نگران
فیض احمد فیض

ایڈیٹر
چودھری برکت علی

چندہ سالانہ
چار روپے چار آنے

فی پرچہ
پانچ آنے

ادبِ لطیف لاہور

جلد (۱۴)

فروری سنہ ۱۹۴۲ء

شمارہ (۶)

مندرجات

چودھری برکت علی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبِ لطیف لاہور سے شائع کیا

اداریہ

اشارات

معاصر آپ تک پہنچ چکا ہے۔ آج سے بہت عرصہ پہلے جب سماج ایک جامد اور یکساں نظام کے ماتحت تھی۔ اس کا ادب بھی ایک ٹھہرے ہوئے دریا کی کیفیت رکھتا تھا جس کے موضوعات اور اسالیب، چند بندھے ہوئے قوانین کی پیروی کرتے تھے۔ سماج کا پرانا نظام ٹوٹ پھوٹ چکا اور نیا نظام شرمندۂ تشکیل ہونے سے پہلے آمادۂ زوال نظر آتا ہے۔ یہی تزلزل اور بے یقینی جو ہمارے خارجی ماحول میں ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کے افکار و اشعار پر بھی مسلط ہے، ان میں پرانے نظامِ اخلاق و معاشرت کے نام لیوا بھی ہیں۔ نئی اقدار کے ترجمان بھی، تعطل اور فراری بھی ہیں، خود اعتماد اور حقیقت پسند بھی، رجعت پسند بھی ہیں ترقی پسند بھی، ہمارے تنقیدی نظریے بھی انہیں متناقض رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اگر ایک نقاد کی نظر میں ادب کا مقصد محض تفریح ہے تو دوسرے کے خیال میں ادب کو افادی مقاصد سے علیحدہ کرنا ناپسندیدہ بھی ہے، اور غلط بھی۔ لیکن یہ مختلف اور متناقض رجحانات یکساں طور پر اہم اور توانا نہیں ہیں، یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں۔ کہ ان میں سے کون شباب کے پہلے مرحلہ میں ہے اور کون پیری کی آخری منزل میں۔ ایک ادبی ماہنامہ جو آزادیٔ گفتار کا قائل ہے اپنے جریدہ کا دروازہ ان سب پر کھلا رکھتا ہے۔ زائرین کی تعداد اور اُن کی حرکات خود اس بات کی شاہد ہیں کہ وقت اور ہجوم کا رخ کس طرف ہے۔ ادبِ لطیف، میں بھی ہم حسبِ وسعت ہمعصر ادب کی مجموعی شکل و صورت پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور اگر یہ صورت بعض اصحاب کی نظر میں پسندیدہ نہیں تو ہمیں اُن سے ہمدردی ہے — وہ یا اپنے وقت سے بہت پیچھے ہیں، یا بہت آگے۔ وہ ادب لطیف، یا موجودہ دور کے کسی اور نمائندہ مجلّے سے برسرِ پیکار نہیں اپنے ماحول سے جنگ میں مصروف ہیں۔

آج سے قریباً سات برس پہلے چند نوجوان ادیبوں نے "ترقی پسند" کے عنوان سے ایک تحریک شروع کی جس کا بنیادی مقصد ادب کو مروجہ رومانیت اور خیال پرستی کے بجائے زندگی اور واقعیت کی طرف مائل کرنا تھا۔ حالی اور آزاد کے زمانہ کے بعد ادب کی مروجہ رسوم کے خلاف یہ دوسری اہم بغاوت ہے۔ اس کی توانائی کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ اس مختصر سے عرصہ میں یہ تحریک ہمارے ادب کے قریباً ہر شعبہ کا مستقل جزو بن چکی ہے۔ اور دوسرا ثبوت یہ کہ آج تک ہمارے ادب میں غالباً کسی نظریے، کسی مصنف اور کسی تحریک کی اس شدت سے حمایت یا مخالفت نہیں ہوئی۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے۔ کہ کوئی مسئلہ کچھ عرصہ موضوعِ بحث رہا، فریقین نے اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور معاملہ ہو نہ ہو ختم ضرور ہو گیا۔ لیکن ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا مسئلہ ایک مسلسل آویزش کی صورت اختیار کر چکا ہے، اور ایسے بنیادی مسئلے کے متعلق ایسا ہونا بھی چاہیے۔ ترقی پسندی، کے خلاف ابھی تک جو اعتراضات کئے جا چکے ہیں، یا عام طور سے کئے جاتے ہیں انہیں ہمارے کرمفرما مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر نے اپنے جامع مضمون میں نہایت وضاحت اور خوش اسلوبی سے پیش کر دیا ہے۔ مضمون کی طوالت کے زیرِ نظر اس کا جواب اس شمارہ میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ آئندہ نمبر میں پروفیسر فیض احمد فیض اس کے جواب میں ترقی پسند مصنفین کے نظریہ کی وضاحت کریں گے۔

غزل اور نظم کی آویزش۔ ترقی پسندی اور رومانیت سے زیادہ پرانی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا مضمون کافی دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ ہم اس مضمون کو بھی موضوعِ بحث کی حیثیت سے چھاپ رہے ہیں۔ "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"

نوٹ: — المنارہ شمارہ ۱۳۔ مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کی رباعی کا دوسرا مصرعہ یوں چھپا ہے "کانٹوں کا وہ سودا منہ بگڑتا ہے"۔ صحیح مصرعہ یہ ہے۔ کانٹوں کا [illegible]

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

کیا غزل نیم وحشی صنفِ ادب ہے؟

نگار کے جنوری فروری ۱۹۴۲ء کے پرچے میں پروفیسر کلیم احمد صاحب کا ایک مضمون "بزم نگار" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں پروفیسر صاحب موصوف نے غزل کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ راقم الحروف غزل کے ان کٹر حامیوں میں سے نہیں ہے۔ کہ اس کو غزل کے عیوب بھی محاسن نظر آئیں۔ نہ وہ ان لوگوں میں سے ہے۔ جو غزل میں کسی اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ بایں ہمہ یہ مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں پروفیسر صاحب موصوف کے بعض مصلحانہ بلکہ انقلابی افکار کو نہیں سمجھ سکا۔ جو انہوں نے شوق غلو اور جوش اصلاح میں نہایت الجھے ہوئے انداز میں ظاہر کئے ہیں۔

ہماری موجودہ غلامی کے ہزاروں بُرے نتائج میں سے ایک مصیبت یہ بھی ہے۔ کہ اکثر حضرات ناظرین و سامعین کو خواہ مخواہ مرعوب کرنے کے لئے کسی جدید و قدیم یورپین نظریہ کا نام لے لیتے ہیں۔ اور اس کے اعتماد پر اپنے دلائل کو زوردار بنا لیتے ہیں۔ ہمارے نقاد پروفیسر کلیم الدین صاحب نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون کو اس دعوے کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ کہ وحشی اپنے آرٹ میں صورت اور تکمیل کا دلدادہ ہے اس بنا پر وہ فرماتے ہیں۔ کہ غزل بھی ایک نیم وحشی صنفِ ادب ہے۔ اور یہ حقیقت اس قدر یقینی ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے خالی خولی دعوے کو ایک یقینی حقیقت کیسے قرار دے دیا جس کے لئے وہ مزید تشریح کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہ سوال کہ آرٹ کی تنقید کے لئے کسی فنی کارنامہ کے حسن کی پرکھ جزواً جزواً کرنی چاہیئے یا مجموعاً ابھی غیر فیصلہ شدہ نزاع ہے۔ کبھی شاہکار کے مختلف اجزا میں اس درجہ ربط و تجانس کا پیدا کر لینا کہ اس میں وحدتِ بسیط اور ہیئت موحدہ پیدا ہو جائے بجائے خود بہت قابلِ ستائش تخلیقی کارنامہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس مختلف اجزا کا انفرادی کمال خواہ اس کے مختلف اجزا میں کچھ تغایر اور تباین بھی موجود ہو، حُسن اور تکمیل صورت کے منافی نہیں۔ کیونکہ بعض صورتوں میں خود تغایر اور تضاد بھی تناسب اور تجانس پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے جس کو اصطلاحاً قانونِ تقابل کا اثر کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس معاملہ میں دونوں طرف دلائل موجود ہیں۔ اور یہ مسئلہ اس درجہ مختلف فیہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی حتمی اور قطعی رائے نہیں دی جا سکتی۔ آر مشر سیریل نے اپنی کتاب Physiology of Beauty میں آر۔ ڈبلیو برٹنی نے An Essay on Critical Appreciation میں اور گلبرٹ کوہن نے A History of Esthetics میں* کہ اس پر اضافہ کرنا ممکن نہیں ایسی حالت میں ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ کہ "یہ ایک یقینی حقیقت ہے" بالکل بے دلیل ہے۔ دراصل غزل پر "ریزہ خیالی" کا الزام بیانیہ بہت

* جزو اور کل کی بحث اتنے دلاویز انداز میں کی ہے

پڑتا ہے۔ پروفیسر گب نے عرصہ ہوا اپنی "تاریخ شعر عثمانیہ" جلد اول میں غزل کے متعلق یہی شکایت کی تھی۔ اس کے بعد بعض دیگر مغربی مصنفین اور اُن کے پیرو ہندوستانی نقاد اس پر معترض ہو رہے ہیں جن میں مسٹر احمد کریم فضلی آئی سی ایس بھی شامل ہیں جنہوں نے فارسی غزل پر ایک عالمانہ مقالہ لکھا ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ ہمارے ڈاکٹر کلیم الدین بھی غزل کے معاملہ میں کچھ گب وغیرہ کے خیالات ہی کو دہرا رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ غلط ہے کہ غزل میں مختلف اشعار ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ بقول مولانا حالی محض اختلافات عیب نہیں تاوقتیکہ وہ اختلاف تناقض نہ بن جائے۔ غزل کے بلند پایہ اساتذہ کے کلام میں تناقض بہت کم پایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اساتذہ کے ہاں بے شمار مسلسل غزلیں ملتی ہیں۔ اردو میں میر، سودا، مومن، غالب، حسرت موہانی وغیرہ نے اور سعدی، حافظ، فغانی اور نظیری وغیرہ نے فارسی میں بہت سی مسلسل غزلیں لکھی ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل کے لئے لازمی نہیں کہ اس کا ہر شعر دوسرے سے ضرور مختلف ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عام طور پر شعرا اس تسلسل کے قاعدہ کی پابندی نہیں کرتے اور کم پایہ شعرا کے اشعار میں نمایاں تناقضات بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں کم پایہ شعرا سے اس بحث میں کوئی سروکار نہیں۔

غرض یہ صحیح ہے کہ غزل میں جیسی کہ وہ اب تک چلی آئی ہے، اختلاف مضمون زندہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس اختلاف کو تناقض نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اساتذہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ رندانہ اور زاہدانہ، فرحیہ اور المیہ، یاسیہ اور رجائیہ مضامین ایک غزل میں جمع نہ ہو جاویں۔ تاکہ تناقض مضمون سے مطلوبہ اثر زائل نہ ہو جائے۔ مثلاً مرزا غالب کی مندرجہ ذیل غزل ملاحظہ ہو۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اس غزل کے مختلف اشعار میں نہایت لطیف اور دلکش ربط موجود ہے۔ لیکن اگر ربط و تسلسل موجود نہ ہو اور تمام اشعار کے مضامین مختلف بھی ہوں۔ تب بھی مجموعی حسن میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اور ہر شعر میں الگ الگ مضمون ادا کرنے سے غزل حقیقت میں بلند پایہ خیالات کا عمدہ مجموعہ بن جاتی ہے۔ لیکن ہمارے پروفیسر صاحب اس تنوع مضمون کو پراگندگیٔ خیال کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ کہ "غزل اور شعر مفرد نیم وحشی صنف شاعری ہونے کی وجہ کسی تہذیب یافتہ دماغ کو تسلی نہیں بخشتے۔ اس کا سبب غزل کی پراگندگی اور شعر مفرد کی تنگ دامانی ہے"۔ لیکن میرے خیال میں اُن کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اس لئے کہ مفرد شعر اکثر اپنی تنگ دامنی کے باوجود بلند حقائق کا حامل ہوتا ہے بشرطیکہ کہنے والا ماہر کامل ہو۔ بلاغت کا کمال مفرد اشعار سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ مفرد اشعار کی یہ صفت کہ نہایت آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں۔ خود اُن کی کشش کا باعث ہے۔ دنیا میں جس قدر اشعار ضرب الامثال بلکہ زبان زد عوام و خواص ہیں۔ اور صدیوں سے لوگوں کو یاد ہیں ان میں سے بیشتر مفرد ہی ہوتے ہیں۔ حکمت و فلسفہ کے نکات، جذبات صادقہ، سوز و گداز اور درد کی باتیں۔ اکثر مفرد اشعار میں مل جاتی ہیں مثنوی اور قصیدوں میں سے جو اشعار لوگوں کو یاد ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے ربط ماسبق کی وجہ سے نہیں بلکہ انفرادی حسن اور جامع مضمون کی وجہ سے پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ باقی رہا تنوع تو انسان فطری طور پر تنوع پسند واقع ہوا ہے۔ ایک ہی غزل میں بجائے ایک جذبہ و تجربہ کے بہت

سے اسرار و طلسمات بیان ہو جائیں تو اس سے تاثیر میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اس ضمن میں ہمارے پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔ "کہ شعر میں کسی ایک جذبہ یا خیال یا جزوی مشاہدہ کی ترجمانی تو ممکن ہے لیکن ان کی ابتدا، ان کی غرض و غایت ان کا دوسرے جذبات و خیالات و مشاہدات سے تعلق یہ سب باتیں ایک شعر میں نہیں سما سکتیں" ارشاد صحیح ہے۔ لیکن ان سب باتوں کو ایک شعر میں کھپانے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ شاعر جب شعر کہتا ہے۔ تو اس کا مطلب کسی تجربہ یا مشاہدہ کی ترجمانی کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس ترجمانی کا طریقہ نثر سے مختلف ہونا چاہیئے۔ یعنی شاعر کو نثر کی مخصوص تفصیل سے بچنا چاہیئے۔ بلکہ جزئیات کو بیان کرتے ہوئے باقی کو ترک کر دینا چاہیئے۔ تاکہ خود تخیل مطلوبہ اثر حاصل کر سکے۔ اسی لئے شاعر اور آرٹسٹ اکثر اختصار و ایما کو تفصیل اور صراحت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اپنے شاہکار کی مصوری میں کئی جزئیات و تفصیلات کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے محذوف اجزا و احساسات کو پڑھنے والوں کا ذہن خود تلاش کر لے گا۔ آرٹ اور شاعری میں محذوفات وہی کام دیتے ہیں۔ جو بعض معاملات میں تفصیل اور جزئیات سے لیا جاتا ہے۔ چونکہ آرٹ کو سمجھنے کے لئے ایک خاص قسم کی تربیت ذہنی ضروری ہوتی ہے۔ جس کی بدولت کسی معین آرٹ کی حقیقی بنیاد خود بخود سمجھ میں آ سکتی ہے اس لئے اگر کسی تجربہ کو بیان کرتے ہوئے تفصیل سے کام نہ لیا جائے۔ تو اس سے ہماری تسکین میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

اسی طرح "ایمائیت" اور "ابہام" (SUGGESTIVENESS) اور (AMBIGUITY) بھی آرٹ کے نقطۂ نظر سے مسلمہ مدارجِ حسن میں سے ہیں۔ جن کی دلکشی اور دلآویزی سے شاید کسی کو انکار نہیں ہوگا۔ اس معاملہ میں ذہن اور خیال جس قدر محذوفات کی تلاش کریگا۔ اسی قدر لطف زیادہ آئیگا۔ تعجب ہے کہ پروفیسر صاحب اپنے جوشِ اصلاح میں ان سب حقائق سے اعراض فرما رہے ہیں

حقیقت یہ ہے۔ کہ جس قدر دنیا کو غزل کی ضرورت ہے۔ آج سے پہلے کبھی نہ تھی۔ موجودہ زندگی کی مصروفیتیں اور پرہنگامہ نظام اس بات کا متقاضی ہے۔ کہ تمام تفریحی امور میں، اختصار کو مدنظر رکھا جائے تھیٹر کے مقابلہ میں سینما، ناول کے مقابلہ میں افسانے اور افسانچے، ڈرامہ کی جگہ مختصر اور یک مجلس ڈرامے سب اسی انسانی اختصار پسندی کا پتہ دیتے ہیں۔ ہمارے قدما طبعاً جفاکش، محنتی، اور تفصیل و استیعاب کے دلدادہ تھے۔ ان میں سے ایک کئی کئی جلدوں میں اپنے شاعرانہ کارناموں کو مرتب کرتا تھا۔ نظامی کے پنج گنج اور جامی کے ہفت اورنگ اور خسرو کے ہشت بہشت اسی طویل نظم گوئی کے نشانات ہیں۔ لیکن آج کا کوئی شاعر شاید یہ محنت گوارا کرنا پسند نہ کرے۔ اس لئے کہ زندگی کے اوضاع و اطوار اتنے مختلف ہو گئے ہیں۔ اور فرصت اتنی کمیاب ہو رہی ہے۔ کہ اس قدر طویل نظموں کے کہنے اور سننے کے لئے ممکن ہے کبھی وقت ہی میسر نہ آ سکے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اب یورپ میں بھی انتخابات کی طرف خاص توجہ ہو رہی ہے۔ پس ان حالات میں غزل کا اختصار اس کی زندگی کی کفالت کرتا ہے۔

جن لوگوں نے غزل کا ڈھانچہ تیار کیا۔ وہ نیم وحشی نہیں بلکہ انتہائی طور پر مہذب تھے۔ انہوں نے اپنے دوسرے طویل کارناموں کے ساتھ ساتھ یہ لطیف، سبک، ایمائی اور مختصر صنف بھی ایجاد کی۔ جس کا عملی پہلو روزمرہ زندگی کے اعتبار سے طویل نظموں کے مقابلہ میں

بدرجہا اہم ہے۔ وہ شعر کے اثر کو جانتے تھے۔ اور یہی سمجھتے تھے۔ کہ ایک اچھا شعر ہزاروں طویل نظموں کے مقابلہ میں روح کو زیادہ تسکین بخشتا ہے اور طبع نظر میں زیادہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ اسی لئے ایڈگر ایلن پو نے کہا ہے۔ کہ طویل نظموں میں شعریت کا فقدان ہوتا ہے۔

غزل کی ساخت میں ہم آہنگی اور ربط کا عنصر مفقود نہیں۔ خود قافیہ اور ردیف کی پابندی ایک وحدت آفریں عنصر ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ہم قافیہ الفاظ کی تکرار ایک صوتی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اپنی موسیقیت سے اتنا اثر پیدا کرتی ہے۔ کہ غزل کا اختلاف مضمون اسکی موسیقیت اور اثر تناسب کو توڑ نہیں سکتا۔ بلکہ تربیت یافتہ ذہن ہم قافیہ الفاظ کی تکرار سے حد درجہ محظوظ ہو سکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب ردیف و قافیہ کی پابندی کو متغزلین کی آسان پسندی خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ اسکے برعکس ہے۔ اچھی غزل لکھنا نہایت ہی دشوار کام ہے۔ اساتذہ عمدہ غزل لکھنے کے لئے بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں۔ کہ طالب آملی نے اس شعر کے مصرع اول کو لکھنے اور سنوارنے میں چھ ماہ صرف کئے تھے۔

ز غارتِ چمنت بر بہار منتہاست — کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

امیر مینائی فرماتے ہیں:-

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے — تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

یہی وجہ ہے کہ غزل کے میدان میں بلند پایہ اساتذہ کی تعداد بہت کم ہے۔ اور خود فارسی شاعری میں جو غزل کی مورث ہے، ابھی جوئی کے نام صرف چند ہیں۔

میں سمجھتا ہوں۔ کہ غزل کے متعلق یا کسی اور صنف شاعری کے متعلق فتویٰ دینے سے پہلے ہمارے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم اس خاص صنف کی ساری تاریخ اور اسکے محرکات تمہید اور قصیدہ پر بھی غور کریں۔ غزل فی الحقیقت فارسی کی ملکیت بلا شرکت غیرے ہے۔ اہل ایران نے ہی اس کو قصیدہ کی "نسیب" سے الگ کیا۔ انہوں نے ہی اسکو آب و رنگ بخشکر درجہ کمال تک پہنچایا۔ شعرائے ایران محض غزل گو نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے مثنوی، قصیدہ، مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، رباعی، خماسی، مثمن غرض ہر طرح کے شعر کہے۔ اس لئے اس سوال کا فیصلہ اہمیت سے خالی نہیں کہ مثنوی کے عام رواج اور رباعیات کے اختصار کے باوجود آخر غزل کو کیوں اس درجہ قبول عام حاصل ہوا۔ غالباً یہ غزل کی اندرونی خوبی تھی۔ کہ اس کا اختصار نسبتاً طویل تر اصنافِ کلام پر غلبہ کا باعث ہوا یہی وجہ ہے۔ کہ صوفیوں نے اس کو اپنایا۔ اور اسکے اختصار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرار اپنے خیالات کی اشاعت کا موثر ذریعہ بنایا۔ اخلاق کے مبلغوں نے اسی کو کسب فضائل کا ذریعہ بنکر کیمیائے سعادت کا ہم پلہ بنا دیا، رندوں اور قلندروں، مجذوبوں اور درویشوں نے اس کی سرپرستی کی، درباروں میں اس کی پرستش ہوئی۔ خانقاہوں میں اسکے ورد ہوتے بازاروں میں اس کی گونج سنائی دی۔ غرض اس بساطِ یاز شعر کی بے ڈھنگی اور بے ربط "وحشی" قسم کی شاعری نے کیا کیا نہ کیا!

میرے خیال میں غزل کے متعلق یہ اشتیاق اور رجحان ایرانی قوم کی بربریت کی علامت نہ تھا کیونکہ غزل کو آب و رنگ بخشنے والے بہت

سے شعرا بہترین مثنوی گو بھی تھے۔ مثلاً سعدی جن کی نثر نظم اور غزل سب کے نزدیک نہایت کامیاب تھی۔ سعدی جہاں بوستاں لکھ کر بہترین مثنوی گو (اور بقول ڈاکٹر صاحب "مہذب") ثابت ہوئے ہیں۔ وہاں غزل کو غزل بنانے والے بھی وہی ہیں۔ پھر کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ سعدی ایک لحاظ سے مہذب تھے اور دوسرے لحاظ سے "نیم وحشی"! ایرانیوں نے مثنوی کو بہ حیثیت صنف بہت ترقی دی ہے۔ اور اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی اقدار شاعری کے بارے میں خاصے مہذبانہ تھیں لیکن اسی مہذب ذہن نے غزل کو اس قدر چمکایا کہ آج ہم مخالفت کے باوجود اس کو نہیں مٹا سکتے۔ خواجہ کرمانی گو بہترین غزل گو تھے۔ مگر ان کی مثنویاں ہما و ہمایوں وغیرہ بھی بہت شہرت رکھتی ہیں۔ جامی۔ خسرو فیضی وغیرہ سب اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن بلند پایہ شعرا نے مثنوی کی طرف کم توجہ کی ان کی "غزلیات" بے نظیر اور کسی حد تک بے عیب ہیں مثلاً حافظ۔ فغانی اور نظیری وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کا استدلال بے حد غلط اور گمراہ کن ہے۔ اور انہوں نے محض چند مغربی نظریات کو آزمانے کے لئے بیچارے غزل گو شعرا کو بہ حیثیت مجموعی رگڑ ڈالا ہے۔

اس کے علاوہ غزل نے گذشتہ آٹھ نو سال میں بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ادبی لحاظ سے غزل جہاں انتہائے کمال کی پروانہ دار ہے وہاں مبتدیوں کے آغاز کار کے لئے بھی مفید مشق ہے۔ زبان پر قدرت اور متناسب اور شاعرانہ الفاظ و تراکیب پر عبور اور ان کے استعمال کے بارے میں مہارت کے لئے یہی لطیف صنف کام آتی رہی ہے۔ شاعروں کے دواوین میں ہزاروں غزلیں ملتی ہیں۔ سب کی سب ان کے کمال کا اظہار نہیں۔ ان میں سے بیشتر مشقیہ کلام ہوتا ہے۔ جو نو مشقی کے دور سے لیکر پختگی کے زمانے کی یادگار ہوتا ہے۔ غزل میں پختگی حاصل کرنے کے بعد دوسرے اصناف سخن پر قدرت ہوتی ہے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب ہمارے شعرا کے دواوین کی کثرت اور ان کی غزلیات کی یکرنگی سے بہت گھبرا گئے ہیں۔ اصل علاج یہ ہے کہ کم پایہ شعرا سے قطع نظر کر لینا چاہیئے۔ اور اس کے بجائے بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر غور کرنا چاہیئے۔ جن کی عظمت کے اسباب ان کی کلیات میں خود بخود نظر آجائیں گے۔ غزل نے شعرا اور زبان کا حقیقی ذوق پیدا کرنے میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ اور آج بھی ہمارے پاس کم از کم اردو کے عروج کے لئے، اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

جو لوگ ادب اور زندگی کے درمیان تعلق پیدا کرنے کے مدعی ہیں۔ انہیں بھی اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ غزل ایک کارآمد صنف کلام ہے جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ غزل ہی تھی جس نے ایرانی تصوف کا ذوق عوام و خواص کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا صوفی غزل کی مقبولیت کے راز کو پا گئے تھے۔ انہوں نے اس کی رندانہ اصطلاحوں کو اپنا کر انکو نئے معانی پہنا دیئے۔ نتیجہ یہ کہ تصوف کا نشہ آج تک سب کو سرمست بنا رہا ہے۔ آج ہماری ضرورتیں ہمیں پھر مجبور کر رہی ہیں۔ کہ ہم اپنے لئے کوئی شاعرانہ قالب ایسا تیار کریں۔ جس کے ذریعے ہم مجبوری و محکومی کے باوجود اپنی دبی ہوئی آواز نکال سکیں۔ میرے خیال میں غزل، اس سلسلے میں بہت کام آسکتی ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے بال جبریل میں سیاسی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نئے راستے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب شاعروں اور ادیبوں کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنی غزل کو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے ہم آہنگ کر لیں۔

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

اب تجھ سے شکوۂ گردشِ دورِ زماں نہیں
اک غم ملا تھا وہ بھی غمِ جاوداں نہیں

تم مہرباں تھے جب تو زمانہ تھا مہرباں
تم مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

اُن کی وفا وبالِ دل وجاں ہوئی مجھے
پہلی سی قلب و رُوح میں بیتابیاں نہیں

دونوں میں اُن کا راج قفس ہو کہ آشیاں
حیراں نہ ہو جو مجھ کو غمِ آشیاں نہیں

دُنیا حفیظ تیرے سخن کو ترس گئی،
وہ دل نہیں کہ دل کی تمنّا جواں نہیں

شہزادی دیہاکر

خزاں

میرے محبوب
تم اس خزاں کے پہاڑ کو
اکیلے ہی کیسے عبور کرسکو گے
جس کا عبور کرنا اس وقت بھی دشوار تھا
جب ہم دونوں ساتھ تھے

طالب شیرازی

مرزا جعفر علیخاں اثر

ترقی پسند ادب کی نفسیاتی تحلیل

مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" مصنف کہتے ہیں: ادب اور اس کی حقیقت سے کسقدر بیگانہ ہیں!

جبتک ادب کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہے۔ اس سے صناعت کا عنصر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ شامل ہے تو شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو (ہماری بحث شاعری تک محدود رہیگی) اس کا مقصدِ اولیں نشاطِ دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ادب کا افادی یا غیر افادی، اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونا ضمنی اور اضافی اوصاف ہیں۔ اسی طرح تمدن، سیاست یا کسی اور تحریک سے ادب کو براہ راست کوئی واسطہ نہیں۔ اور نہ ہونا چاہیئے۔ یہ سچ ہے۔ کہ موجودات عالم میں کوئی شے اور واقعہ ایسا نہیں۔ جو شاعری کے دائرۂ عمل سے خارج ہو۔ مگر جیسا پہلے مضمون میں لکھ چکا ہوں نقطہ نظر صناعانہ ہو اور پروپاگنڈا کا شائبہ بھی نہ ہو۔ ورنہ شاعری یا ادب کا غلط اور ناجائز استعمال ہوا۔ موضوع جو کچھ ہو طرزِ ادا میں فن کارانہ بانکپن قائم رہے۔ ادب کو جہاں کسی غرض یا مفاد کا آلۂ کار بنایا اُسکی تاثیر اور دلکشی فنا ہوئی۔ پھر شاعری شاعری نہیں بکواس ہے۔ اور اُسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے بھیک منگتے، میوہ فروش یا بیاں سناتے چوکیدار پہرا دیتے یا الگوری چھاپ بیچتے ہوں۔

فنونِ لطیفہ میں مصوری، موسیقی اور بت تراشی بھی شامل ہیں۔ ان سے پروپاگنڈا کا کام نہیں لیا جاتا۔ مگر غریب شاعری سے توقع رکھی جاتی ہے۔ کہ مزدوروں اور کسانوں کی دلالی کرے!

شاعری کا یہ غلط مصرف بدترین ادبی اور اخلاقی جرم ہے۔ اور ایسے لوگوں کی مخالفت ہر ذی ہوش کا فرض ہے۔

اگر شاعری کا مقصود زندگی کی مستقل قدروں کا دریافت کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ہے۔ تو ایسی نام نہاد شاعری کا انجام کیا ہوگا۔ جو ایک خاص غرض کے حصول کے لئے گتھیوں کو سلجھانے اور مسائل کا واقعات کی روشنی میں حل سوچے بغیر ہندوستان میں سوویٹ ذہنیت پھیلانا چاہتی ہے، اگر اسی کے ساتھ ساتھ جذبۂ نفرت و انتقام بھی کارفرما ہے۔ تو ایسی شاعری کی زبونی کا کیا پوچھنا۔

ادب کا مطالعہ ہی وہ معصوم اور دلچسپ مشغلہ ہے جس سے سائنسدان، فلسفی، مفکر، بلکہ ہر طبقے اور حیثیت کا شخص دن بھر کی مصروفیت اور تھکن کے بعد اپنی فرصت کے لمحے اس طرح صرف کر سکتا۔ اور ایسے ماحول میں پہنچ سکتا ہے۔ جہاں دنیا کے مکروہات سے تھوڑی دیر کو نجات پا جائے اور وہ سکون و راحت میسر ہو اُسکے دل و دماغ کو جس کی ضرورت تھی۔ اور جسکے نصیب ہونے پر دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنے روزانہ مشاغل زندگی میں زیادہ مستعدی، سرگرمی اور خوش دلی سے منہمک ہو۔ "ادب برائے زندگی"، یہ نعمت بخشنے سے قطعاً قاصر ہے۔ کیونکہ اپنی بہترین صورت میں

بھی اُسی کشاکش کا آئینہ ہے۔ جس کا عملاً سامنا ہوتا ہے۔ ادب میں بھی وہی پرخاتانہ مسرت کے بجائے طبیعت کو اور زیادہ مضمحل اور اندوہگین بنا دیتا ہے اور اس طرح ادب کا حقیقی منشا فوت ہو جاتا ہے۔ ایسا ادب اپنی نوعیت کی بنا پر کسی طبقے میں بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کردہ دعوتِ نفرت انگیز ہونے کے علاوہ اُن خوبیوں اور لطافتوں سے بھی معرا ہے۔ جن کی وجہ سے موضوع سے قطع نظر خود شاعرانہ صناعت دلکشی بھر دیتی ہے۔

"ادب برائے زندگی" دراصل روسی اشتراکی لٹریچر کا بگڑا ہوا خاکہ ہے۔ ایسی شاعری کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے جس میں خلاقانہ تمکین معدوم ہے۔ اور جس میں حقائق کی ترجمانی کے بجائے بدیسی واقعات کو ہندوستان میں منتقل کرکے اُن کی مبالغہ آمیز اور سفیہانہ نقالی کی گئی ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے۔ جو کسی خاص مقصد کی تکمیل کر وجود میں آئی نہیں۔ بلکہ لائی گئی ہے اور کسی طرح دیرپا نہیں ہو سکتی۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ

> ادب کی دو تعریفیں ممکن ہیں۔ ایک جس میں مصنف کی داخلی یا موضوعی کیفیت پیش کر دیا جاتا ہے۔ اور دوسری جس میں خارجی یا معروضی عنصر کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ادب کا پہلا تصور ہمیں رومانیت کی طرف لے جاتا ہے جس میں مصنف کے جذبات اور محسوسات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ اور دوسرا تصور حقیقت نگاری کی طرف جس میں اُس خارجی چیز کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی تصویر کھینچنی مقصود ہو۔ پہلی صورت میں بیان یا طرزِ ادا پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور دوسری میں اُس چیز پر جو بیان کی جائے۔ پہلی حالت میں ادب مقصود بالذات ہو جاتا ہے۔ اور دوسری حالت میں ایک ذریعہ قرار پاتا ہے۔ "ادب برائے ادب" پہلے نظریہ کی حمایت ہے۔ اور دوسرے نظریہ کو "ادب برائے زندگی" کہہ سکتے ہیں۔

کس قدر گمراہ کن تحریر ہے! دنیا جانتی ہے کہ ادب کے داخلی اور خارجی پہلو سے مراد تخیل کا طریقِ کار ہے۔ شاعر کبھی اپنے جذبات و محسوسات و واردات قلب کی مصوری کرتا ہے۔ یہ شاعری کا داخلی پہلو ہوا کہ کبھی مناظرِ قدرت یا کسی واقعہ یا مرئی شے کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اسکو شاعری کا خارجی پہلو کہتے ہیں مگر کوئی شاعر ایسا نہیں قدیم یا جدید جس کے کلام میں دونوں عناصر کم یا بیش موجود نہ ہوں۔ اگر ہمارا قول صحیح ہے۔ تو "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" میں کوئی حدِ فاصل نہ رہی۔ اور یہ حضرت خود نہیں جانتے۔ کہ "ادب برائے زندگی" کیا بلا ہے۔ تاہم دوسروں کو سمجھانے کی جسارت کرتے ہیں!

"ادب برائے زندگی" کے ایک دوسرے حامی فرماتے ہیں۔ کہ ادب میں دو خصوصیتیں لازمی طور پر پائی جانی چاہئیں۔ اول یہ کہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اُس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے۔ "اجتماعی زندگی" سے اُن لوگوں کی زندگی مراد ہے جن کے درمیان ادیب یا شاعر اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے سماجی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شاعری چھوٹی

چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر عجیب و غریب متضاد کیفیتوں کا مجموعہ بن جائیگی۔ دنیا بھر کو جانے دیجئے ایک شہر یا قریہ لے لیجئے۔ سماج کے افراد جس قدر مختلف عقائد، خیالات اور رجحانات رکھتے ہونگے۔ بیچارہ شاعر اس مجبوری کے ساتھ کہ "با ہمیں مرداں بباید ساخت" اُن کی تمام بیہودگیوں، توہمات اور مناقشات کی اپنی شاعری میں تفسیر، تنقید یا ترجمانی کرنے کی سعی لاحاصل کریگا، تفرقوں کی خلیج بڑھتی چلی جائیگی۔ اور جو کچھ آج کہیگا۔ اور کل کچھ اجتماعی زندگی سے کھلا اور براہِ راست تعلق پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعر زندگی کی (مجموعی ہو یا انفرادی) ترجمانی جبھی کر سکتا ہے کہ بنیادی اصول و حقائق کی جزئیات فرقہ وارانہ کوتاہ نظری و پست خیالی سے بالا ہوں۔ ایسے دلکش انداز اور الفاظ میں ترجمانی یا تنقید کرے۔ کہ لوگوں کے دل اُس طرف خود بخود کھنچیں اور شاعر کے مقولات کو قبول کریں۔ ایسا شاعر ذاتی وقتی یا مقامی تنازعات سے کبھی واسطہ نہیں رکھتا۔

یہی بزرگ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:-

> ایک مہذب انسان کا فرض ہے کہ وہ ذاتی فائدے کے بجائے جماعتی فائدے کا اپنا مطمحِ نظر بنائے۔ اس لئے کہ اگر ہم اس سوال پر غور کریں کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ تو اسکے سوا کوئی جواب نہ ملے گا۔ کہ انسان کی خدمت ہی انسان کی زندگی کا واحد اور حقیقی مقصد ہے، دنیا میں انہیں لوگوں نے کامیاب، مطمئن اور سچی مسرت سے لبریز زندگیاں بسر کی ہیں۔ جنہوں نے اپنے ذاتی فائدوں اور ذاتی خواہشوں کو پسِ پشت ڈال کر ابنائے جنس کی خدمت کو اپنا شعار بنایا، دوسروں کے آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھا، دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کے غم کو اپنا غم خیال کیا۔ جن شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زندگی میں عالمگیر مقبولیت حاصل کی اور مرنے کے بعد بقائے دوام کا تاج پہنا۔ وہ وہی ایثار پسند اور اخلاص پیشہ اربابِ فکر و نظر تھے۔ جو سارے جہاں کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے، انسان کی فلاح و بہبود جن کا نصب العین تھا۔ جنہوں نے آپ بیتی کا راگ الاپنے کے بجائے جگ بیتی کے نغمے گائے اور اپنی خودی کو عالمِ انسانیت کی زندگی میں تحلیل کر دیا۔

میرا خیال تھا کہ شاعر کی شہرت اور بقا کا دارومدار اُسکے کلام کی خوبی اور حسنِ قبول پر ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ جبتک شاعر ولی نہ ہو اُسکا کلام بجائے خود کسی عزت کا مستحق نہیں کاش فاضل نقاد ایک ہی ایسے فرشتہ صفت محسنِ انسانیت شاعر کا نام لے دیتے۔ جو ابراہیم بن ادہم کی طرح بنی آدم کا خادم بنکر خدا کا برگزیدہ بندہ بن گیا۔ اور اُس کی شاعری کی شہرت اس وجہ سے ہوئی کہ وہ زیورِ اخلاق سے آراستہ تھا۔ چاہے شاعری کی حیثیت سے قابل

عظمت نہ ہو۔ کیا فردوسی ایسا خادمِ خلق تھا، سعدی تھا، حافظ تھا، خیام تھا، شکسپیئر تھا، ملٹن تھا، ڈانٹے تھا، اگر کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہوا بھی ہو تو سوال پیدا ہوگا۔ کہ شاعری نے اُس کو ایسا انسان بنا دیا یا شاعر ہونے کے علاوہ اُس کی افتادِ طبع ایسی تھی۔ بعض شاعر سپاہی یا مصلح بھی ہوئے ہیں۔ اور ایسے بھی ہوئے ہیں کہ شاعر کی حیثیت سے مشہور مگر اطوار کے لحاظ سے مردود۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ اچھا شاعر کردار کے اعتبار سے بھی اچھا ہو۔ اسکا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ شاعر ہر قسم کی اخلاقی خوبیوں سے معرا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہ شاعر کی شہرت کا مدار اُسکے کلام پر ہوتا ہے۔ نہ کہ اُسکے افعال و کردار پر۔ علاوہ ازیں اگر شاعر یا ادیب کی یہی تعریف ہے تو مصلح قوم، محب وطن اور خادم خلق کی کیا تعریف ہوگی؟

اگر مضمون نگار کی تحریر کے آخری حصہ کو لیا جائے۔ اور تمام عبارت آرائی کو لب لباب سمجھا جائے۔ کہ شاعری یا ادب میں شاعر یا ادیب اپنے انفرادی تاثرات کو پس پردہ رکھے۔ اور خارجی واقعات یا مسائل پر اپنی شاعری یا ادب کا زور صرف کرے۔ تو عام لوگوں کی بابت جو چاہے کہیے شاعری کا تو خون ہوگیا۔ کیونکہ واقعات و مسائل عام اور پیش نظر ہیں۔ جب تک شاعر کی انفرادیت اُن کی تنقید یا ترجمانی اپنے والہانہ انداز میں نہ کرے گی تو شاعری کہاں سے ہوگی۔

ان صاحب نے ادب کا مقصد بھی بالکل الٹا قرار دیا ہے۔ تمہید میں فرماتے ہیں۔ کہ

> اس سوال کا صحیح جواب دینے کے لئے ہم کو غور کرنا ہوگا۔ کہ وہ کون سی چیز ہے جو ادیب کو تخلیق ادب پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ کونسا اندرونی جذبہ ہے۔ جو شاعر سے شعر کہلواتا۔ اور افسانہ نگار سے کہانی لکھواتا ہے۔ ہر شخص مخصوص خیالات و جذبات کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے (اور یہ عین فطرت انسانی ہے) کہ میرے خیالات و جذبات ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پھر قدرتی طور پر یہ خواہش اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کہ میں ان خیالات و جذبات کا اظہار کروں۔ اور اُن کو دوسروں تک پہنچاؤں ..... ادیب اس لئے شعر کہتا یا افسانہ لکھتا ہے کہ وہ اپنے تاثرات کو ایک مستقل شکل دے، اپنے خیالات و تجربات کو دوسروں تک پہنچائے۔ اور اپنے جذبات و احساسات میں وسیع انسانیت کو بھی شریک کرے، وہ چاہتا ہے۔ کہ جو کچھ میں نے سمجھا اور محسوس کیا ہے۔ دوسرے بھی سمجھیں اور محسوس کریں، دوسرے بھی حزن و ملال، نشاط و مسرت اور تفکر و تصور کا وہی لطف حاصل کریں جو خود میں نے حاصل کیا ہے۔

اس تحریک کا استدلال ہی غلط ہے۔ وہ شاعر یا ادیب جو فطانت یا (Geniuo) کے مالک ہیں۔ شاعری یا ادب کے شاہکار اُس وقت پیش کر دیتے ہیں جب ہم شعر کی ابتدائی منزلوں ہی میں ہوتے ہیں اصطلاحات کی پختگی سے کوسوں دور۔ یہ اور بات بھی قطعاً غلط ہے۔ کہ پہلے انہیں اپنے خیالات و جذبات کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسکے بعد ان خیالات و جذبات کو شعر میں منتقل کرتے ہیں (صرف شاعری سے بحث ہے) آدمی شعر اس لئے کہتا ہے کہ اُس کی فطرت شعر کہنے کی محرک ہوتی ہے جب تخیل شعر کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اُسکے بعد شاعر دوسروں کو اپنے خاص انفعالی تاثر میں شامل کرنا چاہتا ہے جو خود اس پر طاری ہوا تھا۔ اور جس نے شعر کی شکل اختیار کی۔ ورنہ خیالات و جذبات ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں۔ اور اُسکے گمان میں اہمیت بھی رکھتے ہیں، پھر وہ سب شعر یا افسانہ کیوں نہیں بن جاتے؟ بجز اس کی کیا وجہ کہ خیالات و جذبات شعر اور افسانے کے علاوہ کہیں خطابت، کہیں مذہبیات اور کہیں عمل یا سازش کی صورت اختیار کرتے ہیں؟ آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ادب کا مقصد سماجی زندگی کو متاثر کرنا ہوا۔ شاعری کا مقصد جیسا پہلے بیان ہو چکا۔ اسکے سوا کچھ نہیں۔ کہ حیات و کائنات کی تفسیر و تنقید کرے۔ اور ایسی زبان میں۔ اور اس اسلوب سے کہ یہ تفسیر یا تنقید اپنے حسن و صداقت سے طبع عام کے لئے تسکین یا راحت کا موجب ہو۔ اسی سے ہم کہتے ہیں۔ کہ ادب کا مقصود بالذات دماغی اور روحانی مسرت یا تسکین مہیا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور "ادب برائے زندگی"، جو اس مقصد سے ہٹ کر شاعری کو اُس کی بلندیوں اور لطافتوں سے محروم کر کے کثافت اور گندگی میں آلودہ کرنا چاہتا ہے۔ نہ تو حیات کی تفسیر ہے نہ ترجمانی۔

اسکے ساتھ پھر اس امر کے اعادہ کی ضرورت ہے کہ شاعری کے دائرۂ عمل سے کوئی جذبہ کوئی واقعہ خارج نہیں۔ شاعر اگر در اصل شاعر ہے۔ تو اس کا موضوع سخن جو کچھ بھی ہو۔ زندگی کی تنقید یا ترجمانی ضرور ہوگی۔ کیونکہ موجودات میں کوئی شے ایسی نہیں۔ جو زندگی سے وابستہ نہ ہو اور یہ تنقید ایسے الفاظ میں اور اس انداز سے ہوگی۔ کہ اُس میں شاعرانہ حسن اور شاعرانہ صداقت جھلکیگی۔ اور یہی وصف شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور شاعری کو اظہار جذبات و خیالات کے دوسرے طریقوں سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔

مگر جو لوگ "جھنڈا اونچا رہے ہمارا"، "یا جان بیٹا خلافت پہ دیدو"، یا حیا سوز فحاشی اور خواہشات جنسی میں ہیجان پیدا کرنے والی باتوں کو شاعری سمجھتے ہوں۔ اُن کو سمجھانے کی کوشش ہی پاگل پن ہے۔ خیر ع تھا جنونِ عشق کا یہ بھی تقاضا، ہو گیا۔

ادب برائے زندگی کے علمبردار، ادب برائے ادب کا یہ مفہوم متعین کرتے ہیں۔ کہ اس کا مقصد محض سامان تفریح مہیا کرنا ہے۔ اگر تفریح سے مراد ادب کی دل آویزی ہے، وہ رنگینیاں ہیں۔ جن میں ہم گم ہو جاتے ہیں۔ تو بے شک ایسا ادب سامانِ تفریح ہے۔ اور ہمیں شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ کہ ایسا کیوں ہے، مگر حقیقی ادب کی دستگاہ یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اچھا ادب نہ صرف حیات کا ترجمان ہوتا ہے۔ بلکہ دائرۂ حیات کو وسیع کرتے کرتے، پھول، پتی، ذرہ، قطرہ، اور دیگر بظاہر بے جان، اشیاء میں بھی حیات کا مشاہدہ کرتا ہوا انسان کو نامحدودیت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ خود موت بھی زندگی کی ایک شکل بن جاتی ہے ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میر)

ادب برائے ادب نے انسانی کردار کے اُن خصوصیات کو جن کا مظاہرہ جہد حیات میں ہوتا ہے کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ اور محض خیالی یا مصنوعی دنیا نہیں بسائی۔ نیکی ذمہ داری، راستی، تواضع، خلق، حیا، نیز دیگر اخلاقِ حمیدہ کی تعریف کرکے اُن کی طرف رغبت دلائی ہے۔ جھوٹ، ریاکاری، دغا، فریب، ظلم، دل آزاری وغیرہ کی مذمت کی۔ مگر جو کچھ کہا صناعت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ دگفتگو لیکن کلام سے ہے ورنہ مطلب دنیا میں ہر جگہ ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ہمارے ادب میں رومانیت اور قنوطیت کے سوا کچھ نہیں ایک بے بنیاد اتہام ہے۔ تخیل کے علاوہ طرزِ ادا اور بیان کی خوبی محض اُن تدابیر کے ہیں جن سے عروسِ سخن سنواری جاتی ہے، اُن کو ادب کا مقصود بالذات کہنا غلط ہے۔ البتہ یہ مدعیان ادب برائے زندگی ادھوری صداقت اور مبہم معانی کا ایک کاواک ڈھانچہ بنا کے اُسکو زرق برق لباس میں لپیٹ کر بسم اللہ گرتا ب نظر ہست کے راہ کی دعوت دیتے ہیں۔ مگر یہ ناقص وہ ہیولیٰ شیوہ دراصل عفونت میں بسا ہوا اور غلاظت میں لتھڑا ہوا ہجلنگا ثابت ہوتی ہے جس کی کراہت لیپ پوت نے دوبالا کردی۔

ادب برائے زندگی کے مدعیوں کا بیان ہے کہ اُن کے مخالفین زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں سے بھاگ کر ایک فرضی اور مصنوعی دنیا میں پناہ لیتے ہیں، الفاظ میں موسیقیت اور خیالات میں رومانیت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ درانحالیکہ انکے "ادب برائے زندگی" کا وجود ہی کالعدم ہو جاتا ہے اگر زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں نے انہیں شاعری پر نہیں ابھارا۔ یہ احساس بیچارگی و محرومی ہی ہے جو قوتِ عمل نہ ہونے کے باعث نظم میں گھسنے اور گالیاں اور نظم میں "ماری جور ہٹیا" بن گیا ہے اگے ہاتھوں پیٹ پالنے کا دھندا بھی نکل آیا۔ دراصل وہ الزام جو دوسروں کے سر تھوپا جاتا ہے انہیں پر عائد ہوتا ہے۔ یہی تلخی اور ناکامی ہے جس نے ان کی شاعری کو مسلخ کا نمونہ بنا دیا ہے، اس میں سوائے دانت پیسنے، چیخ چلا ہٹ، بوٹیاں نوچنے، خون بہانے اور ڈکارنے کے کچھ نہیں۔ جوش اور غالباً احسان دانش کو نکال دو تو کسی کی شاعری میں توپ و تفنگ، لاشوں کے ڈھیر اور خون کی ندیوں کے باوجود مردانگی اور دلیری کی ڈینٹ بھی نہیں، بڑبڑانا، رونا پیٹنا یا خواب میں بڑانا ہے، سمندر کا جزر و مد اور اُس کا طوفانی اضطراب مفقود ہے۔

شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو، جبتک اُس کی امتیازی شان موجود نہ ہوگی، تاثیر اور کیف سے خالی رہے گی۔ راستی، حسن اور شدتِ احساس اسکے ابعادِ ثلثہ ہیں، امتزاج و انتخاب و ترتیب اسکے آلۂ کار اور موسیقی و مصوری و تنوع اسکے رفیق ہیں۔ راستی سے یہ مراد نہیں کہ درخت کو درخت کہہ دیا۔ بلکہ جو نقش اُبھرے وہ کامل اور بے عیب ہو۔ حسن سے یہ مدعا نہیں کہ کسی "مہ جبین" کو دیکھ لیا اور زخم کھا گئے۔ بلکہ وہ توازن و تناسبِ خیال و معنی ہے، جس سے ایسا روحانی اہتزاز حاصل ہوتا ہے جو انسان کو "پوتر" بنادے۔

یہ لوگ مدعی تو ہیں ادب برائے زندگی کے مگر ادب اور زندگی دونوں کے دائرے سے ہر شے کو سوائے چند مفید "عنوانات" کے خارج کر دیتے ہیں، اُن کی شاعری انسان کو حقیقت کا رازدار اور فطرت کا ترجمان بنانے کے بجائے انقلاب کے سامنے ناچنے تھرکنے اور نجاست میں لوٹنے کی دعوت دیتی ہے، شاعری کوئی بھی ہو، عشقیہ یا غیر عشقیہ، جیسے بے روح ہے۔ اگر حقیقت سے دور، جوش و خروش سے خالی اور تصنع سے پُر ہے یہ بھی یاد رہے کہ ہر شخص شاعر نہیں ہوتا، نہ معلوم کتنے تک بند ہیں۔ جنہوں نے یہ خطاب اپنے آپ کو دے رکھا ہے۔ ورنہ ممکن نہیں۔ کہ سچا شاعر

منظر کشی یا جذبات نگاری کرے اور سننے والا متاثر نہ ہو۔ مگر یہ "ادب برائے زندگی" کے موئدین ہیں جو کہ "ادب جدید" سے زیادہ غالباً میتھو آرنلڈ کے اس مقولے سے کہ شاعری تنقید حیات ہے گمراہ کر دیا ہے۔ صرف اُسی شاعری کے گرویدہ ہیں جو اشتراکیت و انقلاب کی تلقین کرے چاہے شاعرانہ خوبیوں سے خالی ہو۔ ضرورتنا ہے کہ میتھو آرنلڈ کا نظریہ واضح کر دیا جائے تاکہ لوگ غلط بیانیوں کا شکار نہ ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ شاعری کا مستقبل مہتم بالشان ہے کیونکہ شاعری میں، بشرطیکہ اپنے اعلیٰ مقصد کے شایاں ہو، بنی نوع انسان کو قابل رہنما ملے گا۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جس کی بنیادیں متزلزل نہ ہوں، کوئی عقیدہ ایسا نہیں جس پر شبہ نہ کیا گیا ہو، کوئی روایت ایسی نہیں جو معرض خطر میں نہ ہو۔ اولاً مذہب واقعہ کی شکل میں پیش کیا گیا۔ مفروضہ واقعہ کی شکل میں، اُسکے بعد واقعہ پر جذبہ کا اضافہ کیا گیا، انجام جو ہونا تھا ہوا یعنی واقعہ نے مذہب کا ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ اب شاعری کو لیجئے اس میں تخیل سب کچھ ہے، باقی اوہام کی دنیا ہے، بیشک الہیات اوہام کی دنیا۔ مذہب کے علی الرغم شاعری تخیل سے جذبے کو منسلک کرتی ہے لہذا خیال واقعہ بنجاتا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہو کہ مذہب کا راسخ ترین جزو اُس کی نامحسوس شعریت ہے!

ہمارا فرض ہے کہ شاعری کو زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اور زیادہ بلند رتبہ دیں، اب تک ہمارا رویہ اسکے خلاف رہا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ شاعری کو قبول کردہ مقاصد سے رفیع تر مقاصد میں صرف کریں۔ اس طرح آدمی کا یہ خیال روز بروز قوی ہوتا جائیگا کہ زندگی کی ترجمانی کے لئے شاعری کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ اور شاعری ہی سے تسکین اور تقویت حاصل کرنا ہوگی، شاعری کے بغیر سائنس نامکمل نظر آئیگا اور ایک بڑا حصہ ہمارے علم کا جس کو مذہب یا فلسفہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُس کی جگہ شاعری لے لیگی۔ جو دراصل تمام علوم کا نچوڑ بلکہ روح رواں ہے۔

لیکن شاعری کا مقصد جب اتنا بلند رکھا جائیگا۔ تو لازم ہے کہ اُس کا پایہ بھی اتنا ہی بلند ہو۔ تاکہ دونوں کا توازن منزل تک رسائی کا ضامن ہو ہمیں عادت ڈالنا چاہیئے۔ کہ شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کریں اور سختی سے جانچیں۔

نپولین کے سامنے کسی شخص کی بابت کہا گیا کہ "خود فریب" ہے۔ نپولین نے کہا کہ سچ ہے۔ مگر کیا کوئی ایسی جگہ ہے۔ جو خود فریبی سے ناآشنا ہو سینٹ بیو کہتا ہے کہ سیاست اور حکمرانی کی مملکت میں نپولین کا قول درست ہے۔ مگر جہاں تک دنیائے تخیل و صناعت کا دخل ہے۔ خود فریبی ٹکسال باہر ہے اور اضافیت کا یہ قابل ادب جزو دخل فصل سے ہمیشہ محفوظ رہیگا۔ خود فریبی کی سعی ہوتی ہے۔ کہ عمدہ اور حقیر کا امتیاز مٹا دے یا مبہم بنا دے، کیا قوی ہے اور کیا ضعیف یا نیم قوی ہو ایسے امتیازات کا مٹانا یا مبہم بنانا شاعری میں سخت ممنوع ہے۔ کیونکہ جب تک شاعری کے مقاصد بلند ہیں۔ ایسے امتیازات اہم اور ضروری ہیں۔ شاعری بحیثیت تنقید کے اُن شرائط کے تابع ہو جو اس قسم کی تنقید کے لئے شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین نے وضع کئے ہیں۔ اعتدال و ناز کے ساتھ ساتھ وہ ادا و انداز تسکین بخشے گی جس کی ہمسری میں دوسری قوتیں عاجز ہوں گی۔ اور یہ تسکین و طمانیت اتنی ہی قوی ہوگی جتنی شاعری میں تنقید حیات کی صلاحیت قوی ہوگی نیز تنقید حیات اتنی ہی موثر ہوگی جتنی شاعری حقیر ہونے کے عوض بلند پایہ ہوگی۔ کمزور یا نیم توانا ہونے کے بجائے توانا ہوگی، کذب یا نیم راستی کے بجلاف راستی پر مبنی ہوگی۔ ہمیں بہترین شاعری کی ضرورت ہے جس میں ہمارے کردار کی تعمیر، ہمیں برقرار رکھنے اور خوش کرنے کی استعداد ہو۔"

آپ نے ملاحظہ کیا۔ کہ تنقید حیات قوانین حسن و صداقت کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ مگر یہ گروہ "ترقی پسند" ادیب شاعری کو زندگی کی گھناؤنی خواہشوں اور ہوس کا بیاں میں آلودہ کرنا اور سیاسی پراپگنڈا کا آلہ بنانا چاہتے ہیں!۔

میتھو آرنلڈ نے بہترین شاعری کی جو معیاری مثالیں پیش کی ہیں۔ اور زور دیا ہے۔ کہ شاعری کو بالعموم ان سے پرکھا جا سکتا ہے۔ اور جن کو سرچشمہ مسرت قرار دیا ہے یہ ہیں!۔

۱۔ مدت ہوئی۔ کہ وہ دھرتی ماتا کے زم کنار میں مصروف راحت ہیں، اپنے ہی پیارے وطن اور اپنے اجداد کے وطن لیکیڈیمن میں (ہیلن اپنے بھائیوں کا ذکر کرتی ہے۔ ہومر)

۲۔ اے نامراد گھوڑو تمہیں ایک فانی بادشاہ پیلوس کے سپرد کیوں کیا؟ بلکن تمہیں بڑھاپا چھو نہیں سکتا اور تم غیر فانی ہو، کیا یہ منشا تھا کہ انسان جو مصیبت سہنے کو پیدا کیا گیا ہے اسکے شریک غم ہو؟ (زیوس بادشاہ پیلیوس کے گھوڑوں کو مخاطب کرتا ہے۔ ہومر)

۳۔ تا، اے بوڑھے شخص ہم نے سنا ہے۔ کہ ایک زمانہ ایسا تھا۔ جب تو بھی شاد کام تھا۔ (ایکلیز پرائم سے کہتا ہے جس وقت وہ ایکلیز کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔ ہومر)

۴۔ میں نہیں رویا اور اندر ہی اندر پتھر کا ہو گیا . . . . وہ روئے! (ڈانٹے)

۵۔ اپنی رحمت سے خدا نے مجھ کو ایسا خلق دیا ہے۔ کہ مجھ پر مصیبت کا اثر نہیں ہوتا اور اس آگ (دوزخ) کے شعلے مجھے گزند نہیں پہنچا سکتے (ڈانٹے)۔

۶۔ خدا کی مرضی میں ہمارا امن ہے۔ (ڈانٹے)

۷۔ کیا تو اس بلند اور گھمنی پیدا کرنے والے بادباں پر جہاز راں لڑکے کی آنکھوں پر مہر لگا دے گی۔ اور اسکے دماغ کو وحشی اور جابر موجوں کے گہوارے میں لوریاں دے گی؟ (ہنری چہارم نیند کی خوشامد کر رہا ہے (شیکسپیئر)

۸۔ اگر کبھی تیرے دل میں میری جگہ تھی۔ تو تھوڑی دیر کو آرام کی معیت چھوڑ دے۔ اور اس بے رحم دنیا میں اوپر کی سانسیں ملے کر میری کہانی سنا (ہیملٹ۔ شیکسپیئر)

۹۔ اس تاریکی میں بھی معلم الملکوت (شیطان)، اُن سب سے بلند و تابناک تھا، لیکن اُس کے چہرے پر بجلیوں نے گہرے نشان نالیوں (جھریوں) کی شکل میں چھوڑے تھے اور اندوہ اُسکے رخسار پر متمکن تھا (ملٹن)

۱۰۔ ہمت جو فرمانبرداری یا مغلوب ہونے کو ٹھکرا دے اور باقی جو کچھ ہے۔ اُس پر فتح نہ حاصل کرے (ملٹن)

۱۱۔ وہ نقصان جس نے کیمبریز کو دنیا بھر کی خاک چھاننے کی زحمت گوارا کرنے پر مجبور کیا۔

اسکے بعد میتھو آرنلڈ ارسطو کا قول نقل کرتا ہے۔ کہ شاعری میں اعلیٰ درجہ کی صداقت اور متانت ہونا چاہیئے۔

ان مثالوں اور اقوال کی روشنی میں "ترقی پسند" ادیبوں کی نظمیں پڑھی جائیں۔ تو ان باتوں کا شائبہ بھی نہ ملیگا۔ ان میں انقلاب اور خونریزی کی تعلیم اور ترغیب کے سوا کچھ نہیں، وہ بھی بھونڈے الفاظ میں، اور یہ باتیں ایسی ہیں جن کو شاعری کے بلند اور مقدس مقاصد سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ اُن میں اُس اعلیٰ صداقت کا نام نہیں جو سطحی نگاہوں سے مخفی ہو اور جس کا انکشاف شاعری کا فرض اولین ہے۔ متانت کا ذکر ہی بیکار ہے۔ اُس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ تاہم یہ لوگ میتھو آرنلڈ کے قول کو اپنا دستور العمل بنانے کے مدعی ہیں اور کتابیں کی کتابیں اور مضمون پر مضمون اپنی بیباک گمراہی کی تائید میں لکھ مارے ہیں! ان اسپرٹ ملتی ہے۔ کہ ہماری شاعری حیات کی سچی تنقید اور ترجمانی ہے۔ جس نے شاعری کو خیالی پلاؤ پکانے کے بجائے حقائق حیات سے قریب تر کر دیا ہے۔ اگر حیات کا مفہوم میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں حقیقی حسن و صداقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ تو ان لوگوں نے "اس شاہد معنی" کا ایک جلوہ بھی آشکار نہیں کیا۔ اگر شاعری کا فرض وہ عظیم الشان اصول منضبط کرنا ہے جو انسان کو ایسا سکون و اطمینان و انبساط بخشیں جس کی تکمیل کو مذہب اور سائنس ناکافی ہیں۔ جو مذہب کی آنکھوں کا نور اور سائنس کے رخسار کا غازہ ہیں تو اس سلسلے میں "نیا ادب" اور اس کی شاعری کا نام لینا بھی ادب اور شاعری کی توہین ہے۔

ایک جگہ میتھو آرنلڈ نے اصلی اور مصنوعی شاعری کا فرق بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ ایک کی نشو و نما ذہن اور دماغ میں ہوتی ہے۔ اور دوسری روح کی گہرائیوں میں تربیت پاتی ہے۔ مصنوعی شاعری میں فکر کا کوئی مستقر نہیں ہوتا۔ اور شعر کے الفاظ محض چند نقوش پیش کر دیتے ہیں جو نثر کی عام زبان بھی کر سکتی ہے۔ مگر یا تخیل سے پر وہ پوش چند خوش آئند نقش ہوتے ہیں۔ جن میں کچھ لمحوں کے لئے آدمی ایک قسم کی دلکشی محسوس کرتا ہے۔ لیکن ایسی شاعری ہمیں واقعات کی سطح سے بہت نیچے نہیں لے جاتی اس سے ہمارا وہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ اشیا اپنے حقیقی حسن میں جلوہ گر ہوں۔ اصلی شاعری کا ارتقا ایسا ہے۔ گویا کوئی شئی شاعر کی روح میں ڈوب کر ہیجان برپا کرتی ہے۔ اور آخر کار سیراب و سرشار ہو کر اپنی فطری اور در خور قبول رعنائیوں کے ساتھ منصۂ شہود پر آتی ہے۔ یہ ارتقا مصنوعی صنعت گری سے زیادہ روشن اور زیادہ تسکین دہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی زبان بھی سادہ سلیس ہوتی ہے۔ لیکن یہ سعادت صرف اُن لوگوں کا حصہ ہے۔ جو زندگی کے سرچشمے سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ اور سطحی موجوں سے نہیں کھیلتے۔

اس اصول کی روشنی میں بھی ترقی پسند ادب اور اس کی شاعری پرچھائیں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے تخیل کا افلاس اپنا آپ سوگوار ہے۔ ان کی شاعری "مزدور" اور "انقلاب" کے صفحوں میں پڑ کر ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اور بس اس کے سوا ان کی شاعری میں نہ تو جدت ہے نہ ترقی کے آثار

ایک دوسری جگہ میتھو آرنلڈ کہتا ہے کہ

شرافت پر مبنی گہرے خیالات کو زندگی کے مطابق کرنا شاعرانہ عظمت کا ضروری جزو ہے۔ بڑے شاعر کی برتری اسی میں ہے۔ کہ اُن شرائط کے ماتحت جو شاعرانہ حسن اور شاعرانہ صداقت کے قوانین اُس پر عائد کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کو زندگی سے ہمنوا کرے۔ موضوع شاعری خواہ انسان ہو خواہ فطرت، خواہ حیات انسانی، شاعر اپنے وضع کردہ خیالات سے اُن کی ترجمانی کرے۔ ان خیالات میں شرافت و متانت ہونا لازمی ہے

ہمیں یہ امر کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ کہ شاعری فی نفسہٖ تنقیدِ حیات ہے۔ اور ایک شاعر کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ قوت اور حسن کے ساتھ حیات پر اپنے خیالات کی روشنی ڈالتا ہے۔ اور اس سوال کو حل کرنا چاہتا ہے۔ کہ ہمیں کس طرح جینا چاہیئے۔ ہم اخلاقیات کا مفہوم اکثر غلط سمجھ اور اس کا دائرہ محدود کر دیتے ہیں۔ اور اخلاقیات کو کسی نظامِ خیال یا عقیدہ سے جن کا عہدِ حکمرانی گزر چکا۔ مگر جو چند پیشہ ور نقادوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ وابستہ کر دیتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم اُن کو سنتے سنتے اکتا جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ ہمیں ایسی شاعری سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جس میں اخلاقیات سے کھلی بغاوت ہے۔ یا ایسی شاعری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جو اخلاقیات سے بے پرواہ ہے۔ اور جس کا موضوع گو غیر متعین ہے۔ مگر طرزِ ادا میں ندرت پیدا کی گئی ہے۔ دونوں صورتوں میں ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ اُس عظیم و نامحدود معنی رکھنے والے لفظ "حیات" پر زیادہ غور کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ اُس کے مفہوم پر کامل عبور حاصل ہو جائے۔ جو شاعری اخلاقیات سے بغاوت کرتی ہے۔ وہ زندگی سے بغاوت کرتی ہے۔ جو شاعری اخلاقیات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ وہ حیات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

ایکٹس نے کیا عمدہ تمثیل اُن چیزوں کی پیش کی ہے۔ جن کا تعلق محض حیات سے ہے۔ یا جن میں لفظی یا ظاہری خوش اسلوبی و صناعت ہے یا جن کو دلکش بنانے میں ذہانت سے کام لیا گیا ہے۔ بعد ازاں اُن کا موازنہ اُس بہترین اور فائق تر چیز سے کیا ہے جس سے ہمارا اکبر تعلق ہے یعنی کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ بعض لوگ ایسی چیزوں سے جن کا رشتہ حیات سے وابستہ ہے۔ ڈرتے ہیں یا ناپسند کرتے ہیں یا قدر و قیمت گھٹا دیتے ہیں یہ لوگ صرف غلطی پر نہیں۔ بلکہ ناشکر گزار یا بزدل ہیں۔ لیکن یہ بھی امکان ہے۔ کہ ایسی چیزوں کی قیمت بے جا طور پر بڑھا دی جائے۔ اور انہیں کو حاصلِ حیات سمجھ لیا جائے۔ حالانکہ وہ حاصلِ حیات نہیں۔ بلکہ حیات سے اُن کا وہی تعلق ہے۔ جو گھر اور سرائے میں ہوتا ہے۔ گویا ایک شخص جو سفر سے گھر کا عازم ہے راستے میں ایک عمدہ سرائے دیکھتا اور اُسکو پسند کرتا ہے۔ اور وہیں مستقل قیام کی ٹھان لیتا ہے۔ اے انسان تو اپنا مقصود بھول گیا یہ تیری منزل نہ تھی۔ بلکہ اس سے ہو کر تھی، بیشک یہ سرائے دلکش ہے؟ اسی طرح اور سرائیں اور مرغزار بھی دلکش ہیں۔ لیکن صرف رہگذر کی حیثیت سے۔ تمہارا ایک خاص مقصد ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ گھر پہنچ جاؤ اور اپنے خاندان، اپنے دوستوں اور ہم وطنوں کے ساتھ جو تمہارے فرائض ہیں ادا کرو۔ اندرونی آزادی، تمکین، خوشدلی اور رضامندی حاصل کرو۔ انداز بیان تمہیں اپنی طرف کھینچتا ہے، دلائل اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ اور تم اپنے گھر کو بھول جاتے ہو اور ظاہری رعنائیوں میں الجھ کر وہیں اپنا مسکن بنانا اور وہیں رہ جانا چاہتے ہو۔ تمہارا عذر صرف اس قدر ہے کہ وہ دلکش ہیں۔ کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ وہ دلکش ہیں؟ لیکن محض رہگذر یا سرائے کی طرح! جب میں ایسا کہتا ہوں تو الزام دیتے ہیں کہ میں اسلوب بیان اور استدلال کا دشمن ہوں۔ اور اُن سے بے پروائی برتنے کی تعلیم دیتا ہوں۔ میں ایسا نہیں کرتا۔ میں تو اُن میں کھو جانے اُنہیں کا ہو رہنے کے خلاف تنبیہ کرتا ہوں۔ کہ حاصل سے بے خبر ہو گئے جس کی سرحد اور آگے ہے۔

چند بلند مرتبت شاعروں کو مستثنیٰ کر کے جن کی شاعری میں تنقیدِ حیات، شاعرانہ صداقت اور حسن سے شیر و شکر ہو گئی ہے۔ باقی شاعروں کے کلام میں محاسن و معائب کا موازنہ اور یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ کہ محاسن کا پلہ بھاری ہے یا معائب کا۔ میتھو آرنلڈ مزید وضاحت کرتا اور کہتا ہے کہ یہ قول مجھ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کہ میں شاعری کو تنقیدِ حیات کہہ کر شاعری کو نثر سے ممیز کرتا ہوں، گویا نثر میں تنقیدِ حیات نہیں ہو سکتی۔ میتھو آرنلڈ

کا جواب ہے۔ کہ میں نے یہ جملہ یعنی تنقید حیات بہت برس ادھر استعمال کیا تھا۔ اور عام ادب کے متعلق استعمال کیا تھا، شاعری کی تخصیص نہیں کی تھی، جو یہ الفاظ تھے۔ ہر ادب کا منشائے آخر اگر غور کیا جائے تو تنقید حیات کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن شاعری میں تنقید حیات۔ شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے اصول کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یعنی اصل مضمون اور طرز ادا میں سچائی اور متانت ہو۔ اظہار خیال مناسب الفاظ اور مکمل خوش سلوبی کے ساتھ ہو یہی خوبیاں ہیں۔ جو بہترین شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اور انہیں سے میرا مدعا ایسی تنقید حیات ہے۔ جو شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کے پہلو بہ پہلو ہوں۔ لیکن گنتی کے ایسے شاعروں سے قطع نظر جو "کلاسک" ہیں اُن سے کم پایہ شاعروں میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مکمل راستی و متانت اور مکمل صدق شگفتہ انداز بیان کے شمول میں ہر جگہ نظر نہیں آتے۔ لہٰذا اس کی ضرورت ہے۔ کہ اُن کے کلام سے عمدہ نمونے منتخب کر لئے جائیں۔ اور اُن کے کلام کا بعض حصہ قبول اور بعض حصہ رد کر دیا جائے۔ اور اس عملِ رد و قبول کے بعد اُن کے کلام پر رائے زنی کرنا اور ایک شاعر کا دوسرے شاعر سے موازنہ کیا جائے۔

میتھو آرنلڈ کے معقولات ختم ہوئے۔ اُسکے برعکس ہمارا یہ حال ہے۔ کہ ہر شاعر کو جو کنجشک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شاہین یا عقاب سمجھ کر بشرطیکہ مزدور اور انقلاب کا راگ الاپے "ادب برائے زندگی" کا نمائندہ اور ناقد حیات قرار دیتے ہیں۔ اور اُن قیود سے قطعاً چشم پوشی کرتے ہیں کہ شاعری میں تنقید حیات شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کی پابند ہے۔ نظر حیات اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہونا چاہیئے سیاسی معتقدات کو نظم کر دیا اور اُن امور کو جو سطحی اور بیش پا افتادہ ہیں۔ اور نظم کی بہ نسبت نثر میں ہزار درجہ بہتر اور قوی تر الفاظ میں بیان ہو چکے ہیں۔ بحر و اوزان میں لے آنا نہ تو شاعری ہے۔ اور نہ تنقید حیات ہے۔ میتھو آرنلڈ نے اپنی تصانیف میں متعدد جگہ شاعری کو تنقید حیات کہا ہے۔ مگر ہر جگہ یہ شرط لگا دی ہے۔ کہ تنقید حیات شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے قوانین کے مطابق ہو۔ مگر ہمارے متجدد ادیبوں اور نقادوں نے صرف "تنقید حیات" کو لے لیا۔ باقی اجزا کو جو نہایت اہم تھے۔ چھوڑ دیا اور وہ غالباً اس لئے کہ "ادب برائے زندگی" کا ہیولیٰ طیار کرنے میں مخل اور سخت مخل تھے۔ میں امید کرتا ہوں۔ کہ خود میتھو آرنلڈ کے معقولات سے ثابت ہو گیا۔ کہ تنقید حیات کا وہ مفہوم ہی نہیں۔ جو "ترقی پسند" ادیب اُسکے سر تھوپتے ہیں۔ "ادب برائے زندگی" کا پشت پناہ یہی فقرہ "تنقید حیات" تھا۔ جب اس کا مفہوم ان لوگوں کے مفروضہ مفہوم سے الگ ہو گیا تو "ادب برائے زندگی" کی پوری عمارت ڈھے گئی۔ اور اب کوئی نئی تعریف گڑھنا ہو گی۔

ایک دوسرے زاویہ سے اس مسئلے پر غور کیجئے۔ روس میں شاعروں اور ادیبوں کو مجبور کیا جاتا ہے۔ کہ خیالی دنیا میں بسر نہ کرو۔ بلکہ میدان عمل میں کود کر حق و انصاف کی حمایت اور جور و استبداد کی مخالفت پر کمر بستہ رہو۔ ہندوستان میں ادب برائے زندگی کے علمبردار صرف قلم سے ہنگامہ کارزار گرم کرتے اور مارتے مرتے ہیں۔ تاہم ادب برائے ادب کو نام رکھتے ہیں۔ مجھے تو چنداں فرق نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اگر ایک میں معشوق کی پلکیں صف آرا ہو کر بیچارے عاشق پر تیر باراں کرتی تھیں۔ تو "ادب برائے زندگی" میں یہ خیالی جانباز مفروضی آلات حرب کا نشانہ ہیں۔ حملے دونوں میں صرف ہوائی ہیں۔"

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ادب کا فرضِ اولین یہ ہے۔ کہ ادب کا فرضِ اولین یہ ہے کہ وہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ، نسل اور طبقہ، مذہب کی تفریق مٹا دے اور اُس جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو۔ ایسی جماعت کو شاعری کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ یہ حیوانہ زندگی کی طرف بازگشت ہے جس میں فنونِ لطیفہ کا خیال بھی تمام تر لغو ہے۔ کیا اچھا طریقہ آزادی کی نشوونما و استبداد کو کچلنے کا نکالا ہے! پھر فرماتے ہیں کہ ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بیچارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے۔ اب اسے اس جذبۂ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہیئے کہ زندگی ابدالآباد تک ہے اور انسان اس کا کارسازِ حقیقی ہے۔ قیامت کے یہ معنی ہیں کہ روح الاجتماع اور محشر کا استبداد کو ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کر دے۔ اور پھر اسی زمین پر ایک ایسی بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی، جسمانی اور روحانی ترقیوں کی بلندیوں تک پہنچے۔

ان لوگوں کی غلامانہ ذہنیت اور ہرزہ سرائی کا یہ عالم ہے۔ کہ ایک طرف تو دہریت اور الحاد کی تعلیم دیتے ہیں مذہب، امتیازِ نسل وغیرہ کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اور دوسری طرف ازل و ابد، قیامت، دوزخ، روح، بہشت اور مماثل تصورات پر جو مذہب اور تہذیب سے مستعار ہیں۔ صورت بدل کر عقیدہ رکھتے ہیں۔ پھر اس عظیم الشان تکمیل کو شاعر کے فرمودات کا محتاج قرار دیتے ہیں۔ جس کا نعرۂ جنگ "ادب برائے زندگی" ہے! شاعر نے اور اس کے ہمنوا انسانوں نے کہا کہ "ہم زندگی کے کارساز حقیقی ہیں" اور ہو گئے! ایک چیخ اٹھا کر میں نے استبداد کو کچل دیا۔ اور وہ کچل گیا! "اے بہشت [illegible] اتر آ" اور وہ اتر آئی! یہ تو بہت سہل نسخہ ہے۔ وہ بھی صرف "ادب برائے زندگی" کے زور پر یا کسان کے بل بوتے پر کہ وہ آپ کا آلۂ کار بنے۔ قتل و غارت کرے، اور عنانِ حکومت آپ کے دستِ مبارک میں دیدے کہ لو بھائی اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ غرضیکہ ادب برائے زندگی ہر مرض کی دوا ہے وار خالی بھی گیا تو کوئی مضائقہ نہیں، ساری بلا کسان کے سر گئی۔ اور آپ نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔ "ادب برائے زندگی" کا فارمولا بیکار ثابت ہوا تو "ادب برائے بیکاری" یا اسی قسم کی اور کوئی ہانک لگانا شروع کر دی۔

جذبی کا جب یہ شعر پڑھتا ہوں اور کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا ہے ؎

جب کشتی ثابت و سالم تھی۔ ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے۔

نئے ادب کا پورا دھواں دھار اور شعلہ بار سانپ کی پھنکاریں لینے والا تبلیغی لٹریچر اس ایک شعر پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے زندگی کی صحیح تنقید اور ترجمانی اور اگر اسی کا نام ترقی پسند ادب ہے تو سر آنکھوں پر۔

اشتراکی شاعری کے ریگستان میں سجاد ظہیر کا شعور بھولے بھٹکوں کے لئے خضرِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر سنتا کون ہے۔ منزل دشوار گزار ہے۔ جس پر گامزن ہونے کو عزم و ہمت و استقلال کی ضرورت ہے۔ اور یہی اوصاف عنقا ہیں (دیکھو صفحہ ۵۴ نیا ادب، خاص نمبر)

اچھے شاعر ہر عہد میں اِکّا دُکّا ہوتے ہیں، معمولی شاعر خصوصاً پر آشوب زمانے میں، اس طرح نکل پڑتے ہیں۔ گویا روح بربادی، معاشی غربت اور لاؤ لشکر کی مجسم ہو گئی۔ ان کی سعی ہوتی ہے۔ کہ صدیوں کی اندوختہ حکمت کو ملیامیٹ کر دیں۔ اور اس کی جگہ دقیق توہمات کا علم بلند کر کے جس طرح ہوا بادلوں کو

کو تخریب کرتی یا اُن کو منقلب کر دیتی ہے۔ بادشاہوں کے تخت اور سلطنتوں کا تختہ الٹ دیں۔ بعض اچھے شاعر اور مفکر بھی اس لپیٹ میں آجاتے ہیں اور کچھ دیر کے لئے انہیں کی سی کہنے لگتے ہیں۔ انگلستان کا ایک شاعر جو بعد کو شہرۂ آفاق ہوا عنفوانِ شباب میں جب انقلاب فرانس سے متاثر تھا۔ تو یوں ڈینگیں مارتا تھا

"قدیم چیزیں بوسیدہ ہو گئیں،
"اچھی چیزوں میں کوئی شے کافی اچھی نہیں،
"ہم ثابت کر دینگے کہ دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں،
"اس دنیا میں بھی بادشاہ ہونگے، لیکن وہ زندگی اور موت کی نشانیاں ہمارے ہاتھ سے لینگے،
"سلطنتیں بادلوں کی طرح چلا بلتی رہینگی گویا میری سانس کی تابع حکم ہیں"

یہی "ادب برائے زندگی" کا نعرہ ہے۔ سو برس سے زیادہ کے گڑے ہوئے مُردے آج اکھڑے جا رہے ہیں۔ اور یہ کوہ کنی مایہ ناز سمجھی جاتی ہے! ہم کو کہنا یہ تھا کہ معمولی اور وقتی شاعروں میں جو مستقل قدروں سے ناواقف ہیں۔ جو طرح طرح کے پن کا سبب تلاش کرنے کو دور جانے کی ضرورت نہیں ایسے شاعر اُن خواہشوں کے غلام ہوتے ہیں جو اُن کے دسترس سے باہر ہیں۔ اور جن کے حصول میں ناکام رہنے پر اپنے دل کا بخار یا غبار اس شاعری میں نکالتے ہیں یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ کہ عامۃ الناس بغیر جانچے ہوئے ایسی دل خوش کن شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں، حیرت تو یہ ہے۔ کہ بعض وہ اشخاص بھی جن کی لیاقت مسلم ہے۔ اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی اتفاقی حادثہ یا بحث اُن کو چونکا کر ایسی شاعری کی خامیوں اور خام کاری سے آگاہ کر دیتی ہے دیکھا گیا ہے۔ کہ وہ لوگ جو نہ صرف ذہنی شاعری بلکہ اکتسابی علوم سے بھی بے بہرہ ہیں، وہ بر خود غلط افراد جو معمولی معمولی صنعت اور پیشہ وری میں بھی نکمے ثابت ہوتے جاتے ہیں مدعی بھی ہیں۔ جتنے جاہل اور بے حس ہیں۔ جو کبھی کاہلی اور سفاہت کی بنا پر شُدبُد کر لیتے تھے، بغض و حسد و کینہ کے زیر اثر شاعر بن بیٹھے۔ اور اچھے اچھے شاعروں کے منہ آنے لگے اور بعض اوقات کتب فروشوں کی سازش سے تجارتی فائدہ بھی اٹھانے لگے، عوام میں عارضی شہرت بھی پیدا کر لی کیونکہ خوشامد کا وہ زبردست طریقہ اختیار کیا۔ جس کا جادو کبھی پھیکا نہیں پڑتا۔ یعنی انسان کے جذبات بد یعنی فتنہ و شر کو مشتعل کرنا۔

ان سے کوئی پوچھے۔ کہ صرف دولت ہی کیا وہ جنس ہے۔ جو ذہن انسانی کی جولانگاہ بن سکتی ہے؟ کیا حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے اور واقعات اور فرقہ وارانہ کشمکش میں جہاں قومیت کا خواب محتاج تعبیر ہے۔ اشتراکی اصول کی ترویج خیالی پلاؤ پکانے یا بھنگ گھوٹنے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے؟

ان کے مفروضات کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے۔ تو کیا شاعری دولت کے شاعرانہ کارنامے نہیں ہیں۔ اور مزدور کا انعام خود وہ محنت نہیں ہے جس کی وجہ سے اُسکو سراہا جاتا ہے؟ یا اسی کے علی الرغم سرمایہ دار انہیں برائیوں کی بدولت جو اُس سے منسوب کی جاتی ہیں مفلس اور قابل رحم نہیں؟ تاہم ایک تو موت کا مستحق اور دوسرا صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے قابل! کیا زندگی کا مفہوم اس قدر تنگ ہے؟ اگر "ادب برائے زندگی" کی یہی بساط اور اسکے تخیل کی پرواز یہیں تک ہے۔ تو ایسے ادب اور اُسکے حامیوں پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ اگر شاعری نفس انسانی کی گہرائیوں اور حیات کائنات کا مستقل اور دلکش مرقع ہے۔ تو یہ ترقی پسند اور بیبا شاعر ایسے ہیں جو پہاڑ کی بلندیوں پر شعر و ادب کا درخشاں معبد تعمیر کرنے کے بجائے دامن کوہ کے دھندلے آثر

پر نقش و نگار بنا رہے ہیں۔ جسے ہوا کا ایک جھونکا اڑا کر لے جائیگا۔

میرے محترم دوست پنڈت امرناتھ جھا، وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کے الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ایک ذی اثر طبقہ مفکرین ہے جس کا خیال ہے کہ ایسی چیز یا بھی موجود ہے جس کو کہ
"ترقی پسند ادب" کہتے ہیں۔ "ادب جدید" کا ہمیں علم ہے ہر زمانے میں طرز نو سے اس کی تخلیق
ہوتی رہی ہے اور ہر دور اپنے سے ماسبق دور کو رجعت پسند کہتا ہے مگر ترقی پسند ادب کا تو
یہ مفہوم متعین کیا جاتا ہے کہ ادب کو سیاسیات و معاشیات کے ایک خاص مرکز کے
پروپیگنڈہ کا آلہ بنایا جائے۔ اگر ادب میں ترقی کا منشا انداز بیان میں جدت آفرینی ہے
نئے سروں یا نغمگیوں کی تلاش یا ایجاد ہے، نئے شاعرانہ تناسبات و لوازم کا دریافت
کرنا ہے تو البتہ اس فقرے کے کچھ معنی اور اس میں کچھ معقولیت ہو سکتی ہے۔ ورنہ مہمل ہے۔
موضوعات ادب نئے نہیں ہو سکتے، زیادہ سے زیادہ اہمیت کا مرکز ثقل بدل جائیگا یا احساس
قدر و قیمت میں تغیر ہوتا ہوگا یا نقطہ نظر مختلف ہو جائیگا۔ ترقی پر جبر، استعداد عمل و کثرت
کا اقتباس، بھوک، گندگی، مادہ پرست لیڈروں کی قصیدہ خوانی یہ باتیں بھی نئی نہیں ہیں۔ مکروہ جنسیت
کی پوجا بھی نئی نہیں، تعطل اور ناکامی کا احساس خیلے برتنے پر عہد حاضر فلسفے میں جدید
الواب اضافہ کرنے کا مدعی ہے۔ وہ بھی نئے نہیں، اجتناب تمنائیں، جد و جہد، دعوت عمل
ہمت و جرأت، ناقابل اطمینان و ارزاں عمری نظام اشیا سے دل برداشتگی، کوئی عہد
ایسا نہیں گزرا ہے جب ادیبوں نے اُن کی طرف توجہ نہ کی ہو جس بات میں تغیر ہوا ہے وہ ہر دور
ملک میں ناگزیر ہے۔ جہاں انفرادیت کو کچلا نہیں جاتا اور جہاں لٹے، نظریہ اور طبائع
کو حکومت ایک خاص ٹھپے پر نہیں لگاتی۔ وہ خود صناع یا ادیب کا نقطہ نظر ہے، خود
اُس کا فلسفہ ہے، باقی رسمی پینترے ہیں"

نوٹ:- اس مضمون کو "نیا ادب کدھر جا رہا ہے" کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اُن مباحث کا اعادہ نہ ہو جو نئے یا نام نہاد ترقی پسند ادب" کے خلاف پہلے مضمون میں درج ہو چکے ہیں۔ اعتراض "جدید ادب" کی تشکیل اور اسکے تبلیغی انداز پر ہے۔ یہ ادعا نہیں ہے کہ سماج کا موجودہ نظام مکمل اور بے عیب ہے۔ اور اصلاح کا محتاج نہیں۔ ایسا اعلان اور اعتراف پہلے مضمون میں بھی کیا جا چکا ہے۔ اثر

جوشؔ ملیح آبادی

زُلفیں

بدلی سے ہوا جھگڑ رہی ہے گویا
بادل کی پری بگڑ رہی ہے گویا
جنبش میں ہیں صبا سے زلفیں تیری
تاریک پھوہار پڑ رہی ہے گویا!

یہ سلسلۂ لامتناہی ہے کہ زُلف!
گہوارۂ بادِ صُبح گاہی ہے کہ زُلف
اے مستِ شباب دوشِ سیمیں پہ ترے
ڈھلکی ہوئی رات کی سیاہی ہے کہ زُلف

اللہ ری یہ زُلف مری مستِ شباب
ہر حلقۂ شب رنگ ہے گویا گرداب
یا آتشِ رُخ کا ہے یہ دُود پیچاں!
یا رندِ سیہ مست کا اُلجھا ہوا خواب

راج بلدیو راج

غزل

عشق کے یہ بے صبر تقاضے حُسن کے یہ کمزور بہانے
ان میں سکونِ رُوح کہاں ہے، یہ بھی فسانے، وہ بھی فسانے

اُف رے مقدر تیرے کرشمے، ہائے محبت تیرے زمانے
دِل کی دُھڑکن، اشکوں کی رَوانی، کوئی نہ سمجھے کوئی نہ جانے

حُسن ہی تنہا حُسن نہیں ہے، عشق کا بھی اک عہدِ حسین ہو
اب آگے تقدیر کی باتیں سمجھے نہ سمجھے جانے نہ جانے

زُعمِ خدائی توبہ توبہ، عجزِ محبت اللہ اللہ
عشق کی ضد بھی عشق کی ضد تھی، وہ تو مُصر تھے ہم ہی نہ مانے

عشق بھی تنہا حُسن بھی تنہا، غافل غافل، کھوئے کھوئے
کون وفا کا سونا پرکھے، کون جفا کا رُتبہ جانے

رات کا دم جب ٹوٹ رہا تھا سب کی نگاہیں سُوئے فلک تھیں
ہم نے یہ اپنی آنکھ سے دیکھا شمع بنے جل کر پروانے

حُسن کا چہرہ اُترا اُترا، عشق کی آنکھیں پھیکی پھیکی
بدرنگی سی بدرنگی ہے، لوگ نئے ایمان پُرانے

غم میں زباں بھی سِل جاتی تھی، اشک بھی اُلٹے پھر جاتے تھے
لیکن اے دل بات تو جب ہے عشق کو خود حُسن آئے منانے

حُسن کی دنیا حیراں حیراں، عشق کا چہرہ شاداں شاداں
جانے کیا کچھ کہہ دیتا ہے، راجؔ کی باتیں راجؔ ہی جانے

علی عباس حسینی

قاعدہ

حکیم صاحب شہر کے مشہور طبیبوں میں تھے۔ بڑے حاذق، بڑے جہاندیدہ اور بہت کچھ دنیا کا سرد و گرم دیکھے ہوئے۔ طبابت آبائی پیشہ تھا۔ بزرگوں کے مجربات نوک زبان تھے اور اپنا ذاتی دواخانہ تھا۔ گھر کے خوشحال بھی تھے۔ پیشے کی آمدنی بھی اچھی تھی۔ اس لئے حج بھی کر آئے تھے اور قومی لیڈر بھی بن گئے تھے۔ اچھا خاصا جسم تھا، اور بڑی چھتنار ڈاڑھی۔ آواز میں گرج تھی اور آنکھوں میں چمک۔ ان تمام باتوں نے مل جل کر لوگوں کے دلوں میں خاصا رعب بٹھا رکھا تھا۔

ایسے ویسے لوگ ان کے مطب میں جاتے ڈرتے تھے۔ مطب نہیں معلوم ہوتا تھا کسی رئیس کا دربار جان پڑتا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں بیچ والی دیوار سے لگا ہوا تختوں کا چوکا تھا۔ اس پر سپید چاندنی کا فرش لگا تھا۔ اس پر حکیم صاحب کی خاص نشست کے لئے ایک اونی قالین بچھا تھا۔ اس پر دیوار سے متصل ایک گاؤ رکھی تھا۔ حکیم صاحب جس وقت اس گاؤ پر ٹیک لگا کر اپنے پنجہ سے اپنی سیاہ ڈاڑھی میں کنگھا کرتے تو بالکل یہ معلوم ہوتا کہ امیر دوست محمد اپنی مسند پر بیٹھا ہے۔

حکیم صاحب کے سامنے ایک سہارنپوری صندوقی رکھا رہتا تھا۔ اور ایک چمکتا ہوا پیتل کا چوڑے پیندے والا بڑا سا اگالدان۔ اس کی بغل میں ایک چاندی کا خاص دان رہتا تھا۔ اس سے ذرا دور پر ایک الومنیم کی پلیٹ میں ایک گنگاجمنی فرشی ہوتی تھی۔ جس پر رکھی ہوئی پیچوان کی چاندی کی منہال حکیم صاحب کے یا تو منہ میں دبی ہوئی تھی یا سامنے قالین پر پڑی رہتی تھی۔

قالین کی بغل میں دونوں جانب جو جگہ فرش پر بچی تھی اس پر حکیم صاحب کے دو دو تین تین شاگرد بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے سامنے کاغذوں کی گدیاں ہوتی تھیں اور ایک ایک قلمدان۔ چوکے کے سامنے ایک نیم دائرے میں بیس کرسیاں رکھی تھیں۔ ان پر نمبر پڑے تھے مریضوں کے لئے حکم تھا کہ وہ جس نمبر سے آئیں اسی نمبر سے کرسی پر بیٹھیں۔ جب نمبر ایک کا مریض اپنے کو دکھا چکے تو نمبر دو کا مریض اس کی جگہ لے اور اسی طرح نمبر ۲۰ تک سبکو ایک ایک کر کے ترقی ملتی رہے یعنی اگر شامت اعمال سے آپ نے کہیں دیر کی اور آپکو کرسی نمبر ۲۰ ملی تو آپ کو انیس بار اٹھنا اور بیس کرسیوں پر بیٹھنا پڑیگا۔

یہ حکیم صاحب کا قاعدہ تھا اور اس دربار نما مطب کا اٹل قانون۔ اس میں تغیر و تبدل کا امکان نہ تھا۔ البتہ احباب خاص کے لئے اپنی پارٹی کے لیڈروں کے لئے کبھی کبھی اور موٹی اسامیوں کے لئے ہمیشہ اس قاعدے میں لچک پیدا ہو جاتی تھی۔ سو اصول کے لئے استثنا،

ضروری ہے اور صاحبانِ ثروت و دولت ہر معاملے میں اور مقام پر مستثنیات کے سرخیل ہوتے ہیں۔ اس لئے حکیم صاحب جتنا اس اصول میں خواص "ذوی الاحترام" کے لئے لوچ پیدا کر کے دب جاتے تھے، اتنا ہی وہ "عوام کالانعام" کے لئے ابھر کر سخت ترین جاتے تھے۔ گویا انکا اصول برف کی سل تھا کہ دو چار قطرے پانی نکل جانے سے نہ تو اس کے انجماد میں کمی ہوتی تھی، نہ برودت میں اور نہ خنکی میں۔۔۔ اور وہ یہ سوچ سوچ کے عجیب طرح کی مسرت محسوس کرتے کہ ان کے رعب و داب کی وجہ سے کسی کی مجال نہیں کہ ان کے مقررہ قاعدے کو توڑ سکے۔۔

ایک دن اس مطب میں ایک مزدور گھس آیا۔ غبار آلودہ چہرے سے وحشت عیاں، پھٹے ہوئے کپڑے مفلسی کے گواہ، ہاتھوں پر ایک چھوٹا سا بچہ غرض کی تصدیق کرتا ہوا۔ گھبرایا ہوا اس قدر تھا کہ نہ اس نے یہ دیکھا کہ یہاں مطب کی شان کم اور دربار کی زیادہ ہے، اور نہ اس کی فکر کی کہ اس سے پہلے کے آئے ہوئے بہت سے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ اور نہ اس پر نظر کی کہ کوئی کرسی خالی ہے یا نہیں۔ اتفاقاً کوئی کرسی خالی بھی نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو وہ شاید اس پر بیٹھنے کی ہمت نہ کرتا۔ اس نے عمر میں سوائے ٹاٹ اور گھاس کے کوئی دوسری چیز بیٹھنے کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔ وہ چلا سیدھا حکیم صاحب کی طرف!

وہ تو اپنے بیمار دم توڑتے بچے کو غش کھاتی ہوئی بیوی کی گود سے لیکر مسیحا کے پاس آیا تھا۔ اسے کرسی، قالین اور گدے کہاں سوجھتے تھے مگر دوسرے مریض تو اسے اس بیباکی سے فائدہ اٹھاتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کی ذہنیت تو بالکل ویسی ہی تھی جو عام طور سے ہندوستانی مسافروں کی ریل کے ڈبے میں پہلے پہنچکر اور اچھی نشست حاصل کر کے ہو جاتی ہے۔ وہ اس سے آنے والے کو اس آسانی سے کیسے گھسنے دیتے؟ چنانچہ انہوں نے مزدور کو گھور کے دیکھا۔ ایک صاحب تو بول ہی اٹھے، "ارے کہاں چڑھے چلے آرہے ہو؟ تمہارا نمبر تو سب کے بعد ہے!"

مزدور غریب نمبر کیا جانے۔ وہ تو یہ جانتا تھا کہ آج چار دن سے اس کا ننھا ماندہ ہے۔ بیوی نے پڑوس کی عورتوں سے پوچھ پاچھ کے جو کچھ ہو سکا دوا کی۔ خود مزدور کو چھ بجے صبح کارخانے پہنچنا ہوتا تھا اور چھ بجے شام کو پلٹنا۔ اس وقت سب اسپتال بند ہو جاتے تھے، حکیم جی کا مطب بھی نہیں کھلا ہوتا تھا۔ محلے میں ایک ڈاکٹر شام کو مطب میں بیٹھتے تھے۔ مگر وہ تھے بڑے نامی گرامی۔ اپنے ہاں بھی دیکھنے کے چار روپے لیتے تھے۔ اتنے پیسے مزدور کے پاس کہاں کہ ان کا علاج کر سکے۔ امید بھی تھی کہ ننھا دو تین دن میں لوٹ پوٹ کے اچھا ہی ہو جائے گا۔ آخر مزدور کا بچہ ہے کسی پونجی پتی کا تھوڑے ہے!۔۔۔ لیکن کل رات سے تو ننھے نے ایسی آنکھیں ونکھیں نکالیں اور اس کے گلے سے اس طرح غرغراہٹ کی آواز آنے لگی کہ ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ساری رات اس کے سوکھے ہونٹ ٹھنڈے پانی سے تر کرتا رہا تھا اور کبھی بیوی کلیجہ سے چمٹائے کھڑی رہی تھی۔ کبھی آپ گلے سے لگائے ٹہلا کیا تھا۔ صبح سویرے ہی سے ننھے کا چاند سا چہرہ مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ بیوی نے ایک نظر دیکھتے ہی رونا پیٹنا شروع کر دیا تھا اور اس طرح چھاتی کوٹی تھی کہ سارے میں نیلے نیلے داغ پڑ گئے تھے۔ مزدور نے کارخانے جانے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ میٹ خفا ہو گا، جرمانہ ہو گا، یا کام سے چھوڑا دیا جائے گا۔ اس کے سوچنے کا اس وقت موقع نہ تھا۔ اس وقت تو ننھے کی جان کے لالے

پڑے تھے۔ پھول سا بچہ آسانی سے ہاتھ سے نہیں کھویا جا سکتا تھا۔ حکیم جی کے آنے کے پہلے مطب کے کئی چکر لگا چکا تھا۔ وہ اس وقت محل میں تشریف رکھتے تھے۔ اب بچے کو لیکر آیا ہے تو یہاں دربار لگا ہے۔ قاعدے سے آؤ نمبر سے دکھاؤ۔

اس نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ حکیم صاحب کی طرف بڑھتا گیا۔ اتنا قریب آگیا کہ شاگردوں میں سے ایک نے اپنی جھکی ہوئی گردن پر اُس کے سایہ کا بار محسوس کیا۔ اور اُس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں پر رکھے ہوئے بچے کو ان کی طرف بڑھا کر کہا۔

"حکیم جی ذرا میرے ننھے کو دیکھ لیجئے نہ جانے اس کو تین چار دن سے کیا ہو گیا ہے ——"

شاگرد نے ڈانٹا "تو سر پہ کیوں چڑھے آرہے ہو، ادھر کرسیوں کے پیچھے جا کر کھڑے ہو، نمبر سے دیکھا جائے گا۔"

مزدور پھر بھی نہ مانا، پیاسا جانور بھری بالٹی دیکھ کر منہ ڈالنے سے بڑی مشکل سے روکا جا سکتا ہے۔ وہ گڑگڑا کر بولا "ابھی ذرا آپ ہی دیکھ لیجئے اس کی ماں مری جاتی ہے!"

حکیم صاحب نے نگاہ غلط انداز ڈالی۔ گرج دار آواز میں کہا "کیا بدتمیز آدمی ہے۔ ایک تو دیا گیا کہ نمبر سے دیکھا جائے گا۔ چلو اُدھر جا کر کھڑے ہو!"

مزدور مریض اور شاگرد کے جھڑکنے کو سماعت میں نہیں لایا تھا۔ مگر حکیم جی کے حکم کو ٹالنے کی جرأت اس میں نہ تھی۔ وہ اس وقت مسیحا تھے۔ اس کے ننھے کی زندگی اُن کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کو خفا کرنا ملک الموت کو پیامِ دوستی دینا تھا۔ وہ بھونچال سے لرزاں پتے کی طرح کانپتا کرسیوں کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور حکیم جی کو اس طرح دیکھنے لگا جس طرح بھکاریوں کا گروہ جمعہ کے دن روٹی بانٹنے والے رئیس کے دربان کو دیکھتا ہے۔

حکیم جی نے اس نظر کی پرواہ بھی نہ کی۔ انہوں نے مریض نمبر ایک کی نبض دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ شہر کے مشہور لیڈر عبدالرؤف صاحب آگئے۔ یہ بیرسٹر بھی تھے، ایم ایل اے بھی اور حکیم صاحب کے محسن بھی۔ اکثر بڑے گھرانوں میں انہیں کی سعی سفارش کی بدولت حکیم صاحب کی رسائی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب اُن کو دیکھتے ہی سروقد تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں نے ان کو اپنے میں قالین پر بٹھایا۔ مزاج پرسی پر معلوم ہوا دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اور طبی مشورے کے لئے آئے ہیں۔ حکیم جی نے فوراً نبض دیکھی، حالات پوچھے، شاگردوں کو نسخہ لکھنے کی ہدایت کی اور میونسپلٹی کی سیاسیات کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ حقہ سے تواضع کی اور پان بھی پیش کیا۔ جب نسخہ لکھا گیا تو خود نظرثانی کی اور عطار کو بلا کر تاکید کی کہ فوراً دوا تیار کر کے لائے۔

پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی بہت کچھ کہنا سننا تھا اور اس سے اپنا بھرم بھی تو بڑھتا تھا شہر کے سب سے بڑے لیڈر ہوتے ہوئے بھی بیرسٹر صاحب علاج کرتے تھے حکیم صاحب ہی کا۔ پھر ذرا لوگ یہ بھی تو دیکھیں کہ اتنے بڑے آدمی سے اور حکیم صاحب سے کیسی ہے۔ اور اُن کے مطب کے سامنے تانگے اور یکے ہی نہیں کھڑے رہتے بلکہ موٹر بھی —— وہ خوش تھے

اپنے رئیس مریض سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ پان کھاتے جاتے تھے اور حقہ بیرسٹر صاحب اور اُن کے درمیان دور کر رہا تھا۔

مزدور کا ننھا ہچکیاں سی لینے لگا۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں کھنچنے لگے۔ مزدور نے گھبرا کر اس کی حالت دیکھی اور گڑگڑایا "حکیم جی! حکیم جی! ذرا دیکھ لیجئے! ذرا دیکھئے کیسا کیسا منہ بنا رہا ہے"

حکیم جی نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ بیرسٹر صاحب نے اس پر متعجب نظر ڈالی۔ ہمارے ہوتے ہوئے بھی کوئی حکیم صاحب کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک انسان مریض نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے مزدور سے کہا "آؤ میاں، آؤ، تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ حکیم صاحب ابھی تمہارے بچے کو دیکھ لیں گے!"

مزدور مضطرب و پریشان، خوفزدہ و احسان مند کرسی کے کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں اپنے ننھے کے چہرے پر جمی رہیں۔ حکیم صاحب کی نظر اپنے محسن کے رخسارِ منوّر کا طواف کرتی رہی۔ باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ حقہ کا دور ہوتا رہا اور پان ڈبیہ سے منہ، منہ سے اگالدان میں پہنچتے رہے۔ بارے دوا بھی بن کر آ گئی۔ استعمال و پرہیز کے بارے میں ہدایات بھی دیدیئے گئے۔ بیرسٹر صاحب نے دوا کی قیمت دینا چاہی، حکیم صاحب نے انکار کیا۔ اصرار بڑھا، انکار بڑھا، بڑی رد و کد رہی، حکیم صاحب نے دام نہ لئے اور موٹر تک پہنچانے گئے۔

مزدور نے بچے کا چہرہ اپنے دامن سے چھپا لیا اور حکیم جی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جاتے بڑے لیڈر سے اب بھی باتوں میں محو تھے۔ ہنسے جاتے تھے، بکے جاتے تھے اور بکے جاتے تھے۔ مزدور سوچنے لگا۔ یا اللہ باتوں کی جھڑی کبھی رُکے گی کہ نہیں۔ دو مرتبہ ہاتھ ملا چکے۔ تیسری دفعہ کا پھر؟ ارے لو وہ تو ہاتھ ہی نہیں چھوڑتے! مسکراہٹ ہے، ہنسی ہے، قہقہہ ہے۔ جانو جیسے سونے چاندی کا محل دیدیا ہے۔ بیرسٹر نے اس۔۔۔ کو! بس بکھرے جا رہے ہیں، صدقے ہو رہے ہیں، جان چھڑک رہے ہیں۔ اے اللہ تو میرے بچے پر رحم کیجو! نہیں اس کو کچھ ہو گیا تو اس کی ماں رو رو کے جان ہی دیدے گی! ــــ ارے یہ حکیم تو فورمین سے بھی زیادہ سنگدل جان پڑتا ہے۔ وہ۔۔۔۔ چھٹی مانگنے پر کیسا بولا تھا۔ "او، تمہارا لڑکا بیمار ہے؟ کوئی چھوت کا بیماری تو نہیں!؟" پھر بخار کھانسی کی بیماری سن کر کس بے پروائی سے اس نے کہا تھا "تم لوگوں کا۔۔۔۔ بچہ روز روز بیمار ہوتا ہے! تم لوگ اتنا پیدا ہی کیوں کرتا ہے؟" جیسے یہ بھی اپنے بس کی بات ہے۔ اللہ کی دین ہے۔ وہ جس کو پیسہ نہیں دیتا، بچہ دیتا ہے۔ دیکھو نا، وہ لالہ مراری لال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لکھ پتی ہے، مگر اُس کی بیوی نے ایک چھچھوندر بھی تو نہیں جنا۔ کہاں کہاں یاترا کے لئے نہیں گئی۔ کاشی، ہردوار، پریاگ، گیا اور گنگیشور نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں۔ لاکھوں بالکوں کے چرن چھوئے، ان گنت پنڈتوں کو بھوگ چڑھائے۔ پر ڈھاک کے وہی تین پات، کوئی پھل نہ ملا۔ ہونہہ کیسا بھر منہ۔۔۔۔ کہتا ہے "تم لوگ بچہ بہت پیدا کرتا ہے" جیسے ہم لوگ سو دو سو بچے پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے کتنے ہی ہیں۔ دس برس بیاہ کو ہوئے، تین تو پیدا ہوتے ہی جنت سدھارے۔ اب اس ننھے کو لیکر کل اور چار رہیں۔ اللہ نے روپیہ پیسہ نہیں دیا تو یہی دولت دی۔ اب یہ بھی ان بے ایمانوں کی آنکھ میں کھٹکتی ہے۔ اے اللہ یہ حکیم کبھی بات ختم بھی کر چکے گا کہ نہیں۔ اس کا جی ہی نہیں بھرتا اپنے باپ سے باتیں کرنے سے ــــ یہ میرا ننھا بھی کیسا چپکا پڑا ہے جتنا

بھی غریب کو بڑا صبر دے دیتا ہے۔ ابھی یہی کسی بڑے گھر کا بچہ ہوتا تو ایک چیخ اوپر ہوتی ایک نیچے۔ آسمان زمین ایک کر دیتا اور یہ حکیم بھی اس طرح قاعدہ و قانون میں بند دیکھتا۔ دوڑا دوڑا آتا۔ بیرسٹر کے ہاتھ کی جگہ اسکی نبض پکڑے رہتا۔ لیکن ننھا غریب بچہ ہے نا اس لئے ــــ حکیم بیرسٹر ہاتھ مضبوط تھامے ہے۔ ایسا جان پڑتا ہے جیسے دونوں ــــ کے ہاتھ گوند لگا کے چپکا دیئے گئے ہیں۔ کسی طرح چھڑائے نہیں چھوٹ سکتے۔ جی چاہتا ہے ایک ڈنڈا پیار سید کروں کہ دونوں ہاتھ کلائیوں سے ٹوٹ کے الگ گر پڑیں۔ پھر دیکھنا کیسا مزہ آتا۔ دونوں ...... اس طرح تڑپتے ہوئے جیسے چھپکلی کی کٹی ہوئی دم ــــ پر بتیا میرے ننھے کا علاج کون کرے گا۔ اس کا سہارا تو یہی ...... حکیم ہے ــــ ننھا بھی کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ ذرا سا کسمساتا تک نہیں۔ ہچکیاں بھی بند ہو گئیں اور ہاتھ پاؤں کا کھنچنا بھی رک گیا ــــ

دوسرے مریضوں کی بھنبھناہٹ نے چونکایا۔ وہ بھی کہہ رہے تھے۔ ارے یار دیکھو ہم لوگ کب تک بیٹھے رہیں گے جیسلونا، بیں اور چلیں ــــ

بیرسٹر صاحب موٹر میں بیٹھ گئے۔ حکیم جی نے سلام کیا، دروازہ بند کیا، پھر سلام کیا۔ اور خوش خوش مسکراتے اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے بغیر پانی کے دھوتے ہوئے قالین پر تشریف لائے۔ دوسرے نمبر کے مریض نے امیدوارانہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ شاگردوں سے مڑ کر بولے "بہت ہی عمدہ آدمی ہیں بیرسٹر صاحب"

ان میں سے ایک بولا "جی ہاں کیا کہنا ہے، انکے اخلاق کا"

حکیم صاحب نے خاصدان سے دو گلوریاں نکال کر منہ میں رکھیں، چاندی کی چھوٹی ڈبیا میں سے تھوڑی سی قوام نکال کر کھائی، پھر اگالدان میں تھوک کے کہا: "ہاں صاحب فرشتہ ہیں فرشتہ! اور میرا تو حد سے زیادہ خیال کرتے ہیں۔ بالکل اپنے حقیقی بھائی کی طرح مانتے ہیں ......"

پہلے مریض نے کھانس کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ حکیم صاحب نے ذرا منغض ہو کر ان کو دیکھا، فرمایا: "لائیے صاحب اپنی نبض دکھائیے" خیر اب کام شروع ہوا۔ مرض پوچھے جانے لگے۔ قارورہ معائنہ کیا جانے لگا۔ نبض ٹٹولی جانے لگی۔ نسخے لکھے جانے لگے۔ مجمع چھٹنے لگا۔ مزدور کئی مرتبہ کرسیاں بدل بدل کر قریب ہونے لگا کہ دفعۃً اس نے دامن ہٹا کے بچہ کی حالت کو بغور دیکھا۔ بالکل خاموش پڑا تھا۔ کسی طرح کی کوئی حرکت نہ تھی۔ جھک کے چہرہ دیکھا۔ معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے ننھے کا چہرہ دھوئیں میں رکھ کر سیاہی مائل کر دیا ہے ننھے بھی کچھ پہلے سے دکھائی دیتے۔ دونوں آنکھیں تو صاف ٹنگی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا کر چیخ اٹھا "حکیم جی! حکیم جی! دیکھو تو اسکو کیا ہو گیا"

حکیم جی کڑکے "عجب طرح کا آدمی ہے۔ کہہ تو دیا کہ میرے ہاں قاعدہ کی پابندی ہے۔ نمبر وار ہی دیکھوں گا"

جو صاحب نبض دکھانے جا رہے تھے انہوں نے بھی بچہ پر اوچھی نظر ڈالی۔ گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے "حکیم صاحب میں اپنے حق سے باز آیا۔ اس کے بچے کو دیکھ لیجئے۔ مجھ کو تو کچھ اور ہی ڈھنگ نظر آتے ہیں" انہوں نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

مزدور اُٹھکر ٹھاتا ہؤا ان کی جگہ بیٹھ گیا۔ حکیم جی کے دل میں کچھ وسوسہ سا پیدا ہؤا۔ انہوں نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بولے "اس کے چہرے سے کپڑا اچھی طرح ہٹاؤ۔"

چہرہ کھولا گیا۔ وہی دھوئیں میں اٹی ہوئی صورت۔ حکیم جی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ مزدور ہی کو حکم دیا۔ "گلے کے بٹن کھولدو"

مزدور نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ بھی کھولے۔ سینے میں دھونکنی چلتی دکھائی نہ دی۔ حکیم جی نے ایک شاگرد سے کہا "میاں ظہور ذرا اس کی نبض تو ٹٹولو" ظہور نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ داہنی ڈھونڈھی، بائیں تلاش کی مگر کسی کا پتہ نہ چلا۔ حکیم صاحب کی طرف دیکھکر سر ہلا دیا۔

حکیم صاحب نے کہا "اناللہ!" اور چاندی کی نال منہ میں دبالی۔ مزدور اُن کے منہ کو حسرت سے دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی آنکھوں کے پردوں میں اب بھی امید کی جھلک باقی تھی۔ اس نے دوبارا اپنی زبان خشک ہونٹوں پر پھرائی۔ پھر بیٹھی ہوئی آواز میں بولا "حکیم جی۔۔۔۔؟"

حکیم صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر گاؤ کی طرف کھسک کر ٹیک لگاتے ہوئے کہا "تمہارا بچہ تو کب کا مر چکا۔"

مزدور نے ہاتھوں پر پھیلے ہوئے بچے کو سمیٹ کر زانوؤں پر رکھ لیا۔ اور اس کی گردن اور پیٹھ اتنی جھکی کہ اُس کا نخا اس کے سینے سے بالکل چھپ گیا۔

حکیم صاحب کہہ رہے تھے "بھئی اب اسے یہاں سے لے جاؤ۔ جزع فزع کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہی مرضیٔ الٰہی ہے یہی قدرت کا قانون۔۔۔۔۔"

—— فضا پر آہستہ آہستہ سکون چھا گیا۔ قارورے دکھائے جانے لگے۔ نبضیں دیکھی جانے لگیں۔ نسخے لکھے جانے لگے، دوائیں تیار ہونے لگیں ——— لیکن دو مریضوں نے اپنے نسخے پھاڑ ڈالے اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے مطب سے چلے گئے

شاہد صدیقی

مشاہدات

موت کی آگ فروزاں نظر آتی ہے مجھے — زندگی شعلہ بداماں نظر آتی ہے مجھے
میں نے ہنستی ہوئی آنکھوں میں لہو دیکھا ہے — ہر مسرّت غمِ پنہاں نظر آتی ہے مجھے
ہو نہ جائے کہیں طوفانِ تکلّم برپا! — خامشی سلسلہ جنباں نظر آتی ہے مجھے
خونِ مزدور سے یہ زینتِ ایوانِ کبنک؟ — منقلب قسمتِ ایواں نظر آتی ہے مجھے
ایک قطرہ ہی سہی خونِ تمنّائے وطن! — اس میں گنجائشِ طوفاں نظر آتی ہے مجھے
قافلہ اہلِ رعونت کا جہاں ٹھہرا تھا، — اب وہ منزل بھی گریزاں نظر آتی ہے مجھے
آج پھر چند شرارے ہیں رگوں میں رقصاں — آج پھر عظمتِ انساں نظر آتی ہے مجھے
آج پھر موت کو اک کھیل سمجھتا ہے شباب — آج پھر رونقِ زنداں نظر آتی ہے مجھے
دیکھتا ہوں جو کبھی خاکِ وطن کے ذرّے — سطوتِ کوہ و بیاباں نظر آتی ہے مجھے
نور و ظلمت کے تصادم کا زمانہ آیا — شمع فانوس میں لرزاں نظر آتی ہے مجھے

دل کی آواز کے ہمراہ قدم اٹھتے ہیں
کوئی منزل بھی ہو آساں نظر آتی ہے مجھے

علی جواد زیدی

"میری راہ میں"

تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟
تم کو تو مجھی سے الفت ہے، تم دُنیا بھر کو کیسا جانو؟
رستہ ہے کٹھن، منزل ہے کڑی، کچھ سوچو، سمجھو، پہچانو؟
اچھا تم اب سے لوٹ چلو، گھر جاؤ، مرا کہنا مانو——!
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟
اس راہ میں پیاس جوانی کی اک دن بھی نہیں بجھنے پاتی
اس راہ میں دل رہتے ہیں تپاں، اس راہ میں جلتی ہے چھاتی
اس راہ میں کٹھنائی کی پری، سو روپ میں جلوے دکھلاتی
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟
رستے میں ہیں سونے کے مندر، جو اپنے کلس چمکاتے ہیں
جو دل کو بھٹکتے سکوں کی لہروں میں بہا لے جاتے ہیں
جو من کو لبھا لیتے ہیں کبھی اور جی کو کبھی للچاتے ہیں!
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟
اس راہ میں مائیں پیٹتی ہیں، اس راہ میں بچے روتے ہیں
اس راہ میں پتی پتنی مل کر، چہرہ آنسو سے دھوتے ہیں
اس راہ میں آنکھوں کے آگے برباد بھرے گھر ہوتے ہیں
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

اس راہ میں وہ سُونے بن ہیں جن میں انساں کا نام نہیں
جن میں ہر وقت اندھیرا ہے یہ صبح نہیں یہ شام نہیں
ٹک جانے کا سامان نہیں، رک جانے میں آرام نہیں
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

اس راہ میں واعظ آتا ہے نیلے پیلے دیئے کرکے
یاں زہر پلایا جاتا ہے، صہبا کی صراحی میں بھر کے
مرتا ہے کوئی زندہ رہ کر جیتا ہے کوئی یاں مر مر کے
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

یاں لاکھوں ہی زہریلے کانٹے، رستے کی حفاظت کرتے ہیں
ہر گام پہ تلووں کے چھالے، اب ٹوٹتے ہیں تب بھرتے ہیں
ساونت بھی ایسے رستے پر چلنے میں جھجکتے ڈرتے ہیں
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

یاں لاکھوں ہی خونی ساگر ہیں جو اک طوفان اٹھاتے ہیں
جو جیون ناؤ سپاہی کی بہکا کے بھنور میں لاتے ہیں
اپنے پتھریلے کگاروں سے مانجھی کو ٹکراتے ہیں
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

میں مست شرابی، میرا کیا؟ میں تو سب کچھ ٹھکرا دونگا
دُنیا کے سارے گناہوں کا اس دُنیا سے بدلہ لونگا
یہ موقع ہے بڑھ جانے کا پھر جو ہوگا وہ دیکھوں گا
کیا تم یہ سب کر پاؤ گی؟
کیا ساتھ مرے تم جاؤ گی؟

چراغ حسن حسرت

پربت کی بیٹی

ستی جس کا چہرہ چاند کا سا تھا۔ شو جی کی استری اور دکش جی کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے پتی کے ساتھ کیلاش پربت پر رہتی تھی۔ جہاں سورج کی کرنیں دیودار کے پیڑوں تلے جھولا جھولتی تھیں اور سپید بادل ننھے بچوں کی طرح کھیلتے پھرتے ہیں۔ پر یہ دکھ اسے گھلائے ڈالتا تھا۔ کہ اسکے پتا دکش جی رات دن شو جی کی نندا کرتے رہتے۔ کبھی انہیں بھکاری اور کنگال کہتے۔ کبھی بیٹی کو بھکاری کہہ کے اس بچاری کا جی دکھاتے۔ ایک دن انہوں نے ستی کو ایسے ایسے طعنے دئے کہ اس بچاری نے آگ میں کود کے جان دے دی۔

ستی اپنے جی سے گئی۔ پر اس کی یاد شو جی کے جی سے نہ جا سکی۔ انہیں آٹھوں پہر اس کا دھیان لگا رہتا کہ جدھر نظر اٹھتی۔ ستی کی سندر مورت کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔

المنہ کی امٹ لکیروں میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ہو کے رہتا ہے۔ ستی کے نصیبے میں یہی لکھا تھا۔ کہ وہ پربتوں کے راجہ ہماچل کے ہاں جنم لے کر پھر شو جی کے استری بنے اور کیلاش کی اندھیری گپھاؤں میں اجالا کرے اور یہ بات پوری ہو کے رہی۔

اس جنم میں اس کا نام اوما تھا۔ اور لوگ اسے پاربتی یعنی پربت کی بیٹی بھی کہتے تھے۔ اس کا چمپئی بدن ہماچل کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی طرح چمکتا تھا۔ جن پر پیلی پیلی دھوپ اپنا سنہرا رنگ پھیر دیتی ہے۔ اس کی کمر انگور کی بیل کی طرح پتلی اور لچکیلی تھی۔ اور آنکھیں مان سروور سی نیلی اور گہری۔ جب وہ کیلاش کی برف بھری چوٹیوں پر نظر ڈالتی تو اسکے ہونٹوں سے جو شہد انہ کی طرح لال تھے۔ ایک سرد آہ نکل جاتی۔ اس وقت اس کی آنکھیں لمبی اور گھنی پلکوں کی چھاؤں میں اس طرح بے چین معلوم ہوتیں۔ جیسے مان سروور کا پانی گھنے پیڑوں کے سائے تلے تیز ہوا میں جھکولے کھا رہا ہے۔

وہ پربت کی بیٹی تھی اور پربت کی گود میں کھیل کے پلی تھی۔ پیڑوں سے ڈھکی ہوئی گھاٹی۔ پہاڑ کا ڈھلوان۔ گہرا کھڈ۔ اونچی کگر اسکے لئے گھر کا آنگن تھے۔ اور رسارس اور تیز نگلے اور مرغابیاں پتھریلی چٹانوں میں گھونسلا بنانے والے باز اور سہمی ہوئی آنکھوں والی ہرنیاں اسکے بچپن کے ساتھی۔ گرمیوں کی رت میں جب

شو جی ہندوؤں کے تین بڑے دیوتاؤں میں ایک ہیں۔ ویدوں میں ان کا نام رودر ہے۔ اپنشدوں میں انہیں شو شنکر۔ مہیشور اور مہا دیو کہا گیا ہے۔ عام طور پر انہیں ہلاکت کی قوت سمجھا جاتا ہے۔ پر ہندو فلسفیوں کے نزدیک شو جی کی ذات زندگی اور موت حیات اور فنا دونوں کا سرچشمہ ہے۔ دکش مہاراج جو برہما کے بیٹے ہیں۔ دیوتاؤں میں بڑے سیانے سمجھے جاتے ہیں۔ مہابھارت میں لکھا ہے۔ کہ وہ برہما کے داہنے انگوٹھے سے پیدا ہوئے اور ان کی استری نے بائیں انگوٹھے سے جنم لیا۔ دکش جی کی تیرہ بیٹیاں کشیاش کو بیاہی گئی تھیں۔ بھگت دیوتا۔ انسان اور حیوان انہیں سے پیدا ہوئے۔

…ت کھلتی ۔ جو بانی کی کلیاں کھلتیں ، اور اجلی اجلی پن چادریں سپید سپید پتھروں پر سر پٹکنے لگتیں ۔ تو وہ اونچے سروں میں شوجی کی مہما کے گیت گاتی ۔ اور لہراتی …ئی ندیاں گنگناتے ہوئے سنگت کرتے کبھی اسے کوئی ہرن کسی پیڑ تلے چوکڑیاں بھرتا نظر آجاتا تو وہ اسکے پیچھے دوڑ پڑتی راستے میں اسے کوئی چشمہ مل جاتا تو وہ ہرن …ی کر اس میں اپنا روپ دیکھنے لگتی ۔ پھر وہ ایکا ایکی مسکرا اٹھتی ۔ اور اس کی مسکراہٹ پھولوں کی مسکراہٹ میں یوں گھل مل جاتی ۔ کہ دونوں کو ایک دوسرے …الگ نہیں کیا جا سکتا تھا ۔

پھر جب تیز اور سرد ہوا کے سوکھے پتوں سے سرسراتی ہوئی گزرتی اور اس کا ایک جھونکا اما کے گالوں کو تھپتھپاتا تو اسکے بالوں کو کندھے پر بکھیر دیتا تو …ہاں نہیں ۔ کہ جاڑا آگیا ۔ پر وہ برف اور اندھی کہر اور دھند سے ڈرتی نہیں تھی ۔ کیونکہ وہ پربت کی بیٹی تھی ۔ اور پربت کی بیٹی کو کون ڈرا سکتا ہے ۔ وہ چاہتی …نے نرم نرم سانس سے برف کو پگھلا دیتی ۔ بادلوں کو ہوا میں یوں اچھال دیتی ۔ کہ ان کا کوئی آتا پتا نہ ملتا ۔ اور جاڑے کی تیز ہواؤں سے اپنے سانس کی طرح جانی …پہچانی معلوم ہوتی تھی ۔ کیونکہ وہ کیلاش کی چوٹیوں کو چھو کے آتی تھی ۔

کھلی ہوا اور پیلی دھوپ میں نیلے آسمان کے سائے تلے اسکے جوبن کی جوت یونہی بڑھتی گئی ۔ پر جوں جوں اسکا روپ نکھرتا جاتا تھا ۔ اسکے دل میں چاہت …کی آگ زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی ۔ اب اس میں اگلی سی چنچلاہٹ نام کو نہ رہی تھی ۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی ۔ اداس نظر آتی تھی ۔ اور کبھی کبھی تو اسے ایسی چپ لگ جاتی کہ …پھول پکھیرو جنہوں نے اسے مسکراتے اور قہقہے لگاتے اور سورج کی کرن کی طرح سرد اور اندھیری گپھاؤں کو جگمگاتے دیکھا تھا ۔ حیران ہو ہو کر ایک دوسرے سے …پوچھتے ۔ پربت کی بیٹی کو کیا ہو گیا ہے ۔

اسکے جی کو شوجی نے ایسی ٹھیک دی تھی ۔ کہ وہ دن رات انہیں کے نام کی سمرن کرتی رہتی ۔ وہ لمبے لمبے برت رکھتی ۔ بھوک پیاس کے دکھ سہتی ۔ بھگوان …کے سامنے بیل کے پتوں ، جنگلی بیروں اور آنسوؤں کی لڑیوں کے چڑھاوے چڑھاتی ۔ اور اُن کے من میں تو ستی بسی ہوئی تھی ۔ انہوں نے اما کی طرف آنکھ اٹھا کر …بھی نہ دیکھا ۔ وہ کبھی کبھی اسکے پاؤں کی چاپ پہچان لیتے تھے ۔ کہ ہماچل کی بیٹی پوجا کرنے آئی ہے ۔ پر انہیں معلوم نہیں تھا ۔ کہ پربتوں کے راجہ کی بیٹی کیسی ہے ۔ یہ دیکھ …کر دیوتا سناٹے میں آگئے ۔ اور ایک دوسرے سے کہنے لگے ۔ کوئی ایسی تدبیر ہونی چاہیئے ۔ کہ مہادیو ستی کو بھول کے اما کو چاہنے لگیں ۔ کیونکہ برہما جی کہہ چکے ہیں ۔ کہ جب شوجی پاربتی سے بیاہ کریں گے ۔ ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا ۔ جو سنسار کو راکششوں کے ظلم سے چھڑائے گا ۔ اس لئے جب تک اما سے مہادیو کا بیاہ نہیں ہوتا ۔ دھرتی پر یونہی پاپ کا اندھیرا چھایا رہے گا ۔

۔ ستی یا پربت کی بیٹی کوئی فانی انسان نہیں بلکہ شکتی کی شکتی ہے ۔ اسکے دو روپ ہیں ۔ اپنے پہلے روپ میں وہ گوری ستی ۔ اما پاربتی اور بھوانی ہے ۔ اور دوسرے روپ میں کالی ۔ درگا اور چنڈیکا ۔ پہلے روپ میں وہ حسن کی مورت ہے ۔ اور دوسرے میں تباہی کی دیوی ۔

۔ برہما دنیا کا خالق ہے ۔ اسے پرجاپتی بھی کہتے ہیں ۔ رامائن میں لکھا ہے ۔ کہ پہلے ہر طرف پانی پھیلا ہوا تھا ۔ اس میں سے دھرتی ابھری اور برہما جی نمودار ہوئے ۔ ۔ شو اور پاربتی کے بیٹے کا نام کارتکیہ ہے اسے سکند اور کمار بھی کہتے ہیں ۔ وہ دیوتاؤں کا سیناپتی دسپہ سالار ۔ اور جنگ کا دیوتا ہے ۔

۔ ایک مخلوق کا نام ہے ۔ راون جو رام چندر جی کے ہاتھوں مارا گیا راکششوں کا ہی سردار تھا ۔ رامائن میں لکھا ہے ۔ کہ جب ہنومان جی نکالے گئے ۔ تو انہوں

آخر دیوتاؤں کے راجا اندر نے لکشمی کے بیٹے مدن کو بلا بھیجا جو پریم کا دیوتا ہے اور جس کے زہریلے بانوں سے انسان تو انسان دیوتا بھی نہیں بچ سکتے۔ اور کہنے لگے ۔ ہم جب یہ چاہتے ہیں۔ کہ مہادیو کسی ڈھب سے اوما کو چاہنے لگیں۔ اگر تم سے اتنا بھی نہ ہو سکے۔ تو تمہارے بان جو پریم کے بس میں بجھے ہوئے ہیں اور کس کام آئیں گے۔ شو کا نام سنکر مدن کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور اس کی استری رتی ایسے کانپنے لگی۔ جیسے مینہ کی بوچھاڑیں چمپا کی پنکھڑی تھرا رہی ہوں۔ مدن کو مہادیو پر تیر چلانے کا حوصلہ تو نہیں پڑتا تھا۔ پر جب اندر نے کہا۔ گھبراتے کیوں ہو۔ دنوں کا راجہ بسنت جس کے سانس میں کلیوں کی باس ہے تمہارے ساتھ ہوگا۔ تو مدن کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھ گئی۔ اور وہ کمان کندھے پہ ڈال رتی کو ساتھ لے کیلاش کی طرف چلا۔ آگے آگے بسنت پھول بکھیرتا جاتا تھا اور پیچھے یہ دونوں چلے آرہے تھے۔ اس سے سامنے جنگل اور بن سنسان تھے۔ پربت کچھ اس ڈول سناٹے میں تھا جیسے ماں کا دکھ اس سے نہیں دیکھا جاتا۔ کالی نیلی۔ اودی اور سپید چٹانیں اس طرح سوچ رہی تھیں جیسے ان کے دل پر کوئی بڑا بوجھ ہو۔ ہوا رکی ہوئی تھی پر جھرنوں کا شور مدھم پڑ گیا تھا۔ پکھیرو گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے۔ چشمے اور تال آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔ پہلو میں کسک دبائے سر نیوڑائے کھڑے تھے۔ ان کبھی کبھی ہوا سسکیاں بھرنے لگتی۔ تو یہ خیال ہوتا کہ اب یہ آنسو پربت کے گالوں پر پھوٹ بہیں گے۔ پر جب پانچ تیروں والا دیوتا مدن اپنی استری رتی کو لے کر کیلاش کے بنوں میں پہنچا تو ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ دو چاند کومل پربت کی گود میں کھیل رہے ہیں۔ جن کی جوت سے اندھیرے جنگلوں میں اجالا سا ہو گیا ہے۔ چٹانیں اس طرح دمک اٹھیں۔ جیسے ان کے سینے میں آگ دہک رہی ہے۔ پر والکھی چشموں کا پانی ہلکورے لینے لگا۔ ندیاں شور مچانے اور لال پتھروں پر سر ٹپکنے لگیں۔ ہری ہری دوب کے فرش پر پھولوں اور کلیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور ہوا ان کی خوشبو سے مہک اٹھی شفتالو کی ٹہنیاں خوبانی کے پیڑ میں پھیلیں۔ انار کی کلیاں انگور کے پتوں میں کھچڑی ہو گئیں۔ چنبیلی کی ڈالیاں بیلے کے ساتھ اٹھیں۔ اور آپ میں مل گئیں۔ عشق پیچہ بادام کی ٹہنیوں سے لپٹ گیا۔ اور انگور نے اپنی نازک باہیں چنار کے گلے میں ڈال دیں۔ کنول کی سپید کلیاں ندی کے پانی میں اپنا روپ دیکھنے لگیں۔ بھونروں کے جھنڈ گونجنے لگے۔ پکھیرو سرک کر ایک دوسرے کے پاس آگئے۔ اور ان کی کوک سے دلوں میں ہوک سی اٹھنے لگی۔

مدن نے دور سے دیکھا کہ درختوں کے جھرمٹ میں دیودار کا ایک پرانا پیڑ ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں سے دل میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ پیڑ تلے مرگ چھالا

۔ یہ وہاں ہر قسم کے راکشس دیکھے۔ ان میں کچھ خوبصورت تھے۔ کچھ بدصورت۔ کچھ موٹے کچھ دبلے پتلے۔ کچھ لمبے۔ کچھ بونے۔ بعض کے سر ہاتھیوں جیسے تھے۔ بعض کے سانپوں کے مانند۔ اس زمانے کے عالموں کا خیال ہے۔ کہ راکشس وہ لوگ تھے۔ جو آریاؤں کے آنے سے پہلے ہندستان میں آباد تھے۔ آریاؤں نے انہیں دکن کی طرف دھکیل کر ملک پر قبضہ کر لیا۔

—— اندر آکاش کا دیوتا ہے۔ اور دیوتاؤں کا راجہ ہے۔ وہ مینہ برساتا اور فصلیں اگاتا ہے۔ سورگ کا راج بھی اسکے قبضے میں ہے۔

—— لکشمی دولت کی دیوی ہے۔ اسے شری بھی کہتے ہیں۔ پرانوں میں لکھا ہے کہ جب دیوتاؤں نے سمندر بلو کر اس میں سے امرت نکالا تو لکشمی ہاتھ میں کنول کا پھول لئے سمندر کے جھاگ سے نمودار ہوئی۔ ہری ونش میں جو سنسکرت کی ایک مشہور نظم ہے۔ اور مہابھارت کا جزو سمجھی جاتی ہے۔ کام دیو کو لکشمی کا بیٹا بتایا گیا ہے

—— مدن یعنی کام دیو محبت کا دیوتا ہے۔ اسکے بارے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ بھگوان کے من میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔ بسنت بہار کا دیوتا ہے

—— مدن کے پانچ تیر پانچ پھول ہیں۔

سے کچھ دور بیٹھا کشیپ کا بیٹا نندی سنتری کی طرح پہرہ دے رہا ہے۔

مدن نے کندھے سے کمان اتاری۔ پرندے جھنکارے بھرنے لگے۔ کیلاش کی گپھاؤں میں جو تپسوی مدتوں سے بیٹھے تپسیا کر رہے تھے۔ ان کا بھی من ڈول گیا۔ ایکا ایکی نندی نے کہا "چپ" اور بن پر سناٹا چھا گیا۔ پرندوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہوا نے سانس روک لیا۔ مکھیاں گاتے گاتے ٹھٹک گئیں۔ پھر مدن کو دیودار کے پیڑ تلے شو جی کی جھلک نظر آئی۔ گورا رنگ، سر پر بھبھوت کا تاج جیسے ہمالہ میں آگ چمک رہی ہو۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا۔ بازوؤں سے ناگ لپٹے ہوئے۔ ماتھے پر بل کی لکیر جیسے کسی ناگن کے پنکھ چٹے کر کے تتے ہوئے پانی سے چھو کر اس پر سلوٹ سی ڈال گئے ہوں۔

مدن سمجھ گیا۔ یہ مہادیو کی تیسری آنکھ ہے جس میں سارے سنسار کو بھسم کر ڈالنے کی شکتی ہے۔ یہ اگر کھل گئی تو اس سے کوئی نہ بچ سکے گا۔ یہ سوچ کے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ڈرا اور بسنت اور رتی کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے جھاڑیوں میں دبک گیا۔

وہ پریم کی جگت جیت مدن جس نے نہ جانے کتنے مردوں اور عورتوں کو پریم کے بندھنوں میں جکڑ دیا تھا۔ وہ کام کا دیوتا جو بھگوان کے من میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔ وہ دلوں کا شکاری جس کے بانوں نے ان گنت سینوں کو چھید ڈالا تھا۔ آج سہما ہوا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح ڈھلک رہی تھیں اور سانس بھپوا کی طرح چل رہی تھا۔

بسنت نے کہا کوئی آ رہا ہے۔ رتی کہنے لگی سچ مچ کوئی آ رہا ہے۔ پر یہ کون ہے جو مہادیو کے استھان میں یوں بے دھڑک چلا آ رہا ہے۔ یہ کوئی دیوتا ہے یا کوئی تپسوی جس نے تپسیا کے بل پر تینوں لوکوں کو جیت لیا ہے۔ نہیں یہ تو ایک سندر استری ہے جس کے روپ میں سورج کی جوت اور جیسے جوبن میں کونپل کی پھبن ہے۔ یہ کسی گندھرو کی کنیا ہے۔ جو بادلوں پر پاؤں رکھتی۔ دھنک کے چنچل رنگوں کو روندتی ابھی ابھی آکاش سے اتری ہے۔ یا سورگ کی کوئی اپسرا ہے۔ جس کے گورے گورے پاؤں تلے پربت کا دل مارے خوشی کے دھڑک رہا ہے۔ نہیں یہ نہ تو کسی گندھرو کی کنیا ہے نہ سورگ کی کوئی اپسرا۔ یہ پربتوں کے راجہ ہماچل کی بیٹی اما ہے۔ جو شردھا کے بل اور بھگتی کی شکتی سے وہاں آ پہنچی ہے۔ جہاں دیوتا بھی پاؤں نہیں رکھ سکتے۔

اما مہادیو کے سامنے پہنچ کر ڈنڈوت کو جھکی۔ تو اس کے بالوں کی ایک لٹ کھل کے اس کے تمتماتے ہوئے گالوں پر آ رہی۔ مدن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمان میں تیر جوڑا۔ شو جی نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"کتنے لال ہیں۔ اس کنیا کے ہونٹ۔ لال اور رس بھرے"

یہ خیال شو جی کے من میں دیئے کی لو کی طرح لپک اٹھا۔ انہوں نے پہلی بار پربت کی بیٹی کو آنکھ بھر کے دیکھا تھا۔ پھر وہ ننھی سی لو کانپی۔ اور کانپ کے

کشیپ رشی سات مشہور رشیوں میں ایک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ برہما کے پوتے تھے۔ وایو پران میں لکھا ہے کہ شو جی کا بیل نندی کشیپ رشی کا بیٹا ہے۔

— تین دنیائیں۔ دھرتی۔ سورگ اور پاتال۔ مگر ہندوؤں کی بعض کتابوں میں سات اور بعض میں آٹھ لوکوں کا ذکر آیا ہے۔

— گندھرو کی استری۔ سورگ کی حسین مخلوق۔ حور۔

— ہندوؤں کی کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ کام دیو سب سے پہلے پیدا ہوا۔

بجھ گئی، میرے جی میں یہ بات کہاں سے آئی۔ کیسے آئی۔ میرے من نے اسے جنم نہیں دیا۔ یہ تو کہیں باہر سے آئی ہے۔ جھجکے جھجکے۔ وہ پاؤں چوروں کی طرح، لال اور رس بھرے ہونٹ، یہ بات میرے من میں کس نے ڈال دی۔ کون ایسا ہے — یہ سوچتے سوچتے اُن کی بھویں تن گئیں۔ پھر ایکا ایکی انھوں نے اپنی تیسری آنکھ کھول دی۔ دیکھا! آنکھوں میں سامنے سنسار کو جلا ڈالنے کی طاقت ہے۔ لال لال شعلے نیلی زبانیں نکالتے ہوئے بڑھے اور وہاں کامدیو کو جو جھاڑیوں میں کمان کا چلّہ چڑھائے بیٹھا تھا، جلا کے راکھ کر ڈالا۔ رتی نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھیں اٹھائیں۔ مگر پچھلا سونا پڑا تھا۔ شوجی کہیں نہیں تھے۔ اس امارس بھری ڈالی کی طرح سر نیوڑھائے کھڑی تھی۔ اس کا جتن اب پوری طرح پھل گیا تھا۔ اور بیتے بھونچال اُسکے پاؤں میں لوٹ رہے تھے۔

جب اما نے دیکھا کہ اس کا روپ اور جوبن شوجی کے من سے ستی کی یاد کو نہیں مٹا سکتا۔ تو اس نے سارا گہنا اتار ڈالا۔ بسنتی دوپٹہ اور کپڑوں نوچ کے پھینک دیا۔ کہ اس کی رگوں سے چندن کا لیپ آپ ہی آپ اتر گیا۔ کان کے بندوں کو غصے میں یوں نوچا کہ کان لہولہان ہوگئے۔ پھولوں کے گجروں کو پاؤں تلے روند ڈالا اور ریشم کا سوہا جوڑا جس میں سونے کے تار گندھے ہوئے تھے۔ اتار کے درختوں کی بھوری چھال سے اپنا بدن ڈھانک لیا۔ اور گھربار چھوڑ کر ایک سنسان جنگل میں جو آبادی سے راہ باٹ سے کٹا ہوا تھا، کٹیا بنا کے رہنے لگی۔

پر اسکے بدن میں بھی اسکے روپ کی چمک دمک کم نہیں ہوئی تھی۔ اور بھوری چھال کے جوڑے میں اُس کا نکھرا ہوا جوبن یوں جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ جیسے بجلی پہر کے دھندلکے میں پھوٹ رہی ہو۔ کیونکہ کنول کا پھول کائی میں گھرا ہوا بھی بھلا معلوم ہوتا ہے، اور بھونرا اسکے ہونٹوں کا رس پینے کیلئے اسکے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔ پچھلے پہر وہ ندی پر جا کے اشنان کرتی۔ اور لوٹتے وقت پودوں کو پانی دینے کے لئے گگری بھر لاتی۔ جب بھوک بہت ستاتی۔ تو پھل پھلاری اور پیڑوں کی جڑیں کھا کے گزارا کر لیتی، اور رات کے سمے اپنی نازک باہنہ کو سرہانا بنا کر پتھریلی زمین پر پڑی رہتی۔ جنگل کے پنچھی پکھیرو اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اور ہرن ہرنیاں اس سے یوں ہل گئی تھیں۔ جیسے وہ بھی کوئی ہرنی ہے۔ جو راستہ بھول کر اس طرف آنکلی ہے۔

آہستہ آہستہ اسے بھوک پیاس بھی بسر گئی۔ پہاڑ سی راتیں آنکھوں میں کٹنے لگیں۔ اور نیند اُس کی آنکھوں کو یوں چھوڑ کے چلی گئی، کہ پھر اس کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔ اب تو اس کا یہ حال ہوا کہ جو تھوڑا بہت وقت ان دھندوں میں خرچ ہو جاتا تھا۔ وہ بھی تپسیا میں کٹنے لگا۔ اس کا جسم جو نئی کلی کی طرح نرم اور تازہ تھا۔ کملا گیا۔ مالا پھیرتے پھیرتے انگلیوں پر گٹے پڑ گئے۔ پر اسکے جپ تپ میں کوئی فرق نہ آیا۔

اما کو یونہی تپسیا کرتے بہت مدتیں بیت گئیں۔ ایک دن وہ کٹیا کے دروازے پر کھڑی تھی۔ کہ ایک بوڑھا برہمن جو شاید راستہ بھول کے ادھر آنکلا تھا۔ کٹیا کے پاس سے گزرا اور اما کو دیکھ کے رک گیا۔

اما نے برہمن دیوتا کے پاؤں دھلائے۔ اُن کی پوجا کی اور پھل پھلاری اُن کے سامنے رکھ کے چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔

برہمن پہلے تو ٹکٹکی لگائے اسکے منہ کو تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ اے کنول کے نینوں والی میں دیکھتا ہوں کہ ہرن تجھ سے بہت ہلے ہوئے ہیں۔ وہ کشا گھاس کے تنکے تیرے ہاتھوں سے چھین لئے جاتے ہیں۔ اور تو بھی ان ہرنوں اور ہرنیوں میں بہت خوش معلوم ہوتی ہے۔ پر سندری ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہ مانیگی۔ تو اس سنسان

یوں میں کیوں اپنی جوانی گنوا رہی ہے۔ تجھے تو اس چاند ایسے چہرے سے کسی راجہ کے رنواس کو اجالنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ چھال کے کپڑے بڑھاپے کا سنگار ہیں۔ ایسی تپسیا تو ہم ایسے بڈھوں کا کام ہے۔ جو زندگی سے نراش ہو چکے ہوں۔ میری سن تو اس جنگل کو چھوڑ کر اپنے گھر چلی جا۔ یہاں تیری رسیلی جوانی کی بہار دیکھنے والا کون ہے — اچھا میں سمجھ گیا۔ تیری ٹھنڈی سانس نے تیرے دل کا بھید کھول دیا۔ تو نے کسی کی چاہت میں یہ روگ بنا رکھا ہے۔ پر دھرتی پر کون ایسا ہے جسے تو چاہے اور وہ تیرے قدموں میں نہ آ گرے۔ اسکے سینے میں دل کی جگہ پتھر کی سل ہوگی۔ کہ وہ تیرے اداس چہرے۔ بکھرے ہوئے بالوں اور آنسو بھری آنکھوں کو دیکھتا ہے۔ اور اس کا جی نہیں پسیجتا۔ نہ تیرے ہاتھوں میں مہندی ہے۔ نہ تیری آنکھوں میں کاجل۔ تیرے کان بندوں سے خالی ہیں اور تیرے سینے کو جسے ہاروں سے ڈھکا ہونا چاہیئے تھا سورج کی تیز کرنیں جھلس رہی ہیں۔ وہ کون ہے جو یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اسے تیری حالت پر ترس نہیں آتا — مجھے تو کوئی سٹھیایا ہوا برہمن سمجھتی ہے۔ جو صرف باتیں کرنا جانتا ہے پہلے چلی کروالی کنیا۔ میں نے تپسیا بھی کی ہے۔ مجھ میں بھی اتنی شکتی ہے۔ کہ اگر چاہوں تو تیرے پریتم کو تجھ سے ملا دوں۔ اس لئے تو اپنا بھید مجھ سے نہ چھپا۔ اور صاف صاف بتا دے کہ کس کی چاہت تیرے جی کی لاگ ہوئی ہے"

اما بولی۔ برہمن دیوتا۔ میں شو بھگوان کے سوا اور کسی کو نہیں چاہتی"

بوڑھا برہمن ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں بادل کی گڑگڑاہٹ تھی۔ اور اسکے اجلے اجلے دانت بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔ شو — میں شو کو جانتا ہوں پر اسکے پاس کیا رکھا ہے کہ تجھ ایسی دیوی اس کی چاہ میں اپنا جیون گنوائے۔ شو تو بھکاری ہے۔ بھکاری۔ اسے تو پہننے کے لئے کپڑا بھی نہیں جڑتا۔ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ گیت جوڑنے والے شاعروں کی طرح سپنے دیکھتا رہتا ہے۔

اما ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگی۔ دیوتاؤں کے ڈھنگ نیارے ہیں۔ ان کی باتوں کو ہم تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم شو کو بھکاری کہتے ہو۔ پر دیوتاؤں کا راجہ اندر اسے ڈنڈوت کرتا ہے۔ اور برہما جس نے سارے سنسار کو پیدا کیا۔ اس کی مہما کے گیت گاتا ہے۔

برہمن بولا۔ میری سنو تو ——"

اما کی بھویں تن گئیں۔ اور وہ کڑک کے بولی۔ چپ۔ میں اور کچھ سننا نہیں چاہتی۔ پر ابھی اسے ایسا معلوم ہوا کہ اسکے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ یوں رک گئی جیسے پتھریلی چٹان کا ایک ٹکڑا چنچل ندی میں ٹوٹ کے آ پڑے اور اسکا راستہ روک لے کیونکہ بوڑھے برہمن کی جگہ مہادیو کھڑے مسکرا رہے تھے۔

اما اپنے روپ اور جوانی سے تو شو کے من کو نہ لبھا سکی۔ پر اس کا تپ وشوناتھ کو اسکے دوار سے لے آیا۔

پھر وہ پانچ تیروں والا دیوتا بھی اٹھا۔ جو مردوں اور عورتوں کو پریم کے بندھنوں میں جکڑتا ہے۔ اور جس نے اپنے زہریلے بانوں سے ان گنت سینے چھید ڈالے ہیں۔

جب آموں پر بور آتا ہے۔ اور اس پر بھونروں کے جھنڈ گونجنے لگتے ہیں۔ تو من بے کھٹکے دلوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ پر جب سے اس نے شو جی پر تیر چلانے کا ہیاؤ کیا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔

اثر صہبائی

غزل

اسرارِ خرد سے بھی میں بیگانہ نہیں ہوں
دیوانہ مگر پھر بھی ہوں فرزانہ نہیں ہوں

جانے! مری دیوانگیٔ شوق میں کیا ہے!
فرزانے بھی کہتے ہیں کہ دیوانہ نہیں ہوں

طاری ہے مری رُوح پہ مستیٔ جاوید
منت کشِ پیمانہ و میخانہ نہیں ہوں

رہتا ہوں ہم آغوش سدا جلوۂ حق سے
دریوزہ گرِ کعبہ و بُت خانہ نہیں ہوں

پنہاں ہے مری خاک میں خورشیدِ محبت
اک گنجِ گراں مایہ ہوں ویرانہ نہیں ہوں

سرمست ہوں، سرخوش ہوں، سرافرازِ ہوں اے دوست
اکسیر ہوں، خاکِ درِ شاہانہ نہیں ہوں

ہر چند نہیں ساغر و مینا سے سروکار
ہے شکر کہ بے جراتِ رندانہ نہیں ہوں

رہتی ہے سدا چھیڑ مری حُسنِ ازل سے
میں پیروِ اندازِ کلیمانہ نہیں ہوں

خود لکھا ہے فطرت نے اثرؔ خونِ جگر سے
روداد حقیقت ہوں میں افسانہ نہیں ہوں

حامد سعید خاں حامد

غزل

بزمِ ازل کے سامنے عالمِ اعتبار کیا
ہونے چلی ہے زندگی موت سے ہمکنار کیا

ساغرِ جوئبار کیا، باغِ لالہ زار کیا
گوشِ خزاں نصیب کو زمزمۂ بہار کیا

تکملۂ حیات کر، دردِ فراقِ یار کیا
کشتۂ انتظار بن خستۂ انتظار کیا

نقشِ حیاتِ بیکسی لوحِ جہاں سے مٹ گیا
اب بھی نہ چین پائے گی گردشِ روزگار کیا

دل ہمہ نذرِ آرزو جاں ہمہ صرفِ جستجو
وعدۂ بے وفا کی تھی قیمتِ اعتبار کیا

اہلِ خرد کو کیا خبر اہلِ جنوں سے پوچھئے
کشمکشِ خزاں ہے کیا مرحلۂ بہار کیا

لاکھ دفعہ مٹا کے دیکھ، لاکھ دفعہ بنا کے دیکھ
برقِ نگاہِ بے اماں قلب پہ ایک بار کیا

پھر اُسی خاکداں کو دیکھ، پھر اُسی آسماں کو دیکھ
سعیِ عمل سے کام لے شکوۂ روزگار کیا

رحمتِ عام کی طرف شرم سے دیکھتا نہیں!
اِس سے زیادہ عذرِ جرم لائے گناہ گار کیا

دل پہ ہزار دل سہی جلوہ سے کیا مقابلہ
لاکھ ہو دعوئِ اعتبار پھر بھی ہے اعتبار کیا

اوپندر ناتھ اشک

جھٹکے

۔۔انہیں میں شادی ہو رہی تھی۔

....

۔۔کمرے میں ہنس کی ماں اور دوسری عورتیں سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔

"دروازے بند ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"۔۔ابھی دالی گوتو کی ماں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا۔ تمہارا ہنس بھی تو وہیں ہے۔"

"میرا ہنس!"

"گوتو کی ماں کہہ رہی تھی کہ وہی بھائی کی حیثیت سے کنیا دان کر رہا ہے۔"

"وہ کنیادان کر رہا ہے — میرا ہنس!"

"گوتو کی ماں ...."

"نہیں نہیں میرا ہنس کیسے ہو سکتا ہے؟ گوتو کی ماں کو تو بے پر کی اڑانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ ہنس اگر کنیادان کرتا تو مجھے کیا اس شادی کا بھی پتہ نہ چلتا؟ میرا بیٹا تو مجھ سے کوئی بات چھپاتا ہی نہیں۔ اور پھر وہ کیوں اس پاپ کے کام میں ...."

"میں پوچھتی ہوں ہنس کی ماں یہ لڑکی ہے کون؟ محلے میں تو چار دن سے طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ شرم حیا تو اس میں ... نام کو بھی نہیں۔ کل دفتر کو جاتے وقت اس نے بُلوا تانگا۔ تو ننگے سر ہی باہر سڑک تک دوڑی آئی۔ شادی تو بھلا آج ہو رہی ہے۔ ہم تو کئی دنوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اکٹھے بیٹھتے اور ہنستے کھیلتے ہیں۔"

"کئی دن سے — انہیں تو آپس میں ملتے جلتے سال بھر ہو گیا ہے۔ میں سوچتی ہوں، اس کی ماں کوئی اعتراض نہیں کرتی۔"

"ماؤں کو آج کل کے لڑکے کیا جانتے ہیں؟"

"میرا بیٹا ہوتا ایسا نرلج — میں تو اس کا منہ تک نہ دیکھوں۔"

"اب سب کوئی ایک جیسے تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ میرا ہنس کرے تو میری مرضی کے خلاف کوئی بات۔"

"اس کا کوئی آگا پیچھا نہیں کیا؟"

"ماں باپ تو نہیں، لیکن ماموں، چچے، تائے اور دوسرے رشتے دار ہیں۔"

"تو کیا ان سب کو چھوڑ کر آ گئی؟"

"اور کیا! سو روپیہ پاتی ہے۔ ان کی یہ کیا پرواہ کرتی ہے۔"

"سو روپیہ کہاں کام کرتی ہے؟"

"کہتے ہیں منٹگمری کے کسی سکول میں ہیڈ مسٹریس ہے۔"

"منٹگمری میں — تو اتنی دور کیسے آ گئی؟"

"ایسی پھر ظلمیں؛ کے لئے دور کیا اور نزدیک کیا۔ جی آیا۔۔
رام رام! لڑکے لڑکیوں کے گھر بیاہنے جاتے تو سنے تھے لیکن
لڑکی لڑکے کے گھر بیاہ کرنے آئی آج ہی سنی"

"تبھی تو آج کل کی لڑکیاں شیطان کا کان کاٹتی ہیں۔ جن
کی اُستانیاں ایسی چلتر نی ہوں۔ وہ خود کیسے نہ ہوا سے باتیں کریگی"

"ہم نے تو سنا ہے۔ اس کی پہلی بیوی بھی زندہ ہے۔"

"ابھی فروری میں تو شادی ہوئی تھی"

"رام رام! اس لڑکی کو دیا نہیں آئی جو اپنی ہی ایک بہن کے
گلے پر چھری پھیرنے کو تیار ہو گئی۔ آخر اس کا کیا بنے گا؟"

"چھوڑ دیگا اور کیا۔"

"میرے سردار جی بھی ایک دن کہتے تھے ۔۔ میں تمہیں چھوڑ
کر دوسری شادی کرونگا"

"ہاں کرلیگا۔ اُس کی تو مذاق کی عادت ہے۔ ہنس رہا ہوگا
ورنہ کیا سب اس جیسے لفنگے ہو جائینگے۔ میرا ہنس بھی اپنی شادی پر
ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ لیکن چھوڑنا تو دور رہا۔ مجال ہے جو میری
بہو کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک تک پڑنی ہو۔ ادھر بہو بیاہ
کرلایا۔ اور ادھر رونے لگا۔ "میری زندگی تم نے ہی خراب کر دی ہے۔ تم
ہی اسے دیکھ کر آئی تھیں ۔۔ کیا وہ میرے لائق ہے؟ سکڑی سڑی،
جلی بھنی، بد صورت اور پھو ہڑ بھدے اور موٹے مذاق والی۔ بات
کرتی ہے تو چہرے پر میں زاویے بن جاتے ہیں ۔۔۔ اور تو اُسکے پتا
تک کہنے لگے۔ میں ہنس کی دوسری شادی کر دونگا" لیکن میں ماں
ہو کر یہ سب کیسے برداشت کرلیتی؟ میرے آگے لڑکی نہیں کیا؟ میں
نے دونوں کو ڈانٹ دیا۔ اور میرا بیٹا اتنا فرمانبردار ہے۔ کہ کسکا
تک نہیں۔ اور اب تو دیکھو یہ ماتماں کی کر پا سے اسکے گھر بال بچہ بھی ہونے
والا ہے"

"میں تو سنتی ہوں ہنس کی مرضی سے ہی یہ شادی ہوئی ہے گوتو
کی ماں ہی کہتی تھی۔ کہ ایک دن دونوں باتیں کر رہے تھے۔ ہنس اسے سمجھا
رہا تھا۔ "میری زندگی تو برباد ہوئی تم کیوں اسے تباہ کرتے ہو۔ اور
پھر اس وقت تمہیں ایسی لائق اور سمجھ دار بیوی ملتی ہے۔"

"لائق ۔۔ یہی لیاقت ہے نا اس کی کہ سوت پہ چڑھی آرہی ہے
اور یہ پڑھی لکھی کی باتیں ہیں۔ ان پڑھ ہوتی تو نہ جانے کون سے
آسمان کو چھیدتی؟"

"کب کہتی تھی گوتو کی ماں میں پوچھوں گی نہ جاکر اس سے۔ کب
ہنس نے یہ سب باتیں کیں؟ ہم سے اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ وہ
باتیں اڑائیگی جن کا سان ہوگا نہ گمان۔ میں کہتی ہوں۔ اگر
ہنس کی مرضی سے ہی ہوتی شادی، تو مجھے اس کا پتہ بھی نہ چلتا؟ میرے
سامنے تو اس نے کبھی اس کام کی تعریف نہیں کی۔ اتنے دنوں سے یہ لڑکی
آئی ہوئی ہے، کہو تو ایک دن بھی میرے گھر آئی ہو۔ میں نے تو ہنس سے کہہ
دیا تھا۔ کہ بیٹا تیرا دوست ہے اسے کہہ دینا کہ اسے میرے گھر نہ لائے۔ میں
ایسی پاپن کا منہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور ہنس نے کہا تھا ۔۔ نہیں ماں
ایسی لڑکی کبھی ہمارے گھر آسکتی ہے کیا؟ اب جاکر بیٹھنے کا کیا ہے دفتر
میں اکٹھے کام کرتے ہیں۔ وہاں جا بیٹھا ہوگا۔ گوتو کی ماں ۔ ۔ ۔ ۔

"میں تو سوچتی ہوں ۔۔ یہ ایک بیوی کے زندہ ہوتے ہوئے دوسری شادی
کر رہا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے پہلی بیوی کے مرنے کے
بعد پھر کبھی شادی کی ہی نہیں"

"مہر کے سیٹھ ہی کو دیکھ لو۔"

ہاں مہر کے سیٹھ کو دیکھ لو۔ چالیس برس کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ لیکن بیوی کے مرنے کے بعد مجال ہے جو شادی کا نام بھی لیا ہو۔"

....

"مہر کے وہی سیٹھ صاحب اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے، چند دوستوں سے کچھ گرم گرم بحث کر رہے تھے۔—

"یہ محلہ ہے یا کنجر خانہ۔ ہم یہ سب ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ محلے کی بہو بیٹیوں پر اس کا کیا اثر پڑیگا۔"

"میں کہتا ہوں اگر اسے جھک ہی مارنا تھی۔ تو کسی منڈی میں جاکر مار لیتا۔ یہ کیا ہوا کہ ایک بیسوا کو بھرے محلے میں اندر ڈال کر دروازے بند کر کے شادی رچا لی۔ میں کل ہی رائے صاحب سے کہونگا۔ کہ اسے فوراً محلے سے باہر کریں۔"

"سنتے ہیں رائے صاحب کے لڑکے سے اس کی دوستی ہے؟"

"پھر کیا ہوا۔ میں کہتا ہوں نہ نکالیں رائے صاحب۔ میں اسے ایسا ٹھیک کر دونگا کہ وہ یہ تیس ہزاری تو کیا، دلی چھوڑ کر بھاگ جائیگا۔ یہ ایک شخص کا سوال نہیں۔ یہ سارے محلے کا سوال ہے۔ ساری سوسائٹی کا یہ سوال ہے۔ چار غنڈے پیچھے لگا دوں تو ہوش ٹھکانے آجائیں۔"

"اس کی اس ذرا سی بیوی کو ہی اٹھا کر لے جائیں۔"

"ہاں اور کیا۔"

"میں کہتا ہوں سیٹھ جی آپ تو اس کے سامنے ہی رہتے ہیں۔ آپ نے اسے سمجھایا نہیں۔"

"ہم سے وہ بات ہی کب کرتا ہے۔ دو مہینے ہو گئے۔ اسے یہاں آئے ہوئے کبھی سلام دعا تک نہیں۔"

اپنے آپ کو نہ جانے کیا خیال کرتا ہے۔ ہم تو اس کے لئے جیسے ہیں ہی

نہیں — عقلمند بنا پھرتا ہے سالا۔ یہ عقلمندی کہاں کی ہے کہ .....

"آخر اس کی پہلی بیوی میں نقص کیا ہے؟"

"پہلی نہیں دوسری کہو۔ پہلی کو تو مرے آٹھ برس ہو گئے۔ اس میں سے تو ایک لڑکا ہے سات برس کا۔"

"خیر دوسری ہی سہی، آخر اس میں نقص کیا ہے؟"

"یہی تو میں کہتا ہوں — بیوی میں کوئی نقص ہو، عیب ہو، وہ بانجھ ہو، لنجی ہو، لنگڑی ہو، یا بیمار ہی گر پڑا ہو۔ تو آدمی دوسری شادی بھی کر لے اس میں تو کوئی نقص ہی نہیں۔ گو تو کی ماں نے اس کی ماں سے پوچھا تھا کہتی تھی — بڑی نیک ہے، ہنرمند ہے، سلیقہ شعار ہے، کھانا پکانا سینا پرونا خوب جانتی ہے۔"

اس کی ماں تو ایک طرف رہی۔ خود اس نے ایک دن مجھ سے کہا تھا — اوسط آدمی کی نظر سے دیکھنے پر اس میں کوئی نقص نہیں۔ نیک سیرت ہے۔ میٹرک تک پڑھی بھی ہے۔ کھانا اچھا بنا لیتی ہے۔ اچھا سی پرو لیتی ہے۔ لیکن میرا اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں اگر آسمان کی بلندیوں میں اڑنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے پاتال کی گہرائیوں میں گھسیٹ لے جانا چاہتی ہے۔ ہم دونوں میں کسی طرح کی ذہنی رفاقت نہیں۔ کوئی کلرک اسے پاکر خدا کا شکر ادا کرتا۔"

"کلرک تو جیسے آدمی ہی نہیں۔ اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھتا ہے حرامزادہ۔"

"اجی یہ ذہنی اور دماغی رفاقت کی باتیں سب ڈھکوسلے ہیں۔ پوچھے کوئی اس سے، کہ اگر تجھے تیرے جیسی کوئی بیوی نہ ملتی تھی۔ تو تو نے شادی ہی کیوں کی؟ اپنا بچہ تھا اس کی خود پرداخت کرتا۔ آخر شادی کا مقصد ہی کیا ہے۔ اولاد — جو شخص اولاد ہوتے ہوئے بھی شادی کرے۔ اس جیسا احمق کوئی نہیں۔ جب میری بیوی مری میرا لڑکا

صرف آٹھ سال کا تھا۔ اس وقت میری عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ یہی تینتیس، چونتیس برس کی ہوگی۔ رشتے داروں نے دوسری شادی کر لینے کو بھی کہا پر میں نے صاف انکار کر دیا۔ اپنے اس بچے کو پالا پڑھایا، لکھایا۔ اس وقت کی بات کیا، ابھی پرسوں مجھ پر لالہ رام نارائن زور دے رہے تھے کہہ رہے تھے — اب بھی آرام سے رہنا چاہتے ہو تو شادی کر لو۔ میں نے صاف کہہ دیا — میں آرام سے ہوں۔ میں سکھی ہوں۔ میں یہ پاپ نہ کروں گا میں یہ گناہ نہ کروں گا۔ یہ ....

....

اور نمبر ۱۲ میں سردار جسونت سنگھ اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے۔

"آخر وہ بڑا کیا کر رہا ہے۔ اس حرامزادے سیٹھ کی بات کر رہی ہو — محلہ اس سے نالاں ہے۔ کوئی لڑکی، کوئی بہو، کوئی استری گزرے وہ گھٹنوں سے اونچا صافا پہنے ننگے بدن سر پر ہاتھ پھیرتا پھیرتا دروازے میں آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور وہ اس کا بیٹا — وہ کیا کرتا ہے؟ محلے بھر کی باتیں سونگھنے کے سوائے کام ہی کیا ہے؟ یہ لوگ دماغی تماشبینی کرتے ہیں — فلاں کی لڑکی صبح اٹھ کر بال چمکاتی ہے۔ فلاں کی بیوی گھونگھٹ نہیں نکالتی۔ فلاں کی بہن باجہ سکھانے والے ماسٹر سے ساز باز رکھتی ہے۔ فلاں کی ماں اتنی پتلی دھوتی باندھتی ہے کہ سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ ان سب باتوں کا ذکر کر کر کے لطف لینے کے سوا یہ اور کیا کرتے ہیں — بہو کے اٹھ نہ دینے کہیں سکے! ان سب باتوں سے کیا یہ بدرجہا بہتر نہ تھا۔ کہ وہ دھرم کا اوتار سیٹھ چپ چاپ دوسری شادی کر کے گھر بساتا۔ اور میں پوچھتا ہوں کہ ہم ہی کونسا بڑا تیر مار رہے ہیں — اس تمام بک بک جھک جھک سے کیا یہ اچھا نہ تھا کہ میں دوسری شادی کر لیتا۔ تم کیا سکھ پاتی ہو میرے ساتھ — کونسا سکھ دیتی ہو مجھے؟ اور وہ کونسا سکھ ہے جو ہمیں ابھرتا ہے اور نہ ملتا ہے؟ — تنگ کرتی ہو تنگ ہوتی ہو۔ روتی ہو سلگتی ہو۔ پیٹتی ہو۔ پٹاتی ہو — میں خود سوچ رہا ہوں کہ اس سب جھوٹی زندگی کو ختم کر کے دوسری شادی کر لوں .....

....

اور نمبر ۹ میں نگیندر رام رتن سے کہہ رہا تھا —

"میں کہتا ہوں اس میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔ کہ لڑکیاں اس پر مرتی ہیں۔ ہمیں تو کوئی سالی نہیں پوچھتی۔ اور تم تو کرنی دیکھو، میری بیوی یہ سمجھتی ہے۔ کہ دنیا جہان کی لڑکیاں مجھ پر فدا ہیں۔ ایک دن کہنے لگی میں تو صبح شام پرماتما سے یہی دعا مانگتی ہوں کہ آپ بالکل گنجے ہو جائیں۔ تاکہ صرف میں ہی آپ سے محبت کر سکوں۔"

"میں کہتا ہوں یار اسے تو کئی لڑکیوں کے خط آتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں — ہمیں تو کوئی کمبخت خط نہیں لکھتی۔"

"وہ بھی بات ہے۔ کہ وہ بہت اچھا گانے والا ہے۔"

"تو ہم کیا اتنی دیر جھک ہی مارتے رہے ہیں؟ ہمارے سنگیت کو بھی تو کسی نے خط نہیں لکھا۔ اتنی دور سے بھاگ کر چلی آتی۔ اور شادی کے لئے تیار ہو جاتی تو خیر"

"یہی میں بھی سوچا کرتا ہوں۔ لیکن کوئی تو خوبی ہے نا اس میں آخر — کوئی یوسف ثانی تو وہ ہے نہیں۔ کہ لڑکیاں اس کی خوبصورتی پر مرتی ہوں۔ اور میں تو کہتا ہوں۔ کہ شوہر کی حیثیت سے بھی وہ ایک نوجوان کنواری لڑکی کے لئے نہایت نامناسب قسم کا شخص ہے۔ جس شخص کی پہلی بیوی کو مرے ہوئے آٹھ برس ہو گئے ہوں۔ چھ سات برس کا ایک لڑکا موجود ہو۔ پھر یہی نہیں، دوسری بیوی زندہ ہو۔ اس سے گو کوئی

لڑکی شادی کرنے کو تیار ہو جائے. تو اس شخص کی قسمت اور ہمت پر رشک آئیگا ہی. اور بھلا وہ یہ کہ یہ لڑکی بدصورت نہیں. جاہل نہیں۔ بی اے بی ٹی ہے. ہیڈ مسٹریس ہے اور ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ پاتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اسے لڑکیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا گُر یاد ہے. بیٹیشن ریپی دیکھو. وہ کتنی جلدی عورتوں کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے. اور یہی ہمدردی بعد کو محبت کی شکل اختیار کر لیتی ہے."

"اس ننھے سے شخص سے کس طرح انہیں محبت ہو جاتی ہے میں اس پر حیران ہوں. ہم تو آجتک یہی سنتے آئے ہیں. کہ لڑکیاں حسن اور طاقت پر ہی جان دیتی ہیں. ہم تو فضول ہی ڈنڈ پیل پیل کر مر گئے. میرا خیال ہے کہ آجکل کی لڑکیوں میں وہ دم خم ہی نہیں. جوان مرد سے وہ گھبرا جاتی ہیں. میں کہتا ہوں. یار وہ نرملا کیسی ہے. میرا جی چاہتا ہے. اُس کو باہوں میں لیکر اتنا بھینچوں کہ اسکا دم نکل جائے."

"تم بھی بس وہ ہو ارے نرملا میں کیا رکھا ہے. ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں. گوشت کا نام نہیں"

"لیکن مل جائے تو کیا بُرا ہے ؟"

"مل ہی جائیگی اس کا کیا بھروسہ ہے ابھی آج کی ان لڑکیوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا. سرسری نظر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے. کہ پلک جھپکتے ہی بغل میں آ گریگی. لیکن پاس جانے پر اتنی ہی دور دکھائی دیتی ہیں اور پھر میرا تجربہ تو یہ ہے. کہ جو لڑکی ایک پر مرتی ہو ضروری نہیں کہ ہر آنی جانی پر"

"پسند تو میں بھی اسے نہیں کرتا. بچپڑی سی ہڈی جیسی تو ہے لیکن . . . . . میرا جی چاہتا ہے کہ ان سب سازوں کو اٹھا کر آگ میں جھونک دوں اور . . . ."

"آپ کی چیزیں تو کلاسیکل ہوتی ہیں یا نہیں تو اچھے معنی نہیں سمجھ سکتے. پھر یہ لڑکیاں کیا سمجھینگی."

"نرملا تو ایم اے ہے."

"ایم اے کر لینے سے کوئی سنگیت کا ماہر تو نہیں بن جاتا. یہ سب ویسی ہی چیزیں پسند کرتی ہیں. جیسی کہ وہ گاتا ہے سستی جذباتی بے مقصد اور بے سود . . . ."

"میں کہتا ہوں یار چمپلی کیسی ہے"

"کون چمپلی ؟"

"ارے وہی جس کے نئے نئے ریکارڈ بھرے گئے ہیں."

"کوئی اتنی خوبصورت تو نہیں پر جسم اسکا ہمیشہ دعوت دیتا ہے. لیکن وہ تو مہنگی میوا ہے."

"لیکن یار غضب کا گدرایا ہوا جسم ہے اس کا" پندرہ سولہ سال کا سن ہوگا."

"اور گلا کیسا پایا ہے کمبخت نے ؟"

"اور گول گول گلگوتھنے گال"

اور آنکھیں بڑی بڑی مسکراتی!"

زبان میں جادو ہے. باتیں کیا کرتی ہے سحر پھونکتی ہے"

"اور چال ——— ہر گام پر سوتے ہوئے فتنے جگاتی ہے."

"میں تو آج ضرور وہاں جاؤنگا. اٹھو نا ولٹی میں پکچر دیکھیں گے. کارنیشن میں کچھ بیئر پلائینگے. اور پھر اُدھر چلینگے. جلدی اٹھو ——— میرا جی چاہتا ہے. کسی کو باہوں میں لیکر اتنا بھینچوں کہ اسکا دم نکل جائے

—.:.—

راجہ مہدی علی خاں

اجی پہلے آپ!

"اجی رکھئے جنت کے در میں قدم!"
"اجی پہلے آپ!"
"اجی واہ پہلے نہ جائیں گے ہم!"
"بھئی پہلے آپ!"

(۲)

"اجی بات اس میں تکلف کی کیا،
قدوم مبارک بڑھائیں ذرا،
اجی چلئے رک جائے گی سب جگہ!"

"اجی پہلے آپ!"
"بھئی پہلے آپ!"

(۳)

"اجی اب تو بڑھئے خدا کے لئے!
سبھی لوگ جنت میں ہیں جا چکے
تکلف کو اب برطرف کیجئے،
نہ اب مجھ سے کہئے خدا کے لئے!

اجی پہلے آپ!"

(۴)

"بھئی مجھ سے یہ تو نہ ہوگا کبھی،
بس اب بڑھئے امت سمجھئے کچھ بھی
تکلف کی اللہ حد ہے کوئی!
یہیں پر کھڑے ہو گئی اک صدی

بس اب پہلے آپ!
"اجی پہلے آپ!"

(۵)

ارے ہو گیا بند جنت کا در!
خدایا بتا جائیں اب ہم کدھر؟
نہیں واپسی کے سوا کچھ مفر
چلو بھائی واپس چلیں اب مگر

ذرا پہلے آپ!
"اجی پہلے آپ!"

اختر اورینوی

بہت بے آبرو ہو کر.......

اُٹنگ پاجامہ، کبھی چھوٹی مُہری کا، کبھی خانے دار۔ بڑے چھوٹے کی کوئی قید نہیں۔ مگر ہمیشہ ایک مُہری اُٹنگ اور ایک جھولتی ہوئی جس کے حاشیے پر گرد اور میل کی مغزی۔ قمیص، کرتہ یا بنیائن۔ گاہ کمر سے اوپر، گاہ گھٹنوں تک۔ اور کبھی صرف پاجامہ۔ بالائی جسم حقے کے منہنال کی طرح کپڑے کی پیٹی سے بری۔ کندھے جھکے ہوتے۔ سر نہوڑاتے۔ آنکھیں زمیں دوز۔ پر آنکھیں ہوں بھی وہ تو گویا اندھا تھا۔ بچپن میں اُس کی آنکھیں آگئی تھیں۔ ماں نے اپنی نیم حکیمی میں روہوں کو ہارسنگار کے پتّے سے خوب رگڑا۔ ساتھ ہی پتلیاں بھی زد میں آگئیں۔ غریب نابینا ہوگیا۔ ایک آنکھ کے گوشے سے تھوڑا تھوڑا سوجھتا تھا۔ لہٰذا ہمیشہ اُسی زاویے میں اس کی گردن اور سر مُڑے ہوئے ہوتے تھے، جیسے گنج مار کھیلتے وقت لٹو نچانے والوں کی ہیئت ہوتی ہے۔ وہ پاؤں گھسر گھسر کر کے چلتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ تلووں سے راستے کو محسوس کر رہا ہے۔ اندھوں کی قوتِ لامسہ بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ کافی تیزی کے ساتھ آنگن میں لکڑی کے ڈھیر، بچھی ہوئی چوکی، کھڑے یا چلتے ہوئے آدمیوں سے بچتا ہوا نکل جاتا تھا۔ وہ سائبان کے زاویوں گوشوں، اور مختلف موڑوں کی ہر شے سے شناسا تھا۔ باورچی خانے کے ہر پیچ و خم سے واقف۔ وہ کھانا کاڑھنے کے وقت صحیح جگہ پہنچتا۔ چائے کی نشست ہوتی تو مناسب اور نمایاں مقام پر نظر آتا۔ وہ خفیہ طور پر چولہے سے انگارا نکال کر بیڑی سلگایا کرتا تھا۔ باورچن کی جھڑکیاں، مالک کی ڈانٹ ڈپٹ سے وہ مطلقاً بے پروا تھا۔

”آگیا کُتّے کا نوالہ کھانے کو! کام نہ کاج، کھانے کو دے دو اڑھائی سیر۔ حرام خور رہا دن بھر اُڑا رہتا ہے۔ مگر کھانا نکلا اور موجود! کام چور نوالے حاضر!“

اس قسم کے جملوں سے اُس کی اکثر تواضع ہوتی تھی۔ کبھی باورچن نے واویلا کیا ——

”چولھا کوڑے کے مُنڈی کا سب آگ بتا دے ہے۔ بیڑی پی کے منہ میں آگ ملا دے کو جیں آدے ہے۔ کبھی چہرہ جھڑکے ہی نا. . . .“

باورچن کو تو خوش کر لیا کرتا تھا۔ کبھی یار دوستوں کے یہاں سے بیرے آیا۔ کبھی کھیتوں سے کتاری کا گٹھا لایا۔ اس قسم کا خراج باورچی خانے کی ڈکٹیٹر کو اکثر دیا جاتا تھا۔ اسی اسمِ اعظم کی بدولت وہ کبھی بھوکا نہ رہا۔ بی بی کی خفگی کی کیا پروا۔ مٹیانے میں اُسے کمال حاصل تھا۔ وہ سوچتا۔ ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ زندگی کا مزہ ہی یہ ہے کہ خوب کھیلو، گتیں مانگو۔ بیڑی پیو اور بی بی کے ڈپٹ سُنتے ہوئے کھانا کھاؤ۔ اور پھر کھیل، گپ اور لیٹے لیٹے پہروں سوچتے رہنا۔ فراغت کا لطف بھی تو اسی سے ہے کہ ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود بیکاری حاصل ہو۔ کبھی کبھار وہ جواب بھی دے دیا کرتا۔ مگر یہ جب

ہوتا کہ اُس کے پاس بڑی نہ ہونی یا دانست کی خوراک میں اضافہ ہوجاتا۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ تو کیا ہی کرتا تھا۔ سانڈے ڈھونڈ کر لانا، گرمیوں میں پنکھے کی ڈور کھینچنی کسی کو بلا نے جانا وغیرہ۔ پر تھا وہ کام چور ہی۔

اُس کی ماں گھر کی پرانی خادمہ تھی۔ بڑی بدمزاج، چڑچڑی اور لڑاکن۔ یہ لڑکا اُس سلسلے کی ایک کڑی جو حویلی کے فیضان سے وجود میں آتا ہے۔ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ اور اُس پر طرہ یہ کہ بچپن ہی میں اندھا ہوگیا۔ بڑے ہونے پر بھی وہ سبکدوش و سبک سری رہا۔ طبیعت میں کسی صلاحیت آفرینش کی خانہ زادیاں کا ملاوہ چاہیے نہ ہوتا؟ تھا اور اسی لحاظ سے آرام طلب بھی۔ ساتھ نے بھی اُس کی مدد کی۔ اندھا کام کرنے سے بچ جایا کرتا تھا۔

بچپن سے ہی وہ ہوا کی طرح آزاد تھا۔ قصبے کی گلیوں میں گھومتا۔ بازار میں سیر کرتا۔ ہجولیوں کے ساتھ بڑی پیتا۔ اساڑھ سے لے بھادوں تک ستم کے بوغوں پر ملغاریں کرتی۔ امرود والی بگیا، بیر، کنارے اور مرطرے کی بجیت لڑکوں کی میراث ہوتے ہیں۔ شمشیروا بھی ان چیزوں کا وارث تھا۔ ابتدا میں تو اُس نے یوں ہی قصبے کے بڑے چھوکروں کے ساتھ نبھاں ہوگیا۔ ماں سے پیسے یا ہاتھ کی صفائی سے حاصل کی ہوئی چیزیں مانگ کر لے جاتا اور لڑکوں کو دیتا۔ بخشش کی سفارش تھے۔ پھر شمشیروا سیکھ سیکھ کر گانے بھی یاد کرلیا کرتا تھا۔ وہ ہجولیوں کی ٹولی میں گا کر اُن کا دل بہلاتا۔ غرض یہ کہ پرانے یاروں طریقت کے حلقے میں اُس کی خاصی قدر تھی۔ بڑا ہو کر تو وہ خود ہی پیر مغاں بن گیا۔ یاران میکدہ کی ایک منڈلی اُس کے گرد قائم ہوگئی۔ اُس کی ترکیب یہ تھی۔ کہ وہ منتظم، ناظم اور قاید کا فرض انجام دیتا۔ مجلس عاملہ اُس کے خیالات کو عملی جامہ پہناتی۔ قصبے میں ہر تقریب، ہر تہوار اور ہر میلے ٹھیلے کے موقعے پر شمشیروا مع اپنی پارٹی کے رونق افروز ہوجاتا۔ گاتے گاتا، کوڑی، لٹو، پتنگ کے کھیل کھیلنا، ناچنا، شور کرنا اور گپیں۔ اس منڈلی کا حلقہ اثر قرب وجوار تک وسیع تھا۔ چھ سات کوس دور کے میلوں میں بھی شمشیروا اینڈ کمپنی نظر آجایا کرتی تھی۔ آزاد پھرے پھرنا، چھٹے ہوئے سانڈوں کی طرح گھومنا، چینیا بادام، آلکٹ، کھوؤے کی لائی۔ لنگڑا، پھلوڑی کھانا، کنوئیں پر پانی پیتے ہوئے چھوکریوں کو گھورنا، اور اُن پر جملہ بازی کر کے ٹھٹھے مار کر ہنسنا

بس یہی کام تھا، یہی کھیل اور یہی پیشہ،

”ارے یار کیسی ہے؟ بتا نے سالا۔؟“ شمشیروا دریافت کرتا۔

”چھوکے دیکھو نے بے!“ بٹروا اقلعی گر کا لونڈا جواب دیتا۔

”کھوب یار! کھوب! پٹوادے گا کا رے؟“

”تو دیکھے کنکھی سے۔ بنیں ایک آنکھ مارے اور تیرے پر جا سکے۔“

سب لونڈے زور کا قہقہہ لگاتے اور شمشیروا آزردہ ہو کر یا تو چپ ہوجاتا۔ یا کوئی دوسری بات نکال دیتا۔ وہ اکثر دلگیر ہو کر سوچتا۔ کاش اُس کی آنکھیں ہوتیں۔ تو وہ بھی دنیا کے تماشے دیکھتا۔ یا دنیا اُس کی آنکھوں کے ایک گوشے سے مبہم طور پر اُس کی روح میں جھانکتی۔ اور اُس کی تمناؤں کو مضطرب کر دیتی تھی۔ وہ ساری صورتوں، اور سارے واقعات کو اپنی ذات میں سمو لینا

چاہتا تھا مگر جلوے ہمیشہ گریزاں ہی رہے، اور پردے کبھی نہ ہٹے۔

تھوڑی دیر میں شمشیرؔوا یہ سب باتیں بھول جاتا اور پھر زندگی کی ایک موج اُٹھتی۔ نٹوں کا تماشہ دیکھنے کے بعد وہ اپنی ٹولی کی قیادت میلے کے اس حصے کی طرف کرتا جہاں پتُرمائیں اپنے قصباتی عمزوں کو ارزاں کئے بیٹھے رہتیں۔ شمشیرؔوا اپنے کسی دوست کی گردن میں باہیں ڈالے ہوئے آگے بڑھا جاتا اور بہک کر گاتا۔ ــــ

ہر روز حسینوں سے دیدار نہیں ہوتا　　دل دینے کا مالک سے اقرار نہیں ہوتا

میلے میں نٹنیوں سے سنے ہوئے گانے سیکھ کر جب یہ پارٹی قصبے کو لوٹتی تو کلیاں تازہ تازہ شعروں سے آباد ہو جاتیں۔ شمشیرؔوا کا حافظہ سب سے اچھا تھا اور اُس کا گلا بھی۔

حویلی کے چھوٹے بڑے لڑکوں سے شمشیرؔوا کی برابر کی دوستی تھی۔ وہ لڑکے بھی اس کے دوست تھے جو اب کالج میں پڑھ رہے تھے اور وہ بھی جو مکتب میں داخل ہی ہوئے تھے۔ وہ سب کے گلے میں ہاتھ دے کر ٹہل سکتا تھا۔ اُس کی شخصیت میں عجیب دلچسپی تھی۔ اُس کے آزاد و بے پروا وجود میں مشغول و مجبور ہستیوں کے لئے ایک رومان پایا جاتا تھا [illegible] نوجوانوں کو گانے اور ان سب کو کچھ ایسی باتیں بتا دیتا جن کے جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جوانی کی جانچ کا طریقہ ایک لڑکے کے لئے کیا ہے۔ لڑکیاں لڑکوں سے کیوں شرماتی ہیں۔ قصبے کی فلاں چھوکری کے مشاغل اور تعلقات کیا ہیں۔ سرسوتی پوجا کی رات کو کیا ہوا۔ مخدوم صاحب کے عرس کی شب مختلف مشہور پس پردہ مقامات میں کتنی کہانیاں بنائی گئیں۔ کن کن قصّوں کی ابتدا ہوئی کون کون افسانے عروج کو پہنچے اور کس کس کی داستانیں اختتام پذیر ہوئیں۔ یہ سب حقیقی یا تخیّلی باتیں وہ حفظِ مراتب کا پاس رکھتے ہوئے اپنے اصحاب دائرہ کو بتاتا۔ اُسکی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی یہی تھی۔ مگر اُس کے اپنے تجربے بہت ہی محدود تھے۔ ناقابلِ یقین طور پر محدود۔ بس ایک جنسی صنفِ مخالف کی دنیائے رنگین کو وہ صرف اپنے تخیّل اور ارمان کے پروں سے مَس کر سکتا تھا۔ اس کی باتیں اکثر و بیشتر سنی ہوتیں اور تجربات سُنے سُنائے ہوتے۔ وہ اُن تجربات کی حقیقی لذّتوں سے بہرہ ور ہونے کے لئے ویسا ہی بے قرار تھا جیسے اُس کے نوگرفتارانِ شباب سامعین۔ اوّل تو وہ اپنی ذاتی نفسی وجذباتی ضرورت سے مجبور ہو کر اس نوع کی باتیں خود گڑھ گڑھ کر یا سُنی سُنائی ہوئی دوسروں کو سنایا کرتا تھا اُس کی سربند آرزوؤں کے پورا ہونے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ دوسرے یہ کہ سُننے والے بھی اس گفتگو کو بیحد پسند کرتے تھے۔ شمشیرؔوا کی عزت عزیزی میں اضافہ ہوتا تھا اور اسے بیڑی بتّی کو پیسے مل جاتے تھے۔ وہ ہمارے فسانہ نگار دل کی طرح تھا۔ پر وہ ایک فسانہ نگار نہیں، داستان سرا تھا۔ بات ایک ہی تھی۔ اپنی ذاتی محرومی۔ فریبِ تسکین، اور سامعین کی طلب، جو خود بھی تشنہ ہوتے ہیں۔

وہ اندھا تھا گویا۔ جب وہ جوان ہونے لگا تو یہ خیال اُسے بہت ستایا کرتا۔ کاش میں اندھا نہ ہوتا! وہ آزاد تھا مگر بینائی خود ایک بہت بڑی پابندی ہے۔ اُس کی جوانی دبے پاؤں نہیں آئی تھی۔ جوان ہونے سے پہلے وہ جوانی کو جان گیا تھا اور اُس کا منتظر تھا۔ وہ اپنی نرم و نازک ہلکی مونچھوں کو تنہائی میں اکثر چھوا کرتا تھا۔ اُس کے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی اور وہ اِس لذّت کو دیرپا بنانے کے لئے بیڑی کا ایک گہرا

کش لیتا اور دیوار سے ٹیک لگا کر پھیل جاتا۔ دیوار کی مس میں وہ زندگی محسوس کرتا اور اسی احساس کی تاریک گہرائیوں سے جذبات کی بہت سی کونپلیں پھوٹتیں اور بہت سی مبہم صورتیں پیدا ہو کر پُرفسوں دھواں بن جاتیں۔ گرم دوپہریں اُمس بھری، سسکتا ہوا ساون، الکوئیں اور باغوں کے جوان قہقہے ساریوں کے سرسرانے کی آواز اور یاروں کے تجربے شمشیروا کے عنفوانِ شباب کو بالیدہ تر کر رہے تھے۔ مگر وہ اندھا تھا۔ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا تھا۔ سب کچھ سن سکتا تھا۔ مگر سب کچھ دیکھ اور سب کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ جامن پک کر اُس کی گود میں گرنے سے رہے اور جرأتِ رندانہ کر گزرنے سے وہ قاصر تھا۔ جہاں کی چھوکری، ابیلدار کی لونڈیا، حویلی کی نوخیز خادمائیں سب اُسے ہیٹا سمجھتی تھیں۔ "اندھا ہے اندھا"۔ "ارے کانا!" بہت ہوا تو "بیچارہ شمشیروا!" "اس بیچارہ" سے اُسے سب سے زیادہ کوفت ہوتی تھی۔ وہ گھنٹوں کے لئے سُست ہو جاتا۔ وہ اپنی ٹولی کا سردار تھا۔ اس کے اشاروں پر چلنے والے فیضیاب ہو جایا کرتے تھے۔ مگر اس کے کام کی انتہا حاجب و دربان اور دلدادۂ زندان بننا تھی بس۔

اب وہ قصبے کی پنہاریوں کی گلی میں آنے جانے لگا۔ مگر وہاں تو پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس کی ماں بوڑھی ہو چکی تھی وہ زمانہ نہ رہا تھا۔ پیسے کہاں سے آتے۔ ایک دو پیسے ملے بھی تو بیڑی خرچ تھا۔ شمشیروا کے پاس کبھی اتنا نہ ہوا کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پالے۔ وہ کڑھتا رہا اور اپنی حسرتیں مختلف عنوانوں سے نکالنے کی سعیٔ ناکام کرتا رہا۔ بہت رات گئے وہ بازاروں کوچوں کی خاک چھان کر آتا جب میسر ہوتی تو تاڑی بھی پی لیتا۔ اور دل کھول کر گاتا ـــــ اپنے انداز میں ـــــ

شبِ وصل کی شب ہے ڈر پہلے پہلے
چھوئی تھی جو میں نے کمر پہلے پہلے
پہلو سے اُٹھ کر یہ میں نے جو بولا
چلی کیوں پلنگ سے اُتر پہلے پہلے

مگر اس نے کبھی لچکنے والی کمر چھوئی بھی ہو۔ وہ اندر اندر سلگتا رہا۔ اندھا لڑکا! اُس کا دل دوزخِ جذبات بنا ہوا تھا۔ کاش وہ مکمل اندھا ہوتا! مگر نابینا آنکھوں کا وہ ایک گوشہ جو بینا تھا۔ دُنیا اُسی گوشے سے جھانک جھانک کر اُس کی جوانی کو پکارتی تھی۔ پھر اُس کی آزادروی، صحبتِ احباب اور قصبے کی اندرونِ خانہ و بیرونِ در گراں اور ارزاں جوانیاں۔ احباب میں سے بھی کوئی اُس کی کیا مدد کرتا۔ ٹھٹھیروں، ڈفالیوں، جولاہوں اور نوکر نوکرانیوں کے لونڈے اگر اپنی گرہ کے پیسوں سے اپنی جوانی کے لئے کھلونے خرید سکتے تو یہی بہت تھا۔ پھر بھی یہ لونڈے اِدھر اُدھر چہ چُک لیتے تھے۔ قصبے میں اس طبقے کے صرف چھوکرے ہی شباب بہ کف نہ تھے چھوکریاں بھی تو جوانی بدست تھیں۔ مگر شمشیروا؟ یہ تو بےچارہ تھا۔ محض بیچارہ۔ پر بیچارے بھی تو آخر کاٹھ کے پتلے نہیں

اُس کی ایک بہن تھی۔ بڑی "فیاض"۔ اُس کا خیال تھا کہ حرکت و تجدید کا نام شباب ہے اور شباب کے معنی ہیں زندگی کے پر جوانی کی مہر ثبت کر دینی۔ اس کی فتوحات یوں تو بہت سی تھیں۔ مگر باضابطہ طور پر بھی اس نے چار شادیاں قبل کی تھیں۔ اور اب

ایک جوان ٹھٹھیرے سے نکاح پڑھا لیا تھا۔ مولوی بغیر طلاق کے بھی بیوہ دیگرے نکاح پڑھا دیتے ہیں۔ بشرطیکہ جواز کی قیمت ادا کی جائے۔ شمشیروا اس شدکام ٹھٹھیرے سے بہت جلتا تھا۔ اُسے نفرت تھی اُس سے۔ شمشیروا اُس سلسلے میں ماں سے لڑا۔ بہن سے لڑا۔ دیکھا ایسی نازیبا و ناروا حرکتیں بھی چوری چھپے کیں کہ ٹھٹھیرے نے اپنی بیوی کو بھائی سے تنہائی میں ملنے اور اُس سے بولنے تک کی ممانعت کر دی۔ بہت سی افواہیں اٹھیں۔ اس پابندی کے خوب خوب چرچے ہوئے۔ اسی زمانے میں شمشیروا کی ماں مر گئی۔ اب اُس کے لئے کوئی ایسی ہستی بھی نہ رہی جس سے وہ نہایت خلوص کے ساتھ لاڈ کر اپنے دل کا بخار نکال سکتا ہو۔ جسے وہ گالیاں دیتا، جھڑکتا، کوستا اور پھر محفوظ بھی رہتا۔ اندھا اب بغیر لاٹھی کے تھا۔ اُس کا تنہا جذباتی سہارا چھن گیا۔ وہ اُس پیاسے کی طرح تھا۔ جس کی سواری لق و دق صحرا میں گم ہو جائے۔ وہ زندگی سے بیزار ہو کر، حیات کے تقاضوں سے تھک کر مضمحل۔ فسردہ۔ دلگیر گوشہ نشین سا ہو گیا۔ شاگرد پیشہ کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں وہ دن کا دن اور رات کی رات لیٹا ہوا نہ جانے کیا سوچا کرتا۔ زندگی کے تانے بانے الجھاتا سلجھاتا رہتا ہوگا اور کیا۔

ایک روز جبروا آیا۔ کہنے لگا۔

"یار کھوب مال آیا ہے۔ پھرو جیا نام ہے۔ بڑ چیز کی قسم! جوانی زبریا! چل نے کتنے جوان، نو سالی ناگن چھڑیا کے طرح جوان۔"

"واجبہ! ہمار سالی کے! ہم ای سب میں نا ہیں اب!" شمشیروا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

جبروا نے بہت کوشش کی مگر شمشیروا کا جوگ نہ ٹوٹا۔ وہ بیزار بیزار سا رہنے لگا تھا پہلے، وہ کتنے ڈانٹ ڈپٹ کے طوفانوں کو۔ یہ سے گزر جانے دیتا تھا وہ چکنے گھڑے کی طرح تھا۔ یا واٹر پروف کی مثال۔ وہ اپنے مشاغل کی دلچسپیوں میں بہت سی جھڑکیاں سہہ جاتا تھا۔ مگر اب وہ نازک مزاج ہی نہیں۔ بلکہ بدمزاج، چڑچڑا اور گستاخ ہو گیا تھا۔ ہر کس و ناکس سے لڑ پڑتا۔ اکثر فاقے کرتا۔ مردم آزاری کی روح اُسے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو خوب پیٹنے پر مجبور کرتی۔ ایک دفعہ اُس نے اپنے بھانجے کو مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ کبھی اُس کے نفس کی تاریکیوں سے خود آزاری و خودکشی کی امنگ آسا موجیں اٹھتیں۔ اُسے کھانے، کپڑے، گرمی، سردی کی کوئی پروا نہ ہوتی۔ اور وہ زیر ہو کر الٹ سے بھی الجھ پڑتا۔ نتیجہ یہ کہ ہر طرف سے ٹھکرایا، دھتکارا اور نکالا جاتا۔ اُس کے چاروں طرف بھیانک تاریکی تھی، اندھی تاریکی، بے آس زندگی۔ ساری حیات اُس کی بے نور آنکھوں کی مثال تھی۔ ایک عالم ظلمات موت سے زیادہ بھیانک مرگ ہزار پایہ، دم گھونٹنے والی آہستگی کے ساتھ رینگتی ہوئی موت

اس کابوسی حالت سے جھلا کر ایک شب اُس کے نفس نے کروٹ لی، شدید جھٹکے کے ساتھ۔ اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "ناگن چھڑی کی طرح جوان" اُس نے کئی بار زیر لب "پھرو جیا پھرو جیا" کا ورد کیا۔ اُس کے سارے اعضا کسمسانے لگے۔ ایک بے پناہ خواہش کے ریلے میں اُس کی ساری شخصیت غرق ہوتی جا رہی تھی۔ مجرم آرزو نے خود ایک ترکیب ایجاد کی۔ شمشیروا اٹھ بیٹھا۔ اور بڑی چستی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پھر گھسر گھسر کرتا ہوا تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ مرغیوں کے ڈربے کی طرف۔ رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔ وہ دبے پاؤں ڈربے میں گھس گیا۔ مرغیاں، مرغے، چوزے سب پر سمٹائے، گردن ڈالے۔ کونوں میں اونگھ رہے تھے۔ شمشیروا نے چاروں طرف ٹٹولنا شروع کیا۔ قائیں قائیں شروع ہوئی۔ وہ ٹھٹھک

گیا پھر وہ موٹی مرغیوں کی جستجو میں اس کے ہاتھ بڑھے اور پھر قائیں قائیں کٹاس کٹاس کا شور ہوا۔ گھر کے لوگ اس طرف متوجہ ہونے "پکڑو ایلی" کا ہنگامہ بلند ہوا۔ دوڑ پڑ گئی۔ ذرا دیر میں شمشیروا پکڑا گیا۔ اس کی خوب درگت بنی۔ یہ سب کچھ ہوا۔ پر بیچارے کی اسکیم ناکامیاب ہو گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ موٹی موٹی مرغیاں بیچ کر وہ فیروزیا کی دو تہائی باتیں مزید سکے گا۔

اس ناکامیابی کے بعد فیروزیا اس کے دل و دماغ میں بس کر رہ گئی۔ اب شمشیروا پھر قصبے کے بازار کے پھیرے کرنے لگا۔ فیروزیا تک رسائی تو کوئی مشکل بات نہ تھی۔ وہ بازار کی ایک جنس ہی تھی نا۔ مگر اس جنس کے استعمال کا حق صرف قیمت ادا کرنے والوں کو تھا۔ اور اس کے پاس دام کہاں۔ محرومی نے شمشیروا کے دل کو اتنا گداز کر دیا کہ فیروزیا اس کے من مندر کی دیوی بن گئی۔ مادی خواہشات لطیف تر ہو کر محبت کی سرجوں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ اس کے در کا گدا بن گیا۔ ایک اندھا پجاری۔ وہ اس کے گھڑے پانی سے بھر کر لا دیتا، گھر میں جھاڑو دیتا اور اس طرح کی ہر خدمت کرنے میں مسرت محسوس کرتا تھا۔ فیروزیا بھی اس محنت کے غلام کو خوب خوب کام کرنے کی دعوت بخشا کرتی۔ شمشیروا کو جہاں سے کچھ بھی ملتا وہ اسے بڑی تمناؤں کے ساتھ فیروزیا کو جا کر دے آتا۔ پریپی کے پیسے، بابو لوگوں کے آنے جانے پر ملے ہوئے پیسے، ریل میں بکنے والی اچھی اچھی چیزوں کے حصے وغیرہ شمشیروا اب اکثر گاتا ہوا پایا جاتا ——— ؎

زمانہ بھر کی نظروں میں کھٹکتا خار ہو جاتا
اگر قسمت سے لیلی کے گلے کا ہار ہو جاتا

وہ شدت محبت میں اپنے نفس کو اور دوسروں کو فریب تمنا میں مبتلا کرنے کی بھی کوشش کیا کرتا تھا معصومانہ فریب۔

"ارے جگر تیا! پھروجیا ہمرے بہت چاہت ہے رے۔ جو اُن کسم! جب جائیں کھوب کھلاوے ہے۔ بھات، گوش، پھن ترکاری، پھن پاپڑ کا ترکجا۔ پھن گھی، پھن دال، پھن ترکاری۔ بھات دال گوس انچار ——— جب ہم نا کھائیں تو اپنی کسم دے دے کے کھلاوے ہے رے ایمان سے! کا جنے کا ہے ہمرے اتا چاہے ہے۔ اتا مانے ہے۔ جی چاہت ہے سالے کو ایک ٹھو گھر بناتے اور اوہی میں پھروجیا کو رکھ کے جندگی کاٹ دیتے۔" جگر تیا تو ہاں میں ہاں ملاتا جاتا تھا۔ مگر ڈبروا بھی کہیں بیٹھے کھڑا یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ قہقہے لگاتا ہوا بولا ——— "ہاں یار شمشیرا تب؟ پھن بھات پھن گوش۔ پھن ترکجا، پھن گھی، پھن دال...... ہاں یار تب؟ کاہے تو رے اتنا مانے ہے پھروجیا؟"

شمشیروا شرما سا گیا کہنے لگا "تو ہوں ددھ ہو؟ بڑا مانے ہے ہمرے پھروجیا!"

دوسرے روز شمشیروا [illegible] تھے۔ قصبے میں اکثر جگہ جلسے ہو رہے تھے۔ شمشیروا کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ فیروزیا کے گھر میں بھی پرب تہوار کی دھوم دیکھے۔ مگر قصبائی پنچایتوں کیا کی کے [illegible] سے اٹی ہوئی پانی پیتی ساری اندھا آئینہ۔ ٹوٹی ہوئی کنگھی اور فاقہ مست دہقانی کنجڑی [illegible] کی طرف کسی لاری کے موٹر ڈرائیور نے توجہ کی تو اس کے بھاگ جاگ گئے۔ پھروجیا کالی کلوٹی ہی تھی۔ اس کے چہرے کی چمکدار سیاہی جوانی کے چلے کو بنا کے دیتی تھی۔ [illegible] اس کا چڑھا بجائیں بجائیں کر رہا تھا اور شمشیروا کا دل فیروزیا کے لئے بہت دکھ رہا تھا۔

حویلی کے لوگ شبرات منا رہے تھے۔ لڑکے پیڑکے مرتا، پٹاخہ، پھلجھڑی چھوڑنے میں مشغول تھے۔ شمشیروا نے دبے پاؤں ایک بار چھپر مرغیوں کے ڈربے کا رُخ کیا۔ اُس نے دو موٹی تازی مرغیاں سرِ شام ہی کو پکڑ لیں۔ شور و غل میں کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس نے مرغیوں کی ٹانگیں باندھیں اور انہیں اپنا دامن دیتے ہوئے اپنے خالتہ دار پائجامہ کی دونوں تہوں میں کرکے پاس نیفے سے باندھ کر لٹکا لیا۔ تہوار کی عام دلچسپیوں میں قوالوں کی طرف کسی نے توجہ بھی نہ کی۔ وہ سیدھا بازار کی طرف روانہ ہوا۔ راستے بھر وہ اس خیال سے سرشار چلا رہا تھا کہ فیروزیا اس تحفے کی کتنی قدر کرے گی۔ اُس کا دل محبت کی لذتوں اور محبوب کو ہدیہ دینے کے کیف سے بھرپور تھا۔ فیروزیا کا گھر آگیا۔ وہ بن سنور کر اپنے دروازے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید تہوار کے دن کوئی گاہک آنکلے۔ وہ دن بھر سے بھوکی تھی۔ اُس کا چہرہ سوکھا ہوا تھا۔ اور اُس کے تیور سے دبا ہوا چڑچڑا پن ٹپک رہا تھا۔ وہ مبہم لیکن یقینی طور پر بھری بیٹھی تھی۔

"پھر مت جاؤ،" شمشیروا نے دروازے پر کسی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"تیس سے سے حرمجادہ! ہم تیرے پر عاشک ہیں رے؟ لکھ سو باں! گلام جادہ!—"

فیروزیا ساری دُنیا پر اپنا غصہ اتار نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے دل کا بخار شمشیروا پر اُتارنے لگی۔ اُس کا غیض بڑھتا جاتا تھا۔ شیروا نے کھیل کھیل میں اس سے آکر کہہ دیا تھا کہ شمشیروا کا نا ہر جگہ کہتے پھرے ہے کہ پھروجیا میرے پر جان دے ہے۔"

فحش گالیوں سے فیروزیا نے شمشیروا کا خیر مقدم کیا اور پھر جو بھڑک اُٹھی ہے۔ تو کاٹنے کو اُس نے نوچ کھسوٹ کر پیٹنا شروع کیا۔ ایک دو ہاتھ مرغیوں پر بھی زور کا پڑا۔ مرغیاں قائیں قائیں کرکے شور مچانے لگیں۔ فیروزیا نے غصہ اور حیرت کے ساتھ اس کے پائجامے سے مرغیاں کھینچ کر نکالیں۔ بازار کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ فیروزیا بپھر کر بولی۔

"سات پشت حرمجادہ۔ کہتا پھرے ہے کہ پھروج جان مجھ پہ عاشک ہیں۔ منہ تو دیکھے اپنا۔ مُرغی چور۔ مرغے کا جنا۔ . . ."

بہت پٹ پٹاکر غریب واپس گھر آیا۔ "دل شکستہ" اور اس سانحہ کے بعد وہ گوشہ نشین ہو گیا۔ بھرے بازار میں اس کی بے آبروئی ہوئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد بجرتیا نے اس سے فیروزیا کی بابت دریافت کیا۔ شمشیروا نے جواب دیا۔

"چھی! رمجان کے مہینہ میں ای سب کھراب کام اچھا نہیں۔" پر وہ اب بھی تنہائی میں گاتا ہوا پایا جاتا ہے

کیا ملا تجھ کو میرے عشق کا چرچا کر کے
خود بھی رسوا ہوئے آخر مجھے رسوا کرکے

مجید لاہوری

"میکدۂ نو!"

یہی دستورِ کہن ہے ترے میخانے کا
ایک وہ ہیں کہ جو تلچھٹ سے بھی یکسر محروم
ایک وہ ہیں کہ جو پینے کی طرح پیتے ہیں
ایک وہ زیست جنہیں حاصلِ صد عمرِ دوام
ایک وہ ہیں جو نہ جینے کی طرح جیتے ہیں
یہی دستورِ کہن ہے ترے میخانے کا
گر کوئی رند یہ آئین بدلنا چاہے
تو اُسے مست نگاہوں سے سزا دیتا ہے
گیسوؤں میں یوں جکڑتا ہے کہ جکڑا رہ جائے
آتشِ سُرخیِ عارض میں جلا دیتا ہے
یہی دستورِ کہن ہے ترے میخانے کا

وقت میخانے میں لایا ہے بغاوت کا پیام
تشنہ لب جی میں یہی ٹھان کے آج آئے ہیں
سختیاں سہہ کے یہ دستورِ کہن بدلیں گے
موت کی چال بھی اس راہ میں چلنا ہوگی

وہ ڈھنگ یہ فرسودہ چلن بدلیں گے
وقت میخانے میں لایا ہے بغاوت کا پیام
اب یہ تقسیم کا انداز بدل جائے گا
میکدہ بدلے گا ساقی کو بدلنا ہوگا
اب اس آئین کو، بنیادِ جفا ہے جس کی
اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلنا ہوگا
وقت میخانے میں لایا ہے بغاوت کا پیام

اب تو میخانے میں اک اور ہی دنیا ہوگی
مٹ کے رہ جائے گی وہ تشنہ لبی کی لعنت
سب پہ یکساں مرے ساقی کی عنایت ہوگی
روحِ صد کوثر و تسنیم کھنچی آئے گی
وہی جنت جو فسانہ تھی حقیقت ہوگی
اب تو میخانے میں اک اور ہی دنیا ہوگی
اب جوانی کے مچلنے کا سماں آئے گا
جوش پر قلقلِ مینا کی صدا آئے گی
رقص کرتا نظر آئے گا فضاؤں میں شباب
زہدِ صد سالہ کی بے طرح قضا آئے گی
اب تو میخانے میں اک اور ہی دنیا ہوگی

نئی کتابیں

- گرہن ۔ راجندر سنگھ بیدی کے تازہ افسانے ، عکر
- گھونسلے ۔ احمد ندیم قاسمی کے ۲۰ بہترین شاہکار افسانے ، ۱۲ر
- زندہ چین ۔ بہترین چینی کہانیوں کا اردو ترجمہ ، عمر
- افادی ادب ۔ ادب حیاتِ انسانی کی تفسیر ہے از اختر انصاری ، ۸ر
- ادب کثیف ۔ ادب لطیف کی شاندار پیروڈی ، برناڈشا سے بھی زیادہ اچھے خیالات ، عمر
- رفیق تنہائی ، سید علی عباس حسینی کے رومانی افسانے ، عکر
- تاریخ انقلابِ روس ، دنیا پرستیں مطالعہ کی چیز از ام ام جوہر مجلد عہر
- وحی الٰہی ، تالیف سید احمد ایم اے ، للعہ
- قصص القرآن ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مجلد للعہ
- مکالماتِ سائنس ، زندگی اور تخلیق انسان پر دلچسپ مکالمے ، عمر
- علم الاقوام ، بہترین معلوماتی کتاب ، عکر
- انشائے داغ ، مرتبہ سید علی احسن مارہروی ، عہر
- ہماری غذا ، مطبوعہ ترقی اردو ہند ، عہر
- کلیاں ، عصمت چغتائی کے افسانوں کا مجموعہ ، عہر
- میرا افسانہ ، چودھری افضل حق مرحوم کے خاص انداز میں آپ کی آپ بیتی ، عکر
- افضل حق از خان کابلی ۴ر

- تاریخ احرار ، چودھری افضل حق کے قلم سے ، عہر
- شعرستان ، اختر شیرانی کے ۲۰ سانیٹ کا مجموعہ ، ۱۲ر
- سوگوارِ شباب ، مجنوں گورکھپوری کا طویل دلچسپ افسانہ ، عکر
- آثارِ جمال الدین افغانی ، از قاضی عبد الغفار خاں ، سے
- فاسزم ، موجودہ جنگ کے متعلق مفید معلومات ، ۶ر
- مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر ، مرتبہ پروفیسر مسعود ، عہر
- میں بھی خانہ بدوش ، از دیوندر ستیارتھی ، سے
- گفتارِ بیخود ، کلامِ بیخود دہلوی مجلد سے
- نقوشِ سلیمانی ، خطبات سید سلیمان ندوی ، مجلد سے
- مراۃ الشعر ، از عبد الرحمٰن صاحب ، مجلد سے
- اضافیت ، پروفیسر رضی الدین ، عمر
- جزیرۂ سخنوراں ، از غلام عباس ، عہر
- آج کا مصر ، مفید معلوماتی کتاب ، عہر
- شاہنامۂ اسلام ، حصہ سوم سے
- مزاحیہ ڈرامے ، عہر
- پاپی (ڈرامے) اوپندر ناتھ اشک ، عہر
- آؤ (ڈرامے) سعادت حسن منٹو ، عہر

مکتبہ اردو لاہور

عصمت چغتائی

"زبانش در دہانِ من"

مکرّمی تسلیم

"ادب لطیف" کا سالنامہ ملا۔ سب سے پہلی چیز جو دلچسپی کی نظر آئی وہ اس کا سائز ہے۔ معاف کیجئے گا ہم لوگوں کا خیال ہے کہ پنجاب کے لوگوں کا ٹیسٹ کچھ پہاڑی قسم کا ہے۔ یعنی بڑی بڑی چیزیں پسند کرتے ہیں لیکن رسالہ کا قد دیکھکر اُس کی نزاکت اور سادگی دیکھکر جی چاہا کہ یہ رسالہ تو لکھنؤ جیسی رومانوی جگہ سے نکلتا ہوا نکلتا۔ معافی تو میں نے پہلے ہی مانگ لی ہے۔ ہاں میں نے عرض کیا نا کہ سادگی یعنی اس پر کوئی رومانی تصویر پھولوں اور غنچوں کی نہیں اور نہ ہی پشت پر کوئی مجرب طلاء کا اشتہار۔

لیکن اف! یہ جو صورت صرف نقش رسالہ کے اندر یہ آپ نے کیا بھر دیا ہے۔ فرصت بہت کم ملتی ہے۔ اس لئے ابھی تک صرف افسانے ہی پڑھے ہیں۔ واہ واہ کیا افسانے ہیں! افسانے ہوتے ہیں نشہ لانے کے لئے دُنیا کے دکھوں کو بھولنے کے لئے اور نیند آنے سے پہلے ذرا اچھے اور سہانے خواب دیکھنے کا انتظام کرنے کے لئے نہ کہ دُنیا بھر کی تکلیفیں گندگیاں اور بھونڈے چنسیاں برداشت کرنے کے لئے۔ سچ مانئے کرشن چندر کے انداز بالکل بگڑ گئے ہیں۔ یہ "دوزخی" کافر "نہ خدا دیکھے نہ رسول" اندھا دھند لٹھ گھماتا ہے۔ نہ ہوا یہ مسلمان ورنہ کبھی کا جہنم میں خون پیپ پیتا ہوتا۔ اُف یہ احمد علی کس قدر بدمزاج ہے! کیا چٹخارے لے لیکر کچے زخموں پر سے پھائے اکھاڑتا ہے۔ عصمت چغتائی صاحبہ جانے کس غلاظت میں اس کی پرورش ہوئی ہے! ایک شریف انسان کو یہ باتیں معلوم تک نہ ہونی چاہئیں۔ خیر اگر کوئی اتنا ذلیل ہے کہ یہ گندگیاں معلوم ہی ہو جائیں تو کیا ضرور کہ انہیں چلا چلا کر بتایا جائے۔ آج کل جاڑے ہیں اور ہر شریف انسان لحاف اوڑھتا ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ لحاف میں لیٹ کر "لحاف" پڑھکر یہی جی چاہا کہ بھڑ بھڑا کر باہر نکل آئیں۔ غلام عباس کی "آنندی" کی سرخی پڑھکر ذرا جی ٹھکانے لگا۔ یقین مانئے سارے وقت یہی انتظار رہا کہ اب آنندی کمرے کم دکھاتی آنکھوں سے تیر چلاتی چھم سے آئی اور اب آئی۔ مگر توبہ کیجئے۔ گھن ہے یہ شخص گھن! پتہ بھی نہ چلا اور عمارت کھوکھلی ہو جائے۔ منٹو نے نہ جانے کیسے دھواں بنکر دماغ گھونٹنا شروع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں ملیریا ہے مچھروں کے لئے گندھک کا دھواں خوب رہتا ہے!

اور لیجئے ذرا سکون قلب کے لئے سونے سے پہلے عبدالمجید بھٹی کے "بھگوان" کے درشن کی کوشش کی تو جناب نیلی آنکھوں میں دھول جھونکدی۔ یہ سب کے سب پاپی ہیں، رونگٹے نام لکھکر للچاتے ہیں اور فوراً منہ پر طمانچہ مار دیتے ہیں۔ آپ اپنے رسالے کا نام بدل کر بجائے "ادب لطیف" کے "کونین" کیوں نہیں رکھ لیتے یہ شکر میں لپیٹ کر زہر گلے سے اتار دینے کی ترکیب ٹھیک نہیں۔

معاف کیجئے گا۔ چوٹ لگے گی تو انسان سہلائے گا ہی لہٰذا یہ چند باتوں کے متعلق عرض کیا ہے۔ ان سے آپ کے رسالہ کے اوپر اعتراض کرنے کا مقصد نہیں ہے یہ صرف ادارہ کی غلطی ہے کہ وہ بجائے "ادیبوں" کے ان چند بلوائی قسم کے بدلگام لوگوں کی بکواس چھاپ دے۔

نوٹ: محترمہ عصمت چغتائی اپنے خط میں لکھتی ہیں۔ "ان مضمون میں چند لوگوں کے خیالات کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ علالت کے طور سے کم لکھا ورنہ جی چاہتا تھا خوب لکھوں۔ لحاف پر جو ملامتیں پڑیں گی وہ اسی میں جذب ہو جائیں گی!" خدا کرے یہ رجائیت صحیح ثابت ہو۔ ایڈیٹر

ہماری

عمدہ افسانوی ادب

گرہن:۔ راجندر سنگھ بیدی فن اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک مکمل ادیب ہے۔ گرہن آپ کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں کئی ایک غیر مطبوعہ افسانے شریک ہیں۔ قیمت مجلد عہ

نئے زاویئے:۔ نئے زاویئے کی اشاعت اردو ادب میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہے۔ اس ادبی تحریک کے چلانے والے زندگی سے فرار کے قائل نہیں۔ زندگی کے متعلق ان کے زاویئے نئے ہیں۔ اس مجموعہ کی تیاری میں جدید مدرسۂ فکر سے تعلق رکھنے والے مختلف اہلِ قلم نے حصہ لیا ہے اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اردو کے بہترین ادیبوں کی پیداوار ہے۔ مرتبہ:۔ کرشن چندر۔ قیمت مجلد تین روپے

منٹو کے افسانے:۔ سعادت حسن منٹو نئے دور کا کامیاب افسانہ نگار ہے۔ منٹو کی تحریر میں ایک زبردست چاٹ پھرت اور تیکھی جھلک ہوتی ہے آپ کی نگاہ گہری اور خیالات وسیع ہوتے ہیں۔ ۲۰ منتخب افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (عہ)

رفیقِ تنہائی:۔ علی عباس حسینی کے منتخبہ بہترین رومانی افسانوں کا مجموعہ۔ مصنف کی سادہ و صاف اردو۔ قیمت دو روپے چار آنے (عہ)

بگولے:۔ احمد ندیم قاسمی کا نام اور کام محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کے اشعار اور مختصر افسانے اردو ادب کے اس دورِ جدید میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو اردو داں ان کے نام سے واقف نہیں۔ اس کی معلومات ناقص ہیں۔ جو ادیب ان کی عظمت کا منکر ہے۔ اس کا ادبی ذوق محلِ نظر ہے (ڈاکٹر تاثیر) بگولے بیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجلد عہ

ٹوٹے ہوئے تارے:۔ کرشن چندر اردو کے مقبول ترین اور دل عزیز افسانہ نگار ہیں۔ ٹوٹے ہوئے تارے آپ کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانہ نگاری کا معراج دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ)

منظر پس منظر:۔ اختر اورینوی کے منتخبہ سولہ افسانوں کا مجموعہ جو ادبی حلقوں میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کی خارجی اور داخلی حقیقتوں کا فن کارانہ تجزیہ نمایاں ہے (زیرِ طبع)

کرنیں:۔ شفیق الرحمٰن کے افسانوں کا مجموعہ (زیرِ طبع)

ناظمہ کی آپ بیتی:۔ (دوسرا ایڈیشن) ایم اسلم کی یہ کتاب اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ بہت انتظار کے بعد دوسرا ایڈیشن طبع ہوا ہے۔ قیمت مجلد عہ

رنگ و بو:۔ (دیباچہ و تبصرہ نیاز فتح پوری) آپ کے افسانوں کا مجموعہ رنگ و بو اس میں ہم ہندوستانی معاشرت کے تمام خدوخال بڑی صناعت سے پیش کرتا ہے۔ دلچسپی، تجربات و مشاہدہ، نفسیاتی تجزیہ، رنگینیٔ نگارش آپ کے افسانوں کی جان ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے (عہ)

مکتبۂ اردو

کتابیں

شعر و سیاست

ماورا :۔ (ن۔م۔ راشد)۔ اس مجموعے میں راشد کی معریٰ نظمیں اور سانیٹ ہی شامل نہیں بلکہ وہ جدید آزاد نظمیں بھی ہیں جنہوں نے راشد کو موجد اور پیش رو کی حیثیت سے ایک لازوال شہرت بخش دی ہے۔ اکرشن چندر کا تعارف، راشد صاحب کا دیباچہ جدید آزاد شاعری پر خاص روشنی ڈالتے ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عمر)

نقشِ فریادی :۔ پروفیسر فیض احمد فیض اردو شاعری کے جدید اسکول کے بہت بڑے نقاد و شارح ہیں۔ آپ الفاظ کے بیجان پیکر میں ایک بیچین روح پیدا کر دیتے ہیں۔ پہلا مجموعہ کلام نقشِ فریادی اسرار اور خلوص تغزل اور سیاسی تفکر، رومانیت اور حقیقت پسندی کا نہایت کامیاب امتزاج ہے۔ مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

آہنگ :۔ اسرار الحق مجاز ترقی پسند حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ آہنگ اردو شاعری کے موجودہ رجحانات کا بہترین ترجمان ہے۔ غنائی وفور، جذباتی اور لفظی ترنم کے لئے آہنگ کا مطالعہ کریں۔ دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد شائع ہوا ہے۔ مجلد (عہ)

آیات و نغمات :۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے افکارِ نو کا تازہ مجموعہ، جو اردو شاعری کے دورِ ارتقاء کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آیات و نغمات میں شاعرِ انقلاب نے اپنے آپ کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ اس کی روح کا عکس ہے۔ اس کے نغمات میں اپنے دل کی دھڑکنیں سنیں، آپ کے دل کے تار مدتوں مرتعش رہیں گے۔ بہترین گردپوش، خوبصورت جلد، قیمت تین روپے آٹھ آنے (سہ)

کمپنی کی حکومت :۔ یہ کتاب انگریزوں کی پُرفریب سیاست، مظالم، اور ان کے وحشیانہ مظالم، حرص و طمع اور شرافت انسانی سے عاری اخلاق کی بے نقاب تصویر ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے میں انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے، اس کی مثال چنگیز و ہلاکو خاں کی تاریخ میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ جناب باری نے یہ کتاب لکھ کر ملک پر احسان عظیم کیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت مجلد (عہ)

آزادی کی راہیں :۔ (برٹرینڈ رسل) تحریک آزادی کی داستان بہت پرانی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان ایک مسلسل جدوجہد کا شکار رہا ہے۔ اس کتاب میں مشہور مفکر برٹرینڈ رسل نے ان تحریکوں کا ذکر کیا ہے جن کی گود میں آزادی پلتی ہے۔ اس میں ان خیالات کی وضاحت کی گئی ہے جس نے بے دست و پا انسانوں کو ایک زبردست قوت عطا کر کے مختلف سیاسی تحریکوں کا محرک بنایا۔ زیرِ طبع

ماتاہری ۔ سوانح حیات۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) **سیرت امام ابن تیمیہ** :۔ کارنامے اور سوانح۔ قیمت دو روپے (عہ)

پاکستان اور چھوت :۔ ہندو مسلم اتحاد پر بہترین تبصرہ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (عہ)

لاہور

مارچ کی رعائت!

جیساکہ اعلان کیا گیا تھا۔ امرت دھارا اوشدھالیہ کی ادویات میں اب مارچ والی رعائت نہیں کی جاسکتی ہے۔ ان سب ادویات میں تھوڑی تھوڑی رعایت ہمیشہ کے واسطے کردی ہے اور رعایتی قیمتوں میں ہی اب ادویات جارہی ہیں جنہوں نے رعایتی قیمتوں کا نقشہ نہ منگوایا ہو۔ وہ منگوا سکتے ہیں۔ کتابیں چونکہ پہلے کی ہی چھپی ہیں۔ اور آج کل کا مہنگا قیمت کا کاغذ لینا نہیں پڑا ہے۔ اس واسطے یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ ۱۔ یکم سے ۳۱ مارچ تک کوی دنو د ویدبھوشن **پنڈت ٹھاکر دت شرما وید** کی تصنیف کردہ ہر انسان کے پڑھنے کے لائق صحت و تندرستی کے اصول سکھلانے والی طبی کتب میں **نصف قیمت** کی رعایت کردی جاوے!

جیسے جیسے ختم ہو کر یہ کتب نئی چھپتی ہوں گی، پھر تو بعض اصل قیمت میں بھی دینی مشکل ہو جائینگی۔ جو کتب اپنے واسطے آپ ضروری سمجھتے ہیں جلدی آرڈر دیکر منگوالیں۔ فہرست میں قیمتیں پوری درج ہیں۔ ان سے آدھی لی جاویگی! جن کے پاس فہرست کتب نہیں ہے۔ وہ فوراً منگوالیں!! بیس روپیہ یا اس سے زیادہ کی کتب منگوانے پر جو نصف دس روپیہ کی ہوگی۔ محصولڈاک و پیکنگ نہیں لیا جاویگا!

المشتہر

منیجر ونشِ اوپکارک بکڈپو نمبر ۲۰ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

قومی زبان

کی

حفاظت، توسیع اور اشاعت

زمانہ کی رفتارِ ترقی کیساتھ ہندوستان بھر کی واحد قومی زبان "اردو" کی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوتی جا رہی ہے اور اب یہ اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں کھڑی ہو سکے مگر بدقسمتی سے آجکل کے نازک دور میں کچھ ایسی تحریکیں بھی چل رہی ہیں جن کا مقصد اردو کو اس کے قومی زبان بننے کے جائز اور فطری حق سے محروم کرنا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے دو اہم مسئلے ہیں، ایک تو اپنی زبان کو علمی اور ادبی ذخیروں سے معمور کرنا، دوسرے مخالفین کے حملوں سے اس کی حفاظت کرنا، ان دونوں کاموں کیلئے ضرورت اسکی ہے کہ اردو کی حفاظت، توسیع اور اشاعت کا کام کرنیوالی صدا انجمن کی بنیاد اور وسائل آمدنی کو زیادہ مستحکم اور مضبوط بنایا جائے تاکہ وہ اس اہم فریضہ کو زیادہ مستعدی اور اطمینان کیساتھ انجام دے سکے۔ انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی کی خدمات اس سلسلے میں محتاجِ بیان نہیں ہیں۔ یہ رجسٹری شدہ انجمن ہے اور اس کی مجلس نظما میں ملک کے نہایت ممتاز اور سربرآوردہ اصحاب شامل ہیں

انجمن ترقیِ اردو نے رکنیت کا ایک جدید سلسلہ

حامیانِ اُردو

کے نام سے شروع کیا ہے۔ اس کا چندہ صرف ایک روپیہ سالانہ رکھا گیا ہے تاکہ کم استطاعت اصحاب بھی آسانی کیساتھ اردو کی خدمت میں حصہ لے سکیں یہ سلسلہ جنوری ۴۲ء سے شروع کیا گیا ہے جو صاحب ایک روپیہ ادا کریں گے وہ دسمبر ۴۲ء تک سلسلہ حامیانِ اردو میں شریک سمجھے جائینگے۔ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی مجلس نظما توقع کرتی ہے کہ ۴۲ء کے اختتام تک کم از کم

پچاس ہزار حامیانِ اردو،

ضرور اپنی قومی زبان کی حفاظت، توسیع اور اشاعت کے لئے مقررہ چندہ ادا کر کے تیار ہو جائیں گے

ہر بہی خواہ اردو کا فرض ہے

کہ وہ جلد سے جلد سلسلہ حامیانِ اردو میں مستقل طور پر شریک ہو جائے

عبدالحق
معتمد انجمنِ ترقی اردو (ہند)

February 1942 Regd. L. No. 3521

ادبِ کثیف

حاجی لق لق



Only title page printed at the Peco Art Press, Outside Mochi Gate, Lahore

یل

۱۹۴۲ء

لکھنے والے

ڈاکٹر تاثیر	جوش ملیح آبادی
رفیع پیر	اسرار الحق مجاز
فیض احمد فیض	مخدوم محی الدین
راجندر سنگھ بیدی	ملک راج آنند

آٹھ آنے

مکتبۂ اُردو کی نئی مطبوعات

آہنگ ، اسرار الحق مجاز ۔ ترقی پسند حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ فنائی ، دوفور، جذباتی اور لفظی ترنم کے لئے آہنگ کا مطالعہ کریں دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد شائع ہوا ہے ، کاغذ، کور، جلد، خوبصورت ۔ دیباچہ پروفیسر فیض احمد فیض قیمت عہ

روحِ ادب حضرت جوش ملیح آبادی کا سب سے پہلا نظم و نثر کا مجموعہ ، جو اہلِ ذوق کے پُر اصرار مطالبہ پر ۲۲ سال بعد شائع ہوا ہے قیمت ۱؎

منظر و پس منظر ۔ اختر اورینوی کے منتخبہ بیس افسانوں کا مجموعہ جو ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہیں ۔ ان افسانوں میں زندگی کی خارجی و داخلی حقیقتوں کا فن کارانہ تجزیہ نمایاں ہے ، مجلد مع خوبصورت ٹائٹل قیمت عہ

رفیقِ تنہائی ، سید علی عباس حسینی کے رومانی افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ، زبان سادہ اور شیریں قیمت عہ

گرہن ۔ راجندر سنگھ بیدی کے بہترین نئے افسانوں کا مجموعہ اور جن میں کئی ایک غیر مطبوعہ افسانے بھی شامل ہیں ۔ قیمت عہ

نقشِ فریادی ۔ مجموعہ کلام فیض احمد فیض دیباچہ ن م راشد ۔ ٹائٹل خان بہادر عبد الرحمٰن چغتائی جلد نرم قیمت ۱؎

بگولے ، احمد ندیم قاسمی ، اُن معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں ۔ جو خود دیہاتی ہیں ۔ قاسمی صاحب کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کا مقامی رنگ ہوتا ہے آپ اس مقامی رنگ کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنا کر اسکے تانے بانے پر دیہاتی زندگی کے جاندار مرقعے تیار کرتے ہیں ۔ بگولے اُس افسانوی رہگذر پر سنگِ میل ہے جو ہمیں احمد ندیم کے ذہنی ارتقا کو ناپنے میں مدد دیتا ہے دلکش چیدا میں افسانے کا مجموعہ قیمت مجلد عہ

منٹو کے افسانے ، سعادت حسن منٹو نئے دور کا کامیاب افسانہ نگار ہے ، منٹو کی تحریر میں ایک زبردست جلیت پھرت ، تڑاک پھڑاک ہوتی ہے ، آپ کی نگاہ گہری اور خیالات وسیع ہوتے ہیں ۔ دھندوستان ، چھبیس نئی اور منتخب کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ قیمت مجلد عہ

ٹوٹے ہوئے تارے ، کرشن چندر اردو کے بہترین افسانہ نویس ہیں "ٹوٹے ہوئے تارے" ، دس شگفتہ افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے سلیس اور سادہ زبان ۔ خوبصورت گردپوش ۔ قیمت مجلد عہ ۔

پاپی ۔ مسٹر اوپندر ناتھ اشک ادبی دنیا میں خاصی شہرت کے مالک ہیں ۔ خصوصیت کے ساتھ آپ ایک ایکٹ کے ڈراموں میں بہت مشہور ہیں اس شعبے میں اشک صاحب نے ایک بہت بلند جگہ حاصل کر لی ہے ۔ زبان بہت سادہ اور مقالے بہت موزوں ، یہ ڈرامے متعدد بار اسٹیج ہو چکے ہیں ، مجلد ، خوبصورت ٹائٹل ۔ قیمت ۱؎

آؤ :۔ سعادت حسن منٹو کے دس ریڈیائی ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے ۔ جو دہلی ، لاہور ، بمبئی ، لکھنؤ اور حیدرآباد سے بارہا نشر ہو چکے ہیں ، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تادل سی دلچسپی ہے ۔

چھ آنے والے سلسلہ میں نئی کتابیں

جواہر لال	گوپال متل	رضا شاہ پہلوی	محمد اشرف عطا	اقبال اور اس کا پیام	خالدہ خانم
سبھاش بوس	"	ٹراٹسکی	فرنیندر ناتھ سیٹھ	عصمت انونو	ثریا اندریان
گاندھی	"	گورکی کی ڈائری	خواجہ احمد عباس	فاشزم	باری جاگیرداری عبد الملک

نگران
فیض احمد فیض

ایڈیٹر
چودھری برکت علی

چندہ سالانہ
چار روپے چار آنے

فی پرچہ
آٹھ آنے (۸/)

ادبِ لطیف لاہور

جلد (۱۵) اپریل ۱۹۴۲ء شمارہ ۱-۲

مندرجات

ادارہ

اشارات

آجکل ہماری تنقیدادب کے پہلو میں جہاں اور بہت سے کانٹے کھٹک رہے ہیں وہاں ایک نہایت کرب انگیز کانٹا جنسیاتی مسائل کا ہے۔ ایک زمانہ میں جنسیات کے تذکرہ کو ادب میں قطعاً ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ پرانے زمانہ کے کئی شعرا اس دستور زباں بندی سے بے نیاز رہے۔ اسکے بعد اصلاحی ادیبوں اور خاص طور پر افسانہ نگاروں نے دبی زبان میں ان مسائل پر گفتگو کرنا شروع کی۔ لیکن یہ اُدبا جنسیات کو تشبیہ و استعارہ کے حریر و پرنیاں میں لپیٹ کر اس طرح پیش کرتے تھے۔ گویا وہ جنسیات نہیں، تصوف یا فلسفہ کی کوئی شق ہے۔ جنگ عظیم کے بعد ساری دنیا کے ادب میں صاف گوئی اور حقیقت پسندی کے رجحانات زور پکڑ گئے۔ ہمارا ادب بھی اس تحریک سے متاثر ہوا اور یہاں کے ادیبوں کی توجہ سب سے پہلے اُسی مسئلہ پر مرکوز ہوئی جس کے متعلق سب سے زیادہ خاموشی برتی جاتی تھی۔ یعنی جنسیات کا مسئلہ۔ ان ادیبوں نے اُس خوف اور جھجک، اُس حجاب اور اخفا سے آہستہ آہستہ آزاد ہونا شروع کیا۔ جو اس موضوع سے مستقلاً وابستہ ہو چکے تھے، ان ادیبوں نے رومانی رنگ و روغن اور منافقانہ پند و موعظت سے الگ ہوکر اس مسئلہ کے خالص جسمانی نفسیاتی اور عمرانی پہلوؤں کا جائزہ لینا شروع کیا، بعض نقاد اس رجحان کو ترقی پسند تحریک کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قاضی عبدالغفار اور اُن کے ہمعصر لکھنے والے ترقی پسند، جماعت کے قیام سے بہت پہلے اس کی بنیاد رکھ چکے تھے، ترقی پسندوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ سماج اور اسکے مسائل کو اجتماعی حیثیت سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی مصنف کی توجہ کسی ایک مسئلہ پر مرکوز ہوکے رہجائے۔ یا اُس کی تحریروں سے ان مسائل کی اضافی اہمیت کا غلط اندازہ قائم ہو تو ہم اُسے صحیح معنوں میں ترقی پسند نہیں کہہ سکتے، جیسے کہ ابھی کہا گیا تھا۔ جنسیات کے متعلق حقیقت پسندی اور صاف گوئی ان ترقی پسند اُدبا سے پہلے ہمارے ادب میں شامل ہو چکی تھی، ان کا اضافہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس مسئلہ کو بالکل الگ تھلگ یا قائم بالذات تصور کرنے کے بجائے اسے سماج کے بنیادی مسئلہ کا ایک جزو سمجھیں۔ اور اُس کا مجموعی سماجی پس منظر اور جملہ سماجی متعلقات کی روشنی میں مطالعہ فرمائیں۔ پرانے خیال کے نقادوں کے پاس فحاشی اور عریانی، ایک ایسا حربہ ہے۔ جسے وہ ہر نئی تحریک اور ہر نئے ادیب کو مطعون کرنے کے لئے استعمال کرتے رہتے ہیں اور دنیا بھر میں ہمارا ہی ایک ملک ایسا ہے۔ جہاں یہ حربہ ابھی تک کارگر ہو سکتا ہے، لیکن اس سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ حقائق (Facts) کو فحش یا غیر فحش قرار دینا مہمل اور لایعنی بات ہے۔ البتہ پڑھنے والے یا لکھنے والے کا ذہن فحش پسند ضرور ہو سکتا ہے۔ دنیا کی قریباً تمام مقدس کتب میں عورت مرد کے تعلقات نہایت وضاحت سے مذکور ہیں۔ اگر ان مسائل کا تذکرہ ہی فحاشی کی دلیل ہے تو ہمیں اپنی پاکیزہ ترین تحریرات سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ البتہ ہمارے ادیبوں کو یہ کوشش ضرور کرنی چاہیئے کہ اگر پڑھنے والے کا ذہن فحش پسند ہے تو وہ اپنے ذہنی جرم کی ذمہ داری لکھنے والے پر آسانی سے عائد نہ کر سکے۔ ایک حد تک یہ ناگزیر ہے۔ لیکن ایک حد تک اس کی پیش بندی کی جا سکتی ہے۔ وہ اس طریقہ سے کہ اس مسئلہ کو دیگر مسائل کی طرح بالکل خارجی اور بے تعلق نقطۂ نظر سے پیش کیا جائے۔ تحریریں وہ لذتیت اور نیم حجاب یا نیم عریانی نہ ہو جس کی وجہ سے پڑھنے والے کے ذہن میں محض ایک گدگدی سی پیدا ہوتی ہے۔ اور اُسے وہ ذہنی یا جذباتی تنقیہ حاصل نہیں ہوتا۔ جو اچھے ادب کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس موضوع پر مختلف صاحب فکر حضرات سے خیال آرائی کی درخواست کی گئی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ دو تین نمبروں میں اس مسئلہ کی مکمل وضاحت ہو سکے گی۔

ترقی پسندی کے موضوع پر کافی بحث ہو چکی ہے اور کافی بحث کی گنجائش ہے۔ اس سلسلہ میں مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر کے مضمون کا جواب پروفیسر فیض احمد فیض کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ لیکن اسے بحث کا اختتام نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بہت سے مسائل اس دوران بحث میں ایسے بھی پیدا ہو گئے ہونگے جو مزید وضاحت کے محتاج ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ مختلف الخیال اصحاب ان مسائل پر روشنی ڈالینگے

چونکہ فروری کا پرچہ وسط مارچ میں شائع ہوا تھا۔ اسلئے ہم مارچ اور اپریل کا پرچہ یکجا شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ گذشتہ مہینوں میں ہمیں جن دقتوں کا سامنا تھا۔ اُن میں سے بیشتر کا حل میسر آ گیا ہے اور آئندہ سے ہم پرچہ کو باقاعدگی سے شائع کرینگے۔

اسرارالحق مجاز

شکوۂ مختصر

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی اُن زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوقِ رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں اُن پاک باطن نکتہ چینوں سے
لبِ معجز نمانے، جن کے مجھ پر آگ برسائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے اُن پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنہوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی
مجھے شکوہ نہیں دیر و حرم کے آستانوں سے
وہ جن کے در پہ کی ہے مدتوں میں نے جبیں سائی
مجھے شکوہ نہیں افتادگانِ عیش و عشرت سے
وہ جن کو میرے حالِ زار پر اکثر ہنسی آئی
مجھے شکوہ نہیں اُن صاحبانِ جاہ و ثروت سے
نہیں آئی میرے حصہ میں جن کی ایک بھی پائی
زمانہ کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن، آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

پروفیسر فیض احمد فیضؔ

ترقی پسند ادب کی نفسیاتی تحلیل

اس عنوان سے ادبِ لطیف کے فروری نمبر میں میرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کا ایک مبسوط مضمون شائع ہوا ہے۔ اور مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں اسکے جواب میں ترقی پسند نظریہ کی وضاحت کروں۔ اس فرمائش کی تعمیل کا وعدہ کرتے ہوئے مجھے خیال نہیں تھا کہ یہ کام اتنا دشوار ہوگا۔ میرزا صاحب نے چند صفحوں میں اتنے مبحث مطلب اور مختلف فیہ مسائل و دعاوی کو یکجا کر دیا ہے کہ ؎ ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می‌نگرم — کرشمہ دامن دل می‌کشد کہ جا اینجاست

لیکن خوش قسمتی سے میرزا صاحب نے ترقی پسند نظریہ کے خلاف جو اعتراضات کئے ہیں اور ترقی پسند ادب کو جن جرائم کا مرتکب گردانا ہے۔ وہ کچھ بہت نئے نہیں ہیں۔ اسکے علاوہ انہوں نے اپنے بہت سے اعتراضات و الزامات کا جواب بھی خود ہی ارشاد فرما دیا ہے۔ جسکے لئے میں انکا ممنون ہوں۔ پہلے حصہ میں میرزا صاحب نے ترقی پسند نظریہ کو جھٹلایا ہے اور دوسرے حصہ میں ترقی پسند مصنفین کے ادبی اعمال سے باز پرس کی ہے۔ یہ تقسیم اُن کے مضمون میں موجود نہیں (نالہ پابند نے نہیں ہے)، لیکن بحث کی سہولت کے لئے یہ تحکم غالباً جائز ہے۔ پہلے نظریاتی حصہ کو لیجئے۔

۱۔ میرزا صاحب کا پہلا کلیہ یہ ہے کہ شاعری کا مقصد اولیں نشاطِ دل و دماغ ہے۔ فرماتے ہیں۔ "جبتک ادب کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہے۔ اس سے صناعت کا عنصر جدا نہیں کیا جاسکتا اور یہ شامل ہے تو شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو (ہماری بحث شاعری تک محدود رہیگی)، اس کا مقصدِ اولیں نشاطِ دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ . . . . . فقط نظر صناعانہ ہو اور پروپیگنڈا کا شائبہ بھی نہ ہو ورنہ شاعری یا ادب کا غلط استعمال ہوا۔ موضوع جو کچھ ہو طرز ادا میں فن کارانہ بانکپن قائم رہے۔ ادب کو جہاں کسی غرض یا مفاد کا آلۂ کار بنایا اس کی تاثیر اور دلکشی فنا ہوئی۔ پھر شاعری شاعری نہیں محض پروپیگنڈا ہے"۔ اس دعوے کے ثبوت میں میرزا صاحب نے متعدد اور دلائل پیش کئے ہیں۔ یعنی "فنونِ لطیفہ میں مصوری، موسیقی، اور بت تراشی بھی شامل ہیں۔ ان سے پراپیگنڈہ کا کام نہیں لیا جاتا۔ پھر غریب شاعری سے توقع کی جاتی ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی دلالی کرے"، "ادب کا مطالعہ تو وہ معصوم اور دلچسپ مشغلہ ہے جس سے سائینسدان، فلسفی، مفکر بلکہ ہر طبقہ اور حیثیت کا شخص دن بھر کی مصروفیت اور تھکن کے بعد اپنی فرصت کے لمحے اس طرح صرف کر سکتا ہے اور ایسے ماحول میں پہنچ سکتا ہے۔ جہاں دنیا کے مکروہات سے تھوڑی دیر کے لئے نجات پا جاوے۔ . . . ادب میں بھی وہی پھر خاتا نہ دھندا مسرت کے بجائے طبیعت کو اور زیادہ مضمحل اور اندوہگین بنا دیتا ہے۔ اور اس طرح ادب کا حقیقی منشا فوت ہو جاتا ہے"۔ اس عبارت میں کئی ایک باتیں قابل غور ہیں۔ شاعری میں نشاطِ دل و دماغ اولیں مقصد اسلئے ہے۔ کہ شاعری سے صناعت کا عنصر جدا نہیں جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اگر کسی فن سے صناعت کا عنصر جدا نہ کیا جاسکے (اور ظاہر ہے کہ اسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ورنہ ہم کسی فن کو فن کہہ ہی نہیں سکتے) تو اس کا مقصدِ اولیں نشاطِ دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں۔ اس کلیہ کو صحیح تسلیم کر لینے سے بہت دلچسپ نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ کوزہ گری، قالین بافی، تعمیرات وغیرہ مشرق کے مشہور فنون میں سے ہیں۔ اور ان سے صناعت کا عنصر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ انکا مقصد نشاطِ دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں۔ جہاں آپ نے انہیں اکل و نوش، نشست و برخاست رہائش و سکونت یا کسی اور غرض کا آلۂ کار بنایا۔ ان کی تاثیر و دلکشی فنا ہوئی۔ پھر وہ تعمیر یا کوزہ گری نہیں محض پروپیگنڈا ہے۔ اگر آپ کسی نہایت بدوضع مکان کے مالک ہیں تو آپ رہائش یا سکونت کو اسکا مقصد اولیں ٹھہرا سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی تعمیر میں صناعت کا عنصر شامل ہو جائے۔ تو پھر اس کا مصرف نشاطِ دل و دماغ کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اس میں کوئی دروازہ، کوئی کھڑکی، کوئی چھت، کوئی فرش نہ ہو تو بھی مضائقہ نہیں۔ اسلئے کہ رہائش تو ثانوی اور بہت کم مقصد ہے۔ نشاطِ دل و دماغ اسے دیکھنے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ آپ اس میں رہ بھی سکیں۔ یہی حال باقی فنون کا

ہے۔ مجھے نشاطِ دل و دماغ کی اہمیت سے انکار نہیں ظاہر ہے کہ اگر کسی شے میں صناعت کا عنصر موجود ہے۔ تو اس سے یہ فرحت ضرور میسر آئے گی لیکن اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ اسکے باقی مقاصد نسبتاً غیر اہم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری سے صناعت کا عنصر جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بھی مسلم کہ یہ عنصر نشاطِ دل و دماغ کا ضامن ہے۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہوا کہ اسکا مقصدِ اولین اظہارِ جذبات، تنقیدِ حیات یا کوئی اور چیز نہیں۔ بلکہ اسی نشاط کی فراہمی ہے۔ کم از کم میرزا صاحب نے اسکے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ مجھے اس پر چنداں زور دینے کی ضرورت نہیں معلوم کہ میرزا صاحب کا اپنا دعویٰ خود بھی تسلیم نہیں اور آگے چل کر وہ اس کی تردید بھی کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں "شاعری میں تخیل کے علاوہ طرزِ ادا اور بیان کی خوبی بمنزلہ اُن زیوروں کے ہیں۔ جن سے عروسِ سخن سنواری جا سکتی ہے۔ ان کو ادب کا مقصود بالذات کہنا غلط ہے۔" ظاہر ہے کہ شاعرانہ صناعت تو اسی طرزِ ادا اور بیان کی خوبی سے عبارت ہے اور اگر یہ محض عروسِ سخن کے زیورات میں سے ہیں اور انہیں مقصود بالذات کہنا غلط ہے تو ان کو یا ان کے پیدا کردہ نشاطی تاثرات کو شاعری کا مقصدِ اولین نہیں ٹھہرا سکتے۔ تو پھر شاعری کا مقصود بالذات یا مقصدِ اولین کیا ہے۔ میرزا صاحب اس کا جواب دیتے ہیں۔ "شاعری کا مقصد جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اسکے سوا کچھ نہیں کہ حیات کی تنقید و تفسیر کرے اور ایسی زبان میں اور ایسے اسلوب سے کرے کہ یہ تفسیر یا تنقید اپنے حسن و صداقت سے دل و دماغ کے لئے تسکین یا راحت کا موجب ہو" ایک کی بجائے دو مقاصد ہو گئے۔ ایک طرف تنقید و تفسیرِ حیات ہے۔ دوسری طرف زبان اور بیان کی خوبی ہے اب کون فیصلہ کرے کہ ان میں اول کون ہے اور آخر کون؟ فرض کیجئے کہ ایک شاعر ناقدِ حیات تو ہے۔ لیکن اسکا نقطۂ نظر صناعانہ نہیں۔ دوسرے شاعر میں زبان اور اسلوب کی خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن اس میں تنقیدِ حیات یا مفقود ہے یا ناقص۔ ان دونوں میں کسے ترجیح دی جائے۔ بقول میرزا صاحب کے زبان اور بیان مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اسلئے مقصدِ اول تنقیدِ حیات ہوئی۔ لیکن میرزا صاحب تنقیدِ حیات والے فقرہ کے بعد اگلا فقرہ یہ لکھتے ہیں۔ "اسی سے ہم کہتے ہیں کہ شاعری کا مقصود بالذات دماغی اور روحانی تسکین کے سوا کچھ نہیں" یہ عجب مصیبت ہے۔ کہ مرزا صاحب صغریٰ کبریٰ کچھ قائم کرتے ہیں اور نتیجہ کچھ اور برآمد کر لیتے ہیں۔ انکے الفاظ سے تو فقط اسی قدر ثابت ہوتا ہے۔ کہ شاعری کا مقصد محض تنقید و تفسیرِ حیات ہے۔ بیان کی خوبی اس تنقید کا لازمی انداز ہے اور دماغی تفریح اسکا لازمی نتیجہ ہے لیکن شاعری کا مقصد دوگونہ ہے۔ (۱) تنقید و تفسیرِ حیات (۲) فن کارانہ بانکپن۔

اور اگر وہ ان دونوں مقاصد میں کامیاب ہے تو اس سے پڑھنے والے کو لازماً دماغی تسکین و تفریح حاصل ہوگی۔ اتنی سی بات ثابت کرنے کیلئے میرزا صاحب کو اتنی کاوش کی ضرورت نہ تھی [illegible] ترقی پسند [illegible] اختلاف نہیں [illegible] کہ ترقی پسند مصنفین [illegible] منافی [illegible] قائل نہیں [illegible] معترض [illegible] کوئی وجہ نہیں۔ ادب برائے زندگی کے معنی صرف اسی قدر ہیں۔ کہ شاعری زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے۔ اسلئے اسے زندگی سے بے تعلق یا مجموعۂ انسانی کے اجتماعی مفاد کے منافی نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے یہ مان لینا کسی طرح بھی لازم نہیں آتا۔ کہ ایسی شاعری کو زبان و بیان کی جملہ خوبیوں سے معرا ہونا چاہیئے ذرا ایک لمحہ کے لئے فنِ تعمیر کی مثال کی طرف لوٹ آیئے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک مکان کا مقصدِ اولین سکونت و رہائش ہے۔ تو آپ اس سے یہ نتیجہ کیسے برآمد کر سکتے ہیں۔ کہ وہ تعمیراتی حسن کی اہمیت کا قائل نہیں یا بے ڈول اور بدوضع مکان کی تعمیر کا خواہاں ہے؟ اس تمام بحث سے یہ ثابت ہوا کہ جہاں تک شاعری اور حیات اور شاعری اور نشاطِ دل و دماغ کا تعلق ہے میرزا صاحب کے نقطۂ نظر اور ترقی پسندوں کے نظریہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں اور اگر ہے تو اسے میرزا صاحب کے تخیل کی سند حاصل ہو تو ہو ترقی پسند تخیل کی سند حاصل نہیں۔ دونوں کو یہ تسلیم ہے کہ شاعری کا مقصد تنقید و تفسیرِ حیات ہے۔ اور وہ اس انداز سے کہ پڑھنے والے کو نشاطِ دل و دماغ حاصل ہو۔

اب بحث اس بات پر رہی کہ تنقید و تفسیرِ حیات کی نوعیت اور اسکا انداز کیا ہونا چاہیئے۔

(۲) میرزا صاحب کا دوسرا ارشاد یہ ہے کہ "پروپیگنڈا کا شائبہ بھی نہ ہو، موضوع جو کچھ بھی ہو طرزِ ادا میں فن کارانہ بانکپن قائم رہے۔ اور جہاں ادب کو کسی غرض یا مفاد کا آلۂ کار بنایا اُس کی تاثیر و دلکشی فنا ہوئی" پہلے اس دوسرے فقرہ پر غور کیجئے۔ "موضوع جو کچھ بھی ہو" یہ بالکل غیر مشروط بات ہے، اگر طرزِ ادا میں فن کارانہ بانکپن قائم رہے۔ تو شعر کامیاب ہے۔ اور جو موضوع تبلیغی (Propagandist) ہو تو؟ فرض کیجئے کہ

ایک شاعر کا موضوع ایسا ہی ہے اور اُس نے فنکارانہ بانکپن کو بھی ہاتھ سے نہیں دیا تو اُس کی شاعری کامیاب ہوئی یا ناکام! شاید میرزا صاحب کا یہ مطلب ہے کہ پروپیگنڈا اور فنکارانہ بانکپن میں بنیادی تضاد ہے اور یہ کبھی یکجا ہو ہی نہیں سکتے۔ اسکا ثبوت؟ میرزا صاحب نے اس تضاد کی کہیں تشریح نہیں فرمائی۔ میرزا صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں۔ "شاعر اگر دراصل شاعر ہے تو اسکا موضوعِ سخن جو کچھ بھی ہو زندگی کی تنقید یا ترجمانی ضرور ہوگی"۔ اس طرح میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ "شاعر اگر دراصل شاعر ہے تو اُس کا موضوعِ سخن خواہ کچھ بھی ہو اس میں فنکارانہ بانکپن ضرور قائم رہیگا" اب یہ ثابت کرنا میرزا صاحب کا کام ہے۔ کہ ایک دراصل شاعر کی صلاحیتیں پراپیگنڈا کو فنی رنگ دینے سے عاجز ہیں۔ لیکن آخر یہ پراپیگنڈا ہے کیا چیز؟ پروپیگنڈا کے لغوی معنی تو صرف تبلیغ یا تلقین کے ہیں اور کیا میرزا صاحب کی رائے میں واقعی کوئی اچھا شاعر ایسا بھی گزرا ہے جس نے زندگی کے متعلق کسی نقطۂ نظر یا کسی بنیادی اصول یا اصولوں کی تلقین یا تبلیغ نہ کی ہو۔ خوش قسمتی سے میرزا صاحب کی رائے یہ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں "ادب برائے ادب نے انسانی کردار کے اُن خصوصیات کو جن کا مظاہرہ چیدہ حیات میں ہوتا ہے کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ اور محض خیالی اور مصنوعی دنیا نہیں بسائی۔ نیکی و نکوکاری، تواضع، اخلاق، حیا، نیز دیگر اخلاقِ حمیدہ کی تعریف کرکے ان کی طرف رغبت دلائی"۔ یعنی اگر ادب برائے ادب کے حامی تواضع اور نکوکاری کی طرف رغبت دلائیں تو یہ پروپیگنڈا نہیں ہے اور اس سے فنکارانہ بانکپن میں بھی فرق نہیں آتا لیکن اگر ادب برائے زندگی کے مدعی حریّت اور مساوات کی تلقین کریں تو یہ پراپیگنڈا ہی ہے اور ایسے فنکارانہ بانکپن کسی طرح جیب میں بھی حاصل نہیں۔ شاید میرزا صاحب یہ کہنا چاہتے ہوں کہ پرانے شعراء حیا اور نکوکاری کی تلقین دبے الفاظ میں کرتے تھے اور موجودہ شعرا اپنے عقائد کا ڈھنڈورا کھلے بندوں پیٹتے ہیں۔ لیکن انہوں نے تو قید یہ لگائی تھی۔ کہ پراپیگنڈا کا شائبہ تک نہ ہو۔ اگر میرزا صاحب کے محبوب شعرا میں پروپیگنڈا کا شائبہ تک نہیں ہے تو میرزا صاحب کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ کسی چیز سے نفرت یا اُس کی طرف رغبت دلا رہے ہیں۔ پھر ہمارے پرانے شعراء کا پروپیگنڈا کچھ ایسا مخفی بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اگر میرزا صاحب کی بات مان لی جائے تو مذہبی (عرفی، صوفیانہ) (رومی)، اور اخلاقی (سعدی)، شاعری بالکلیہ اور عزلیہ شاعری کا بیشتر حصہ شاعری کا غلط اور بیجا استعمال ہوا۔ یا شاید میرزا صاحب کا مقصود یہ ہے کہ شعرا مختلف صفات کی تلقین انفرادی حیثیت سے کرتے تھے اور کوئی غرض یا مفاد انکے پیشِ نظر نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ غرض یا مفاد ایسے ہی مبہم الفاظ ہیں جیسے پراپیگنڈا مثلاً نوعِ انسانی کے اخلاقی معیار کو بلند کرنا غرض ہے کہ نہیں ہے۔ کسی مذہبی۔ نظری، یا اخلاقی فرقہ کے خیالات کی حمایت کرنا مفاد کی ترجمانی ہے یا نہیں ہے، اگر ان پرانے شعرا کے پیشِ نظر کوئی قابلِ ستائش اغراض و مقاصد تھے ہی نہیں۔ تو پھر اُن کی تلقینات کو سراہنا قطعاً مہمل اور بیکار بات ہے۔ انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اور کس لئے کر رہے ہیں۔ لیکن اُن کے کلام سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اغراض یا اپنے مفاد سے اتنے بے خبر تھے محسوس یہ ہوتا ہے کہ میرزا صاحب پروپیگنڈا اور غرض و مفاد، کو کسی ایسے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں جو اُن کے اپنے ذہن میں محفوظ ہے اور جن کا اطلاق محض ترقی پسند شعراء پہ ہوتا ہے اور باقی تمام شعرا پر نہیں ہوتا۔ اصل فن اور پروپیگنڈا میں کوئی بنیادی تضاد نہیں۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ تبلیغی شاعر پروپیگنڈا کی دھن میں یا تخیل کی کم مائیگی کے باعث اپنے فن پہ پوری توجہ نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انکا کلام ہمیں فنی اعتبار سے ناقص دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ پروپیگنڈا کا قصور نہیں شاعر کے فن کا عجز ہے۔ بدقسمتی سے ان ناکام شعرا کی تعداد کامیاب تبلیغی شعرا کے مقابلہ میں اتنی زیادہ ہے کہ ہمیں تبلیغی شاعری کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر دکھائی دینے لگتی ہے، لیکن اس سے ایک کلیہ وضع کرلینا منطق کی بالکل ابتدائی غلطی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ چونکہ وسطی ہندوستان کے باشندے عام طور سے کمزور اور ٹھگنے ہوتے ہیں۔ اسلئے وہاں کوئی لمبا تڑنگا انسان پیدا ہی نہیں ہو سکتا یا چونکہ ہمارے ہاں عام طور سے مئی میں بارش نہیں ہوتی۔ اس لئے اس مہینے میں مینہ برس جانا قوانینِ فطرت کے خلاف ہے۔ جیسا میرزا صاحب نے ارشاد فرمایا تھا۔ "اگر شاعر دراصل شاعر ہے۔ تو اس کا موضوعِ سخن خواہ کچھ بھی ہو وہ اسے شاعری کی سطح سے گرنے نہیں دیگا" اور میرزا صاحب ایسے حقیقیات کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "جوش اور غالباً احسان دانش کو نکال دو تو کسی کی شاعری میں توپ تفنگ، لاشوں کے ڈھیر" وغیرہ وغیرہ کے سوا کچھ نہیں"۔ یہ دونوں بیچارے ترقی پسندوں کی صف سے غالباً اسی جرم میں نکالے گئے کہ میرزا صاحب کی رائے میں ان کی شاعری ترقی پسند ہونے کے باوجود ایسی ناکام

نہیں۔ اگر ان کی شاعری پروپیگنڈا کو ہضم کر لینے کے باوجود ابھی تک زندہ ہے۔ تو یہی ثابت ہوا کہ پروپیگنڈا ایسا سمِ قاتل نہیں۔ جس سے کوئی بھی جانبر نہ ہوسکے۔ البتہ اسکے لئے بہت مضبوط معدہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ ہر کسی کے بس کا کھیل نہیں۔ مجھے یہ ماننے میں بھی تامل نہیں۔ کہ بہت سے شعرا جو اپنے کو ترقی پسند کہتے ہیں فنی اعتبار سے کامیاب نہیں ہیں۔ لیکن آخر شاعری کی کونسی صنف یا ادب کی کونسی تحریک ایسی ہے جس نے اچھے اور برے دونوں طرح کے لکھنے والے پیدا نہیں کئے۔ اگر آج تک جتنا غزلیہ کلام لکھا گیا ہے جمع کیا جائے تو اس میں سے کم از کم نوے فیصدی بیکار اور بے مصرف ثابت ہوگا۔ آپ اندازہ تو کیجئے۔ گزشتہ ڈیڑھ صدی میں ہمارے ہاں کروڑوں ہی غزلیں لکھی گئی ہوں گی اور ہزاروں ہی شعرا پیدا ہوتے چلے گئے لیکن گنتی کے چند شعرا ہیں جن کا کلام اب تک محفوظ ہے اور قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے۔ تو کیا اس سے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ غزل بہت ناکام صنفِ سخن ہے۔ میرزا صاحب کے تطبیق میں سودا، میر، غالب، ذوق اور چند دوسرے شعرا کو نکال دو تو اس میں محرم۔ شاید ابتر نظر او ر ہوتے کم رہ کے سوا کیا رہ جاتا ہے؟ اگر انہیں اساتذہ کے نام غزل کی کامیابی کی دلیل ہیں تو میرزا صاحب کو ترقی پسند یا تبلیغی شاعری کی طرف سے جوش کی ضمانت لینے سے کیوں انکار ہے۔

۳۔ رہی یہ بات کہ مصوری، موسیقی اور بت تراشی سے پروپیگنڈا کا کام نہیں لیا جاتا۔ معلوم نہیں میرزا صاحب کو یہ اطلاع کہاں سے بہم پہنچی ہے۔ ان فنون کو تو پروپیگنڈا سے الگ ہوئے مشکل جمعہ جمعہ آٹھ دن گزرے ہیں ورنہ ماسوا اسلام کے جملہ مذاہب کی سب سے بڑی پروپیگنڈا ایجنسیاں یہی تو تھیں۔ پرانے مصور اور بت تراش مندروں اور کلیساؤں کے پیشہ ور کارندے ہوا کرتے تھے۔ اور ان کے شاہکار نہ صرف مذہبی تبلیغ میں مد ہوتے تھے بلکہ ان کی کشش سے اہلِ مندر و کلیسا کی جیبیں بھی گرم ہوا کرتی تھیں۔ یہی حال رقص اور موسیقی کا ہے، عرب کے رجز خوانوں سے لے کر ہٹلر کے نازیوں تک کوئی جنگ جو طبقہ ایسا نہیں گزرا۔ جس نے موسیقی سے پروپیگنڈا کا کام نہ لیا ہو۔ موسیقی آج تک یا لوگوں کو سلانے کے کام آتی رہی یا جگانے کے۔ آج کل بھی ان فنون سے پروپیگنڈا کا کام لیا جاتا ہے۔ یا کم از کم اس کی توقع کی جاتی ہے۔ اسکے علاوہ اگر غریب شاعری سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مزدوروں کی دلالی کرے تو یہ اس پر کوئی نیا ظلم نہیں ہے۔ آج سے پہلے اس سے نوابوں اور رئیسوں کی دلالی کا کام لیا جاتا رہا۔ اور اس سے پہلے پروہتوں اور کاہنوں کی دلالی کا۔ آخر مزدوروں کی دلالی ہی ایسی قابلِ نفرین کیوں ہے؟ ہمیں غریب شاعری سے ہمدردی ہے۔ لیکن جب تک شاعر کسی سماجی طبقہ سے وابستہ ہے۔ شاعری کو یہ مذموم فعل کرنا ہی پڑیگا۔ میرزا صاحب بار بار اس بات پر طعن کرتے ہیں۔ کہ مزدوروں کی حمایت پیٹ پالنے کا ڈھونگ ہے۔ اور ترقی پسند ادیب پبلشروں سے مل کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے ایک منظم سازش کر رہے ہیں۔ اسکا جواب سوائے اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں پیٹ پالنے کے اس سے کہیں زیادہ آسان دھندے موجود ہیں۔ سرکار کی مداحی یا قرابین کی آستان بوسی ہی کر لیجئے، اس میں جان کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ اور مال کی افزائش بھی، مقربینِ درگاہ سے ساز باز کر لینا پبلشروں سے ساز باز کرنے سے کچھ زیادہ کٹھن نہیں ہے۔ اسکے لئے نہ انقلاب کی ضرورت ہے۔ نہ کوئی لمبی چوڑی سازش درکار۔ اگر کچھ ترقی پسند مصنف ایسے ہیں کہ جنہیں پبلشروں سے ساز باز کرنے اور پیٹ کی خاطر اپنے اصول و عقائد بیچنے کے سوا کام نہیں۔ تو وہ میرزا جعفر علی خاں صاحب کے علم میں ہونگے، ہماری تو ان حضرات سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی نہ ہم کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں۔

۴۔ لیکن موضوعِ بحث کی طرف رجوع کیجئے۔ میرزا صاحب کا اگلا ارشاد یہ ہے۔ کہ ادب کا مشغلہ ہی وہ دلچسپ یا معصوم مشغلہ ہے۔ جس سے ہر شخص دن بھر کی مصروفیت اور تھکن کے بعد اپنی فرصت کے لمحے اس طرح صرف کر سکتا ہے۔ . . جہاں دنیا کے مکروہات سے تھوڑی دیر کو نجات پا جاوے . . . ادب برائے زندگی یہ نعمت بخشنے سے قطعاً قاصر ہے۔ کیونکہ اپنی بہترین صورت میں بھی اُسی کشاکش کا آئینہ ہے۔ جس کا عملاً سامنا ہوتا ہے؟ اول تو اگر محض مکروہاتِ دنیا سے نجات مقصود ہے۔ تو ادب کے علاوہ کئی اور مشاغل یہ تسکین بہم پہنچا سکتے ہیں۔ یہ مشاغل ایسے معصوم نہ سہی۔ لیکن دلچسپ ضرور ہیں مثلاً افیون خوری، بادہ نوشی وغیرہ وغیرہ، جہاں تک محض مکروہاتِ دنیا سے نجات پانے تعلق ہے۔ یہ صلاحیت

دونوں میں مشترک ہے ۔ اگر محض یہی مقصود ہے تو ادب کو ان پر کوئی ترجیح ہونی چاہیئے ۔ اور اگر اسے ترجیح ہے تو اس میں کوئی اور ایسا وصف ہوگا ۔ جو ان دوسرے مشاغل میں موجود نہیں ۔ اور اسی کو ہم ادب کا مابہ الامتیاز سمجھیں گے ، میرزا صاحب نے دو ہی باتیں گنوائی تھیں ۔ ایک تنقید حیات اور دوسری صناعانہ اسلوب ، بلکہ اسے ایک ہی بات کہنا چاہیئے یعنی صناعانہ تنقید حیات ۔ اب اس پر تیسری بات یہ اضافہ ہوئی کہ اس تنقید حیات کو اس کشاکش کا آئینہ نہیں ہونا چاہیئے جس کا عملاً سامنا رہتا ہے ۔ تو پھر اسے کونسی حیات اور کس کشاکش کا آئینہ ہونا چاہیئے ؟ کسی خیالی اور مصنوعی حیات کا جس میں یہ کشاکش بالکل ناپید ہو ؟ نہیں تو ۔ میرزا صاحب خود فرماتے ہیں " کہ ادب برائے ادب نے انسانی کردار کے اُن خصوصیات کو جن کا مظاہرہ جہد حیات میں ہوتا ہے ۔ کبھی نظر انداز نہیں کیا اور محض خیالی اور مصنوعی دنیا نہیں بسائی ۔ اب اس کا کیا علاج کہ اگر ادب برائے ادب والے جہد حیات کا تذکرہ کریں تو طبیعت کو فرحت ہوتی ہے ۔ اور اگر یہی کام ادب برائے زندگی والے سرانجام دیں ۔ تو طبیعت پر اضمحلال و درماندگی طاری ہو جاتا ہے شاید یہ فرق ہو کہ ادب برائے ادب والے محض اُن خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہیں جن کا مظاہرہ جہد حیات میں ہوتا ہے ۔ اور ادب برائے زندگی والے اُن انسانوں کا نقشہ کھینچتے ہیں جو ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ تو کچھ ایسا فرق نہیں ہے ۔ خصوصیات فضا میں معلق نہیں ہوتیں ۔ کوئی خصوصیت اس وقت تک وجود ہی میں نہیں آتی ۔ جب تک اُس کا کوئی حامل نہ ہو ۔ یا شاید یہ مراد ہے کہ ادب برائے زندگی والے ہمعصر مسائل پر زیادہ زور دیتے ہیں اور ادب برائے ادب کے ترجمان محض مستقل و ابدی مسائل پر غور کرتے ہیں ۔ یہ بھی کچھ ایسا فرق نہیں ہے ہر ہمعصر مسئلہ کسی مستقل اور ابدی مسئلہ کی ایک مخصوص صورت ہوتا ہے ۔ کوئی جذباتی ، اخلاقی ، یا سیاسی مسئلہ لے لیجئے ، مثلاً مرد اور عورت کا تعلق ، دیانت یا راستبازی کا تصور ، فرد اور جماعت کا ربط ، یہ تمام مسائل ہمیشہ سے چلے آتے ہیں ۔ لیکن ہر دور اور ہر عہد میں ان کی مخصوص صورت ہوتی ہے ۔ اور اُس عہد کے ادیب یا شاعر براہ راست اسی صورت سے دوچار ہوتے ہیں ، اگر انہیں تنقید حیات کی آرزو ہے تو وہ حیات کی کوئی خیالی یا مصنوعی تصویر پیش کرنے کے بجائے اس کی وہی صورت پیش کریں گے جو اُن کے سامنے ہے ، اگر اس سے پڑھنے والے کی طبیعت مضمحل اور درماندہ ہو جائے تو اس کا الزام شاعر کے سر پر نہیں کشاکش حیات کے سر پر ہے ۔

۵ ۔ میرزا صاحب کو ادب برائے زندگی سے ایک اور شکایت یہ ہے کہ " ادب برائے زندگی ۔ دراصل جدید روسی اشتراکی لٹریچر کا بگڑا ہوا خاکہ ہے " یہ شاعری " ایک خاص غرض کے حصول کے لئے گتھیوں کو سلجھانے اور مسائل کا واقعات میں حل سوچے بغیر ہندوستان میں سوویٹ ذہنیت پھیلانا چاہتی ہے " ترقی پسندوں نے مسائل کا واقعات میں حل سوچا ہے یا نہیں ۔ یہ تو سیاسی بحث ہے ۔ اسے الگ رکھئے ۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے ۔ ادب برائے زندگی کے نظریہ کو سوویٹ روس سے کہاں تک تعلق ہے ۔ اگر ارسطو سے لیکر حالی تک اُن تمام ادیبوں کے نام گنوائے جائیں جو ادب کے افادی نظریہ کے قائل ہیں تو سوویٹ روس کے حامیوں کی فہرست بہت طویل ہو جائیگی ۔ فی الحال میرزا صاحب کے اپنے ارشادات سے ثابت ہوتا ہے کہ سوویٹ روس والوں کی معلومات اپنے ہوا خواہوں کے متعلق بہت ناقص ہیں ۔ " یہ ادب برائے زندگی کے مؤید جنہیں روسی ادب جدید سے زیادہ غالباً میتھو آرنلڈ کے اس مقولے نے کہ شاعری تنقید حیات ہے ، گمراہ کر دیا ہے ، " ادب برائے زندگی کا پشت پناہ یہی فقرہ تنقید حیات تھا ۔ جب اس کا مفہوم ان لوگوں کے مفروضہ مفہوم سے الگ ہو گیا ۔ تو ادب برائے زندگی کی پوری عمارت ڈھ گئی " اسکے بعد ورڈز ورتھ سے ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں ۔ یہی ادب برائے زندگی کا نعرہ ہے ۔ سو برس سے زیادہ کے گڑھے ہوئے مردے آج اکھیڑے جا رہے ہیں اور یہ گورکنی مایہ ناز سمجھی جاتی ہے " میرزا صاحب نے میتھو آرنلڈ اور ورڈز ورتھ کو سوویٹ کے حامیوں میں شامل کیا ۔ اب ترقی پسندوں کے کارنامے ملاحظہ ہوں ۔ " نیا ادب کیا ہے " کے عنوان سے ترقی پسند مصنفین نے نیا ادب کا ایک خاص نمبر چھاپا ہے ۔ جس میں مختلف ادیبوں نے مقاصد ادب کے متعلق اپنی آرا کا اظہار کیا ہے ۔ منشی پریم چند لکھتے ہیں ۔ " اس جذباتی آرٹ کا اب زمانہ نہیں رہا ۔ اب تو ہمیں اس آرٹ کی ضرورت ہے ، جس میں عمل کا پیغام ہو ۔ . . . . مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں " (صفحہ ۴۰) . . . . مولینا عبدالحق ارشاد فرماتے ہیں " ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اُسی وقت تک ہوتی ہے ۔ جب تک اس میں تازگی ، جدت اور توانائی پائی جاتی ہے ، اور تازگی اور

جدت اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہو جس پر ہمارا ایمان ہو اور جس کے حصول کے لئے ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہیں صفحہ ۴۹ " ڈاکٹر ٹیگور رقمطراز ہیں۔ "ادیب کا فرض ہونا چاہیئے۔ کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے، ہر انسان کو مسرت اور امید کا پیغام سنائے، ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا ہر ادیب کا فرض عین ہونا چاہیئے" صفحہ ۵۵۔ اب فرمائیے اگر یہ تینوں بزرگ ارمژ دوروں کے دلآل اور سوشلسٹ، وس کے ایجنٹ ہیں تو کلمۃ الحق کہنے والوں کی ہم کا پیٹ کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ اسکے بعد میرزا صاحب ترقی پسند ادیبوں کی طرف فرداً فرداً توجہ فرماتے ہیں۔

" ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "ادب کی دو تعریفیں ممکن ہیں۔ ایک جس میں مصنف کی داخلی یا موضوعی کیفیت پر زور دیا جاتا ہے۔ اور دوسری جس میں خارجی یا معروضی عنصر کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ادب کا پہلا تصور ہمیں رومانیت کی طرف لے جاتا ہے جس میں مصنف کے جذبات اور محسوسات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ اور دوسرا تصور حقیقت نگاری کی طرف جس میں اُس "خارجی" چیز کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے جس کی تصویر کھینچنی مقصود ہو۔ پہلی صورت میں بیان یا طرز ادا پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور دوسری میں اُس چیز پر جو بیان کی جائے پہلی حالت میں ادب مقصود بالذات ہوتا ہے۔ اور دوسری حالت میں ایک ذریعہ قرار پاتا ہے۔ "ادب برائے ادب" پہلے نظریہ کی حمایت ہے اور دوسرے نظریہ کو "ادب برائے زندگی" کہہ سکتے ہیں۔

کس قدر گمراہ کن تحریر ہے! دنیا جانتی ہے کہ ادب کے داخلی اور خارجی پہلو سے مراد تخیل کا طریق کار ہے۔ شاعر کبھی اپنے جذبات و محسوسات اور واردات قلب مصوری کرتا ہے، یہ شاعری کا داخلی پہلو ہوا کبھی مناظر قدرت یا کسی واقعہ یا مرئی شئی کا نقشہ کھینچتا ہے، اسکو شاعری کا خارجی پہلو کہتے ہیں۔ کوئی شاعر ایسا نہیں قدیم و جدید جسکے کلام میں بیش و کم دونوں عناصر موجود نہ ہوں اور اگر ہمارا قول صحیح ہے تو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں کوئی حدِ فاصل نہ رہی۔ مجھے تو میرزا صاحب کے ارشادات اور اُن کے پیش کردہ اقتباس میں کوئی ایسا فرق دکھائی نہیں دیتا۔ داخلی اور خارجی کی دونوں ایک ہی تعریفیں کی ہیں صاحب اقتباس نے صرف یہ کہا ہے۔ بعض تعادم داخلی پہلو کو زیادہ اہم گردانتے ہیں اور انکا تصور ہمیں رومانیت کی طرف لے جاتا ہے۔ بعض خارجی پہلو کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں کہ اکا تعلق حقیقت پسندی سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ داخلیت یا خارجیت شاعر کے تخیل کا رکا نتیجہ ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ ہر شاعر میں بیش و کم یہ دونوں عناصر موجود ہوتے ہیں سوال تو اُسی کمی بیشی یا دونوں پہلوؤں کی اضافی اہمیت یا نااہمیت کا ہے، شاعر کے محسوسات بہر حال اُسکے اپنے محسوسات ہونگے لیکن اُن کے موضوعات خالص داخلی تجربات بھی ہو سکتے ہیں اور خارجی مشاہدات بھی، اگر ایک شاعر محض اپنی مسرتوں اور کلفتوں کا ذکر کرتا ہے اور دوسرا شاعر اپنے دور کی عالمگیر فلاکت یا خوشحالی کا نقشہ کھینچتا ہے تو پہلے کا بیان بالکل داخلی نہیں کہلا سکتا۔ اسلئے کہ اُس کی مسرتیں اور کلفتیں بھی خارجی حالات ہی کی پیدا وار ہیں نہ ہم دوسرے شاعر کو کلی طور پر خارجی کہہ سکتے ہیں۔ اسلئے کہ اسکے مشاہدات خارجی حقائق سے متعلق ہیں باوجود اُن کے محسوسات ہی ہیں باوجود ان دونوں شعرا کے نقطہ نظر اور اُن کے موضوعات میں ایک بین فرق دکھائی دیگا۔ وہی کمی بیشی کا فرق اور اسی کی بنا پر ہم انہیں داخلی یا خارجی کہینگے، یہ فرق نظری اور تاکیدی ہے اور میرزا صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی جا سکتی

"ادب برائے زندگی" کے ایک دوسرے حامی فرماتے ہیں کہ ادب میں دو خصوصیتیں لازمی طور پر پائی جانی چاہئیں۔ اول یہ کہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اُس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آوے "اجتماعی زندگی سے مراد اُن لوگوں کی زندگی ہے۔ جن کے درمیان یہ ادیب یا شاعر اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے سماجی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ شاعری چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر عجیب و غریب متضاد کیفیتوں کا مجموعہ بن جائیگی اور . . . . شاعر زندگی کی مجموعی ہو یا انفرادی، ترجمانی بھی کر سکتا ہے۔ کہ بنیادی اصول و حقائق کی جو ذات پات فرقہ وارانہ کوتاہ نظری و پست خیالی سے بالا ہیں۔ ایسے دلکش انداز اور الفاظ میں ترجمانی یا تنقید کرے کہ لوگوں کے دل خود بخود اُس طرف کھنچیں۔ . . . ایسا شاعر ذاتی وقتی، یا مقامی تنازعات سے کبھی واسطہ نہیں رکھتا،

پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی شاعر اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنا چاہے یا نہ چاہے یہ تعلق فی الواقعہ موجود ہوتا ہے اور رہبانیت یا گوشہ گزینی کے علاوہ شاعر کے لئے اس تعلق کو منقطع کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ یہ تعلق قائم ہے تو وہ وقتی یا مقامی تنازعات سے کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہ بات کچھ ترقی پسندوں کی اختراع نہیں ہے۔ مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری میں ارشاد فرماتے ہیں "قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات اُس کی رائیں اُس کی عادتیں۔ اُس کی رنجشیں، اُس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے، اُسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا۔ بلکہ سوسائٹی کے ساتھ وہ خود بدلتا چلا جاتا ہے"

ملا اثر صاحب کا یہ خدشہ کہ اس سے شاعر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ تو یہ کچھ ایسی دہشت افزا بات نہیں۔ شاعر ہمیشہ ٹولیوں میں منقسم رہے ہیں۔ اگر ایک شاہ پسند تھا تو دوسرا العتوف کا دلدادہ۔ ایک گروہ نئی چال ڈھال کی آرزو میں تھا تو دوسرے کو متاعِ آخرت کی تمنا۔ اسکے باوجود شاعری کو کوئی خاص گزند نہیں پہنچا۔ رہا یہ مفروضہ کہ ایسی شاعری فاشتہ پارت فرقہ دارانہ کوتاہ نظری و پست خیالی سے ملوث ہو گی تو زیر نظر اقتباس کے باقیماندہ حصے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ محض مفروضہ ہے۔ "جن شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زندگی میں عالمگیر مقبولیت حاصل کی اور مرنے کے بعد بقائے دوام کا تاج پہنا وہ وہی ایثار پسند اور مخلص پیشہ ارباب فکر و نظر تھے۔ جو سارے جہاں کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے" تو ثابت ہوا کہ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے یا اُس کی ترجمانی کرنے سے لکھنے والے کی فرقہ دارانہ کوتاہ نظری یا تنگ خیالی نہیں بلکہ جمیع نوعِ انسانی سے ربط و محبت مراد تھی۔ انسان سارے جہاں کے درد کو اپنا درد بھی سمجھ سکتا ہے کہ اُسے اس درد کی حقیقت سے آگاہی یا دوسرے الفاظ میں اپنے دور کی اجتماعی زندگی کے بنیادی اصول و حقائق سے واقفیت حاصل ہو۔ اگر کوئی ادیب محض ایک فرقہ یا نسل یا ذات پہ نگاہ رکھتا ہے تو اس کا نقطۂ نظر اجتماعی، کیونکر ہوا؟ اجتماعی زندگی سے کسی شہر یا قریہ کی زندگی مراد نہیں بلکہ کسی خاص دور میں تمام سماج بلکہ تمام نوعِ انسانی کی تنظیم مقصود ہے اسلئے کہ ہر طبقہ کی زندگی ہر دوسرے طبقہ کی زندگی سے اور ہر سماج کے مسائل باقیماندہ دنیا کے مسائل سے متعلق و متاثر ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میرزا صاحب بار بار بنیادی اصول و حقائق، اور مستقل قدروں کا ذکر کرتے ہیں۔ "ادب کا مقصد زندگی کی مستقل قدروں کو دریافت کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ہے" لیکن آخر یہ مستقل قدریں کیا ہیں؟ اگر شاعر کا مقصد انہیں دریافت کرنا ہے تو ان کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) صدیوں کی سعی و تلاش کے باوجود یہ قدریں ابھی تک دریافت نہیں ہو پائیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اب انہیں دریافت کئے جانا دیوانگی ہے ایک دلفریب چھلاوہ کے لئے ہلکان ہونا کہاں کی دانشمندی ہے۔

(۲) یہ قدریں دریافت ہو چکی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو انہیں دوبارہ دریافت کرنا تحصیل حاصل ہے۔ اس صورت میں ہر شاعر کا کام صرف یہی ہے کہ اپنے پیشروؤں کے خیالات و عقائد کا اعادہ کرتا رہے۔

(۳) حیاتِ انسانی میں کوئی مستقل قدریں موجود ہی نہیں۔

اگر شاعری کا مقصد زندگی کی مستقل قدروں کا دریافت کرنا یا انہیں دوسروں تک پہنچانا ہے تو ان تینوں صورتوں میں شاعر کی قسمت میں ناکامی لکھی ہے۔ لیکن ایک صورت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ زندگی کی بنیادی قدریں مستقل ہونے کے باوجود مختلف قالب بدلتی رہتی ہیں اور ہر عہد میں انہیں دوبارہ دریافت کرنا پڑتا ہے۔ پھر حالات کے ادل بدل کے ساتھ ان کی اضافی اور تقابلی اہمیت میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ فراغت اور کشاکش، محبت اور نفرت، تحفظِ نفس اور خدمتِ خلق سب بنیادی اور مستقل قدریں ہیں۔ لیکن اُن کی صُورِ اظہار، ان کے مادی مظاہر، انکے ذرائع حصول و تسکین ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کا مقصد بعینہٖ انہی قدروں کو متعین و مرتب کرنا ہے۔ مثلاً ترقی پسند ادیب یہ کہتے ہیں کہ جسمانی اور ذہنی فراغت، آزادیٔ فکر و رائے، اخوت و مساوات حیاتِ انسانی کی مستقل قدریں ہیں، ان کی ترویج و اشاعت ہر ذی شعور مصنف کا فرض ہے جو مفاد یا ادارہ انکے حصول و ترویج کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اُس کی مخالفت اس فرض کا لازمی جزو ہے۔ اگر کوئی شاعر یا ادیب ان مستقل

قدروں سے آنکھیں موند کے محض ذاتی تفریح و نشاط کا چرخہ کاتنے میں مصروف ہے۔ وہ اپنے فن کی توہین کر رہا ہے۔ اس نے چرخہ کو گل اور عارضے کو رعنائی نگار تصور کر رکھا ہے۔

" ایک مہذب انسان کا فرض ہے۔ کہ وہ ذاتی فائدے کی بجائے جماعتی فائدے کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ اس لئے کہ اگر ہم اس سوال پر غور کریں کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے تو اسکے سوا کوئی جواب نہ ملے گا۔ کہ انسان کی خدمت ہی انسان کی زندگی کا واحد اور حقیقی مقصد ہے۔ دنیا میں انہیں لوگوں نے کامیاب مطمئن اور سچی مسرت سے لبریز زندگیاں بسر کی ہیں۔ جنہوں نے اپنے ذاتی فائدوں اور ذاتی خواہشوں کو پس پشت ڈال کر ابنائے جنس کی خدمت کو اپنا شعار بنایا دوسروں کے آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھا، دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کے غم کو اپنا غم خیال کیا۔ جن شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زندگی میں عالمگیر مقبولیت حاصل کی اور مرنے کے بعد بقائے دوام کا تاج پہنا وہ وہی ایثار پسند اور اخلاص پیشہ ارباب فکر و نظر تھے۔ جو سارے جہان کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے، انسان کی فلاح و بہبود جن کا نصب العین تھا۔ جنہوں نے آپ بیتی کا راگ الاپنے کے بجائے جگ بیتی کے نغمے گائے اور اپنی خودی کو عالم انسانیت کی زندگی میں تحلیل کر دیا۔"

اس اقتباس کے متعلق میرزا صاحب

فرماتے ہیں: میرا خیال تھا کہ شاعر کی شہرت اور بقا کا دارومدار اسکے کلام کی خوبی اور حسنِ قبول پر ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ جب تک شاعر ولی نہ ہو اُس کا کلام بجائے خود کسی عزت کا مستحق نہیں۔ کاش شاعر فاضل نقاد ایک ہی ایسے فرشتہ صفت اور محسن انسانیت شاعر کا نام لے دیتے۔ میرزا صاحب غالباً تجاہل سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ یہ تو نہایت سطحی سی بات ہے کہ ہم شاعر کے کردار سے ہمیشہ اُس کا شاعرانہ یا تخیلی کردار مراد لیتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر حب وطن سے سرشار ہے یا فلاں شاعر بادۂ تصوف سے سرمست ہے۔ تو ہمارا اشارہ ہمیشہ اُس کے کلام کی طرف ہوتا ہے۔ نہ کہ اُس کی ذات کی طرف۔ چنانچہ اگر کسی شاعر کو ایثار پسند یا اخلاص پیشہ کہا جائے تو اسکے معنی صرف اسی قدر ہیں۔ کہ اُس کی شاعری ان اوصاف سے بھرپور ہے نہ یہ کہ اُس نے خدا کی راہ میں گھربار لٹا دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ ایک شاعر کے کلام میں گھربار لٹا دینے کے باوجود خلوص پیدا نہ ہو اور دوسرے میں ذاتی عیوب کے باوجود خلوص کی افراط ہو۔ خیر اگر میرزا صاحب کی تاویل کو درست مان لیا جائے تو بھی مضائقہ نہیں۔ میرزا صاحب تو شاعر کا منصب اس سے بھی کہیں بالا سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ حقیقی ادب کی دسترس یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اچھا ادب نہ صرف حیات کا ترجمان ہوتا ہے۔ بلکہ دائرۂ حیات کو وسیع تر کر دیتا ہے، پھول پتی، ذرہ قطرہ اور دیگر بظاہر بے جان اشیاء میں بھی حیات کا تماشہ کرتا ہوا انسان کو نامحدود وسعت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ ہم تو ابھی تک یہی سمجھے تھے۔ کہ شاعر کی شہرت کا دارومدار صرف اسکے کلام کی خوبی اور حسنِ قبول پر ہے مگر اب معلوم ہوا کہ جب تک شاعر فلسفی یا عالم کل نہ ہو۔ اُس کا کلام بجائے خود کسی عزت کا مستحق نہیں۔

آگے چل کر میرزا صاحب ترقی پسند شعراء پر یہ طعن کرتے ہیں۔ کہ اُن کے اعمال اُن کے اقوال کے مطابق نہیں ہیں۔ لیکن اگر میرزا صاحب ایک شاعر سے محض شاعری کی توقع رکھتے ہیں اور یہ توقع جائز ہے۔ تو آج اُسکے اعمال سے مطلب؟ بہرحال آپ دونوں طرح استدلال نہیں کر سکتے

(۸) نو ان صاحب نے ادب کا مقصد بھی بالکل انوکھا قرار دیا ہے۔ تمہید میں فرماتے ہیں۔ کہ اس سوال کا صحیح جواب دینے کے لئے ہم کو غور کرنا ہوگا۔ کہ وہ کونسی چیز ہے۔ جو ادیب کو تخلیق ادب پر مجبور کرتی ہے اور وہ کونسا اندرونی جذبہ ہے۔ جو شاعر سے شعر کہلواتا اور افسانہ نگار سے کہانی لکھواتا ہے۔ ہر شخص مخصوص خیالات و جذبات کا مالک ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے اور یہ عین فطرت انسانی ہے کہ اس کے خیالات و جذبات ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں، پھر قدرتی طور پر یہ خواہش اسکے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کہ میں ان خیالات و جذبات کا اظہار کروں اور اُن کو دوسروں تک پہنچاؤں۔ ادیب اس لئے شعر کہتا یا افسانہ لکھتا ہے کہ وہ اپنے تاثرات کو ایک مستقل شکل دے اپنے خیالات و تجربات کو دوسروں تک پہنچائے اور اپنے جذبات و احساسات

ہیں کہ ہم انسانیت کو بھی شریک کریں، وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ ہم نے سمجھا اور محسوس کیا ہے دوسرے بھی سمجھیں اور محسوس کریں، دوسرے بھی حزن و ملال نشاط و مسرت اور تفکر و تصور کا وہی لطف حاصل کریں جو خود ہم نے حاصل کیا ہے۔

اس تحریر کا استدلال ہی غلط ہے۔ وہ شاعر یا ادیب جو ذہانت یا Genius کے مالک ہیں شاعری یا ادب کے شاہکار اُس عمر میں پیش کر دیتے ہیں جب سنِ شعور کی ابتدائی منزلوں میں ہوتے ہیں۔ اور تجربات کی پختگی سے کوسوں دور، یہ دعویٰ بھی قطعاً غلط ہے۔ کہ پہلے انہیں اپنے خیالات و جذبات کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اسکے بعد ان خیالات و جذبات کو شعر میں منتقل کر دیتے ہیں، صرف شاعری سے محبت ہے، آدمی شعر اس لئے کہتا ہے کہ اس کی فطرت شعر کہنے کی محرک ہوتی ہے۔ جب تخیل شعر کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اسکے بعد شاعر دوسروں کو اپنے اُس انفعالی تاثر میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ جو خود اُس پر طاری ہوا تھا اور جس نے شعر کی شکل اختیار کی ورنہ خیالات و جذبات ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں۔ اس استدلال کی پہلی غلطی میرزا صاحب کا یہ خیال ہے کہ صاحب ذہانت لوگ اپنے بہترین شاہکار سنِ شعور کی ابتدائی منزلوں میں پیش کر دیتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ دانتے، شیکسپیئر، ملٹن، فردوسی، گوئٹے، غالب، سب پینتیس برس کی عمر کے بعد سنِ شعور کو پہنچے تھے، استدلال کی دوسری غلطی میں نہیں سمجھ سکا۔ صاحبِ اقتباس کی رائے میں شاعر اسلئے لکھتا ہے۔ کہ اُسے اپنے خیالات کی اہمیت کا احساس اور اسکے اظہار کی آرزو ہوتی ہے۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اُس کی فطرت شعر کہنے کی محرک ہوتی ہے۔ لیکن فطرت لاکھ محرک ہوا کرے اگر کوئی شخص اپنے خیالات کو اتنی اہمیت ہی نہیں دیتا۔ کہ وہ ان کا اظہار کرے۔ تو اُسے شاعری کا دردِ سر مول لینے کی کیا ضرورت ہے، شعر گوئی بہرحال ایک ارادی فعل ہے، فطرت لٹھ لے کر کسی سے شعر نہیں لکھوا سکتی، اگر کوئی شخص صحیح یا غلط اپنے جذبات و خیالات کو اظہار کے قابل سمجھتا ہے۔ تو وہ شعر یا افسانہ لکھے گا ورنہ نہیں لکھے گا۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اپنے خیالات کی اہمیت کا احساس تو ہر شخص کو ہوتا ہے پھر ہر شخص شاعر کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ پھر منطق کی ابتدائی غلطی ہے، اگر ہر شاعر کو اپنے خیالات کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ ہر شخص جسے اپنے خیالات کی اہمیت کا احساس ہو شاعر ہوتا ہے۔ اگر ہر انگریز سفید فام ہوتا ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ ہر سفید فام شخص انگریز ہے۔

ان تمام معقولات کے بعد میرزا صاحب نے چند صفحے مینیو آرنلڈ کے نظریہ کی تفسیر و توضیح پہ صرف کئے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ ادب برائے زندگی کا مفروضہ مفہوم میتھو آرنلڈ کے اصلی مفہوم سے الگ ہو گیا اور چونکہ ادب برائے زندگی کی پشت پناہ یہی ایک فقرہ تھا۔ اسلئے ادب برائے زندگی کی تمام عمارت ڈھا گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ ادب برائے زندگی کے معنی کسی ایسے مفروضہ مفہوم کے قائل تھے جیسے مرزا صاحب نے بڑی کاوش اصلی مفہوم سے الگ کیا ہے نہ یہ فقرہ ادب برائے زندگی کی پشت پناہ تھا اور نہ میرزا صاحب کے ارشادات سے اس عمارت کو کوئی آنچ آئی ہے۔ وقت یہ ہے کہ میرزا صاحب حق بھی ہیں اور مدعا علیہ بھی، وہ ترقی پسند یا ادب برائے زندگی کے حامیوں کی طرف سے خود ہی مفروضہ معتقدات وضع کرتے ہیں اور خود ہی انہیں غلط ثابت کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے میتھو آرنلڈ کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ وہ تنقید حیات کے ساتھ ساتھ متانت و صداقت در حسن و صناعت کا بھی قائل ہے۔ اس پر یہ اضافہ کیا کہ ترقی پسند حسن و صناعت کے قائل نہیں ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ تنقید حیات سے بھی بے بہرہ ہیں۔ افسوس ہے پتہ چلا کہ ملک میں جو بھی کم سواد متشاعر رسالوں کے صفحات سیاہ کرنے میں مشغول ہے۔ ترقی پسند مصنفین کا ممبر نہیں تو ہمدرد ضرور ہے، ہمیں سے یہ واضح ہوا کہ اگر اس جماعت میں کوئی صاحب علم اور ذی ہوش شخص بھی موجود ہے تو خدائے بزرگ و برتر اُسے ہدایت دے، اُسے نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس طرح اتہام و تشنیع کی عمارت بنتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اس عمارت کی خشت اول ہی کج ہے

بہرحال میرزا صاحب کو ترقی پسندوں پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ صناعت اور فنی حسن سے منکر یا بے پرواہ ہیں اور کوتاہ بین تک بندوں یا لیست خیال شاعروں کو اُن کی حمایت حاصل ہے۔ ان مسائل کے متعلق خود ترقی پسند مصنفین سے استفسار کرنا شاید زیادہ مناسب ہو۔ اس جماعت نے اپنے ادبی اصول کو منشور میں بیان کیا ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، اس اشاعت کے مختلف لکھنے والوں کی آراء ملاحظہ ہوں۔

جو لوگ صرف ادب اور سماج کے باہمی لگاؤ پر زور دیتے ہیں اور اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ادب فنونِ لطیفہ میں سے ہے وہ مستقبل میں

پناہ لیتے ہیں اور خارجی حقیقتوں سے بیگانہ ہو کر صرف اپنی خواہشوں کا قصیدہ پڑھتے رہتے ہیں۔ کاش اُن کی خواہشوں اور زندگی کی حقیقتوں میں کوئی ربط ہوتا۔ ان دنوں جس طرح ہمارے پرانے ادیب ادب برائے ادب کے گول گنبد میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ اُسی طرح ہمارے بعض نوجوان ادیب مستقبل پرستی کے ہوائی محل میں بیٹھ کر اپنی ذاتی خواہشوں کی تسکین کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مزدور کسان اور انقلاب اور سوشلزم کے نعرے لگاتے ہیں۔ تو ان نعروں میں نہ گرمی ہوتی ہے نہ تڑپ ہوتی ہے اور نہ خلوص۔ انہیں سنکر خواہ مخواہ ابکائی آتی ہے۔ حقیقت پسندی سے تو انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا (اداریہ صفحہ ۱۰)

"نام نہاد ترقی پسند ادیب زبان اور جدت طرازی کو ترقی پسندی کا نام دے کر تنقید کی کسوٹی سے بچنا چاہتے ہیں۔ پرانی لکیر کے فقیر صحیح ترقی پسند ادب کو بھی یا وہ گوئی کا الزام لگا کر اپنی کورچشمی اور سست رفتاری کے لئے راستہ صاف رکھنا چاہتے ہیں۔ . . ترقی پسند ادب کو مخالفوں سے کوئی ڈر نہیں۔ اسلئے کہ وہ تو اپنے دن پورے کر رہے ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ نادان دوستوں سے ہے جو بہت تیزی سے بغیر سوچے سمجھے جو کچھ منہ میں آتا ہے لکھتے جاتے ہیں (حیات اللہ انصاری صفحہ ۱۴)

ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو جس کی زبان پختہ، شستہ اور لطیف ہو۔ جب جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔ جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہیں" (منشی پریم چند صفحہ ۳۴)

"ادیب کو حق حاصل ہے اور اُسے آزادی ہونی چاہیئے کہ جو چاہے لکھے لیکن اُسے حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے (ملک عبدالحق صفحہ ۴۲)

ترقی پسند ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ سنجیدہ، وسیع، امید افزا اور حوصلہ انگیز ہو" (مجنوں گورکھپوری۔ صفحہ ۴۱)

مگر یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ادب صرف اس وقت ہی زندہ رہ سکتا ہے جب کہ وہ نہ صرف سماجی احساس کو صداقت اور صدق دل سے ظاہر کرے بلکہ وہ بحیثیت ادب کے بھی عمدہ اور بلند پایہ ہو۔ (احمد علی صفحہ ۱۰۶)

ادب کی جمالیاتی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی اہمیت کو دیکھنا ضروری ہے . . . کتاب کی ادبی اہمیت کے دوش بدوش اُس پہلو کو بھی دیکھنا ہے۔ جس میں طبقاتی اور دوسرے رجحانات سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں (احتشام حسین صفحہ ۱۲)

ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو (۱) سماجی ترقی میں مددیں (۲) ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔" (فیض احمد صفحہ ۱۴)

حیرانی ہے کہ اشتراکیت کے اس قارنامے میں میرزا صاحب نے صرف سجاد ظہیر ہی کے مشورہ کو کیوں قابل اعتنا خیال فرمایا۔ پس میرزا صاحب نے جن تحریروں کو ترقی پسند ادب کے نام سے عزت بخشی ہے اُن میں سے بیشتر پر اس نام کا اطلاق ہی نہیں ہوتا اور اُن کی توبیخ و مذمت میں خود ترقی پسند جماعت میرزا صاحب سے پیچھے نہیں ہے۔ ایسی تحریروں کے مطالعہ سے انسان ایک غصہ ایک جھلاہٹ سی ضرور محسوس کرتا ہے۔ لیکن زید کے گناہوں کی وجہ سے عمرو کو کشتنی و گردن زدنی قرار دینا انصاف کا تقاضا نہیں ہے ۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرزا صاحب کے ادب برائے ادب کے نقطۂ نظر اور ترقی پسند یا ادب برائے زندگی کے نقطۂ نظر میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس اختلاف کا ایک پہلو شعوری ہے اور ایک بہت حد تک غیر شعوری۔ اس کا غیر شعوری پہلو ہے انقلاب اور خصوصاً اشتراکی انقلاب سے خوف اور نفرت۔ میرزا صاحب کا خیال ہے کہ یہ انقلاب نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ اس امر کی طرف انہوں نے بار بار اشارہ کیا ہے کہ ہندوستان میں سوویٹ حکومت کے خواب دیکھنا بھنگ گھوٹنے کے مترادف ہے۔ موجودہ ادیب انقلاب کے سامنے ناچتے تھرکتے رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ میں سیاسیات میں الجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر میرزا صاحب اس آرزو پروری یا [illegible] کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ ایسا انقلاب بالکل ناممکن العمل ہے تو انہیں یہی حق اُن رجائیت پسند اشتراکیوں کو بھی دینا چاہیئے۔ جن کی رائے میں دنیا کی تاریخی قوتیں اسی ایک مرکز کی جانب مصروف خرام ہیں۔

اس اختلاف کا شعوری پہلو وہی ادب کے تفریحی اور افادی نظریات کی پرانی چپقلش ہے۔ میرزا صاحب کی طرح میری بھی یہی رائے ہے کہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں کوئی حدِ فاصل نہیں۔ اگر ادب برائے ادب کی تشریح کی جائے تو اسکے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ادب کا مقصد

ادبیت ہے۔ اگر کوئی ادب فنی محاسن سے معرا ہے تو اس میں اور جو بھی خوبیاں ہوں ہم اسے ادب نہیں کہہ سکتے، اسکے معنی یہی ہوئے کہ ادب، ادب ہے تو وہ ادب ہے۔ ورنہ وہ ادب نہیں ہے۔ بھلا اس سے کون انکار کرتا ہے، یہ بات صرف ادب کے متعلق ہی نہیں ہر چیز کے متعلق صحیح ہے، مثلاً گھوڑا بڑا گھوڑا اونٹ بلند قامت وغیرہ وغیرہ۔ یعنی گھوڑے کا فرض اولیں یہ ہے کہ وہ گھوڑا ہو، کیونکہ اگر وہ گھوڑا ہی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ گھوڑا نہیں ہے یہ تو صحیح ہے کہ اگر گھوڑا گھوڑا ہی نہیں ہے تو اُسکے باقی اوصاف و مقاصد کا قصہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اُس میں فلاں فلاں محاسن ہونے چاہئیں تو ہم پہلے ہی سے فرض کر لیتے ہیں کہ اُس میں کم از کم گھوڑے پن کا وصف ضرور موجود ہے۔ اس سے ہم کہتے ہیں کہ گھوڑا گھوڑا تو ضرور ہے لیکن صرف گھوڑا نہیں ہے بار برداری یا نقل و حرکت کا ذریعہ بھی ہے۔ گھوڑا پالتو بھی ہو سکتا ہے وحشی بھی۔ بہت ممکن ہے کہ وحشی گھوڑا پالتو گھوڑے سے کہیں زیادہ حسین اور دلکش ہو لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اتنا مفید نہیں ہے اور جب تک یہ جانور ہماری سماجی اور معاشی زندگی کا ایک رکن ہے ہم اس کی افادیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہی حال ادب کا ہے، ظاہر ہے کہ اگر کسی ادب میں ادبیت کے بنیادی محاسن مفقود ہیں۔ تو ہم بحیثیت ادب کے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھینگے۔ لیکن ادب محض ادب نہیں ہے۔ ہماری سماجی زندگی کا ایک اہم جزو بھی ہے، اسکے مطالعہ سے سماج کے خیالات متاثر ہوتے ہیں اس کی ترغیب سے سماجی اقدار کی ترتیب ہوتی ہے، اسکے زیر اثر مختلف زاویہ ہائے نظر، مختلف ذہنی اور جذباتی رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا ہونا چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے یہ ایک جداگانہ بحث ہے، اصلاً کرتی تو واقعہ ایسا ہوتا ہے، جب تک ادب وہ معنی الفاظ استعمال کرتا ہے اور جب تک الفاظ معانی سے یکسر خالی نہیں ہو جاتے ادیب اپنے معاصر قارئین کو متاثر کرتا رہیگا اور ادب برائے زندگی یا ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامی اُس سے صرف یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اُسکا اثر سماج کے لئے مضر و یا مضرت رساں ہونے کے بجائے مفید اور سود مند ہو۔ اور وہ سماج کے لئے مفید اور سود مند جبھی ہو سکتا۔ اگر ادیب کو سماج کے معاصر مسائل اور معاصر مشکلات کا ادراک اور ان کی صحیح نوعیت سے آگاہی ہو۔ اس اجتماعی احساس سے اُس ادیب کی صناعت یا فنکاری میں کمی واقع نہیں ہوگی بلکہ اُس کی وجہ سے کلام میں وہ خلوص، وہ گہرائی اور وسعت پیدا ہو جائیگی۔ جو ادب کے بہترین مظاہر کا خاصہ ہے۔

دو غزلیں

شکیل بدایونی

منزل کی دھن میں ہوش و خبر سے گزر گئے
سو بار تیری راہگذر سے گزر گئے

جو امتیازِ شام و سحر سے گزر گئے
ایسے بھی کچھ زمانے نظر سے گزر گئے

اپنی تو اب تمام ہوئی داستانِ غم
دو اشک تھے سو دیدۂ تر سے گزر گئے

رُخ پر کسی کے ہائے وہ رنگِ سکوتِ غم
نالے حدودِ جذبِ اثر سے گزر گئے

ہم میں بھی جذبۂ کششِ حسنِ روئے دوست
اٹھنے لگی نگاہ جدھر سے گزر گئے

باوصفِ شوق اُن کو نظر تو نہ پا سکی
لیکن وہ ہر مقامِ نظر سے گزر گئے

قربِ جمال مانعِ دیدار تھا کہ وہ
آ کر نظر میں حدِ نظر سے گزر گئے

ہر چند فرشِ راہ تھی اُن کے لئے نگاہ
پھر بھی خبر نہیں وہ کدھر سے گزر گئے

کیا پوچھتے ہو لطفِ ہجومِ نظر شکیل
کچھ تیر تھے جو قلب و جگر سے گزر گئے

احسان دانش

آئے ہو پی کے شاید میخانہ سحر سے
افسوں برس رہے ہیں مستی بھری نظر سے

صبحِ مریضِ غم سے شامِ الم ہے ظاہر
تقدیر رونما ہے تدبیرِ چارہ گر سے

دونوں نشاطِ غم کی منزل پہ گامزن ہیں
وہ حسنِ باخبر سے میں عشقِ بے خبر سے

اک سمت بے ثباتی اک سمت ناتمامی
تعمیرِ زندگی کو دیکھوں کدھر کدھر سے

میں تیرے بعد اب یوں دنیا سے مل رہا ہوں
جیسے کوئی مسافر ملتا ہے ہم سفر سے

آغاز اللہ اللہ، انجام توبہ، توبہ،
مجھ کو معاف کیجے اِس زحمتِ نظر سے

مدت میں طے ہوئی ہے پیچیدہ راہِ الفت
اکثر بھٹک گیا ہوں آثارِ رہگذر سے

فطرت نہ جانے مجھ کو لے کر کہاں چلی ہے
شمعیں دکھا رہے ہیں جلوے اِدھر اُدھر سے

وہ جا رہے ہیں لیکن ہے عشق کا تقاضا
جذباتِ دل سے روکوں آواز دوں نظر سے

احسان آہ اُس نے دی ہے دغا وہ مجھ کو
امید اٹھ گئی ہے احبابِ معتبر سے

علی سردار جعفری

عشق اور مفلسی

فضا خموش ہے، تاروں کی انجمن خاموش
حسین رات کے ماتھے پہ اک تفکر ہے
بُجھی ہوئی ہے مرے ذوق و شوق کی دُنیا
ہر ایک شے پہ اُداسی کی حکمرانی ہے
نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا ہے مگر
کہ ہولے ہولے کوئی جیسے بات کرتا ہے

ہوا میں ہے کسی آنچل کی سرسراہٹ سی
کسی کے پاؤں کی آواز آ رہی ہے مجھے
یہ کس کے چاند سے چہرے کی چھوٹ پڑتی ہے؟
یہ تیرتا ہے فضاؤں میں بانکپن کس کا؟
سمٹ سمٹ کے بکھرتا ہے تیرگی میں کوئی
جھلک سی ہے در و دیوار پر تبسم کی
نہا کے نور میں یکسر نکھر رہا ہے کوئی
عجیب طرح سے دل میں اُتر رہا ہے کوئی
کہ جیسے پچھلے پہر گل پہ اوس پڑتی ہے

یہ کون؟ ... کون مرے پاس آ کے بیٹھ گیا؟
یہ کس نے؟ — کس نے مرے دل کے تار چھیڑ دیئے؟
ہیں میرے بالوں میں پیوست انگلیاں کس کی؟
یہ کس نے رکھ دیئے ہونٹوں پہ گرم ہونٹ اپنے؟

یہ کون جھجک کے اندھیرے میں پیار کرتا ہے؟
کسی کے ہاتھ مری سمت بڑھتے آتے ہیں
مری نگاہ کے آگے کھڑا ہوا ہے کوئی
یہ تم ہو؟   تم ہو مری جان؟   یقین نہیں آتا
تمہیں تو مجھ سے محبت نہیں تھی، پیار نہ تھا
بس اک لگاؤ تھا اور وہ بھی ساتھ رہنے سے
وہ راتیں بیت گئیں، اور وہ دن تمام ہوئے

یہاں تم آگئیں کیسے؟ کہ دور ہے یہ مقام
بہت ہی دُور امارت کی عیش گاہوں سے
یہ وہ جگہ ہے جہاں سیم و زر کی چھاؤں نہیں
بھرے ہیں دق کے جراثیم ان فضاؤں میں
یہاں تو مفلس و نادار سانس لیتے ہیں
شمیمِ عطر نہیں ہے، گلوں کی باس نہیں
حریر و مخمل و دیبا کا یاں رواج نہیں

مگر وہ چیز مرے پاس ہے تمہارے لئے
جو اصل زر کے مکانوں میں مل نہیں سکتی
مری متاع فقط میری اک جوانی ہے
سوائے عشق تمہیں کچھ میں دے نہیں سکتا
مرے لباس میں سونے کا کوئی تار نہیں
اسی لئے تو مری قدر تم سے ہو نہ سکی
مگر یہ سچ ہے کہ میں تم کو پیار کرتا ہوں
ہمارا عہد، تجارت کا کارخانہ ہے
ہر ایک شے کا یہاں مول تول ہوتا ہے
میں چاہتا تو محبت خرید سکتا تھا

کسی کی اٹھتی جوانی بھی مول لے لیتا
میں تم کو زر کی ترازو میں تول سکتا تھا
تمہیں بھی میری امارت پہ پیار آجاتا
میں اپنے ذہن و فراست کو بیچ سکتا تھا
تمہاری مست جوانی خریدنے کیلئے
مجھے خبر ہے کہ اندھا ہے دیوتا دل کا
نہیں تو میں تمہیں اس طرح پیار کیوں کرتا
کہ کوئی ساتھ نہیں مفلسی و دولت کا
وہ عشق عشق نہیں، اور وہ شوق شوق نہیں
جو زر کی گود میں پل کر جواں نہیں ہوتا
بتاؤ تو مجھے لیکن قصور کس کا ہے؟
کہی تھی پہلے پہل دل کی بات جب تم سے
وہیں پہ تم نے مجھے کس لئے نہ روک دیا؟
بتاؤ تم نے بھلا کیوں مجھے نہ ٹوک دیا؟
مجھی کو تم سے مگر احتراز لازم تھا
کسی غریب سی عورت کو پوجنا تھا مجھے
کہ حسن اطلس و کمخواب کا غلام نہیں
مگر ہٹاؤ یہ باتیں کہ وقت ہے تھوڑا
تم اتنی دور سے آئی ہو —— ہاں کہو کیا ہے؟
یہ کیا؟ —— خموش ہو تم؟ —— جیسے پیکرِ تصویر!
بُرا کیا کہ خفا تم کو کر دیا میں نے
قریب آؤ کہ اب خفگیوں کا وقت نہیں
میں جانتا ہوں کہ تم لوٹ جاؤ گی لیکن
میں چاہتا ہوں کہ جی بھر کے دیکھ لوں تم کو
ذرا کچھ اور قریب آؤ ہاں کچھ اور قریب
کہ جذب کر کے نگاہوں میں کھینچ لوں تم کو!

مطلبی فرید آبادی

محنت کشوں کی نیا

کوسوں وار، میلوں وار کالا انبر کالا سنسار
کوئی نہیں ہے کھیون ہار کون لگائے اس کو پار
دیس کی نیا ہے منجدھار!

کالے بدلا گول کے گول پربت جیسے اونچے ٹول
پون بجاوے جنگی ڈھول جل کے دھکے، جل کی جھار
دیس کی نیا ہے منجدھار

بڈھے مانجھی نے دھوکا دینا کب کا بیری نے بیڑا لینا
ہنس ہنس کہوے "دو دن جینا ایشور ہی ہے کھیون ہار"
دیس کی نیا ہے منجدھار

بوہروں کی نیا پیسے کا ڈھیر کشتی کریں دلدل سے نکالیں
اپنی پھنسی تو کسے بلالیں بوہرے کہیں "اشور کرتار"
دیس کی نیا ہے منجدھار

بوہروں کا ہیں اشور دھندا کشتی "ڈاکا" کا رکرندہ
اشور اپنے گلے کا پھندا بن اپنا کشتی کسٹم کرتار
دیس کی نیا ہے منجدھار

ڈبک ڈبک کرتی نیا کیوں نہ نہیں ہم اسکے کھویا
چپو چلاؤ ملکر بھیا مانس شکتی اپرم پار
دیس کی نیا ہے منجدھار

رو بڈھے! اے ناؤ چلی ہے یہ نیا مزدوروں کی ہے
اشور اپنا بھجا بل ہی ہے نا دیس کی نیا ہے منجدھار
مانس شکتی اپرم پار

اپرم پار اپرم پار مانس شکتی اپرم پار

بادل۔ ؎۲ خول ؎۳ الف۔ پرانے رجعت پسند سیاسی لیڈر ؎۴ نکالیں ؎۵ محنت ؎۶ دلدل ؎۷ اس کا ؎۸ کارندہ ؎۹ گلے ؎۱۰ خاندانی ؎

حکیم اسرار احمد کریوی

اکبر کی واقعاتی شاعری

لسان العصر اکبر آبادی مرحوم کی شاعری کا بڑا حصہ گرد و پیش کے حالات. زمانے کے واقعات اور مختلف حادثات کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس واقعہ کا اثر ان کے دل و دماغ پر جتنا زیادہ پڑا اسی لحاظ سے اس کا نقش ان کے شعروں پر نمایاں ہوا۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا۔ تو ۱۸۵۷ء کا خونناک انقلاب سرو ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے نتائج اب بھی باقی تھے۔ ... سال کی اسلامی حکومت فنا کے گھاٹ اتاری جا چکی تھی۔ اور اس کی آخری یادگار بوڑھے ظفر کو رنگون میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ پرانی تہذیب و تمدن کا آفتاب زوال کی طرف مائل تھا اور مغرب کے مطلع سے ایک نئی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس انقلاب و تغیر کو کم و بیش پورے ملک اور اس کی ساری آبادی نے محسوس کیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا خمیازہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا اکبر مرحوم ایک مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ تھے فطرت سے ایک حساس دل اور اثر پذیر طبیعت لاتے تھے۔ عروج کے بعد زوال اور ترقی کے بعد تنزل کی یہ حالت ان سے نہ دیکھی گئی۔ فرماتے ہیں ؎

جنابِ شیخ کو ہے میرے حال پر افسوس
کہو کہ اس سے بھی ہوگا سوا ابھی کیا ہے
صدائے صور کی ہے ابتدا زمانے میں
بڑھے گی اس کی بلند تیغ لے ابھی کیا ہے
اس انقلاب کو حسرت سے دیکھتا ہوں میں
زمانہ کہتا ہے۔ دیکھا کرو ابھی کیا ہے

جنابِ شیخ سے یہاں سر سید مرحوم مراد ہیں۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں میں وہی پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے مسلمانوں کی ابتری اور زبوں حالی سے متاثر ہو کر ان کی فلاح و بہبود کے لئے عملی اقدام کی جرأت کی تھی۔ اکبر مرحوم نے اس انقلاب کا نقشہ اپنے ایک شعر میں اور بھی بہتر طریقے سے کھینچا ہے ؎

زبانِ حال میں اگلے فسانے امرِ ماضی ہیں — جو تلواریں چلاتے تھے وہ اب ٹھوکر پہ راضی ہیں

یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ مسلمان ہونا ہی سب سے بڑا جرم تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ یہ شورش مولوی اور وہابی قسم کے مسلمانوں کی پھیلائی ہوئی ہے لسان العصر مرحوم نے ذیل کے اشعار میں اسی حالت کو پیش کیا ہے ؎

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے — میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا راز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہیں بے مہری کرے مجھ سے — اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ — ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

دلی میں میرے پڑوس میں ایک بزرگ شیخ محمد رحیم نامی رہتے ہیں۔ یہ صاحب ڈاکخانے کے وظیفہ یاب اور کافی عمر رسیدہ ہیں۔ ان کا بیان ہے۔ کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد دلی کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ کہ بیچارے مولوی اپنی جان بچانے کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔ اور خانساموں کی وہ عزت و وقعت تھی۔ کہ خدا کی پناہ! یہاں تک کہ رشتہ ناتے کے وقت بھی اس کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا جس کے نام کے

سامنہ خانساماں کا دم چھلا لگا ہوتا۔ اس کی مشکل ادبچے گھرانے میں بڑی آسانی سے ہو جاتی تھی ؎

انقلاب دہر دیکھو بن گیا آقا غلام ۔۔۔ مصر کا مالک جو تھا اب اس کا درباں ہو گیا
فلک کے دور میں ہارے ہیں بازی اقبال ۔۔۔ اگرچہ شاہ تھے بدتر ہیں اب غلام سے ہم

ادھر تو مسلمانوں پر یہ آفتیں اور مصیبتیں ٹوٹ رہی تھیں اور ادھر خاص مصلحتوں کی بنا پر ہندوؤں کو نوازا جا رہا تھا۔ بعض ناعاقبت اندیش اور عیر مآل اندیش ہندو رہنما اس بندوبست کو جو محض انتظاماً اور عارضی تھا مستقل اور ہمیشہ اری سمجھ بیٹھے اکبر مرحوم نے اس غلط خیال پر انہیں بروقت تنبیہہ کی ۔

بگو بہ شیخ کہ او را ہم حرم نخواہد ماند ۔۔۔ بگو بہ برہمن او را صنم نخواہد ماند
من ار چہ در نظر یار شرمسار شدم ۔۔۔ رقیب نیز چنیں محترم نخواہد ماند

مرحوم کی یہ پیشین گوئی ۵۰۔۔۰۰ برس کے اندر ہی پوری ہو کر رہی۔ حاکموں کو اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ برسوں کے مغضوب اور مغلوب مسلمان مورد الطاف شاہانہ قرار پائے اور ہندوؤں کو نظر انداز کیا جانے لگا ۔

—— : ——

جیسا کہ اوپر کی سطروں میں عرض کیا گیا۔ سر سید مرحوم نے مسلمانان ہند کی پستی اور کس مپرسی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اور ان کے لئے علیگڈھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ سر سید مرحوم کا تجویز کیا ہوا نسخہ مریض کے حسب حال تھا یا نہیں۔ مجھے تو صرف یہ دکھانا ہے کہ اکبر مرحوم کا خیال اس کے بارے میں کیا تھا ؎

مسلمانوں کی خوشحالی کی ہے ترنگ و دھن سید کو ۔۔۔ مگر یہ کام نکلے گا نہ ٹکر سے نہ چندوں سے
درستی تخت و عزت کی کہاں ان کیل کانٹوں میں ۔۔۔ توقع شہسواری کی نہ رکھو نعلبندوں سے

وہ مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے ترقی خواہ تھے۔ لیکن انہیں یہ بھی شبہ تھا۔ کہ کہیں چار دن کی چاندنی کے بعد پھر وہی اندھیرا مسلط نہ ہو جائے ؎

سید کی روشنی کو اللہ رکھے قائم ۔۔۔ بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے

مرحوم کی نظر میں وہی مدرسہ قومی مدرسہ کہلانے کا مستحق تھا جس کی پالیسی اور نصاب تعلیم معین اور مقرر کرنے کا حق صرف قوم کے افراد کو ہو، اس لئے جب انہوں نے مدرسۃ العلوم علیگڈھ میں فرنگی اثر و اقتدار کو بڑھتا دیکھا تو خاموش نہ رہ سکے ؎

علیگڈھ کو شرف بخشا ہے اقبال نصاریٰ نے ۔۔۔ کہ جو مسلم اٹھا جوش ترقی میں یہیں آیا

علی گڈھ کالج کا قیام ہندوستانی مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لئے عمل میں آیا تھا۔ لیکن اکبر مرحوم کے خیال میں یہ مقصد پورا نہ ہو سکا۔ بلکہ اس کی طلب میں دین کا دامن بھی ہاتھوں سے چھوٹ گیا ؎

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے ۔۔۔ کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

علی گڈھ کالج کے قیام کے نصب العین اور طریق عمل سے اختلاف رکھنے کے باوجود اکبر مرحوم یہ سمجھتے تھے۔ کہ موجودہ حالات کی روشنی میں علیگڈھ کالج کے بغیر چارہ بھی نہیں ؎

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہ سید سے ۔۔۔ قفس ہی میں تو اس ڈر سے کہ چھوٹ جائیں کہاں

علی گڈھ کالج میں مذہبی تعلیم کا جو انتظام کیا گیا تھا، اکبر مرحوم اسے محض پراسرار بات سمجھتے تھے، ذیل کی رباعی میں اسی پر طنز فرمایا ہے ؎

رندی و شراب و بزم شاہد بھی ہے ۔۔۔ منطق بھی ہے دلیل ملحد بھی ہے
لیکن قربان حکمت پیر مغاں ۔۔۔ دو موری میں ایک مسجد بھی ہے

مولوی سے پہلے "دو" کا لفظ محض شعر کا وزن درست کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ سرسید ایسے روشن خیال مسلمان کو بھی سنی و شیعہ بچوں کی تعلیم کے لئے الگ الگ مولوی رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اگرچہ اکبر مرحوم نے سرکاری ملازمت کی۔ وہ حکومت کے پنشن خوار اور خطاب یافتہ تھے لیکن ان کی فطرت فرنگیانہ نہ بن سکی۔ انہیں سرسید مرحوم کے اس اصول سے سخت اختلاف تھا کہ علی گڑھ کالج کی پرنسپلی پر صرف انگریزوں کو ہی مقرر کیا جائے۔ سرسید مرحوم کے بعض سرگرم اور مخلص رفقائے کار کو بھی اس چیز سے اتفاق نہ تھا۔ ایک مرتبہ تو اس بحث نے ناگوار صورت بھی اختیار کر لی تھی۔ اس مخالف گروہ کے ایک بزرگ خان بہادر مولوی بشیر الدین احمد صاحب مہتمم اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ خوش قسمتی سے آج بھی ہم میں موجود ہیں۔ اکبر مرحوم نے ذیل کے اشعار میں اسی کشمکش اور اپنے نقطہ نظر کی طرف بڑے دل نشین اور چبھتے ہوئے پیرایہ میں اشارہ کیا ہے۔ ؎

کر چکا کالج میں جب تکمیل فن — تب یہ بولے مجھ سے مسٹر مارلیسن
گو کہ ہے شہرت تمہاری دُور دُور — مجھ سا تم رکھتے نہیں عقل و شعور
عرض کی میں نے کہ اے روشن ضمیر — ہے یہی تو جس کو روتا ہے بشیر
آپ نے سیکھا ہے اپنے باپ سے — اور میں نے جو پڑھا وہ آپ سے

مارلیسن صاحب اس زمانہ میں علیگڑھ کالج کے پرنسپل تھے۔ سرسید مرحوم سے اس اختلاف رائے کے باوجود اکبر مرحوم اچھی طرح سمجھتے تھے کہ سرسید مرحوم کا انگریزوں سے میل جول تقاضائے وقت سے تھا۔ نہ کہ محبت اور عقیدت کی بنا پر۔ مولویوں نے سرسید مرحوم کے خلاف تکفیر بازی کا جو محاذ قائم کیا تھا وہ اُسے اُن کے کوردنی پن اور بے وقوفی سے تعبیر کرتے تھے ؎

فتوائے کفر دینا واعظ کی بے حسی ہے — یہ عشق بت نہیں ہے اکبر کی پالسی ہے

اکبر مرحوم کے نزدیک سرسید مرحوم کا یہ مقصد نہ تھا۔ کہ مسلمانانِ ہند سارے مشرقی رسوم و آداب کو چھوڑ کر مغربی طور طریقوں کو اپنا شعار بنا لیں، مذہب سے بیگانہ ہو کر الحاد و دہریت کا شکار ہو جائیں۔ یہ بعد کے مسلمانوں کی غلطی ہے۔ کہ انہوں نے سید مرحوم کے مشن کو اچھی طرح نہ سمجھا اور حاکموں کی اندھی تقلید اور کورانہ نقالی ہی کو منزل مقصود تصور کر لیا ؎

خدا جانے کہا کس نے یہ کس دن عقل مسلم سے — کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
ڈنر، عہدے، تبسم، مشورے، وعدے، نئے گیسو — وہ گیسو جس سے پھیلی بوئے مست عنبر سارا
وہ ٹوٹے، یہ گرے، پھیلے وہ، یہ چھپ، اُن کو غش آیا — نہ ایماں میں رہی طاقت نہ دل میں ضبط کا یارا
ہوا سب کو تعجب کیوں ہوئیں یہ حالتیں پیدا — نہ تھا یہ مطلب سید کہ اس رخ پر چلے دھارا۔
وہ پردے کے بڑے حامی تھے طاعت کے مؤید تھے — وہ خواہاں تھے کہ چمکے اوج پر اسلام کا تارا

اسی خیال کو ایک فارسی شعر میں یوں ادا فرمایا ہے ؎

گذشتند آں قدر یاراں ز عہد سید اکبر — کہ آں مرحوم اکنوں در شمار شیخ می آید

علی گڑھ کالج کے بعد جب لکھنؤ میں شیعہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ تو انہوں نے بڑی دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ یوں اپنے اختلاف کا اظہار کیا

بڑے عزیز ہیں شیعہ ہیں کس طرح یہ کہوں — کہ میں ہوں خوش جو ہوئی اُن کی درسگاہ جدا

گویا شیعہ کالج کے قیام سے اُن کا اختلاف صرف اس خیال کے تحت تھا۔ کہ اسلام کے دو بڑے فرقے ایک دوسرے سے اور بھی زیادہ دور نہ چلے جائیں وہ سنی تھے لیکن شیعوں کو غیر نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے مذکورہ بالا شعر لکھنے کے بعد شاید اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں اُن کے اختلاف رائے کو رشک، حسد یا مذہبی تعصب پر محمول نہ کر لیا جائے۔ چنانچہ بعد کے شعروں میں انہوں نے علیگڑھ کالج کو بھی لپیٹ میں لے لیا ؎

برائے دولت و آبرو ہے ایک ہی مرکز — نہیں ہے اب بھی طریقِ حصولِ جاہ جدا
یہ دونوں اب بھی بدستور پیر بھائی ہیں — نہیں ہے حرج جو ہو جائے خانقاہ جدا
ڈنر پہ ایک ہی پھر کیا جو دو ٹکٹ گھر ہوں — کہ اپنا بیگ سنبھالیں نکلے پناہ جدا
وہ شیخ کی تھی ترقی یہ مجتہد کا عروج — نئے طریق کے ہیں خوب دو گواہ جدا

ان اشعار کا طنزیہ پیرایہ بیان داد سے مستغنی اور تعریف و تحسین سے بے نیاز ہے

—:—

جہاں تک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تعلیمی خدمات کا تعلق ہے۔ اُن سے کسی مسلمان کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اکبر مرحوم کو یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ کالج کے لڑکوں سے چندہ وصولی کا کام لیا جائے ؎

گرمیوں میں بچوں کو تھکانا — شہروں شہروں بھیک منگانا۔
اور اس پہ یہ بات بنانا — مفلس لڑکوں کا ہو کا ٹھکانا
آپ کہیں معیوب نہیں ہے — ہم کو تو مرغوب نہیں ہے
گدیہ اسلوب نہیں ہے — ہاں یہ طریقہ خوب نہیں ہے
اس سے بگڑ جاتی ہے قومی حالت — جاتی رہتی ہے شرم کی خصلت

وہ اس ضمن میں سرسید مرحوم کے معترف اور مداح ہیں ؎

سید کا جو عہدِ مشن تھا — اس سے کا ٹھیک چلن تھا
حسبِ ضرورت طرزِ سخن تھا — وقت وہ اور تھا اور ہی سن تھا

لیکن سید کے کارکنوں کو وہ محض خوشامدی اور جی حضوری سمجھتے ہیں۔ شہرت پسند اور جاہ طلب قرار دیتے ہیں ؎

قوم پہ غالب کورٹ کے ممبے — ٹھیلے ٹھہرے پارک کے گملے
بعض ہیں بادہ و جام کے خواہاں — بعض نمود و نام کے خواہاں
بعض فقط آرام کے خواہاں — کم ہیں فیضِ عام کے خواہاں

ان لوگوں میں سب سے بڑی کمی جو اکبر کے خیال میں تھی۔ وہ یہ کہ ان میں خلوص اور روحانیت نہ تھی ؎

یہ وادی ہے طور سے خالی — یہ محفل ہے نور سے خالی
یہ جنت ہے حور سے خالی — پاس سے خالی دور سے خالی

اس کے بعد ایک انگریز کی زبانی کیسی بننے کی بات کہی ہے ؎

اک انگریز نے بات یہ کہہ دی — جس نے ترقی دی یہ دی
کیسے سید کیسے مہدی — اس بازی کو ہمیں نے شہ دی

—:—

یہ حقیقت کسے معلوم نہیں۔ کہ کانگریس کے قیام میں اہلِ ملک کی خواہش سے زیادہ خود ہمارے آقاؤں کی مرضی کو دخل تھا۔ کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم کو حضور وائسرائے کے علاوہ پارلیمنٹ کے نامی گرامی ممبروں کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ انگریز مدبروں کا خیال تھا۔ کہ کانگریس کے ذریعہ

کہہ دیا صاف ہم نے اے مہراج — ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج
ماتمیاں کو نئے دلدار ہیم — باڈ پوٹیشنت یا غم میم

ہندو جو اب تک حکومت کی عنایتوں اور شفقتوں کے تن تنہا اور بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ مسلم لیگ کے قیام سے بجا طور پر بدظن اور مشکوک ہوئے۔ انہوں نے چاہا کہ مسلمانوں کو جو سیاسی میدان میں ان کے نئے حریف اور رقیب کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ حکومت کی پالیسی سے آگاہ کردیں۔ اور انہیں اپنے تجربہ کی بنا پر بتادیں کہ حکومت کا یہ التفات عارضی ہے۔ ہندوؤں کی یہ ہمدردی سچی تھی یا نمائشی، حقیقت پر مبنی تھی یا جوشِ رقابت کا نتیجہ۔ میرے موضوع سے خارج ہے اس کا فیصلہ اہلِ سیاست ہی اچھی طرح کرسکتے ہیں۔ مجھے تو یہاں اس مسئلہ پر اکبر مرحوم کے تاثرات کو پیش کرنا ہے اور بس ؂

ڈپوٹیشن کی سرسبزی جو دیکھی اس نے شیخ جی — برہمن نے کہا یہ شاخ بیاور لیسے گملے ہیں
کہا ہندو نے بھائی تم کو کیوں اس درجہ حیرت ہے — تمہارے واسطے یہ کیا محل رشک و غیرت ہے
تعجب کیا ہے جو اس بت کے پہلو میں جو بیٹھے ہیں — حرم کے محترم کیا دیر کے خادم سے بیٹھے ہیں
برہمن نے کہا یہ آپ کی باتیں ہی باتیں ہیں — ابھی یہ وصل کی راتیں نہیں ہیں یاں کی گھاتیں ہیں

کانگریس اور مسلم لیگ کے اس باریک فرق کے باوجود جہاں تک صحیح ایثار اور عمل کا تعلق تھا۔ اکبر مرحوم کی نظر میں دونوں کی حیثیت قریب قریب یکساں تھی ؂

یہ کلکتہ کی شوخی اور یہ ڈھاکہ کی طراری — وہ اک فرشی کبڈی ہے یہ لتفلی گیند بلا ہے
یہ ویسی ورزشیں ہیں مغربی جمناسٹک ہے وہ — نئے سن کی طبیعت ہیں یہ کرمس کا بچھلا ہے

ابھی مسلمان حکومت کے خوان کرم سے جی بھر کے ریزہ چینی بھی نہ کرنے پائے تھے۔ کہ کانپور کی مسجد کا حادثہ پیش آگیا جس نے خلیج بنگال سے درہ خیبر تک اور راس کماری سے نیپال کی ترائی تک سارے مسلمانوں کے جذبات کو حکومت کے خلاف بھڑکا دیا۔ اسکے بعد ہی جنگ بلقان اور طرابلس کے شعلے بلند ہوئے۔ ان واقعات کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے۔ ایک طرف مسلمانوں کو حکومت کی اسلام نوازی پر بھروسہ نہ رہا۔ اور دوسری جانب حکومت کو ان کی وفاداری مشکوک نظر آنے لگی۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو شاید قضیہ آگے نہ بڑھتا۔ لیکن الہلال، کامریڈ اور زمیندار وغیرہ کی نکتہ چینیوں نے حکومت کے جام صبر و ضبط کو چھلکا دیا۔

اونٹ نے ہرگز نہیں کل گردن اٹھائی تھی ذرا — ہو چکی تھی اس کو کسرت میں اک مدت دراز
وہ یہ سمجھا تھا کہ تسلیم ہیں ہماری نیکیاں — خوشدلی سے آپ فرمائیں گے اسکو سرفراز۔
منزلِ مقصود اسکی سجدہ گاہِ خلق تھی — وہ تو تھا اک بارکش اور سالکِ راہِ حجاز
آپ نے ناحق سزا دی اور سزا سمجھا اُسے — آپ اُسے گردن کشی سمجھے جو تھا اک پاکباز
یاالٰہی ہم غریبوں کا کہاں ہو اب نباہ — بدگماں اشتر سے ہیں جب حضرت انجن نواز

ادھر مسلمان معتوب ہوئے۔ اور ادھر حکومت کی نگاہ کرم پھر ہندوؤں پر مبذول ہوئی۔ دلی میں شاہی دربار رچایا گیا۔ ملک معظم نے بہ نفسِ نفیس تشریف لاکر تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان کیا۔ وہ لوگ جو کل تک شورش اور دہشت انگیزی کے رہنما اور حامی تھے۔ مراحم خسروانہ کے گیت گانے لگے۔ اکبر مرحوم کی شاعری میں اس دلی دربار کا بھی معقول حصہ ہے۔ ذیل کے اشعار پڑھئے اور مرحوم کی قادر الکلامی کی داد دیجئے ؂

بحرِ ہستی سے رہا تھا بے دریغ انگڑائیاں — ٹیمس کی امواج جمنا سے ہوئیں تھیں ہمکنار
انقلابِ دہر کے رنگین نقشے پیش تھے — تھی پئے اہلِ بصیرت باغِ حیرت میں بہار
ذرے ویرانوں سے اٹھے تھے تماشہ دیکھنے — چشم حیرت بن گئی تھی گردشِ لیل و نہار

ہندوستانیوں میں وفاداری کا جذبہ اور حکم برداری کی اعلیٰ صلاحیت پیدا کی جا سکے گی۔ اکبر مرحوم نے ذیل کے شعروں میں اسی سازش کی پردہ دری کی ہے

سمجھے وہ لوگ جس کو ہمارا انہیں کا تھا — کچھ غل مچا تو یہ بھی اشارہ انہی کا تھا
آزادیوں کے شوق میں ابھرا تھا دل مگر — اس کی خطا نہ تھی وہ ابھارا انہیں کا تھا

آگے چل کر جب اس نیچے کی شوخیاں اعتدال کی حد سے بڑھنے لگیں اور اس سے انگریزوں کو وہ توقعات پوری ہوتی نظر نہ آئیں۔ جو انہوں نے ابتدا میں اس سے قائم کی تھیں۔ تو انہیں ایک نئی جماعت بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ انگریزوں کو یہ معلوم تھا کہ بنگالی بابوؤں کا شور و غل تقریر کی دار و گیر سے گزر کر ان کے لئے ایک مستقل مصیبت اور عذاب الیم بن جائیگا۔ اب انہوں نے ہندوؤں کو ان کے حال پہ چھوڑ کر مسلمانوں سے پینگیں بڑھانی شروع کیں۔ اس انقلاب کو خود لسان العصر کی زبان سے سنئے ؎

دلچسپ ہوائیں سوئے گلشن پہنچیں — زلفیں شانہ سے تا دامن پہنچیں
درگا بائی سے راجہ جی جب رد تھے — صدقہ ہونے کو بی نصیبن پہنچیں۔

نواب محسن الملک میر مہدی علی خاں مرحوم کی تحریک سے بااثر اور معزز مسلمانوں کا ایک وفد مرتب ہو کر شملہ میں حضور والسرائے کی خدمت میں باریاب ہوا۔ ادھر اکبر مرحوم کی شاعری کو ایک نیا شگوفہ ہاتھ آیا ؎

ڈیلیگیٹوں نے جو شملہ میں بہم کی ہے صلاح — بعد عمدہ کھانے کے الٹی ڈکاریں ہیں مباح
بابوؤں کی طرح لیکن غل سے کچھ مطلب نہ ہو — کریں بس توضیح جز و کل سے کچھ مطلب ہو
سنٹرل بھی ہو کمیٹی اور پراونشل بھی ہو — حامی پبلک بھی ہو رخ جانب کونسل بھی ہو
ولولے ایسے نہیں محتاج کچھ تصریح کے — کیوں نہ ہوں دانے تو ہیں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے

اس وفد کے صدر ہز ہائینس سر آغا خاں تھے۔ جو اپنی جماعت کے مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہیں۔ مرحوم نے ذیل کے دو شعروں میں آپ ہی کی صدارت اور مسلم لیگ کی سرکاری حیثیت پر طنز کیا ہے ؎

اونچ ہے یہ رشیوں کی ترازو ہے نہ گلے کا — زیر پردا ہے گلشن کا زیر بولا ہے گلے کا۔
ہمارے حضرت شیخ مہذب کی کرامت ہے، — خدا اس میں چمک دے یہ بھی اک طرح ہے شعلے کا

ان دونوں شعروں میں واقعیت کے ساتھ بلا کی شعریت بھی ہے۔ مرحوم نے اپنے اس نظریہ کو ایک دوسری جگہ بھی فرضی مکالمہ کی شکل میں پیش کیا ہے ؎

راجہ صاحب سے شیخ جی نے کہا — اب بھروسہ حضور پر نہ رہا
مجھ کو چھوڑا امام باڑے میں — پہنچے خود نیچری اکھاڑے میں
راجہ صاحب نے ہنس کے فرمایا — کیوں مزاج آپ کا ہے گرمایا
جب حکومت کرے خود اس کا ڈفنس — کیوں نہ ہوں میں شریک کانفرنس

راجہ صاحب سے مرحوم مہاراجہ محمود آباد اور نیچری اکھاڑے سے نواب محسن الملک مرحوم کی ٹولی مراد ہے۔

اکبر مرحوم اگرچہ کانگریس کو بھی حکومت ہی کے اشارہ چشم ابرو کی پیداوار سمجھتے تھے۔ لیکن انہیں اس سے ایک گونہ تسکین ضرور تھی کہ کانگریس کے بنگالی بابو رفتہ رفتہ ملکی معاملات سے آشنا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن مسلم لیگ والوں کی تگ و تاز وفد بازی ہی تک محدود رہ گئی ؎

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو — ملک کو دیکھو اپنے حق پہ لڑو

جلسے باہر نگاہ ناز فنا ہائے ہند حیف قانون کے اندر آ نہ بیلوں کی قطار

سچ ہے اس سے بڑھ کر اور کیا انقلاب ہو سکتا ہے۔ کہ وہی دلی جس پر کبھی پرتھی راج کا اقبال سایہ فگن تھا جس نے تغلق، لودھی اور سوری خاندان کے پرچم کو لہراتے دیکھا، اور جہاں جس دلی پر مغلوں کے جاہ و جلال کا نیر اعظم اپنی ضیا باریاں کر چکا تھا۔ آج سراپا عبرت بنی ہوئی۔ اس کشاکش کو دیکھ رہی تھی۔ آخری شعر حاکم و محکوم کی مختلف اور متضاد نفسیات کا ایسا عمدہ مرقع پیش کر رہا ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

دلی دربار ہی کے موضوع پر یہ شعر بھی توجہ کے قابل ہیں ؎

اوج بخت ملاقی ان کا چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا آنکھیں میری باقی ان کا

چوتھا مصرع ایک ایسی تلخ حقیقت کا حامل ہے جس سے کسی بڑے سے بڑے خیر خواہ اور وفادار کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ذیل کی رباعی میں بھی مرحوم نے اسی سچائی کو سپرد قلم کیا ہے ؎

حالت پہلی سی اب کہاں میری ہے حیرت انگیز داستاں میری ہے
سینہ میرا ہے دل نہیں ہے میرا میری نہیں بات گو زباں میری ہے

اور یہ شعر تو شاہکار ہے ؎

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی انہیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

پچھلی عالمگیر جنگ پر بھی اکبر مرحوم نے بڑے حسن اور رمز کی لیکن نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ یہ موضوع بجائے خود مستقل و وسیع ہے۔ کہ اس چھوٹے سے مضمون کا دامن اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہاں نمونہ کے طور پر ایسے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ جو موجودہ جنگ پر بھی اسی طرح صادق آتے ہیں۔ جیسا کہ پچھلی لڑائی کے موقع پر۔ سچ ہے تاریخ اپنے اوراق دہراتی ہے ؎

شاہ جرمن نے کہا اک دن جناب پوپ سے وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہانِ توپ سے

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا چہلم ان کا پائنیر لکھتا ہے۔ بیمار کا حال اچھا ہے

جنگ کے ختم ہوتے ہی ہمارے ملک میں ایک نیا فتنہ رولٹ ایکٹ کے نام سے اٹھا۔ جلیاں والا باغ کا المناک حادثہ پیش آیا۔ سوراج اور خلافت کے نغموں سے فضا معمور ہو گئی۔ مدت کے بچھڑے ہوئے ہندو مسلمان پھر بھائی بھائی ہو گئے۔ اتفاق اور اتحاد کی لہریں یہاں تک بڑھیں۔ کہ وہی ہندو جو کبھی مرحوم اسلامی سلطنت کو خدائی قہر و ستم سے تعبیر کرتے تھے۔ اب مسلمان بادشاہوں کی رواداری اور بے تعصبی کا گیت گانے لگے۔ مرحوم کے یہ شعر اسی مبارک دور کی یادگار ہیں ؎

پنڈت نے خوب بات کہی جوشِ طبع میں ناحق گزشتہ عہد پہ یوں طعنہ زن ہیں آپ
پتھر کے بدلے اب تو حرم کو پوجنے لگا محمود بت شکن تھا برہمن شکن ہیں آپ

اس اتفاق و اتحاد کو قائم ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوئے تھے۔ کہ سارا ملک فرقہ وارانہ فسادات سے آتش کدہ

بن گیا۔ وہی جو کل تک ایک دوسرے کے پسینے پر اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اکبر مرحوم کے خیال میں اس اختلاف کا سرچشمہ نئی اصلاحات کونسل اور اسمبلیاں تھیں ؎

دلکش بہت ہے افق گیسوئے اختلاف   کونسل سے کیوں کہوں کہ تیرے بال پیچ نہیں

وہ سارے فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ممبری اور ووٹ بازی ہی کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ اور اس ضمن میں گائے یا باجے کا سوال ان کی نظر میں چنداں اہم نہ تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ممبری پر جنگ ہے اس میں گئو کا کیا قصور   مفت میں بدنام ناحق یہ بچاری ہو گئی

ان کے نزدیک ان اسمبلیوں اور کونسلوں کے ذریعہ جمہوری حکومت کا حصول ایک خواب تھا۔ جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ اس کی بجائے اُس سے ملک کے مختلف فرقوں میں بغض و عناد کی جڑیں استوار ہو گئیں ؎

حکومت پارلیمنٹی نہ باشد اندریں کشور   مگر نیز جنگ آمد بہم از بہر کونسل ہا

قانون ساز جماعتیں سچی حب الوطنی اور قوم پرستی پیدا کرنے کے بجائے جھوٹی عزت اور شہرت کا متوالا بنا دیتی ہیں۔ ؎

ز حرص ممبری نقصان پذیرد قوت ملت   بجائے قوم آز و غل یابد بر درِ دلہا

وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ انہیں ان کی سرپھٹول دل سے ناپسند تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ انہوں کی پھوٹ پر غیروں کو ہنسنے کا موقع ملے، ؎

وہ لطف اب ہندو مسلماں میں کہاں   اغیار اُن پر گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا زباں کی کبھی بحث   ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زبان۔

کیا یہ گاؤ زبان کا یہ نسخہ آج بھی ہماری بہت سی رنجشوں اور خانہ جنگیوں کا سنگم نہیں ؟

بات ہی بات میں زبان کا ذکر آ گیا تو مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مختصر طور پر اس پر بھی ان کے خیالات عرض کر دیئے جائیں۔ وہ اردو زبان کے ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی فلاح و بہبود کے لئے بہت ضروری سمجھتے تھے ؎

اردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں   اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرالقیس بنیں   پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں ۔

پچھلی صدی میں کاشی جی کی پوتر بھومی سے سنسکرت زبان از سرِ نو زندہ کرنے کا ایک غلغلہ بلند ہوا۔ اکبر مرحوم اس کوشش کو نیک نیتی اور خلوص پر مبنی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نئی تحریک فرنگی جادوگروں کی سحر کاری کا اعجاز ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہ ہندو مسلمانوں میں کبھی مستقل اور پائیدار اتفاق و اتحاد ہی قائم نہ ہو سکے ؎

زبان سنسکرت اس وقت پنڈت جی سے کہتی ہے   کہ اچھا ہے مری الفت تمہارے دل میں بستی ہے
میں خوش ہوں گی بلا شک تم اگر مجھ کو جلاؤ گے   مگر وسکی پلاؤ گے کہ گنگا جل پلاؤ گے ۔
جیوں گی میں کہ پھر تم کو ملاؤں دیوتاؤں سے   بھلاؤ گے مجھی کو یا کہ دنیا کی بلاؤں سے
اگر شوق عبادت ہے تو میں موجود ہوں اب بھی   اگر دنیا کا سودا ہے تو میں کب اس سے راضی تھی

اردو کے خلاف یہ جہاد اس غلط خیال کے تحت شروع کیا گیا۔ کہ وہ بدیشی زبان ہے۔ اور اس کے حروف عربی ہیں۔ مرحوم نے ذیل کے رول میں ہولے کے اسی رُخ کو بیان فرمایا ہے ؎

یہ کہتے تھے اک لالہ باوقار — کہ عربی حروف اب تو ہیں ہم پہ بار
رکی ہے انھیں سے ہماری نمود — یہ کھسکیں تو قائم ہو اپنا وجود
کہاں کا حرام اور کہاں کا حلال — پٹے جائے حلوے رہیں رام لال۔

ہمارے ملک کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہیں، کہ یہ کشمکش اب تک اسی روش پر چلی جا رہی ہے۔ عوام کا تو کیا ذکر بعض ایسے مقدس بزرگ بھی جن سے ملک کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، ہندو مسلمانوں کی اس مشترک میراث کو صرف مسلمان بادشاہوں کی قوت ایجاد و اختراع کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے مرحوم ہی کے ایک شعر پر اس بحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

اے فلک انگلش و جرمن ہوں مبارک تجھ کو — ہم کو تو اردو و ہندی میں بسر کرنا ہے

—•:•—

اب تک جتنے شعر پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا تعلق عام واقعات سے ہے۔ مرحوم نے خاص خاص افراد اور بعض مخصوص معاملات کے متعلق بھی جو خامہ فرسائی کی ہے وہ کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اس قسم کے اشعار کسی ذاتی رنجش کا نتیجہ نہیں۔ اس لئے امید ہے کہ انھیں سنجیدہ ظرافت کے سوا اور کسی دوسرے امر پر نہ محمول کیا جائیگا۔ مرحوم کا مشرب صلح کل تھا۔ وہ قدیم وضع کے ایک مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ اور کسی کو برا بھلا کہنا اپنے اصول کے خلاف سمجھتے تھے

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی مثنوی اسرار خودی کے دیباچہ میں خواجہ حافظ شیرازی کے انداز تغزل اور رنگ کلام کے متعلق دو ایک شعر کہہ دیئے جن پر بڑی لے دے ہوئی، اکبر مرحوم بھی جو صوفی منش انسان تھے اقبال مرحوم کے طرز کو برداشت نہ کر سکے۔ پہلے آپ اقبال مرحوم کا اس سلسلہ میں ایک شعر سن لیجئے۔ اسکے بعد اکبر مرحوم کا جواب ملاحظہ فرمایئے ؎

اقبال
ہوشیار از حافظ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار

مرحوم کا جواب اس رباعی میں ہے ؎

نزع نے کر دیا واقف کہ یہ ہستی کیا تھی — ہوش آیا تو کھلا حال کہ مستی کیا تھی
رنگ حافظ پہ جھجک جاتے ہیں ارباب بہار — یہ سمجھتے نہیں وہ بادہ پرستی کیا تھی

—•:•—

۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی کا ایک وفد مولانا محمد علیؒ مرحوم کی سرگردگی میں لندن گیا تھا۔ اسکے ایک رکن مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے۔ اکبر مرحوم کو ایک عالم دین کا سیاسی حیثیت سے ولایت جانا کچھ پسند نہ آیا ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی — کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کچے — مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں — خدا عیز سے ان کو کردے غنی

یہ وفد لندن میں مہینوں رہا۔ حکومت کے وزیروں اور مشیروں کی خدمات میں باریاب ہوا۔ سب بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ دعوتیں بھی ہوئیں اور پارٹیاں بھی ملیں، یہ سب کچھ ہوا لیکن وفد کا اصلی مقصد پورا نہ ہونا تھا۔ نہ ہوا۔ اکبر مرحوم کو وفد کی اس ناکامی پر جب کہ اس پر مولانا سید سلیمان ندوی کی برکت اور دعاؤں کا سایہ بھی تھا۔ ذیل کا شعر لکھنے کے سوا کوئی مفر نہ رہ گیا ؎

معارف کے فسوں رکھے ہے مسجد کی دیوار پر — چلا نقش سلیمانی نہ ان یورپ کی پریوں پہ

—•:•—

شیخ عبداللہ صاحب نے علیگڑھ سے خاتون نامی ایک رسالہ نکالا اور دبے لفظوں میں پردہ کے خلاف آواز اٹھائی۔ شیخ عبداللہ ایسے تجربہ کار اور پختہ مغز بزرگ کا یہ اقدام اکبر مرحوم کے دل میں بے طرح کھٹکا۔ وہ نئی پود کو معاف کر سکتے تھے۔ لیکن بڈھوں کا جرم ان کی نظر میں ناقابلِ عفو تھا۔ اور پرانے دستور سے کسی طرح کی بغاوت اُن کے نزدیک جرم تھا ؎

پردہ اُٹھ جانے سے اخلاق ترقی کریں گے — جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سن چکا ہوں میں کہ کچھ بڈھے بھی ہیں شیخ جی — یہ اگر سچ ہے تو بیشک پیر نابالغ ہیں وہ

پچھلی جنگِ عظیم کے موقع پر حسین شریف نے انگریزی حکومت کی تحریک پر ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس حسن خدمت کے صلہ میں جنگ ختم ہونے کے بعد اُسے معروف مکہ کا شریف بلکہ پورے حجاز کا فرمانروا بنا دیا گیا۔ مرحوم نے ذیل کا شعر اسی واقعہ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے ؎

نئے زمانے کی سطری کے عجیب مفہوم بن رہے ہیں — کہ خدمت دیریں بدولت حرم کے مخدوم بن گئے ہیں

جوش ملیح آبادی

حرفِ آخر کا اک ورق

تخلیقِ حوّا سے پہلے

منظر

چھٹپٹے کا وقت ہے۔ آدم ایک جنگل میں تنہا ٹہل رہا ہے۔ آبشار جاری ہیں۔ دریا زور شور سے بہہ رہا ہے۔ ہوائیں سنسنا رہی ہیں۔ ابر پارے آوارہ پھر رہے ہیں۔ اور آدم ایک عجیب ناقابلِ فہم بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر سپاٹ آنکھوں سے دیکھتا ہوا زیرِ لب دل ہی دل میں کہہ رہا ہے۔

حیراں ہوں، خاک پر ہے یہ کیا زندگی کا طور — ہر ساعت ایک فکر ہے ہر سانس ایک غور
دریا، درخت، سبزہ، سکوں اور آبشار — ہر چند دلفریب ہیں، لیکن یہ قلبِ زار
سینے میں مثلِ شعلہ بھڑکتا ہے کس لئے — کیا چیز ڈھونڈھتا ہے دھڑکتا ہے کس لئے
کچھ اس کی اصل بھی ہے کہ وسواس ہے مجھے؟ — کس چیز کی کمی کا یہ احساس ہے مجھے؛
ہر لمحہ ایک دُھن ہے، تو ہر آن اک کُرید — اور کیوں ہے کس بنا پر ہے کھلتا نہیں یہ بھید
ساکن ہوں اور خیال ہے آوارہ چار سُو، — کس چیز کی تلاش ہے، کس شے کی آرزو؟
یہ واقعہ غریب ہے، یہ مرحلہ عجیب، — خود سے ہوں فاصلے کبھی اور کبھی قریب،
اور بالخصوص فکر میں جھکتی ہے جب جبیں — خود کو ٹٹولتا ہوں کہ میں ہوں بھی یا نہیں،
رہتی ہے مثلِ ابر مسلّط دماغ پر — سنجیدگی، رموزِ خفی سے عمیق تر،
سینے میں کانپتی ہے مرے ایک موجِ نور — دل سے قریب، فہم سے بالا، نظر سے دُور
رہتا ہوں ایک طرفہ تقاضے سے مضمحل — اپنے سے دُور دُور، مناظر سے منفعل
رہتا ہوں کیوں اداس سا، آنسو پیے ہوئے — کیسی یہ تشنگی ہے رگوں میں لئے ہوئے
گونجی ہوئی ہیں کس کے قدم کی یہ آہٹیں؟ — کیسی یہ مرے جسم میں ہیں کسمساہٹیں؟
چھالا سا دل میں وقتِ سحر پھوٹتا ہے کیوں؟ — راتوں کو نامراد بدن ٹوٹتا ہے کیوں؟
بادِ شمال ہو کہ وہ ابرِ جواں خرام — ناقص ہر ایک چیز ہے، ہر شے ہے ناتمام
احساسِ ناتمامیٔ عالم تو ہے، مگر — اب تک ہوں ناتمام کے معنی سے بے خبر
کوندا سا اک لپکتا ہے ہر شاخِ تاک پر — پرتو سا ایک کانپتا رہتا ہے خاک پر
دورانِ خون میں ہے رواں ایک تیز دھار — خود اپنی سانس سینے میں چبھتی ہے بار بار
کچھ اجنبی زبان میں کرتی ہے گفتگو — راتوں کو اک بعید سی موہوم آرزو

لہ میں اس واقعہ پر "ن" کے اعلان کو جائز سمجھتا ہوں۔

چشموں کو کیا کروں، لبِ ساحل کو کیا کروں
اِس نامرادِ کشمکشِ دل کو کیا کروں

خود اپنے ولولوں کو بھی پہچانتا نہیں
کس راستے کے موڑ پہ ہوں، جانتا نہیں

منظر ۹

آدم کی اس حدیثِ نفس کی آواز عرش پر جاتی ہے۔ خدا [illegible] گنا سا ہو جاتا ہے۔ گردن پہلے نیچے جھکاتا پھر اوپر اٹھاتا ہے اور تخت سے اتر کر ٹہلنے لگتا ہے۔ اور ٹہل ٹہل کر بار بار کہتا ہے۔

"اس نامرادِ کشمکشِ دل کو کیا کروں" "اس نامرادِ کشمکشِ دل کو کیا کروں" "اس نامرادِ کشمکشِ دل کو کیا کروں"

پھر ایک دم ٹھہر جاتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔ دیر تک سوچتا رہتا ہے۔ آخر کار خفیف سا متبسم ہو کر، سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے، زیرِ لب کہتا ہے۔

ہاں ــــــ نامرادِ کشمکشِ دل کو کیا کروں

پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر، آنکھوں کو ایک خاص عزم آمیز انداز سے گردش دیتے ہوئے، ہاتھ اٹھا کر،

مہیّا زخم کا ہونا ہے "مرہم"
مبارک باد مرگِ توبہ آدم

منظر ۱۰

آفتاب کے غروب ہوتے ہی قلبِ آدم اور سفینۂ ارض پر مشیتِ الٰہی کا عکس کانپنے لگتا ہے۔ آدم دفعتہً گھبرا سا جاتا ہے۔ دیوانہ وار اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ لیکن اُس کی سمجھ میں اس داخلی و خارجی تبدیلی کا مفہوم کچھ نہیں آتا۔ اور وہ عجیب حیرت آمیز جوشیلے انداز سے پُر آواز مگر دل ہی دل میں کہتا ہے۔

یہ کس شے کی نرالی، اجنبی، نا آشنا ضو ہے
یہ کس نورِ خفی کا نورسس و موہوم پرتو ہے

یہ میرے گرد کیسا درمیانی سا اُجالا ہے
جو سطحِ روشنی سے پست ہے، ظلمت سے بالا ہے

نہ جانے راستے میں ہیں کہ محوِ رقصِ منزل ہیں
یہ کیسے تلخ و شیریں ولولوں کی دھوم ہے دل میں

یہ کس ناخن کا پَر تو پڑ رہا ہے عقدۂ دل پر؟
یہ لو کیسی ہے جو رہ رہ کے کانپ اٹھتی ہے ساحل پر؟

یہ کیا ہے روح ساکن جاگتی ہے، او ونہ سوتی ہے؟
ندی کے موڑ پر اِک داستان معلوم ہوتی ہے!

فضا میں دائرے سے بن رہے ہیں، کیا تلاطم ہے
یہ طوفانِ حقیقت ہے کہ طغیانِ توہم ہے؟

یہ کیسی گھٹتی بڑھتی دل نشین آواز آتی ہے!
کہ جیسے آگ کرہ لگتی ہے، الگ کر گھل سی جاتی ہے

یہ کس نا آشنا سے مہمان کی آمد آمد ہے؟
یہ کس بے بیجھے بوجھے کارواں کی آمد آمد ہے؟

یہ کیا عالم ہے ہر شے بحرِ حیرت میں ڈوبتی ہے!
یہ کس کی سانس چہرے پر مجھے محسوس ہوتی ہے؟

ہوئی ناف یک بیک یہ مری نبضوں میں دھمک کیسی؟
ارے یہ دفعتہً جنبش سی کیسی، یہ چمک کیسی؟

یہ آہٹ کس کی یوں گونجی مرے بے چین سینے میں
صبا جیسے کلی میں، راگنی جیسے سفینے میں،

یہاں آیا ہے کوئی، یا جنوں نے مجھ کو گھیرا ہے؟
ارے یہ کس کا شانہ مس ہوا، تو کون ہے، کیا ہے؟

باری

تاریخ کیا ہے

انسانی امید و بیم، فرض و امکان اور قول و فعل کی راہیں نظامِ پیدائش ہی سے نکلتی ہیں۔ زمین پر الٹی سیدھی لکیریں اور رنگین پردوں پر تصویریں مختلف نظام ہائے پیدائش کی پیداوار ہیں۔ بڑے بڑے تاریخی واقعات کے اسباب معاشی نظاموں میں پنہاں ہیں۔ انسانی زندگی کا بیشتر حصہ اُس کی معاشی حالت کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر زمانہ کے فکر و فلسفہ کے اسباب اُس زمانہ کی معاشی تنظیم کے تجزیہ سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ ہر زمانہ کی حاوث کی رفتار کو بدلنے کے لئے جو سعی کام میں لائی جا سکتی ہے اُس کی تنگی و وسعت کا اندازہ اُس زمانہ کے معاشی عناصر کی قوتوں سے لگایا جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کے ارتقا کے دوسرے عناصر کو تسلیم کرتے ہوئے اس ارتقا کے اہم ترین اسباب، پیدائش، تقسیم اور تبادلہ ہیں۔ یہی اسباب انسانی افکار، انسانی ارادوں اور انسانی خواہشات کی تعمیر و تخریب کا کام دیتے ہیں۔ تنظیم پیدائش سے انسان ایک دوسرے سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں۔ کہ اس طرح سے مجلسی، سیاسی، اخلاقی اور تمدنی ضوابط مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم کسی خاص سماج کی حقیقی ترکیبی کا پتہ لگانا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس سماج کی تنظیم پیدائش کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اسی پیدائش اور تقسیم سے سماج مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں کے مطابق اپنے نظریوں میں تبدیلی نہیں کرتا بلکہ اس تبدیلی کا ایک بڑا سبب ذرائع پیدائش و تقسیم کی تبدیلی ہوتا ہے۔ ہیرلڈ لاسکی کے الفاظ میں: حقوق، بدنی آزادی اور مساوات کے تصورات مروجہ ذرائع پیدائش کے ساتھ اعتباری تعلقات رکھتے ہیں۔ ایک مخصوص نظام پیدائش میں انسان سڑک پر چلنے یا کوئیں سے پانی بھرنے کا حق طلب کرتا ہے۔ جس وقت نظام پیدائش بدل جاتا ہے۔ تو یہی انسان آئین سازی کے حق کا مطالبہ کرتا ہے۔ مصر کے غلام کسان جو طغیانی کے موسم میں اہرام بنانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ موجودہ صنعتی ملکوں کے مزدوروں کے مطالبات کیونکر پیش کر سکتے تھے؟ بمبئی، کانپور اور احمد آباد کے مزدور لندن، نیویارک اور ماسکو کے مزدوروں کے مطالبات کیوں پیش نہیں کرتا؟ ظاہر ہے کہ مختلف پیدائشی نظاموں میں حقوق کے مطالبات بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ سوویٹ روس کے مزدوروں کا مطالبہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے مزدوروں کے مطالبہ سے مختلف ہونا چاہیئے۔ ایک مخصوص نظام پیدائش میں فرد واحد کے الفاظ عدل و آئین کا حکم رکھتے ہیں لیکن نظام پیدائش کے بدل جانے کے بعد عدل گستری کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ ایک مخصوص نظام پیدائش میں ننگے سر چلنے پھرنے کا مطالبہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرے نظام پیدائش میں تحریر و تقریر کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے۔ ایک مخصوص نظام پیدائش میں صرف ووٹ دیئے جانے کے حق کو مساوات کہتا ہے۔ لیکن تبدیل شدہ نظام پیدائش میں ووٹ کے حق کو حاصل کرنے کے بعد بھی انسان معاشی مساوات کا مطالبہ کرتا ہے۔ نظام پیدائش و تقسیم کے بدل جانے سے مطالبات اور تصورات میں جو تبدیلی آتی ہے۔ اُسے انڈین نیشنل کانگرس کی تاریخ واضح کرتی ہے۔

تاریخ کے متعلق یہ نظریہ کہ وہ ایک سائنس ہے۔ حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔ لیکن تاریخ کے متعلق یہ نظریہ کہ وہ ازمنۂ گزشتہ کے واقعات کا ایک ریکارڈ ہے۔ اتنا پرانا ہے جتنا فن تحریر۔ فن تحریر سے پہلے تاریخ اور اُس کے واقعات صدیوں تک سینہ بسینہ چلے آتے تھے۔ تاریخ کی سب سے پرانی کتابیں مصریوں، بابلیوں، اشوریوں اور اسرائیلیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ تاریخ کی ان کتابوں کا انداز ناصحانہ ہے۔ مشرق کے ان وقائع نگاروں سے یونان کے مورخوں کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ یونانیوں نے تو بہت اگلے سے کر لیا اُن کی ماہیت پیش نظر مطالعہ کیا تھا۔ سب سے پہلا یونانی مورخ ہیکیٹس کہتا ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں۔ وہ میرے نزدیک سچ ہے۔ یونانیوں کے افسانے بے شمار ہیں۔ اور میرے خیال میں وہ بیہودہ ہیں۔ اس کے بعد ہیروڈوٹس آتا ہے۔ ہیروڈوٹس اگرچہ بہت مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ تاہم وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایران اور یونان کی جنگ دو رقیب تمدنوں کی جنگ تھی۔ یونان کا تیسرا نامور مورخ تھیوسی ڈائڈز ایتھنز اور سپارٹا کی جنگوں کو پیش کرتا ہے وہ تاریخ کے مقصدی نظریہ کا قائل تھا اُس کے نزدیک ازمنۂ ماضیہ کے واقعات کا علم اس لئے ضروری ہے۔ کیونکہ اس امر کا پورا امکان ہے۔ کہ اس قسم کے واقعات دوبارہ ہوں گے۔ یونانی مورخ پولی بیس نے روم میں رہ کر رومی جمہوریت کی جو تاریخ مرتب کی تھی۔ اس میں اُس نے تھیوسی ڈائڈز کے نظریہ کی پیروی کی تھی۔

جولیس سیزر سے پہلے رومی تاریخ یونانی زبان میں یونانیوں کے قلم سے لکھی گئی۔ جولیس سیزر نے لاطینی زبان میں جنگ گال لکھی۔ یہ کتاب تاریخ سے زیادہ [illegible] ہے۔ لیوی نے شاعرانہ انداز میں رومی دولت مشترکہ کے گیت گائے۔ روم کے اخلاقی انحطاط پر ٹیسی ٹس نے نفاست پر غور و فکر کرنے کو رومی مورخ کا فرض خیال کیا۔ رومی سلطنت اور بعد ازاں کلیسا کی فتح کے بعد تاریخ نگار پیدا ہوں اور دینی پیشواؤں [illegible] تاریخ کو دینیات کے ماتحت کر دیا گیا۔ خدا اور انسان کے تعلقات کے ریکارڈ کا نام تاریخ رہ گیا۔ ایک ہزار سال تک یورپ تاریخ کے اصل مفہوم سے نا آشنا رہا۔ یہاں تک کہ ہسپانیہ کے عرب تمدن نے یورپ کے جہالت کدہ کو منور کیا۔

عرب مورخوں نے دنیا میں پہلی مرتبہ ساری دنیا کی تاریخ کو ایک وحدت بنا کر پیش کیا۔ انہوں نے تاریخ اور جغرافیہ کی آمیزش سے "تاریخی جغرافیہ" کا علم پیش کیا۔ عرب مورخوں میں مسعودی، ابن خلکان اور ابن خلدون نے تاریخ کو اس انداز میں پیش کیا۔ کہ ہم انہیں علم تاریخ کے بانی کہہ سکتے ہیں۔ ابن خلدون کے زمانے میں مصر میں انسائیکلو پیڈیا کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ ابن خلدون یہ تسلیم نہیں کرتا۔ کہ حوادث بغیر نظم و ترتیب کے محض بخت و اتفاق سے پیش آتے رہتے ہیں۔ بلکہ وہ یہ ثابت کرتا ہے۔ کہ چند قوانین اجتماعی حرکت کے محرک ہوتے ہیں۔ ان قوانین سے بحث کرنے کے لئے نتائج کا مطالعہ ناگزیر ہے اس اجتماعی حرکت کے مطالعہ کو وہ عمرانیات و سوشیالوجی کا نام دیتا ہے۔ ابن خلدون نے یورپ میں ایک نیا مدرسہ فکر پیدا کر دیا۔ یورپ کے جو احیا کے مورخ ابن خلدون کے زیر اثر دکھائی دیتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کا مورخ ویکو فلسفی مورخ ہونے سے کہیں زیادہ مقنن تھا۔ مونٹسکیو نے ابن خلدون کے اس نظریہ کی تشریح کی کہ آب و ہوا کا اداروں اور افکار پر کیا اثر ہوتا ہے۔ تنقیدی تاریخ میں والٹیر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ڈیوڈ ہیوم، ولیم رابرٹسن، ایڈم سمتھ اور ہارڈر ہیرین سب کے سب والٹیر کے زیر اثر دکھائی دیتے ہیں۔ انقلاب فرانس کے بعد جرمنی میں حیرت انگیز طور پر تاریخ نگاری میں کام ہوا۔ وائن کانگریس کے بعد مورخوں کی نئی نسل رومانی ادبیات سے وابستہ تھی۔ بادشاہوں کے "سایۂ خداوندی" ہونے کی پھر تلقین کی گئی جمہوریت کی بجائے قومیت کا پرچار ہونے لگا۔ اس زمانے کے فلسفی مورخ سماج کو انقلاب فرانس سے آگے نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن صنعتی انقلاب نے ذرائع پیدائش میں تبدیلی کر دی۔ اور نئے نئے مطالبات شروع ہو گئے۔ بہرحال تاریخ نگاری کی اس رومانی تحریک سے یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کی چھپی ہوئی تاریخ ہمارے سامنے آ گئی۔

جب رومان پسند مورخ ماضی کو جنت بنا کر پیش کر رہے تھے۔ تو اس وقت انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی میں تاریخ کو سائنس بنانے کے لئے جد و جہد ہو رہی تھی۔ اس نئے مدرسہ کا آغاز وُلف کی "تمہید ہومر" سے ہوتا ہے۔ وُلف کے شاگرد آگسٹ بوخ نے اپنے استاد کے طرز استدلال کو تاریخ واقعات پر پرکھا۔ لیوپولڈ فان رانکے نے تاریخ کو غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کیا۔

انیسویں صدی کے طبیعی مسائل نے تاریخ نگاری میں نمایاں تبدیلی کی۔ لیکن انیسویں صدی کے بیشتر مورخ مسئلہ ارتقا کی الجھنوں میں پھنسے رہے تاہم تاریخ کا مطالعہ طبیعی علوم میں شامل ہو گیا۔ کارل مارکس نے تاریخ کا معاشی نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ سے یہ مراد ہے۔ کہ انسان کے طبیعی ارتقا میں معاشی عناصر دوسرے عناصر پر غالب ہوتے ہیں۔ فیور باخ کے خیال میں انسان کا وجود انسانی شعور کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن مارکس کے خیال میں انسانی شعور اس کے طبعی ماحول سے پیدا ہوتا ہے

اندھیرا

مخدوم محی الدین

رات کے ہاتھ میں اِک کاسۂ دریوزہ گری۔
یہ چمکتے ہوئے تارے!
یہ دمکتا ہوا چاند!
بھیک کے نور میں، مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے، یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمین گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں ——
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں، ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی
کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے۔
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

ڈاکٹر تاثیر

۲
دوراہے

ریل گاڑی پہ یہ گھمسان۔ الٰہی توبہ! —
نہ مروت، نہ تکلف، نہ تبسم، نہ ادا
یونہی اک غیر شعوری سی خشونت کا خروش! —
بے ارادہ سہی تو کیا، غیر شعوری ہے تو کیا
یہ نئے دور کے احساسِ غلامی کا ظہور
انتقاماً نہ تحکم کی نمود! ——
خانہ جنگی ہی سہی
اس میں اک اظہار بغاوت بھی تو ہے۔
یونہی یونہی سہی
اک شائبۂ دادِ شجاعت بھی تو ہے
—— "چاک کرتا ہوں میں اپنا گریباں ہی سہی"

* * * * * * * * * * * * * * * *

کلبلاتی ہوئی مخلوق کی اس دلدل میں
سینہ تانے ہوئے کچھ لوگ بڑھے جاتے ہیں
خوب پھنکارتے پھن پھیلائے! —
لوگ؟ یہ وہ لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ کالانعام نہیں
جن کو ٹھکراتے ہوئے جاتے ہیں
یہ لوگ — بڑے صاحب لوگ! ——
یہ جو حکام ہمارے ہیں یہ حکام نہیں
جو ہمیں ہیں مگر ہم میں نہیں۔
یہ جو بندے ہیں آقا، مگر آقا کے غلام
— بادشاہوں تو ہوں بے دام نہیں! ——
—— "تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا"

* * * * * * * * * * * * * * * *

ان پہ دنیا کی ہر اک راہ کشادہ ہے مگر
آج اک سنگِ گراں حائل ہے۔
کہ اٹھائے نہ اُٹھے اور ہلائے نہ ہلے!—
دوسرے درجے کے دروازے میں
ان کے آقاؤں کا اک فرد — فرنگی گورا
بانہیں پھیلائے ہوئے راستہ روکے ہے کھڑا۔
("کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق!")
سیٹیاں بجنے لگیں!— خدمتِ سرکار بجا لانا ہے
اور سرکار ہی خود سنگِ رہِ منزل ہے؟—
زندگی آگئی دوراہے پر!—

——— دیر کیوں کرتے ہو بھاگو بھاگو
دوڑ کر تھرڈ کے ڈربے میں گھسو
اپنے ہم جنس غلاموں میں پھر رلو
زندگی آگئی دوراہے پر!—

راجندر سنگھ بیدی

ناگفتہ

ڈوگرہ حوالدار نے ٹوپ کو کانوں تک کھینچ لیا، بند وقت کی اور خاکی وردی کے بٹن کو کاج میں پھنساتے ہوئے بولا

"اب تم میں سے کون بولے گا، آگے ..."

آدھی درجن کے قریب باڑھ کی سی آوازیں آئیں — "ہم — — میں ہم!"

رنگپور گاؤں کے جنوب کی طرف، جہاں میں ایک ترتیب ڈٹے ہوئے جوان کھڑے تھے، وہ رنگ فارم کی کپاس اپنے سفید سفید دانت نکالے منہ چڑا رہی تھی۔ وہ بھی علاقے کی عام جوان اور بوڑھی عورتوں کی طرح تھی — بھرتی والوں سے سخت متنفر۔ اسکے سبز زرد پتوں پر کہیں کہیں شبنم کے بڑے بڑے آنسوؤں کی صورت ڈھلک رہے تھے۔

رنگپور جرنیلی سڑک کے کنارے پر واقع تھا۔ دور سے مسجد کے مینار اور سکھوں کے گوردوارے کے نشان صاحب، بادلوں کی مجبوری سفیدی کے خلاف، زرد زرد اور لہراتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ گویا گاؤں کے ارتقا میں عبادت گاہیں رہائش کاموں سے پہلے وجود میں آگئی تھیں۔ لیکن حقہ والے خوش تھے، مسلمان مسجد میں سے اور سکھ گوردوارے سے سنت لیتے، اگر روزانہ حقہ پی سکتے تھے۔ اور پھر ہمیشہ کی طرح آوارہ مرغیاں بھی چر اُٹھ سکتی تھیں۔

کچھ دور جانے پر رنگپور کے واگی دکھائی دیئے۔ وہ ڈھور کو کھیتوں میں سے ہٹا کر جرنیلی پر ہانکنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈھور کا ایک جوڑا ڈبلی کھائی میں اترا ہوا تھا اور اپنی کھال میں مست جگالی کر رہے تھے۔ اس کے منہ سے بڑے بڑے بتاشے پانی میں گر کر کھیل رہے تھے ... ہو ہو، تیرے مریں مالک ہو ہو ... واگی دور سے آواز دیتے، پھر تہمد کو اوپر اٹھاتے لیکن کھائی کے ٹھنڈے پانی میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑتی۔ اسپراج پہاڑ کی طرف سے تلوار کے پھل کی طرح تیکھی اور کاٹ دینے والی ہوا چل رہی تھی۔ اور جتنے آدمیوں کو گرم کپڑوں میں لہو کی گردش تیز شراب کا مزا آ رہا تھا۔

سپاہی پر دمن سنگھ نے ایک مینڈ پر کھڑے ہو کر پیچھے کی طرف دیکھا اور بولا

"کوئی دانا پتا نہیں بھرتی افسر کا"

"تو ہی تحصیل میں چل گیا ہوگا، بہن کا ......" حوالدار بولا۔

حیاتے نے خرجین میں سے ایک تھیلا اٹھوا، دیسی سنگترہ نکالا۔ اور اس کا چھلکا ہوا میں اچھالتے ہوئے بولا۔

"دھواں بھی نہیں ہے آج۔ ورنہ بھرتی افسر کی کار کا پتہ نہ چلے ..."

ایک عجیب انداز سے کھیستے، حیاتے، ٹولکا بریاں، سنتے حقے والے رنگپور کی طرف بڑھے۔ رنگپور کا نمبردار بچھو بھی ساتھ ہی تھا۔ ضلع سے براہ راست اُس کے نام پروانہ آیا تھا۔ ایک سو چار آدمی اُس نے پچھلی جنگ میں دیئے تھے۔ جن کی جانبازی اور شہادت کا پتھر کسی شہر کے عجائب گھر میں پڑا تھا۔ ایک تین کے قریب اس لڑائی میں جا چکے تھے اور بہت سے نوجوان ابھی گاؤں ہی میں دکھائی دے رہے تھے۔ بچھو سب حالات سے واقف تھا۔ مثلاً یہ کہ مارگی والوں نے تعلیم کے لئے دو چرچے لکھے، پلے ہوئے جوانوں کی توقع تھی۔ اسکے علاوہ بچھو اور بھی بہت کام کرتا تھا۔ مثلاً اُس نے بٹیر پال رکھے تھے۔ جب وہ ان بٹیروں کو جنگ کے لئے آمادہ کرنا چاہتا۔ تو انہیں کئی کئی دن بھوکا رکھتا۔ ان کی کلگی بند کر دیتا اور وہ خشمگین ہو کر ہر اپنے اور پرائے سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے۔

مدرسے کے قریب پہنچتے ہی حوالدار نے سپاہی پردمن سنگھ کو سرس کی ایک بڑی سی چھتری کے نیچے جھنڈا گاڑ دینے کا حکم دیا۔ رنگ پور کی قطرہ کے باسی لمبردار کے بیٹے نے اشارے پر جاروب کی بجائے کندھوں پر پڑی ہوئی گاڑھے یا گمٹی کی چادروں سے ہی زمین صاف کرنی شروع کر دی۔ سبز خون والے سفید سفید کیڑے اور بھکھڑے کے سے چھوٹے چھوٹے کانٹے جو کہ جا بجا بکھرے ہوئے تھے، ایک طرف ہٹا دیئے گئے۔ جب سب کچھ ہو چکا تو جھنڈا [illegible] کی چھڑی کی طرح پتلی مگر سخت، حوالدار کی لمبی سی انگلی اٹھی اور وہ ہلہم بجانے لگے ——

باہر کھڑے رنگروٹ بھرتی ہو جاوے

* * * * * *

ایتھے تے پاناں ایں ٹٹیاں جتیاں

ایتھے تے پاناں ایں ٹٹیاں جتیاں۔

جانور ون نے ۔ سے تڑائے کرے اٹھے رکتے ہونٹ اور کچھ دیر بعد بکھو رنے سب کھایا پیا اگل دیا۔ منڈیر ول پرا ور نیچے نیچے ہی بچے اور عورتیں ہی عورتیں دکھائی دینے لگیں۔ کچھ عورتیں اپنے شوہروں کے لئے سڑک کے دو رویہ جا کھڑی ہوئیں۔ گاؤں کے جاٹ ہاتھوں میں درانتی یا دو سانگھے لئے اپنی کھوکھلی، بے شغل، بےغرض متوجہ نگاہوں سے حوالدار اور اُن کے شامیانے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک مبہم جذبے کے ساتھ اُن کا خون حرکت کرنے لگا۔ بھرتی کے خیال نے انہیں متاثر نہیں کیا تھا۔ بلکہ جہاں بھی چار آدمی جمع ہوتے۔ وہیں ان کا جوش مارنے لگتا اور وساکھی کے موسمی جھگڑے، جھمر یا لڈی انہیں یاد آجاتے اور ایک ہاتھ کانوں پہ رکھ، دوسرا آسمان کی طرف اٹھا —— او آئی وساکھی آئی، او گئی وساکھی گئی، کا بے مطلب گانا گا کر اودھم مچانے لگتے۔

جتھے والے بولے۔

ایتھے تے پاناں ایں ٹٹیاں جتیاں

اوتھے ملن گے بوٹ بھرتی ہو جا اوئے

مجمع میں سے ایک آدمی آگے بڑھا۔ اُس کے اندر کوئی فطری سوال زبان پر آنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ اُس نے جھینپی ہوئی نگاہوں سے بندوقوں کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کا منہ زرد سے سُرخ ہوا، پھر سُرخ سے زرد اور وہ بنا کچھ کہے واپس چلا گیا۔ اُس نے چھوٹی سی خودکشی کر لی...... اور دیکھتے کہ بڑے بڑے وزنی بوٹوں کا سیاہ پالش دمک رہا تھا۔ مولا سنگھ اور جھورا ظہور دین، ایسے زاویئے پر کھڑے تھے۔ کہ سورج کی شعاعیں پالش کے آئینوں میں سے منعکس ہو کر اُن کی آنکھوں میں پہنچ رہی تھیں۔ اگرچہ سورج تھوڑی دیر بعد پھر بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا۔ جھورے نے یونہی اپنے کاسے شاہی جوتوں کی طرف دیکھا وہ کبھی کے پرانے ہو چکے تھے۔ اور پھر آج لوبیا کے کھیت میں سے باہر آئے تھے۔ اور ان پر اب مٹی کا نیٹ پالش اپنی کند شعاعیں جھورے کے ذہن میں منعکس کرتے ہوئے اسے ایک ناقابلِ عبور، افریقی دلدل بنا رہا تھا۔ ہجوم کے وسط میں، کنوئیں کی جگت کے سہارے اچار جن رکھی اپنے بچے کو لئے کھڑی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں اپنے اچار ج کو وہ سیاہ بوٹ پہنا بھی دیئے۔ اگرچہ وہ اپنی کمر پر ان کی ایک بھی ٹھوکر برداشت نہ کر سکی۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بوٹوں سے کوئی منکر نہیں تھا۔ اور جتھے والوں نے جاری رکھا۔

ایتھے تے پاناں ایں دگدیاں لیراں

اوتھے ملن گے سوٹ بھرتی ہو جا اوئے

* * * * * *

ایتھے تے کھانا ایں گاجر مولی

اوتھے ملن گے فروٹ بھرتی ہو جاؤ

باہر کھڑے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آسمان پر بادل پھٹ گئے تھے اور سورج ہوا کی گذاری کو گندکر رہا تھا۔ دیہاتی اپنے نیم برہنہ بدنوں کو ڈھانپتے ہوئے جیتھڑے والوں کے کپڑوں اور ان کی خوفگینیوں میں کسی چیز کے سامان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ایک مبہم سی، خواب آلودہ یاس کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ پہاڑ کی طرف سے صولہا کی ایک گہری سی اٹھی اور آنا فانا تڑپیو رکھ کے آسمان پر چھانے لگی۔ مجمع کے چند آدمیوں نے اوپر کی طرف نگاہ کی۔ لیکن کچھ نہ سمجھتے ہوئے، پھر حوالدار کے ٹرنک اور سپاہیوں کی بانڈیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ گاؤں کا واحد سفید ایک نخے سے شیشم کے ساتھ سرگوشی کے لئے جھکا۔ سپاہی پرڈمن سنگھ نے جواب سے کہا۔ بھرتی افسر آ رہا ہے شاید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور حیات نے پر دمن سنگھ کی بات کو پوری طرح نہ سنتے ہوئے بھی سر ہلا دیا اور رہٹ کی سی بھدی آواز میں گانے لگا۔

اچھے سنے ملدا ای دانہ ہی دنیا

اوتھے فی گی بدو تی بھرتی ہو جا دے —

اس سے پہلے شاید دیہاتیوں کو پیٹ اور جسمانی سکھ کا ہی خیال تھا۔ اب بندوق نے اُن کے ذہن میں ایک سنجیدگی اور مسرت کی دنیا پیدا کر دی تھی۔ جتا سنگھ نے اس شش ماہی میں چار دفعہ ہوکے کا ستہ بند کر دیا تھا۔ اور ہرلا سنگھ اسے جان سے مار سکتا تھا۔ جھنڈا اپنی بیوی کے عاشق سے بدلے سکتا تھا۔ بچپن میں کوؤں کے گھونسلے گرانے، بیر بہوٹیوں کا تیل نکالنے اور بکروٹوں کا اچار ڈالنے کا جذبہ اس عمر میں اپنے ہم جنسوں کو مار ڈالنے کے جنون تک پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر گلا پھاڑنے کے بعد سب ٹھنڈے ہو گئے۔ حوالدار نے لچھو کو کچھ بولنے کا اشارہ کیا۔ اب لچھو ہلا کہاں کا مقرر تھا۔ اس نے ایک شاپ لی۔ دراصل اس نے بھرتی گیت کے مفہوم کو دہرا دیا تھا، اور اس بات پر زور دیا تھا کہ وہاں، دنیا کی ہر نعمت میسر آتی ہے۔ لیکن لچھو کوئی بہت احمق نہیں تھا۔ جو محض ان باتوں کو دہرا دینے پر اکتفا کرتا۔ اُس نے مدرسہ کا احاطہ کرنے والی منڈیر کے قریب کھڑی بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — اور پوچھو جیونے کی ہے بے سے، کیا اسے ہر مہینے دس روپے کا نیلا منی آرڈر نہیں آتا؟ جیونے کی ماں کے دل میں ایک اُبال سا اٹھا۔ اُس نے زور سے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن صرف — اخ ۔ ۔ ۔ ۔ اخ ۔ ۔ ۔ کر کرا کیا گلا ملنے لگی۔ اُس کے گلے میں بلغم پھنس گئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عورتوں اور مردوں کے ذہن میں روپوں کی سفیدی اور منی آرڈر کی نیلاہٹ خلط ملط ہونے لگی۔ ان کے کانوں میں بھرتی گیت اور اخ اخ گتھم گتھا ہونے لگے۔ آسمان کی آندھی اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کھڑپ کھڑپ، کھڑپ کھڑپ کی سی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بہت سے پاؤں ایک ساتھ اٹھ کر زمین پر پڑ رہے ہوں۔ سپاہی حیات نے کنوئیں کی جگت پر چڑھ کر مغرب کی طرف دیکھا۔ جرنیلی سڑک پر دور تک کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بھرتی افسر کی موٹر ہوتی تو کبھی کی رنگ پور پہنچ جاتی۔ دور سڑک پر ایک نقطہ سا تھا۔ جو کہ بسیط ہو رہا تھا۔

ڈھ گہ۔ حوالدار نے رجسٹر کو کھولا اور ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اندراج کے لئے بیٹھ گیا۔ لیکن دور سے باجے کی آواز نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ جرنیلی پرچم کا نقطہ اچھی خاصی مستطیل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سب لوگوں کو سامنے کے چار آدمی دکھائی دئے۔ ان کے پیچھے کچھ اور آدمی تھے۔ پندرہ بیس منٹ میں ایک پلٹن کی پلٹن نظر آنے لگی۔ اور سب لوگ کھڑے ہو کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

لیفٹ رائٹ لیفٹ ۔ ۔ ۔ ۔ لیفٹ رائٹ لیفٹ ۔ ۔ کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ہلکی سی دھول رنگ پور پر چھا گئی تھی۔ دیہاتی گاؤں والوں کی طرف دیکھتے ہوئے جرنیلی پر سے گزرنے لگے۔ اسکے بعد چھکڑے اور چھوٹی چھوٹی گاڑیاں آئیں۔ درمیان میں کہیں کہیں ایک بڑا سا استر، ایک بڑے وزنی چھکڑے کو کھینچ رہا تھا۔ ان گاڑیوں اور چھکڑوں میں شاید راشن تھا۔ چھکڑے کے پیچھے دو ڈھائی فرلانگ تک اور سپاہی تھے۔ جن کے پاؤں عین ایک ساتھ اٹھتے تھے۔ ان کی چھاتیوں پر تمغے اور کندھوں پر نشان تھے۔ کہیں دھات کے بنے ہوئے ستارے اور تاج تھے ۔ ۔ ۔ ۔ لیفٹ رائٹ، لیفٹ ۔ ۔ ۔ ۔ فوج چلتی گئی۔ نہ صرف قدم بلکہ سپاہیوں کے بازو بھی ایک ہی ساتھ اٹھ رہے تھے۔ سورج نکلنے پر ہوا اور بھی خشمگیں ہو گئی تھی۔ جو چہروں کا کف اُن کے کناروں پر

اکٹھا ہو رہا تھا۔ لیکن انسان کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو کوئی آندھی، جھکڑ یا بگولا روکنے کا اہل نہیں تھا۔ پلٹن کے آدمی کسی دور علاقہ کے دکھائی دیتے تھے۔ ان کا رنگ سیاہ تھا اور قد ٹھگنے۔ دکن میں کہیں بھرتی ہوئے تھے۔ عراق میں دو برس لگا کر انہیں پنجاب میں تبدیل کیا گیا تھا۔ اور اب انہیں کبھی پشاور، کبھی سیالکوٹ، کبھی لاہور یا جہلم بھیج دیا جاتا۔ اور وہ ہمیشہ کبھی گاڑی میں اور کبھی پیدل کسی نامعلوم جگہ کی طرف پا بہ سفر رہتے۔

پلٹن کا آخری حصہ رنگ پور میں سے گزر رہا تھا۔ آخری چند قطاروں میں سے ایک سپاہی نے اپنے ساتھی کے ساتھ سرگوشی کی اور اپنے جمعدار کی نگاہ سے بچتے ہوئے باہر نکل آیا۔ وہ دُبلا، پتلا اسکھنڈی سا آدمی تھا۔ اس کے جسم کے کنگرے منہدم ہو رہے تھے۔ اس کی جوانی کمزور تھی۔ چہرے پر موسم کے اثرات شدت سے نمایاں تھے۔ عمر کے لحاظ سے وہ جوان تھا اور نہ بوڑھا۔ قطار سے باہر نکل کر اس نے اپنی چندھی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا اور کنوئیں کے منڈیر کی طرف دیکھا، جہاں ایک اچار جن رخو اپنا بچہ لئے کھڑی تھی۔ رخو کے قریب پہنچ کر سپاہی بولا۔

"ماں! کیا تم مجھے اپنا للا دے سکو گی؟"

رخو گھبرائی، اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔

"صرف ایک منٹ کے لئے، ماں!" سپاہی نے گڑگڑا کر کہا "صرف ایک پل کے لئے"

عورت نے کتورا مخمل کی طرح نرم اور گداز، بچہ سپاہی کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ سپاہی نے ایک پل کے لئے بچے کو اچھی طرح سے گھورا۔ اس کی معتدل حرارت کو محسوس کیا، اسے بے تحاشہ چوما۔ چھاتی سے بھینچا، رویا اور گرتا پڑتا سپاہیوں میں شامل ہونے کے لئے دوڑنے لگا۔

پیرزادہ رفیع خالدی (رفیع پیر)

ایک استہزائی تمثیلیہ

راز و نیاز

افراد ———

راز — بیس پچیس برس کی ایک نوجوان اور طرحدار عورت
عہد جدید کے جذبہ تجسس کی پیداوار
نیاز — ایک نوجوان مصنف

جائے وقوع

سرینگر کا ایک ہاؤس بوٹ، لب دریا

منظر — ایک بڑے ہاؤس بوٹ کا نشستی کمرہ۔ پیچھے کی دیوار میں تین کھڑکیاں ہیں جن پر رنگین پردے پڑے ہوئے ہیں۔ سٹیج کی بائیں طرف کمرے کی دیوار میں ہاؤس بوٹ میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ دائیں طرف کی دیوار کے تقریباً نصف حصہ میں پرانی مغربی وضع کا ایک راک ہے جس پر گلاس اور مشروبات کی مختلف اشیاء دھری ہیں۔ باقی حصہ کھلا ہے اور اس پر پردہ لٹکا ہوا ہے۔

پچھلی دیوار سے کچھ آگے کو یعنی چلنے پھرنے کا رستہ چھوڑ کر ایک صوفہ ہے صوفہ کے دائیں طرف کھڑکی سے کچھ اس طرف ایک مجھلے کی میز آڑی رکھی ہے۔ صوفہ کے اسی طرف صوفہ کے سامنے ہی ایک چھوٹی میز ہے۔ آگے کی طرف۔ یعنی سامعین کی طرف کو دائیں بائیں دو طرفہ کرسیاں ہیں

عورت (جلدی جلدی سے کاغذات دیکھتے ہوئے۔ ملی الستک، یہ بھی نہیں یہ بھی نہیں۔ ہائے یہ بھی نہیں۔ اوہ یہ ہے۔ یہی۔ !!!

(اس وقت ایک مرد کمرے میں داخل ہوتا ہے اور عورت کو دیکھ کر دفعتاً رک جاتا ہے عورت کاغذات کی تفتیش میں اتنی منہمک ہے کہ وہ مرد کے آنے سے باخبر نہیں ہوتی)

مرد (عورت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کھنکار کر) اہم۔ !!

عورت۔ (دفعتاً چونک کر، گھومتی ہے) ہائے میں نہیں یوں نہ آ کر چونکا دیا کرو (پھر یک لخت مرد کو دیکھ کر انتہائی تعجب کے لہجے میں) اوہ !! مگر آپ تو کوئی اور ہیں ——— !!!

مرد (اختیاری ندامت کے ساتھ) جی افسوس ہے میں کوئی اور ہوں! مزاج شریف۔ !!

عورت۔ (طنز کے ساتھ) تھنکس !!

مرد۔ آپ پہلے کبھی نیاز حاصل نہیں ہوئے۔ !

عورت۔ (طنزاً متبسم ہو کر) آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ !

مرد میں یوں لاحق ہونے کے لئے معذرت چاہتا ہوں، مگر ———

عورت۔ (بے رخی کے ساتھ) نہیں نہیں کوئی بات نہیں ——— !

مرد۔ (ابرو اٹھا کر) صاحب بات تو کچھ ضرور ہے ——— !

عورت۔ (تن کر) بات۔ ؟

مرد (شاطرانہ معذرت طلبی کے انداز میں) معاف فرمائیے گا۔ معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو کسی گہری مصروفیت سے چونکا دیا ہے

عورت۔ (ہونٹ نکال کر) چونکنے کی تو بات ہی ہے۔ جب ناگہاں کوئی سر پہ آن کھڑا ہو تو انسان کیا کرے۔ خصوصاً جب آنے والا بغیر مرد ہو۔ !

مرد۔ (مبالغہ آمیز اظہار مطابقت کے ساتھ) جی ہاں خصوصاً جب

حائل ہونے والا غیر مرد ہو۔ ! (انداز بدل کر) مجھے اس بات کا قطعی طور پر اعتراف ہے کہ اگر صاحب خانہ کوئی محرم ہوتا تو آپ کا استعجاب شاید اسقدر ناخوشگوار نہ ہوتا۔

عورت (متعجب و متذبذب ہوکر) صاحب خانہ۔ آپ۔ !!؟

مرد ۔ (شاباش) فی الحال ۔ !

عورت (اور زیادہ تعجب کے ساتھ) فی الحال۔ ؟

مرد یہ آپ کو ایسی نادر سی بات کیوں معلوم ہوتی ہے ؟ اس ہاؤس بوٹ میں آپ کو کن صاحب سے ملنے کی توقع تھی ؟ یا شاید آپ کی حیرت زدگی کو مشاہدہ کرنے کے بعد یہ پوچھنا زیادہ مناسب ہو کہ آپ کو یہاں کن صاحب سے دوچار ہو جانے کا خدشہ تھا۔

عورت ۔ (ایک مضمحل سے تبسم کے ساتھ) میں سمجھی تھی آپ یوسف ہیں۔

مرد ۔ (اختیاری تاسف کے لہجے میں) مجھے بڑا قلق ہے کہ میں یوسف نہیں ہوں۔ (متبسم ہوکر) یوسف ثانی ہونے کا دعوےٰ البتہ بیجا نہیں ہے

عورت (طنز کے ساتھ) جی ! چہ نسبت ۔ !!

مرد ۔ ملاحظہ فرمایئے (لہجہ بدل کر) ایک ضروری سوال کا جواب دینے کی زحمت فرمایئے گا۔ ؟

عورت (ابرو آویختہ) فرمایئے ؟

مرد ۔ ان۔ یوسف صاحب کو علم تھا کہ آپ یہاں تشریف لا رہی ہیں ؟

عورت (جلدی سے) جی ہاں ۔۔ (پھر دفعتہً رک کر) نہیں۔ (متذبذب میں) یونہی میرا خیال ہے کہ انہیں تھا علم ۔۔

مرد ۔ جی یونہی خیال ہے !

عورت مگر شاید ۔۔ انہیں نہ بھی ہو علم مرے آنیکا۔

مرد ۔ جی۔ شاید ۔۔ !! عورت ۔ تنک کر آپ کیوں پوچھتے ہیں

مرد ۔ (پر تکلف انداز میں) اگرچہ اس گوشۂ ترک و تجرید کے اندر لوازم مہمانوازی کی افراط نہیں ۔ تاہم یوسف ثانی کے منصب کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہیں چاہتا کہ ایسی طرحدار خاتون کی خدمت میں مجھ سے کوئی میزبانہ کوتاہی سرزد ہو جائے۔

عورت ۔ پُر پیچ و تاب گفتگو فرماتے ہیں آپ۔

مرد ۔ اسے اپنی حیرت افروز موجودگی کا محض ایک تو برگشتہ خیال فرمایئے !

نہ کیوں محو داستان دل پریشان ہوکے رہ جائے

تری زلف پریشان کی پریشانی نہیں جاتی

عورت (طنزاً) خوب۔ شعر و شاعری سے بھی رغبت رکھتے ہیں !

مرد ۔ تو میں دوبارہ دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ ان یوسف علم کو آپ کی تشریف آوری کا علم ہے یا نہیں۔

عورت (تذبذب میں) علم ؟ ہوں ۔۔ !!

مرد ۔ اطمینان سے اپنے دل کے ساتھ فیصلہ کر لیجئے کہ انہیں آپ کے آنے کا علم ہے یا نہیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میں انتظار کر سکتا ہوں انتظار کرنے کا عادی ہوں۔ آپ کا جواب ہاں ہو یا نہیں میرے لئے دونوں برابر ہیں مجھے آپکے فیصلے سے کوئی شخصی یا ذاتی دلچسپی نہیں۔

عورت ۔ (طنز کے ساتھ) محض ایک درسی دلچسپی ہے آپکو ؟ !

مرد ۔ جی۔ برسبیل مطالعہ !!

عورت ۔ شکر ! ! تو پھر اس حالت میں مرا خیال ہے ۔۔ کہ انہیں مرے آنے کا علم نہیں ہے۔

مرد (عورت کے لہجے کی تقلید کرتے ہوئے) شکر ! !

عورت ۔ میں در اصل ۔۔ آج کچھ گرمی زیادہ ہو گئی ہے محسوس کیا آپ نے ؟ !

مرد (طنز کے ساتھ) جی ہاں۔ الامان الامان۔ بلا کی گرمی ہو گئی ہے

عورت ۔ میں نے کشمیر میں آکر کبھی اتنی گرمی محسوس نہیں کی۔

مرد ۔ محل ہی گرمی محسوس کرنے کا ہے ،

عورت (متبسم) جی۔ (پھر فوراً مطلب سمجھ کر چیں بجبیں) ہیں ؟ ؟ !

مرد ۔ میرا مطلب ہے۔ یہ قصور کشمیر کا نہیں۔ اس ہاؤس بوٹ کا ہے

عورت ۔ ہاؤس بوٹ کا ۔۔ ؟ !

مرد ۔ جی ہاں ۔ جب ایک طرحدار خاتون بیگانے ہاؤس بوٹ کی میز میں سے خفیہ طور پر کاغذات نکالتی ہوئی پکڑی جائے۔ تو موسم کی ناسازگاری کا شکوہ اسکے نازنین اور تمتماتے ہوئے ہونٹوں پر بہت زیب دیتا ہے۔

عورت ۔ (سراسیمہ ہوکر) کاغذات ۔ !!

مرد ۔ جو ابھی آپ نے اس میز کی دراز سے نکالے ہیں ! !

عورت (گرم ہوکر) آپ کا مطلب ہے کہ میں۔ کہ میں۔ کہ (نرم ہوتے ہوئے) ہوں کیا اسم گرامی ہے آپکا ۔ ؟

مرد ۔ سراپا نیاز ۔ ! اور آپ ؟

عورت سراپا راز ۔ !

مرد ۔ تو یہ کاغذات ۔ !

عورت (برافروختہ ہوکر) توبہ توبہ سراپا نیاز صاحب آپکا مطلب ہے کہ میں ۔ کہ میں ۔

مرد ۔ چوری کر رہی تھی ؟ توبہ توبہ ! یہ کس نے کہا ! مری کیا مجال ہے کہ میں
ایسا شبہ آپ پر کروں ! (نسواں نوازی کا انداز اختیار کر کے) لائیے
میں آپ کا بوجھ ہلکا کر دوں ۔

عورت ۔ (قصداً مطلب نہ سمجھ کر) بوجھ ۔ کیسا بوجھ ؟

مرد ۔ (ذرا بڑھ کر) یہ — مکتوبات کی یہ گٹھڑی جو آپ کے ہاتھ میں ہے ۔

عورت (پیچھے ہٹتے ہوئے) نہیں نہیں ۔ !

مرد ۔ (تلطف آمیز تبسم کے ساتھ) مجھے اندیشہ ہے کہ یہ دست سیمیں اس بار
کا متحمل نہیں ہو سکے گا ۔ اجازت دیجئے کہ میں ان خطوط کو آپ سے لے کر آپ کی
میز کی دراز میں رکھ دوں

عورت ۔ (جیسے ابھی تک نہیں سمجھی) خطوط ! (دیکھتے ہوئے) اوہ ! (پر تبسم)
آپ کی بے حد نوازش ہے ۔ مگر معاف فرمائیے یہ خطوط میرے لئے
بار نہیں باعث راحت ہیں ۔

مرد ۔ (متعزم) تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ ان خطوط کا آپ کے پاس ہونا میرے
لئے باعث راحت نہیں ہے ۔ !

عورت ۔ آپ کے لئے — کیوں ؟ ۔

مرد ۔ کیونکہ یہ خطوط اس ہاؤس بوٹ کے یوسف صاحب کی امانت ہیں ۔
یہ اُن کی تازہ ڈاک ہے ۔ میں آج ہی اسے یوسف صاحب کے نئے پتے پر
گلمرگ روانہ کرنے والا تھا ۔ برائے مہربانی یہ خطوط مجھے واپس دیجئے !

عورت ۔ (خفیف سی حیرت کے ساتھ) اوہو — تو یہ یوسف صاحب کے
خطوط ہیں ۔ ! تو لیجئے ۔ بڑے شوق سے لے لیجئے ۔ !! میں یوسف
صاحب کے مکتوبات کو رکھ کر کیا کروں گی ۔ یہ لیجئے ایک — دو ۔ تین
(پھر پھرتی سے ایک لفافے کو اپنے آرائش بیگ کی آڑ میں سرکا
کر باقی سب خطوط ہاتھ سے گرا دیتی ہے ۔ اور جب مرد گرے
ہوئے خطوط کو جمع کرنے کے لئے جھکتا ہے تو جلدی سے
اس خط کو بیگ میں رکھ لیتی ہے)
اوہ — معاف فرمائیے گا خطوط مرے ہاتھ سے گر پڑے ۔

مرد ۔ مضائقہ نہیں ۔ میں اٹھا لیتا ہوں ۔ ایک ۔ دو تین چار ۔ پانچ ۔ چھ
سات آٹھ — اور — وہ (بیگ کی طرف اشارہ کر کے) وہ خط بھی
تو عنایت فرمائیے نا ۔

عورت ۔ (انجان بن کر) وہ کیا — کونسا ؟

مرد (بیگ پر نگاہ جمائے ہوئے) وہ جو ابھی آپ نے نہایت چابکدستی کے ساتھ
بیگ میں رکھ لیا ہے (عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) لفافوں
کو دفعتاً گرا دینے سے شاید آپ کا یہ منشا تھا کہ انہیں اٹھانے میں مری
نگاہ آپ کے بیگ کی طرف نہیں جاتی ۔

عورت ۔ (ایک دلفریب ہنسی کے ساتھ) بھئی بلا کے عیار آدمی ہیں آپ ۔ !

مرد ۔ (متبسم) تشکر ۔ !

عورت ۔ آپ خفیہ پولیس میں تو کام نہیں کرتے ۔ ؟

مرد ۔ یہ خفیہ پولیس پر چوٹ ہے یا مجھ پر ۔ ؟

عورت ۔ (ہنس کر) بھئی نیاز صاحب آپ سے مل کر قلبی مسرت ہوتی ہے !

مرد ۔ تشکر در بر مطلب ۔ وہ — خط مجھے دیدیجئے نا ۔ بیگ والا

عورت ۔ (آرائش بیگ پر اپنی گرفت کو محفوظ کرتے ہوئے) نہیں نہیں معاف
فرمائیے گا ۔ یہ خط میں آپ کو نہیں دے سکتی ۔ یہ مرا اپنا ہے ۔

مرد ۔ آپ کا اپنا ہے ! یعنی کسی نے آپ کو لکھا ہے ؟ !

عورت ۔ کسی نے مجھے نہیں لکھا میں نے خود لکھا ہے — یوسف کو ۔

مرد ۔ ہوں یہ بات ہے ۔ مگر میں کیسے مان لوں کہ یہ خط آپ کا لکھا ہوا ہے ؟

عورت ۔ میں آپ کو بتا جو رہی ہوں ۔ !

مرد آپ کا فرمانا بجا ہے ، مگر میں — مگر ۔ !!

عورت ۔ اجی صاحب آپ کو یقین نہ آئے ۔ تو یہ لیجئے ۔ یہ ہے خط ۔
(عورت ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ خط اپنے آرائشی بیگ
سے نکالتی ہے ۔ اور اپنی مرمریں ہاتھ کی ایک رقص آمیز جنبش
کے ساتھ دو انگلیوں میں تھامے ہوئے خط کو مرد کی طرف بڑھا
دیتی ہے ۔ مرد بڑھ کر خط عورت کے ہاتھ سے لے لیتا ہے)

مرد ۔ (خط لیتے ہوئے) تسلیمات ۔

عورت ۔ اب ایک آنکھ سے توجہ کے ساتھ اس خط کو دیکھتے رہئیے اور دوسری
آنکھ سے ہنوز مجھے دیکھتے رہئیے ۔
(یہ کہتے ہوئے وہ میز کی طرف جاتی ہے ۔ اور دراز کھول
کر ایک سادہ لفافہ نکالتی ہے)

عورت ۔ دیکھئے اب میں اس میز کی دراز سے ایک سادہ لفافہ لیتی ہوں اور
آپ کے سامنے اس پر وہی سرنامہ لکھتی ہوں ۔

مرد ۔ ہاں ہاں لکھئے ۔ شوق سے لکھئے ۔ !!
(عورت اپنے بیگ سے پنسل نکال کر لفافہ پر لکھتی ہے)

مرد ۔ آپ کو اس ہاؤس بوٹ کے جغرافیہ پر بڑا عبور ہے !

عورت ۔ (مرد کے قریب آتے ہوئے) لیجئے ملاحظہ فرمائیے ۔ یہ سرنامہ میں نے
ابھی آپ کی زیر نگرانی تحریر کیا ہے ۔ اب ان دونوں لفافوں کی تحریر
کا مقابلہ کیجئے ۔ ملاحظہ فرمائی آپ نے مشابہت ۔

مرد ۔ (غور سے تحریر کا مقابلہ کرتے ہوئے) ہوں ۔ —

عورت ۔ (شوخی سے) اس میں کوئی جادوگری نہیں۔ کوئی شعبدہ بازی نہیں۔ سر نامہ میں نے آپ کے سامنے لکھا ہے۔ یہ دیکھ لیجئے (شعبدہ بازوں کے ڈھنگ کی مسخرانہ تقلید کرتے ہوئے) میری یہ آستین خالی ہے۔ یہ دایاں ہاتھ خالی۔ یہ بایاں ہاتھ خالی — ! اب فرمایئے۔؟

مرد ۔ ہوں اوں ! ! تحریر تو آپ ہی کی دکھائی دیتی ہے۔

عورت ۔ قطعاً میری تحریر ہے۔ (ہاتھ بڑھا کر) لایئے برائے مہربانی اب میرا خط مجھے واپس دے دیجئے۔

مرد ۔ ایک لمحہ توقف فرمایئے — !

عورت ۔ میں ؟

مرد ۔ دیکھئے نا محترمہ بات یہ ہے کہ — !

عورت ۔ (بے تابی سے) اوہ صاحب آپ تو عبث اس بات کو طول دے رہے ہیں۔ جیسے میں نے کسی بڑی جائداد کا بیعت نامہ چرا لیا ہے۔ یہ معمولی چار سطروں کا ایک خط ہے جو میں نے خود یوسف کو لکھا ہے۔ میں اسے واپس لینا چاہتی ہوں۔ اس میں آپ کو کیا عذر ہے۔

مرد ۔ جی — !

عورت ۔ جی کیا — آپکا فہم اتنی سی بات کو اخذ نہیں کر سکتا ؟

(سکوت)

عورت (صوفے کی طرف جاتے ہوئے) ہے ہے آپ کو اپنے فیصلہ پر غور کرنے کے لئے وقت درکار ہو تو معاف کیجئے گا۔ میں اتنی دیر یہاں پیاسی بت پسند نہیں کرتی (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) وہ سامنے طاق پر عرق لیموں کی بوتل تو نہیں۔

مرد ۔ جی ہاں۔

عورت ۔ مجھے جلدی کچھ پینے کو دیجئے۔ میرا حلق گرمی سے خشک ہوا جا رہا ہے۔

مرد ۔ (طاق کی طرف جاتے ہوئے) جی ہاں۔ ضرور۔ یہ خدمت تو میں خوشی مسرت سے سرانجام دے سکتا ہوں۔

(طاق کے پاس جا کر لیموں کے عرق کا ایک گلاس تیار کرتا ہے)

مرد ۔ (لیموں تیار کرتے ہوئے) معاف فرمایئے۔ مجھے پیشتر مشروبات پیش کرنے کا خیال نہیں آیا۔

عورت ۔ مرد سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مرد ۔ افسوس ہے آپ کو ایسوں ہی سے معاملہ پڑا۔

(لیموں کا گلاس لا کر عورت کو پیش کرتا ہے) لیجئے نوش جاں فرمایئے۔

عورت ۔ (گلاس لیتے ہوئے) شکریہ۔ !!

عورت لیموں کے رس کے دو لمبے لمبے گھونٹ پی کر رک جاتی ہے اور اطمینان کی آہ بھرتی ہے)

مرد ۔ (سگریٹ سلگا کر) آپ قرار ہی بھتیں کہ یہ معمولی خط ہے۔ اگر یہ خط معمولی ہے تو اسے حاصل کرنے کے لئے آپ نے یہ غیر معمولی طریقہ ختیار کیوں کیا۔ ؟ اس بات کی تہہ میں ضرور کوئی راز ہے۔

عورت (ہنس کر) راز تو ہے۔ مگر آپ کو اس سے کیا ؟ لیموں کا رس پیتی ہے) یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کون ہیں۔ اور آپ کا اس ہاؤس بوٹ میں کیا کام ہے۔ یہ ہاؤس بوٹ یوسف صاحب کا ہے۔ اور آپ کہتے ہیں کہ آپکا نام نیاز سراپا نیاز ہے۔ بڑی مضحکہ سی بات دکھائی دیتی ہے۔ !

مرد ۔ میں نے یہ ہاؤس بوٹ چند ہفتوں کے لئے یوسف صاحب سے کرایہ پر لیا ہے

عورت ۔ جی۔ مگر یوسف تو آج گلمرگ سے واپس سرینگر آ رہے تھے۔

مرد ۔ اُنھوں نے دفعتاً اپنا ارادہ بدل لیا۔ وہ کل چند گھنٹوں کے لئے یہاں آئے تھے۔ اور کپڑے لیکر واپس گلمرگ چلے گئے۔

عورت ۔ خوب ! (لیموں کا رس ہونٹوں سے لگاتی ہے)

مرد ۔ مجھے سرینگر میں مناسب جائے رہائش دستیاب نہیں ہوئی اس لئے میں نے یہ ہاؤس بوٹ چند ہفتوں کے لئے یوسف سے کرایہ پر لے لیا ہے۔

عورت ۔ جی — یہ لیموں کا عرق بے حد مزیدار ہے۔ !

مرد ۔ اضطراب اور حرارت کے لئے بے حد مفید چیز ہے !

عورت ۔ یہ لیجئے گلاس۔ بے حد نوازش۔

(مرد گلاس لیکر ایک میز پر رکھ دیتا ہے)

عورت ۔ (صوفے سے اٹھتے ہوئے) اب مہربانی فرما کر میرا خط مجھے دیجئے !

مرد ۔ ٹھہر جایئے۔ مس۔ مس !

عورت ۔ راز بانو —

مرد ۔ (سوچتے ہوئے) راز بانو (سگریٹ کو ایک طشتری میں کچلتے ہوئے) یاد نہیں یہ نام میں پہلے کہاں سُن چکا ہوں !

راز بانو — راز ! — خوب دلربا نام ہے۔ !

عورت ۔ نیاز صاحب۔ میرا خط اب مجھے واپس دے دیجئے۔ !

مرد ۔ (ایک صوفہ کرسی کے بازو پر بیٹھ کر) مس راز۔ آپ جانتی ہیں کہ جب خط ایک بار پوسٹ آفس میں چلا جائے تو وہ تحریر کرنے والے کی ملکیت نہیں رہتا۔

عورت ۔ نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ !؟

مرد ۔ قانون تو یہی کہتا ہے۔

عورت۔ تو آپ نے قانون سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

مرد۔ میری حقیر و ناچیز رائے تو یہی ہے۔ کہ میں نے غلطی نہیں کی۔

عورت۔ مختصر یہ کہ آپ میرا خط واپس دینا نہیں چاہتے۔

مرد۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ خط اب آپ کی ملکیت نہیں ہے۔

عورت۔ (بیزاری سے) ہائے ہائے آپ نے بھی کیا بے معنی بحث چھیڑ دی ہے (تیز ہو کر) آپ نے قانون کی حفاظت کا اجارہ لے رکھا ہے۔ آپ وکیل ہیں مجسٹریٹ ہیں۔ پیشہ ور کے ایجنٹ ہیں۔ کون ہیں۔؟؟!

مرد۔ (عاجزی سے) میں ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ میں صرف اور خالصۃً ایک مصنف ہوں۔

عورت۔ (طنزاً) او ہو۔ مصنف ہیں آپ۔ تو۔ اگر آپکا یہ خیال ہے کہ میرا خط ایک ادبی جواہر پارہ ہے۔ جس کے مطالعے سے آپ کو اپنی کسی آئندہ تصنیف کے لئے کچھ تازہ مواد ہاتھ آ جائیگا تو میں ابھی سے آپ کو آگاہ کئے دیتی ہوں کہ آپ کو سخت مایوس ہونا پڑیگا —

مرد۔ میرے انکار کی وجہ یہ نہیں

عورت۔ (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) ارے صاحب تو پھر آپ اور کیا چاہتے ہیں؟! اسلئے میں ایک امیر اور خود مختار عورت ہوں۔ میں آپ کی دو ایک کتابیں اپنے خرچ پر چھپوا دونگی۔ آپ میرا خط مجھے واپس دے دیجئے۔

مرد۔ (کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) بڑی کرم فرمائی ہے آپ کی میں اپنی کتابوں کو چھپنے کا خود انتظام کر سکتا ہوں۔

عورت۔ ہائے میرے اللہ۔ تو میں پھر آپ کو اور کس طرح سمجھاؤں؟!

مرد (کھڑکی کے پاس) مانگاں کو مشتعل نہ کیجئے گا۔ میں بڑا تند مزاج ہوں

عورت۔ یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔!

مرد۔ (دردیدہ) یہ دردِ محض ہے۔ کہ آدمی کو بھی میسر نہیں۔ انساں ہونا۔

عورت۔ (رونی ہو کر) ہائے — تو، تو پھر میں کیا کروں۔!

مرد (دردیدہ) صبر

عورت۔ آپ مجھے ایک بے بس عورت سمجھ کر تنگ کر رہے ہیں۔

مرد۔ (مخموم کر) آپ ایسا کرنے پر مجھے مجبور کر رہی ہیں۔

عورت۔ اُف۔ اگر میں مرد ہوتی۔!

مرد۔ (نزدیک آ کر) تو آپ بھی دلربا ہوتیں اور میں کبھی لیموں کا عرق آپ کو پیش نہ کرتا!

عورت۔ اگر میں مرد ہوتی تو آپ کبھی ایسا کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

مرد۔ (بغیر کسی قسم کی لاف زنی یا طنز کے) واضح رہے کہ میں روز صبح لیموں سوڈا نمک پینے کا عادی ہوں۔

عورت۔ (ہیبت کے ساتھ) ڈرٹی۔!!

مرد۔ اور میری چھاتی کا پھیلاؤ چالیس سے پینتالیس اور پانچ ملحسہ اور دیکھئے یہ میری کمر شاعر کے محبوب کی آنکھوں کا کانٹا ہے۔

عورت۔ (ایک نشاط آمیز ہنسی کے ساتھ) اُف۔ آپ بڑے جابر ہیں!

مرد۔ نہیں مجبور۔!

عورت۔ (آہ بھر کر) مجھے اس عورت کے حال پر ترس آتا ہے۔ جس غریب کا دامن شومئی قسمت نے آپ سے باندھ دیا ہے۔

مرد۔ (منہ بنا کر) ٹھیک فرمایا۔ اس عورت کی حالت واقعی قابل رحم ہے کیونکہ ابھی تک اسے میری زوجیت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

عورت۔ تو یہ کیسی قینچی سی چلتی ہوئی زبان ہے۔ لائیے اب میرا خط مجھے دیدیجئے۔!!

مرد۔ (طنزاً) گویا اب خط لوٹا دینے کے سوا ہمارے پاس چارہ ہی کیا ہے آپ کی استقامت کی داد ضرور دینا پڑتی ہے آپکا اصول غالباً یہ ہے کہ آساں گرد د بر آنچہ ہمت بستی۔ بہ لحاظ اصول اس میں کوئی عیب نہیں۔ تاہم ہرچہ خدا خواست ہماں مے شود۔

عورت۔ اپنی فارسی دانی سے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے

مرد۔ (رک کر) تو شکارہ منگاؤں؟

عورت۔ اور آپ عبث بیٹھے باتیں بنائے چلے جا رہے ہیں۔

مرد۔ باتیں بنانا میرا پیشہ ہے۔

عورت۔ آپ کو دل لگی سوجھتی ہے۔ یہ نہایت سنجیدہ معاملہ ہے۔

مرد۔ مجھے اس کی سنجیدگی میں مطلق کلام نہیں۔

عورت۔ (صلح جوئی کا انداز اختیار کرتے ہوئے مانوس دوستی کے لہجہ میں) دیکھئے میں آپ کو ایک بات بتاتی ہوں۔

مرد۔ (صوفے کے بازو پر سر کو ٹیکا کر نیاز مندانہ انداز میں) میں ہمہ تن گوش ہوں۔!

عورت۔ بات دراصل یہ ہے کہ —

مرد۔ (سرگوشی میں) جی۔

عورت۔ (ڈانٹ کر) مہربانی فرما کر قطع کلام نہ کیجئے گا۔

مرد۔ (بہ آواز) میں نے تو کچھ نہیں کہا۔

عورت۔ خاموش رہیے۔

مرد۔ جی!

عورت۔ (کامل سنجیدگی کے ساتھ) بات یہ ہے کہ یہ خط میں نے ایک نا ملائم جذبہ سے مشتعل ہو کر یوسف کو لکھ دیا تھا۔ اب اپنے اشتعال پر مجھے ندامت ہو رہی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی۔ کہ یوسف اسے پڑھ کر

شکستہ خاطر ہو۔ اس لئے میں یہ خط واپس لینے آئی ہوں! اب بھی میرا خط مجھے واپس دینے سے آپ انکار کریں گے۔!

مرد۔ (متاثر ہو کر) مجھے علم نہیں آپکا بیان صحیح ہے یا نہیں۔ اور ذاتی طور پر مجھے اس امر سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کا بیان صحیح ہے یا نہیں۔ تاہم اگر آپکے سکون قلب کے لئے ضروری ہے تو میں یہ خط آپکو واپس دیدونگا

عورت۔ میں کس زبان سے اظہار تشکر کروں۔!

مرد۔ نہ کیجئے۔!

عورت۔ اوہ۔ آپ نے میرے سینے سے ایک بہت بھاری بوجھ ہٹا دیا ہے۔!

مرد۔ (اٹھ کر) بیئر کا ایک اور گلاس نوش فرمائیے گا؟

عورت۔ جی نہیں۔ بڑی نوازش فرمائی آپ نے۔ اب میں فوراً خط لیکر رخصت ہونا چاہتی ہوں۔

مرد۔ (ایک طرف ٹہل کر) اگر میں آپ کی خاطر اس قانون شکنی کے لئے تیار ہو جاؤں۔ مگر کیا آپ میری خاطر کچھ کرنے کے لئے رضامند ہونگی۔

عورت۔ کیا مطلب ہے آپکا۔؟

مرد۔ (مسکرا کر) گھبرائیے نہیں میں اس قانون شکنی کے عوض میں آپ کو کسی ارتکاب جرم کی دعوت دینے والا نہیں ہوں

عورت۔ اگر آپ کی درخواست معقول دکھائی دی تو مجھے عذر نہ ہوگا فرمائیے!

مرد۔ (واپس عورت کی طرف آتے ہوئے) میں مظاہر حیات کے مطالعے میں بے حد دلکشی محسوس کرتا ہوں۔ اگر ضرور ہی ہو تو ایک نیا تجربہ حاصل کرنے کے لئے میں تقریباً ہر طرح کی جھک مارنے کے لئے آمادہ ہوں۔

عورت۔ (متبسم ہو کر) دلچسپ آدمی ہیں۔

مرد۔ (عورت کو بغور دیکھ کر) آپ بھی بے حد دلچسپ عورت ہیں۔

عورت۔ تشکر۔!

مرد۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میری خدمت کے صلے میں آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ آپ نے کن حالات یا جذبات سے مشتعل ہو کر یوسف صاحب کو یہ خط تحریر کیا تھا۔ پھر میں یہ خط آپ کو واپس دیدونگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے حالات ابد تک میرے سینے میں محفوظ رہیں گے

عورت۔ (بشاشت کے ساتھ) خیر تو آپ کی خاطر سے۔ خصوصاً جب آپ نے رازداری کا وعدہ کیا ہے۔ میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔

مرد۔ (عورت کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے) تشکر۔!!

عورت۔ نیاز صاحب۔ آپ کو کبھی کنیٹرے ہوئے ہیں۔؟

مرد۔ (متعجب ہو کر) کنیٹرے!! ہا ہا (ہنستے ہوئے) آ — نہیں۔ مجھے تو کبھی نہیں ہوئے کبھی بھی نہیں۔!

عورت۔ اوہ۔ تو آپ۔ واقعی بڑے نادر مرد ہیں!

مرد۔ ہیں۔ ہا ہا۔ مگر کنیٹرے۔ کنیٹروں کا کیا واسطہ اس بحث سے

عورت۔ کنیٹروں کا میرے حالات کے ساتھ گہرا تعلق ہے

مرد۔ اوہ۔!!

عورت۔ جی ہاں — میں — میں دراصل اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔

مرد۔ کنیٹروں سے؟

عورت۔ ہائے توبہ — نہیں۔ یوسف سے۔!!

مرد۔ اوہو۔ یوسف سے۔؟!

عورت۔ ہماری منگنی ہو چکی تھی۔ نکاح عنقریب ہونے والا تھا۔ رسم نکاح کے رقعے جا چکے تھے۔ تحفے تحائف کا انتخاب ہو چکا تھا۔ جانبین کے دوست احباب۔ عزیز و اقارب اپنی امیدوں اور اپنے اندیشوں اپنی دعاؤں اور اپنی بد دعاؤں کا اظہار دل کھول کر کر چکے تھے۔ بس ایک تاریخ کی کسر باقی تھی کہ —

مرد۔ جی۔

عورت۔ کہ میں تذبذب میں پڑ گئی۔ ہونے والے خاوند سے پیچھا چھڑا لینا کوئی مشکل بات نہیں۔ مگر ان دوسرے لوازمات سے خصوصاً پھوپھیوں خالاؤں سے پیچھا چھڑانے کے لئے بڑے عزم اور جرأت کی ضرورت ہے۔

مرد۔ اور آپ نے عزم اور جرأت سے کام لیا۔!!

عورت۔ سنئے! یوسف نے اور میں نے اپنی پسند سے ایک دوسرے کا انتخاب کیا تھا۔ مگر — تاہم — مجھے یوسف سے ایک گونہ انس ضرور تھا تاہم — تاہم — آپ جانتے ہیں۔ کہ آپ جانتے ہیں۔

مرد۔ جی ہاں — میں خوب جانتا ہوں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں!!

عورت۔ یونہی۔ دفعتاً ہمارے درمیان ایک جمود سا حائل ہو گیا جمود! میری طبیعت کا رخ بدل گیا۔!

مرد۔ (اسے بغور دیکھ کر) جمود صاحب قبلہ کی وجہ سے؟!

عورت۔ (مرد سے نگاہ ملا کر) جی نہیں — (آنکھیں جھکاتے ہوئے) انکا نام وجود تھا۔!!

مرد۔ بروزن جمود۔!!

عورت۔ (تاؤ پیچ کرتے ہوئے) معاف فرمائیے میرے لئے انتخاب زوجین کا مسئلہ شاعرانہ تک بندی نہیں ہے۔!

مرد۔ جی نہیں معاذ اللہ!! تو اب آپکا قرعۂ انتخاب وجود صاحب پر پڑا!

عورت ۔ وودو ہیں — ایک خاص انداز کی مردانہ کشش تھی جو میں (بمشکل ۔
جو میں آسانی سے بیان نہیں کر سکتی ۔

مرد ۔ (ہمدردی سے) جی ہاں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ۔!

عورت ۔ جی تو ۔ ایک روز وودو نے مجھے ۔ نہ جانے کس طرح ۔ خفیہ شادی کرنے پر رضامند کر لیا ۔

مرد ۔ کاش راشنیدن بارے بود!!

عورت ۔ خویش و اقارب خصوصاً پھوپھیوں اور خالاؤں کی خاص سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد ۔ خفیہ شادی کی تجویز مجھے نہایت دلکش دکھائی دی ۔

مرد ۔ (انتہائی ہمدردی کے ساتھ) جی ۔!

عورت ۔ خفیہ شادی کے لئے ۔ ڈل پر ایک ہاؤس بوٹ طے کیا گیا ۔ یوسف کو ابھی تک اس تبدیلی کا علم نہیں تھا ۔

مرد ۔ آپ نے ابھی تک یوسف سے اپنی منگنی نہیں توڑی تھی ۔ ؟

عورت ۔ جی نہیں ۔!

مرد ۔ آہ آپ حیرت انگیز عورت ہیں ۔!!

عورت ۔ میں نے چاہا کہ یوسف سے مل کر اس بات کا فیصلہ کر آؤں ۔ مگر وودو رضامند نہ ہوا ۔ اس نے کہا کہ یوسف کو خط کے ذریعے سے اطلاع کر دینا کافی ہوگا یہ کل کی بات ہے ۔ آج صبح وودو کی اور میری خفیہ شادی تھی

مرد ۔ (متعجب ہو کر) آج صبح! — تو پھر آپ — یہاں ۔!!

عورت ۔ میں ابھی عرض کرتی ہوں — آج علی الصبح سب سے پہلے میں نے یوسف کو خط پوسٹ کیا ۔ تاکہ وہ خط اُسے آج ہی دوپہر کی ڈاک سے مل جائے مجھے معلوم تھا کہ یوسف چند روز کے لئے گلمرگ گیا ہے ۔ لیکن وہ مجھ سے کہہ گیا تھا ۔ کہ وہ آج ضرور واپس آ جائیگا ۔ اس لئے میں نے ہاؤس بوٹ کے پتہ ہی پر خط روانہ کر دیا تھا ۔

مرد ۔ جی ۔!

عورت ۔ یوسف کو خط پوسٹ کرنے کے بعد میں نے شکارا لیا اور ڈل کی طرف چلی ۔ جہاں وودو نے خفیہ شادی کے لئے ایک ہاؤس بوٹ کرائے پر لے رکھا تھا ۔ رستے میں بار بار مجھے ایک خیال نے ستانا شروع کیا ۔ میں سوچنے لگی کہ وودو سے مجھے محبت تو ہے ۔ ایک طرح کی محبت ۔ مگر کیا اس محبت کی بنیاد پر ایک پائدار ازدواجی راحت اور مسرت تعمیر ہو سکتی ہے ۔ کیا وودو سے شادی کر لینا وافی تو نہیں ۔ یہ سوچتی سوچتی جب میں وہاں پہنچی ۔ تو آپ جانتے ہیں میں نے وہاں کیا دیکھا ۔

مرد ۔ (مسکرا کر) کہ نوشہ میاں پہلے استقبال کے لئے کھڑے مسکرا رہے ہیں ۔!!

عورت ۔ (آنکھیں کشادہ کرتے ہوئے) جی نہیں ۔ نوشہ میاں کے بدلے (بیگ سے ایک پیلا زرد لفافہ نکالتے ہوئے) یہ تار ۔ یہ تار!!

مرد ۔ اسے پڑھنے کی اجازت دیجئے گا؟

عورت ۔ ہاں ہاں شوق سے پڑھئے ۔ یہ لیجئے تار ۔

مرد ۔ شکریہ ۔ (پڑھتے ہوئے) آہ — مجھے اچانک کنپیڑے نکل آئے ہیں ۔ خط تحریر کر رہا ہوں ۔ وودو ۔!!

عورت ۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے ۔ (شدت سے) اچانک ۔!!

مرد ۔ جی ہاں بہت فی البدیہہ قسم کا مرض ہے (تار واپس دیتے ہوئے)

عورت (تار کو ایک مٹھی میں مسل دیتی ہے) اُف میرے اللہ (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) ہماری انگوبٹی کی ترکیب حقیر اور پست قسم کی کنپیڑے ۔۔

مرد ۔ جی ہاں ۔ یعنی صورت نام کو نہیں!!

عورت ۔ (تار کو حقارت سے دیکھ کر) اُف ۔!!

مرد ۔ مجھے وودو صاحب کے عجز تخیل پر حیرت ہوتی ہے ۔

عورت ۔ (شدت سے) کنپیڑے!! کنپیڑے!!! (تار کو غصہ سے بیگ میں ٹھونس کر دریا کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

مرد ۔ بڑی نامعقول حرکت ہے! اور ایسے اہم موقع پر؟! ۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے ۔ تاہم ۔ اگر غور کیا جائے ۔ تو اس میں بیچارے نوشہ کا کیا قصور تھا ۔!!

عورت ۔ (کھڑکی سے گھوم کر) تو پھر میرا قصور تھا؟

مرد ۔ (صوفے سے اٹھ کر) جی نہیں میرا مطلب ہے کہ —

عورت ۔ کہ مجھے کنپیڑوں پر قناعت کر لینی چاہیئے تھی

مرد (صوفے پر پھر کر صوفے کی پشت پر بیٹھ جاتا ہے) کنپیڑوں سے نوشہ کے رُخ زیبا کا حلیہ تو ضرور بگڑ گیا ہوگا ۔ تاہم اگر آپ کسی قدر نسوانی سیاست سے کام لیتیں تو اس کا اہتمام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا ۔ آپ یہ کر سکتی تھیں ۔ کہ عروسانہ شرم و حیا کے بہانے ابتدا میں اپنی نگاہیں نیچی رکھتیں ۔ اور نوشہ کے کنپیڑوں کا مشاہدہ نہ کرتیں!! نوشہ کی شکل آپ دیکھتیں نہ ۔۔

عورت ۔ میں کبھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی ۔ (دریا کی طرف دیکھتے ہوئے)

مرد ۔ یہ اور بات ہے ۔

عورت ۔ کبھی نہیں ۔ (روبرو دریا)

مرد ۔ مگر دیکھئے تا یہ تو صریحاً ظلم ہے!

عورت (گھوم کر) ظلم ۔!! (صوفے کی پشت کی طرف آتے ہوئے جہاں نیاز بیٹھا ہے) میں یہ نہیں کہتی کہ اسے کنپیڑے نکلے کیوں ۔ ! کنپیڑے

آخر سبھی ایک سا تو نہیں ہو سکتے ہیں۔ تاہم۔ (آنکھیں جھکا کر) تاہم (اس کی طرف سے پھر گھماتے ہوئے) کنپٹیڑوں کے لئے اپنا نامو زوں وقت انتخاب کرنا یہ کرنا انسانیت ہے۔

مرد۔ تاہم — مجھے آپکے غریب نوشہ کے حال پر رحم ضرور آتا ہے۔

عورت۔ سو سو ہدایت کے لئے فوراً تیار ہو جاتا ہے (اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) تم سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوتے ہو۔

مرد۔ حاشا یہ صحیح نہیں ہے۔ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں خود!

عورت۔ جی آپ!!!

مرد۔ میں وہ نہیں ہوں کہ اپنی شادی کے روز کنپٹیڑے میں لیٹ جاؤں — مجھے ایسا ویسا آدمی نہ سمجھئے گا

عورت۔ آپ واقعی ایسے نہیں ہیں — ؟

مرد۔ ہرگز نہیں محتسب داند کہ من این کار کمتر کنم! — آپکے دولہا صاحب کے دیّل سرکرنے کا یہ مطلب تھا کہ آپ نے اسے چھوڑ دیا تو اُس غریب کی کیا حالت ہو گی۔ اسکا دل چکنا چور ہو جائیگا۔

عورت۔ (گھوم کر میز کی طرف جاتے ہوئے، ترود نہ فرمائیے۔ اُس کا دل چکنا چور ہونے والی چیز نہیں ہے۔

مرد۔ اس کی جگہ میں ہوتا۔ تو میری یہی حالت ہوتی

عورت۔ (مرد کے چہرے کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے، آپ کی — ہاں آپ! — (مسکرا کر) آپ کی اور بات ہے (صوفے کی طرف آتے ہوئے) آپ پھر اُسکے نزدیک بیٹھ کر ایک متجسس نگاہ کے ساتھ بغور اُسے دیکھتی ہے آپ واقعی اور طرح کے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔

مرد۔ (صوفے سے اتر کر عورت کے قریب آتے ہوئے) یہی میں عرض کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ میں اور طرح کا آدمی ہوں

عورت۔ (سکوت کو توڑ کر جلدی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے) (ایک لمحہ کے لئے دونوں محو ہو کر ایک دوسرے کو تکتے رہتے ہیں) مگر آپ نے اس معاملہ کا بقایا حصہ تو ابھی سنا نہیں۔

مرد۔ (عورت کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے، فرمائیے۔!

عورت۔ تار کا مضمون دیکھتے ہی میں۔ دیکھئے تا میں عورت ذات۔ کیا کرتی ایک لمحہ کے لئے کچھ گھو سی گئی۔ پھر لمبی سی آہ بھر کر میں نے ایک بھرائی ہوئی آواز میں اپنے دل سے کہا، میرے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر اور سر پہ پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگی۔ میرے دل و دماغ میں ایک عجیب ہیجان برپا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی۔ میں نے نیا جنم لیا ہے۔ ایک سکتے کے عالم میں یہاں پہنچی۔

مرد۔ (تشویش ک لہجے میں) پیدل۔!

عورت۔ (بیزار ہو کر) جی نہیں۔ تانگے پر۔ بلکہ میرے تمام بکھرے ہوئے چیز جو مجھے ملی ایک تار تھا۔

مرد۔ تار!

عورت۔ تار۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ کس بے صبری اور اضطراب سے میں نے وہ تار کھولا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ہے وہ تار!!

مرد۔ میں پڑھ لوں اسے۔

عورت۔ جی ہاں پڑھئے نا۔

مرد۔ (پڑھتے ہوئے) "مجھے اچانک کنپٹیڑے نکل آئے ہیں۔ خط تحریر کر رہا ہوں۔ ووووو۔"

عورت۔ (نفرت سے) کنپٹیڑے!!!

مرد۔ یعنی — یہ وہی کنپٹیڑے ہیں۔ پہلے تار والے!!

عورت۔ جی ہاں۔ بالکل وہی کنپٹیڑے۔!

مرد۔ (کنپٹیڑوں کی اہمیت سے متاثر ہو کر، بہت خوب!!

عورت۔ اُف۔!

مرد۔ بجا!!

عورت۔ ملاحظہ کیا آپنے۔ دونوں تاروں کے مضمون میں بال برابر فرق نہیں۔ بس اسی سے اندازہ کر لیجئے۔ کہ وہ کس قماش کا آدمی تھا۔

مرد۔ باضابطہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔!

عورت۔ خشمناک آواز میں، باضابطہ (اٹھ کر بائیں طرف کی صوفہ کرسی کی طرف جاتے ہوئے) کیا پتہ ہے۔ میرے تمام دوست احباب خویش و اقارب کے یہاں بھی بعینہٖ اسی مضمون کے تار گئے ہوں (صوفہ کرسی پر ہاتھ رکھ کر) ہندوستان کے کونے کونے میں آج غالباً اسی مضمون کے تار پڑھے جا رہے ہیں۔ "مجھے اچانک کنپٹیڑے نکل آئے ہیں۔ خط تحریر کر رہا ہوں۔ ووووو۔" نا صاحب مجھے ایسے ضابطہ سے معاف رکھئے۔!!

مرد۔ (اندیشہ ناک لہجے میں) ممکن ہے روزانہ اخبارات کے پرسنل کالم میں بھی یہ مضمون درج ہو

عورت۔ اس شخص سے ایسی بات ہرگز بعید نہیں۔!

مرد۔ واقعی ایسی باضابطگی حد اعتدال سے کچھ باہر ہے۔!

عورت۔ دونوں تاروں کے مضمون یا عبارت میں ذرہ برابر تفاوت نہیں ہے نہ بدذوقی کی انتہا۔ (سامنے کے رخ صوفہ کرسی میں بیٹھ کر)

اُف میرے اللہ اس شخص میں تو کافی احساس ہی نہیں کہ وہ میرے تاریکے الفاظ ہی بدل کے وہ بدل کر دیتا۔ مثلاً افسوس مت کیجئے "کل آئے ہیں"۔ "کپیڑے ہو گئے ہیں" یا صرف کنپیڑے نکل آئے ہیں ہیں ہیں وغیرہ۔ کئی ترکیبیں ہو سکتی تھیں۔ مگر اس نے الفاظ سے ہونے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ اُف!

مرد۔ مگر شاید کنپیڑوں کی وجہ سے بیچارے نے بستر میں لیٹے لیٹے خط۔

عورت۔ ایسے موسم کون لڑکی سادی کرتا یا بھاگ جو بستر میں پڑے پڑے معشوق کو لکھے

مرد۔ (صوفے سے اٹھ کر عورت کی طرف آتے ہوئے) جی۔ ہوں سمجھ لیا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب کی طبیعت میں شاعری کا عنصر مطلق موجود نہیں۔ شاعر ہمیشہ اس جستجو میں رہتا ہے کہ اسکے تخیل کا کامل اظہار کن الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ اس کی جستجو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اسے ہمیشہ اس بات کا احساس تکلیف دیتا رہتا ہے کہ اظہار رہ جانے کے لئے اس کے پاس موزوں الفاظ نہیں ہیں اور وہ اس درد کا بے اختیار ہو کر بیان کرتا ہے کہ۔

نہاں زحمت فزد ماندہ مانہ من بافیست
بنہایت شوق آخر شد و سخن باقیست۔

وہ صاحب کی فطرت میں شاعری نہیں ہے۔ اسلئے انہیں اظہار مدعا میں ترتیب و انتخاب الفاظ کے سلسلے کوئی الجھن یا پریشانی نہیں ہوتی۔ الفاظ ان کے لئے آلۂ عمل ہے آلۂ حسن و جمال نہیں۔ اس نے جب ایک عبارت سے ان کا مطلب حل ہو جائے تو وہ اس میں ترمیم یا ردّ و بدل کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

عورت۔ (محویت میں ڈوبی ہوئی آواز میں) ہاں ہاں۔

مرد۔ وہ وہ صاحب کے مدعا جتنا سرمایہ اُن کے ضمیر میں تھا۔ وہ ان الفاظ سے ظاہر ہو جاتا ہے "مجھے اچانک کنپیڑے نکل آئے ہیں خط تحریر کر رہا ہوں"۔ وہ وہ اس لئے وہ الفاظ میں ردّ و بدل کرنے کی تکلیف کیوں اٹھاتے۔ وہ روحانی کشمکش جو ایک شاعر الفاظ کے انتخاب میں محسوس کرتا ہے۔ اس سے وہ وہ صاحب کی فطرت ناآشنا ہے۔ معاف فرمائیے میں تقریر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

عورت (کسی دوسرے عالم سے دوبارہ روزمرہ کی دنیا میں واپس آتے ہوئے) اوہ — آپ۔ نیاز صاحب۔ آپ بے حد دلچسپ آدمی ہیں!

(مرد مسکراتا ہے) آپ واقعی صاحب آپ بھی بے حد دلچسپ عورت ہیں۔!

عورت۔ آہ آپ کا بیان نیاز صاحب۔ شاعری کی روحانی کشمکش کی تشریح کر کے آپ نے میری اپنی قلبی کشمکش کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا ہے۔ یعنی کشیدن کا درد ہیں کہ دو روانی سے میں محسوس کرتی ہوں کہ جیسے میں زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ میری بھی وہی کیفیت ہے جو آپ کے شاعر کی۔ مجھے معلوم نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں!

مرد۔ جیسے شعری۔ حسن جمال۔!!

عورت۔ (گہرے احساس کے ساتھ) ہاں حسن جمال۔ میں بھی ہمیشہ اسی قسم کی کشمکش میں مبتلا رہتی ہوں۔ جیسے آپکا شاعر۔

مرد۔ جی ہاں!!

عورت۔ میں بھی۔ ہمیشہ جستجو میں رہتی ہوں۔ اور میری جستجو ختم نہیں ہوتی

مرد۔ جی ہاں۔ یعنی پہلے یوسف۔ پھر وہ وہ۔ اسکے بعد — اور اس وقت آپ کی کیفیت گویا علامت استفہام کی مانند ہے۔ جستجو کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔!

عورت۔ مگر پہلے یوسف، پھر وہ وہ۔ — آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں۔ کہیں

مرد۔ جی ہاں میں سمجھتا ہوں۔!

عورت۔ (ہنس کر) ہا ہا ہا۔ آپ بڑے سمجھدار آدمی ہیں!!

مرد۔ تشکر!

عورت (اپنے خیالات کو جمع کرتے ہوئے) ہوں۔ ہوں۔ تو میں کیا کہہ رہی تھی ہاں تو وہ دوسرا تار دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے فوراً اسی مضمون کا تار وہ وہ کو کیا۔ "عجیب بات ہے مجھے بھی کنپیڑے نکل آئے ہیں۔ راز" یہ تار روانہ کرتے ہی میں دوڑی ہوئی یہاں آئی۔

مرد۔ راز بانو۔ راز۔ یہ نام میں پہلے کہاں سُن چکا ہوں۔!!

عورت۔ آپ سُن رہے ہیں نا!!

مرد۔ (اپنے خیال میں) جی ہاں۔ جی ہاں۔!

عورت۔ دیکھئے نا۔ میں یوسف کو لکھ چکی تھی کہ میں — کہیں ایک اور شخص سے شادی کر رہی ہوں۔ اور اگر تم سے ہو سکے۔ تو میرے قصور کو معاف کر دو۔ مگر جب میرا خطیب حبیب شادی کرنے کے بجائے کنپیڑوں کے ناگہانی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ تو مجھے ندامت ہوئی کہ میں نے بیچارے یوسف کو ناحق ایسا دل شکن خط تحریر کیا۔ یاد وہ خط اس وقت آپ کے پاس ہے۔ اور اسے واپس لینے کی غرض بس فقط اتنی ہے جو میں عرض کر چکی ہوں۔!!!

مرد۔ (دائیں ہاتھ والی صوفہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے) راز بانو۔ راز۔ راز شاعرانہ نام ہے! مجھے یقین ہے یہ نام پہلے میں ضرور کہیں سُن چکا ہوں

عورت۔ آپ کو پسند ہے میرا نام؟!

مرد۔ بلا انتہا۔ (عجیب نام ہے۔ ناز — (صوفہ کرسی سے لپک کر اٹھتے ہوئے) ہاں یاد آگیا — ناز بانو جیتانی یہی نام ہے نا؟!

عورت۔ جی ہاں ناز بانو جیتانی میں ہی ہوں۔ آپ دفعتاً اتنے حیرت زدہ کیوں ہو گئے

مرد۔ (عورت کی طرف آتے ہوئے) یوسف نے آپ کے نام ایک خط پوسٹ کرنے کے لئے مجھے دیا تھا۔

عورت۔ خط۔ یوسف نے؟!

مرد۔ جی ہاں۔ میرا خیال ہے میں نے وہ خط آج ہی پوسٹ کیا ہے — (جیبوں میں ٹٹولتے ہوئے) آج صبح میں نے کوٹ کی اندر والی جیب میں رکھا تھا — (چونک کر) اوہ — مگر۔ لاحول ولا قوۃ — وہ خط تو ابھی میرے پاس ہی پڑا ہے۔ اس اندر والی جیب میں۔ یہ دیکھئے نا یہ ہے یہ!!

عورت۔ یہ خط آپ کو یوسف نے کب پوسٹ کرنے کو دیا تھا۔؟!

مرد۔ آج صبح جب میں بندر پر کچھ خریدنے جا رہا تھا۔

عورت۔ (صوفہ کرسی سے اٹھتے ہوئے) خوب — یہ خط تو ابھی پوسٹ آفس کے اندر نہیں گیا نا

مرد۔ جی نہیں۔!

عورت۔ اس لئے ابھی تک یہ خط یوسف کی ملکیت ہے قانون غالباً یہی کہتا ہے،

مرد۔ غالباً۔ غالباً!!

عورت۔ میں اِن معاملات میں ضابطہ کی سخت پابند ہوں۔

(پھر دفعتہً لپک کر مرد سے خط چھین لیتی ہے اور ہنستی ہوئی بھاگ کر بڑے صوفے کے پیچھے پناہ لے لیتی ہے)

عورت۔ ہا ہا ہا ہا ہا ہا۔۔۔۔!!

مرد۔ (معترض) اوہ۔ یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔

عورت۔ (انگلی اٹھا کر) بس وہیں کھڑے رہئے صاحب۔ اب یہ خط میرے قبضے میں ہے!!

مرد۔ (ہنس کر) افسوس ہے۔ آپ نے مجھ پر اتنی سی بات کا بھروسہ نہیں کیا

عورت۔ معاف فرمائیے گا۔ یہ زمانہ دوسروں پر بھروسہ کرنے کا نہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔!!

مرد۔ (صوفے کی طرف جاتے ہوئے) آپ کو یاد نہیں۔ قانون شکنی کے احتمال کے باوجود میں آپ کے اپنے پوسٹ کئے ہوئے خط کو بھی واپس کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں!

عورت۔ (صوفے کے پیچھے بائیں طرف کو سرکتے ہوئے) میں آپ کا وعدہ نہیں عمل دیکھنا چاہتی ہوں۔

مرد۔ (صوفے کے سامنے) بڑے وثوق سے قریب لمحہ کی تیاریاں کر رہی ہیں گویا!

عورت۔ ہا ہا ہا ہا — بتائیے۔ اس خط کا سٹیمپ کون دیگا — جو ڈھائی آنے لگتی ہے؟

مرد۔ (ہاتھ پھیلا کر) سٹیمپ مجھے دیجئے۔ خط اپنے پاس رکھئے!

عورت۔ (ہاتھ بڑھا کر سٹیمپ دیتے ہوئے) یہ لیجئے بالکل نیا سٹیمپ ہے۔ اب بجٹ میں پانچ پیسے کی بچت ہو جائیگی۔

مرد۔ (بڑی احتیاط اور نفاست سے سٹیمپ کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے) تفکر۔ (غور کرتے ہوئے) ہو نہ بچت مگر تیر نشانے پہ نہیں بیٹھا (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) شاید آپ کا کوئی تیر کبھی ٹھیک نشانے پر نہیں بیٹھا۔ میں ناپ تول کر زندگی بسر کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ آپ کا تفکر دور ہو جاتا ہے۔ مگر آج تک کسی کو پایا نہیں۔ شاید آپ کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے!!

عورت۔ (میز کے پاس تپائی پر چڑھ کر خط کو دیکھتے ہوئے پوچھتی ہے) — وہ!!

مرد۔ (صوفے سے اٹھتے ہوئے) خیر باشد۔ کیا بات ہے؟

عورت۔ (میز کا سہارا لیکر) اُف۔ میرے اللہ۔!!

مرد۔ (جلدی سے عورت کے پاس جاتے ہوئے) اس خط میں کوئی بری خبر تو نہیں تھی؟

عورت۔ (صوفے کی طرف آتے ہوئے) مجھے جلدی سے عرق لیموں کا ایک گلاس دیجئے۔!!

مرد۔ (طاق کی طرف جاتے ہوئے) ہاں ہاں لیجئے لیجئے۔

(وہ حافظ کا یہ شعر گنگناتے ہوئے لیموں تیار کرنے لگتا ہے —

عشق است و مفلسی و جوانی و نوبہار
عذرم پذیر و جرم بذیل کرم بپوش

اور پھر لیموں کا گلاس لیکر گنگناتا ہوا عورت کے پاس آتا ہے)

مرد۔ یہ لیجئے۔ دیکھئے آپ نے ساری پر گرا دیا — نہیں نہیں آپ بیٹھیں میں اپنے رومال سے صاف کر دیتا ہوں

(ساری پر گرے ہوئے عرق کو بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے رومال سے پونچھتا ہے)

عورت۔ (عرق پینے کے بعد) اوف۔

مرد۔ لائیے میں گلاس رکھ دوں۔

عورت۔ (گلاس دیکر) اوہ —!

(مرد گلاس لیکر ابھی ایک قدم ہٹے میز پر رکھ دیتا ہے اور پھر صوفے سے لگ کر عورت کے پاؤں میں فرش پر بیٹھ جاتا ہے)

مرد۔ کیوں کیا بات تھی۔؟!

عورت ۔ آفنہ ووغا ۔!

مرد ۔ وفا ؟ !

عورت ۔ یوسف بھی مجھے دغا دے گیا ہے ۔

مرد ۔ (چونک کر) یوسف !!

عورت ۔ آج کل گرگ میں ۔ وہ اپنی چچازاد بہن سے شادی کر رہا ہے ۔ خفیہ شادی !!!

مرد ۔ کون سنے ؟

عورت ۔ میری ایک سہیلی نے ۔ مردود ۔ !!

مرد ۔ مگر تو پھر آپ کو یوسف سے کیوں شکایت ہے ۔ ؟

عورت ۔ کیوں شکایت ہے !!

مرد ۔ آپ کی سہیلی سے شادی کر لینے کے یہ معنی ہیں ۔ کہ یوسف آپ کو چھوڑ دینے کے بعد بھی چھوڑ نہیں سکا ۔ آپ کی سہیلی میں بھی وہ آپ ہی کی کسی خوبی پر مرتا ہے ۔ اور اس کا ذوق نیاز ابھی تک آپ ہی کے حلقۂ اثر میں محدود ہے ۔ یہ بھی تو ایک طرح کی فتح ہے اور پھر کیا معلوم ۔ شاید عین شادی کے وقت آپ کی سہیلی کو بھی کینیبڑوں کی شکایت ہو جائے ۔ !!

عورت ۔ نہیں نہیں ۔ یوسف جس عورت سے واقعی شادی کرنے کا ارادہ کرلے ۔ اسے کینیبڑوں کی شکایت ہونا ناممکن ہے ۔ وہ اپنی زندگی کو اتفاقات کے رحم پر چھوڑ دینے کا عادی نہیں ہے ۔

مرد ۔ بھئی بڑا بیہودہ آدمی ثابت ہوا ہے ۔ جی چاہتا ہے ۔ جی چاہتا ہے ۔ اسے ہاؤس بوٹ کا کرایہ ادا نہ کروں !

عورت ۔ (واقعی بیں کر) ہائے میرے اللہ ۔ اگر پہلے میرا خط اسے مل جاتا تو مجھے ہرگز اتنی مایوسی نہ ہوتی ۔ اب وہ اس بات پر اترائیگا ۔ کہ پہلے اس نے مجھے چھوڑا ۔

مرد ۔ ہوں ۔ بڑی بات !!

عورت ۔ مگر نیاز صاحب آپ گواہ ہیں ۔ کہ پہلے میں نے یوسف کو چھوڑا ہے

مرد ۔ یقیناً آپ نے چھوڑا ہے !! آپ کا خط میرے پاس موجود ہے ۔ میں عدالت میں گواہی دینے کے لئے تیار ہوں ۔ آپ چاہیں تو میں ابھی اپنی شہادت قلمبند کر دوں !

عورت ۔ اگر آپ مناسب خیال کریں تو ـــ

مرد ۔ (ایک لخت کچھ سوچ کر) ہاں مگر ایک اور صورت بھی تو ہے ـــ !

عورت ۔ کیا ۔ !

مرد ۔ یہ خط یوسف کو گلمرگ کیوں نہ بھیج دیا جائے ۔

عورت ۔ کونسا خط ۔ ؟

مرد ۔ یہ جو آپ نے ابھی اس ہاؤس بوٹ کے پتے پر پوسٹ کیا تھا ۔

عورت ۔ ٹھیک ـــ نیاز صاحب بلا کے ذہین آدمی ہیں آپ !!

(گھٹنوں کے بل اونچا ہو کر) ملاحظہ فرمائیے ۔ ڈاکخانہ کی مہر ۔ تاریخ وغیرہ سب کچھ دکھائی دے رہا ہے ۔

عورت ۔ (مرد کی طرف جھک کر) جی ہاں

مرد ۔ خط کے اندر بھی تاریخ موجود ہے

عورت ۔ جی ہاں ۔ حجۃ الوداع !!

مرد ۔ خوب ۔ بڑا مبارک اور موافق دن انتخاب کیا ہے !

عورت ۔ گذشتہ شب ساڑھے آٹھ بجے سب کچھ خط کے اندر موجود ہے ۔

مرد ۔ (فرش پر بیٹھتے ہوئے) بس تو ٹھیک ہے ۔ (اپنی پشت صوفے سے لگا کر باہیں صوفے پر پھیلا دیتا ہے) اب یوسف آپ سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ اس کا گلمرگ کا سرنامہ میرے پاس موجود ہے ۔ یہ خط آج ہی روانہ کر دیا جائیگا

عورت ۔ میں کس زبان سے آپ کی ذہانت اور رہنمائی کا شکریہ ادا کروں آپ سچ مچ بلا کے منفعل آدمی ہیں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونے دیتے

مرد ۔ (دفعتہً کچھ سوچ کر) اوہو ۔ ٹھہر جائیے ۔ (فرش سے اٹھتے ہوئے) آپکے کہنے سے مجھے یاد آگیا ۔ کہ ایک بہت بڑا دقیقہ فروگذاشت ہوا جا رہا ہے ۔

عورت ۔ واقعی وہ کیا ؟

مرد ۔ (صوفے پر گھٹنہ ٹیک کر) یوسف کو آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ میں ایک اور شخص سے شادی کر رہی ہوں ۔ (ٹانگ صوفے پر تہہ کر کے بیٹھتے ہوئے) مگر جب یوسف اپنی دلہن کو لیکر نیچے آیا تو اسے معلوم ہو جائیگا ۔ کہ ـــ

عورت ۔ کہ میری شادی نہیں ہو سکی ۔

مرد ۔ جی ہاں ۔ کہ آپ کے دولہا کو کینیبڑے نکل آئے ہیں ۔ اس بات پر اترانے کا اسکے پاس زیادہ عذر ہوگا ۔

عورت ۔ یہ تو سچ مچ بڑی بیڈھب بات ہے ۔

مرد ۔ اس پر غور کر لینا ضروری ہے ۔

عورت ۔ ہائے میرے اللہ ۔ یوسف کو خط لکھتے وقت مجھے یہ کیا سوجھی ۔ کہ دولہا سے شادی کرنے کا تذکرہ بھی ساتھ ہی کر دیا ۔ میں اسے اور طرح بھی ٹال سکتی تھی ۔

مرد ۔ آپ نے دولہا کا نام اپنے خط میں تحریر کیا ہے ۔ ؟

عورت ۔ نہیں ۔ میں نے اپنے خط میں دولہا کا نام تو نہیں لکھا ۔ صرف یہ لکھا ہے کہ میں ایک اور شخص سے شادی کر رہی ہوں ۔

مرد ۔ بس تو پھر خیریت ہے ۔ !

عورت۔ خیریت کیسی ۔؟

مرد ۔ میں عرض کرتا ہوں!

عورت۔ خدا کے لئے جلدی کہئے۔ وقت گزرتا جارہا ہے!

مرد ۔ آپ اس خط کو اسی طرح کھڑکی سے روانہ کر دیں۔

عورت۔ ارے صاحب مگر ــــ!

مرد ۔ اور جب یوسف واپس آئے ــــ تو آپ کی شادی خانہ آبادی ہو چکی ہو۔

عورت۔ (تعجب سے مرد کو دیکھ کر) میری شادی ہو چکی ہو! ــــ خوب! مگر کس سے؟!

مرد ۔ (بیقراری سے دیکھتے ہوئے) کسی اور سے ــــ جو اس نازک تحریر کے لئے اپنی نیاز مندانہ خدمات پیش کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اور جسے آپ اپنی قبولیت کا شرف جتنا مناسب سمجھیں۔

عورت۔ (چہرہ مرد کی طرف سے گھما کر۔ رو بہ سامعین) ایسا کون ہو سکتا ہے؟

مرد ۔ (عورت کے پیچھے پنڈولم کی طرح ٹہلتے ہوئے) یہ اپنے دل سے دریافت کیجئے!

عورت۔ دل سے۔؟

مرد ۔ اور اپنی آنکھوں سے!

عورت۔ (محویت کے عالم میں صوفے سے اٹھتے ہوئے، آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اندازہ میں کھڑکی کے پاس جاکر) آنکھوں سے! اوہ۔ مگر کہاں کہاں!!

مرد ۔ (صوفے پر) چشم بینا کے لئے عالم امکان کا ہر ذرہ اک دعوت تماشا ہے!!

عورت۔ (کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے) عالم امکان! ــــ ہاں مگر عالم امکان تو اک وسیع چیز ہے! بہت وسیع جس میں کوئی ربط مکانی نہیں دیتا۔

مرد ۔ اس کا علاج صرف مقصد کی تعیین ہے۔!!

عورت۔ (مرد کو دیکھ کر) مقصد کی تعیین!!

مرد ۔ ہاں۔ مقصد کی تعیین اس وسعت اور انتشار کے اندر ایک معنی اور ولاویز ترتیب پیدا کر دیتی ہے۔ کیا خوب کہا ہے غالبؔ نے

خوشا آوارگی گر دور فرو شوق بر بندد
بتار دامنے شیرازہ مشتِ غبار!

آپ اپنی زندگی میں ایک مقصد ایک مدعا مرتب کر لیں۔ تو شاید آپ کو اپنی جستجو میں بہت دور نہ جانا پڑے۔

عورت۔ آہ۔ (صوفے کی طرف آتے ہوئے) کوئی پیارا رفیق آرزو جس کی ہر ادا سے میری طبیعت مانوس ہو۔

مرد ۔ اس کا تجربہ آپ کر چکی ہیں۔ بارہا دیدیم بہ بینید کہ یار چہ کرد!!

عورت۔ (صوفے کے پیچھے) پھر!

مرد ۔ (صوفے سے اٹھ کر) آپ کو خدا نے دل آنکھیں فہم و شعور سب کچھ عطا کیا ہے۔ ان سے بشارت طلب کیجئے (رہنے سامعین کی طرف آتے ہوئے) اور جب کسی خوش نصیب کے متعلق آپ کو الہام ہو تو اسے اپنے قلب و جان کے اندر جگہ دیجئے۔ اس سے زیادہ میں آپ کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ کروم اشفقہ عزیزم

عورت۔ (کھوئی ہوئی سی آواز میں) الہام۔ الہام!۔ ہاں (سامنے کی طرف آتے ہوئے۔ رو بہ سامعین) انسان ہمیشہ اس جستجو میں رہتا ہے کہ اسے پہلے کی بہ نسبت بہتر شے دستیاب ہو۔ جس سے اس کی شخصیت کی تکمیل ہو سکے۔ جس سے اس کی شخصیت کو اور زیادہ پھیلنے پھولنے کا موقع ملے۔

مرد ۔ اسی کا نام زندگی ہے۔

عورت۔ الہام ــ جس فرضی مرد کا ذکر ہم اس وقت کر رہے ہیں۔ اس کے لئے لازم ہوگا کہ وہ ہمیشہ میری دسترس سے زیادہ دور رہے۔ تاکہ میری نگاہ میں وہ ہمیشہ وہی رہے۔ جس کی جستجو مجھے رہتی ہے۔

مرد ۔ (عورت کی طرف گھوم کر) ایسا کوئی مرد آپ کے ذہن میں ہے؟

عورت۔ (رو بہ شاید ... (مرد کو ایک سامعین / بہ جانب شمالِ ستار دیکھ کر) میں الہام کا انتظار کر رہی ہوں۔

مرد ۔ (پیچھے سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر) تمہارے سر کی قسم مزا کیا ہی لطف ہو کہ جب یوسف سنگے کو لیکر یہاں آئے تو وہ دیکھے۔

عورت۔ (مرد کی طرف چہرہ اٹھا کر) اکٹھے ادھر ہیں۔

مرد ۔ (اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) میاں بیوی۔

عورت۔ (مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے) اپنے پیار و محبت سے

مرد ۔ (ہاتھوں کو کندھوں سے سرکا کر آہستہ آہستہ کمر میں ڈالتے ہوئے) اس جنت ارضی کے اندر عیش و راحت کی ایک ننھی سی جنت تعمیر رہے ہیں۔

عورت۔ (آنکھیں بند کر کے) پیارے نیاز

مرد ۔ پیاری راز

عورت۔ مجھے ابھی الہام ہوا ہے۔

مرد ۔ مجھے بتاؤ۔

عورت۔ کہ تم وہ ساحل ہو۔ جس کی آغوش میں سہارا لون اور میری جستجو کہ مدت سے اپنی عافیت میں بلا رہی تھی۔ بتاؤ مجھے اپنا بناؤ!!

مرد ۔ اور تم مجھے! لے اپنا باہوں میں لپیٹ کر، یوں! اوہ

والدہ راز تم ایک نعمتِ آسمانی ہو۔ !! اور جان (علیحدہ ہو کر)
اب (جیب سے خط نکال کر) آؤ پہلے اس خط کو روانہ کر دیں۔ ابھی رد
میں اسے پوسٹ کا نیا سرنامہ لکھ دوں۔

(جلدی سے میز کے پاس جا کر لفافے پر سرنامہ لکھتا ہے)

مرد۔ (سرنامہ لکھتے ہوئے) تمہارے اس قسم ناز میں اس بات پر بے حد
خوش ہوں کہ تمہارے اس شخص کو عین وقت پر کنپیٹرے نکل آئے

عورت۔ (دیکھ کے درمیان) زہے نصیب!

مرد۔ (میز سے واپس آتے ہوئے) آؤ جان اب یہ خط تیار ہے۔

عورت۔ تو گویا۔ اب قطعی فیصلہ ہے۔!!

مرد۔ قطعی۔ (شوخی سے) تاہم یہ خط تمہیں خاوند پر مجبور کرتا ہے۔ مجھے
اپنا خاوند بنانے پر مجبور نہیں کرتا۔

عورت۔ میں اپنی بات نہیں سوچ رہی تھی۔!

مرد۔ تو۔!!

عورت۔ تمہارا خیال آیا تھا مجھے ——

مرد۔ ہاں؟

عورت۔ کہ تم —— میرے تلون کو ——

مرد۔ میں۔ یہ کیا بات شروع کر دی تم نے۔ (اسے اپنے سینے سے لگا کر)

ماز تمہا! تلون۔ (مجنونانہ انداز میں)

تا زم تلونِ تو بہ بحث من و رقیب
کر یار دحینیں زبیدی مبا چپال بدنہ

عورت۔ میرا یقین پختہ ہوتا جاتا ہے!

مرد۔ (شوخی سے۔ چھیڑتے ہوئے) پھر بھی۔ تم چاہو تو یوسف کے آنے
تک اپنے انتخاب میں مزید ترمیم کر سکتی ہو۔

عورت۔ نہیں نیاز۔ میرا خیال ہے مزید ترمیم کی ضرورت نہیں۔
شعر موزوں ہو چکا ہے۔ اس کی بندش میں اب کسی اصلاح کی
گنجائش دکھائی نہیں دیتی۔

کہ نقشے در خیال ما ازیں خوشتر نمے آید

مرد۔ (کمر میں بانہہ ڈال کر) اچھا تو آؤ اب اس خط کو پوسٹ کرآئیں۔ لفافے
کا وہ کونہ تم پکڑ لو اور یہ کونہ میں پکڑ لیتا ہوں۔ اور دونوں متفقہ طور
پر اسے ڈاک سپرد کر کے آتے ہیں۔

عورت۔ ہاں۔ بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

(آخری مصرعہ کہتے ہوئے دونوں تیزی سے باہر چلے جاتے ہیں)

(طلعہ۔ آئی۔ آر۔ سلامید) پردہ

ابراہیم جلیس

مدر انڈیا

ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک ، ہندوکش سے لیکر خلیج بنگالہ تک انسانوں کی کتنی بڑی منڈی پھیلی ہے ۔ سستے سے سستا انسان یہاں خرید لو ۔ ایک انسان کی قیمت صرف دو ٹکے ۔ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا تھا ۔ مگر جب سے انسان سیم وزر کی لعنت میں پھنس گیا اور بڑے چھوٹے کی تفریق پیدا ہو گئی انسان اشرف المخلوقات کے سنگھاسن سے اترا تھا اشرف الانسان بھی بن بیٹھا ہے اور اس طرح انسان دو جماعتوں میں بٹ گئے ہیں ۔ اشرف انسان ۔ ارذل انسان اشرف انسان کو اپنی بزرگی اور شرف برقرار رکھنے کے لئے ارذل انسان کی ضرورت تھی اور ارذل انسانوں کی ایک بہت بڑی منڈی بنائی گئی ۔ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک ہندوکش سے لیکر خلیج بنگالہ تک ۔

غفور کی قیمت پانچ روپیہ ماہانہ ۔ رحیم خاں کی قیمت پچیس روپیہ ماہانہ ۔ نصرت حسین کی قیمت پانچسو روپیہ ماہانہ

غفور کئی دنوں سے بیمار ہے ۔ ہڈیوں کا ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے ۔ مگر رینگتا رینگتا کارخانہ پہنچ ہی جاتا ہے ۔ اس کا کام بہت ناقص ہو رہا ہے ۔ اس لئے اس کے آقا نے کہہ دیا ہے ۔ کہ اب وہ گھر بیٹھ رہے ۔ اس کے آقا نے صرف چار روپے ماہوار پر ایک نیا غلام خرید لیا ہے ۔ اب ایک روپیہ کا منافع اور اچھے کام کی ضمانت ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ غفور بیٹھ رہے گا تو کھائیگا کہاں سے ۔ کل مرنے والا آج مر جائیگا مگر تجارت تفنن کا کھیل ہے

رحیم خاں کی بیوی مر گئی ہے ۔ صاحب چھٹی نہیں دیتا ۔ صاحب ضبط و نظم کا بڑا پابند ہے ۔ اگرچہ ہندوستانی ہے ۔ مگر تازہ ولایت سے آیا ہے ۔ رحیم خاں دفتر کی ٹوٹی کرسی میں دفن ہے اور اس کی بیوی قبرستان میں ۔ دونوں مر چکے ہیں ۔ ایک کا جسم مر چکا ہے ۔ ایک کی روح مر چکی ہے ۔

پانچسو روپیہ پر خریدا ہوا نصرت حسین برج کھیلتے ہوئے ایک انگریز سے ہار گیا ۔ نصرت حسین اس انگریز کی بیوی کے آگے گڑگڑا رہا ہے ۔ ایک ارذل انسان ایک اشرف انسان سے پناہ مانگ رہا ہے ۔

غفور ، رحیم خاں ، نصرت حسین اب نیچے گہرائی میں جا پڑے ہیں ۔ انہیں اوپر چڑھنا نہیں آتا ۔ اسی لئے یہ کوشش بھی نہیں کرتے ۔ کالج کے ایک نوجوان شاعر نے ایک نظم لکھی تھی ۔ کہ اوپر ایک حسین دنیا بستی ہے ۔ اور اسی لالچ میں آ کر ریاض نے ایک مرتبہ اوپر چڑھنے کی کوشش کی تھی ۔ مگر کس بری طرح نیچے گرا تھا وہ ۔ ۔ ۔ اڑا دہم میں مزا آ گیا تھا ۔ بے چارے کی حالت دیکھ کر اب کسی کی ہمت نہیں ہوتی ۔ سب اس گہرائی میں سسکتے رہنے اور رینگتے رہنے کو زندگی سمجھنے لگے ہیں ۔ اور اوپر سے ان کے آقا اس طرح ان کا رزق پھینک رہے ہیں ۔

لو پانچ روپئے ۔ ۔ لو پچیس روپئے ۔ ۔ لو پانچسو روپے

نیچے کھلبلی مچ جاتی ہے ۔ پانچ روپیہ کے لئے بہت سے غفور آپس میں لڑ پڑے ۔ مگر ایک غفور نے جس کی ماں کلکٹر صاحب کی باورچن تھی ۔ اور غفور کو چوری سے مکھن دودھ اور انڈے کھلایا کرتی تھی ۔ سب کو مار پیٹ کر پانچ روپے اپنے قبضہ میں کر لئے ۔ دوسرے غفور حسرت سے اس کا منہ تکنے لگے اور اپنے بھوکے بچوں کی بلبلاہٹ سننے لگے لو پچیس روپیہ ۔ ۔ بہت سے رحیم خاں دوڑ پڑے ۔ ایک نے دوسرے کو گرا دیا ۔ دوسرے نے تیسرے کو قتل کر دیا ۔ چھٹے نے پانچویں کو زہر دیدیا ۔ اور چھٹے رحیم خاں نے دیکھا کہ کوئی حقدار باقی نہ رہا فتحمندی سے اس نے پچیس روپے اپنی جیب میں بھر لئے اور اب وہ اپنے آقا سے وعدہ کر رہا ہے ۔ اگر بیوی بھی مر جائے ۔ تو بھی وہ دفتر ہی میں دفن رہے گا ۔ آقا نے وفادار غلام کی پیٹھ ٹھونکی ۔ پیسہ کی محبت مادی نفع پہنچاتی ہے اور بیوی کی محبت ایک بیکار سی ۔ ایک لغو سی ۔ ایک فضول سی ہے ۔ ایک اعلان شائع ہوا کہ ایک نوکری خالی ہوئی ہے ۔ قابل آدمی کو کلکٹر بنا دیا جائیگا ۔ یعنی بہت بڑا نوکر بنا دیا جائیگا اس بات کی ذمہ داری لی جاتی

چونکہ نوکر کو اس بات کا مطلقاً احساس نہ ہوگا۔ کہ وہ نوکر ہے۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہننے کی آزادی ہے۔ اسے موٹر میں بیٹھنے کی آزادی ہے۔ اور نوکری انجام دینے پر اس کی معیار پانسو روپیہ دیئے جائینگے۔ اس اعلان کو پڑھ کر بہت نصرت حسین اچھل پڑے۔ اُن کے والد بھی اس صاحب بہادر کی کوٹھی سے اُس صاحب بہادر کی کوٹھی تک تمام عمر لڑکیاں لئے دوڑتے رہے تھے۔ ایک نصرت حسین کالج میں ہمیشہ اسی موضوع پر تقریریں کرتا اور مضامین لکھتا تھا کہ ہندوستان میں ایک خالص ہندوستانی حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ موجودہ حکومت کا نظام جلنا چاہیئے۔ جارج اور گاندھی نے کئی مرتبہ اس کی پیٹھ ٹھونکی بھی۔ مگر اب اس نے موجودہ حکومت کی موافقت میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ دوسرا نصرت حسین ایک ایبر ریپ سے محبت کرتا ہے۔ وہ ہونٹوں کے لئے لپ اسٹک مانگتی ہے۔ گالوں کے لئے پاؤڈر چاہتی ہے۔ پہننے کے لئے قیمتی کپڑے تفریح کے لئے رولس رائیس کار۔ ورنہ محبت کو گڈ بائی کہنا چاہتی ہے۔ اب وہ زمانہ کہاں رہا کہ ایک خاناں برباد فقیر منش عاشق اپنے محبوب سے کہتا کہ تیرے ایک خال پر میں سمرقند و بخارا قربان کر دینا چاہتا ہوں۔ تو محبوب عاشق کی سخاوت کی داد دیتا ہوا۔ اسے شراب پلاتا تھا — اب تو محبت بھی تجارت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ قیمت ادا کرو تو محبت کرو — اسی لئے دوسرا نصرت حسین اس لڑکی سے کہہ رہا ہے۔ تمہارے ابا کا حکومت میں رسوخ ہے۔ اگر تم مجھے یہ نوکری دلا دو تو میں تمہارے ہونٹوں کے لئے قوسِ قزح کی رنگت مانگ لوں۔ تمہارے گالوں کے لئے شفق سے غازہ خرید لوں۔ بالآخر اسے نوکری مل گئی۔ ملک کی دولت کبھی ہونٹوں کی سرخی بن کر چمکنے لگی۔ کبھی گالوں کا غازہ بن کر اُڑنے لگی۔ کبھی موٹر کا پٹرول بن کر بہہ گئی۔ اور اسی طرح دس سال گزر گئے۔ نصرت حسین جی کا پسینہ آخری حد تک بہا کر اپنی جوانی راکھ کی طرح اڑا رہا تھا۔ اور تنگ آ کر خودکشی کر لی — آسمانوں میں اڑنے والی اور قوسِ قزح سے کھیلنے والی خوبصورت چھتری اور ایک زمین پر رینگنے والے کیڑے میں کہاں میل ہو سکتا تھا —؟

کالج کے چند نوجوانوں نے ابھی ابھی عملی زندگی میں قدم رکھا ہے۔ ایک انڈین سول سروس کے مقابلہ کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ دوسرا ایمرجنسی کمیشن میں بھرتی ہو گیا ہے۔ تاکہ ہندوستان کو جنگ کے خطرے سے بچائے۔ اور اسی لئے کل وہ لندن جا رہا ہے — مگر یہ سب بہانہ ہے۔ دراصل اسے اپنے غریب کنبے کو پالنا ہے۔ وہ سارا زیور اور گہنے جو اس کی طالب علمی کے زمانے میں اس کی ماں نے بنئے کے پاس رہن رکھے تھے۔ چھڑانا چاہتا ہے۔ تیسرا اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانا چاہتا ہے۔ تاکہ واپس آ کر کوئی اعلیٰ نوکری کرے اور سب اس کی تعریف کریں۔ واہ واہ بیٹا واہ — نوجوان مردوں سے بازی لے گیا۔ اسی لئے اس کے باپ نے ساری جائداد بیچ دی ہے۔ حالانکہ اسی رقم سے جو باہر کے کالجوں، ریسٹوران، ناچ گھروں اور کیفوں میں خرچ ہوگی۔ اپنے ملک میں بڑی عزت سے گزارا ہو سکتا ہے۔ مگر اعلیٰ نوکری کا ہیولا کتنا رنگین ہے۔ کتنا دلچسپ ہے۔ کتنا سندر ہے۔

مجھے اپنے بچپنے کے سلسلے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی چیز کے لئے میں اپنی امی سے ضد کر رہا تھا۔ اس وقت میری امی نے کہا تھا "میرا لال بڑا سمجھدار ہے۔ جب وہ بڑا ہوگا تو میں اسے پڑھنے کے لئے ولایت بھیجوں گی۔ اور وہ کوئی اعلیٰ نوکری کریگا" مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ اس وقت ولایت اور اعلیٰ نوکری کے خیال سے میرے دل میں گدگدیاں ہونے لگی تھیں۔ اور میں نے رونا بند کر دیا تھا۔ بچپنے سے پروان چڑھتا ہوا تخیل اب کافی پروان چڑھ چکا ہے۔ اب بھی اگر کوئی مجھ سے کہے کہ تم اپنا مذہب بدل دو تو میں تمہیں کوئی اعلیٰ نوکری دے دونگا۔ تو میں تیار ہوں۔ اب مجھ میں بھوکا اور ننگا رہنے کی تاب نہیں ہے۔ زندگی روتے کٹ رہی ہے۔ اب اور آنسو بہانے کی ہمت نہیں رہی۔ مجھے نوکری بخش دو۔ میں کل کی آزادی سے آج کی غلامی کو بہتر سمجھتا ہوں —

غفور کل تک نرم زمین میں ہل تک نہ چلا سکتا تھا۔ آج جنگ پر جا رہا ہے۔ اس کے جسم پر پچاس روپیہ کی وردی ہے۔ اسکے سر پر دس روپیہ کا ٹوپ ہے۔ اسکے پیر میں اٹھارہ روپیہ کا جوتا ہے۔ اسکے کندھے پر دو سو روپیہ کی بندوق ہے۔ مگر غفور کی قیمت — بھوکے اور ننگے غفور کی قیمت ستر روپیہ نو آنے ماہوار۔

آج رحیم خاں کی تنخواہ ملی۔ رحیم خاں چالیس برس کا کنوارا ہے۔ اور جب تک اس کی تنخواہ تیس روپے اور خرچ چالیس روپے رہیگا۔ وہ کنوارا ہی رہیگا۔ اب وہ ایک تنگ و تاریک غلیظ گلی میں بھاگا جا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گندہ مکانات کی چوکھٹوں پر کالی کلوٹی سانولی سلونی مرجھائی ہوئی عورتیں بیٹھی ہوئی چیخ رہی ہیں۔

"تین روپے"

"دو روپے"

"ایک روپیہ"

ایک روپیہ پر خرید و فروخت بند ہو جاتی ہے گنبدے مکان کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اور باہر زہریلی ناگنیں پھنکارتی ہیں۔

"ان ننی ننی چھوکریوں سے خدا بچائے۔ ایک ایک ٹکے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ نامراد"

اور پھر وہ اپنا اپنا تماشہ یاد کرنے لگتی ہیں۔ جب بڑی بڑی کچیاں بار دار بچے اونچے طرے لگانے والے ان سے ہزاروں کما کما کر دیتے تھے ہنس ہنس پیسے دا ذکمانے والا اور ان خاندانی پولی ای بہن بھائی کے ایک کریچ کنبے کو پالنے والا رحیم خاں ایک روپیہ پھینک کر کچھ دیر کے لئے پیارا ہو جاتا ہے۔ اور روپیہ پیار کی کرا اپنی پیاری اولاد کی طرح پالتا ہے۔

آج نصرت حسین نگی بھی تجزادہ ہی پانچسو دیئے۔ وہ ایک جگمگاتی دکان میں اپنی بیگم عریاں بیگم کے ساتھ کھڑا ہندوستانی صنعت کا مذاق اڑا رہا ہے ہندوستانی صنعت وہ رہی جیتھڑوں میں لپٹی ہوئی بڑھی بھکارن۔

"صاحب یہ دیسی ٹوئیٹہ ہے۔ دو روپیہ گز"

"ہش۔ لورپول اور ہیوکاسل کے ٹوئیٹڈ دکھاؤ"

"صاحب، یہ دونوں ٹوئیٹڈ ایک ہی نمونے کے ہیں۔ اور دیسی ٹوئیٹڈ مقابلتاً لیورپول کے بہت سستا ہے۔ لیورپول ٹوئیٹڈ کی قیمت نو روپے گز۔"

صاحب نے نو روپیہ گز والا لیورپول کا ٹوئیٹڈ خرید لیا۔ میں اس نصرت حسین کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس نے ایک مرتبہ ریڈیو پر اپنی تقریر نشر کی تھی "اس جنگ سے ہندوستان ایک اچھا صنعتی ملک بن کے نکلے گا"—— اور اگر اس زمانے میں بھی نو روپیہ گز، دو روپیہ گز پر سبقت لے جاتا رہا تو —— ؟

میرا ایک دوست اسی وجہ سے قومی لیڈر بن گیا ہے۔ مگر میں اس پر ہنستا ہوں۔ اسے میں نے ہمیشہ شراب اور سگریٹ میں مست دیکھا ہے۔ صبح کے بعد سے اسے چہرے سے ملاقات ہٹایا ہے۔ بارہا سینماؤں کی اعلیٰ نشستوں میں اسے مگن دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ آخر یہ کیا قصہ ہے۔ وہ اس طرح اپنے مقاصد میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا۔ "عادات کا مقاصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا" میرے جی میں آئی کہ اس کا منہ نوچ لوں۔

"تم دوہرے غلام ہو۔ ایک تو اپنے آقا کے غلام، دوسرے عادات کے غلام۔ یہ دوسری غلامی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔"

"مگر میں نے ہمیشہ اپنے دوست کو معاف کر دیا۔ کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہاں اکثر ایسا ہی کرتے ہیں۔

میں اکثر اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں ہندوستان کے نقشے کو دیکھتا ہوں —— ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک۔ سندھ کش سے لیکر خلیج بنگالہ تک کیسی نحوست پھیلی ہے —— غلاموں کا ملک۔ انسانوں کی منڈی — اب میں اپنے ملک سے نفرت کرنے لگا ہوں۔ قدرت کا قانون کیسا الٹ گیا ہے۔ بچہ اپنی ماں سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اسے اپنی ماں کی گود قبر کی طرح ڈراؤنی نظر آ رہی ہے ——

صد شکر کہ مستِ مئے مغرور نہیں چلا ہوں
سا [illegible] و قلندر در آتش چلا ہوں
کافر ہوں اگر ہو، ہوسِ کوثر و تسنیم
بھرپور ہے رندانِ بلانوش چلا ہوں
(بیدل حیدری)

سید احمد اعجاز

سعیٔ خام

چاندنی کے ساز پر — ہو محبت نغمہ گر
میرے دل کا اہتزاز — بن گیا ہے رُوحِ ساز
چاندنی کو سے کے دُور — جا رہی ہے موجِ نور
بھیجتا ہوں تیرے نام
موجِ سیمیں پر پیام
آہ لیکن سعیٔ خام!

جس طرح بچہ کوئی — ناؤ اپنی کاغذی
آبجو میں چھوڑ دے — اور توقع یہ کرے
ناؤ اُس کی جائیگی — اور کھلونے لائیگی
مادرِ مرحوم سے — شہرِ نامعلوم سے
پھر کنارِ جوئبار — وہ سراپا انتظار
کشتیوں کو دُور سے — دُور سے آتے ہوئے
دیکھتا ہو تا بہ شام!!

اقبال (سنتپا پوری)

آزادِ فکرِ زیست سے سود و زیاں سے دُور — رکھا ہے تیرے غم نے غمِ دو جہاں سے دُور
بدنام ہو نہ جائے کہیں ذوقِ بندگی — سجدے مچل رہے ہیں ترے آستاں سے دُور
دل سے لُٹا ہے یہ محبت بھری نگاہ — ایسا نہ ہو یہ برق گرے آشیاں سے دُور
اقبال اس کو کہتے ہیں مجبوریٔ حیات — میں ہوں بھری بہار میں بھی آشیاں سے دُور

شفیق الرحمٰن

ساڑھے چھ

شام ہو گئی تھی۔ اور میں تھکا ہوا چپ چاپ اپنے کمرے میں پلنگ پر آ گرا۔ یار دوستوں نے مالش شروع کی۔ بس گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ابھی دو دوا کھاؤ اور میں تم تو جیسے استاد ہو بالکل ٹھیک بچا دیا۔ معاملہ صاف ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل مجھے کرکٹ سے ویسی دلچسپی نہیں اور اب مجھے خواہ مخواہ پر افسوس ہو رہا ہے کہ سامنے خواہ مخواہ میچ کا ذکر کر دیا تھا مگر وہ یہاں نہ تھے۔ تب کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی لیکن اب تو وہ بہت ہی حافظ فرما ہو گئے ہیں اور شاید وہ بھی کر رہے ہیں۔ ادھر وہ پرنسپل صاحب — خدا جانے کس طرح آ گئے۔ اینٹیک نہ میں نہ خواہ مخواہ یہ بھی ملاقات سے واقفیت ہوئی تھی۔ تو ضرور اسی طرح ہوئی تھی کیا ہم بھی قسمت کے دھنی ہیں۔ اب وہ دو ڈھنس رہے ہوں گے۔

کل ہنستے نکل گیا وہ پوچھنے لگے۔ کہاں ہو گے ہم میں نے کہا جناب کل تو باکسنگ (Boxing) کا میچ ہے۔ بڑے اچھے میچ دیکھیں گے تم نے ایک عرصے سے ہمیں تنگ کر رکھا ہے۔ اس مرتبہ ہم ضرور تمہیں لڑتے دیکھیں گے۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ بہتیری منتیں کیں۔ آپ وہاں تشریف نہ لایئے۔ شور ہوتا ہے۔ فضول سا ٹورنامنٹ ہے۔ آپ ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ وقت ضائع ہو گا۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن کیا مجال جو وہ مانتے ہوں۔ اور ادھر یہ پرنسپل صاحب بھی شامتِ اعمال سے تشریف فرما تھے۔ کہنے لگے ہم بھی ضرور دیکھیں گے۔

میچ کوئی مقابلے کا ہوتا تو بات بھی تھی، میرا مقابل ایک بھاری بھرکم سیاہ فام گینڈا تھا جس کے سامنے مجھ کو زخم زدہ بہتر ہی ہو کر آنا چاہیے تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ یہ کم بخت تو مجھ سے وزن میں ایک دو من زیادہ ہو گا۔ آخر کس طرح مجھ سے لڑا رہے ہیں۔ آتے ہی اس کم بخت نے وہ الٹے سیدھے ہاتھ دیئے کہ میں چودہ طبق روشن ہو گئے۔ عرش بریں تک کے تمام بھید کے بڑے بڑے میرے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ اور اس کے بعد قل اللہ دے اور بندہ ہے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ منہ بنا کر، دانت بھینچ کر جو گھوما گھمسار تا۔ تو دھم دھم پنڈ نہیں کے گھونسے ہی لگا جاتا۔ اور میں سوچتا رہ جاتا کہ کیا کروں۔ اب پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ کہیں ناک آؤٹ (Knockout) ہی نہ ہو جاؤں اور ساری شیخی دھری رہ جائے۔

آخر مدافعت شروع کی بازو موڑ کر چہرے کے دونوں طرف آڑ بنالی۔ اب وہ ہے کہ گھونسے مار رہا ہے اور میں روک رہا ہوں۔ یوں بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ کہیں اس سے کہیں لڑا ہوں۔ ذرا سی ہمت کروں۔ تو اسے تھکا لوں گا۔ اب میں نے غل مچایں پھر نا شروع کیں۔ ایک دیا اور تڑاپ کر جلدی سے نکل گیا۔ جتنی میں وہ مڑا ہے اتنے میں ایک اور جڑ دیا اور پھر تڑاپ کر دوسری طرف۔ یہ نسخہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ وہ حیران ہو گیا۔ اب جناب پر تھکاوٹ کے آثار نمودار ہونے لگے، سینہ ہے کہ دھونکنی بنا ہوا ہے۔ ہاتھ لٹک رہے ہیں ٹانگیں کانپ رہی ہیں، چہرہ عجیب بنا ہوا ہے، اس راؤنڈ میں میں نے اُسے باقی تھکا مارا۔ ریفری نے مجھے ٹوکا بھی کہ یہ کیا کبڈی سی کھیل رہے ہو۔ اگلے راؤنڈ میں جو اُسے دیکھا ہے تو بس اجو طریقے مجھے یاد تھے۔ اور جس جس کو میں پسند کرتا تھا۔ اسی صورت کی۔ جب کبھی وہ مجھے اُس کی لڑاتی ہوئی طاقت تو دز پر لگتا۔ تو قہقہوں کا شور مچتا اور تالیاں بجتیں۔ سب سے زوردار اور دیرپا قہقہہ پرنسپل صاحب کا تھا۔ جو فضا کو زیر و زبر کر دیتا۔ میں نے اُسے جلدی ناک آؤٹ نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی تو دز پر لگتے گھونسے سے ایک بہت پیاری اور ترنم خیز آواز نکلتی تھی۔ جس سے لوگ بہت خوش ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا شاید یہ یاسی طرح جیت حاصل کر رہا ہوں۔ اس بار کوئی تو دز کو چھٹا ہی کر رہے۔ راؤنڈ ختم ہونے سے ذرا پہلے ایک چھوٹا سا تھکا ہوا کی ... ہلا کر اُسے ناک آؤٹ کر دیا۔

ہمارے کالج کے لڑکے چھوڑ کر انہیں اٹھا کر رنگ میں آ گئے۔ بڑا شور مچا پھر میں چپ ہوا اور پرنسپل صاحب سے ملا۔ پرنسپل صاحب نے تعریفوں کے

چل یا منہ دیئے بیٹے۔ تم نے بڑی ہمت سے کام لیا، اور اس نے کمال درجہ سے، میں تمہاری وجاہت کو دیکھتا تھا۔ کبھی اس کی جہالت کو تمہاری حماقت بھی ظرافت سے پُر تھی۔ جس سے شرارت ٹپکتی تھی؟

میں نے مؤدبانہ عرض کیا، "افسوس میں نے امانت میں خیانت کر لی"

"پیج کر بولے۔ کیا لیاقت ہے؟"

یہ تھی پرنسپل صاحب سے پہلی ملاقات۔

. . . .

پھر ایک شام کو میں بالکل تھکا ہوا سینما چلا گیا، ٹانگیں پھیلا کر اور سر کرسی کی پشت پہ ٹکا کر بڑی بے نیازی سے پکچر دیکھ رہا تھا انٹرول میں میں نے ایک ریشمی خاتون دیکھیں جو اپنے ننھے بہن بھائیوں کے ساتھ بالکل میرے پاس بیٹھی تھیں۔ ریشمی خاتون وہ خاتون ہیں جنہیں دیکھ کر دل کم از کم ایک منٹ کے لئے دھڑکنا بند ہو جائے۔ وہ بیرے کو بلانا چاہتی تھیں، کسی چیز کے لئے ننھے منے ضد کر رہے تھے شاید لیکن اُن کی آواز یا ہاتھ کا اشارہ بیرے تک نہ پہنچ سکا۔ ننھے میاں بھی کوشش کر چکے۔ آس پاس اور کوئی تھا نہیں۔ لہذا انہوں نے میری طرف دیکھا۔ کہ میں اُسے بلا دوں۔ میں نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔ خوب آرام سے سیدھا بیٹھ گیا، بھلا مجھے کیا پڑی۔ جو کسی کو بلاتا پھروں۔ یہاں اسقدر تھکاوٹ ہے۔ کہ ہاتھ تک ہلانے کو جی نہیں چاہتا۔ نہ جانے ایسی کیا اشد ضرورت تھی کہ انہوں نے پھر اُسے بلانے کی کوشش کی، اور پھر میری جانب دیکھا۔ میں نے جوابا یتیم چار دھوئیں کے گول اور دھوئیں کے چھلے بنانے لگا۔ وہ کچھ ناراض سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن اس کے بعد میں عموما انہیں دیکھا کرتا۔ جب علی الصبح میں کالج جاتا تو ایک موڑ پہ وہ اکثر مجھے ملتیں، ایک ایسی سی چھوٹی کار میں۔ شاید کہیں آس پاس ہی اُن کا کالج تھا۔

ایک مرتبہ میں نے اُسی موڑ پر اپنے بالوں پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اُڑایا، وہ سمجھیں سلام کر رہا ہے۔ انہوں نے جواب میں مجھے بُری طرح دیکھا۔ اگلے روز پھر سر پہ ہاتھ پھیرا تو یہی چل گیا انہوں نے بہت برا منہ بنایا میں نے جلدی سے کالی عینک اتار کر بالکل اُن کی نقل اتاری۔ اسکے بعد تو جان بوجھ کر میں نے سلام کرنا شروع کر دیا۔ خفا ہوئیں، منہ چڑایا، منہ پھیرا، چپ رہیں، لیکن آخر کو راہ راست پر آگئیں۔ اب میرے سلام پر جواب تو نہ ملتا تھا۔ لیکن بس مسکرا دیتیں آہستہ آہستہ اچھی لگنے لگیں۔ میں اُن کا انتظار کرنے لگا، اُن کی کار کا نمبر میری ڈائری میں محفوظ تھا ایک روز تو میں بہت ڈرا، کہ کہیں اُن سے سچ مچ ہی محبت نہ ہو جائے

. . . .

پرنسپل صاحب سے دوسری ملاقات ہوئی کانسرٹ میں، ہم کلب میں کانسرٹ کر رہے تھے۔ پروگرام کے ایک حصے میں مسٹر اور مسز قریشی کی نقل اتاری گئی۔ دونوں میاں بیوی حد درجے کے قنوطی تھے۔ جب کبھی مشہور رہتے ہیں بشی کا خیال تھا۔ کہ اُن کا ہاضمہ خراب ہے۔ میں کہتا تھا کہ یہ ورزش نہیں کرتے۔ اس لئے ایسے ہیں۔ دو سال سے کالج میں ہم نے انہیں صرف تین مرتبہ ہنستے دیکھا، وہ بھی ایسے نازک موقعوں پر جب ہم ہنستے ہنستے بیہوش ہو گئے تھے۔ تب وہ دونوں اس بیزاری سے مسکرا دئیے تھے۔ جیسے ہم لوگوں پر بہت بڑا احسان کر رہے ہوں۔ قریشی صاحب کا پارٹ میں کر رہا تھا۔ اور مسز قریشی بشی تھے۔ سامنے ہونے کی وجہ سے اُن پر کوئی پاؤڈر یا ووڈر ضائع کیا گیا تھا۔ وہ کہتے تھے دیا کہتی تھیں، کہ میں سفید کپڑے پہنونگا۔ جیسے کہ اکثر مسز قریشی پہنتی تھیں۔ میں نے انہیں وظیفے لیکر سنایا کہ ایک بالکل سیاہ انسان سفید کپڑے پہنے جارہا تھا، اور ایک ننھا سا بچہ اپنے ابا کے ساتھ آرہا تھا، اُسکے ابا فوٹوگرافر تھے۔ وہ بچہ اُس سیاہ شخص کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور اپنے ابا سے بولا "وہ دیکھئے ابا جان ایک نیگیٹیو (negative) جا رہا ہے" سب اس پر اُن کے کان کھڑے ہوئے۔ اور وہ باز آگئے۔

جب اسٹیج پر گئے تو قریبا ایک جتنے ہی تھے اس لئے بشی کو نیچی کرسی پر بٹھایا گیا تھا، تاکہ وہ چھوٹے لگیں۔ قریشی صاحب منہ لٹکائے کسی بیماری کی کتاب پڑھ رہے ہیں دوسری طرف منہ پھیرے مسز قریشی بالکل بیزار بیٹھی ہیں سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہے ایک کتاب اٹھاتی ہیں، اور فوراً ہی پھینک دیتی ہیں۔ پھر

بیزار ہو کر لیٹ جاتی ہیں۔ قریشی زور سے کھانستے ہیں۔ مسز قریشی آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہیں۔

بیگم کمبخت زکام ہی مجھے دبوچ بیٹھا ہے۔ ابھی کچھ پہلے تو دم بگڑ رہا تھا۔ وہ بولیں۔

"اور مجھے کھانسی دم نہیں لینے دیتی۔ سر درد الگ ہے کہ انگ انگ دکھ رہا ہے۔" مسز قریشی بولیں۔

"آج پھر میری پسلی میں درد ہو رہا ہے۔"

"میری بائیں آنکھ رہ رہ کر پھڑک رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔"

"رات گرمی کس قدر تھی؟"

"اور مچھروں نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آج ہی کھا ڈالیں گے۔" وہ بولے

"آج کا دن کتنا پھیکا اور غمگین ہے۔"

"اور رات کس قدر اداس اور ڈراؤنی تھی۔ کتنے تارے ٹوٹتے ہیں۔ توبہ الٰہی۔!"

— خاموشی —

"سنا ہے کہ امریکہ کے شمالی حصے میں بڑا زبردست زلزلہ آیا ہے، حالات کتنے خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔" مسز قریشی

"اور آسٹریلیا کے جنوب مغربی ساحل پر زبردست طوفان آیا ہے جس سے لوگ بہت بے گھر ہو گئے ہیں۔" وہ بولے۔

"میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ چند ہفتے تک دنیا سے کوئی ستارہ ٹکرائے گا۔ اور ہماری دنیا چکنا چور ہو جائے گی۔ یہ بلا کیا ہمیں بھی نازل ہونے والی ہیں؟

مجھے بھی ہفتہ بھر سے طرح طرح کے خواب ڈرا ڈرا رہے تھے، رات کو تو ایک بھوت نے مجھے نگل ہی لیا تھا۔!"

ایک وقفہ   باہر سے نوکر کے کھانسنے کی آواز آتی ہے۔

مسز قریشی کی تیوری چڑھ جاتی ہے۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور ان کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ جیسے ابھی کوئی دورہ پڑے گا۔ غصے سے کہتی ہیں بیگم کمبخت ہر وقت ہنستا ہی رہتا ہے۔ جب دیکھو دانت نکالے ہوئے ہیں۔ شاید اسے موت یاد نہیں۔!

مجبور بادہ ہنستے ہیں، وہی روتے بھی ہیں۔ انشاء اللہ جلد مصیبت میں گرفتار ہو گا۔ بھول جائیگا سب یہ گرا چھ

لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ اتنے میں میرے کانوں میں ایک ظالم قسم کے فلک شگاف قہقہے کی آواز آئی میں چونک ہو کر جو دیکھتا ہوں تو سامنے ہی پرنسپل صاحب بیٹھے تھے۔ ان کی وہ نوکدار مونچھیں بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ مونچھیں حسبِ دستور تاؤ شدہ تھیں۔ ان میں ایک ادھر اور ایک اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جیسے گھڑی کی سوئیاں گیارہ بجکر پانچ منٹ پر ہوتی ہیں۔

ان کے ساتھ ایک ریشمی خاتون بیٹھی تھیں، غور سے دیکھا تو یہ وہی خاتون تھیں جن سے ہر روز بس ہوٹل پر مڈبھیڑ ہو جاتی تھی جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ بالکل گھبرا گیا کیونکہ میں نے اپنا پارٹ بھی پوری طرح یاد نہیں کیا تھا اور پرامپٹر کے سہارے کام چل رہا تھا۔ اب انہیں دیکھ کر میں نے باوجود مٹری مشقی شروع کر دیں۔ غلط سلط بول رہا تھا۔ یہ غالباً پرنسپل صاحب کی صاحبزادی ہونگی یا بھتیجی وغیرہ ہیں۔ یا شاید یونہی اتفاقیہ طور پر بیٹھ گئی ہوں۔ عجب مصیبت ہے۔ میں بولا کہ بیکار ہی پرامپٹر چیخ چیخ کر پارٹ بتا رہا ہے۔ لوگ ہنس رہے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ معاملہ کیا ہے۔ اس خیال سے ہنس رہے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ڈرامہ ہی ہے۔ ادھر پرنسپل کے فلک شگاف قہقہوں سے فضا کی دھجیاں اڑ رہی ہیں۔ ابھی یہ نقل تمام نہ ہوئی تھی کہ ڈراپ گرا دیا گیا۔ اسٹیج پر کسی صاحب کا ڈائیلاگ دے دیا گیا۔ لوگوں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا، دھمکایا، پچکارا، منتیں کیں، لیکن میں مچل گیا۔ کہ اب اسٹیج پر نہیں جاؤنگا۔ مجھے پارٹ یاد نہیں، میں تو نہیں جاتا۔ ادھر باہر لوگ شور مچا رہے تھے۔ آخر تنگ آکر شیخ بولے۔ تمہاری سزا ہے کہ تم خود اسٹیج پر جا کر ان سے کہو کہ حضرات مجھے معاف کیجئے۔ مجھے اپنا پارٹ یاد نہیں رہا ہے۔ انہوں نے دھکیل کر مجھے اسٹیج پر لا کھڑا کیا۔ پہلے تو میں بول ہی نہ سکا پھر یکایک ایک خیال میرے دل میں آ گیا۔ میں نے کہا حضرات کیا تم خوب ہو

خیالستان میں جو کچھ آپ نے دیکھا وہ محض نمونہ تھا جس کا ذکر کیا جاتا ہے بلکہ افسانہ آپ کو کبھی پھر دکھایا جائیگا ۔ آپ خاطر جمع رکھیئے اسی ذریعے سے اندازہ لگائیے کہ اصل چیز کتنی مزیدار ہوگی ؟"

میں بھی ہنستے ہنستے ہنستے ولی کی طرف لوٹ گئے ۔ خواتین کی ہنسی صاف سنائی دے رہی تھیں ۔ لیکن پرنسپل صاحب کھلنڈرا اور دریا قہقہے ساتھ لگا رہے تھے ۔ اور اُن کی آنکھیں بجلی کی روشنی میں بہت پیاری لگ رہی تھیں ۔

. . . .

آخر میں نے شجی کو ساری بات بتا ہی دی ۔ وہ بہت ہنسے ۔ کہنے لگے ۔ کیا واقعی تمہیں محبت ہو گئی ہے ؟"

میں نے کہا ۔ "ہاں !"

بولے "اُن کا نام کیا ہے ؟"

میں نے کہا ۔ "پتہ نہیں !"

پوچھا ۔ "رہتی کہاں ہیں ؟"

"یہ بھی پتہ نہیں ! — البتہ مجھے اُن کی کار کا نمبر زبانی یاد ہے — !"

"کیسی بات کی ہے ؟"

"نہیں تو !" میں نے سچ کہہ دیا ۔

"اُن کے ابا کی تعریف ؟"

"ابھی اس کا تو پتہ نہیں ، لیکن کچھ اندیشہ سا ہے کہ کہیں پرنسپل صاحب ہی نہ ہوں !"

بولے "لاحول ولا قوۃ ! کچھ تو بتاؤ ، اندیشہ سا ہے — اور جو پرنسپل صاحب نہ ہوئے پھر ؟ تو تو فرہاد و مجنوں کی قسم کے انسانوں کی سی بات کر گیا ۔ ایسا عشق تو ہوا کرتا تھا کہیں سن سولہ سو — سولہ سو چھبیس میں ! یہ خواہ مخواہ کی محبت جب ہوا کرتی تھی ۔ جب ہندوستان میں لڑکیاں نہیں تھیں ۔ میرا مطلب ہے سارا دن چھپی بیٹھی رہتی تھیں ، کہیں کسی کو اتفاق سے دیکھ پائے ۔ اور دھڑام سے فوراً محبت شروع کر دی ۔ اور آج کل — آج کل تو خدا کا فضل ہے ۔ اس زمانے میں اس قسم کے دقیانوسی خیالات بالکل بے ہودگی باتیں ہیں — !"

"مجھے تو ہر روز اُن کے خواب دکھائی دیتے ہیں ۔ تمام رات میں اُن سے باتیں کرتا رہتا ہوں ۔" میں نے مسکین سی شکل بنا کر کہا ۔

"وہ خوب ! تو خواب دکھائی دیتے ہیں ۔ اس میں تمہارا قصور نہیں ۔ بھلا اگر رات کو دسترخوان پر ذرا دیر لگا دی جائے تو پھر خواب نہ نظر آئیں گے تو اور کیا ہوگا ۔ ذرا بھوک رکھ کر کھایا کرو ، تب دیکھیں کیا نظر آتا ہے ۔ مجھے تو سو کر ذرا ہوش نہیں رہتی ، صبح حمام ہی جگاتا ہے ۔ کہیں پر یاں نہیں جگاتیں" وہ بولے ۔

"آج کل تو تقریباً میں ہر روز انہیں دیکھتا ہوں — اُسی موڑ پر ۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا کرتی ہیں — اور — !"

"بھئی تمہاری بھی حالت ہے ۔ جو اتنی گرمیوں میں محبت کر لیتے ہو ، مجھے تو ان دنوں محبت کا نام سنتے ہی پسینہ آ جاتا ہے ، میری مانو تو اس اپنی محبت کو کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دو ، تین چار مہینوں کی بات ہے ۔ موسم خوشگوار ہو جائیگا ۔ تب جو مرضی آئے کرنا ۔"

میں نے ایک سرد آہ بھری ، اور چھت کی طرف دیکھ کر کہا "شجی تم کیسی کیسی باتیں کر رہے ہو آج ؟ محبت بھی کہیں ملتوی ہوتی ہے بھلا ؟ —

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ ۔ کہ لگائے نہ — !"

"میرا ذاتی خیال تو یہی ہے ۔ کہ ایک تندرست انسان کو محبت کبھی بھی کرنی نہیں چاہیئے ۔ آخر کوئی تک بھی ہے ۔ اس میں کہیں ؟ خواہ مخواہ کسی کے متعلق سوچتے ہو ، چاہے وہ تمہیں جانتا بھی نہ ہو ۔ بھلا کس فائدے سے یہ ثابت ہوتا ہے ۔ کہ جسے تم چاہو ۔ وہ بھی تمہیں چاہے ، میاں یہ سب من گھڑت قصے

ہیں۔ اگر جان بوجھ کر خبطی بننا چاہتے ہو تو بسم اللہ کھیلا کرو محبت۔ ہماری رائے تو یہی ہے۔ کہ تم صبر ہی کرلو "

مجھے غصہ آگیا۔ یہ شخص ہمیشہ ہی مسخرا بنا رہتا ہے۔ میں نے جھلا کر کہا۔

"تم بالکل خشک انسان ہو، بلکہ گرم خشک ہو۔ بالکل چیز، ہمارے قسم کے تم سے ایسی باتیں کرنی فضول ہیں، تم یہ ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔

— اور تم بہت سمجھ سکتے ہو مولینا یہ باتیں اوروں کو سمجھ سکتی ہیں، انہیں نہیں سمجھتیں۔ ایک چھ فٹ کے تندرست انسان کو کوئی حق نہیں کہ وہ محبت کرے اور اس صورت میں جب کہ وہ صبح سے شام تک ورزش کرتا رہے۔ تمہاری صحت ہرگز محبت کرنے کے قابل نہیں تم تو جاکر ورزش کرو۔ میں غصے سے تلملا اٹھا۔ اور بغیر ایک لفظ کہے واپس چلا آیا۔

یکایک وہ خاتون غائب ہوگئیں، اگلے ہفتے پتہ چلا کہ پرنسپل صاحب کا تبادلہ ہوگیا ہے۔ اور وہ خاتون واقعی اُن کی صاحبزادی تھیں۔ مجھے تو بڑا افسوس ہوا۔ سارا دن غمگین بیٹھا سوچتا رہا۔ اگر یہ پتہ ہوتا کہ یہ اُن کی صاحبزادی ہیں۔ تو یوں ہاتھ پہ ہاتھ نہ دھرے بیٹھا رہتا۔ اور اب تو وہ سب کہیں دور چلے گئے ہونگے۔ رشی کے پاس گیا۔ ساری بات بتائی، پوچھا اب کیا کیا جائے۔

وہ بولے۔ بھلے آدمی، عقل کے ناخن لے، نہ کبھی بات کی تھی نہ کچھ، خواہ مخواہ افسوس کرنے سے فائدہ، دنیا بہت وسیع ہے۔ اور اتفاق بھی ہوتے رہتے ہیں کیا پتہ کل تجھے اور چیز نظر آجائے۔ اُس سے بہتر۔ باقی رہا تبادلہ سو اس پر کسی کا زور نہیں، دنیا کا دستور ہے، ہم نے صبر کیا تو بھی صبر کر — انا اللہ — ؟

"آہ پرنسپل صاحب!" میں ایک سرد بھری، اُن دنوں میں سرد آہ بڑی آسانی سے بھر سکتا تھا۔ بڑی مشق تھی۔

"اب آہ پرنسپل صاحب یا ہائے پرنسپل صاحب کوئی فائدہ نہیں پرنسپل صاحب کی ذات سے تجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے وہ کچھ اتنے دور بھی نہیں گئے، اور بیٹا اگر تو اُن کی نگاہوں میں آگیا ہے۔ تو وہ تجھے ہرگز نہ بھولیں گے اور شاید کبھی یاد ہی فرمالیں "

میں سوچنے لگا — شاید یاد فرمالیں۔

* * * * * * * * * * * *

اور سچ مچ اُنہوں نے یاد فرمایا۔ اور یاد بھی کس پیار سے کیا؟ مجھے یقین نہ آتا تھا۔ اُنہوں نے سچ مچ کا پیغام دیا۔ وہ اس خاکسار کو دامادی کا شرف بخشنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے تاریخ لکھی تھی، مجھے بلایا تھا، غالباً انٹرویو کے لئے۔

* * * * * *

میں بہت خوش ہوا، اُس روز میں خوب اکڑ اکڑ چلا، مٹھیاں بھینچ کر، سینہ نکال کر، میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اب بہت جلد اُن کا خاتون کا اچھی طرح سے منہ چڑاؤنگا۔ اور انہیں سلام کا جواب بھی باضابطہ دینا پڑیگا۔ میں ایک لمبا تڑنگا ذمہ دار اور عقلمند لڑکا ہوں، لوگ مجھے بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ تب ہی تو پرنسپل صاحب محض دو تین مرتبہ دیکھنے کے بعد اتنے متاثر ہوگئے۔ ورنہ رشی بھی تو ہیں، سانولے رنگ کے۔ اُوٹ پٹانگ قسم کے انسان، بھیاں کے چہرے پر نزاکت ہے نہ کچھ اور، بالکل کورے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں تو کسی نے پسند نہیں کیا۔ شاید پرنسپل صاحب اُس دن مجھے لڑتا دیکھ کر خوش ہوگئے۔ انہوں نے ضرور میرا نام اخباروں میں پڑھا ہوگا، بس یہ مرعوب ہوگئے ہیں، ولایت میں کھلاڑیوں کی وہ قدر ہوتی ہے کہ بس! کیا سپورٹ مین کی طرح ہی سمجھا انہوں نے واللہ! اور پھر میں ہوں کس سے کم، ایم۔ اے کا طالب علم ہمیشہ چوٹی کے لڑکوں میں شمار ہوتا ہوں۔ یوں چٹارخ سے ایم۔ اے پاس کر دونگا۔ پھر مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں گے — آہا!!

پھر دوگوں کو پتہ لگے گا۔ کہ میں محض ایک کھلاڑی ہی نہیں ہوں، میری شخصیت بھی کوئی چیز ہے۔ مجھ میں بہت سے اچھے اچھے گن ہیں، جن کے سامنے پرنسپل صاحب جیسے نقاد نے بھی ہتھیار ڈال دئے۔

خیر صاحب! میں نے تیاریاں شروع کر دیں، پانچ چھ روز کے بعد مجھے جانا تھا۔ سوچ سوچ کر ساری گفتگو کی سکیم بنائی کہ آخر یا وہ کیسی کیسی باتیں کریں گے

میں اصلاح کے وہ فرائض کن جواب کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے سامنے گھبرانے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا سیدو تمہیں کبھی گھبراتے ہیں کیا۔

شمی نے بڑی بے تمیزی دکھائی وا اُنہوں نے مبارکباد کہہ دی آؤں غاؤں کر کے ٹال گئے۔ میں نے سوچا رشک آرہا ہے جناب کو جس شہر میں پرنسپل صاحب رہتے تھے۔ وہیں اتفاق سے شمی کو بھی جانا تھا۔ وہاں ان کے کوئی عزیز تھے۔ بولے کہ چلو تمہیں ساتھ لئے چلیں، ہم دونوں اکٹھے روانہ ہو گئے۔ میں نے جامنی والا ایک بہت اچھے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، اور ویسے ہی رنگ کی ٹائی بہت ڈھیلی تھی۔ ہاں کالر کچھ تنگ تھا۔ اس کا ایک سخت سا حصہ بری طرح میری گردن میں چبھ رہا تھا۔ میری گردن بالکل اکڑی ہوئی تھی۔ ذرا بھی ہلا نہ سکتا تھا۔ بار بار اسے ڈھیلا کرتا۔ اور وہ پھر گردن میں پیوست ہو جاتی۔

شمی بولے۔ اگر میں تیری جگہ ہوں تو اس کم بخت کو پھینک دوں ایک طرف۔ آخر کس حکیم نے کہا ہے۔ کہ ضرور ہی ٹائی باندھی جائے۔ میں نے یہی سوچا کہ تمک سے چل رہے ہیں۔

"اور اپنی طرف سے دل میں خوش ہو رہا ہو گا، بڑا تیر مارنے جا رہا ہے۔" وہ بولے۔ اور میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ میں شمی کے ہاں ٹھہرا۔ اگلے روز مجھے انٹرویو کے لئے جانا تھا۔ میں لباس کا انتخاب کرنے لگا۔ شمی کی رائے لی۔ وہ بولے "کچھ پہن لے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"فرق کیوں نہیں پڑے گا۔ میرے خیال میں تو یہ دھاریوں والا سوٹ اور یہ بو سب سے اچھی رہے گی۔"

"تو خواہ نیکر پہن کر چلا جا یا تہمد باندھ لے، اب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"آخر کیوں نہیں پڑے گا فرق؟ وہ مجھے دیکھیں گے۔ لباس کی تمیز بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"اونہہ! دیکھیں گے، جیسا وہ تجھے دیکھ بھی چکے، اور اگر تو اب نہ بھی آتا۔ تب بھی یہ نشست تیری ٹھہر جاتی۔"

"تو گویا مجھے تفریحاً بلایا گیا ہے۔"

"یقیناً!"

"شمی تم ایک نڈر دو رخے اور چڑچڑے انسان ہو، پہلے مجھے خیال تھا کہ تمہیں رشک آرہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ تمہارا حسد سے برا حال ہے۔"

اور انہوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"آخر ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں؟" میں نے پوچھا۔

"پرنسپل صاحب کو جو کچھ چاہئے تھا وہ تمہارے ہاں موجود ہے۔ تمہارے ابا کی تنخواہ بہت ہے۔ تمہارے ہاں اچھی سی کار ہے۔ تمہاری جائیداد بھی ہے۔ بالکل مختصر سا کنبہ ہے، بس ان سب باتوں کی جانچ پڑتال کے بعد پرنسپل صاحب راضی ہو گئے ہیں۔ اور تم خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔" وہ بولے۔

"لیکن کار تو ابا کی ہے، اس میں میری کیا خوبی ہے بھلا؟"

"جو کچھ بھی سمجھ لو، لیکن انہیں تو یہی چاہیئے تھا۔"

"اور اگر یہ سب باتیں ہم میں نہ ہوتیں تو؟" میں نے دریافت کیا۔

"تو یہی کہ تم خواہ لاکھ بازی کرتے۔ تیر سے نہیں کیوں کی گنتری جیت لیتے، ایم۔ اے چھوڑ کر کچھ اور بھی کر لیتے — تب بھی تمہیں کوئی نہ پوچھتا۔"

"جھوٹ ہے" میں نے جوش سے کہا "بھلا ابا کی چیزوں کا مجھ سے تعلق؟ میرے پاس تو اپنی قابلیت ہے، بلند ارادے ہیں، ہمت ہے —!"

"تمہارے پاس سب کچھ ہو گا، لیکن یہ رشتہ محض کار وغیرہ کی وجہ سے ہو رہا ہے — کوئی نئی بات نہیں عموماً یونہی ہوا کرتا ہے۔"

مجھے غصہ آیا۔ جی چاہا کہ شمی کی ناک کاٹ کر رکھ دوں، یہ یونہی انٹ سنٹ ہانک رہا ہے۔

"پرنسپل صاحب ایک بہت بڑے عالم ہیں، بہت وسیع خیالات کے انسان ہیں، تم ہدایت فضول الزام لگا رہے ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے محض میری خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"خیر بھئی اگر تم یہی محسوس کرتے ہو گے"

بیکھ پھر غصہ آگیا۔ "آخر کیا ثبوت ہیں تمہارے پاس ؟"

"ثبوت ؟ — ثبوت یہی کہ کل پرنسپل صاحب سے اپنے گھر کے متعلق ذرا اکڑی اکڑی باتیں کر کے دیکھو پھر پتہ چل جائیگا"

"اور جو تمہارا نظریہ غلط رہا تو ؟"

"تو جو چاہے سزا دو میری سزا عمر بھر تمہیں ایک نصیحت کر جاؤں تو نام بدل دینا"

میں سوچنے بیٹھ گیا۔ تمہارے گھر کو غلط باتیں بتا دوں۔ لیکن اسکے نتائج نہ جانے کیسے برآمد ہوں، کہیں پتہ چل جائے۔ اور کان مروڑ دئے جائیں۔

"پرنسپل صاحب تمہارے ہاں آئے ہونگے ؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں صرف چچا جان سے ملے تھے، وہ سرسری طور پر"

ذرا سی مزید بحث کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ کل پرنسپل صاحب کو غلط باتیں بتاؤنگا، یقین تو مجھے پختہ ہے کہ وہ ان باتوں کا اتنا سا بھی خیال نہیں کریں گے وہ مجھے پسند کرتے ہیں۔ بھلا اس میں موٹر، تنخواہ، اور جائداد کا کیا سوال ؟

شبی مجھ سے ہاتھ ملا کر بولے۔ "آزمائش شرط ہے"

شام کو مجھے اُن کے ہاں جانا تھا، میں نے وہی دھاریوں والا سوٹ پہنا، بھڑکدار ٹائی لگائی جس نے میری گردن کو جکڑ کر رکھ دیا۔ پرنسپل صاحب نے اپنی کار میرے لئے بھیجی۔ میں نے شبی کو بھی ساتھ گھسیٹا۔ کہ چلو مولینا تم بھی یہ تماشا دیکھ لو۔

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا، شبی بہانے سے اُن کی لائبریری میں گھس گئے۔ جو ساتھ ہی تھی۔ میں بڑی حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا تین بیڈ لیمپ رکھے تھے، ایک کام کا ہو گا، دو شاید بگڑے ہوئے ہونگے۔ چھوٹے چھوٹے کتے، بلیاں، طوطے، بت، عجیب و غریب تصویریں۔ کارنس، میزیں، الماریاں، سب کی سب ایسی ایسی چیزوں سے لدی ہوئی تھیں، لیکن صاف پتہ چلتا تھا۔ کہ یہ سب کچھ آج ہی رکھا گیا ہے۔

خوشبو کی ایک زبردست لپٹ آئی اور پرنسپل صاحب داخل ہوئے۔ ایک بہت ہی چمکیلے سوٹ میں ملبوس، بال بہت اچھے بنائے تھے۔ بلا استری کئے گئے تھے۔ اُن کی دونوں نوکدار بڑھیا مونچھیں بجلی کی تیز روشنی میں شعاعوں کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ وہ حسبِ معمول چھت کی جانب اشارہ کر رہی تھیں۔ جیسے کسی ٹائم پیس میں گیارہ بجکر پانچ منٹ ہوئے ہوں۔ نہ جانے اُنہوں نے "روغن مونچھ" استعمال کیا تھا یا کوئی خاص "مونچھ کریم" لگا کر آئے تھے۔

مجھے دیکھ کر تو وہ جیسے آپے سے باہر ہو گئے۔ مسکرائے، ہنسے، چلائے، میرے ہاتھ کو دس ہارس پاور سے یوں بھینچا کہ جیسے توڑ کر ہی دم لینگے۔ اُن کا میک اپ دیکھ دیکھ کر میں حیران ہو رہا تھا، بھلا یہ انٹرویو کس کا ہو رہا تھا میرا یا اُن کا ؟

بولے "اب کم از کم ایک ماہ تو تم یہاں ضرور ٹھہرو گے، نہیں ! — واہ یہ بھی کوئی بات ہے، نہیں جانے کون دیتا ہے میں کوئی بہانہ نہیں سنونگا۔ غیر حاضری لگیگی ؟ — لگ جائے، کیا پرواہ ہے ؟ کھیلنے کے لئے یہاں بے شمار کلب ہیں، کرکٹ ہے، باکسنگ ہے، ٹینس ہے، سب کچھ ہے" وغیرہ وغیرہ۔

جس تیز رفتاری سے وہ باتیں کر رہے تھے، میں اُن سے مرعوب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کم بخت شبی مجھے بُری طرح چھبدی تھی میں منہ سے ٹھیک کہنے سے تنگ آ چلا تھا۔ "میں نے فلاں جگہ تمہیں کھیلتے دیکھا، فلاں ڈرامہ دیکھا جس میں تم نے ہنسا ہنسا کر لوگوں کے پیٹ میں بل ڈال دیئے، فلاں پروفیسر تمہاری بڑی تعریف کر رہے تھے۔ اخباروں میں کتنی مرتبہ میں نے تمہارے متعلق پڑھا۔ خوب ! تو تم ایم۔ اے کا امتحان دے رہے ہو، ہم نے تمہاری لیاقت کی شہرت بھی سنی ہے۔ یہ ساری خوبیاں تم میں اکٹھی کیسے ہو گئیں ؟ ایم۔ اے کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے، اور پھر ذہین لڑکے تو کھیلے میں جو ذرا پیچھے ہی ہوتے ہیں۔ نہ جانے تم یہ سب کچھ کس طرح کر لیتے ہو ؟"

اُنہوں نے جوش میں آکر میرے کندھے مسل ڈالے۔

میں نے دل میں کہا کہ یہ بالکل جھوٹ بولتے تھے، پرنسپل صاحب تو میری خوبیاں ہی بیان کر رہے ہیں! بھلا انہوں نے ہمارے گھر کے متعلق بھی پوچھا ہیں مجھے شرمندہ ہونا چاہیئے، توبہ توبہ کیسی کیسی فضول باتیں میں ان کے متعلق سوچتا رہتا ہوں — استغفراللہ!

"کم از کم ایک ماہ یہاں رہوگے، مجھے تو دن بھر میں فقط دو مرتبہ کار کی ضرورت پڑتی ہے۔ دن بھر یہ یونہی کھڑی رہتی ہے۔ تم اب اسے خوب لیئے پھرا کرنا۔ یہ کار کیسی ہے — یہی جس میں تم آئے ہو — بیوک کا نیا ماڈل ہے۔ پہلے ہمارے ہاں شاندار تھی وہ اچھی رہتی۔ جی چاہا کہ نئی بیوک لے لوں، مسٹر ڈار کی تیکر پر بھی میرا دل للچایا، چھوٹی سی مدھ والی کار ہوتی ہے۔ لیکن آخر کار یہی لے لی۔ تمہیں کیسی لگی؟ — بھلا تمہارے ہاں کونسی کار ہے؟"

میں چونکہ پڑا، سوچ رہا تھا کیا کہوں، اور مجھے زور سے ہچکی آئی، میں نے جلدی سے اُسے ٹھیک کیا پھر عجیب سا منہ بنا کر کہا "ہمارے ہاں؟ — ہمارے ہاں تو کوئی کار نہیں۔"

"کوئی کار نہیں؟" وہ چیخ کر بولے "کیا سچ مچ کوئی کار نہیں؟"

"جی نہیں، — ہمارے ہاں کوئی کار تھی ہی نہیں، البتہ زمینوں پر چند اونٹ ضرور ہیں"

"لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا کہ تمہارے ہاں کار ہے" وہ چلا کر بولے۔

انہوں نے یوں منہ بنایا کہ جیسے بچے کڑوی چیز کھا کر بنایا کرتے ہیں۔

"ابی یونہی کسی نے غلط بتا دیا ہوگا" میں نے کہا۔

اُن کی دونوں تنی ہوئی تاؤ شدہ مونچھیں یکلخت ڈھیلی پڑ گئیں اور اب وہ ایک دوسرے سے بالکل خطِ مستقیم بنا رہی تھیں — جیسے گھڑی کی دو سوئیاں سوا نو بجے ہوتی ہیں۔

"آپ خاموش ہو گئے" میں نے مودبانہ عرض کیا "کیا ہوا کار ہوئی نہ ہوئی اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟"

"ہاں! ہاں! کوئی بات نہیں۔ وہ تو یونہی میں پوچھ رہا تھا۔ لیکن مجھے — مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تمہارے ہاں کار ہے۔ خیر!"

اب اُن کا جوش و خروش کچھ کم ہو گیا تھا۔ اپنی انگلیاں چٹخانے لگے۔ پھر بولے۔

"آج کل ابا کہاں ہیں؟"

"پنشن ہو گئی ہے اُن کی، کشمیر گئے ہوئے ہیں۔" حالانکہ پنشن ملنے میں ابھی نہ جانے کتنے سال باقی تھے۔

"اوہ! پنشن پر ہیں، لیکن مجھے کسی نے کہا تھا ابھی سروس میں ہیں"

"یونہی کسی نے کہہ دیا ہوگا" میں بظاہر لاپرواہی سے بولا۔

پرنسپل صاحب نے پھر بہت بڑا منہ بنایا۔

"ہاں تو خیر ہے — لیکن — تو تمہاری زمینیں کہاں ہیں؟"

"ہماری زمینیں؟" میں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں ہاں! تمہاری زمینیں!"

"اچھا! ماموں جان کی زمینوں کا ذکر ہو رہا ہے، دراصل وہ ہماری نہیں ہیں، ساری جائیداد ماموں جان کی ہے۔ آپ نے غلط سنا ہوگا"

"وہ زمینیں بھی تمہاری نہیں!" وہ چلا کر بولے "غضب خدا کا، تو کیا سچ مچ وہ کسی اور کی ہیں؟"

"جی ہاں! سچ مچ! اللہ جانے کس نے آپ کو ساری باتیں غلط بتا دیں؟"

"لاحول ولا قوۃ! کار والی بات بھی غلط، سروس والی بھی غلط، جائیداد والی بھی غلط۔ لاحول ولا ——!"

"میں اس مرتبہ ایم اے کے امتحان کی تیاری ——!" میں نے شروع کیا۔

"لاحول —— ابھی ایم اے کے امتحانوں میں پڑے ہوئے ہیں، اسے چھوڑو، تمہارے چھوٹے بھائی کہاں ہیں آج کل؟"

"کون سے چھوٹے بھائی کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟" میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"لاحول ولا —— تمہارے چھوٹے بھائی کا ——!"

"جناب ہم کل آٹھ بھائی ہیں!" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

انہوں نے ایک چیخ ماری، "آٹھ بھائی ہیں؟ لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا کہ —— کہ —— دو دو سے، تو گویا سچ مچ آٹھ بھائی ہیں —— اور کار والی بات بھی غلط ہے ——؟ لاحول ——!"

پرنسپل صاحب کا چہرہ دفعتاً اتر گیا۔ اب اُن کی چمک دار مونچھیں نرم ہو گئیں۔ اور یک لخت ڈھلک سی گئیں، جیسے گھڑی کی سوئیاں آٹھ بج کر بیس منٹ پر ہوتی ہیں۔

"تو گویا مجھے بالکل غلط باتیں بتائی گئی ہیں مجھے یقین نہیں آتا —— لاحول ولا —— سچ مچ تمہارے ہاں کار نہیں ہے؟ عجب تماشہ ہے —— مجھے تو بڑے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ ——!"

"قبلہ گستاخی معاف! آپ پانچ منٹ میں سات آٹھ مرتبہ لاحول پڑھ گئے ہیں ——!"

"او ہو! مجھے خیال نہیں رہا۔ لیکن سوچو تو سہی ذرا، سب کی سب باتیں غلط بتائی گئیں۔ میں نے تو کتنی مرتبہ سنا ہے کہ تمہارے ہاں ایک خوبصورت سی کار ہے۔"

اب میں بالکل سنجیدہ ہو چلا تھا، پرنسپل صاحب نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ اب مجھے اُن کا اتنا سا بھی ڈر نہ تھا۔ اور وہ جو چھوٹی موٹی سی محبت اُن خاتون کی تھی وہ بھی اب ختم ہو رہی تھی۔

میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا، "آپ بُرا نہ مانیے۔ دیکھئے آپ نے مجھے بلایا ہے۔ مجھے ملاحظہ فرمانے کے لئے۔ آپ مجھ میں نقائص نکالئے۔ بھلا آ جان کی کار ہو یا اُن کی جائداد ہو، تو اس سے میری خوبیوں میں تو کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ میں ایم۔ اے کا امتحان دینے والا ہوں، ضرور پاس ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد بیسیوں مقابلے کے امتحان ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے مجھے ذہین کہا ہے، میرے ارادے بلند ہیں، مجھ میں خدا کے فضل سے بہت استقلال ہے۔ آپ میرے پرانے سرٹیفکیٹ دیکھ لیجئے۔ اچھا خاصا کھیل لیتا ہوں، صحت بھی بہت سوں سے اچھی ہے۔ اور وہ ——!"

"ہاں ہاں یہ سب ٹھیک ہے۔ خدا کرے تم کامیاب ہو جاؤ، لیکن مجھے تو ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ تمہارے ہاں کار بھی ہے۔ اور اچھی خاصی جائداد بھی —— ویسے تم بھی سچ کہہ رہے ہو، لیکن وہ کار —— یعنی کہ —— مجھے سچ مچ غلط بتایا گیا ہے"

"آپ کار کا ذکر بار بار کرتے ہیں، سو میں بھی یہ عرض کرتا ہوں کہ میں چند ہی سالوں میں ایک چھوڑ دو کاریں لے لوں گا اور وہ میری ہوں گی۔ آپ کچھ متعلق بھی تو کچھ باتیں کیجئے۔ آپ نے اکثر اخباروں میں میرے بارے میں پڑھا ہو گا"

"اُسے چھوڑو، ایک طرف! کھیل کود بے کار چیز ہے، یہ ڈراما وغیرہ مسخروں کا کام ہے۔ باقی رہا ایم۔ اے میں پڑھنا سو یہ بھی ایک معمولی سی بات ہے لاکھوں لڑکے ایم۔ اے میں پڑھتے ہیں" وہ بیزار ہو کر بولے۔

"لیکن جناب میرے پاس حوصلے ہیں، امیدیں ہیں، مستقل مزاجی ہے، مضبوط ارادے ہیں ——!"

"ہوں گے! —— خدا کرے ہوں —— ! نہ جانے مجھے یہ باتیں کیوں غلط بتائی گئیں، اگر کہیں مجھے پہلے پتہ چل جاتا کہ تمہارے ہاں کار نہیں تو —— تو بہتر ہوتا"

اسکے بعد وہ کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلے، انہوں نے ایک سگریٹ پیدا کیئے ہی کیئے، کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہتے، یہی چار مرتبہ دیکھا بھی۔ دیر تک اسی طرح مراقبے میں رہے۔ پھر بولے۔ "میں کل کہیں باہر جا رہا ہوں۔ بڑا ضروری کام ہے۔ کئی روز تک نہ آسکوں گا۔ تم یہاں اکیلے شاید اداس ہو جاؤ گے۔ ویسے تمہارا ارادہ کب ہے واپس جانے کا؟"

"چلا جاؤں گا — !"

"میں کم از کم ہفتہ بھر باہر رہوں گا۔ یہاں تنہا ہو گے۔ اس سے تو بہتر ہی کیا جاؤ گے۔ پھر تمہاری غیر حاضریاں بھی تو ہو رہی ہوں گی — اچھا تو بہت دیر ہو گئی، کہو تو موٹر نکلوا دوں۔ ویسے رستہ لمبا تو نہیں ہے، کل دس پندرہ منٹ کا ہے، میرے خیال میں پیدل بہتر رہے گا — اچھا — !"

انہوں نے ایک ڈھیلا ڈھالا سا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا، بالکل سرد اور بے جان ہاتھ۔ ہاتھ ملا کر بلکہ ہاتھ چھڑا کر میں نے مودبانہ سلام عرض کی اور چل پڑا۔

دروازے سے جو مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہ دونوں تو کمرے ہی سے بالکل غائب ہو رہی تھیں۔
پرنسپل صاحب کی بڑھیا گھڑی میں ساڑھے چھ بج چکے تھے!

دروازے پر پہنچے، ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے، بُڑھیا ایک مرتبہ پھر چیخی، اس دفعہ میں نے اُسے نوچ کر پرنسپل صاحب کے پلاٹ میں پھینک دیا۔

کوٹھی کے دروازے پر پہنچ کر ایک زبردست فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اور مجھے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا، ہم کتنے زور سے ہنسے؟ — اس کا تو اندازہ نہیں البتہ آس پاس کے درختوں پر جتنے پرندے بسیرا لے رہے تھے۔ وہ سب کے سب اُڑ گئے۔

• • • • • • •

ان باتوں کو ایک عرصہ گزر گیا ہے، اب کسی موڑ پر کسی موٹر کو دیکھ کر میں ہرگز نہیں ٹھہرتا، کسی ریشمی خاتون کو دیکھ کر اگر میرے بالوں پر مکھی بیٹھی ہو تب بھی نہیں اٹھاتا۔ نہ کبھی کسی کو جان بوجھ کر سلام کرنے کی کوشش کرتا ہوں، رات کو ہمیشہ بھوک رکھ کر سوتا ہوں۔

اور جب کبھی کھیل کود کے بعد تھک کر شام کو کوچ پر پڑا ہوتا ہوں۔ تو آنکھیں مندنے لگتی ہیں، مجھ پر غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے، پرانی یادیں تازہ ہونے لگتی ہیں۔ نظروں کے سامنے سیاہی اور سفیدی کے ٹکڑے ناچنے لگتے ہیں، کچھ تصویریں بن جاتی ہیں۔ پھر وہ متحرک ہو جاتی ہیں۔
تب سامنے رکھے ہوئے ٹائم پیس کے گرد ایک ہالہ بن جاتا ہے،
ساڑھے چھ بجے ہیں، وہ ایک جوڑی بڑھیا، نوکدار، چلبلی، "نا وابستہ شدہ" سوئیں یاد آجاتی ہیں۔ جن میں پہلے گیارہ بج کر پانچ منٹ تھے۔ پھر سوا نو بجے، اور اسی طرح آخر میں ساڑھے چھ بج گئے تھے۔

کرنیں

شفیق الرحمٰن کے مسکراتے ہوئے رومانی افسانوں کا حسین و جمیل مجموعہ ہے جن میں جدت ہے، حقیقت نگاری ہے جنہیں بار بار پڑھنے پر بھی جی نہیں بھرتا۔ جس میں ہر پڑھنے والے کو اپنی داستان حیات کے ورق بکھرے ملیں گے

اس مجموعے میں وہ افسانے بھی شامل ہیں۔ جو ملک کے ممتاز رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، انکے علاوہ چند غیر مطبوعہ افسانے بھی شریک ہیں۔
شکست، فاؤسٹ، باولز، ایک شام، لیڈی ڈاکٹر، گرمیوں کی چھٹیاں۔ وسعت، دو تارے، فلاسفر، نسرین وغیرہ
کتاب کا دیباچہ ملک کے نامور نقاد اور شاعر پروفیسر فیض احمد فیض نے لکھا ہے
مکتبہ اُردو لاہور

ملک راج آنند

دُودھ

"بکھڑے ہو تو ایک فرلانگ ہے، بیٹھ جاؤ تو دو میل اور کھانے لگو تو چار میل"۔ بسنتو بولی۔

"مجھے میں آدمی کسی کی نہیں سنتا"۔ ہیرو نے کہا۔ اور بے چینی سے وہ لالہ نانک چند حلوائی کی دوکان سے چند گز کے فاصلے پر دودھ کے برتنوں کو اپنے آگے رکھ کر بیٹھ گئیں اور پہاڑی برفیلی ہوا سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنے پھٹے ہوئے رنگدار چیتھڑے کو اچھے گرد اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔

وہ چرواہا عورتیں تھیں۔ جو اوپر کی پہاڑ کی گھاٹی سے جہاں وہ درختوں کے نیچے ایک چھوٹی سی بستی میں رہتے ہیں، چل کر آئی تھیں۔

"ہاں، اُس نے اُس بہرے کی شکر کھا لی۔" بسنتو نے نفرت کے ساتھ کہا اور اُسکے چہرے کی جھریاں سمٹ کر ایک بھدی سی گرہ بن گئیں۔

"شکر کی اُس کے ہاں کیا کمی ہے۔" ہیرو نے جلیبیوں، برفیوں اور گھمن بڑوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جو نانک چند حلوائی کی دوکان پر قطار در قطار رکھے ہوئے تھے۔ بھوکے آدمیوں کی للچائی ہوئی نظروں اور مکھیوں کے لئے کھلے ہوئے۔

"بھوکے آدمی کے لئے کھانا کیا، اور نیند کے ماتے کے لئے تکیہ کیا؟" بسنتو بولی۔ "میری بچی ہماری قسمت میں نعمتیں نہیں لکھیں۔ ابھی اُس دن ہی جب میں نے تمہارے بھائی کے لئے نانک چند سے ذرا سی برفی مانگی تھی تو وہ کہنے لگا، ایک روپیہ سیر، لو کے آنے کی دوں؟ اور میں اپنا سا منہ لے کر چلی آئی۔ کیونکہ ایک دفعہ کھانے لگو تو پھر بغیر پورے روپے کی کھائے منہ چپنا بند نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو اپنے لڑکے کا منہ میٹھا کرنے کو ذرا سی مانگی تھی۔۔۔۔"

"میں تو یہ بھی بھول گئی کہ مٹھائی کھاتے کیسے ہیں، مدتیں ہو گئیں جو میں نے شکر کی ایک ڈلی بھی چکھی ہو۔" ہیرو بولی۔

"آج ہم مزدور تھوڑی سی مٹھائی لینگے، آج میں کچھ زیادہ دودھ لائی ہوں۔"

"چلو چلو، مجھے اپنا دودھ دکھاؤ، بسنتو، ہیرو، چلو جلدی کرو" نانک چند نے کہا: "صاحب چائے کے لئے انتظار کر رہے ہونگے، تمہیں پتہ نہیں صاحب لوگ بستر میں ہی ناشتہ کر لیتے ہیں۔"

"آؤ چاچی" ہیرو نے شوق سے کہا اور اُس نے اپنے جوان بازوؤں سے برتن کو سر پر اٹھا لیا۔

"او بی، بھاگی جا رہی ہے، ذرا مجھے سہارا تو دے" بسنتو بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ تجھے چاولوں کے کیک کھانے کی جلدی پڑی ہے، مگر ذرا اس بڑھیا کی بھی تو مدد کر۔ ویسے بھی مجھے ہی پہلے جانا چاہئیے۔ تو تو جب پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب سے میں نانک کو دودھ دے رہی ہوں"۔

"چلو چلو، جھگڑا نہ کرو۔" نانک چند زور سے چلایا اور اُس کے کانوں میں پڑی ہوئی سونے کی بالیاں کانپ کر رہ گئیں۔ ہیرو نے اپنے سر کے برتن کو جھکا کر بسنتو کو سہارا دیا اور پھر موقعہ پاکر اُس نے اپنے پلے کی گانٹھ کھول لی۔ جس میں وہ مٹھائی خریدنے کے لئے پیسے بچا بچا کر رکھتی رہی تھی۔ اور پھر اُس نے اپنا برتن اٹھایا اور نانک چند کی دوکان کے تختے کے قریب ٹھک گئی۔

"سیٹھ جی، ہمارا حساب کر دو" بسنتو نے برتن سر سے اتارتے ہوئے کہا: "کیونکہ اب ہم اپنے مویشیوں سمیت نیچے میدانوں میں جا رہے ہیں۔ یہاں تو اب جاڑا پڑنے لگا، کل ساری رات ہم بارش میں بھیگتے رہے۔ کیونکہ درختوں کے نیچے اتنا سایہ تو ہوتا نہیں کہ بارش سے بچا سکیں۔ اور پھر جانے سے پہلے ہمیں ملا کو گھاس چرانے کا کرایہ بھی دینا ہے، ورنہ ہم وہ ہمارے کپڑے اتروا لینگے ۔۔"

"تم یہیں مکان کیوں نہیں بنا لیتے"۔ نانک بولا۔

"ہم تمہاری طرح مالدار سیٹھ تھوڑے ہی ہیں۔" بسنتو نے جواب دیا۔

"اچھا کام ہوگا، اچھے پیسے پاؤگی۔" نانک بولا۔

"اچھے پیسے پائینگے، جبھی تو اچھا کام کرینگے۔" ہیرو درمیان میں بولی۔

"تم، تم تو لاکھ روپے کا مال ہو۔ تمہیں تو بغیر کام کئے پیسے مل سکتے ہیں۔"

"تم نے تو کبھی شکر کی ایک ڈلی تک نہیں دی۔" ہیرو نے ناز کے ساتھ اپنے سر پر آنچل ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم چاہتے ہو کہ ایک چوہے کا پیٹ بھر دو۔ مگر اس کی نیت نہ بھرے گی۔" بسنتو نے جیسے سیٹھ کے ہیرو کی طرف ہونے سے حسد ہو رہا تھا، بولی۔

"لو یہ دودھ تو سنبھالو، یہ سودا ہو رہا ہے یا چار دنوں کے لیکھوں کی باتیں۔ آج تمہارا نوکر کہاں ہے؟"

"ابے، کہاں چلا گیا، او منشا سنگھ!" نانک چند اپنی رانوں کو کھجاتے ہوئے چلایا۔

"آیا جی۔" ایک زرد رو سکھ لڑکے نے سر جھکا کر اور عاجزی سے اپنی ٹھوڑی کھسکا کر جواب دیا۔ "کڑاہی تو بالکل صاف تیار ہے۔"

"چل آ، ان کا دودھ لے کر کڑاہی میں ڈال —— ارے کہاں ہے کڑاہی؟"

اور جب منشی اپنی پسلیاں اور اپنے لمبے پھٹے پاجامے میں سے اپنے گھٹنے دکھاتا ہوا آیا تو نانک اپنے بھاری بھرکم جسم کو چکنی گدی پر سے اٹھا کر دکان کی کال کوٹھڑی میں پھنکتے ہوئے چلا گیا —— "میں تم دونوں عورتوں کے لئے کل کے بچے ہوئے دودھ کی کھرچن لاتا ہوں۔"

"کیوں، کیا بازار میں بکتے نہیں ہیں۔ جو تم بچی ہوئی کھرچن ہمیں دے رہے ہو۔ کبھی تم کوئی کام کی چیز بھی دیتے تو۔" بسنتو بولی۔

"او منشی، ہیرو کا دودھ صاحب لوگوں کے لے جانے کے لئے علیحدہ رکھ لے اور بسنتو کا کڑاہی میں ڈال دے۔" نانک نے واپس آتے ہوئے کہا۔

"لڑکے، پہلے میرا برتن خالی کر دے۔" بسنتو منشی سے بولی۔ "کیونکہ مجھے اپنے بچوں کے پاس واپس جانا ہے۔ دیکھو سورج ڈوبا جا رہا ہے، تو نے کبھی دن ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جانور باہر جانے کا انتظار کر رہے ہونگے۔ پھر مجھے ابھی تیرے مالک سے پیسے بھی لینے ہیں . . . . . ."

"بھکاری کے لئے ٹھہرنے اور چل پڑنے میں کیا فرق۔" ہیرو نے خاموش عاجزی کے ساتھ کہا۔ "پہلے میری چاچی کا دودھ لے منشی۔"

"ذرا بڑی ہو جا، چھوکری۔" بسنتو بولی۔ "پھر تجھے پتہ لگے گا کہ ٹھہرنے اور چل پڑنے میں کیا فرق ہے۔ جب غریبی میں کام کرنا پڑے گا، اور بچے پالنے پڑینگے۔ اب تو تو اپنے ماں باپ کی حرام کی روٹی کھاتی ہے، اور وہ خود تیری جوانی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر حرام کی روٹی کھاتے ہیں۔ میں تو اپنی بیٹی کو اس طرح بازاروں میں لوگوں کے گھورنے کے لئے کبھی نہ بھیجنے دوں نہ اس طرح ان دکانداروں سے جو تیرے جسم کی ایک لاکھ قیمت بتاتے ہیں، ہنسنے بولنے اور مذاق کرنے دوں۔ جوان لڑکی ذرا سوچ تو سہی، تجھے دنیا کو کیا ہوتا جا رہا ہے، ہمارے وقتوں میں تو . . ."

جب منشی بسنتو کا برتن دکان کے اندر لے جا رہا تھا تو ہیرو نے ایک زور کا ٹھیلکا سنا اور کہا —— "ہائیں!" اور پھر اس نے سیٹھ نانک چند کو پہلے ان کی بچی ہوئی کھرچن ایک پیتل کے برتن میں باہر لاتے ہوئے دیکھا۔

"ارے، دودھ ڈال چکو تو کڑاہی باہر لے آئیو اور تھرمامیٹر بھی لیتا آئیو۔" اس نے زور سے چلا کر لڑکے سے کہا —— "وہاں اندھیرے میں تجھے نظر کیا آئیگا۔"

"مجھے ایک آنے کی برفی دینا۔" ہیرو نے اپنے ہاتھ کے چار پیسے نانک کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"دو پیسے پھینک دے۔" نانک نے ایک پیسے جیسی سی احتیاط سے کہا۔ ترازو میں مٹھائی کو تولا اور ایک پتّے میں رکھ کر لاکر پتلے کی کنواری کی طرف پھینک دیا۔

منشی کڑاہی لے آیا تھا، اتنی وزنی چیز کو سنبھالنے میں اس کے جسم کی ایک ایک رگ پر زور پڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آخر وہ کڑاہی کو نانک کی چکنی گدی کے قریب انگیٹھی پر رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔

"میٹر کہاں ہے؟" نانک نے دروازے کے پیچھے چکنی گرد آلود دیوار پر اسے کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر اس نے ہانپتے ہوئے منشی کو حکم دیا۔ "چل، اب

اس دودھ کے ڈبے کو اس چمن میں ڈال لے، کیونکہ خالص ماں آ تا ہی ہوگا۔"

آخر کار اُسے سیٹر جل ہی گیا۔ پہلے اُس نے اپنے گولے پیر کو صاف کیا۔ پھر مٹھائی پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر آبے کو دودھ میں ڈبو دیا۔

"اب یہ دھوکا دینے پر اتر آئی نا، کیوں بسنتو؟"

"کیوں" بسنتو نے چلا کر کہا۔

"کیوں کیا گڑ بڑ ہے؟" ہیرو نے اپنے پھیل جانے والے آنچل میں مٹھائی کو باندھتے ہوئے کہا۔

ایک لحظہ نانک کے چہرے پر تفکر کے مصنوعی جذبات ظاہر ہوئے۔ اور اُس نے اپنے مکروہ چہرے کو اور بھی کریہہ المنظر بنا لیا۔ پھر وہ بولا۔

"دودھ میں پانی ملا رکھا ہے!" اور اپنی چہرے کو زبردستی غصے کی کانٹھ بناتے ہوئے اُس نے اپنے نوکر سے کہا۔

"دوسرا دودھ بھی لے آ، او منشی۔"

لڑکا وہ کڑھایا جس میں ہیرو کا دودھ تھا لے آیا اور نانک نے میٹر کو اُس میں ڈبو دیا۔

"کچھ دال میں کالا ہے" ہیرو اپنے دماغ میں اُس جھگڑے کا سلسلہ جو اُس نے نانک کی دوکان سے باہر آتے وقت سنا تھا ملاتے ہوئے اور بسنتو کے دودھ میں پانی کی آمیزش کی بات سوچتے ہوئے بولی۔

"اچھا دال میں کچھ کالا ہے" بسنتو پھوٹ پڑی: "دال میں کچھ کالا ہے، جو جیسا خود ہوتا ہے ویسا دوسروں کو سمجھتا ہے، کوا ہی کوے کی زبان سمجھتا ہے۔ کیسی باتیں بنا رہی ہے۔ رام کرے تو مر جائے، رام کرے تیرے کالی چیچک نکلے، باتیں کیسی بناتی ہے کہ میں بازار میں پانی ملا دودھ لاتی ہوں، کیسی ....."

"چاچی میں تمہارے خلاف تو کچھ نہیں کہہ رہی، تم مجھے گالیاں کیوں دے رہی ہو۔ دیکھو تو میرا دودھ بھی وہ دیکھ رہا ہے ....." نانک کی طرف مڑ کر اُس نے کہا۔ "کیوں سیٹھ جی میرے دودھ میں تو پانی نہیں ہے۔ میں نے تو خود گائے دوہی ہے۔"

"میں خوب جانتی ہوں تم کیسے دوہتی ہو،" اس سے پہلے کہ نانک ہیرو کے دودھ کے متعلق کوئی رائے دیتا بسنتو بولی۔ "میں خوب جانتی ہوں کہ دوہنے سے پہلے تم کیسے گائے کو خوب پانی پلا دیتی ہو۔ برتن میں پانی نہ ملاؤ تو کیا ہوا۔ تم میرے بچوں کے منہ کا نوالہ چھینتی ہو ——"

"ہاں،" نانک بولا۔ "یہ دودھ بھی بہت پتلا ہے، ضرور اس میں بھی کچھ ملایا گیا ہے، حالانکہ میٹر سے معلوم نہیں ہوتا۔"

"نہیں سیٹھ جی، ایسا نہیں ہو سکتا" ہیرو نے تردید کی۔ "بھگوان کی قسم، اپنے ماں باپ کی قسم اپنے پیاروں کی قسم میرے دودھ میں ذرا بھی پانی نہیں۔"

"اور میرے دودھ میں پانی ہے؟ اری کتیا کہیں کی ——" بسنتو چیخنے لگی: "رام کرے تیرا باپ مر جائے۔ اور تیری ماں رانڈ ہو جائے، رام کرے تو یتیم ہو جائے، رام کرے تم سب مر جاؤ۔ جب تم سب اس دنیا سے غائب ہو جاؤ گے۔ تو میں نانک کی دکان سے ساری مٹھائی خرید کر بانٹوں گی ——"

"ہوش میں آؤ چاچی،" ہیرو بولی۔ "تم میرا ہی گلا کیوں کاٹنا چاہتی ہو۔ یاد رکھو اکیلی سینک نہ جل سکتی ہے نہ چمک سکتی ہے، نہ روشنی دے سکتی ہے۔ مجھ سے کیوں لڑتی ہے، اس سے لڑ جو جھگڑا کروا رہا ہے؟"

"اگر مجھے جھگڑا کروانے والا کہا تو میں پولیس کو بلواؤں گا" نانک مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے بولا۔ "آپ تو جھگڑا کرتی ہیں، بیچ دودھ والیاں کہیں کی اور الزام دیتی ہیں مجھے، کیسی گستاخ ہیں؟"

"بلالے پولیس کو" ہیرو بولی۔ "میں تجھ پر تھوکتی ہوں، بسنتو چاچی کو کیا معلوم، میں جانتی ہوں تم اندر جا کر کیا کہتے ہو ....." اور غصہ کی وجہ سے وہ آگے نہ بول سکی۔ سیٹھ کی فریب دہی اور بدمعاشی پر اُس کا چہرہ تمتما اٹھا اور سرخ ہوگیا۔ وہ سازشیں جن کی وجہ سے اُس کی توند بڑھ گئی تھی اور اُس نے شہر میں ایک محل بنا لیا تھا۔ وہ چالاکیاں اُس نے خود ہیرو کو جب وہ اُس کا اعتبار اور جسم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بتا دیں تھیں۔ لیکن صدیوں کی غلامی اور خاموشی نے ابھی تک ہیرو کو کہنے سے باز رکھا تھا ...

"ہاں ہاں بسنتو چاچی کیوں جانے گی، جانتی تو تڑپ رہی ہے، بدذات کہیں کی تو قوا مد ہوائی ہے نا۔ اب باتیں بناتی ہے۔ مگر کوئی زبان چلا کر باتیں بتاتا ہے کوئی اپنے ہاتھ چلاتا ہے۔" اور یہ کہتی ہوئی وہ اپنے پنجے کھول کر سیرو کی طرف جھپٹی۔ اور اُسکے سر پر سے پُونڑ کر اُسکے بال کھسوٹنے لگی۔ اور اُسکے گلے میں اپنے ناخون گاڑھتے ہوئے چیخ چیخ کر چلاتی جاتی تھی — "میں جلتی لکڑی سے تیرے سر میں کنگھی کروں گی، کتیا کہیں کی، کُٹنی کہیں کی، زندگی میں تیرے سر پر چھپّا چھپّا پانی ڈالوں گی، میں تجھے زندہ کھا جاؤں گی۔۔۔۔"

منشی نے اُن کے بیچ پڑ کر اُنہیں علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر نانک بولا۔

"چھوڑ دے بے لڑکے، مرنے دے دونوں کتیوں کو — کھا جائے ایک دوسری کو جب تک تمہارا پیٹ نہ بھر جائے لڑو جاؤ، تمہاری گھریلو یاری ٹوٹ جائیں۔"

لیکن لڑکے نے بسنتو کو گھسیٹ کر دونوں عورتوں کو علیحدہ کر دیا۔ بسنتو اب بھی چلاتے جا رہی تھی — "میں اُسے اور اُسکے رشتہ داروں سب کو کھا جاؤں گی ایشور کی قسم میں کسی کو نہ چھوڑوں گی۔"

"تو کہا یا نہ کہا لیکن یہ جھگڑا جو بیٹھا ہے اس کا انجام تو بہت خوفناک ہے۔" بھیڑ میں سے تماشہ دیکھنے کو جمع ہو گئی تھی، کسی آدمی نے اُن کو چپ کرتے ہوئے کہا

"یہ صرف تمہیں بلانے کے لئے اکسایا جا رہا ہے۔" منشی نے اپنی آواز دبانے کے لئے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اُس نے ۔۔۔" مگر نانک اتنے فاصلے پر تھا کہ وہ سن نہ سکتا تھا اور دزدیدہ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اسے لڑکا یہ نہ بتا سکا کہ اُسکے مالک نے دودھ میں پانی ملا دیا تھا۔ اور اُس کی ساتھ والی کا مطلب دال میں کالا ہونے سے سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا۔ کہ اُسکو شبہ تھا کہ سیٹھ نے اندر جا کر کوئی چالاکی کی ہے۔

"اچھا سیٹھ میرا حساب کر دو۔" منشی کی سرگوشی سے سچائی کی ایک کرن اسپر ظاہر ہونے لگی تھی۔

"مکاری اور سیٹھ کی قیمت ایک نہیں ہوتی" نانک بولا۔ "مجھے کیا معلوم کہ تم نے مجھے اچھا دودھ دیا اور کب بُرا۔ حوالات میں جانے سے بچنے کے لئے مجھے تو پولیس کو رقم دینی پڑتی۔ اب اچھا ہے وہ سچے مجرموں کو پکڑ لینگے تم دونوں نے میرے نوکر اور ان سب آدمیوں کے سامنے ایک دوسرے کو مجرم بتایا ہے ۔۔۔"

"او سیٹھ نانک چند، بھئی انہیں پیسے دے کر جھگڑا پاک کرو۔" بھیڑ میں سے ایک ہمسایہ دوکاندار نے کہا۔

"ہاں ہاں، انہیں پیسے دے دو اور جانے دو۔" کسی دوسرے آدمی نے کہا۔

"نہیں نہیں، یہ چور ہیں۔" نانک بولا۔

"او چھوڑو بھی لالہ نانک چند، ترس کھاؤ جانے دو بچاریوں کو۔" پاس کے ایک پنساری نے دوکان پہ بیٹھے بیٹھے کہا۔

"اچھا کتیو!" نانک بولا۔ "میری طرف سے خیرات سمجھو کہ میں تم دونوں کو ایک ایک روپیہ دے رہا ہوں۔ میں چاہتا تو تمہیں پولیس کو دے دیتا ۔۔۔۔"

اور اپنے زنگ آلود آہنی بکس سے اُس نے ایک ایک روپیہ نکال کر دونوں کے آگے پھینک دیا۔

عورتوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک دوسرے سے جھگڑنے میں اُنہوں نے خود کو تھکا دیا تھا۔ اور اب اُن کو ضبط کرنے کا انہیں دم باقی نہ تھا

"چلو، بھاگ جاؤ یہاں سے، نہیں تو میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

"جاؤ جاؤ، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔" ایک مہربان ہمسائے نے کہا۔

"جاؤ جاؤ فقط آسامیوں کے لئے ضامن کی ضرورت نہیں۔" کوئی دوسرا بولا۔

اور انہوں نے آہستہ سے پیسے اٹھائے اور اپنا سا منہ لے کر چلی گئیں۔

مرتا ہوں اُن پہ اور جئے جا رہا ہوں میں
اس داستاں کو طول دئے جا رہا ہوں میں

[illegible]

سیف الدین سیف

ملاقات

یہ شبستانِ رنگ و بو اور میں — چاندنی رات، پھول تم اور میں
چھٹ گئے۔ انتظار کے بادل — ڈھل گیا روئے ناز سے کاجل
حسن تابانیوں میں ڈوب گیا — عشق حیرانیوں میں ڈوب گیا
کھلکھلائے لبِ شراب آلود — مسکرائی نگاہِ خواب آلود
دیکھ گلشن کا دامنِ زرکار — چاندنی کا گلوں پہ نقش و نگار
ہر نظر مستِ سرخوشی ہے دیکھ — ہر کلی پھول بن رہی ہے دیکھ
چاندنی میں نہا رہی ہے جھیل — ہے تہِ آب ماہ کی قندیل
جنبشِ زندگی کے ساحل میں — دھڑکنیں کائنات کے دل میں
ذکرِ فرقت کا بار بار نہ کر — دامنِ وصل داغدار نہ کر
بات جو ہو چکی ہے ماضی میں — رات جو کھو چکی ہے ماضی میں
جا چکی ہے عدم کو جانے دو — وقت کے ساتھ غم کو جانے دو
محفلِ عیش میں دھواں کیوں ہو — جو دیا بجھ چکا یہاں کیوں ہو
درد و غم کی حقیقتیں مت پوچھ — زندگی کی مسرتیں مت پوچھ
آج بیتے دنوں کا ذکر ہی کیا — آنے والے غموں کی فکر ہی کیا
لطفِ امروز پر نظر ڈالو — کل کے سائے نہ آج پر ڈالو
جانے والی سحر کا ماتم کیا — شام سے پہلے شام کا غم کیا
درحقیقت خزاں ہے خوفِ خزاں — اس طرح زندگی گزار یہاں
دل فریبِ حیات کھا جائے — غم نہ کھائے یہ بات کھا جائے
چھوڑ افسانۂ غم و شادی — دیکھ تصویر بن گئی وادی
دیکھ عنبر اڑا رہا ہے قمر — دیکھ چنبر ملا رہے ہیں شجر
جوئے نکہت ہوا میں رقصاں ہے — بوئے نغمہ فضا میں لرزاں ہے
دیکھ ہستی کے دودھیا مینار — گنبدوں کا نشیب تیرہ و تار
ہر تصور میں لرزشِ مستی — ہر قدم پر خیال کی بستی
چاندنی پتیوں سے چھن چھن کر — ناچتی ہے کنول کے پھولوں پر
وقت اپنا ہے رات اپنی ہے — آج یہ کائنات اپنی ہے
بے نیازی کو شرمسار نہ کر — وصل کی ساعتیں شمار نہ کر
شوق کی وسعتیں خدا معلوم — جوششِ آرزو سے کیا معلوم
فرصتِ عیش بے کراں ہو جائے — آج کی رات جاوداں ہو جائے

دلے، آئی آر۔ لاہور

پائی چنگ چیائی مترجم سراج الحق احمد نظامی

برما روڈ

اُس شاہراہ کی بنیاد کے کنارے، جس پر نیا فرش لگا ہے۔ اور جو جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے درختوں کے نیچے سے Syechuan اور Tunnan میں سے ہوتی ہوئی، برما کی سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کی ایک لمبی سی قطار ہے، ان میں وہ قلی رہتے ہیں۔ جو سڑک تعمیر کر رہے ہیں، اُن کے سامنے بڑے بڑے الاؤ روشن ہیں۔ اور اُن کے شعلوں کی روشنی میں انسانی سایے ادھر اُدھر حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔

ڈک اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھا ہے، وہ گھٹنوں کو ہاتھوں میں تھام کر الاؤ کی روشنیوں کی طویل زنجیر کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے، اس منظر کو دیکھ کر میدانِ جنگ کا خیال آتا ہے، کسی تعلیم یافتہ آدمی نے اُس سے کہا تھا "یہی لوگ جنگ کو جاری رکھتے ہیں۔ جو عقب میں کام کرتے ہیں" ڈک اس خیال سے متفق ہے، سڑک تعمیر کرنا جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ اُسے وہ وقت یاد آتا ہے۔ جب اُس نے اور اس کے گاؤں والوں نے آدھی رات کے وقت   میں ایک بڑی سی مچھلی کو اپنی تیز چمکدار برچھیوں سے مارا تھا۔ پھر وہ اُن لمحات کو یاد کرنے لگتا ہے۔ جب طویل راتوں کو وہ چوروں کے ڈر سے اپنے لوبیا کے کھیت کی حفاظت کیا کرتا تھا۔ وہ تھوڑی سی سبز پھلیاں لے کر آدھی رات کے وقت چشمہ کے کنارے پکا لیا کرتا تھا۔ پھر اُس کے دماغ میں گاؤں کے نمبردار کا خیال آتا ہے، اور وہ اس حقیر سردار کو ہاؤس ٹیکس کے معاوضہ میں اپنا دیگچہ لے جاتے دیکھتا ہے۔ اب آگ کی روشنی میں وہ ایک مرتبہ پھر گاؤں کے نمبردار کا مکروہ چہرہ، بھیڑیئے کی سی آنکھیں، بڑی سی ناک اور موٹے موٹے ہونٹ دیکھتا ہے وہ آگے جھک کر غضبناک اور بیباک آنکھوں سے ٹکٹکی لگا کر آگ کو دیکھتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ نمبردار سے لڑنا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے وہ کبھی اتنا غضبناک نہ ہوا تھا۔

بچا ہو سوئم اپنی جھونپڑی میں سویا پڑا ہے۔ اُس کا پائپ ابھی تک اُس کے منہ میں سلگ رہا ہے۔ جب تمباکو سارا جل جاتا ہے تو بچا ہو جاگ پڑتا ہے، وہ چونک کر بیٹھ جاتا ہے، اور جلدی جلدی کش لگانے لگتا ہے، اور اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی ٹھوڑی پر سے تھوک صاف کرتا ہے، پھر وہ باہر نکلتا ہے، پتلون کے بٹن کھولتا ہے۔ اور پیشاب کرتا ہے، پائپ میں دوبارہ تمباکو بھرتا ہے۔ اور الاؤ میں سے ایک کوئلہ لے کر سلگاتے وقت ڈک کو ایک فلسفی کی طرح خیالات میں مستغرق بیٹھے دیکھ لیتا ہے۔

"بیٹا ڈک! تم لیٹ کر تھوڑا سا سو کیوں نہیں لیتے! یہاں بہت سردی ہے"

"مجھے یہاں بیٹھ کر سوچنے میں لطف آتا ہے"

"شاید تم وحشی بھیڑیوں کو دیکھ رہے ہو؟ یا اپنی بوڑھی ماں کے متعلق سوچ رہے ہو! چاؤ دو ہم آج ہمارے لئے گاؤں سے چاول لایا ہے، تمہاری ماں نے تمہارے لئے کیا بھیجا ہے؟"

"اوہو، ایک چھوٹی سی کپڑے کی تھیلی، اور اس میں ہے کیا؟ — تین تانبے کے سکے۔ تلوں کے تین دانے اور تین سبز

پھلیاں، لڑکوں کا خیال ہے۔ کہ ان سے شیطانی روحوں اور جاپانی شیطانوں کی اڑنے والی مشینوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا

"احمق بڑھیا! یہ بات اُسے کس نے بتائی؟"

"گاؤں کے نمبردار نے! اُس نے ہر گھر میں کہہ دیا ہے۔ کہتا ہے کہ پچاس سکے خرچ کے ایسی تھیلی خرید لو"

"مجھے امید ہے۔ کہ تمہارے چچی میرے لئے تو نہ خریدے گی، میرا چاول کا ذخیرہ تقریباً ختم ہو چکا ہے" یہ کہہ کر چچا ہوسوئم اپنی جھونپڑی میں چلا جاتا ہے،

مطلع ابر آلود ہے۔ اور آسمان پر کوئی ستارہ دکھائی نہیں دیتا۔ پہاڑوں میں ہوا آہستہ آہستہ سے چل رہی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ بارش ہوا چاہتی ہے۔

ڈک گیلی گھاس سے اپنے پاؤں پر سے کیچڑ صاف کرتا ہے۔ اور پھر وہ بھی اپنی پناہ گاہ میں چلا جاتا ہے ان کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں ایک صنوبر کے درخت کے ساتھ کھڑی ہیں، چچا ہوسوئم کے پاس تھوڑی جگہ ہے، اور ڈک کے پاس زیادہ سمان کے پاس چونکہ سرہانہ اور لحاف کچھ نہیں۔ اس لئے وہ ڈک کے بستر میں سوتا ہے۔

سمان ایک محنتی اور فراخدل شخص ہے، وہ اپنی ساری تنخواہ ایک دم خرچ کر ڈالتا ہے۔ جونہی شام ہوتی ہے، وہ گھاس پھوس پر دراز ہو کر خراٹے لینے لگتا ہے، ڈک پست قامت ہے۔ اور رات کاٹنے کے لئے سمان کے قدموں میں پڑا رہتا ہے۔ تمباکو اور خشک گھاس کی بو جھونپڑی کو بھر دیتی ہے۔

چچا ہوسوئم اپنے بستر پر سے پکارتا ہے۔ "میرے بیوقوف ڈک تم نے وہ قیمتی تھیلی کہاں رکھی ہے؟"

"میں نے پھینک دی ہے، میں نہیں چاہتا کہ گلہریاں بیج کھانے کے لئے میرے کپڑے کتر ڈالیں"

چچا ہوسوئم اکثر سوچا کرتا تھا کہ کبھی گاؤں کے نمبردار کو یہاں بلائے۔ اور اُسے وہ بڑی بڑی ہستیاں دکھائے جو سڑک کی تعمیر کے لئے آئی ہیں۔ ایک دن اُس نے بڑے پُرجوش لہجہ میں کہا۔ "ڈک اب ہم بہت جلد بڑی بڑی چیزیں دیکھیں گے!"

دوسرے دن علی الصبح، جب کہ گھنی اور اودی دھند ابھی تک وادی پر چھائی ہوئی تھی، وہ سڑک پر کام کرنے لگے۔ ہیریسن جو اس سڑک کے مزدوروں کا فورمین ہے، چچا ہوسوئم کے پاس آتا ہے اور کہنے لگتا ہے،

"چچا! آج ہم سب سے بڑے افسر کو دیکھیں گے! وہ ہمارے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے تین درجے بڑا ہے! یہ چن تا سیو۔ کہیں ایک دفعہ ہمارے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ساتھ کھانا کھا بیٹھا تھا۔ اور جب وہ گاؤں میں واپس آیا۔ تو اُس کا چہرہ بدلا ہوا تھا — اُس نے سارے گاؤں والوں کو خوفزدہ کر دیا! لیکن چچا تم تانگن کے سب سے بلند مرتبہ افسر کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے پھر جب تم ہمارے گاؤں میں واپس جاؤ گے، تو کیا تم چچا وہ تم کو اپنا بڑا بھائی سمجھ لے گے؟"

یہ سچ تھا گورنمنٹ کا ایک اعلیٰ افسر سڑک کی تعمیر کا معائنہ کرنے آ رہا ہے۔ اور تمام کسان مزدور اس آنے والی گھڑی سے جوش میں بھرے ہیں۔

ہاں وہ جوش میں بھرے ہیں، لیکن خوفزدہ بھی ہیں، ایسے موقعوں پر چچا ہو جیسے آدمی سر میں درد محسوس کرتے ہیں اعلیٰ افسروں کے لئے بڑی تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہارے لئے کچھ کریں، تمہیں ان کی خدمت میں بھنا ہوا گوشت پیش کرنا پڑتا ہے، چچا ہوسوئم کے پاس ایک قیمتی چیز ہے — بانس کی جڑ کا بنا ہوا ایک لمبا سا پائپ، ہر صبح وہ تین تہ

بھر کر اسے پیتا ہے۔ اور پھر اپنے کرتے میں چھپا لیتا ہے۔ گاؤں کے نمبردار جی تا اسیو نے یہ پائپ لینے کے لئے کئی مرتبہ اشارہ کیا لیکن چچا ہوکو یہ پائپ بڑا پسند ہے۔ اور اگر کوئی اُس کی پائپ لینے کی دھمکی دیتا ہے۔ تو اُسکے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔

ہرویسن فرمین سب پر یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ میں بہت لائق اور پڑھا لکھا آدمی ہوں، وہ چچا ہوکو بہت بے خبر کسان سمجھتا ہے جس نے یہ دنیا کبھی نہیں دیکھی۔ اُسے معلوم نہیں۔ کہ تیس سال ہوئے چچا ہوسوکم نے ایک عالی مرتبہ افسر کو دیکھا تھا، لیکن چچا ہو کے پاس ان تمام ظریفانہ باتوں کا موزوں جواب موجود ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "جناب فرمین صاحب! مجھے وجہ معلوم ہے! تم نے اپنی زردرو دیہاتی بیوی سے چھٹکارا حاصل کیا، اور دریا کے اُس طرف ایک جیز کلی سکول میں چلے گئے، چند بے معنی الفاظ پڑھے۔ اور اب تم ایک مینڈھے کی طرح مغرور ہو، اگر واقعی تمہیں کسی چیز کا پتہ ہے۔ تو ذرا یہ بیلچہ پکڑو اور سڑک بناؤ۔ تم ہمیشہ ہماری بے عزتی کرتے رہتے ہو اور کہتے ہو کتے کا گوشت کھاؤ۔ تم اسی لائق ہو" — بھلا یہ تو بتاؤ کہ اس کا ذائقہ کیا ہے کیونکہ تم اسکے متعلق بہت کچھ جانتے ہو"

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

سپروائزر جس کا نام ساؤ ہے، بہت تنگ مزاج اور ظاہر دار انسان ہے، اُس کی آنکھیں چوہے کی آنکھوں کی طرح چھوٹی چھوٹی ہیں اُسکے بال لمبے اور تیل میں تر رہتے ہیں۔ اور وہ غیر ملکیوں کی طرح انہیں پیچھے الٹ دیتا ہے، قلیوں کی ہنسی کی آواز سُن کر وہ تیزی سے اُن کی طرف بڑھتا ہے، اور سواری کی چابک کو جو کسی گھوڑے پر کبھی استعمال نہیں ہوتی، ہلاتا ہے۔ اور کہتا ہے! "کیا تم ہنس رہے تھے؟ کیوں ہنس رہے تھے تم بیوقوفو؟ ایک عالی افسر آ رہا ہے۔ اگر تم نے اچھی طرح کام نہ کیا۔ تو تمہیں اتنا پیٹا جائے گا کہ تم چلا اٹھو گے۔ ہاں چلا اٹھو گے!"

سپروائزر کو بولنے میں ازحد تکلیف ہوتی ہے۔ وہ اپنے سخت ہونٹوں سے الفاظ کو کھینچ تان کر نکالتا ہے۔ کبھی جلدی جلدی بولتا ہے کبھی آہستہ — اُسکے لمبوترے چہرے کی ہر رگ اپنی شان کے اظہار کے لئے اکڑ جاتی ہے، سمان کو اُسے یوں بولتے دیکھ کر ازحد تکلیف ہوتی ہے، اور وہ اُسکے فقروں کے اختتام پر ہنسی کو مشکل سے ضبط کر سکتا ہے، سپروائزر کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں اور وہ بڑے غصے سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، پھر چابک سے ہرویسن کے سر کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔ "فر — فرمین! دیکھو تم کیا کر رہے ہو! اِدھر اُدھر کتنے پتھر بکھرے پڑے ہیں، انہیں سڑک پر سے اٹھا کر گڑھوں میں پھینک دو، جلدی کرو تمہیں صرف ان احمقوں کے ساتھ مل کر ہنسنا آتا ہے — !"

یہ بڑی زیادتی تھی، سارے قلی کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

"سنتے ہو! اب ہنس کے دیکھو، میں چابک سے تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا — ایک ایک کو پیٹوں گا!" وہ ہوا میں اپنی چابک ہلاتا ہے۔ اور پھر چلا جاتا ہے۔

فرمین ہرویسن پتھر اٹھانے لگتا ہے۔ اور باقی مزدور اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اپنے کدال رکھ دیتے ہیں۔ اور پتھر ہٹانے میں مشغول ہو جاتے ہیں، لیکن سمان اپنے پتھر سڑک کے ساتھ ایک دیوار کی طرح چن دیتا ہے۔

الکلی سارے پتھروں کو گڑھوں میں پھینک دینے کے حکم پر حیران ہے۔ سمان ایک پتھر کو نیچے رکھ کر اپنا جسم سیدھا کر کے کہتا ہے: "شیطان! ہم ان پتھروں کو سڑک پر پہنچانے کے لئے کیوں نہ رکھیں، اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ٹکڑے گڑھوں میں دھنس [illegible]"

مزدوروں کے دل میں بھی یہی خیال ہے، وہ اتفاق سے سر ہلاتے ہیں۔ لیکن فریبن ہوسیوم خاموش ہے، شکستہ افسردہ بیٹھا ہے۔
چچا ہوسوئم کا دل فریبن کی خاموشی سے بڑھ جاتا ہے اور جرأت کر کے کہتا ہے۔ "ہاں۔ جب سڑک کی بالائی سطح بنا دی جائے گی تو ہمیں گڑھوں میں کود کر پھر ان پتھروں کو باہر نکالنا پڑے گا۔ کتنے کام ہیں! ہماری کمریں دوہری ہو گئی ہیں۔" ہوریسن دلیر بن جاتا ہے اور بولا کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ کتنا احمقانہ کام ہے! جب آدمی حق پر ہو۔ تو اُسے ضرور بولنا چاہیئے۔ تم یہ ایک گز سلاخوں میں گئے ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"اس کے ساتھ جھگڑنے سے کیا فائدہ، پتھروں کو یہاں اکٹھا کر دو۔" سنان اپنی بھورے پیٹ پہ ہاتھ مار کر کہتا ہے "میں نے چار ضلع سڑک کے سپرنٹنڈنٹوں کی ملازمت کی ہے، دریا کے شمال و جنوب کی طرف سفر کیا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی سڑک پر کام نہیں کیا، لیکن میں نے کئی سڑکوں کی فرش بندی دیکھی ہے۔ اور کئی سڑکوں پر پیدل سفر کیا ہے اور میں ان باتوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، ہوریسن، میرے بیوقوف بچے، سپروائزر کو چالاکی سے مخاطب کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گا!"
سپروائزر انہیں پھر باتیں کرتے دیکھ لیتا ہے۔ اور دوڑ کر اُس طرف جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان تک پہنچے۔ لوگ ہوریسن کو بولنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور وہ بلند آواز سے کہتا ہے۔ "سپروائزر! کیا ان پتھروں کو سڑک کے کنارے جمع کر دیں یا گڑھوں میں ڈال دیں؟"

"ہاں، ہاں انہیں گڑھوں میں ڈال دو۔ سب پتھروں کو ڈال دو۔"
سنان غصے سے ہوریسن کی طرف دیکھتا ہے، فریبن ایک مرتبہ پھر آرام سے پوچھتا ہے۔ "ہمیں چاہیئے کہ ان پتھروں کو سڑک کی فرش بندی کے لئے بچا رکھیں، ٹھیک ہے نا؟"
"حکومت! یہ انجینئری کا معاملہ ہے، بکواس بند کرو۔ تم انجینئری کی دقیق باتوں کو کس طرح سمجھ سکتے ہو؟"
"میں سمجھتا ہوں" ہوریسن نے کہا۔ اُس کا چہرہ سفید ہو رہا ہے۔ لیکن آواز مضبوط ہے۔ "میں نے ژنگون کی یونیورسٹی میں اس علم کو پڑھا ہے، اور میں نے اپنی آنکھوں سے برما روڈ کی تعمیر دیکھی ہے۔"
"فوریبن صاحب" سپروائزر بلند آواز سے کہتا ہے، "میرے ساتھ بحث نہ کیجئے ہم سب اپنے ملک کے لئے کام کر رہے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ برما روڈ چین اور جاپان کی جنگ کے لئے سامان حرب پہنچانے کے لئے تعمیر کی جا رہی ہے! تمہیں یہ نہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اعلےٰ افسر جو آج آ رہا ہے۔ بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ وہ ہر چھوٹی چھوٹی چیز دیکھے گا۔ کہ گھاس کہاں ہو۔ اور پتھر کہاں پھینکے جائیں۔ یہ سب کچھ اُسکے دماغ میں موجود ہے! وہ سڑک کے نقشے کی تیاری سے پہلے کئی مرتبہ اس مقام کا معائنہ کر چکا ہے۔ ہمیں چاہیئے۔ کہ کوئی ایسی بات نہ کریں۔ جس سے اُسے ہم پر نکتہ چینی کا موقع ملے۔ سڑک کے اوپر والے حصہ کے قلی میرے دوست ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اُنہوں نے مجھے کتنی قیمتی چیزیں دی ہیں۔ لیکن تم — ہاں مجھے افسوس ہے!"
چچا ہوسوئم۔ سپروائزر کی پیٹھ کے پیچھے ہوسیبن کی طرف انگلی اٹھا کر فلسفیانہ انداز سے کہتا ہے "آپ ہمارے پاس رہیں، چونکہ آپ بھی ہمارے افسر ہیں۔ اس لئے ہماری مدد کریں۔ دو افسروں کے لئے یوں لڑنا جھگڑنا بہت بُرا ہے!"
جب سپروائزر چلا جاتا ہے تو چچا ہوسوئم اپنے پوپلے منہ سے مسکرا کر کہتا ہے۔ "اس سے پہلے یہ پیلا مانس اپنے چمکدار بالوں، غازہ آلود چہرہ، اور مغربی لباس کے خراب ہونے کے خوف سے کبھی اس سڑک پر چلنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ لیکن آج

تو حیثیات خود آگے بڑھ کر دیکھ رہا ہے کہ کہیں یہ جیتے جنود فیض محمد جناب افسر اعلےٰ کے قیمتی پاؤں کی راہ میں حائل نہ ہوں، لیکن وہ مجبور ہے، واللہ!

سن کر سب ہنس پڑتے ہیں۔ بابا چچا ہو سونگ بہت خوش ہوتا ہے اور اُس زمانہ کو یاد کرنے لگتا ہے۔ جب وہ گیارہ برس کا تھا اور اپنے دو دیگر بچوں کے ساتھ حوالی کی سیر کے لئے دور دور تک گیا تھا۔ چینیوں کی رسم تھی۔ اور اس ضلع کا افسر زمین کے دیوتا جی ہوانگ کے مندر کی زیارت کو آیا تھا۔ جلوس اس سال فصل بھی ہوئی۔ تین مرتبہ توپ داغی گئی۔ چچا ہو سونگ کے کان توپ کی گرج سے بہرے ہو گئے۔ اور اُس نے سرکاری جھنڈیاں، ریشمی چھاتے اور مسلح سواروں کا شاندار جلوس دیکھا اور لال جھنڈی کی سریلی تانیں بھی سنیں، اور سپاہیوں کو "راستہ چھوڑ دو" اور "چپ ہو جاؤ" کے نعرے لگاتے بھی سنا۔ کتنا پرشکوہ جلوس تھا! آخر چچا ہو سونگ کسانوں کو آگاہ کرتا ہے کہ خوفزدہ نہ ہوں، وہ کہتا ہے: "جب تم توپوں کی آواز سنو تو خوفزدہ نہ ہونا! افسر کی سواری کی پالکی پہاڑی کی دوسری جانب ہو گی! جب تم لال بینڈ کی سریلی تانیں سنو تو ہنسنا نہیں —"

چچا ہو کا چہرہ اب سنجیدہ ہو جاتا ہے، سنان پتھر میں ڈال کر اپنے چہرے سے پسینہ صاف کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ چچا ہو یوں آزادی سے باتیں کرے۔ وہ کہتا ہے "تمہاری زبان پن چکی کی طرح چلنے لگی ہے! میرے تجربے کے مطابق کسی افسر کے جلوس میں جھنڈیاں اور باجے کا جو بیان ہوا! تم اُن چیزوں کا ذکر کرتے ہو جو ہم بیٹھے پرانے ڈراموں میں دیکھتے تھے۔"

"تیس سال ہوئے میں نے یہ چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں!"

گو چچا ہو سونگ اس وقت تقریباً پچاس سال کا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ اُس کی بینائی جوانوں کی طرح ہے۔ تب ابھی ہے چچا ہو سونگ حاکم بھی ہے۔ اور اب بھی گاؤں کا تمام ... اُس پر پورا اعتماد کر کے اُس سے اپنا خط پڑھوانے کی خواہش کرتا ہے۔

سنان کہتا ہے۔ "کیا تمہارے خیال میں چاول کا وہ بیج جو تیس سال کا پرانا ہو، استعمال ہو سکتا ہے! میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ کیونکہ میں نے تمہارے اعلےٰ افسر کو آج تک نہیں دیکھا۔ لیکن میں اپنے تجربہ کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ افسر خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اپنے جلوس میں صرف سپاہی رکھتے ہیں۔ اور تم اُن کے مرتبہ کو سپاہیوں کی تعداد سے پہچان سکتے ہو۔ میں چار مجسٹریٹوں کی ملازمت کر چکا ہوں۔ جب وہ باہر نکلتے تو ہر ایک کے ساتھ چار بڑی اور چار چھوٹی رائفلیں ہوا کرتی تھیں، ایک اور بات سنو۔ کیا تم نے کبھی سپاہیوں کو پہاڑوں میں کسی کو گرفتار کرتے دیکھا ہے؟ اگر مجرم کو ...... جرمانہ ہوتا ہو۔ تو اُس کے تعاقب میں صرف ایک سپاہی جاتا ہے۔ اگر اُسے قید ہوتا ہو۔ تو پھر تین سپاہی بھیجے جاتے ہیں۔ اور وہ شخص جسے تین سال کی سزا ملنی ہوتی ہے، وہ دستہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتا ہے! اسی طریق سے تم ایک افسر کے مرتبہ کا پتہ لگا سکتے ہو۔ اور میں یہ سنتا ہوں۔ کہ اُس افسر کے ساتھ جو آج ہمارا معائنہ کرنے آ رہا ہے۔ کم از کم اسی رائفلیں ہوں گی، چھوٹی رائفلیں سات بار والی، دس بار والی اور بیس بار والی ہوں گی بڑی رائفلیں سب ... کی بنی ہوتی ہیں۔ اور ہر کمپنی کے پاس دو مشین گنیں ہوں گی!"

ڈک پتھر اٹھا اٹھا کر سڑک کے کنارے گڑھوں میں پھینک رہا ہے۔ وہ کام کرتے وقت سوچ رہا ہے۔ کیا افسر کس قسم کا ہو گا، وہ افسر جو اُس نے آج تک دیکھے تھے، عالی مرتبہ نہ تھے — اُس نے صرف گاؤں کے نمبردار اور سپروائزر کو دیکھا تھا، یہ دونوں مغرور انسان تھے۔ وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اگر یہ افسر بھی یہاں کے سپروائزر کی طرح ہوا تو پھر وہ بھی بڑا سی ہو گا، ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کبھی کچھ نہ کہتا ہو، اور جب کہتا ہو تو اتنا غضبناک ہو جاتا ہو کہ لوگوں کو چپیر مار دیتا ہو۔ اور شاید اُس کی آواز بہت بلند ہو، یا اگر وہ گاؤں کے نمبردار کی طرح ہو گا۔ تو اُس کی آنکھیں ہمیشہ اوپر کو اٹھی رہتی ہوں گی۔ اور اُس کی ناک ایک غیر ملکی شیطان کی طرح لمبی ہو گی!

اس وقت تمام مزدور کام کر رہے ہیں، وہ بڑے بڑے پتھر اٹھاتے ہیں۔ اور گڑھوں میں پھینکتے جاتے ہیں۔ اتنے میں ہو یو سن دوڑتا آتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "وہ آ رہا ہے! وہ آ رہا ہے!"

کام شروع کیا جاتا ہے۔ وہ جہاں کھڑے ہیں وہیں پتھر پھینک دیتے ہیں۔ اور سب کے سب مڑ کر گھبرا کر غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ چند لمحات گزر جاتے ہیں ۔۔ اور سپروائزر ایک بڈھے اور تین نوجوانوں کو ساتھ لئے اُن کی طرف آتا ہے۔ یہ سب نیلی وردیاں پہنے ہیں۔ سپروائزر اپنی لیاقت کے مطابق اُس بڈھے سے باتیں کر رہا ہے۔ اور بڈھا ایک گز ہاتھ میں لئے اپنا ہاتھ ادھر اُدھر مڑتا ہے۔ چچا ہو سوتم فوجیوں جیسے ہو لیس سے نہ صرف بلکہ دھیمی آواز میں پوچھتا ہے۔ کہ افسر کب آئیگا۔ ہو لیس حیرت زدہ ہو کر بڈھے کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ۔۔ "وہ بڑا افسر اعلیٰ ۔۔ وہ بادشاہ ہے!"

چچا ہو سوتم اُس سے مایوس ہو جاتا ہے، وہاں کوئی جھنڈیاں، ہار، بینڈ وغیرہ نہیں! ہو لیس بڑی بیدلی سے اپنا ہاتھ ہلاتا ہے، سلوت سے دوسروں کو خبردار کرتا ہے۔ مزدور آہستہ آہستہ اُس بڈھے آدمی کو گھیر لیتے ہیں جو اُن کا معائنہ کرنے آیا ہے، لوک اپنی آستینوں میں منہ ڈال کر ہنس رہا ہے کتنے آدمی اس بھورے بڈھے کے گرد جمع ہو رہے ہیں، سنان چپکے سے انہوں کے پیچھے ہو کر دیکھنے لگتا ہے کہ انہوں نے اُنہیں کہاں چھپائی ہیں۔ یعنی کھجیلیں یا تمغے، آستینوں میں یا ٹانگوں میں چھپائی جا سکتی ہیں، لیکن اُسے وہاں کوئی دکھائی نہیں دیتی، صرف اُن کی وردیوں پر کچھ کپڑے کے نشانات دکھائی دیتے ہیں۔ سپروائزر مزدوروں کے درمیان پھر کر غصے سے کہتا ہے۔ "ہدایات سنو! شور نہ مچاؤ! شور نہ مچاؤ!"

تب وہ بڈھا اس سارے ہجوم کو ایک سرسبز ڈھلوان مقام پر لے جاتا ہے، وہ مزدوروں کے سامنے بیٹھ جاتا ہے، چچا ہو سوتم بھی اُس انتظار میں کھڑا ہے۔ بڑا غم زدہ ہے۔ سنان ایک معمار کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور لوک جو حیران ہے سامنے زمین پر پاؤں پھیلا دیتا ہے۔

بڈھے کی ڈاڑھی زرد ہے۔ اور جب وہ ٹوپی اتارتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسکے بال موسم خزاں کی گھاس سے رنگین ہیں۔ موٹے موٹے ہونٹ چھوٹا قد ۔۔ وہ ایک ایسا نادار کسان کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک دوستانہ طریقے سے کہتا ہے۔ "مجھے تمہاری جانب سے اطمینان ہے، سڑک کے کھلے ہوئے حصے کا کام کل ختم ہو گیا ہے، لیکن تم ۔۔ کیا تم لوگ تھک تو نہیں گئے تم میں سے کتنے اس خراب موسم میں بیمار ہوئے ہیں!"

ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ ان الفاظ نے اُس کا دل گرما دیا ہے۔ وہ بڈھا پوچھنے لگتا ہے کہ خوراک اچھی ملتی ہے یا نہیں، جھونپڑیاں گرم ہیں یا نہیں وغیرہ۔ پہلے پہل وہ فرداً فرداً اُسکے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ اور بعد میں وہ سب مل کر بولنے لگتے ہیں، اور بعض دفعہ ہنسی کی آواز آنے لگتی ہے۔

بوڑھا آدمی کہتا ہے۔ "ہمیں مستعدی سے کام کرنا چاہیئے، اور کام کو جلد ہی ختم کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی محنت برباد نہ کرنی چاہیئے! ابھی ابھی میں نے دیکھا کہ تم لوگ بڑے بڑے پتھر اٹھا کر گڑھوں میں پھینک دیتے ہو، کیا فورمین اسی طرح کام کی نگرانی کرتا ہے؟ وہ تمہیں بتاتا کیوں نہیں اور اپنا فرض پوری طرح کیوں نہیں بجا لاتا؟ بہت جلد ہمیں یہی پتھر سڑک کی فرش بندی میں استعمال کرنے پڑینگے۔ کیا تمہیں انہیں دوبارہ سڑک پر نہ لانا ہوگا؟ اس طرح تم نے اپنی آدھی مشقت برباد کر ڈالی ہے۔"

یہ سن کر ہر شخص سپروائزر کی طرف دیکھنے لگتا ہے، سنان کہہ اٹھتا ہے۔ "اس کام پر ہمیں سپروائزر نے مجبور کیا ہے۔"

اور سب جوان اور بڈھے مزدور شہادت دینے اور تصدیق کرنے کے لئے اٹھتے ہیں۔ بوڑھا ایک منٹ کی ناراضگی سے سپروائزر کو بلا کر کہتا ہے: "دوبارہ کبھی ہمیں ایسی غلطیاں نہ کرنی چاہئیں، سڑک کے عقب میں ہی ہمارا مقابلہ جاری ہے، ذرا اُن ہزاروں ہم وطنوں کا خیال تو کرو جو محاذ میں جنگ کر رہے ہیں۔ اس حالت میں کوئی شخص اپنی شان و شوکت کا خیال کیونکر کر سکتا ہے۔ تمہارے پسینے کے ہر قطرہ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم کی زندگی کے تحفظ کے لئے ایک مضبوط حصار کھڑی ہو جاتی ۔۔ میں بھی مزدور ہوں، قلی ہوں۔ اور بالکل تمہارے جیسا ہوں!"

کیا الفاظ ہیں! لوک اچھل کر نعرہ مارنا چاہتا ہے، لیکن سپروائزر نیم بے ہوشی کی حالت میں گرتا ہے۔ اور زمین پر لوٹنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُسے دورہ پڑ رہا ہے۔ چچا ہو سوتم اور فورمین بڈھے افسر کے پاس جاتے ہیں۔ اور سپروائزر کو معاف کرنے کی درخواست کرتے

رہیں سب کی نظریں چچا ہو سوتم کے پر گڑی ہیں۔ اسکے منہ میں اُس کا بانس کا پائپ ہے، اور وہ بولتے وقت بھی اُسے منہ سے نہیں نکالتا مگر ہوا سے اُس کی راکھ بھی اُڑ رہی ہے!

جب دن ڈھلنے لگتا ہے تو سپروائزر ہو یونس کے پاس آکر دوستانہ لہجہ میں باتیں کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے: "کہتے ہیں کہ رنگون کی یونیورسٹی بڑی اچھی ہے"۔

"ہاں بہت اچھی ہے!" ہو یوسن جواب دیتا ہے، وہ اپنے تئیں مسکا کر علم ظاہر کرتا ہے۔

"یہ یونیورسٹی ہے کہاں؟"

"سنگاپور میں"

"اس کا بانی کون ہے"

"سمندر پار کے چینی"

سمان برداشت نہیں کر سکتا۔ اور کہنے لگتا ہے: "اتنا جھوٹ نہ بولو! ان پتھروں کو دیکھو، یہ کارآمد ہیں یا نہیں!"

چچا ہو سوتم اطمینان سے پائپ پی رہا ہے، تھوڑی دیر بعد وہ اُس کی راکھ جھاڑ کر ڈک کو دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "کیا تم پیو گے ڈک"

"نہیں مجھے نیند آرہی ہے!"

"پائپ پینے سے گندی ہوا نقصان نہیں دیتی"

ڈک کوئی جواب نہیں دیتا، وہ اپنے تنکوں کے بستر میں لیٹ جاتا ہے، اُسے اتنی نیند آرہی ہے کہ وہ لحاف اوڑھنا بھی بھول جاتا ہے۔

"ہائے! لمبردار — کتے!" یکایک ڈک خواب میں چلانے اور سمان کو پورے زور سے پیٹنے لگتا ہے۔

یہی پرانا خواب جو ڈک ہر رات دیکھا کرتا ہے! ایک دفعہ جب ڈک اپنے چوزوں کو پسے ہوئے چاول کھلا رہا تھا۔ تو گاؤں کے لمبردار اُس کی والدہ کی سوتی سوزنی چھیننے آیا تھا، بہانہ یہ تھا کہ ڈک نے سارا ہاؤس ٹیکس ادا نہیں کیا، اُس کی والدہ نے مضبوطی سے سوزنی کو پکڑ لیا تھا، اور وہ اُسے کسی طرح بھی چھوڑنے پر تیار نہ تھی، اور خود ڈک کو اتنا غصہ آیا تھا کہ وہ رونے لگا تھا۔ اُس نے لمبردار کو دھکے دیکے نکال دیا تھا۔ اور اُسے خوب مارا تھا۔

سمان چلاتا ہے۔ "ڈک! ڈک! جاگو! خواب سے جاگو! تم مجھے مارتے کیوں ہو"، اور چچا ہو سوتم خواب دیکھتا ہوا کروٹ لیتا ہے۔ اور چلاتا ہے۔ "بھیڑیا! بھیڑیا!"

ڈک جاگ پڑتا ہے اور جھونپڑی سے باہر نکلتا ہے۔ اُس کا سر چکرا رہا ہے۔ اور بوجھل ہو رہا ہے، آسمان نیلے ریشم کا شامیانہ معلوم ہوتا ہے، ستارے جھلملا رہے ہیں۔ دور فاصلہ پر پہاڑی میں بادل منڈلا رہے ہیں، ساری فضا پر چاندنی کا دور دورہ ہے، سرد ہوا کے ایک جھونکے سے سڑک کی نئی کھدی ہوئی مٹی کی تازہ خوشبو آتی ہے، ڈک اس لطیف ہوا میں لمبے لمبے سانس لیتا ہے۔

جھونپڑی میں سے سمان کی آواز آتی ہے۔ "ڈک! خیال رکھنا کہیں تمہیں سردی نہ لگ جائے! کیا تم نے افسر کی یہ بات نہیں سنی کہ کل ہمیں سخت محنت کرنی ہے! کیا ہم سب نے وعدہ نہیں کیا! اگر تم بیمار ہو گئے تو تمہارا کام ٹھیک نہ ہو گا"۔

خلیل احمد خلیل

موت

اے مقدس دوشیزۂ جمیل!

ہرچند تو اسرار شیرینگ کی خوفناک الجھنوں میں پنہاں ہے لیکن اس چشم بے باک سے اپنی تابانی حسن کیسے چھپا سکیگی جو عمار جانسپاری سے بدمست فناں خانہ عشق کے عجیب گوشوں میں رموز ازلی کو آشکار کرنا اپنا مقصدِ حیات قرار دے چکی ہو۔ اسیس میاد تھا وستہ عز ممکن نہیں ادہ چشم بے باک کہ تیری نقاب کشائی پر تلی ہوئی ہے یہ راز پائے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تو دراصل عروسِ زندگی ہے۔ پھر بھلا منفعل خود سپردگی تو کیا کر سکے گی!

اے پاکیزہ شاہد طناز!

تو اس بے حیج چاہنے والے سے پوشیدہ کس طرح رہ سکے گی جو ستارۂ بصیرت لیکر عزم جستجو کرے۔ بصیرت انسان میں خدا ہے۔ خالق ہے۔ تخلیق بصیرت ہی سے ہو سکتی ہے اور تیرا عشق تخلیقِ حیات ہے۔ پھر اس چاہنے والے کا جذبۂ جستجو فتحیاب نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ کائنات کی تلاطم وسعتوں میں اسکا دامِ کامرانی تجھے مجبور خود نمائی کردیگا۔ بالآخر تیرے ایسے چاہنے والے کی آنکھوں کی مسرور روشنی میں تیرا یہ راز تحلیل ہو کر رہیگا کہ دراصل تو عروسِ زندگی ہے۔ پھر بھلا منفعل خود سپردگی تو کیا کر سکے گی!

اے ربانی محبوب!

تو اپنی عمیق پاس نگاہوں سے خوف کے تاریک بگولے اڑاتی چلی جا! تو اپنے قدموں کی شوخ کڑک سے ہراس کی آندھیاں چڑھاتی چلی جا! لیکن اک جری نظرباز کی وہ نگاہ کہ نہیں ہو سکتی جس میں تیرے شعاب رُخ کی لافانی جھلملاہٹ بس چکی ہو۔ ایسا نظرباز جس نے جوہر جہاں بینی کو در پر خود فہمی سے مرتبہ خداشناسی تک بلند کر دیا ہو۔ جس نے انتشار حیات میں ایک مرکز قائم کر دیا ہو۔ یا یوں کہیئے کہ مقصدِ حیات تعمیر کر لیا ہو۔ کیونکہ تیری اداۓ دلبری پر جان نچھاور کرے جبکہ تیرا عشق مقصدِ حیات کی تعمیر ہے۔ ایسے جری نظر باز کے جلالِ شخصیت کے سامنے تیرا راز اک شرمیلے تبسم کی صورت میں منتقل ہو کر یا افشاں ہو جائیگا۔ کہ تو دراصل عروسِ زندگی ہے۔ پھر بھلا منفعل خود سپردگی تو کیا کر سکے گی!

خالد بن ولید نے تلواروں کی آتشیں بجلیوں میں کہ عداوت کی بے پناہ گھٹاؤں میں کڑکتی تھیں۔ تیرا جمالِ منور دیکھا۔ وہ تیرے عشق کو ذوقِ شہادت کہتا تھا۔ ہرچند تھا نے ترغیبِ ہوس اور تحریصِ نفس کے جال بچھائے لیکن وہ اس مہلک شعبدہ بازی میں نہ پھنس سکا وہ صاحبِ یقین ان حیاتی دھوکوں سے بہت بلند تھا۔ ایک روحانی منلس تیرے عشق کی عظمت قہار کو ذہن میں بھی نہیں لا سکتا۔ مگر وہ تیرا شیدائی تھا۔ اس نے ذوقِ شہادت کی مشعلِ روشن لیکر خونیں فولاد کے بہتے طوفانوں میں تیرا تعاقب کیا۔ زوال ہمیشہ اسکے نام سے تھراتا رہیگا۔ تیرا عاشق بزم ثبات کی زینت ہے۔ تیرا عشق تخلیقِ حیات ہے۔ انسان ہمیشہ اسے مقصدِ حیات کی رفعتوں پر دیکھیگا کیونکہ تیرا عشق مقصدِ حیات کی یافت ہے۔

سقراط نے صداقت کے منکشف بہا بازوں میں مشعل بصیرت لیکر تیری جستجو کی انسانی ظن کی وقتی ہیبت اس کی بصیرت کو خوف کی ناپاک گرد سے گدلا کرنا چاہا۔ مگر وہ پیغامبر صداقتِ فریب نظر کا شکار کب ہو سکتا تھا۔ تیری محفل کہ نشاط جاوید کی ترتیب ہے۔ اس کی حسرتوں کا مرکز تھی سطح بیں رفیقوں اور بزدل دشمنوں نے ہرچند یہ کوششیں کیں کہ وہ تیرا سودائی تیری بزم کی عشرت سرمدی کے حاشیے سے باہر رہے۔ مگر یہ کب ہو سکتا تھا۔ وہ تیرے عشق کو علم کی نگاہ سے پہچانی ہوئی قوت کہتا تھا۔ زوال ہمیشہ اسکے نام سے تھراتا رہیگا۔ تیرا عاشق بزم ثبات کی زینت ہے۔ تیرا عشق تخلیقِ حیات ہے۔ انسان ہمیشہ اسے مقصدِ حیات کی رفعتوں پر دیکھیگا کیونکہ تیرا عشق مقصدِ حیات کی یافت ہے۔

منصور نے اوج ہیبت تجھے داد نظربازی دی۔ اس عارف جانباز نے تیرے عشق کو ایک پُراسرار نام سے موسوم کیا وہ تیرے عشق کو انا الحق کہتا تھا۔ کم مایہ خرد انسانی نے اسے مجرم گردانا۔ مگر وہ جری نظرباز متبسم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ یہ کم مایہ خرد ایک عیش جہاد گیری ہوا چاہتی ہے۔ یہ اسے تیرے سنگ آستان تک لے جائیگی وہ خوش نہیں تھا بے بس بھی نہیں تھا۔ زوال ہمیشہ اسکے نام سے تھراتا رہیگا۔ تیرا عاشق بزم ثبات کی زینت ہے۔ تیرا عشق تخلیقِ حیات ہے۔ انسان ہمیشہ اسے مقصدِ حیات کی رفعتوں پر دیکھیگا کیونکہ تیرا عشق مقصدِ حیات کی یافت ہے۔

اے شاہد رعنا۔ یہ مجھی کہ آغاز یہ پانی کے عالم پر ہوا کے فاتح تیرے عشق کی خلش جاوید اپنے سینوں میں رکھتے تھے یہ فانی دنیا کے لافانی تیری وجہ محبت پیدا کرلیتے ہیں۔ اور یہی مقصدِ حیات ہے۔ تیری الفت کے ترانۂ جاوید کی روح موسیقی ان کی نبضِ حیات میں چلتی ہے اور یہی انکے ثبات کا راز ہے۔ وہ جن کی نظر کائنات کے سطح بیں اُلجھ کر کبھی تیرا جلوۂ جاں بخش نہ دیکھ سکی۔ ایک بے مقصد مردہ ہستی سے صد نابود ہوگئے۔ غلامی و بیمارگی کی گور تاریک میں زندگی کی تشنہ ہوس جہل و حرص مشتاق

اے محبوب جب تیری محبت کی لو سے احساس حیات کو چھوتی ہے۔ تو میری مسرت ایک طوفان خوفناک کی طرح ظلمت ہستی پر چھائے جاتی ہے آج تو ایسے شفق نار سوا ہیں مگر سدا بہار زمزمہ رقص کرنے لگتا ہے۔ کہ اب تو زندہ ہوں۔ اب تو فنا مجھ سے خوف کھائیگی۔

نقد و نظر

ہماری قومی زبان ۔ مصنفہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو ، حجم ۹۰ صفحات سائز ۲۲×۱۴/۱۶ قیمت آٹھ آنے

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں ہوتا ہے آپ انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے صدر ہیں۔ یہ کتاب ان کے چند خطبات، پیغامات اور بیانوں پر مشتمل ہے۔ آپ اردو زبان کو ہندوستانی تہذیب کا بہت بڑا جز اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ اور متحدہ کوششوں کا کارنامہ سمجھتے ہیں اور اُسے ہندوستان کی قومی زبان مانتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"مجھے اردو زبان سے محبت ہے۔ میں اس کو اپنی زبان سمجھتا ہوں اور اپنے ہندوستان کی زبان۔ مجھے یہ کہتے ہوئے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ اردو میری مادری اور قومی زبان ہے۔ میں اس کا کبھی قائل نہیں ہو سکتا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ بلکہ جتنا دعویٰ مسلمانوں کو اردو پر ہو سکتا ہے اتنا ہی ہندوؤں کو بھی ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اردو دراصل ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوئی اور اس اتحاد کی واحد یادگار ہے۔" غرضیکہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے

ہمارے مزدور ۔ مصنفہ جناب محمد عبدالقادر صاحب لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ، ضخامت ۲۰۴ صفحات سائز ۲۲×۱۸/۸ قیمت عہ، ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں مصنف نے ہندوستانی مزدوروں کے اہم معاشی مسئلوں سے نہ صرف روشناس کرایا ہے بلکہ ان پر تنقید بھی کی ہے۔ ان کے نقل مکانی کے اسباب۔ ان کے اوقاتِ کار۔ ان کی اجرتیں اور ان کے معیارِ زندگی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ قانون مزدور مجریہ ۱۹۳۴ء کو مصنف نے مزدوروں کی ترقی کا زینہ قرار دیا ہے۔ صنعتی جھگڑوں کے اسباب کو رفع کرنے کی تدابیر بھی وضاحت سے بیان کی گئی ہیں۔ مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے چند مشورے بھی دئے ہیں۔ آخر میں اردو اصطلاحات اور ان کے انگریزی مرادفات دیکر پڑھنے والوں کی رہنمائی کی گئی ہے۔

گل و گِل ۔ از جناب سید علی عباس ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، طباعت اور کتابت دیدہ زیب، قیمت سوا روپیہ، ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی ادب دہلی۔

یہ جناب عباس سہارنپوری کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے جس پر مطالعہ کے عنوان سے ہدایت حسنی ایم اے نے ایک بسیط مقدمہ سپرد قلم فرمایا ہے اور یہ مقالہ ثبوت ہے مقالہ نگار کی جگر کاوی اور دقتِ نظر کا۔ جناب ہدایت نے مصنف کے حالات کی تفصیل سے ادب کا ضروری مقصد پورا کیا ہے۔ قدیم شعراء کے دواوین کے مطالعہ صرف یہی چیز نہیں جس سے ان کی معاشی زندگی اور ماحول کا پتہ نہیں لگتا اور تذکرے بھی مصنف کے حالات سے بے بہرہ رہتے ہیں

اس میں شک نہیں کہ جناب عباس جگہ جگہ غالب اور اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن جناب ہدایت نے نہایت اس اظہار کو کیوں وار کھا ہے جس نے مصنف کو عوام کی صف سے ہٹا کر غالب اور اقبال کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس میں جناب عباس مطلق بے قصور ہیں۔ کیونکہ انہوں نے تو جگہ جگہ اس قسم کے اشعار کہے ہیں۵

۵ کلام حضرت اقبال سے کتنا عباس سخنوری کا طریق پیمیری کیا ہے۔ ادارہ

کتاب العلم یا اُردو کی اولین انسائیکلو پیڈیا (جزو اول) دی ایسٹرن پبلشنگ اینڈ سٹیشنری لمیٹڈ لاہور کی طرف سے محمد سعید بیگ اور محمد اسمٰعیل نعیم نے مرتب اور شائع کی ہے۔ سرورق دلکش اور دلفریب ہے۔ کتاب میں بہت سی رنگین تصویریں نقشے اور اشکال ہیں اور کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں عمدہ کتابت نے بہت کشش پیدا کر دی ہے۔

پوری کتاب کی سو جلدیں یا حصے ہونگے۔ مولفین نے تمام انسانی علوم کو بیس عنوانوں میں منقسم کیا ہے۔ مثلاً کائنات، حیاتیات کیمیا، طبعیات، ایجادات وغیرہ وغیرہ۔ ہر جلد میں انہی بیس عنوانوں کے ماتحت متعلقہ علوم کے مضامین درج ہوں گے۔

کتاب العلم کا عام رجحان یہ ہے کہ جدید سائنٹفک معلومات کو مفصل طور پر پیش کر دیا جائے۔ باقی مضامین و علوم کی حیثیت ثانوی

معلوم نہیں ہوتی۔ اندازِ بیان تشریحی ہے اور بعض بعض موقعوں پر انشا پردازی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ مختصر بات کو پھیلا کر بیان کرنے کی طرف میلان موجود ہے۔ یہ کتاب طلبہ اور عام شوقیہ مطالعہ کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کا سٹائل نسبتاً عام فہم اور آسان بنا دیا جائے۔ اور معلوماتِ عامہ کا خلاصہ انشا پردازی سے معرا عبارت میں پیش کیا جائے۔

کتاب العلم انگریزی کی بُک آف نالج کی طرح کی چیز ہے۔ اسلئے اصطلاحی طور پر شاید ہم اُس کو انسائیکلو پیڈیا نہ کہہ سکیں گے۔ یہ ایک کتابِ مطالعہ ہے۔ کتابِ حوالہ نہیں جو ایک انسائیکلو پیڈیا کی بُنیادی صفت ہونی چاہیئے۔ اس میں ضروری ببلیوگرافی ہر مضمون کے ساتھ موجود نہیں۔ جس سے افادی پہلو بہت کمزور ہو گیا ہے۔

کتاب العلم کے مجوزہ خاکہ سے اگر اندازہ لگانا درست ہے۔ تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس میں ادبی، تاریخی، سوانحی، اور فنی مضامین کی کمی ہو گی۔ اور اُردو سے متعلق قدیم علمی اصطلاحات سرے سے غائب ہونگی۔

بہرحال میں مولفین کی اس کوشش کو اُردو ادب کی روز افزوں ترقی کے حق میں ایک نیک فال خیال کرتا ہوں۔ میرے خیال میں کتاب العلم اُردو دان طبقے کی ایک اہم تعلیمی اور علمی ضرورت کو پورا کرنے کا باعث ہو گی۔ اور اسی بنا پر اس بات کا پورا پورا استحقاق رکھتی ہے کہ اسکی کما حقہٗ قدر شناسی کی جائے۔ (سید محمد عبداللہ ایم۔ اے)

جزیرۂ سخنوراں مختصر ناول کہہ لیجئے یا ایک طویل افسانہ لیکن اس کا افسانوی عنصر ایک طنزیہ موضوع کا محض لباس یا روغن ہے اور یہ موضوع ہمارے روایتی شعراء ہیں۔ افسانہ کا پلاٹ یوں ہے کہ دو سیاح، ایک مرد ایک عورت سمندر میں بھولے بھٹکے ایک جزیرہ میں پہنچتے ہیں۔ جہاں سخنور اور اُن کے مدّاح آباد ہیں۔ سخنور اور مدّاح کی تقسیم اُن کے مشاغل کی بنا پر کی گئی ہے۔ مدّاح ہر قسم کا کاروبار کرتے ہیں لیکن سخنور محض سخنور ہیں۔ وُہ ریختہ میں شعر کہتے، مثنویاں، داستانیں اور ناٹک لکھتے یا اور طرح خدمتِ زبان کرتے ہیں، وُہ مدّاحوں کی طرح کسی قسم کا کاروبار نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ کتابوں کے کاروبار میں بھی حصہ نہیں لے سکتے۔" اس کے بعد ان خیالی مدّاحوں اور سخنوروں کی معاشرتی، ذہنی اور ادبی عادات و روایات کا مفصل بیان ہے۔ اخیر میں دونوں سیاح اکتا کر اس جزیرہ سے بھاگ نکلتے ہیں۔ بین السطور اس جوڑے کا ایک مبہم سا رومان رہتا ہے۔ ان سخنوروں کا کردار ہمارے پُرانے شعراء کے فنی اور ذہنی رجحانات کا بہت حد تک صحیح مرقع ہے۔ مثلاً کہ "اہلِ جزیرہ کو مذہب سے برائے نام تعلق تھا۔ لیکن چونکہ واعظ اور ناصح کے نہ ہونے سے شاعری کا ایک اہم اور دلچسپ رُکن ضائع ہو جاتا اسلئے سخنوروں نے منتظمینِ جزیرہ سے کہکر زبردستی واعظ اور ناصح مقرر کر رکھے تھے۔ اُنہیں مجبور کیا گیا کہ پارسائی کا جامہ پہنیں۔ لبیں کتروائیں، ریش بڑھائیں اور سخنوروں کو زہد و اتقا کی تلقین کریں۔"

"ان سخنوروں کا معشوق نصف عورت اور نصف لڑکا تھا۔ ایک طرف محرم چوٹی اور مُوباف کا بیان تو دُوسری طرف کلاہ، چہرہ اور سبزۂ خط کا ذکر، پھر دُنیا بھر کے کرشمے اُس کی ذات میں موجود۔ زلفِ مشکیں رات تو رُخِ روشن دن، رفتار فتنۂ قیامت، طبیعت میں سفاکی اور جلّادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ ہونٹوں پر عاشقانِ باوفا کا خون لگا ہوا۔ کسی پر کمند پھینکی۔ کسی کے پاؤں پر زنجیر ڈالی۔ کسی کو شہیدِ تیغِ ناز کیا۔ کسی کو بحرِ ظلمات میں دھکا دیا۔ کہ عمر بھر ٹامک ٹوئیے مارتا رہے۔"

ان شعراء کی زندگی سے بے تعلّقی، مختلف صنائع و بدائع سے اُن کا شغف۔ اُن کی زندگی کا بے رنگ کھوکھلا پن، مصنف نے اس تفصیل سے اُجاگر کیا ہے کہ اُن کے تخیّل کی داد دینی پڑتی ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی زبان کی شگفتگی، اور بیانیہ تفصیلات کی سچائی ہے۔ سخنوروں کی محفلِ شعر و سرود، اُن کے مشاعرے۔ اُن کی رہائش، غرضیکہ کسی متعلقہ موضوع کے بیان میں مصنف کا قدم اوچھا نہیں پڑا۔ لیکن یہی اس کتاب کی کمزوری بھی ہے۔ تفصیلات کی دلچسپی اور بیان کی شگفتگی کی وجہ سے کتاب کا مرکزی طنز اکثر اوقات دَب جاتا ہے۔ افقی سخنور، نوشابہ خاتون اور یوسف مرزا کے عاشقانہ تگدّم کی وجہ سے بھی پڑھنے والے کی توجہ کچھ بٹ سی جاتی ہے۔ ان باتوں کی موجودگی سے افسانے کی دلچسپی شاید

بڑھ گئی ہو طنز کی گہرائی کم ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ افسانہ اگر ذرا مختصر ہوتا۔ تو اس کی خالص طنزیہ ملاحت پر بہت کچھ اضافہ ہو سکتا تھا محض اس کے پھیلاؤ کی وجہ سے یہ لذت وزائد ہم ہو گئی ہے۔ کتاب کی لغزشیں قیمت کے زیر نظر میں اس کے مطالعہ کی آپ سے سفارش کروں گا۔

میں ہوں خانہ بدوش

دیوندر ستیارتھی کی تصنیف ہے ستیارتھی صاحب ایک مدت سے ہمارے ملک کے اطراف و جوانب سے عوام کے گیت جمع کر رہے ہیں اور یہی گیت بلکہ اس کے گرد انہوں نے مضامین کا ایک جال بُنا ہے۔ اس کتاب کے مختلف الواب خود نوشت، بیانیہ مضمون اور مختصر افسانے سے مرکب ہیں ستیارتھی صاحب کا یہ نسخہ کہیں کامیاب ہے اور کہیں کہیں ناکام۔ بھیا ری، تین گیت، ایہا وتی بہت کامیاب مضامین ہیں، ہمارے ہاں خود نوشت کا رواج بہت کم ہے۔ شاید اس لئے کہ ہماری زندگی میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش ہی نہیں آتا۔ یا شاید اس لئے کہ ہم اپنی زندگی سے مستقل طور پر بیزار رہتے ہیں۔ لیکن زندگی میں اہم اور غیر اہم کی تعیین بہت مشکل ہے اور معمولی سے معمولی واقعات بھی زندگی کے مجموعی نظام سے متصل ہونے کی وجہ سے اہم ہو جاتے ہیں۔ ستیارتھی صاحب نے اپنی شخصیت کو ایسے ہی معمولی واقعات کی کھونٹیوں پر سجانا سیکھ لیا ہے۔ کوئی سرسری ملاقات، کسی گیت کے دو بول۔ کوئی مضمون کوئی افسانہ اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ ستیارتھی صاحب کبھی اِن گیتوں کی نوعیت، اُن کی ماتر بھومی۔ اُن کے پیدا کنندہ ماحول پر تنقید کرتے ہیں کبھی اُن سے متعلق ذاتی تجربات اور تاثرات بیان کرتے ہیں اِس وجہ سے اُن کی کتاب اچھوتی بھی ہے دلچسپ بھی۔ لیکن جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا۔ کہیں کہیں اُن کا نسخہ ناکام بھی رہتا ہے۔ مثلاً آپ بیتی خود نوشت میں جذباتیت (Sentimentality.) غالب آجاتی ہے۔ فلسفیانہ خیالات میں سطحیت جھلکنے لگتی ہے۔ سماجی تنقید میں چند مقررہ خیالات کی تکرار پیدا ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ مضمون کے پنجر میں گوشت پوست کا پتہ نہیں چلتا۔

"مَیں ہوں خانہ بدوش" "لنکا دیس ہے کولمبو" "ابھی کوئی تیا سسرال نہیں جائیگی"۔ اور کئی ایک ایسے مضمون ہیں جن میں مواد اور مضمون میں پوری موافقت پیدا نہیں ہو سکی۔ یعنی مواد کے نحیف و نزار جسم پر مضمون کا جامہ بہت ہی ڈھیلا ڈھالا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن کتاب کا سب سے قیمتی حصہ اُس کے صفحات پر جابجا بکھرے ہوئے گیت ہیں۔ جن کی جڑیں بقول ستیارتھی صاحب ہماری دھرتی میں پاتال تک چلی گئی ہیں۔ محض انہیں کے لئے یہ کتاب قابلِ قدر ہے۔ (فیض احمد فیض۔ اے۔ آئی، آر۔ لاہور)

یہ کتابیں نہایت خوبصورت چھپی ہوئی ہیں کاغذ بہت اچھا اور ٹائٹل دیدہ زیب ہیں۔

	قیمت
کتاب العلم	۱۲ر
جزیرہ سخنوراں	" عہ ر
میں ہوں خانہ بدوش	" سے ر

مکتبۂ اُردو لاہور

ادبی جواہر پارے

(ادبِ لطیف کے سابقہ خاص نمبر)

صرف اپریل ۱۹۴۲ء تک رعایت۔ چونکہ اب دفتر میں ان پرچوں کی چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں اسلئے اطلاع دیجاتی ہے۔ کہ جن حضرات کے پاس یہ نمبر نہیں ہیں وہ اس ماہ منگوالیں۔ اسکے بعد بعض پرچے تو ویسے ہی نہیں مل سکیں گے اور باقی پرچوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جائیگا۔ یہ نمبر صوری و معنوی لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہ پرچے بہت اچھی تصاویر پر ہونے کے علاوہ بہت ضخیم ہیں۔ قیمت کیساتھ فی پرچہ ایک آنہ پوسٹیج اور تین آنے رجسٹری کے لئے پیشگی آنے چاہئیں

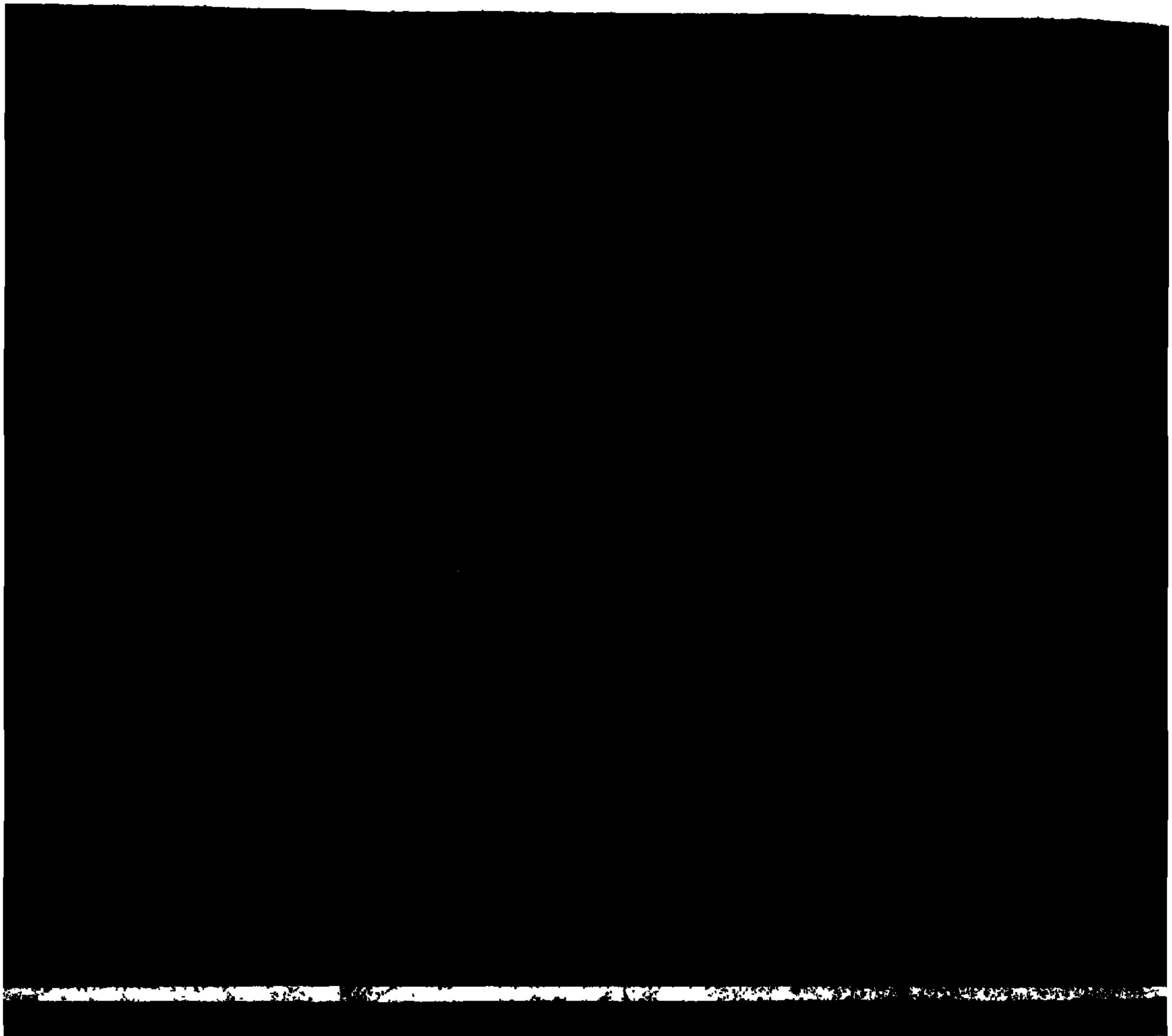
سالنامہ ۱۹۳۶ء	۸ر	سالنامہ ۱۹۳۹ء	۱۰ر	سالنامہ ۱۹۴۰ء	۱۲ر	افسانہ نمبر ۱۹۴۲ء	۱۲ر
" ۱۹۳۷ء	۸ر	افسانہ نمبر "	۸ر	افسانہ نمبر "	۹ر	رشید احمد منیجر ادب لطیف	
افسانہ نمبر ۱۹۳۸ء		ڈراما نمبر "	۸	سالنامہ ۱۹۴۱ء	۱۲ر		

چودھری برکت علی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادب لطیف لاہور سے شائع کیا

Regd. L. No. 3321



دیہاتی زندگی کے مشہور عکاس احمد ندیم قاسمی کے بیس شاہکار افسانوں کا مجموعہ



۱۹۴۴ء

جن

لکھنے والے

جوش ملیح آبادی — فضل احمد کریم فضلی
اختر انصاری — پروفیسر کنہیا لال کپور
اسرار الحق مجاز — یوسف ظفر
اوپندر ناتھ اشک — [illegible] جذبی

لاہور

پانچ آنے

سالانہ چندہ
چار روپے چار آنے

ایڈیٹر
چودھری برکت علی
چودھری نذیر احمد

فی پرچہ
پانچ آنے

ادبِ لطیف لاہور

شمارہ ۴ جون سنہ ۱۹۴۲ء جلد ۱۵

مندرجات

فضل احمد کریم فضلی

ترقی پسند ادب

کچھ عرصے سے "ترقی پسند ادب" کے متعلق میدانِ صحافت میں کارزار جاری ہے۔ جنگ روز بروز گرم ہوتی جا رہی ہے۔ اس گرمی کا اندازہ مرزا ادیب صاحب کے اس مضمون سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو حال ہی میں ادبِ لطیف میں شائع ہوا ہے۔ مرزا صاحب بجائے خود نہایت سنجیدہ و متین ادیب ہیں [illegible] ہے کہ مجھ جیسے "غیر ترقی پسند" کو بھی "گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر" کہنا پڑا۔

اس قسم کی گرم بحثیں ہمیشہ غلط فہمیوں کی بنا پر ہوا کرتی ہیں۔ جب غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں تو بحث کرنے والوں کو یہ معلوم کر کے ہنسی آتی ہے کہ [illegible] اس قدر بحث کر ڈالی۔ موجودہ بحث بھی بڑی حد تک اسی قسم کی غلط فہمیوں کی مرہونِ منت ہیں۔ اگر وہ دور ہو جائیں تو شاید یہ بحث "ختم ہو جائے"۔

پہلی بڑی غلط فہمی تو اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم بحث میں شاعر و ادیب کی اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہر شخص کی طبیعت پر اس کے گرد و پیش کے حالات اور واقعات کا تھوڑا بہت اثر ضرور ہوتا ہے۔ اور ہر انسان میں اپنی شخصیت اور خودی کے اظہار کا جذبہ کم و بیش پایا جاتا ہے۔ مزید برآں اس میں ایک قوتِ اظہار بھی ایسی ہوتی ہے جو دوسروں میں تقابلتہً کم پائی جاتی ہے۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر ایک چیز کو ہم آپ سب ہی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ادیب اسے بیان کرتا ہے تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے دل کی بات کہہ دی جسے ہم نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ قوتِ اظہار مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ مصوری، بت تراشی، معماری، موسیقی، افسانہ نگاری، شاعری وغیرہ وغیرہ۔ بحث کی آسانی کیلئے یہاں صرف شاعری کی مثال لی جاتی ہے۔ ہر حقیقی شاعر میں (زیادہ شاعروں کا ذکر نہیں) یہ تینوں باتیں یعنی اپنے ماحول سے اثر پذیری، جذبۂ اظہارِ خودی اور قوتِ اظہار تو ضرور ہوتی ہیں لیکن چونکہ طبائع میں اختلاف ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی اپنے ماحول کی ایک چیز سے زیادہ متاثر ہوتا ہے کوئی دوسری چیز سے۔ یوں سمجھئے کہ شعرا پھول ہیں اور واقعاتِ عالم سورج کی روشنی کی طرح ان پر [illegible] میں سرخ نظر آتا ہے۔ دوسرا نیلا، تیسرا زرد، یہ سب رنگ اسی سورج کی روشنی ہی کے تھے۔ لیکن ہر پھول نے اپنی ماہیت کے مطابق رنگ قبول کیا۔ اسی طرح کسی شاعر پر قومی اخلاق کی پستی کا زیادہ اثر ہوتا ہے، کسی پر سیاسی واقعات کا، کسی پر محض حسن و عشق ہی کا۔ کوئی اپنی شاعری سے اصلاحِ اخلاق کا کام لینا چاہتا ہے [illegible] قوم کو بیدار کرنا ہے۔ اور کوئی جذباتِ انسانی کی ترجمانی ہی سے سروکار رکھتا ہے اور اس میں بھی کسی کو رنج و غم سے انس ہوتا ہے اور کسی کو مسرت و شادمانی سے۔ کوئی سعدی بنتا ہے، کوئی حالی، کوئی اکبر، کوئی اقبال، کوئی حافظ، کوئی غالب، کوئی میر، کوئی سودا۔ اب یہ کہنا کہ انہیں شاعر تو ہم اسی کو کہیں گے جو [illegible] کرے۔ ویسی ہی زیادتی ہے جس طرح یہ کہنا کہ پھول سرخ ہی رنگ کا ہوتا ہے، یا نیلے ہی رنگ کا یا زرد ہی رنگ کا۔ یہاں تک کہنے کا تو اسے ضرور حق ہے کہ اسے فلاں رنگ کا پھول پسند ہے اور فلاں رنگ کا نہیں۔ لیکن وہ ان پھولوں کے پھول ہونے سے انکار نہیں کر سکتا جن کا رنگ اسے پسند نہیں [illegible] کہنے والا شاعر ہے۔ اس کی شاعرانہ عظمت کا دارومدار اس امر پر نہیں کہ اس کا موضوعِ شاعری کیا ہے بلکہ اس پر کہ اس نے جو کچھ کہنا چاہا ہے اسے کس طرح کہا ہے۔ اس "کس طرح کہنے" ہی میں شاعر کی صناعی کا کمال مضمر ہوتا ہے۔ اگر کوئی [illegible] کے مضامین پیش کرتا ہے تو ہمیں اس سے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ وہ کیوں ایسا کرتا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے بحیثیت صناع کے اسے کس طرح پیش کیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی شاعری حسن و عشق کی ہے تو ہمیں اس سے جھگڑنا نہیں چاہئے بلکہ کمالِ فن پر نظر کرنی چاہئے۔ [illegible] شاعری کو مردود قرار دینا مناسب نہیں [illegible] ہاں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں فلاں قسم کی شاعری پسند ہے فلاں ناپسند۔ ایسا کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہم اپنی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا اس پُرجوش طریقے سے اظہار کرتے ہیں کہ دوسروں کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی پسندیدہ شاعری کے علاوہ اور کسی شاعری کو شاعری ہی نہیں سمجھتے۔ اب اگر انہیں ہماری ناپسندیدہ

دوسری بیسویں صدی کے ماں افسانوی جارحانہ جنگ شروع کر دیتے ہیں اور معاملہ طول کھینچنے لگتا ہے۔

۲- کچھ غلط فہمی افادی ادب اور ادب برائے ادب کی تفریق کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بحث کچھ آج کی نہیں بہت عرصے سے چلی آتی ہے۔ یہاں صرف ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ آزادی ادب کے حامی اکثر اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ادب سے جو افادہ مقصود ہے اس کا انداز روپیہ آنہ پائی یا من سیر چھٹانک میں نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا اندازہ اکثر ذہنی، شعوری اور غیر محسوس طریقے پر ہوا کرتا ہے۔ اس بات کی کتنی ہی مثالیں ہماری تاریخ ادب میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً سعدی کے بلند اور جوشیلے اشعار یا بادشاہ کا اور نہ بخارا کیلئے روانہ ہو جانا مگر یہ مستثنیات میں سے ہیں۔ اور افادی ادب کے حامی ان مثالوں کو افادی ادب میں شامل کرنا غالباً خود بھی پسند نہ کریں گے۔ حصولِ مسرت ہی انسان کی ساری دوڑ دھوپ کا مقصد ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اسی مقصد کیلئے۔ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ خوشی پہنچانا ہی وہ معیار ہے جس سے ہر چیز کی افادیت جانچی جا سکتی ہے۔ خوشی ایک ذہنی احساس ہے جو مختلف چیزوں سے پیدا ہو سکتا ہے، ان چیزوں میں ایک ادب بھی ہے۔ اچھے شعر کو پڑھ کر جو خوشی پڑھنے والے کو ہوتی ہے وہ بھی افادے کی ایک صورت ہے ممکن ہے۔ ان شعراء کا کلام جو وقتی ہنگاموں کو پیش کرتے ہیں وقتی طور پر زیادہ افادیت کا حامل ہو لیکن یہ افادہ اسی وقت تک رہیگا جب تک وہ مسائل حل نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف ان شعراء کا کلام جو نفسیاتِ انسانی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ باعتبار اپنے اثر کے پائندہ تر ہے، چونکہ نفسیاتِ انسانی بدلتی ہیں۔ اس لئے ان اشعار سے انسان اس وقت تک لطف و سرور حاصل کرتا رہیگا جب تک ان کی زبان کے سمجھنے والے موجود رہیں گے۔ پھر ہم ایسے اشعار کو جنہیں شاعر نے کسی خاص افادے کے خیال سے نہیں کہا لیکن جن سے انسان لطف و سرور کی صورت میں مستقل طور پر افادہ حاصل کرتا رہیگا۔ کیسے غیر افادی قرار دے سکتے ہیں؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر افادی ادب والے افادے کے معنی اس قدر مادی اور محدود نہ کریں اور قدرے "گرمِ تماشا" ہوں تو

چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

اس وقت بہت سی آپس کی شکایتیں رفع ہو جائیں گی۔

تیسری اور سب سے بڑی غلط فہمی خود "ترقی پسند" کے لفظ سے پیدا ہوتی ہے۔ اول تو اپنے آپ کو ترقی پسند کہنا ہی کچھ بڑی خوش مذاقی کی بات نہیں۔ سادہ الفاظ میں اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے۔ مغرب میں اپنے آپ کو (Progressive) قرار دینا وہاں کی موجودہ روایات کے مطابق ہے لیکن اس قسم کی خودستائی مشرقی روایات کے خلاف ہے۔ اس میں مغربی نقالی کی ایسی بو پائی جاتی ہے۔ جیسے خود ترقی پسند نظریہ کا سا فی ہونا چاہیئے۔ ہمارے نوخیز ادیب اگر اپنے آپ کو ترقی پسند کہہ کر خوشی حاصل کر سکتے ہیں تو کریں لیکن مشکل یہ ہے کہ بہت سے اور ایسے ادیب ہیں اور شاید ان کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے کہ اگر ان سے پوچھا جائے "کیوں صاحب آپ ترقی پسند ادیب ہیں یا نہیں؟" تو وہ عجب گومگو کی مشکل میں پڑ جائیں۔ اگر "ہاں" کہتے ہیں تو علاوہ میاں مٹھو بننے کے دوسروں کو غالباً رجعت پسند قرار دیتے ہیں۔ اور اگر "نہیں" کہتے ہیں تو اپنے اوپر حرف آتا ہے۔ خیال ہے کہ اپنے آپ کو ترقی پسند کہنے والے حضرات اکثر معنی کے اس پہلو پر نظر نہیں رکھتے کہ اس خودستائی کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کو برا بھی کہہ رہے ہیں جس سے زبردستی لوگوں کو اشتعال ہوتی ہے اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان پر چوٹ کی گئی ہے۔ بہت کچھ موجودہ گرم جوشی اسی اشتعال کا نتیجہ ہے۔ اگر ایسے اشتعال انگیز ٹکڑے کے بجائے کوئی اس قسم کا ٹکڑا استعمال کیا جاتا جس سے اس تحریک کے صحیح نظریہ پر کچھ روشنی پڑتی تو زیادہ بہتر تھا۔ لفظ ترقی خود تشریح طلب ہے، ترقی کا مفہوم اضافی ہے۔ ایک شخص کے نزدیک جو چیز ترقی ہے وہی دوسرے کے نزدیک تنزل۔ انیسویں صدی میں جب ایرانی ادب میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تو ان نئے ادیبوں نے اپنے سامنے فردوسی اور منوچہری کو رکھ کر پرانی شاعری کو پھر نمونہ کے طور پر رکھا۔ یہ ایک قسم کی قدامت پسندی بھی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن ان ادیبوں کے نزدیک یہ ترقی پسندی تھی۔ اس طرح ترقی پسند کا ٹکڑا مبہم بھی ہے جس سے مزید غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا اگر ترقی پسند کے بجائے اجتماعی ادب یا حقیقت پسند ادب کے قسم کے ٹکڑے استعمال کئے جاتے، تو شاید اتنی برہمی نہ پیدا ہوتی۔ تبدل و تغیر قانونِ فطرت ہے، حرکت زندگی ہے اور جمود موت، اس کلیہ سے ادب بھی نہیں نکل سکتا۔ زندگی جو بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے ادب جو زندگی کا عکس ہے وہ بھی ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ چولا بدلنے کا سلسلہ اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ ایک چولا ابھی ٹھیک سے پہنا

یہی نہیں کہ اسے اتنا پہنچا دوسرا اقتصادی ہیں ہے کہ اسے پیٹ کے تیسرا اٹھانا پڑا۔ یہاں تک کہ عالمِ سراسیمگی و حیرانی میں وہ تنگی و بے ماٸیگی کہ سماج ... رہتا یہی حال آج کل مغربی زندگی اور ادب کا ہو رہا ہے۔ مشرقی زندگی اور ادب میں بھی یہ کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ اگرچہ مقابلتہً آہستہ آہستہ ہمارے ادب کا بھی رجحانات و مذاق و رنگ میں تبدیل و تغیر ہوتا رہا ہے۔ جب کوئی نیا رنگ پیدا ہوا تو اسے ایک نیا نام بھی دیا گیا۔ لیکن ایسا جس سے اس رنگ کی خصوصیات جھلکیں۔ مثلاً وقوعہ گوئی، ساحلبندی، مضمون آفرینی، خیال بندی، ایہام گوئی وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ترقی پسند ادیبوں کی اس نیک نیتی سے غالباً کم لوگوں کو انکار ہوگا کہ وہ ہمارے ادب میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں اور وہ اس طرح کہ اسے اجتماعی زندگی کے حقائق سے قریب تر لے آئیں۔ یہ اقدام ہر طرح مبارک ہے اور قابلِ تحسین۔ مگر

"نہ ادب شناس نہ دلبری خطا اینجاست"

یہاں ادب کا استعمال قدرے ذو معنی ہو گیا ہے۔ لیکن میری مراد اس ادب سے ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ

ادب تاجیست از فضلِ الٰہی   بنہ بر سر برو ہر جا کہ خواہی

گوپال متل

دعوتِ فکر

ہر دل وفورِ درد سے ہے بے قرار دیکھ   ہر آنکھ فرطِ غم سے ہے خوں نابہ بار دیکھ
ہاں اس میں نیک و بد کی نہیں ہے کوئی تمیز   ہر شخص ہے ہلاکِ غمِ روزگار دیکھ
انساں کہ کشتۂ ستمِ بے حساب ہے   ہے شاہکارِ صنعتِ پروردگار دیکھ
فکرِ جہاں کے ساتھ جہنم کا خوف بھی   کن آفتوں میں ہے دلِ ناکردہ کار دیکھ
ان میں خزاں کا رنگ بھی شامل ضرور ہے   گہری نظر سے نقش و نگارِ بہار دیکھ
تخریب ہے اصولِ جہانِ خراب کا   ہر ذرہ ہے فساد کا آئینہ دار دیکھ

للہ تجھکو دیدۂ بینا کا واسطہ
اے مدعیِ رحمتِ پروردگار دیکھ

معین احسن جذبی

بیزار نگاہیں

اپنے بھیگے ہوئے رخساروں کو اک آہ کے ساتھ میرے جلتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ رکھے گا کوئی
لبِ رنگیں کی خموشی پہ نہ میں بگڑوں گا میری بے باک نوائی پہ نہ روٹھے گا کوئی
دلِ نازک کے دھڑکنے کی سنوں گا نہ صدا میری گھٹتی ہوئی آہوں پہ نہ چونکے گا کوئی
میری آہٹ پہ لجاتے ہوئے میری جانب ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے نہ آئے گا کوئی
اُن کے ماتھے پہ پڑے گی نہ بناوٹ کی شکن اُن کے کھنچتے ہوئے ہاتھوں کو نہ چومے گا کوئی
میری وحشت کے تماشے نہ انہیں ہوں گے نصیب اُن کے اُلجھے ہوئے بالوں سے نہ اُلجھے گا کوئی
جن سے آجاتا تھا معصوم نگاہوں میں غرور میری بے ربط سی اُن باتوں کو نہ ترسے گا کوئی

دلِ ناشاد! تری چپ سے مگر کیا ہوگا
تیری فریاد بھی سمجھا ہے نہ سمجھے گا کوئی

میں نے جانا تھا کہ اس وقت بڑھا ہے جو یہ ہاتھ اب مرے ہاتھوں سے یہ ہاتھ نہ کھینچے گا کوئی
میں تو سمجھا تھا کہ تا حشر رہے گا اب ساتھ میں تو یوں خوش تھا کہ اب ساتھ نہ چھوڑے گا کوئی

فکر ہی کیا جو کسی کو نہیں پروا میری کیا مجھے غم جو مرا حال نہ پوچھے گا کوئی
اُن کے اُمڈے ہوئے اشکوں سے مجھے کیا مطلب میرے بہتے ہوئے آنسو جو نہ پونچھے گا کوئی
وہ جو خوددار ہیں، خوددار رہیں اے غمِ دل! اُن سے کہہ دو کہ تمہیں یوں تو نہ چاہے گا کوئی

دلِ ناشاد! یہ پھر عرضِ وفا کی خواہش تیری باتوں کو نہ مانے گا، نہ مانے گا کوئی
اب تو بھولے سے بھی اے دل نہ وہاں جاؤں گا ہائے اُن خاص نگاہوں سے نہ دیکھے گا کوئی
ڈوبتے چاند کی سوگند، نہ جاؤں گا وہاں میری بے خواب نگاہوں کو نہ سمجھے گا کوئی
میں نہ جاؤں گا، نہ جاؤں گا وہاں اے شبِ غم اک سسکتے ہوئے دل سے تو نہ کھیلے گا کوئی

اُن سے بیزار ہیں جذبی جو نگاہیں میری
اور تاریک ہوئی جاتی ہیں راہیں میری

جوشؔ

تنہائی کی بادہ خواری کے تاثرات

ساقی بغیر گل جو پیا آبِ آتشیں

کل شام کا ذکر ہے۔ آفتاب خدا خدا کر کے غروب ہو چکا تھا ——— میں بھکم جبر تنہا شراب پینے بیٹھ گیا۔

"آج میں یہ کیا کر رہا ہوں" دل سے آواز آئی۔ گویا میں کسی نئی اور راز کی بات کا ارتکاب کرنے والا ہوں۔

بوتل کھلی، کاگ کھلنے میں جو ایک مزے کی طویل "گڑ" (GOOD) کی سی آواز آتی تھی، نہیں آئی جو آج کاگ کھلنے کا ہنگامہ تھا ایک سسکیاں سا ہوا سا ہے" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

پہلا پیگ بنایا ——— ایسا معلوم ہوا کوئی حاکم جبر کسی نامطبوع مراقبے کے ادا کرنے کا حکم دے رہا ہے اور دو ہی کانی بیس لیے میں ——— میں نے پہلا گھونٹ پیا ——— "آج تو شراب ضرورت سے بہت زیادہ تلخ ہے" میں نے دل ہی کہا ——— معین وقت سے کچھ پیشتر ہی پہلا پیگ ختم ہو گیا ——— سر بھاری ہونے لگا ——— آج شراب پر لگی نہیں۔ اس خیال نے پریشان کر دیا۔

دوسرا پیگ بنایا۔ وہ بھی پہلے کی طرح جلد ختم ہو گیا۔ "آج نشے میں بہاؤ پیدا نہیں ہوگا" دل نے مجھ سے کہا

دوسرے پیگ کے بعد سر اور بھی بھاری ہو گیا۔ تالو کے وہاں گرمی، الجھن، جھنجھناہٹ اور رکاوٹ سی محسوس ہونے لگی۔ نشہ ایک مرکز پر منجمد ہوتا جا رہا ہے۔ اس تصور نے اور بھی آزردہ کر دیا ——— اب کافی بے کیفی کے ساتھ تیسرا پیگ بنایا ——— افسردہ و آوارہ خیالات دماغ کے گھیرے میں گردش کرنے لگے۔ اور دل پر ایک پھیکا سا بے مزہ اور غیر متعین غم سا طاری ہو گیا ——— دل سے آواز آئی "افسوس تنہائی ایک [illegible] ہو گئے خدا بخشے ان تینوں مرحوم پیگوں کو ——— گھبرا کے آنکھیں اٹھائیں۔ سامنے کوئی نہیں تھا۔ دل بند ہونے اور ماحول کی [illegible] کا دم گھٹنے لگا ———

تیسرا پیگ ختم کر کے ایک آدھا پیگ اور بنایا ——— اور صد حیف کہ وہ بھی اپنے مظلوم پیش رووں کی طرح، تنہائی کے [illegible] منتقل ہو گیا ——— میں نے زیرِ لب کہا "اللہ جنت نصیب کرے ان ساڑھے تین شہداء کو" ———

اس کے بعد تسلی کی خاطر یا خود کو فریب دینے کے ارادے سے چند بوندیں گلاس میں ڈال کر سامنے رکھ لیں ——— اور سگار پینا شروع کر دیا ——— سگار کا ایک جھونکا خراش ڈالتا ہوا دل سے مس ہوا۔ سگار کا دھواں، ختن کے کھلے ہوئے بادل کی طرح ہوا میں پیچ و خم کھانے لگا میری نظریں اس دھوئیں پر جم کر رہ گئیں۔ اور دفعتاً ایسا محسوس ہونے لگا گویا ایک جنگل ہے۔ جہاں میں تنہا ٹہل رہا ہوں۔ آدمی ہے نہ آدم زاد، گھر ہے نہ درخت جنگل ہی جنگل ہے، گھنا ہوا اور تاریک۔ دردناک اور خواب آفریں ——— جہاں سناٹا سنسنا رہا ہے اور سوگوارانہ اندھیرا چھایا ہوا ہے ——— میں اس جنگل کے اندر چلا جا رہا ہوں ——— آہستہ گامی کے ساتھ ——— جاتے جاتے کیا دیکھتا ہوں کہ تقریباً سو برس کے بوڑھے ایک گڑھے کے اندر بیٹھے چرس پی رہے ہیں، دم مار رہے ہیں، دم مار مار کر کھانس رہے ہیں، کھانسنے میں ان کی پسلیوں کے نیچے گڑھے پڑ رہے ہیں۔ ——— میں جلد جلد وہاں سے گزر جاتا ہوں، اور اب ایک ایسی جگہ پہنچتا ہوں، جہاں تین گز دہ پشت برچھیاں، تھر تھر کانپتی نظر آتی ہیں، [illegible] جنگل کی چڑیلیں ہیں۔ یہ خیال آتے ہی بدن کے تمام رونگٹے جھن سے ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسری پگڈنڈی پر تیز تیز رفتار دوڑنا [illegible] پشت سے کھٹ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ مڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہی تینوں چڑیلیں بیساکھیاں بغل میں دبائے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی تعاقب

کر رہے ہیں۔ میں بھاگتا ہوں اور بھاگتے ہوئے سنتا ہوں۔ ایک خوفناک کپکپاتی ہوئی آواز "کہاں جا رہے ہو بیٹا" میں اب اور زور سے بھاگتا ہوں۔ یکلخت گھنٹے گھنٹے کی آواز معدوم ہو جاتی ہے۔ اور میں دم لینے کے لئے ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہوں کہ بائیں جانب سے سرسراہٹ کی خوفناک آوازیں آنے لگتی ہیں۔ مڑ کر دیکھتا ہوں کہ لانبے لانبے سیاہ سانپ، موٹے موٹے اژدہے چاروں طرف رینگ اور کلبلا رہے ہیں —— میری طرف سر اٹھا اٹھا کر پھنکار رہے ہیں۔ میں ان کی پھنکاروں کو پنڈلیوں سے لے کر کنپٹیوں تک محسوس کر رہا ہوں۔ میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی ہے کہ یکایک میری پشت پر نہایت ہی مکروہ اور خوفناک آواز میں ایک گدھا چیخنے لگتا ہے جس کی دہشت سے میں بری طرح اچھل پڑتا ہوں۔ ایک سانپ میری طرف تیزی سے رینگنے لگتا ہے اور میں گدھے کی پیٹھ پر جست کر کے بیٹھ جاتا ہوں اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ اگلے پل کہ سوکھی ہوئی گھاس کے انبار ملتے ہیں۔ جن کے وسط میں پہنچ کر گدھا میری رانوں کے نیچے سے یکایک غائب ہو جاتا ہے اور میں پیدل راہ طے کرنے لگتا ہوں — اور جب گھاس کے پولوں کا سلسلہ ختم ہونے کے قریب آتا ہے تو دیکھتا ہوں چند جوان گیدڑ ایک بوڑھے گیدڑ کو حلقے میں لئے ہوئے سرگوشیاں کر رہے ہیں —— جوان گیدڑ دو پلی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہیں۔ اور بوڑھا عمامہ باندھے ہوئے ہے۔ میں جب ان کے قریب سے گزرتا ہوں۔ تو وہ سب مجھے افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں اور بوڑھا گیدڑ تالو سے زبان لگا کر "تچ تچ" کی آواز نکالتا اور اپنے رفقاء سے میری جانب اشارہ کر کے کہتا ہے "یہ بیچارہ تنہا مسافر کس قدر تھکا اور مغموم نظر آتا ہے" —— میں یہ سنتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہوں تو مجھے اپنے پر ترس آنے لگتا ہے کہ اتنے میں ایک بوڑھی جھاڑی سے نکلتی ہے، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھنڈی سانس بھرتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے —— میرا دل یادوں سے بوجھل ہو جاتا ہے —— نیند میرے سر کے اندر رینگنے لگتی ہے جس کے اندر غم بھی سرسراتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک پھیکا سا بے کیف اور غیر متعین غم —— اسی جنگل میں ایک [illegible] اور بیٹا ہوں۔ جیسے قطرہ قطرہ کر کے پینا شروع کرتا ہوں — جس سے مجھ پر نیند کا اور بھی غلبہ ہونے لگتا ہے، ایسی نیند جس میں [illegible] ہوئے غم کی آمیزش ہوتی ہے جس میں آگ اور برف کا باری باری سے دل پر چرکا لگتا ہے۔ جس میں پھیلاؤ اور بہاؤ نہیں بلکہ بندھے [illegible] ہے۔ اور جس کے اندر ایک عجیب گھٹن پیدا کرنے والی افسردگی، الجھی ہوئی ڈور کی طرح پیچیدہ افسردگی ہوتی ہے جس کے پیچ و خم [illegible] ہوئی سلوٹیں اور بھرے ہوئے چہروں کی گرہیں ابھری ہوئی نظر آتی ہیں —— جس میں آنسو نہیں نکلتے، اور آنکھیں ریگستان کی طرح گرم و [illegible] ہو جاتی ہیں —— میں اس عالم میں جنگل کے اندر بڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ اور تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک اندھے کنوئیں کے قریب پہنچتا ہوں جہاں [illegible] بہت سی چھوٹی چھوٹی سفید بکریاں کھڑی نظر آتی ہیں، سوگواری کے ساتھ سر جھکائے ہوئے، کوئی میرے کان میں کہتا ہے۔ ان بیچاری بکریوں کا کوئی پیارا ہمراہی تازہ ہو گیا ہے، شاید وہ اپنے جوانا مرگ محبوب چرواہے کو یاد کر رہی ہیں۔ اور [illegible] ہوئے چرواہے کی صورت ذہن میں ابھر نہیں رہی ہے۔ اس لئے وہ اس قدر مغموم اور بے کیف نظر آ رہی ہیں —— حسرت ہے بکریاں کیسی اداس ہیں؟ یہ سوچتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ اور دیکھتا ہوں کہ ایک بہت پرانا اور بہت گہرا تالاب ہے جس کا مردہ پانی، کائی کا کفن پہنے صدیوں سے سو رہا ہے جس کے چاروں طرف درختوں کی شاخیں اس طرح جھکی ہوئی ہیں جس طرح مردے کو دفناتے وقت لوگ قبر کے چاروں طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں —— تالاب کے کنارے ایک دو بالشت اونچا درخت ہے۔ جس کی کھلائی شاخوں پر چار پانچ جھینگر جو آپس میں سگے بھائی ہیں۔ بیٹھے ہوئے اپنے بوڑھے باپ کی سرد مہری اور ہوس پرستی کی شکایت کر رہے ہیں جس نے اس بڑھاپے میں عقد ثانی کر کے انہیں گھر سے باہر نکال دیا ہے۔ سب سے چھوٹا بھائی تو بیچارہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے۔ خاندان برباد [illegible] مردہ اور [illegible] ہیں۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں —— میں وہاں سے اور آگے بڑھتا ہوں۔ تیز قدموں کے ساتھ۔ اب میں تقریباً جنگل کے وسط میں پہنچ گیا ہوں، اف کس قدر دلگیر اور دینے والی گرمی ہے، میں محسوس کر رہا ہوں۔ اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہوں کہ چلتے چلتے ایک باؤلی نظر آتی ہے۔ یہ شاید خود خواہ بھوتوں کا مرگھٹ ہے مجھے ایسا خیال پیدا ہوتا ہے۔ باؤلی کے قریب بہت بڑا برگد کا درخت ہے۔ دل میں کہا شاید اس درخت کو تیر [illegible] تھا۔ نظر اٹھاتا ہوں تو برگد کی شاخوں پر دیکھتا ہوں۔ صدہا سر لٹکے ہوئے ہیں جن سے تازہ خون کی

برنیاں چاشپ زمین پہ گر رہی ہیں ——— جن کی دمیں ترشی اور داڑھیاں گھنی ہوئی ہیں۔ اور داڑھی کے ہر بال سے آواز آرہی ہے "تمنا شمنوں کو کرد دیم و جان دادیم و بمقصد خود نرسیدیم" میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں دیوانہ وار، اور جیسے ہی ایک چٹان پر چڑھنا چاہتا ہوں، نہایت کڑکتی ہوئی مہیب آواز آتی ہے "باش باش او بے حیا" کہ فرطِ خوف سے میں دھم سے زمین پر گر پڑتا ہوں۔ تھوڑی دیر پڑا رہتا ہوں، اور بڑی ہمت کر کے ایک دوسری پگڈنڈی پر روانہ ہو جاتا ہوں ——— میں کہاں جا رہا ہوں، میری منزل کیا اور کدھر ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، لیکن میں چل رہا ہوں، برابر چل رہا ہوں، تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ ——— کہ ایک گھنے درخت کے نیچے دم لینے ٹھہر جاتا ہوں ——— درخت کی الجھی ہوئی شاخوں سے عجیب قسم کی بھن بھناہٹ کی سی آوازیں آنے لگتی ہیں ——— "توبہ توبہ" میرا دل کہتا ہے "شہد کی مکھیوں میں کسی بزرگ خاندان کی اچانک موت کے بعد ترکے پر نزاعِ لفظی ہو رہی ہے۔" میں وہاں سے بھی چل کھڑا ہوتا ہوں، اور کوئی دو فرلانگ کے بعد ایک دلدل ملتی ہے جس کے ایک کونے میں ساتوں مدد کی بھٹیاریاں گھٹنوں گھٹنوں دلدل میں دھنسی ہوئی ایک دوسرے کو فحش گالیاں دے رہی ہیں۔ اور کوستی بھی جاتی ہیں۔ جونہی میں ان بھٹیارنیوں کے قریب جاتا ہوں تو وہ ساتوں بھٹیاریاں مجھے دیکھتے ہی آپس کی گالی گلوچ موقوف کر کے میری طرف ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہنے لگتی ہیں "مرنے کے اس موتے کو ابھار میاں اسے کھائیں۔ اس پر علی کی تیغ ٹوٹے، یہ مرا اُبد نظر آ ہمیں سنا دیکھ رہا ہے!"

چنانچہ میں وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوتا ہوں، بھاگنے کا اب مجھ میں دم باقی نہیں رہا ہے کسی طرح اپنے کو کھینچتا ہوا میں وہاں سے اسی کا ایک تین فرلانگ نکل جاتا ہوں کہ مجھے ایک منحوس آدمی درخت کی چوٹی پکڑا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مجھے چونچ کیوں دکھا رہا ہے۔ میں نے اس کی کیا خطا کی ہے۔ مجھے اس کی طرف نہ دیکھنا چاہئے۔ سر جھکا کر روانہ ہو جاتا ہوں کہ یکایک مجھے متلی سی ہونے لگتی ہے۔ پسینے میں نہا سا جاتا ہوں اور دفعتاً ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کوئی بدکلام بوڑھی بیوہ مخمل سروتے سے عین میری کھوپڑی کے اندر بیٹھی ہوئی ڈلی کاٹ رہی ہے۔ کٹا کٹ، کٹا کٹ۔ اور ڈلی کے ٹکڑے ٹکڑے میرے کلیجے میں بم کے گولوں کی طرح لگ رہے ہیں جس سے متلی میں اور بھی اضافہ ہو رہا ہے ——— میں دو گھونٹ اور پیتا ہوں گرم گرم اور [illegible] اف میری رگیں سنسنا اور سر اڑ رہا ہے۔ ہائیں میرے سر پر تو ایک دہکتا ہوا لانبا منارہ تعمیر ہو چکا ہے۔ اف کس قدر وزن، اور کتنی [illegible] میں نے محسوس کیا ——— میں سر کو جنبش دے رہا ہوں کہ منارہ گر جائے، منارہ اور بھی لانبا ہوتا چلا جا رہا ہے ——— ناچار اس منارے کو اٹھائے [illegible] اٹھاتا ہوں ڈگمگ ڈگمگ کرتا ہوا ——— کہ منارے کے اندر روپ متی اور باز بہادر کا ناٹک ہونے لگتا ہے۔ اور روپ متی کے ڈھاریں مار مار کر رونے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اف کس قدر دردناک ڈرامہ ہے ——— منارے کو سر پر لادے اب میں پھر حرکت میں آتا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے "یہ شاید دوسرا بارِ امانت ہے۔ ایک بارِ امانت تو ازل کے دن انسان نے اٹھایا تھا جس کے جلیتوں 'ظلوم و جہول' کا اس نے خطاب پایا تھا۔ اب یہ دوسرا بارِ امانت [illegible] کے بعد میں نے اٹھایا ہے۔ معلوم نہیں مجھے کیا خطاب ملنا چاہئے ——— اسی عالم میں راہ قطع ہوتی ہے اور ایک موڑ پر پہنچتا ہوں۔ جہاں کسی بلند مقام سے آواز آتی ہے۔ "کہاں جا رہے ہو میاں عبدالصمد" کیا میں "عبدالصمد" میں تبدیل ہو چکا ہوں۔ میں دل سے سوال کرتا ہوں، اور جواب کا انتظار کئے بغیر چلتا رہتا ہوں کہ کوئی دو سو قدم چلنے کے بعد پشت سے آوازیں آنے لگتی ہیں "واہ بے واہ۔ واہ بے واہ" "ابے یار، گستاخی کر رہا ہے" مڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ دو موٹے موٹے مدراسی مردوں پر مسی ملی بتیسیاں پھیلائے ہوئے دوڑتے چلے آ رہے ہیں [illegible] تماشا [illegible] اٹھا اٹھا کر کہہ رہے ہیں "واہ بے واہ۔ واہ بے واہ" کہ میں گھبرا کر ایک درخت پر چڑھ جاتا ہوں، اور مدراسی ایک نشیبی پگڈنڈی پر اترنے لگتے ہیں۔ اترتے وقت وہ اپنی دھوتیاں اپنے کاندھوں پر ڈال لیتے ہیں۔ اف ان کے بدن کس قدر سیاہ اور چکنے ہیں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا ہوتا ہوں کہ میری پشت کی شاخ کو حرکت ہوتی ہے [illegible] دیکھتا ہوں کہ دو شاخوں کے اتصال پر ایک مولانا محوِ خواب ہیں۔ میں انہیں جگاتا ہوں۔ "اخاہ جوش صاحب ہیں" یہ کہہ کر وہ مجھ سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ "آپ کا اسمِ گرامی" "مولانا آپ مجھے بھول گئے؟ بدایوں کا مولوی" "استغفر اللہ۔ مولانا" "استغفر اللہ" اس زور سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں درخت کے نیچے گر پڑتے ہیں۔ گرتے ہی مولانا تو غائب ہو جاتے ہیں اور میں پھر حسبِ دستور چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ اور اب چلتے چلتے کیا دیکھتا ہوں کہ جنگل کی تاریکی میں

بہت اضطراب ہو رہا ہے۔ میں اپنا گلاس خالی کرتا ہوں۔ ایک ناگن سی میری رگ رگ میں دوڑ جاتی ہے۔ درخت سے گرنے کا ڈر جسم میں باقی نہیں رہتا لیکن دل کی دھڑکن چھپی ہوئی گھبراتی ہیں۔ نظر اٹھاتا ہوں۔ مغرب کی چوٹیوں پر شفق پھیلی ہوئی ہے۔ سامنے ایک لانبا سا سرخ آنکھوں والا ایک سیاہ پوش آدمی کراہتا ہوا ایک طرف سے آ رہا ہے۔ وہ میرے قریب آ گیا ہے۔ میں ڈر گیا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ وہ ڈوبتے سورج والے دھندلے سے شہر کی طرف اشارہ کر کے بین کر رہا ہے۔ چھاتی پیٹ رہا ہے اور اپنے بالوں کو نوچ رہا ہے ... میرا دل بھر آیا ہے۔ چاہ رہا ہوں خود بھی رونے لگوں، لیکن نہیں رو سکتا۔ میں ٹھنڈی سانسیں بھر رہا ہوں۔ مسہری چرچرا رہی ہے اور بین کرنے والا بین کرتے ہی چلا جاتا ہے۔

غم غلط کرنے کے لئے میں وہاں سے تیز تیز دوسری طرف روانہ ہو گیا ہوں۔ تھوڑی دور پہنچ کر ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے کوئی غیبی ہاتھ میرے پیچھے پیچھے مجھے بھگا رہا ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہو رہی ہے۔ "میں دردناک چیخ مار کر کہہ رہا ہوں تم مجھے پروا نہیں" کوئی ڈانٹ کر جواب دے رہا ہے۔ میری پنڈلیاں برابر کھائی جا رہی ہیں۔ مجھے بھاگے جانے میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے پہلی بار مجھے اندازہ ہو رہا ہے ---- اس ہاتھ سے نگاہیں بچنے کی خاطر میں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا ہوں۔ بھگانے والے کا ہاتھ، دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور وہ برابر میری پنڈلیاں کھا رہا ہے۔ کہ میں ایک سامنے کے اندھے کنوئیں میں دھم سے کود پڑا ہوں۔ بس یہ کر دیتے ہی بھگانے والے ہاتھ کے چوٹ سے ٹوٹ جانے کی آواز کنوئیں میں گونج رہی ہے ---- میں بمشکل وقت کنوئیں سے نکلتا ہوں۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا ہوں۔ ایک سیاہ پانی کی جھیل ہے جس کے کنارے پر ایک کالی بھینس کھڑی ہوتی ہے۔ سر جھکائے منہ دم ہلا رہی ہے، کان، اس کے دونوں سینگوں پر دو منحوس پرندے آ بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں ---- میں اس بھینس سے ٹکرا گیا ہوں۔ اس کی دم کے بال میرے نتھنوں میں پیوست ہو گئے ہیں۔ مجھے چھینکیں آ رہی ہیں۔ متلی ہو رہی ہے ---- میں کالی بھینس کے نیچے میں اس کے تھنوں کے نیچے لیٹ گیا ہوں۔ لیٹتے ہی سو گیا ہوں۔ سوتے ہی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جیسے کوئی اژدہا میرے جسم کو اپنے پیچ و خم میں لئے مروڑ رہا ہے اور سرہانے سے آواز آ رہی ہے :-

"ہائے ہائے، ہائے ہائے، ہائے ہائے"

[illegible]

ہم لوگ

جس طرف دیکھو نکل کر اپنی خلوت گاہ سے
جا بجا ٹوٹے پڑے ہیں زندگی کے تار و پو
گلستاں والے ہوئے اپنی بہاروں کے حریف
طائرانِ خوش نوا خاموش، گل بے رنگ و بو
زیرِ دامانِ فلک تھی نہیں راہِ فرار
اب سکوں گلگشت میں ہے نے کنارِ آبِ جو
دل کے تاروں سے نکلتے ہی نہیں نغماتِ درد
ناگہاں گھٹ کر رہ گیا سینوں میں سوزِ آرزو
دل کی تسکیں کو بہانہ اور ہی اب ڈھونڈئیے
ضعف سے ہے نے قناعت ہے نہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

مسعود پرویز

مغربی موسیقی پر تنقید

کسی فن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نقاد اُس فن کی ارتقائی منازل اور اُن کی خصوصیات سے کما حقہ واقف ہو۔ اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے ارتقا کے دوران میں زیر بحث فن نے مختلف ذہنی تصورات اور جذباتی کیفیات کے اظہار کے لئے کون کون سے وسائل اختیار کئے۔ اور پھر اُن سے انحراف کرنے میں کون کون سے اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ جب تک ہم کسی فنی کارنامے کو اُس کی گذشتہ ارتقائی تاریخ کی روشنی میں نہ دیکھیں گے ہم نہیں جان سکتے کہ اُس کے مختلف پہلوؤں کی صحیح اہمیت کیا ہے۔ مثال کے طور پہ جدید اردو یا انگریزی شاعری کو لیجئے۔ اس میں ہمیں شاعری کی پرانی روایات سے انحراف نظر آتا ہے۔ جہاں یہ انحراف محض فنی عجز کو ظاہر کرتا ہے۔ وہاں تو فن کی حیثیت تصنع سے کچھ زیادہ نہیں۔ لیکن جہاں اس انحراف کا کوئی خاص مقصد ہے۔ وہاں اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ہم شاعری کی گذشتہ روایات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ شاعری کی جدید کینوس پر تنت نئے نقوش ابھرتے نظر آ رہے ہیں ــــــ لیکن ان کا پس منظر ہے ــــــ اس کا مطالعہ کرنا بھی اشد ضروری ہے۔

اسی طرح مغربی مصوری کی جدید تحریک (Surrealism) کو لیجئے۔ اگر ہم نے مغربی مصوری کی ارتقائی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تو ہم یقیناً اس جدید مصوری کے متعلق بحیثیت ایک فن کے کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اپنی ناواقفیت کے باعث یہ کہہ دیں کہ اس قسم کی مصوری میں کوئی معنی نہیں اور اپنے آپ کو نقاد تصور کریں تو یہ بعینہٖ ایسے ہوگا۔ جیسے کوئی مغربی اصولوں سے بے بہرہ مصور کاغذ پہ چند الٹے سیدھے خطوط کھینچ کر اپنے آپ کو (Surrealist) سمجھنے لگے۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر فن اپنے ارتقا کے دوران میں چند ایسے اصول وضع کر لیتا ہے جو اس کے مستقبل کو متعین کرنے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ہم ان اصولوں کا اُن قوموں یا فرقوں سے متعلق مطالعہ کریں، جن میں فن نے پرورش پائی تو ہمیں اصل میں ان قوموں یا فرقوں کے ذہنی رجحانات کو پیش کرنے میں اسی ملک کے فن پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس ملک کے باشندوں کے ذہنی رجحانات کا بھی مطالعہ کرنا ہم پر لازم ہے۔ اگر ہم اپنی قوم کے ذہنی رجحانات سے ایک مناسبت رکھنے کی وجہ اپنے فن کو بہترین تصور کریں اور اسی فن کی کسوٹی پر ہر قوم کے فن کو پرکھنے کی کوشش کریں تو نہ صرف ہم اپنے فنی اصولوں کا غلط استعمال کریں گے بلکہ دوسرے فن کا صحیح مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے۔ کسی غیر قوم کے فن کو پرکھتے وقت ہمیں اس فن کے اپنے اصول اور اس قوم کے اپنے ذہنی رجحانات پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اور جب تک ہم ان سے پوری طرح آگاہ نہ ہو جائیں ہماری تنقید نہ صرف لا حاصل بلکہ گمراہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

تنقید کی ان بنیادی ضروریات کو نظر انداز کرنے سے نقاد جن غلط نتائج پر پہنچ سکتا ہے اُس کی ایک واضح مثال آپ کو ہمایوں بابت مئی ۴۲ء کے ایک مضمون بعنوان "ہندوستانی موسیقی" میں ملے گی۔ اس مضمون میں مغربی موسیقی کو ہندوستانی موسیقی کے سامنے ہیچ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گذشتہ بحث کی روشنی میں مضمون نگار کے تنقیدی زاویہ نظر پر ایک بنیادی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ نقاد نے ایک غیر مانوس اور غیر ملکی لطیف فن کو ہندوستانی موسیقی کے اصولوں پر پرکھنے کی جرأت کی ہے۔ ایک ایسا نظام موسیقی جو ہندوستانی نظام موسیقی سے اصولاً مختلف ہو اُسے آپ ہندوستانی موسیقی کے اصولوں پر پرکھتے ہیں ــــــ کیا یہ کوشش بالکل ایسی نہیں جیسے کوئی شیکسپیئر کے سامنے اس کے اشعار کی فاعلاتن فاعلات کے اصولوں پر تقطیع کرے اور پھر جھنجلا کر اس نتیجے پر پہنچے کہ صاحب یہ شعر تو کسی بحر کے پابند ہی نہیں ــــــ بہر حال جناب مضمون نگار (مضمون) ہمایوں کے اسی شمارے میں لکھتے ہیں؟ مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ "باوجود اس قدر تہذیب و تمدن اور ترقی کے جن کے ماننے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا مغربی اقوام کا موسیقی نظام ابھی تک بے مزہ اور بھدا ہے۔ بھدا اس لئے کہ موسیقی میں راگ مرادوستان یا تو ہمیں نہیں یا اس درجے اور پائے کے نہیں جن کو ہم جانتے ہیں۔ نہ ان میں سروں کی ویسی

ترکیب و ترتیب ہے جن سے کسی راگ یا راگنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ اس موسیقی کو عمر بھر سنئے کبھی آپ کے ذہن میں اس کے سروں کا باہمی رشتہ نہ آئے گا۔ اگر کوئی دھن اتفاق سے مبنی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہو تو سمجھ لیجئے کہ ہندوستانی موسیقی کی خوشہ چینی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ نقاد مغربی موسیقی میں ہندوستانی موسیقی کی جھلک ڈھونڈ رہا ہے۔ یہ نہ ملی تو مغربی موسیقی کو رو کھا پھیکا، بے مزا اور جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی موسیقی زمزمہ اور تان کو اہمیت نہیں دیتی اور نہ ہی بھیروں یا جھانگیری کو الاپنا جانتی ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ایسی بیہودہ ہے یا اس میں کوئی لذت نہیں۔ آپ بھیروں یا جھانگیری سننے کی امید پر مغربی موسیقی کی طرف توجہ دیں، عمر بھر کی سماعت کے بعد بھی آپ بازیاب نہ ہوں گے۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ آپ با ذوق ہوتے ہوئے بھی مغربی موسیقی کے اصولوں سے آگاہ نہ ہو جائیں، اس کے سروں کا باہمی رشتہ آپ کے ذہن میں نہ آ جائے اور آپ لطف اندوز نہ ہوں۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو: "مغرب کے مردوں کا گانا تو سرے سے قابلِ ذکر ہی نہیں۔ وہاں کی خواتین بھی موسیقی کے مذاق سے بے بہرہ ہیں۔ . . . مغربی موسیقی تو محض کوہم و غم کے لئے موزوں ہے۔"

اس قسم کی تنقید مغربی مصنفین کے اُن جاہلانہ خیالات کی یاد دلاتی ہے جو کبھی ہندوستانی موسیقی کے متعلق اُن کے دل میں جاگزیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی موسیقی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ چہرہ بگاڑ بگاڑ کر اور ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر ـــــ جیسے کوئی اناڑی تیراک پانی میں غوطے کھا رہا ہو ـــــ چند سروں کے بے ربط مجموعے کو طبلے کی بے ہنگم دھیں دھیں کے ساتھ بار بار دہرایا جائے۔ اور اس روحانی اذیت کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے دو ایک بے سرے ساز تمام وقت گانے والے کا منہ چڑاتے رہیں۔ یہ زمانہ گذر گیا۔ اب فوکس سٹرینگ ویز، ایلمنسٹ، پاپلے وغیرہ کی تنقیدیں پڑھیں، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہی بے ربط اور تکان آور موسیقی میں اب روحانی لذت پیدا ہو گئی ہے۔ مغربی نقاد مشرقی فنون کے قریب تر آتے جا رہے ہیں۔ لیکن خیال ہے کہ مشرقی فنون کے دلدادہ اور غیر نقاد مغربی فنون کو پرکھنے میں اسی غلطی کے مرتکب ہیں۔ جہاں تک مغربی نقادوں کی تنقید کا ... زیر بحث مضمون کے آخری حصہ میں مضمون نگار رقمطراز ہے: "بعض مغربی نقادوں کا اعتراض ہندوستانی موسیقی پر یہ ہے کہ اس میں 'ہارمنی' نہیں یعنی سنگت میں اس کے ساتھ بہت سے ساز نہیں ہوتے۔ یہ اعتراض ایک اصولی غلطی پر مبنی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کا مقصود ہی ایک مستقل اور دیرپا اثر سامعین کے دلوں پر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ غل مچانا اس کا مقصد نہیں۔ اس لئے اس کی سنگت میں جہاں تک مناسب معلوم ہوتا ہے ساز کم ہی رکھے جاتے ہیں۔"

مضمون نگار "ہارمنی" کی اصلیت سے یکسر ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ مختلف سروں کے بیک وقت سنائی دینے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، اُسے "ہارمنی" کہتے ہیں۔ مثلاً اگر گویا کچھ گا رہا ہو اور اس کے ساتھ، کسی خاص نغماتی کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے، ساز پر کوئی اور سر بجا سکے، تو مجموعی طور پر جو کیفیت پیدا ہو گی، اُسے "ہارمنی" کہیں گے۔ اس کے لئے لازمی نہیں کہ سنگت میں بہت سے ساز ہوں۔ ایک ساز بھی کافی ہے۔ مگر حسبِ ضرورت زیادہ ساز بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔

اب رہا "غل مچانے" کا سوال ـــــ آزاد قوموں کی موسیقی پر جوش اور حیات افروز کیوں نہ ہو؟ دستورِ زباں بندی غلاموں ہی کو زیب دیتا ہے۔ جہاں لوگوں کی یہ حالت ہو کہ "گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے"۔ وہاں کوئی آواز بھی نکلے گی تو دبی ہوئی، سہمی ہوئی۔ لیکن وقت آ رہا ہے جب ہندوستانی موسیقی میں زندگی کی وہی لہر دوڑے گی جو آزاد قوموں کا حصہ ہے۔ ابھی تک ہم مغربی موسیقی کے جوش و خروش میں شریک نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے محض شور و غل سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں انتظار کرنا چاہئے۔

یہ ظاہر ہے کہ مغربی موسیقی کا ہر فرد، بیتھوفن، باخ، موزارٹ اور شوبرٹ ایسے غیر فانی نغمہ نگاروں کی نمائندگی نہیں کرتا۔ اور نہ ہی کوئی "سا سے ۔ ۔ ۔ سے" کو ادا کرنے سے لازمی طور پر ہندوستانی موسیقی کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اچھے اور برے فن کار مغرب میں بھی ملیں گے اور مشرق میں بھی۔ ایک محدود تجربے کی بنا پر مشرقی یا مغربی موسیقی کو اچھا یا برا کہنا شدید غلطی ہے۔ جب تک کسی فن کے متعلق ہمارا مطالعہ وسیع نہ ہو اور ہم نے اسے غیر جانبدارانہ زاویہ نظر سے دیکھ کر اس کے حسن و قبح کے متعلق غور نہ کیا ہو، ہمیں اس فن پر تنقید کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

شہاب ملیح آبادی

ننگا فقیر!

ننگا فقیر صبح یہ کہتا ہوا گیا ، "بابا قدم قدم پہ ہے دم قدم کی خیر"
رقت کی لَو سے شمعِ خیالات بجھ گئی رخشندگیٔ شیوۂ اہلِ کرم کی خیر
زُلفِ حیات رفتہ میں کیا پیچ و خم ہیں آج زُلفِ حیاتِ رفتہ کے ان پیچ و خم کی خیر
پھر ہے رمیدگی کے لئے آج بے قرار آہوئے خرامِ وقت کے اس ذوقِ رم کی خیر
دُنیا و دیں کی شمع ہے بادِ زیاں سے سرد شمعِ ضمیر و مشعلِ دیر و حرم کی خیر
آشفتگیٔ فقیر کی بوجھل نگاہ سے رُوئے جمیل و حجلۂ بیت الصنم کی خیر
سکتے میں ہیں زمانے کی دولت نشانیاں ضربِ کلاہ و حربۂ تاج و علم کی خیر
دوزخ کے تُند و تیز تھپیڑوں کی چوٹ سے سازِ اُمور و نغمۂ باغِ ارم کی خیر
اک زہر کا پیالہ ہے ہر قطرۂ شراب مینائے بزمِ خسروی و جامِ جم کی خیر
ہر زمزمہ ہے نوحۂ پیہم کی ایک لہر ان زمزموں کے ڈھتے ہوئے زیر و بم کی خیر
آسودگی کو آج ترستی ہے ہر نگاہ فکرِ مآل و وسوسۂ کیف و کم کی خیر
وارفتہ تر ہے کاتبِ تقدیرِ روزگار میراثِ عصر و وارثِ لوح و قلم کی خیر

ابلیسیت کے ہات میں تہذیب کی لگام
دارائے کائنات کے جاہ و حشم کی خیر

اختر انصاری

ایک واقعہ

"روکو! ــــ ارے گاڑی روکو! ــــ گاڑی رکواؤ! ــــ"

یکایک یہ آواز انٹر کلاس کے مسافروں کو سنائی دی، اور وہ چونک سے پڑے۔

یہ تھرڈ برتھ تھی اور انٹر کلاس میں گنتی کے چند آدمی تھے ــــ پانچ مرد اور ایک عورت! مردوں میں سب سے نمایاں شخصیت جن صاحب کی تھی وہ اگرچہ دیکھنے میں ایک مہاجن معلوم ہوتے تھے۔ مگر اصل میں ایک وکیل تھے۔ اُن کا قد چھوٹا تھا اور جسم بھاری۔ مٹاپے کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں بہت ہی چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ وہ سیٹ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے تھے۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی لحیم شحیم آدمی کے دھڑ میں ایک چھوٹے سے تندرست و توانا بچے کے ہاتھ پاؤں جوڑ دیئے گئے ہیں۔ اُن کی گردن بھی بہت چھوٹی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ٹھوڑی بالکل سینے سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ٹھوڑی سینے کے اس حصے کو مس کر رہی تھی جس حصے کو ایک داڑھی والے شخص کی داڑھی مس کیا کرتی ہے۔ ان کے وکیل ہونے کی ایک بدیہی علامت یہ تھی کہ وہ مسلسل بول رہے تھے، اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر اپنے ساتھیوں سے بے تکان باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اُن کے دو ساتھیوں میں سے ایک جن کو وہ خان صاحب کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ان کے اپنے قصبے کے میونسپل کمشنر تھے ان کی سب سے بڑی خصوصیت آواز کی بلندی اور لہجے کی کرختگی تھی۔ وہ وکیل صاحب کی بات کا جواب دیتے تو یہ معلوم ہوتا کہ انجن کی سیٹی کا جواب دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے لحاف کو اوڑھنے کی بجائے اپنے نیچے بچھا رکھا تھا اور مزے سے ایک پوری سیٹ پر دراز تھے۔ ہر تین چار منٹ کے بعد وہ اپنا ایک ہاتھ دونوں رانوں کے بیچ میں ڈال کر کھجانے لگ جاتے تھے۔ وکیل صاحب کے دوسرے ساتھی ایک آنریری مجسٹریٹ تھے جو ان کے برابر بیٹھے ہوئے اپنے دونوں دوستوں کی باتوں پر ایک بزرگانہ تبسم کی بارش کر رہے تھے۔ بات کرتے وقت بھی اُن کا انداز بزرگانہ ہوتا تھا۔ ایک باریک دھوتی پر ایک باریک کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ البتہ ٹانگوں پر ایک اُونی دوشالا ڈال رکھا تھا۔ یہ تینوں احباب خالص سرکاری قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کے پاس کلکٹروں، ڈپٹی کلکٹروں، تحصیلداروں، پولیس انسپکٹروں، بورڈ کے ممبروں اور اسی نوع کے دوسرے لوگوں کے زوال و اقبال کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو کیلئے نہ تھا۔ فلاں کلکٹر بڑا بدمعاش ہے، فلاں ڈپٹی کلکٹر نہایت سیدھا سادہ باتونی ہے۔ فلاں سب انسپکٹر اگرچہ ہے تو سب انسپکٹر، مگر بڑے بڑے حکام کو خاطر میں نہیں لاتا ــــ یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں تھیں۔ جن سے وہ ایک دوسرے کی تواضع کر رہے تھے

ان تینوں آدمیوں کے علاوہ ڈبے میں ایک میاں بیوی بھی تھے۔ میاں ایک اوپر کی سیٹ پر اپنا بستر بچھائے گہری نیند کے مزے لے رہے تھے وہ اپنے ایک بھتیجے بھانجے کی شادی میں شریک ہو کر واپس ہو رہے تھے۔ اور کئی دن کی جسمانی تھکن کو ریل میں اتار رہے تھے۔ اُن کی بیوی نیچے سیٹ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی جس پر وکیل صاحب اور آنریری مجسٹریٹ صاحب آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ متوسط طبقے کی ایک سیدھی سادھی عورت تھی ــ ایسی عورت جس کی ساری زندگی برتن مانجھنے، جھاڑو دینے اور بچے پیدا کرنے میں ہی گزر جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر شائستگی یا اوپری ٹیپ ٹاپ کا کوئی قابلِ ذکر اثر نہ تھا، نہ لباس سے ظاہری بنے ٹھنے کا شوق ظاہر ہوتا تھا۔ وہ نوجوان ہوتے ہوئے بھی اُن نوجوان عورتوں سے بہت مختلف تھی جو نک سک سے درست اور نوک پلک سے آراستہ ہوتی ہیں اور دیکھنے والے کو نظر جما کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ اُس کے ہونٹ پان کی سرخی تک سے محروم تھے اُس کو حسین کہنا بھی دشوار تھا کیونکہ اُس کی صورت شکل بہت معمولی تھی اور کوئی خاص کشش اپنے اندر نہ رکھتی تھی۔ البتہ نقوش میں ایک لطیف

نرمی اور آنکھوں میں ایک پاکیزہ روشنی کی جھلک ناقابلِ شمار طور پر پائی جاتی تھی۔ اور اسی بنا پر اُس کو کم رو یا بدصورت کہنا بھی کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ غرض یہ کہ وہ ظاہر اور فطری سادگی کا مجسمہ تھی۔ شاید یہ اسی سادگی کا نتیجہ تھا کہ وہ بغیر کسی جھجک کے اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی اور نہایت انہماک کے ساتھ وکیل صاحب، خان صاحب اور آنریری مجسٹریٹ صاحب کی باتیں سن رہی تھی۔ وکیل صاحب بول رہے ہوتے تو اُن پر نظر جمائے رہتی، خان صاحب کچھ کہتے تو اُن کی طرف دیکھنے لگتی، اور آنریری مجسٹریٹ صاحب اپنی بزرگانہ بلندی سے کوئی بات کہتے تو اُس کی توجہ اُن کی طرف ہو جاتی ہر تین چار منٹ کے بعد خاں صاحب اپنا ایک ہاتھ دونوں رانوں کے بیچ میں ڈال کر کھجانے لگتے تو اُس کی نظر خاں صاحب کے ہاتھ کی جنبشوں پر جم جاتی، اور اُس وقت تک جمی رہتی جب تک کہ خاں صاحب کے ہاتھ کی یہ مصروفیت ختم نہ ہو لیتی۔

ڈبے کا چھٹا مسافر جو تیسری سیٹ پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھا، ایک لکھنوی ٹھاٹھ کا نوجوان شاعر تھا۔ لکھنوی ٹھاٹھ کا محض اس لئے کہا گیا کہ جس طرح اُس کی شاعری لکھنوی انداز کی تھی اسی طرح اُس کی ریشمی ردائی سے لکھنوی نفاست کا ثبوت ملتا تھا۔ ورنہ یوں وہ ایک داڑھی مونچھ صفا چٹ قسم کا نوجوان تھا اور ہر حیثیت سے مغربی طور طریقوں کا دلدادہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ وکیل صاحب، خاں صاحب اور آنریری مجسٹریٹ صاحب کی ختم نہ ہونے والی گفتگو کو حقارت اور بے توجہی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اُس کو افسوس تھا کہ یہ لوگ شعر و شاعری سے کوئی مس نہیں رکھتے اور گھٹیا قسم کی غیر شاعرانہ باتوں میں اپنا دماغ کھپاتے ہیں۔ وہ اُن کی ساری گفتگو کو کھوکھلا اور بے مغز سمجھتے ہوئے دل ہی دل میں اُن کو قابلِ نفرت ٹھہرا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اُن کی بھدی اور غلط اردو پر جی ہی جی میں کڑھنے لگتا، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی زباندانی پر ایک فخر سا محسوس کرتا۔ وکیل صاحب "سہولیت"، "تابعداد"، "لاپرواہی"، "انکساری" اور "ناہمواری" جیسے غلط اور مہمل الفاظ استعمال کر رہے تھے، اور خاں صاحب مستقل طور پر "آوے ہے" اور "جاوے ہے" قسم کی غیر فصیح اور دہقانی زبان بول رہے تھے۔ اس ناقص زبان سے شاعر کی مہذب سماعت مجروح ہو رہی تھی اور وہ نفرت کے مارے منہ پھیر پھیر لیتا تھا۔ ڈبے میں اگر کوئی چیز اُس کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی تھی تو وہ نوجوان عورت تھی۔ اس غیر شاعرانہ اور مادیت زدہ ماحول میں یہی ایک ایسی چیز تھی جو اپنے اندر کچھ شعریت، کچھ لطافت، کچھ رومانیت اور کچھ غزلیت رکھتی تھی۔ ہر چند کہ وہ حسین نہ تھی۔ مگر کسی حسین عورت کی عدم موجودگی میں شاعر اسی کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ وہ اُس کو غور سے دیکھ رہا تھا تاکہ اس کے متعلق کوئی شدید جذبہ محسوس کر سکے، اور یوں دو چار شعر موزوں کرنے میں کامیاب ہو جاتے (چند مصرعے تو اُس کے ذہن میں پیدا ہو چکے تھے) وہ اُس کی ہر ادا کا جائزہ لے رہا تھا۔ کبھی وکیل صاحب کوئی تعجب خیز یا خندہ انگیز بات کہتے تو اُس کا یعنی نوجوان عورت کا منہ تھوڑی دیر کے لئے کھلا اور کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ اُس وقت شاعر اپنے دل میں کہتا، "کیسا خوبصورت ہے اِس کا منہ! اور کتنے رسیلے ہیں اِس کے ہونٹ! مگر افسوس کہ یہ پان نہیں کھاتی! اگر یہ پان کھائے ہوئے ہوتی تو اِس کے سرخ ہونٹ کتنے اچھے معلوم ہوتے! یہ جو اِس کے چہرے پر ایک پھیکا پن اور اس کے علاوہ حسن میں ایک بھدی کمی سی پائی جاتی ہے اس کا سبب صرف یہی ہے کہ یہ پان نہیں کھاتی۔ کاش یہ پان کھایا کرتی! کاش . . . . . ." پھر خاں صاحب اپنا ہاتھ دونوں رانوں کے بیچ میں ڈال کر کھجانے لگ جاتے اور نوجوان عورت اُن کے ہاتھ کی جنبشوں کا مطالعہ کرنے لگتی۔ اُس وقت شاعر اپنی نظریں نوجوان عورت کی نظروں پر جما دیتا اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ یہ حد سے زیادہ بے تکلف عورت کب اپنی نظریں خاں صاحب کے ہاتھ پر سے ہٹاتی ہے۔ مگر اُس کی نظریں وہیں جمی رہتیں اور شاعر اپنے دل میں سوچنے لگتا، "اس دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی سمجھدار اور حساس عورت ہو جو ایک لمحے سے زیادہ اس نظارے کی تاب لا سکے۔ پھر یہ نوجوان عورت کیوں اس نظارے سے حریصانہ طور پر لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہی ہے؟ کیا وہ سمجھدار اور حساس نہیں ہے؟ . . . . . اور یہ مرد؟ یہ بے تمیز اور جاہل انسان؟ کیا یہ گدھے سے بدتر نہیں ہے؟ . . . . . ." اتنے میں خاں صاحب کے ہاتھ کی مصروفیت ختم ہو جاتی اور نوجوان عورت کی نظریں وہاں سے ہٹ کر وکیل صاحب کے چہرے پر جم جاتیں۔ وکیل صاحب کوئی تعجب خیز اور خندہ انگیز بات کہتے۔ عورت کا منہ تعجب سے کھلتا اور کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ شاعر اپنے دل میں کہتا، "افسوس کہ یہ پان نہیں کھاتی! اگر یہ پان کھائے ہوئے ہوتی تو اِس کے سرخ ہونٹ کتنے ہوتے! . . . . . ."

یہ تھے انٹر کلاس کے ڈبے کے چھ مسافر۔ پسنجر ٹرین تھی جو ہر اسٹیشن پر ٹھہرتی ہوئی آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا اور شام کا وقت۔ اس لئے بیشتر کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور چھ مسافروں میں سے کسی ایک کو بھی اتنا ہوش نہیں تھا کہ گاڑی کب اسٹیشن پر ٹھہرتی ہے اور کب روانہ ہوتی ہے۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری اور دو منٹ بعد روانہ ہوئی۔ انٹر کلاس کے مسافر اس سے بے خبر رہے مگر جب گاڑی پلیٹ فارم کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تو یکایک یہ آواز سن کر وہ چونک سے پڑے: "روکو!—— ارے گاڑی روکو—— گاڑی رکواؤ!——"

نوجوان عورت کے شوہر اور لکھنوی شاعر کے علاوہ (کہ ایک گہری نیند کے نشے میں چور تھا اور دوسرا شعر، محبت اور جوانی کی مرثیوں میں غرق) چاروں مسافر—— وکیل صاحب، خاں صاحب، آنریری مجسٹریٹ صاحب اور نوجوان عورت—— اپنی اپنی جگہ سے اُٹھے اور جدھر سے آواز آئی تھی اُدھر کی کھڑکیاں کھول کر باہر جھانکنے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ انٹر کلاس کے ڈبے کے برابر جو ڈبہ ہے اُس کے ہتھے کو ایک شخص دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے لٹک رہا ہے اور اُن کی طرف دیکھ دیکھ کر متواتر چیخ رہا ہے: "گاڑی روکو!—— گاڑی رکواؤ—— میں مر جاؤں گا!"

یہ ایک دیہاتی تھا جو پچھلے اسٹیشن سے چلتی گاڑی پر سوار ہوا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کو چھوڑنے پر مجبور تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ٹکٹ نہ خریدنے پر بھی مجبور تھا۔ ظاہر ہے کہ پلیٹ فارم پہنچ کر گاڑی میں اُس وقت بیٹھنا جب کہ وہ کھڑی ہوئی تھی، اُس کے لئے ناممکن بات تھی۔ چنانچہ جب گاڑی روانہ ہو گئی اور پلیٹ فارم سے بھی کچھ آگے نکل گئی تو وہ اُچھل کر گاڑی پر چڑھ گیا اور ہتھے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھول کر اندر جانا چاہا تو دروازے نے کھلنے سے انکار کر دیا۔ یہ اصل میں ایک فسٹ کلاس کا ڈبہ تھا اور مسافروں سے خالی ہونے کی بنا پر مقفل تھا۔ جب وہ اپنی پوری قوت صرف کر کے بھی اس کو نہیں کھول سکا تو اُس نے سوچا کہ کھڑکی کے راستے سے اندر چلا جاؤں۔ مگر کھڑکی کا بھی شیشہ چڑھا ہوا تھا اور یہ راہ بھی مسدود تھی۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ نیچے کود پڑے۔ مگر گاڑی کی رفتار بہت تیز ہو چکی تھی، اور زمین بجلی کی سی سرعت کے ساتھ مخالف سمت میں جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے نیچے کود پڑنے کی ہمت اپنے اندر نہ پائی۔ زور زور سے چیخنا شروع کر دیا: "گاڑی روکو!—— ارے گاڑی رکواؤ!——"

انٹر کلاس کے مسافروں نے اپنے سر کھڑکیوں سے باہر نکالے تو انہوں نے اُس کو ہتھے سے لٹکا ہوا پایا۔

وکیل صاحب چیخ کر بولے، "ابے اندر چلا جا—— دروازہ کھول کے اندر چلا جا"

خاں صاحب نے بھی بے اختیار یہی مشورہ دیا: "اندر چلا جا!"

"دروازہ بند ہے" دیہاتی چلّایا۔

انٹر کلاس کے مسافروں نے صورتِ حال کا اندازہ لگایا اور کافی غور و خوض کے بعد دوسرا قیمتی مشورہ عنایت کیا: "ابے نیچے کود پڑ!——" زمین بجلی کی سی سرعت کے ساتھ مخالف سمت میں اڑی چلی جا رہی تھی۔ دیہاتی اس خودکشی پر تیار نہ ہوا۔ اور بدستور چیخے گیا: "گاڑی رکواؤ!—— میں مر جاؤں گا!——"

انٹر کلاس کے مسافروں کے ذہن میں اُس زنجیر کی یاد تازہ ہو گئی جسے کھینچ کر گاڑی کو رکوایا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے کنکھیوں سے زنجیر کی طرف دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں بھی انہیں زنجیر لہراتی ہوئی نظر آئی۔ وکیل صاحب، خاں صاحب، آنریری مجسٹریٹ صاحب—— تینوں کے دماغ میں ایک ہی خیال گونج رہا تھا: "زنجیر کھینچنی چاہیے!" اور تینوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اسی ایک خیال کو پڑھ رہے تھے۔ اس ناخوشگوار خیال سے جان بچانے کے لئے انہوں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔

"حرامزادہ نیچے نہیں کود پڑتا۔ فضول چلّائے جا رہا ہے۔" وکیل صاحب نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو نچاتے ہوئے کہا۔

خان صاحب نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا اور اپنی آواز کی پوری بلندی اور لہجے کی تمام تر خفگی کے ساتھ چیخ کر کہا "بے وقوف نیچے کود پڑنا۔ نیچے کیوں نہیں کود پڑتا ہے؟"

آنریری مجسٹریٹ صاحب اپنے بزرگانہ انداز میں بولے "کم بخت جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں —— اس طرح چلتی گاڑی پر سوار ہونے کی کیا ضرورت تھی۔!"

تینوں بے معنی طور پر چیخ رہے تھے!

تینوں کے دماغ میں ایک ہی خیال گونج رہا تھا "زنجیر کھینچنی چاہئے —— زنجیر کھینچنی چاہئے —— زنجیر کھینچنی چاہئے ——"

تینوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اسی خیال کو پڑھ رہے تھے۔

اور تینوں اپنی بے معنی چیخ و پکار کے ساتھ ساتھ دل ہی دل میں یہ کہہ رہے تھے: "زنجیر کون کھینچے! آنا بڑا اقدام کون کرے! بیٹھے بٹھائے مفت کی مصیبت کون مول لے! ——"

گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی!

زمین زیادہ سے زیادہ سرعت کے ساتھ مخالف سمت میں دوڑ رہی تھی!

دیہاتی برابر چیخ رہا تھا: "گاڑی رکواؤ! —— میں مرا! —— گاڑی رکواؤ! ——"

نوجوان عورت کبھی وکیل صاحب کو دیکھتی تھی کبھی خان صاحب کو اور کبھی آنریری مجسٹریٹ صاحب کو۔ جب اس نے دیکھا کہ ان لوگوں کی چیخ پکار کسی نتیجے پر نہیں پہنچتی اور گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے تو اس نے کمال سادگی اور انتہائی بے ساختگی کے ساتھ اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور زنجیر کھینچ لی۔

وکیل صاحب، خان صاحب اور آنریری مجسٹریٹ صاحب کی چیخ و پکار بند ہو گئی۔ تینوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک مطمئن ضمیر کے ساتھ کھڑکیوں سے جھانک کر باہر دیکھا۔

دیہاتی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ نہ وہ ہتھے سے لٹک رہا تھا نہ کہیں زمین پر پڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"گر پڑا" تینوں ایک ساتھ بولے "زنجیر بھی ناحق کھینچی!"

"ہے ہے، گر پڑا!" نوجوان عورت نے بے ساختہ کہا، اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

شاعر اپنی لکھنوی ٹھاٹھ کی ریشمی رضائی میں لپٹا ہوا، اور شعر، محبت اور جوانی کی لذتوں میں کھویا ہوا بدستور اپنی سیٹ پر دراز تھا۔ اس نے نوجوان عورت کا کھلا ہوا منہ دیکھا اور اپنے دل میں کہا "افسوس کہ یہ پان نہیں کھاتی! اگر یہ پان کھاتے ہوتی تو اس کے سرخ ہونٹ کتنے اچھے معلوم ہوتے! . . . ."

کنہیا لعل کپور

اُردو افسانہ نویسی کے چند نمونے

[یہ مضمون صرف عام پڑھے لکھے آدمیوں کی رہنمائی کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس سے مجھ کو کسی شخص کی دلآزاری یا دل شکنی مطلوب نہیں]

گذشتہ چند سالوں میں اردو افسانہ نویسی نے قابلِ رشک ترقی کی ہے۔ کسی زمانے میں اُردو ادب پر شعرا کا تسلط تھا۔ آج کل شعرا کی جگہ افسانہ نویسوں نے لے لی ہے۔ چنانچہ شاید یہی وجہ ہے۔ کہ اگرچہ ہمیں مرحوم علامہ اقبال کا نعم البدل نہیں مل سکا۔ اور مرحوم منشی پریم چند کے ایک سے زیادہ جانشین پیدا ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو اپنی جانشینی کا اخبارات اور رسائل میں اعلان بھی کر دیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب منشی پریم چند کی جانشینی کے اسلئے حقدار ہیں۔ کہ وہ دیہات کے متعلق افسانے لکھتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ درست ہے۔ کہ وہ اپنے کسی افسانے میں دیہات کی فضا کا صحیح نقشہ پیش نہیں کر سکے۔ مگر ان کا دعویٰ ہے۔ کہ اُن کے ہر افسانے میں ہل، بیل اور اُپلے کے الفاظ آپ کو ضرور ملیں گے۔ جن سے آپ کی معلومات میں قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔ اسی طرح ایک اور حضرت منشی پریم چند کے اسلئے جانشین ثابت ہوتے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے ہر ایک افسانے میں ساس اور بہو کی لڑائی کو زوردار الفاظ میں بیان کیا ہے۔ غرضیکہ ہر ایک افسانہ نویس کسی نہ کسی وجہ سے اگر پریم چند کا جانشین نہیں۔ تو ثانی ضرور ہے۔ یہ امر جہاں اردو ادب کے لئے خوشی کا موجب ہے وہاں عام پڑھے لکھے آدمی کے لئے پریشانی کا باعث بھی ہے۔ کیونکہ آجکل افسانے اس تعداد میں اور اس کثرت سے لکھے جا رہے ہیں کہ اگر انہیں ایک قطار میں کھڑا کیا جائے۔ تو شاید اُن کا سلسلہ لاہور سے لیکر حیدر آباد دکن تک پھیلتا ہوا نظر آئے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ موجودہ دور کے افسانوں کو سمجھنے کے لئے اُن کے چند نمونے پیش کئے جائیں۔

۱۔ ترقی پسند افسانے

سب سے پہلے ترقی پسند افسانے ہیں۔ یہ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی قسم وہ ہے جس میں ایک مزدور پر حد سے زیادہ ظلم ڈھایا جاتا ہے۔ اور آخر میں اُسے مار کر پڑھنے والے کے دل میں اُس کے لئے ہمدردی پیدا کی جاتی ہے۔ عموماً یہ مزدور تار کے کھمبوں یا پہاڑ کی چوٹی سے گر کر مرتے ہیں۔ کئی دفعہ سڑک پر پتھر کوٹتے کوٹتے ان کو دمہ یا تپِ دق کا شدت کا دورہ پڑتا ہے۔ اور اُن کی تھوک میں لال رنگ کی ایک گہری لکیر دیکھی جاتی ہے۔ بعض دفعہ ان کو اس قدر بید یا چابک لگائے جاتے ہیں۔ کہ وہ کھڑے کھڑے مر جاتے ہیں۔ یہ ترقی پسند افسانہ نویسی کی سب سے پہلی منزل ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ اس قسم کے افسانے صرف پچیس فیصدی ترقی پسند ہیں۔

اس سے زیادہ ترقی پسند افسانے وہ ہیں جن میں مزدور پر ظلم اور مزدور کی عورت سے عشق کیا جاتا ہے۔ ان افسانوں میں عموماً سرمایہ دار سڑک کوٹنے والی، کارخانوں میں کام کرنے والی۔ اور گھر میں برتن صاف کرنے والی مزدور عورتوں کو پھسلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور عموماً اُن کو روپے یا نوٹ کا لالچ دے کر ان کی عصمت پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ پچاس فیصدی ترقی پسند افسانے ہیں۔

اس کے بعد وہ افسانے ہیں۔ جن میں مزدور سرمایہ دار کی بیوی سے عشق کرتا ہے۔ عموماً یہ مزدور ایسے بوڑھے سرمایہ دار کے گھر ملازم ہوتا ہے۔ جس نے بڑھاپے میں دوسری یا تیسری شادی کرنے کی غلطی کی ہے۔ چند دن کے راز و نیاز کے بعد یہ مزدور اپنے مالک کی بیوی کو ساتھ لے کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ یا موقع پاکر بوڑھے سرمایہ دار کو زہر وغیرہ کھلا کر اپنا راستہ صاف کرتا ہے۔ سو فیصدی ترقی پسند وہ افسانے ہیں۔ جن میں بھائی بہن سے یا بیٹا ماں سے عشق کرتا ہے۔ عموماً یہ بھائی اور بہن نہایت تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر فرائڈ کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ اور ان کی نظر میں بہن بہن نہیں، ایک عورت ہوتی ہے۔ اسی طرح بھائی بھائی نہیں بلکہ ایک مرد۔ ان افسانوں کو لکھنے والے عموماً وہ نوجوان یا رنڈوے مصنف ہوتے ہیں جن کی کسی

وجہ سے شادی نہیں ہو سکی۔ یا جن کی ماں اور بہن اس قدر خوبصورت ہیں۔ کہ یہ گوارا نہیں کر سکتے۔ کہ کوئی غیر آدمی اُن کے ساتھ محبت کرے علاوہ ایسے افسانے لکھتے وقت بھول جاتے ہیں کہ یہ ہندوستان ہے جہاں آئندہ دو ہزار سال تک سوائے اپنی بیوی کے کسی اور عورت سے عشق نہیں کیا جا سکتا سو فیصدی ترقی پسند افسانوں میں وہ افسانے بھی شامل ہیں۔ جن میں مصنف اپنے ذاتی تجربات کسی احمق شخص کی زبان سے بیان کرتا ہے۔ اس میں ہمیں مصنف کے طوائفوں کے پاس جانے یا بھکارنوں کو بھگانے کے واقعات نہایت صاف گوئی سے لکھے جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو اتنا بتانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ کہ آجکل مصنف کن جنسی امراض میں مبتلا ہے۔

۲۔ جذباتی افسانے

ترقی پسند افسانوں کے بعد جذباتی افسانے آتے ہیں۔ جذباتی افسانوں میں جذبات اور احساسات کی شدت کو نمایاں طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ مختلف جذبوں کے زیر اثر افسانے کے کردار عجیب و غریب حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں مثلاً ایک افسانے میں سریش کو جب پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے نرملا سے شادی نہیں کر سکتا۔ تو وہ نرملا کو اس طرح مخاطب کرتا ہے: "نرملا۔ تم آج سے میری بہن ہو۔" "تمہاری بہن؟" نرملا نے گھبرا کر کہا۔ "ہاں ہاں میری بہن"۔ سریش نے بہن کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم آج سے میری بہن ہو۔ کاش کہ تم عمر میں مجھ سے پانچ دس سال بڑی ہوتیں۔ اور میں تمہیں "ماں" کہہ سکتا"۔ اسی طرح ایک افسانے میں دو بھائی ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے ہیں۔ مگر جب چھوٹے بھائی کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا بڑا بھائی اُن دونوں کی مشترکہ محبوبہ سے شادی کرنے کو تلا ہوا ہے۔ تو وہ مندر میں دیوی یا دیوتا کے سامنے اُس لڑکی کا ہاتھ اپنے بڑے بھائی کے ہاتھ میں دے کر خود سادھو بن کر زندگی گزارنے کا حلف اُٹھاتا ہے۔ جذباتی افسانوں میں قہقہے۔ آنسو۔ سسکیاں۔ جھگڑے۔ قسمیں کثرت سے پائے جاتے ہیں عموماً انجام خودکشی ہوتا ہے۔ اور محبت کے دیوتا کے سامنے عجیب و غریب قربانیاں کی جاتی ہیں۔

۳۔ دیہاتی افسانے

جذباتی افسانوں کے بعد ایک آدھ نمونہ دیہاتی افسانوں کا بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ افسانے اپنے دلکش ماحول اور طرزِ تحریر کی سادگی کی وجہ سے بے حد مقبول ہیں۔ ان میں یہ کوشش کی جاتی ہے۔ کہ کوئی ایسی بات تحریر نہ کی جائے جو غیر فطری یا غیر دیہاتی ہو۔ چنانچہ تشبیہیں استعارے محاورے سب دیہاتی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ احساسات تک دیہاتی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "بگیاں کا قد کماد کے پودے کی طرح لمبا۔ اور اُس کے گال ٹماٹر کی طرح سرخ تھے۔ اُس کی آنکھیں جگنو کی طرح چمکتی تھیں۔ اور اُس کی باتیں شکر سے زیادہ میٹھی تھیں۔ وہ جب گوبر سے اُپلے بناتی۔ تو اُس کے گوبر سے لت پت ہاتھ اِس طرح معلوم ہوتے جیسے کسی دلہن نے دل کھول کر مہندی لگائی ہے۔ اس وقت شیرو اُس کو دیکھ کر اس طرح بیتاب ہو جاتا۔ جس طرح گائے کو ملنے کے لئے بچھڑا۔ وہ اپنا ہل کندھوں سے اُتار کر پھینک دیتا۔ اور بگیاں کی طرف اس طرح دیکھتا۔ گویا۔ وہ بگیاں نہیں بلکہ کپاس کا خوبصورت پھول ہے۔ اس وقت اُس کے دل میں خیال آتا۔ کہ وہ بگیاں کو اپنے مضبوط بازوؤں میں پکڑ لے اور اُسے اس زور سے بھینچے۔ کہ اُس کا چہرہ انار کے پھول کی طرح سرخ ہو جائے"

۴۔ نفسیاتی افسانے

جذباتی اور دیہاتی افسانوں کے بعد ہم نفسیاتی افسانوں کو لیتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہیرو یا ہیروئن کی دماغی کشمکش کو صفحۂ قرطاس پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکثر یہ دکھایا جاتا ہے۔ کہ جس وقت انسان سوچنے لگتا ہے۔ تو اُس کے خیالات کا سلسلہ ایک ٹیڑھی لکیر کی مانند ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک ہی سیکنڈ میں معشوق۔ ڈاک خانے اور ہوائی جہاز کا تصور کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نفسیاتی افسانے کا ہیرو جس کو اُس کی محبوبہ نے کاٹھ کا اُلو کہا ہے۔ سڑک پر جا رہا ہے۔ اُس کے محسوسات یا احساسات کو اس طرح بیان کیا جائیگا۔

"اُس نے سوچا۔ کہ کیا وہ سچ مچ کاٹھ کا اُلو ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا حتیٰ کہ اُسے اپنے کاٹھ کے اُلو ہونے کا کچھ کچھ یقین ہونے لگا۔ تو اُس نے دل میں کہا۔ اُلو کوئی خاص برا پرندہ نہیں۔ خدا جانے اس کو لوگوں نے مفت میں کیوں بدنام کر رکھا ہے۔ اُلو ایک تاجر کی طرح الگ تھلگ

زندگی بسر کرتا ہے۔ زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر۔ مسجد . . . . ہاں۔ آج صبح اُس نے مسجد کے پاس ایک خوبصورت لڑکی دیکھی تھی . . . . شراب پینے دے مسجد میں . . . . اُسے شراب چھوڑے ہوئے کتنی مدت ہو گئی تھی . . . . غالب چھُٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی . . . . پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں . . . . کتنا خوبصورت شعر ہے۔"

اسی طرح اِن افسانوں کی ایک قسم وہ ہے جسمیں تجزیہ نفس کیا جاتا ہے۔ مثلاً حمید حیران تھا کہ اُسے اپنی بیوی سے نفرت کیوں ہے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا۔ کہ اُس کی بیوی رضیہ کوئی بدصورت بھی نہیں۔ پھر کیا وجہ تھی۔ کہ اُس کے نزدیک آنے پر اُس کی روح لرزنے لگتی۔ اور اُس کا جی چاہتا کہ وہ دوڑ کر اپنے ہمسائے کے گھر پناہ گزیں ہو۔" اس طرح لکھنے کے بعد ہمیں اشاروں اشاروں میں بتایا جاتا ہے کہ دراصل بات یہ تھی۔ کہ جب حمید اور رضیہ بچپن میں ایک دوسرے سے کھیلا کرتے تھے۔ تو رضیہ حمید کو بُری طرح پیٹا کرتی تھی۔ اور جب حمید دو برس کا خوبصورت بچہ تھا۔ تو ہمسائے کی عورتیں اُسے نہایت پیار سے گود میں لیا کرتی تھیں۔ ان بچپن کے واقعات نے حمید کے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ بڑا ہو کر اُسے ہمسائے کی عورتیں خوبصورت اور اپنی بیوی بدصورت نظر آنے لگی۔

تیسری اور آخری قسم نفسیاتی افسانوں کی وہ ہے جسمیں خیالات کا لامتناہی سلسلہ بیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ کوشش کی جاتی ہے۔ کہ افسانے میں کہانی کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔ مثلاً کہانی کا ہیرو بازار میں سے گزر رہا ہے۔ ایک دکان پر وہ ایک خوبصورت لڑکی کو رومال خریدتے ہوئے دیکھتا ہے اور اُس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس رنگ کا لڑکی نے رومال خریدا ہے۔ وہ رنگ اُسے نہایت مرغوب ہے۔ دوسری دکان پر وہ ایک نئے شادی شدہ جوڑے کو کچھ آرائش کی اشیاء خریدتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور اُس کے دل میں عجیب و غریب خیالات آتے ہیں۔ مثلاً دلھن دُلھا سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اُسے نہ صرف ساڑھی پہننے کا سلیقہ ہی آتا ہے۔ بلکہ اُسے ساڑھی کا کنارا چننے میں بھی کمال حاصل ہے۔ اُس کے آویزے گو قیمتی نہیں مگر خاص بُرے بھی نہیں۔ اِس دکان سے وہ ایک ہوٹل میں جاتا ہے۔ جہاں ہوٹل کی خادمہ کو دیکھ کر اُسے اپنی محبوبہ یاد آجاتی ہے۔ ہوٹل سے نکلتے ہی وہ ایک بھکارن کو دیکھتا ہے۔ جو پھٹے پُرانے کپڑے پہننے کے باوجود اُسے نہایت دلکش نظر آتی ہے۔ وہ اُس کی ہتھیلی پر ایک آنہ رکھ دیتا ہے۔ اور آہستہ سے پوچھتا ہے۔ کیا تم شادی شدہ ہو۔ مگر بھکارن کا جواب سُنے بغیر وہ آگے چلا جاتا ہے۔ بازار کے اخیر پر وہ ایک پاگل آدمی کو سکول کے لڑکوں میں گھرا ہوا دیکھتا ہے۔ اور اُسے پکڑ کر گھر لے آتا ہے۔

اِس قسم کا افسانہ پڑھتے وقت آپ یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ شاید کہانی اگلے صفحہ پر شروع ہوگی۔ مگر ایں خیال است و محال است و جنوں۔ آپ بیشک انتظار کئے جائیں۔ کہانی کا ہیرو ہرگز کوئی ایسی حرکت نہیں کریگا۔ جس سے پلاٹ میں باقاعدگی کے پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔ افسانہ ختم ہو جاتا ہے اور آپ کی مایوسی غصے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِس قسم کے افسانے عموماً ۲ فرلانگ لمبا بازار یا دس منٹ بازار میں کے عنوان سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اور موجودہ دور کے افسانوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

۵۔ حقیقت نگاری۔

موجودہ افسانوں کی ایک قسم وہ ہے جسمیں حقیقت نگاری کو معراج پر پہنچایا جاتا ہے۔ اِس قسم کے افسانوں میں ہر ایک چیز تفصیل سے بیان کی جاتی ہے۔ اور جزئیات اِس افراط سے دی جاتی ہیں کہ بعض دفعہ پڑھنے والے کا سر چکرا جاتا ہے۔ مثلاً ہماری گلی میں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ ہماری گلی کا طول ۷۰ فٹ ۸ انچ اور عرض ۱۲ فٹ ۴ انچ ہے۔ گلی کا فرش نہایت خستہ حالت میں ہے۔ جگہ جگہ اینٹیں اکھڑی پڑی ہیں۔ ایک جگہ تو ایسا گڑھا پیدا ہو گیا ہے۔ کہ اُس کو پُر کرنے کے لئے ۲۰۰ اینٹیں درکار ہیں۔ جو بزرگ ہماری گلی میں رہتے ہیں۔ اُن کی عمر ساٹھ سال آٹھ ماہ اور چھ دن ہے۔ اُن کی داڑھی کے ستر فیصدی بال سفید ہو چکے ہیں۔ وہ ایک لال رنگ کی ٹوپی پہنتے ہیں جس پر تقریباً ایک سو بیس دھبے گرد و تیل کے ہوں گے۔ یہ بزرگ ہر روز صبح کے ۶ بجکر پچاس منٹ پر اپنے کُتے کو ساتھ لے کر سیر کو جاتے ہیں۔ ان کے کُتے کا رنگ خاکی بال سیاہ ہے۔ قد کوئی دس انچ اور دم ۳ انچ ہوگی۔

سیر کرتے وقت پہلے پانچ منٹ میں یہ کتا ان بزرگ کے سامنے ڈٹا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ان کے پیچھے ہو لیتا ہے" وغیرہ وغیرہ

چنانچہ اس قسم کے افسانوں میں کوئی فقرہ بغیر تشریح کے نہیں لکھا جاتا۔ مثال کے طور پر صرف اتنا ہی لکھنا کافی نہیں کہ "ہیرو نے سیب کاٹا"۔ یہ فقرہ اس طرح لکھا جائیگا۔ "اُس نے اپنے کوٹ کی دائیں جیب سے بہت دیر ٹٹولنے کے بعد چاقو کی بجائے پنسل نکالی۔ وہ پھر جیب میں چاقو کو ڈھونڈنے لگا چند منٹوں میں وہ چاقو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ چاقو اس نے وزیر آباد میں ایک روپیہ دس آنہ میں خریدا تھا۔ اس کا دستہ ہڈی کا اور پھل فولاد کا تھا۔ اُس نے چاقو سیب پر رکھا۔ مگر سیب پھدک کر ایک طرف کو سرک گیا اور جلدی میں اُس نے سیب کی بجائے اپنی اُنگلی کاٹ ڈالی۔

اسی طرح یہ فقرہ۔ کہ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس طرح ادا کیا جائے گا۔" افق کے اوپر روشنی کا ایک لال لال گولا بہت عرصہ تک ناچتا رہا۔ اس کے خونی ناچ سے لہو کی دھاریں دور دور تک پھیلتی گئیں۔ یہ دھاریں آہستہ آہستہ لال لال رنگ کی لکیروں میں تبدیل ہوتی گئیں کچھ دیر کے بعد ان لکیروں کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہوتا گیا۔ اب گولے کی جگہ ایک سیاہ رنگ کے طوق نے لے لی۔ یک لخت یہ طوق افق سے اُبھرا اور پھر اس نے افق سے نیچے ایک چھلانگ لگائی۔ اور غائب ہو گیا"

۶۔ رُومانی افسانے۔

اب آخر میں کچھ رومانی افسانوں کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ رومانی افسانوں کا پس منظر عموماً کشمیر کی وادی۔ ڈل لیک یا دریائے جہلم ہوتا ہے۔ ان میں عموماً ناؤ یا شکارے میں بیٹھ کر عشق کیا جاتا ہے۔ اکثر چند روز بے تحاشا عشق کرنے کے بعد کہانی کا ہیرو واپس گھر لوٹ آتا ہے۔ اور بیچاری معشوقہ گھُل گھُل کر مر جاتی ہے۔ یا اگر وہ زندہ رہتی ہے۔ تو اُس کی زندگی بے رنگ و بُو ہو جاتی ہے۔ اکثر رومان کا ان افسانوں میں یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ مصنف جواب تک افلاس کی وجہ سے کشمیر نہیں جا سکا۔ اپنے آپ کو عالمِ خیال میں ڈل لیک میں ایک نہایت خوبصورت شکارے میں بیٹھا ہؤا پاتا ہے اور اُسے ایک ایسی کشمیری لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے جس کی شکل اُس نے کسی با تصویر رسالے میں دیکھی تھی۔ اس حقیقت کو نہایت رنگین فقرات میں چھپایا جاتا ہے اور چنار۔ صنوبر۔ امیرا کدل۔ ہاؤس بوٹ کے الفاظ استعمال کر کے یہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ کہ نہ صرف مصنف کشمیر گیا تھا۔ بلکہ اُس کا وطن یا مسکن کشمیر ہی ہے بسا اوقات مصنف جنسی بھوک کا شکار ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ افسانوں میں خیالی معشوقوں سے افلاطونی محبت کرنے کے بعد نہیں جانتا۔ کہ اب اس کے بعد کیا کیا جائے۔ اگر ہیرو اور ہیروئن کی شادی کی جائے۔ تو افسانہ رومانی نہیں رہتا۔ اور اگر خودکشی کرے تو افسانہ جذباتی بن جاتا ہے۔ اِسلئے اس کا ہیرو کشمیر سے بھاگنے میں ہی مصلحت سمجھتا ہے۔ رومانی افسانوں میں وہ افسانے بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں کوئی بیمار ہسپتال کی نرس یا کسی ایسی شادی شدہ عورت سے جو تیمارداری کرنے کے لئے آئی ہو۔ محبت کرتا ہے۔ جب کبھی اُس کا درجہ حرارت ۱۰۴ یا ۱۰۵ سے اُوپر جاتا ہے تو اُسے عشق کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ نہیں جانتا کہ اُسے ٹائیفائڈ ہے یا عشق چنانچہ ایک طرف اگر وہ ایڑیاں رگڑتا ہے۔ تو دوسری طرف نرس کا ہاتھ اس زور سے بھینچتا ہے کہ وہ بیچاری درد کے مارے چلا اُٹھتی ہے۔ مگر کوڑ مغز ہونے کی وجہ سے یہ نہیں سمجھتی۔ کہ مریض اس سے اظہارِ عشق کر رہا ہے"

یوسف ظفر

احساسِ قدر

چور پکڑا گیا — پکڑا ہی گیا آخرکار —

رات کے ٹوٹتے تاروں کا سنبھالا لیکر
چپکے چپکے وہ دبے پاؤں ہوا تھا داخل —
بھوک اک خنجرِ بیباک تھی اُس کے دل میں —
دل کی دھڑکن — وہ تو چہرے پہ نکھر آئی تھی
کئی راتوں کی تھکن ، اُس کی نظر کے بل پہ
آنکھ کے پردۂ سیمیں پہ اُتر آئی تھی
اُس کی پژمردہ جوانی کا وہ ڈھانچا تو نہ تھا
ایک احساس کا پتھرایا ہوا لاشا تھا — —
چپکے چپکے وہ دبے پاؤں ہوا تھا داخل
چور تھا ، پکڑا گیا — پکڑا گیا آخرکار
اُس کے دل میں بھی تو اک چور تھا — وہ چور مگر
کامراں لوٹا — کوئی اس کو پکڑتا کیسے ؟

سامنے کمرے میں کیا کچھ نہ تھا — سب کچھ ہی تو تھا
وہ زر و سیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا ،
اپنے خود کاشتہ انصاف کے انبارِ عظیم ، —
جنبش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں
مسکراتی ہوئی تصویریں بنی جاتی تھیں —
بھوک مٹ سکتی تھی — مٹ سکتی تھی — مٹ سکتی تھی

کیسی دشمن تھی وہ دہلیز پہ اُس کی ٹھوکر
چور تھا — پکڑا گیا ، پکڑا گیا آخرکار —
اُس کے دل میں بھی تو اک چور تھا — وہ چور مگر
کامراں لوٹا — اُسی نے تو بتایا تھا اُسے
تو ہے اک چور — ذرا دیکھ کے چل — چور ہے تو

اوپندر ناتھ اشک

چق

افراد

ہری	ایک شاعر
منوہر	اس کا دوست اور رقیب
رادھے	اس کا چھوٹا بھائی
کرن	ہری کی قریب المرگ بیوی
ششی	ایک نوجوان تعلیم یافتہ لڑکی
سوپا	ہری کی بہن
ماں	ہری کی ماں

مقام

(تیس ہزاری دلی کے ایک مکان میں بیمار کرن کا کمرہ)

وقت

(رات کا پہلا پہر)

(پردہ اٹھتے وقت سٹیج پر بالکل اندھیرا ہے۔ ماں داخل ہوتی ہے)

ماں ۔ یہ تم نے اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ بتی کیوں نہیں جلاتے۔

(بجلی کا بٹن دباتی ہے)

(کمرے میں روشنی ہو جاتی ہے۔ ہری کرن کی چارپائی کے پاس بیٹھا نظر آتا ہے۔ کرن چادر اوڑھے بیہوش پڑی ہے۔ اسکے ٹخنوں میں رسیوں کے ساتھ اینٹیں بندھی ہوئی ہیں۔ کمرہ بالکل صاف ہے۔ چارپائی اور چارپائی کے پاس پڑے ہوئے دوائیوں کے میز کے علاوہ کمرے میں اور کچھ بھی سامان نہیں۔)

(سامنے کی دیوار میں کھڑکی ہے جس پر چلمن لگی ہوئی ہے)

ہری ۔ روشنی بجھا دو۔ روشنی بجھا دو۔ کرن کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ تیز روشنی سے وہ گھبراتی ہے۔ پرسوں سے وہ دھوپ کی شکایت کر رہی ہے۔

ماں ۔ تم تو پاگل ہو۔ اس طرح اندھیرے میں بھوتوں کی طرح بیٹھے ہو۔ اٹھو میں اس کے سرہانے بیٹھتی ہوں۔ تم ذرا ادھر جا کر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھو۔ تاش . . . . .

(دوسرے کمرے سے قہقہوں کی آواز آتی ہے)

ہری ۔ میں یہیں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ تم روشنی بجھا دو۔

ماں ۔ ششی کرسمس کی چھٹیوں میں آئی ہے۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

ہری ۔ میں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔

(دوسرے کمرے سے پھر قہقہوں کی آواز آتی ہے)

—— آج اس کی کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔ گھڑی گھڑی بیہوش ہو جاتی ہے —— تم ذرا ان لوگوں سے کہہ دو اتنے زور سے نہ ہنسیں

ماں ۔ کرن ہنستی تھی۔ قہقہے آج چار برس سے اس گھر کے لئے غیر ہو گئے ہیں۔ ہمیشہ موت کا سا سماں چھایا رہتا ہے۔ آج ششی آئی ہے۔ اور

اس کے ساتھ منوہر اور بیچارہ ری پن ذرا دُور ہو تُب ہے۔ اس کی بیماری کا کیا
مخالف ہے۔ اور برسوں پھر بھی رہ سکتی ہے لیکن وہ تو خاص طور پر پشاور سے
تمہیں دیکھنے آئی ہے۔ ذرا اُن کے ساتھ جا بیٹھو۔ . . .

ہری۔ میں کہیں نہیں جانا چاہتا تم روشنی بجھا دو یہ دو پہر سے بیہوش پڑی ہے
ہوش میں آئے گی تو روشنی سے گھبرا جائے گی۔

(ماں بتی بجھا دیتی ہے)

ماں۔ تو بالکل اندھیرے میں بیٹھنے کی بجائے مٹی کا دیا ہی جلا لو۔

(چلی جاتی ہے)

کرن۔ (ہوش میں آکر) یہ گھپ اندھیرا کیوں ہے (اور بھی گھبرائی ہوئی آواز میں)
یہ گھپ اندھیرا کیوں ہے ہیں . . . میں . . .

ہری۔ میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔

کرن۔ یہ باہر کچھ نظر کیوں نہیں آتا کیا آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کیا
کرشن پکش شروع ہو گیا ہے۔ پر ایک تارا بھی تو آسمان پر نہیں۔

ہری۔ نہیں آج تو پورنماشی ہے کھڑکی پر گہرے نیلے رنگ کی چلمن لگی ہوئی
ہے —— تم بھول گئیں —— تم ہی نے تو کہا تھا —— سورج کی
روشنی سیدھی آنکھوں پر آکر پڑتی ہے یہاں کوئی چق لگوا دو —— آج
وہ پیہر چق لگا آئی ہے معمولی ملائم نہیں۔ اس پر ٹنگا ہوا ٹاٹ لگا ہے
—— گہرے نیلے رنگ کا۔ روشنی کی کرن تک اس کے اندر نہیں آ
سکتی —— پر تم تو سو رہی تھیں۔

کرن۔ میں نے اسے نہیں دیکھا (لمبی سانس لیتی ہے) نہ جانے کیوں مجھے کچھ
. . . نیند سی آجاتی ہے بیماری کا مقابلہ کرتے کرتے تھکے ہوئے میرے انگ
آپ سے آپ سو جاتے ہیں بیہوش ہو جاتے ہیں۔ پر اس چق کو اب اٹھا دو
میں روشنی چاہتی ہوں۔ . . .

ہری۔ میں بجلی کی بتی جلا دوں

کرن۔ نہیں نہیں بجلی کی روشنی سے مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اس چق کو ہی
اٹھا دو میں روشنی چاہتی ہوں۔ ٹھنڈی شانتی بھری سکون بھری روشنی
چاہتی ہوں . . . .

(ہری جاکر چق اٹھاتا ہے۔ کمرے میں چاندنی روشنی سے
مدہم سا اجالا پھیل جاتا ہے)

—— ذرا اور اونچی ذرا اور اونچی۔ اسے پوری اٹھا دو۔ اس اجلی
دھلی ٹھنڈی چاندنی کو کمرے میں بے جھجک آنے دو۔ من میں آتی ہے
—— چاندنی میں جی بھر کر نہاؤں۔ کرنوں سے مل مل کر غسل لوں ——
آہ! پر یہ اینٹوں کا بوجھ —— یہ اینٹیں اب اتار دو . . . .

ہری۔ ابھی پرسوں تمہارے پلاسٹر لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر کہتا ہے . . . .

کرن۔ آہ ڈاکٹر! (لمبی سانس لیتی ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جب سے
میں نے ہوش سنبھالا ہے میں اسی طرح پڑی ہوں۔ اور میرے ٹخنوں سے
اسی طرح اینٹیں بندھی ہیں میں ہل نہیں سکتی بیٹھ نہیں سکتی اٹھ نہیں سکتی
اور کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر آپ ان اینٹوں کی رسیاں کاٹ بھی
دیں تو کیا میں اٹھ کر چل پھر سکوں —— ٹانگیں شاید چلنا بھول گئی
ہوں (لمبی سانس لیتی ہے) اس چاندنی رات میں گھومنے کو کتنا جی
چاہتا ہے۔

(دوسرے کمرے سے پھر قہقہوں کی آواز آتی ہے)

کرن۔ یہ کون ہے؟

ہری۔ منوہر آیا ہے۔ شاید لوگ برج کھیل رہے ہیں۔

کرن۔ مجھے برج کھیلے جیسے برسوں بیت گئے ہیں میں کتنا برج کھیلتی تھی۔
بازی پہ بازی جیتا کرتی تھی —— میں برج کھیلنا چاہتی ہوں۔ کیا وہ
اس کمرے میں نہیں آ سکتے ——

ہری۔ تم بہت کمزور ہو۔

کرن۔ انہیں کہہ دو —— اس کمرے میں بیٹھ کر کھیلیں میں صرف دیکھوں گی . . .

ہری۔ تم بہت کمزور ہو کرن۔ ڈاکٹر کہتا ہے . . . .

کرن۔ آہ ڈاکٹر . . . .

(دوسرے کمرے سے پھر قہقہوں کی آواز آتی ہے)

ہری۔ (چڑ کر) یہ لوگ چپ کیوں نہیں کرتے میں کتنی بار کہہ چکا ہوں . . .

کرن۔ تم انہیں کچھ نہ کہو۔ میری وجہ سے پہلے ہی گھر میں کافی اداسی چھائی رہتی ہے
کوئی ہنستا کھیلتا نہیں۔ جاؤ تم بھی جاؤ۔ ان کے ساتھ جا کر من بہلاؤ۔
میں دل سے تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میری آنکھیں نہیں . . . . پر
میری آنکھیں تو بند ہو رہی ہیں۔ وہ طاقت کی دوائی کہاں ہے۔ مجھے
اس نیند سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے . . . . . .

ہری ۔ (میز کی شیشیوں میں ڈھونڈھتا ہوا) دوائی کہاں ہے (اٹھکر پھر ڈھونڈھتا ہے) وہ طاقت کی دوائی کہاں ہے ؟

(ماں دیا لئے داخل ہوتی ہے)

ماں ۔ کیا بات ہے ؟

ہری ۔ طاقت کی دوائی کہاں ہے ؟ کرن پھر بیہوش ہو گئی ہے ۔

ماں ۔ اس اندھیرے میں تمہیں کیا ملیگی ۔ یہ لو میں دیا لے آئی ہوں ۔ بالکل اندھیرا ٹھیک نہیں ۔ اندھیرا منحوس ہے ۔ اندھیرا . . .

ہری ۔ باہر چاند چمک رہا ہے ۔

ماں ۔ لیکن کمرے میں تو تاریکی ہے بجلی نہیں جلانا چاہتے تو اسے طاق میں پڑا جلنے دو ۔

(دیا طاق میں رکھدیتی ہے ۔ وہیں دوائی کی شیشی پڑی ملجاتی ہے ۔ اسے اٹھا لیتی ہے)

—— اور یہ لو شیشی ۔ یہی شاید طاقت کی دوائی ہے ۔ لیکن میری مانو تو اب اسے آرام کرنے دو ۔ ان دوائیوں ، ان پلاسٹروں . . . .

ہری ۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں تو چپ رہو ۔ اور دیکھو ۔ ان سب سے کہدو ۔ اتنا گلا نہ پھاڑیں ۔ اتنا زور سے نہ ہنسیں ۔

ماں ۔ میں نے انہیں پہلے ہی تمہارے ڈر سے دوسرے کمرے میں بھیجدیا ہے

ہری ۔ (جیسے اپنے آپ) اس کی طبیعت بہت خراب ہے ۔ یہ بار بار بیہوش ہو جاتی ہے ۔

(دوائی چمچے میں ڈالکر اس کے منہ میں ٹپکاتا ہے)

—— سب گالوں پر بہہ گئی ۔ ماں تم ذرا چمچہ تھامو ۔ میں دانت کھولتا ہوں

(ماں چمچہ لیکر بیٹھتی ہے ۔ ہری دانت کھولکر پھر دوائی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے)

—— بیکار ہے گر جاتی ہے ۔ بہت کم دوائی اندر گئی ہے ۔

ماں ۔ لو اب آؤ ۔ تم کب سے یہاں اس طرح بیٹھے ہو ۔ اب اٹھو میں یہاں بیٹھتی ہوں ۔ تم ادھر جاکر ذرا کمر سیدھی کر لو ۔ ذرا ان کے ساتھ جاکر جی بہلا لو ۔ ذرا ان کا جی رکھ لو ۔ . . .

ہری ۔ میں نے ایک بار کہدیا ۔ میں نہیں جا سکتا ۔

ماں ۔ شیشی ٹھیک طرح سے کھل رہی ہے ۔ نہ . . . .

ہری ۔ تو میں کیا کروں ۔ منہ بھرو ہاں ہے . . . .

(بیہوشی سے جاگ کر کرن دایاں ہاتھ ہلاتی ہے)

—— کرن . . . .

کرن ۔ (جیسے خوابوں کی دنیا سے آنے والی ڈری ڈری آواز میں) میں روشنی چاہتی ہوں ۔ میں روشنی چاہتی ہوں ۔ میں اندھیرا نہیں چاہتی (آنکھیں کھولتی ہے) میری چارپائی اس کھڑکی کے پاس روشنی میں کر دو ۔ میں باہر کا نظارہ کرنا چاہتی ہوں (لمبی سانس لیتی ہے) معلوم ہوتا ہے جیسے میں ان نظاروں کے لئے اجنبی ہو گئی ہوں ۔ لیکن یہ میرے سپنوں میں بار بار آتے ہیں ۔ (قدرے مسرور ہو کر) ابھی میں نے اپنے آپ کو اجیت گڑھ کے اس مینار پر چڑھتے دیکھا تھا ۔

ہری ۔ (طاقت کی دوائی چمچے میں ڈالتا ہوا) اجیت گڑھ کے مینار پر ۔

کرن ۔ میں نے دیکھا —— یہ ساری کی ساری راجدھانی میرے پاؤں میں بچھی ہوئی ہے ۔ اور سورج کی دھوپ میں سے نئے مکانوں کی نئی چھتیں چمک رہی ہیں ۔

ہری ۔ (دوائی کی شیشی کو میز پر رکھتا ہوا بدستور بے خیالی میں) سورج تو کب کا چھپ چکا ۔

کرن ۔ ہاں سورج کب کا چھپ چکا ہے (اداس ہوکر) شاید میں اب اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی ۔ اس مینار سے نئے بنے ہوئے مکانوں کی نئی چھتوں کو کبھی نہ دیکھ سکونگی ۔

ہری ۔ (اس کے حلق میں دوائی ٹپکاتا ہوا) تم برسوں تک دیکھو گی اپنی ان آنکھوں سے میری ان آنکھوں سے برسوں تک دیکھوگی ۔ . .

کرن ۔ (دوائی سے کچھ طاقت پاکر قدرے اونچی اور جذبات سے بھری ہوئی آواز میں) آپ کو وہ صبح یاد ہے جب رات بھر بارش ہوتی رہی تھی —— بھیگی بھیگی ، بھاری بھاری سی ہوا چل رہی تھی اور میں نے آپکو سیر پر جانے کے لئے مجبور کر دیا تھا ۔ ہم زینے پر سے تھے اس مینار کے مزار پر چڑھے تھے . . . .

ہری ۔ مجھے سب یاد ہے ۔ لیکن تم اب چپ رہو تم تھک جاؤگی ۔

کرن ۔ نہیں میں چپ نہیں رہنا چاہتی ۔ خاموشی سے مجھے ڈر لگتا ہے میں بولنا چاہتی ہوں ۔ میں ہنسنا چاہتی ہوں ۔ میں کھیلنا چاہتی ہوں ۔

ہری ۔ تم زیادہ نہ بولو کرن ۔ تم آرام کرو تم . . . .

کرن ۔ میں کالج سے ہی آ کر رہتی ہوں۔

ہری ۔ تمہارا جسم ضرور آرام پاتا ہے لیکن تمہارا من ہمیشہ تنا رہتا ہے۔

کرن ۔ (لمبی سانس لیتی ہے) ہاں میرا من ہمیشہ تنا رہتا ہے ۔ اور ابھی ابھی جب ہم اس قلعہ کے کھنڈر پر جا چڑھے تھے ——— یاد ہے نا تمہیں ——— ٹھنڈی بھیگی مست ہوا چل رہی تھی اور نیچے بارش سے بھیگی ہوئی سڑکیں چمکتی ہوئی چاندی کی طرح بل کھاتیں درختوں کے پتوں میں جھلملاتی تھیں مجھے اس بڈھے کی شکل یاد آتی ہے۔

ہری ۔ (اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا خود ہی میں) بڈھے کی . . .

کرن ۔ وہ نیچے سیڑھیوں سے اوپر کو آ رہا تھا کہ میں اترنے لگی ——— کپڑی میں ملی لاٹھی ہاتھ لئے کپڑے سر پر پگڑی اور کمر میں تہمد ——— وہیں بیچ کھڑا بہت دیر تک مجھے ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا ۔ پھر جب اس نے ساتھ کی دوسری سیڑھیوں پر ایک بھی اترتے دیکھا تو یکدم نیچے اتر گیا (آہستہ آہستہ خواب آلودہ سی آواز میں) اور جب ہم نے دھرتی پر پاؤں رکھا تھا تو آگے بڑھ کر گڑگڑایا تھا ——— جوڑی سلامت رہے بھوکا ہوں

ہری ۔ (بھوکا تھا اور رو دیا)۔

کرن ۔ (اور بھی خواب آلود آواز میں) ——— میں دیکھتی ہوں ۔ وہی بڈھا میرے سپنوں میں بھیانک روپ دھار دھار کر آتا ہے ۔ میں ہمیشہ دیکھتی ہوں ——— اس کے پیٹ میں ایک بھٹی دھک رہی ہے ۔ اور میں اور میرے جیسی کئی اس جلتی ہوئی بھٹی کا ایندھن بن رہی ہیں۔

ہری ۔ کرن تم اپنے دماغ کو تھکا رہی ہو۔

کرن ۔ (جھرجھری سی لیکر بیدار ہوتی ہوئی) مجھے پھر نیند آ رہی ہے ۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے ——— نہیں نہیں مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے میری چارپائی روشنی میں کر دو۔

ہری ۔ تم سو جاؤ کرن ۔ تم اپنے کو . . . .

کرن (جاگنے کی کوشش کرتے ہوئے) میں سونا نہیں چاہتی ۔ میں جاگنا چاہتی ہوں (لمبی سانس لیکر اور بھی خواب آلود آواز میں) پر میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں ۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے ۔ مجھے دوائی پلا دو ۔ میری چارپائی روشنی . . . .

(خاموش ہو جاتی ہے)

ہری ۔ (دوائی کا چمچہ بھر کر اس کے منہ کی طرف لے جاتا ہوا) کرن . . .
کرن . . . .

(بہن داخل ہوتی ہے)

بہن ۔ تم دوپہر سے ادھر بیٹھے ہوئے ہو، ادھر چلو۔

ہری ۔ (دوائی کو پھر شیشی میں ڈالتا ہوا) یہ بیہوش ہو گئی ہے۔

بہن ۔ ماں کو بھابی کے پاس بیٹھنے دو ۔ تم ذرا چلو ششی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہے ۔ وہ دل سے کھیل میں حصہ نہیں لے رہی بیچاری۔

ہری ۔ (سنی ان سنی کر کے) تم ذرا چارپائی کو اس کھڑکی کے پاس کرنے میں میری مدد کرو ۔ یہاں اندھیرا ہے اور دیئے کی کانپتی ہوئی روشنی اس تک نہیں پہنچتی۔

(دونوں چارپائی اٹھاتے ہیں)

——— آہستہ! ایڑیوں کے ہلنے سے اسے تکلیف نہ ہو (کھڑکی کے پاس چارپائی لیجاتے ہوئے) اس اندھیرے میں اس کی کمزور صورت اور بھی کمزور نظر آتی ہے۔

بہن ۔ اب اس میں رکھا ہی کیا ہے ۔ کبھی آسودہ نہ ہونیوالی جونک کی طرح اس موذی بیماری نے اس کا خون چوس لیا ہے ۔ تم خواہ مخواہ اس کی بیماری کو طول دیئے جاتے ہو ۔ ناحق دن دن بھر پریشان بیٹھے رہتے ہو ۔ ذرا اپنی صورت تو دیکھو تمہارا چہرہ کتنا پیلا پڑ گیا ہے۔

ہری ۔ تم اس کا منہ دیکھو ——— پیلا بھی نہیں سفید ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ساری چاندنی اس کے جسم سے نکل کر اس ساری کائنات پر پھیل گئی ہے اور اپنی سب جوت لٹا کر یہ جسم مرجھا گیا ہے۔

بہن ۔ تم کیسی باتیں کرتے ہو ۔ اٹھو، ماں کو یہاں بیٹھنے دو چلکر کچھ دیر کے لئے ششی کے پاس بیٹھو ۔ بنارس سے وہ صرف تم سے ملنے دہلی چلی آئی ہے ۔ تم کیسے پتھر ہو۔

ہری ۔ تم یہ چادر اس کے پاؤں پر کر دو ۔ ننگے ہو گئے ہیں۔

بہن ۔ نہ جانے کب تک تم اس نیم جان پنجر کے سرہانے بیٹھے رہو گے۔

ہری ۔ نہ جانے کب تک میں اس نیم جان پنجر کے سرہانے بیٹھا رہوں گا ——— اپنی سونی گھڑیوں میں، اپنے سپنوں، اپنی تنہائیوں میں ——— میں خود ایک نیم جان پنجر بن جاؤں گا۔

بہن ۔ (بھرے ہوئے گلے سے) تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہیں دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔

(کرن ہاتھ ہلاتی ہے)

ہری ۔ ٹھہرو ۔ یہ ہوش میں آ رہی ہے۔

کرن ۔ (ہوش میں آ کر دھندلی ڈوبی آواز میں) نہیں نہیں میں اندھیرا نہیں چاہتی میں روشنی چاہتی ہوں میری چارپائی روشنی میں کر دو۔

ہری ۔ تم آنکھیں کھولو۔ دیکھو تمہاری چارپائی پر نور پھیلا ہوا ہے۔ باہر سڑک پر پہاڑی کے پتھروں پر، چٹانوں پر، درختوں پر نور پھیلا ہوا ہے۔

کرن ۔ اوہ، میں کتنا ڈر گئی ہوں۔

(آنکھیں کھول کر سکھ کی سانس لیتی ہے)

ہری ۔ (چمچے میں دوائی ڈال کر اس کی طرف بڑھاتا ہے) تم یہ دوائی پی لو۔

کرن ۔ (دوائی پی کر پھر سکھ کی سانس لیتی ہے) میں کتنا ڈر گئی ہوں (خواب آلود آواز میں) ابھی ابھی میں دیکھ رہی تھی ——— میں اس جنگل میں بھٹک گئی ہوں پتھروں سے ٹھوکریں کھاتی اور جھاڑیوں سے الجھتی ہوئی اندھیرے میں راستہ ڈھونڈتی ہوں ——— میں چلی جاتی ہوں۔ الجھتی گرتی بھٹکتی چلی جاتی ہوں ——— سامنے بھیانک کالا پہاڑ آ جاتا ہے۔ اس پر چڑھنے لگتی ہوں۔ سانس پھول جاتی ہے ٹانگیں چڑھنے سے جواب دے دیتی ہیں۔ پاؤں میں زخم ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں بڑھے جاتی ہوں بڑھے جاتی ہوں روتی ہوں پر چڑھنا نہیں چھوڑتی (قدرے مسرور ہو کر) اور میں چوٹی پر جا چڑھتی ہوں ——— دیکھتی ہوں ——— سامنے پورب کی آنکھوں میں روشنی جاگ رہی ہے۔ اور نیلی بھوری بدلی کے پیچھے سے سورج کی سنہری ٹکیا نکل رہی ہے۔

(ماں داخل ہوتی ہے)

ہری ۔ سورج کی ٹکیا . . . .

کرن ۔ میں سہمی ہوئی سی کھڑی رہ جاتی ہوں۔ لیکن میری نس نس میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے (لمبی سانس بھرتی ہے) مجھے روشنی کتنی اچھی لگتی ہے مجھے بیداری . . . .

ماں ۔ (آگے بڑھ کر) شش جانا چاہتی ہے۔

ہری ۔ ٹھہرو (کرن سے) تم نے پہاڑ سر کر لیا ہے (ماں اور بہن دونوں کو سنا کر) کرن نے پہاڑ سر کر لیا ہے (پھر کرن سے) ہاں تم لمبی بیماری کی تکلیفوں اور راتوں کو تم کامیابی سے برداشت کر آئی ہو۔

(سکھ کی سانس لیتا ہے) تمہارا یہ خواب کتنا خوشی کو چھلکاتا دینے والا ہے ——— اور دیکھو تم روشنی میں ہو ——— کتنی صاف اور کتنی دھلی ہوئی روشنی ہے۔ سامنے مندر کی دیواریں سر پہ نیلا شی کے چاند کی پاکیزہ روشنی میں کسی سوگ کے منصف کی یاد دلا رہی ہے

کرن ۔ مجھے سہارا دے کر بٹھا دو ۔ میں کھڑکی سے مندر کو دیکھنا چاہتی ہوں کتنی بار اپنے سپنوں میں اس کے بند دروازوں سے سر ٹکرا چکی ہوں۔ اس کے دروازوں سے سر ٹکرا رہی ہوں۔ اس کے اندر جانے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ نہ جانے میں کبھی اس کے اندر جا بھی سکوں گی کہ نہیں۔

ہری ۔ تم ضرور جاؤ گی۔ تم نے اس تاریک اور بھیانک جنگل میں راستہ پا لیا تو کیا تم اس مندر کی دیواروں کو پار نہ کر سکو گی۔ تم ضرور اس کے اندر جاؤ گی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ جائیں گے۔

کرن ۔ مجھے سہارا دے کر بٹھا دو۔ میں ان پہاڑیوں کو دیکھوں۔ اس مندر کو دیکھ لوں۔

ہری ۔ ابھی پرسوں تمہارے ناسور کو چلا نشتر لگایا گیا ہے۔

(منوہر تیز تیز داخل ہوتا ہے لیکن پاس آ کر چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے)

کرن ۔ میں محسوس کرتی ہوں جیسے میرے ناسور کو آرام آ گیا ہے۔ مجھے بٹھا نہیں سکتے تو میری چارپائی کے نیچے سرہانے کی طرف اینٹیں ہی رکھ دو (جیسے خواب میں باتیں کر رہی ہو) چارپائی کھڑکی تک اونچی ہو جائے گی۔ اور میں لیٹے لیٹے سب کچھ دیکھ سکوں گی (لمبی سانس لیکر اور بھی دھیمی اور خواب آلود آواز میں) نہ جانے کیوں آج میرا جی پہاڑی کی پیڑیوں میں گھومنے کو مندر پر جا چڑھنے کو چاہ رہا ہے۔

(آنکھیں بند کر لیتی ہے)

ہری ۔ تمہارے ناسور کو آرام آ رہا ہے . . . .

منوہر ۔ خاک آ رہا ہے۔ تم دیکھ نہیں رہے وہ بیہوش ہو گئی ہے تم کیوں اس کو اپنے آپ کو دھوکوں کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہو تم

کہتے ہو ناسور بن چکا ہے۔ میں کہتا ہوں ——— اس کا سارا جسم
ناسور بن گیا ہے۔ یہ اب کبھی نہ سدھرے گا۔ چار سال ——— چار لمبے سال ———
تھوڑے تھوڑے ہی میری روح کانپ جاتی ہے۔ اور یہ چار سال ابھی ختم
نہیں ہوئے۔ آہستہ آہستہ اس کا بھرا بھرا جسم کمزور ہو کر ہڈیوں کا پنجر رہ گیا
اس کی آنکھیں سوکھتے سوکھتے کوڑی بن گئیں۔ اور تم نے یہ اینٹیں ہسپتال
کے ٹکڑوں سے بار بار دی ہیں۔ . . . .

ہری۔ (چیں بہ جبیں ہو کر) دو پاؤ، نا باہر سے دو چار بڑی بڑی اینٹیں اٹھا لاؤ۔

منوہر۔ اسے ان ڈاکٹروں اور ہسپتالوں سے اس کو نجات دو۔ اس کو ان ٹکڑوں
سے بیزار ہو جانے دو۔ اسے ان گھڑیوں میں تو آرام لینے دو ———
تم کتنے بیوقوف ہو کہ اس کی اس بیماری میں بھی حظ اٹھاتے ہو۔

ہری۔ منوہر ———

منوہر۔ یہ عیاشی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم اس سوز میں رس پاتے ہو۔ اس سے
انسپریشن Inspiration حاصل کر کے پُرسوز شعر کہتے ہو۔ اور پھر
انہی کے سوز میں گم رہتے ہو۔

ہری۔ منوہر ———

منوہر۔ اور دنیا کی نظروں میں تم اپنی بیمار دم توڑتی ہوئی بیوی کے سرہانے
بیٹھے ہو اور غم میں چور رہتے ہو لیکن دراصل ایک چالاک جادوگر کی
طرح تم اپنے پُرسوز شعروں کا جال کشتی کے اردگرد بُنتے جا رہے ہو۔

ہری۔ منوہر تم پاگل ہو گئے ہو۔

منوہر۔ میں چار سال سے دیکھ رہا ہوں۔ کسی دوسرے کے گھر میں یہ اب تک
کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی ——— یہ سل کی بیماری کا ناقابلِ علاج آزار۔
لیکن تم نے اس کو اتنا کھینچا اتنا کھینچا ——— انجکشن دے دے کر
شربت پلوا کر دوائیں باندھ باندھ کر ——— اور اس بیماری سے
تم اپنے پُرسوز شعروں کی فضا حاصل کرتے رہے۔

(رودا اینٹیں لے آتی ہے)

ہری۔ اینٹیں ادھر دو

(اس سے اینٹیں لے کر پاؤں کے پاس رکھتا ہے)

منوہر۔ تم کتنی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے تم کشتی کی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے
تم میری تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے ——— یہ اینٹیں اس کے

پاؤں میں نہیں کشتی کے پاؤں میں بھی چبھتی ہیں اور میرے پاؤں
میں بھی۔ یہ سوئیاں اس کو ہی نہیں چبھتیں اس کو بھی چبھتی ہیں اور
میرے دل میں بھی کچوکے لیتی ہیں۔ اور یہی سلگنا نہیں ہو رہی
تھی ہو رہی ہے اور میں بھی ——— تم نے اس کے جسم کا بیمار خون
اپنی نظموں کے لئے لیا ہے . . . .

ہری۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔ حسد اور رقابت نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔

منوہر۔ تم نے یہ جال اس چالاکی سے بنا ہے کہ کشتی اس میں پڑی تڑپتی
رہے گی۔ نکل نہ سکے گی۔

ہری۔ منوہر ———

منوہر۔ میں . . . .

ہری۔ تم دیکھتے نہیں کرن کی حالت خراب ہے۔ وہ مرنے کو ہے۔ اور
تم اپنی ان زہر سے بجھی ہوئی باتوں سے میرا دل چھلنی کئے جا رہے ہو

منوہر۔ تم کشتی کو نہ اپناتے ہو نہ چھوڑتے ہو۔ اور میں تو ترشنکو کی طرح بیچ
میں ہی لٹکا ہوا ہوں۔ تمہاری یہ بے پروائی میں ہی جانتا ہوں
کتنی بے رحمی بھری ہوئی ہے ——— وہ اس بے نیازی سے وہ بیمار ہی
سے نہیں مٹنے کو جھٹکتی ہے۔ وہ جب سے بیمار ہے، تم سے ملنے
کو بیقرار ہے۔ کھیل میں وہ حصہ نہیں لے سکی۔ باتوں میں وہ حصہ
نہیں لے سکی۔ اور تم اپنی جگہ سے ہلتے تک نہیں۔

ہری۔ کرن کی حالت بہت خراب ہے۔ زندگی اور موت . . .

منوہر۔ وہ پڑی تڑپتی رہے گی۔ نہ جئے گی۔ نہ مرے گی۔ کرن کے سوکھے ہوئے
جسم کا لہو اپنی نظموں کے ذریعے تم نے کشتی کے جسم میں ڈال
دیا ہے۔

(کرن کا اضطراب بڑھتا ہے)

ہری۔ تم جاؤ تم سب چلے جاؤ۔ کرن ہوش میں آ رہی ہے۔

کرن۔ (نہایت خواب آلود آواز میں) میں چپ نہیں رہ سکتی۔ میں چپ
نہیں رہ سکتی۔ میری روشنی بجھ کر رہ گئی . . . .

ہری۔ (اس کے منہ میں دوائی ٹپکاتا جاتا ہے) کرن تمہاری روشنی بند کرتا ہے
یہ کبھی ختم نہیں ہوتی ہے۔ اور چاندنی کی پاکیزہ روشنی تمہارے ساتھ
کھیل رہی ہے۔ میں نے تمہاری چارپائی کے پیچھے اینٹیں رکھ . . .

دھی ہیں- اٹھو- دیکھو . . . .

ماں- یہ نہ اٹھے گی- دیکھتے نہیں- اس کے ہاتھ مڑے ہوئے ہیں- اسے دھرتی پر لٹا دو۔

ہری- نہیں میں اسے دھرتی پہ نہ لٹانے دوں گا ـــ ٹھنڈی بے رحم بے حس دھرتی پر . . . .

کرن- میری روشنی بند نہ کرو- میری روشنی بند نہ کرو . . . .

ہری- کون تمہاری روشنی بند کرتا ہے

کرن- ششی میری روشنی بند کر رہی ہے۔

ہری- ششی ـــ

رجنی آپ سے آپ گر پڑتی ہے!

کرن- وہ میری روشنی بند کرنے کے لئے گھونگٹ اٹھا رہی ہے- میں بجھنا نہیں چاہتی- میری روشنی بند نہ کرو- میری . . . .

ہری- (رجنی اٹھا کر پھینک دیتا ہے) میں نے رجنی توڑ دی ہے کرن . . . . کرن . . . .

ماں- کرن کہاں- کرن ختم ہو گئی ہے- میں نے کہا تھا دھرتی پر لٹا دو . . .

رادھے- ششی نے کہا ہے ـــ وہ یہیں آ سکتی ہے

ہری- وہ نہیں آسکتی- وہ کبھی نہیں آسکتی- دیکھتے نہیں- میں نے رجنی اتار دی ہے- میں نے رجنی اتار کر پھینک دی ہے . . . .

عبدالمجید بھٹی

سادہ سوال

ایک ——— ؟
بے کار
حقیر اور بچارا
تنہا
وجہ پریشانی خود!

ایک اور اک ——— ؟
دو
جمع کا اک سادہ سوال
رونقِ بزمِ ہستی!

ایک ضرب ایک ——— ؟
دو اور اک ——— تین
کبھی چار
کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں
اور کبھی اس سے بھی زائد
لیکن
پھر جو بٹتے ہیں
تو بن پانچ کے چار
اور کبھی تین کے دو
اور پھر اک
ایک اور اک دو کا وہی سادہ سوال
باعثِ جنگ و شدید

ایک ضرب ایک ——— ؟
ہزاروں
لاکھوں
لاکھوں - کروڑوں - اربوں
پر کوئی ایک ہے لاکھوں پہ گراں
اور کوئی لاکھ؟
حقیر اور ناچیز
تیری عظمت کے ستون!

تو ہے ان سب سے الگ
اور علیحدہ
یکتا
میں ہوں بددل
مایوس
ایک
بچارا
تنہا

تجھ کو آ جائے اگر جمع کا یہ سادہ سوال
تیری دنیا بھی حسین ہو جائے۔

رامانند ساگر

گیانو

اتنے دنوں کی مسلسل ملاقات ہوتے ہوئے بھی میں اُسے اچھی طرح سمجھ نہ سکا تھا۔ اور اگر میں نے اُس کے متعلق کوئی رائے قائم کی بھی تھی تو وہ غلط تھی۔ اس روز میرے سامنے جب اُس نے سیٹھ کالو رام کو اپنی ڈیڑھ فٹ آگے بڑھی ہوئی توند کو اُٹھائے ہوئے اپنی دوکان سے گزرتے دیکھا تو اچانک اُس کے لبوں سے یہ فقرہ جیسے پھسل گیا: "آخر اس شخص کو اتنی دولت رکھنے کا کیا حق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص میں خصوصیت اس قدر بھی نہیں کہ اس کی توند کے اندر گھسی ہوئی گہری ناف ہی اس کی لیاقت ہو جائے۔ اور دوسری طرف ایسے شخص بھی ہیں، جو سر سے لے کر پیر تک اور چہرے کی بیرونی سطح سے لے کر دل کی گہرائی تک سراسر خصوصیت ہی خصوصیت ہیں لیکن وہ ——— " پھر اچانک اس کی نگاہ میری جانب مڑی، اور وہ جیسے چونک کر ٹھٹھک گیا۔ گویا یہ کہتے وقت اُسے اس بات کا احساس نہیں رہا تھا، کہ کوئی اور بھی میرے پاس بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس میں پھر وہی سنجیدگی آ گئی۔ جس نے اُسے میرے لئے قابلِ توجہ بنا رکھا تھا۔ کیونکہ ایک دوکاندار کا اس قدر سنجیدہ مزاج ہونا۔ کہ بعض وقت گاہک سے بھی بات نہ کرنا، اور اس بات کا کوئی لحاظ نہ رکھنا، کہ میرا گاہک ٹوٹ جائیگا یقیناً قابلِ توجہ ہوتا ہے۔ یہی باعث تھا کہ جب میں نے اس کوچہ میں نقلِ مکانی کی تو گیانو دوکاندار بھی اُن تین چار ہستیوں میں سے تھا۔ جو اس محلہ کی کلرک آبادی کی عام اور پست سطح سے اُبھری اُبھری معلوم ہوتی تھیں۔

اُن میں سے میرے لئے ہر ایک کی انفرادیت کسی مختلف خصوصیت سے تھی۔ مثلاً لالہ رادھا کشن تھے جن کی ایک مستقل عادت تھی کہ شام کو دفتر سے لوٹتے ہی گلی ہی میں چارپائی بچھا کر بیٹھ جاتے۔ گلے میں محض ایک بنیان ہوتی اور لمبی نے والا پیچوان تو گویا اُن کا ازلی ساتھی تھا۔ اور اس تصویر کا لازمی جزو کوئی ڈیڑھ درجن کے قریب بچے ہوتے، جن کے بیٹھ جانے کے بعد چارپائی کا کوئی حصہ بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔ یہ بچے خالص اُن کی اپنی پیداوار تھے، اور پھر اُن سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی وہ فلاسفی تھی۔ یہی باعث تھا کہ بھرتی کے لائق عمر کو پہنچنے والوں کی نشستوں کے انتظام سے بھی وہ غافل نہ تھے یعنی دُنیاوی دھندوں میں کھو جانے والوں کی رفتار سے تاریخی چارپائی پر ان کی جگہ لینے کے لئے نئے آنے والوں کی رفتار کچھ کم نہ تھی۔ اور نہ اس کے کم ہونے کے آثار ہی دکھائی دیتے تھے۔ حالانکہ ان کی مونچھیں بھی قریب قریب سفید ہو چکی تھیں۔

اور وہ دوسرا رائے بہادر تھا، جو لالہ جی کے محلے ہی میں دو روپے مہینہ دے کر رہتا تھا۔ اس کی خصوصیت اس کی حسین بیوی تھی۔ جو غالباً محلہ کی عورتوں سے زیادہ جاذبِ نظر تھی۔ اس کے جسم کی ترچھی سی اُٹھان، اور اس کے انگوں میں انگڑائیاں لیتا ہوا اُبھار، ایسی خصوصیات تھیں جو کسی بھی راہگیر کا پاؤں باندھ لینے کے لئے کافی تھیں۔ رائے اُسے بہت پیار کرتا تھا۔ اور یہ طعنہ تو ہر شام کر دیا کرتا، کہ "وہ دیکھو۔ لالہ رادھا کشن کی عورت تجھ سے بالشت چھوٹی ہی ہو گی۔ نین نقش بھی تجھ جیسے نہیں لیکن پھر بھی کتنی خوش ہے۔ اور تجھے تو جیسے کال پڑا ہوا ہے"۔

اور تیسرا تھا یہی گیانو دوکاندار۔ کوچہ کے موڑ پر اپنی دوکان میں نمک تیل وغیرہ کی ہاٹ لگائے بیٹھا ہوتا۔ منحنی جسم، لمبا قد، چہرے سے پھندی بھنڈی ہوئی، لیکن آنکھوں میں ایک بانکپن، کنگھی کے بغیر بال بکھرے ہوئے جن کی چند لٹیں عموماً پیشانی کو ڈھانپے رہتیں۔ باقی بدن چند بے ترتیب کپڑوں میں ڈھنپا رہتا لیکن مجھے پہلی ہی نظر میں اس بے ترتیبی کے اندر بھی ایک لطیف سی ترتیب کا احساس ہو گیا تھا جیسے وہ کوئی حسین شعر تھا

کے الفاظ کی بے ترتیبی سے بھی ایک جداگانہ کیفیت مرتب ہوتی ہے۔

یہ شخص کچھ عجیب طرح کا دوکاندار تھا۔ جسے میں نے گاہکوں سے کبھی دلچسپی سے گفتگو کرتے نہ سنا تھا۔ کسی گاہک کو سودا دیتا، تو ایسا محسوس ہوتا، گویا کسی تلخ فرض انجام دے رہا ہے۔ پہلے پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ یہ دوکاندار کاہل ہے۔ اور مالک سے اس کی بگڑی ہوئی ہے۔ ایک دن تو اس کی ایک حرکت نے مجھے بُت ہی بنا دیا۔ آسمان پر صبح ہی سے بادل چھا رہے تھے۔ اور دس بجتے بجتے آسمان پر اُودی اُودی بدلیوں اور کالے اور سفید بادلوں کے جمگھٹ نے کچھ ایسا نظارہ پیش کیا کہ میں اس میں بالکل کھو گیا۔ اور خدا جانے میں کب تک اسی کیفیت میں رہتا۔ اگر لیلا اچانک میرے کندھے جھنجھوڑ کر اونچی آواز میں یہ نہ کہتی "کیا دفتر جانا بھول گئے؟" اس نے خدا جانے ہلکی ہلکی کتنی آوازیں لگانے کے بعد اپنے گلے کا آخری سُر استعمال کیا تھا لیکن اس آسمانی نظارے کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ مجھے ایسا ہی معلوم ہوا، جیسے کوئی الھڑ دوشیزہ پنچم کے سُر میں گا رہی ہو۔ میں نے اسی سرشاری کے عالم میں اس کے گالوں پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ اور یہ سوچتا ہوا کپڑے پہننے لگا "آخر چھٹی کا روز کیوں متعین ہے۔ کیوں نہ جس روز کسی کا جی چاہے اُسی روز اُسے تہوار منانے کی اجازت ہو؟" بہرحال خواہی نخواہی میں جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ تو لیلا نے اندر سے آواز دی "سبھاش پوڑے کھانے کو کہتا ہے۔ ذرا گیا تو سے سُوجی لے کر آتے جائیں۔"

میں گیا تو کے ہاں پہنچا۔ تو دیکھا کہ جناب کی نظریں زمین پر پڑتی ہی نہیں۔ آسمان کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہیں۔ اور خدا جانے منہ میں کیا گنگنا رہا تھا۔ میں نے ایک دو بار سُوجی کی فرمائش کی۔ لیکن مجھے جواب کون دے؟ گیا تو تو نہ جانے کس دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ جب پکارنے تک نوبت پہنچی، تو اس نے کسی پہنچے ہوئے صوفی کی طرح شرابی آنکھوں سے میری جانب گھور کر دیکھا۔ مجھے پہچانتے ہی اس کی ماتھے کی تیوری تو دُھندلی ہو گئی لیکن اس کے چہرے پر [illegible] جوں کا توں قائم رہا۔ لیکن میں نے پھر سُوجی مانگی۔ اس نے نہایت بے دلی سے پلڑا یا بند کرتے ہوئے خود ہی اپنی اس حرکت کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ "بابو! کیا آج بھی سودا بیچنے کا دن ہے؟" اور میں نے اس کی آنکھوں کے کونوں سے ڈھلتا ہوا پانی دیکھا۔ مجھے فرصت نہ تھی۔ اس لئے میں کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ لیکن میرے دل میں وہ فقرہ اور اس کی نم ناک آنکھیں کچھ اس طرح کھب گئیں کہ آج تک اُس کا نقش نہیں مٹ سکا۔ لیکن پھر بھی میں اُسے گیا تو دوکاندار ہی سمجھتا رہا۔ ایسا دوکاندار جس کے لئے "بنیئے" کا لفظ مشہور ہے۔ یہ لفظ خود اس قدر تصور زا ہے کہ اس کی تشریح فضول ہے۔

لیکن آج جو فقرہ سیٹھ کا نورام کو جاتے دیکھ اس کی زبان سے از خود ہی پھسل گیا۔ اس نے مجھے یقین دلا دیا۔ کہ میں نے اُسے آج تک غلط سمجھا تھا۔

میرے مجبور کرنے پر اس نے اپنی جو داستان سنائی۔ اس سے میرے جذبۂ تجسس کو تو سکون حاصل ہو گیا۔ لیکن میرے دل کا سکون چھن گیا۔ آج تک جب بھی مجھے اُس دکان کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو گیا تو دوکاندار کو ایک کاغذ پر کچھ لکھتے دیکھ میری آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا، کہ یہ آنسو گیا تو کے انجام پر بہتے ہیں یا اس کاغذی پُرزے کے ہونے والے انجام پر۔ اور ہر بار میرا دماغ اس کہانی کو دُہرا جاتا ہے کہ کس طرح اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث وہ اُن کی آشاؤں کا مرکز تھا۔ جو بڑھاپے کی اور دکھ بھری زمین پر ڈگمگاتے بوڑھوں کا سہارا ہوگا۔ اُن کا گھرانا مالی لحاظ سے اُس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا جو وسطی طبقہ سے کچھ نیچے لیکن بھک منگوں اور مزدوروں کے طبقہ سے کچھ اونچا ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ اکلوتا بیٹا نہ ہوتا تو شاید اس کی تعلیم ابتدائی حد بھی پار نہ کر سکتی۔ بہرحال اسی خصوصیت کے سبب وہ میٹرک تک تعلیم پا چکا تھا، اور اس سے زیادہ اُن کی ہمت سے باہر تھا۔

بدقسمتی سے اس تشنۂ تکمیل ذہنی ارتقاء نے اس کے ایک فطری

مجھ کو بے نقاب کر دیا۔ جس نے اس کے ذوق و شوق سے لبھانا ان کو خوب چلا دی۔

: جوہر چکا شاعری ——

چونکہ فطرت ہی کی جانب سے اُسے شاعری ودیعت کی گئی تھی، اس لئے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ جوہر کچھ اس طرح چمکا کہ اچھے اچھوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن ادھر وہ اس پریم رس میں ڈوبتا چلا گیا۔ اُدھر اس کے ماں باپ کو تشویش محسوس ہونے لگی۔ کہ لڑکا ہاتھوں سے جا رہا ہے اُن کی آنکھوں پر جیسے پانی پھرتا دکھائی دینے لگا۔ انہوں نے ہر طرح اُسے اس راہ پر جانے سے روکنے کی سعی کی۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات تھوڑا ہی تھی۔ وہ تو جیسے کسی غیر مرئی کشش کے باعث اس ندی کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں پانی اس کے مختلف اعضاء کو ڈھانپتا چلا جا رہا تھا۔ اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی چلی گئی کہ وہ از خود رفتہ سا ہو کر اس کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔

یہ عالم دیکھ کر اس کے ماں باپ اور زیادہ جھنجھلانے۔ وہ اس کی بے بسی کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ وہ سمجھتے بھی کیونکر؟ انہیں کیا معلوم، کہ ایک شاعر شاعری کرنے پر مجبور کیوں ہوتا ہے۔ اس بات کو تو کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ ایک شرابی شراب کیوں پیتا ہے۔ ایک عاشق عشق سے کیوں منہ نہیں موڑ سکتا، اور ایک مور ساون کے بادلوں کو دیکھ کر کیوں دیوانہ وار ناچ اُٹھتا ہے؟

اسی ذہنی کشمکش کے ساتھ ہی ساتھ اس کی شہرت پرواز کرنے لگی۔ مشاعروں میں اچھے اچھے لوگ اُسے داد دینے لگے۔ جن میں کئی ایک شعر نواز امیر شخص بھی تھے۔ سٹیج پر وہ لوگ اس کے متعلق جن جذباتی الفاظ کو استعمال میں لاتے۔ اُن سے اس کشمکش میں پھنسے ہوئے دل کو بہت تسکین ہوتی۔ حتیٰ کہ اُسے یقین ہو چلا کہ یہ لوگ سچ مچ مجھ پر بہت کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔ اخبارات و رسائل میں اس کا کلام تعریفی حواشی کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ ان سب باتوں سے اُسے یقین ہوتا چلا گیا، کہ اس کی اقتصادی مشکلات بھی شاعری ہی کی بدولت آسان ہو جائیں گی۔ وہ اس انتظار میں رہتا کہ جو رسائل اس کے کلام کے متعلق یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ "حضرت ... کا کلام سونے کے تول تُلنے کے قابل ہے"۔ ضرور اگر سونا نہیں تو اس کے مقابلہ پر کوئی حقیر سی رقم اس کی نذر کریں گے۔ لیکن یہ خواب خواب ہی رہا یہاں تک کہ ایک بار جب اس نے خود ہی ایک مدیر کو اس بارے میں لکھا، تو اس نے نہایت "خلوص" سے جواب بھیجا کہ "رسالہ تو پہلے ہی گھاٹے میں چل رہا ہے۔ یہ تو خدمتِ ادب کا جذبہ ہے جس کے ماتحت ہم یہ دھندا کئے جا رہے ہیں، ورنہ کوئی ہوتا تو کب کا کپڑے سمیٹ کر بیٹھ گیا ہوتا"

بھولے شاعر کو ان کے خلوص پر کوئی شک نہ ہوا۔ اور نہ اُسے اُن اشخاص کے خلوص پر شک گزرتا۔ جو مشاعروں میں سٹیج پر آ کر اُس سے نہایت پریم بھری باتیں کرتے اور کہتے "آنکھیں ترس جاتی ہیں، لیکن مشاعروں کے سوا آپ کی صورت دیکھنے ہی میں نہیں آتی"۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسے ایسے فقرے محض رسمی طور پر کہہ دئے جاتے ہیں۔ ورنہ کہنے والے کی مراد یہ نہیں ہوتی۔ وہ اسی طرح کے رسمی تکلفات کے فریب میں مبتلا رہا۔ اس کے ان رسمی مداحوں میں چند ایک امیر شخص بھی تھے، جن سے اُس نے اپنی بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن اس دل خوش کن سراب کا فریب بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ امیر لوگ شاعروں کو محض اپنا دل بہلاوا سمجھتے ہیں۔ اور اگر سٹیج پر ان کی تعریف کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ درحقیقت انہیں کوئی ممتاز ہستی سمجھتے ہیں، بلکہ محض اس لئے تاکہ وہ لوگ ان کے تفریح بخش کھیل کو جاری رکھیں۔

وہ چند ایک اشخاص کے ہاں اپنی [illegible] پر گیا۔ لیکن وہاں اُسے گھنٹوں ڈیوڑھیوں میں انتظار کرنا پڑا۔ اور جب ملاقات بھی ہوئی، تو اُسے اپنے میزبانوں کا رویہ ایسا معلوم ہوا، گویا وہ کسی بھک منگے سے باتیں کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر اس کے ولولوں پر اوس پڑ

مجھ سے اس نے پھر کہا: "اب میں سمجھ چکا ہوں کہ جذبات کی کوئی قیمت نہیں۔ شاعری بازار کی منڈی میں نہیں بکتی۔ یہ ہے ایک شاعر کی ٹریجڈی۔

اب مجھے "گیانو دوکاندار" کہہ کر پکارتے ہیں۔ کس قدر غیر شاعرانہ نام ہے۔ میرا نام "گیانیشور" تھا۔ لیکن ایک تیل نمک بیچنے والے کو کسی خوبصورت نام سے پکارنا گویا گناہ ہے۔ اور یہ بذاتِ خود ایک ٹریجڈی ہے!" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ مجھ میں اُلٹا کسی تک کی ہمت نہ رہی تھی۔ میں اپنی قوت کے لوٹنے کا منتظر تھا۔ کہ اچانک وہ پھر بول اُٹھا: "میں نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ شاعری بھی ایک طرح کی قومی لیڈری ہے۔ جس میں کامیابی و ناموری حاصل کرنے کے لئے اپنی جیب میں خوب دولت چاہیئے۔ مفلس لیڈر ایک گمنام رضاکار ہی رہ جاتا ہے اور مفلس شاعر نمک تیل کا دوکاندار!"

"گیانو! یہ لالٹین تیل سے بھر دینا" ایک ننھی سی لڑکی نے دوکان میں پیسہ پھینکتے ہوئے کہا۔

گیانیشور نے نہایت حقارت سے پیسہ واپس باہر پھینک دیا۔ "جا بھاگ جا!"۔۔۔ لڑکی اس عجیب و غریب دوکاندار کا منہ دیکھتی ہوئی پیسہ اٹھا کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر تک تو گیانو اسی کیفیت میں رہا گویا کسی کو گالیاں دے رہا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ عالم بدل گیا گویا اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے دوکان کے باہر سر نکال کر بازار کے اندھیرے میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اس کے لبوں سے ایک مایوسانہ آواز نکلی "وہ چلی گئی"۔۔۔

پھر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: "ان سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے بابو! کہ میں دوکانداری میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ گویا میرا دماغ چل گیا ہے۔ یہ دیکھو۔ میں نے ابھی ایک پیسہ کا گاہک گنوا دیا۔ اور کیا جانے۔ کہ یہ گاہک پھر کبھی میری دوکان پر آئے بھی کہ نہیں۔ آج صرف دو آنے پیسے دیکھ کر وہ حسین سی آنکھوں کی چمک جب دھندلی پڑ جائے گی، تو کیا میری زندگی اندھیری نہ ہو جائے گی؟ میں نے سوچا تھا کہ الم پر الم اُٹھانے سے شاید دل بُجھ جائے۔ اس کی اُمنگیں مر جائیں تو میں دوکانداری میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن یہ خیال اُسی وقت تک رہتا ہے جب تک ایک حسین اور نازک بدن ملگجے پیرہن میں میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ جب صبح دوکان پر آتے ہی وہ اوجھل ہو جاتا ہے۔ تو شاعری دیوی آن موجود ہوتی ہے۔ پھر جب شام آتی ہے اور گھر جانے کو تیار ہوتا ہوں۔ تو اپنی سارے دن کی کمائی دیکھتے ہی اپنی ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ دن بھر میں بے خودی کے عالم میں جو خوننابہ چکانی کی ہوتی ہے۔ اُن تمام اشعار کو آگ کی نذر کر دیتا ہوں۔ تاکہ ان جگر کے ٹکڑوں سے زیادہ پیار نہ بڑھ جائے۔" یہ کہتے کہتے گیانیشور نے جیب سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر دیئے کی لَو پر رکھ دیا۔ شاید یہ اس دن کی شاعرانہ کارروائی تھی۔ مجھ میں اس کے ہاتھ سے یہ کاغذ چھیننے کی سکت بھی نہ رہ گئی تھی۔ البتہ جلتے ہوئے کاغذ کے ایک کونے پر میں نے یہ مصرعہ دیکھا ع

پھر وہی میں ہوں وہی صحرا وہی بربادیاں۔۔۔

اب بھی جب کبھی میں وہاں سے گزرتا ہوں تو "گیانو دوکاندار" کو کچھ کاغذ پر کچھ لکھتے دیکھ کر میری آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنسو گیانو دوکاندار کے انجام پر بہتے ہیں، یا اس کاغذی پرزے کے ہونے والے انجام پر۔۔۔

جانا لازمی تھا۔ لیکن وہ شاعر تھا۔ ایک حقیقی شاعر۔ جو کسی صلہ کی پروا یا ستائش کی تمنا میں شعر نہیں کہتا۔ بلکہ اس لئے کہتا ہے، کیونکہ وہ شعر کہے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کوئی سننے والا ہو یا نہ ہو لیکن وہ اپنا پیغام سُناتا جائے گا۔ اور جب کبھی اُس کا پیغام سُن کر کسی ایک ہستی کا دل تڑپ اُٹھا، کسی اہلِ دل کی آنکھ سے آنسو کا ایک ہی قطرہ ٹپک پڑا، یا اس کے پیغام کو سُن کر کسی ایک رُوح نے اپنے بازوئے پرواز کھول دیئے یا کسی نے اس کے پیغام سے متاثر ہو کر کبھی کسی یتیم بچے کو پیار سے اپنی گود میں لے لیا، یا کسی افسر نے اپنے کسی ہر وقت جھڑکے جانے والے غریب و مفلس چپڑاسی سے ہنس کر ہی بات کر لی، تو اس کا مقصد اس کی شاعری کا مقصد اسی دم پورا ہو جائے گا۔ خواہ اُن میں سے ایک بھی واقعہ اس کی حیات میں ظہور پذیر ہو یا بعد الموت۔

غرضیکہ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز بحرِ شاعری کی گہرائیوں سے موتی رولتا رہا۔

اس کے ماں باپ بھی اپنی دانست میں بگڑے ہوئے لڑکے کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کر چکے تھے۔ لیکن اس نے سدھرنا تھا، نہ سدھرا۔ آخر کار انہوں نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکالنے کی ٹھانی اور یہ تھیار تھا — شادی۔ ان جہاں دیدہ بزرگوں کو یقین تھا کہ جب بیوی پہننے کھانے کو مانگے گی تو اس کی تمام شاعری نکل جائے گی۔

ایک روز ماں نے بیٹے سے نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہا "تمہارا باپ فلاں جگہ نسبت کرنے کو کہتا ہے۔ میں لڑکی دیکھ آئی ہوں۔ نین نقش ایسے سُندر ہیں، گویا آسمان سے کوئی اپسرا اُتر آئی ہے۔ ہماری ذات برادری میں تو ایسی لڑکی ملنی کیا، بھگینی تک مشکل ہے۔"

شاعر — اور پھر حُسن کی تعریف سُن کر مچل نہ جائے، پھر وہ شاعر ہی کیا — نادان اس تجویز سے بلکہ خوش ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ پہلو میں کسی حسین کی موجودگی میرے تخیل کو پر لگا دے گی۔ کسی کی مستانی آنکھوں کی شراب میں تمام دُنیاوی تفکرات ڈوب جائیں گے۔ لیکن اُس نے یہ نہ سوچا کہ اس شراب کی قیمت اُسے کیا ادا کرنی پڑے گی۔

شادی کے بعد جو کچھ ہوا، اُسی کی زبان سے سُنئے:۔

"بابو۔ آپ نے کبھی اس شخص کو دیکھا ہے جس نے راہ پر خود منزل کو قربان کر دیا ہو۔ یا وہ شخص جس نے اپنی کشتی کو ریت پر ٹھہرانے کے لئے اس کی مرمت کرائی ہو اور اس مرمت کے عوض اپنی ناؤ دے ڈالی ہو، اور خود پرلے کنارے ہی رہ گیا ہو۔ اگر کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے دیکھو۔ جس نے اپنی شاعری کو جلا دینے کے لئے ایک حسینہ سے عقد کیا اور اس کے عوض اپنی شاعری کو نذر کر دیا۔

اگر ہمارے گھر میں کچھ باقی تھا، تو وہ میری شادی کی بھینٹ ہو گیا۔ چند ہی روز بعد افلاس اپنی ننگی صورت میں تانڈو ناچ ناچنے لگا۔ بھوک کے بھوت ہمارے گھر کی بنیادیں تک ہلاتے نظر آنے لگے۔ مجھے مجبور ہو کر کوئی کام ڈھونڈنا پڑا۔ پہلے پہل میں نے کوشش کی کہ کوئی ایسا کام ملے، جو میری شاعری میں مخل انداز نہ ہو۔ میں نے سوچا۔ کہ کہیں کلرکی مل جانے پر مجھے شاعری کے لئے بھی وقت ملتا رہے گا۔ (بھولا شاعر۔ اُسے کیا معلوم کہ کلرکی کس مصیبت کا نام ہے!) میری اُمید کی آنکھیں ایک بار پھر اپنے امیر مداحوں پر لگ گئیں۔ میں نے اُن سے سفارشیں کروانا چاہیں۔ لیکن اب کی بار وہ ہوا جو پہلی مرتبہ بھی نہ ہوا تھا۔ مجھے دھتکار دیا گیا۔ اور بعد ازاں مجھے اُن کے منشی متصدیوں سے پتہ چلا۔ کہ میرے دھتکارے جانے کی وجہ میری شاعری تھی۔ میرے ان مداحوں کا خیال تھا کہ شاعری کی لت پڑ جانے پر انسان کسی بھی کام کا نہیں رہتا۔ پھر دفتر کی ذمہ داریاں اُٹھانے کا جوگ کہاں — ؟ گویا وہ آج تک میری مدح اس لئے کرتے رہے کہ میں اور بھی نکما بنتا چلا جاؤں۔ لیکن اس وقت میرے پاس یہ سب کچھ سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ بلکہ یوں کہو کہ دل گرفتگی تک کی فرصت نہ تھی۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ کیونکہ چار مدھم اور بوڑھی آنکھوں کے آنسو اور دو شوخ اور حسین آنکھوں کے موتیوں کو اس فراوانی سے ضائع ہوتے دیکھنے کا مجھ میں یارا نہ تھا۔ اور اس کے بعد —— یہ نمک تیل کی دوکان۔" وہ ایک پل کے لئے رُک گیا۔ ایک لمبی سانس چھوڑتے

سعید احمد اعجاز

کنارِ گنگ

کنارے گنگ کے بیٹھا ہوں خاموش — ہوا ساکن ہے موجِ آب روپوش
بہت دلگیر ہے تاروں بھری رات — غلافِ گنبدِ نیلوفری، رات
سکونِ آبِ دریا آئنہ ہے — ستارہ ننھا سا مُنہ دیکھتا ہے
تفکر میں شجر یاں پر کھڑے ہیں — کسانوں کے وہاں پر جھونپڑے ہیں
صدا بربط کی دھیمی آ رہی ہے — کسی نے راگنی اِک چھیڑ دی ہے
گلوئے دخترِ دہقاں سے پیدا — کہ یہ نغمہ ہے تارِ جاں سے پیدا
نظر آتا ہے یوں گویا کہ ہر شئے — اسی کے سیل میں ڈوبی ہوئی ہے
سرایت کر رہا ہے سنگ میں راگ — لرزتا ہے عروقِ گنگ میں راگ
نہ معلوم ابتدا اس کی کہاں ہے — نہ معلوم انتہا اس کی کہاں ہے

سرود ایسا یہ دلکش دِل نشیں ہے
مرے پہلو میں گویا دِل نہیں ہے

آسی رام نگری

کھلونے والا

وہ ہمارے گاؤں میں روزانہ آتا تھا۔ میں ہمیشہ سے اسے ایسا ہی دیکھ رہا ہوں۔ سینے پر لٹکتی ہوئی روئی کی طرح سفید لمبی داڑھی۔ ہونٹوں پر جھکی ہوئی نکیلی ناک۔ بڑی بڑی بھیچی بھیچی سی آنکھوں کی پلکیں بھولی بھولی سی چہرے پر متعدد جھریاں۔ ایک ڈلیہ میں کانچ اور مٹی کے بہت سے کھلونے ——— عورتوں کیلئے چوڑیاں، سنگار دان۔ بچوں کے لئے کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں ——— یہی اس کی دکان! یہی اس کی کائنات تھی ———

سردی ہو یا گرمی دوپہر کے وقت ہاتھ میں چھڑی لئے سر پر ڈلیہ رکھے وہ آتا تھا۔ اور جب بھی وہ گاؤں میں آ کر ——— "واہ واہ ری چڑیا جن ——— ہوں لگ گئیا۔ وہی لیں گے چڑیا" کی آواز لگاتا تو بچے اپنا اپنا کھیل چھوڑ کر دوڑتے تھے۔ بچے اسے دیکھ کر خوشی سے ناچ اٹھتے۔ وہ بچوں میں آ کر جی جاتا تھا۔ لیکن شیلو اسے اور وہ شیلو کو جتنا پیار کرتا تھا۔ اتنی محبت اتنے گاؤں میں کسی سے نہ تھی۔

شیلو ایک دوسرے گاؤں سے آئی ہوئی ایک بیوہ عورت کی اکلوتی بچی تھی۔ پہلے روز جب وہ گاؤں میں آئی تو بوڑھے کی آواز سنکر وہ دوڑا۔ اس نے متحیر نگاہوں سے دیکھا کہ اس کے ساتھ کھیلنے والے بچے دوڑ کر بوڑھے کو لپٹ رہے ہیں۔ رامو دینا سے لڑ کر رو رہا تھا۔ بوڑھے کی آواز سنتے ہی پلیہ کرتے کی آستین سے ناک پونچھتا ہوا خاموش ہو کر دوڑ پڑا۔ گوبندا اپنی ماں کے آنچل میں چھپا ہوا دودھ پی رہا تھا۔ وہ دودھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ منی اپنی ماں سے گڑیا کیلئے ضد کر رہی تھی۔ بوڑھے کو دیکھا تو گڑیا بھول کر بچوں میں مل کر اس کے پیروں میں لپٹ گئی۔

شیلو منہ میں انگلی ڈال کر ایک طرف کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ دھول سے اٹے ہوئے گھونگھرالے بالوں کو آنکھوں کے آگے سے ہٹا کر اس نے بوڑھے کے چمکتے ہوئے کھلونوں کو دیکھا۔ پھر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بچوں پر برستی ہوئی محبت نے شیلو کو بیحد متاثر کیا۔

بوڑھے نے شیلو کو دیکھا تو اپنی ڈلیہ چھوڑ کر دونوں ہاتھ شیلو کی طرف پھیلا دیئے۔ اور بڑی محبت سے کہا ——— "آ میری بچی تو مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑی ہے؟ کیا تجھے یہ کھلونے اچھے نہیں لگتے؟"

ایک لڑکے نے کہا ——— "دادا! یہ تمہیں جانتی ہی نہیں۔ ابھی کل رات ہی اس گاؤں میں آئی ہے۔"

بوڑھے نے پھر شیلو سے کہا ——— "آ بیٹی۔"

شیلو دوڑ کر بوڑھے کے گلے سے لپٹ گئی۔ بوڑھے نے اسے گود میں اٹھا کر کہا ——— "تمہارا نام کیا ہے رانی بیٹی؟"

شیلو کچھ نہ بولی تو بوڑھے نے ہنسکر بچوں کی طرف دیکھا۔ ایک بچے نے کہا ——— "دادا اس کا نام شیلو ہے۔ اے شیلو ہم سب انہیں دادا کہتے ہیں۔"

شیلو نے ہنسکر کہا ——— "اچھا تو میں بھی تمہیں دادا کہوں گی۔ لیکن یہ اتنے سارے کھلونے تم نے کہاں سے لئے؟"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا ——— "میں تو روز ہی اتنے کھلونے لاتا ہوں۔ اور یہ بچے دو چار خرید لیتے ہیں۔ کیا تم کوئی کھلونا لو گی؟"

شیلو نے ایک گڑیا ہاتھ میں لیکر کہا ——— "ہاں مجھے یہ گڑیا بہت اچھی لگ رہی ہے۔ اچھا تم ذرا ٹھہرو۔ میں ماں سے پوچھتی آؤں۔"

شیلو اپنے گھر کی طرف دوڑی۔ بوڑھے نے محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا ——— "کیسی پھول سی بچی ہے۔ اس کا باپ کتنا خوش نصیب ہے۔ جب وہ اسے گود میں لیکر اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا ہوگا۔ تو دنیا کے سارے دکھ اسے پھیکے معلوم ہوتے ہوں گے۔"

اتنے میں شیلو دوڑتی ہوئی آئی۔ اور ایک پیسہ ہاتھ میں دیکر بولی ——— "لو دادا! مجھے ایک گڑیا دیدو۔"

بوڑھے نے شیلو کے ہاتھ میں گڑیا دیکر کہا ——— "لے بیٹی یہ پسند ہے ——— ؟"

پھول نے ایک ہی سانس میں کہا — "اوں ہوں، چار پیسے کی گڑیا شیلو کو ایک ہی پیسے میں کیوں دے رہے ہو دادا؟ ہمیں بھی دو۔"
بوڑھے نے شیلو کو گود میں اٹھا کر پوچھا — "تیرے باپ کہاں گیا بیٹی؟"
شیلو نے اعتماد سے گویا اپنے کرتے میں چھپاتے ہوئے کہا — "اماں کہتی ہیں، ابا اللہ کے ہاں گئے۔"
بوڑھے نے بچی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا — "شیلو تو میری بیٹی ہے۔"
شیلو نے بوڑھے کی داڑھی سے کھیلتے ہوئے کہا — "ہاں تمہاری بیٹی تو ہوں ہی دادا۔ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو —؟"
بوڑھے نے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا "یوں ہی —"
اس روز کے بعد وہ روز آتا۔ شیلو کو گود میں بٹھا کر کھلاتا اور دو چار کھلونے دے کر چلا جاتا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی شیلو کی عمر بھی بڑھ رہی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح دوڑ کر اپنے دادا سے لپٹتی نہ تھی۔ بلکہ اپنے دروازے ہی پر کھڑی ہوئی مسکرا کر پکارتی — "دادا! ادھر آؤ" بوڑھا اپنی بیٹی کی محبت بھری پکار سن کر وہیں بیٹھ جاتا۔ شیلو پڑوس کے بچوں کے لئے کھلونے خریدتی۔ اور دادا اپنی پسند کے مطابق اسے نئی چوڑیاں پہنا جاتے۔
ایک دن بوڑھے نے گاؤں میں کچھ چہل پہل دیکھی۔ آہستہ آہستہ شیلو کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ خوب سجا ہوا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے خوشی سے اچھل رہے تھے۔ گھروں میں عورتوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر بوڑھا اپنی آواز لگانا بھول گیا۔ شیلو کے دروازے کی سج دھج دیکھ کر اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آواز لگائی — "واہ ری واہ چڑیا، جن کے ہونگے کھلیا۔ دہی لیں گے چڑیا" اس نے کئی بار آواز دی مگر شیلو دروازے پر نہ آئی۔ بوڑھے نے دروازے کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ کر ایک بار پھر آواز لگائی۔ شیلو کی ایک سہیلی نے دروازے سے جھانک کر کہا "دادا آج شیلو کا بیاہ ہے۔ اسے بیاہ کی چوڑیاں پہنانی ہیں۔ آنگن میں بیٹھی ہوئی ہے۔"
بوڑھا شیلو کی شادی کی بات سن کر کانپ گیا۔ اس کے دل میں ایک دھکا سا لگا۔ وہ سوچنے لگا آج میری بیٹی مجھ سے چھن رہی ہے۔
بوڑھا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس لڑکی کے ساتھ اندر گیا اور آنگن میں بیٹھ کر چوڑیاں کھولیں۔ دو عورتوں کے ساتھ شیلو سامنے آئی۔ بوڑھے نے سرخ گھونگھٹ میں چھپا ہوا اس کا حسین مگر اداس چہرہ دیکھا۔ شیلو نے بھی دادا کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ دھیرے دھیرے آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کی گوری گوری کلائیوں میں دادا نے گہرے سبز رنگ کی چوڑیاں پہنائیں۔ پھر دو سنگاردان شیلو کے ہاتھ میں دے کر گلوگیر آواز سے — "بیٹی اپنے دادا کی یہ حقیر پیشکش قبول کرو۔ خدا تمہیں خوش و خرم رکھیں . . . ."
بوڑھے کی آنکھوں سے گرم آنسوؤں کی دو بوندیں گر کر سنگاردان کے شیشے پر آ رہیں ——
شیلو نے اپنے دادا کی پیشکش کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگائی۔ بوڑھا لڑکھڑاتے پیروں سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔
رات کو بڑی دھوم سے بارات آئی۔ دوسرے روز اپنے بانکے سجیلے شوہر کے ساتھ شیلو سسرال چلی گئی۔

حسب معمول دوپہر کو بوڑھا گاؤں میں آیا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ ہر بچے کی صورت میں اپنی شیلو کو تلاش کر رہا تھا لیکن اس کی مایوس نگاہیں تھک کر رہ گئیں۔
وہ ہر روز گاؤں میں آتا۔ لیکن کھویا کھویا سا رہتا۔ اور شیلو کے دروازے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا چپ چاپ چلا جاتا۔
تین مہینے کے بعد شیلو سسرال سے واپس آئی۔ اور اپنے دروازے پر کھڑی دادا کی راہ دیکھ رہی تھی۔ حسب معمول آج بھی بوڑھا آیا۔ شیلو نے دیکھا تو لپٹ گئی۔ دادا دیوار کے سہارے وہیں بیٹھ گئے۔ شیلو نے پکارا — "دادا!"
اس نے بھرپور محبت نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ پھر مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اس دلنواز منظر کو ہمیشہ کے لئے آنکھوں میں چھپا لینا چاہتا ہو!
شیلو نے بے قرار ہو کر پھر پکارا —— "دادا! دادا!" لیکن دادا نے آنکھ نہ کھولی۔ شیلو از خود رفتہ سی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور بار بار بوڑھے کا ماتھا چومنے لگی۔

ادبِ لطیف
جون ۱۹۴۲ء

شیر محمد اختر

فطرت کی آواز

تہذیب اپنی معراج پر ہے۔ سائنس کی ترقی پر خود عقل انسانی حیران ہے۔ علم بڑھتا جا رہا ہے۔ فلسفہ اپنی موشگافیاں کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ سب لوگ فطرت کی آواز کی طرف کان نہیں دھرتے۔ اس سے بے خبر ہیں۔ بے خبر رہنا چاہتے ہیں۔

ایک کارخانے کو دیکھئے۔ ہزاروں انسان پسینے سے شرابور آگ کے سامنے کھڑے لوہا کوٹ رہے ہیں۔ زندگی کی حقیقت اس سے زیادہ کہاں تلخ مل سکتی ہے۔ دوزخ کا نقشہ اور کہاں میسر آتا ہے۔ مگر اس ساری مخلوق میں ایک عورت کا گزر جانا معجزہ سے کم نہیں۔ جھلسے ہوئے چہرے مسکرا اٹھتے ہیں۔ تپتے ہوئے بدن سرد معلوم ہوتے ہیں۔ جھکی ہوئی کمریں یکایک سیدھی ہو جاتی ہیں۔ دوزخ میں جنت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ فطرت اپنی آواز کی پکار سن رہی ہوتی ہے۔

اب اور آگے بڑھئے۔ فلسفہ دانوں کی مجلس گرم ہے۔ بال کی کھال اتاری جا رہی ہے۔ خیالات کی دنیا میں خشک بحثیں جاری ہیں۔ سنسنی اور ہیجان ہیں۔ کیا یہی زندگی ہے جس پر ساری دنیا مرتی ہے۔ مگر اس فضا میں ایک نقرئی اور شیریں آواز ساری محفل کا رنگ بدل دے گی۔ بوڑھے فلسفیوں کے چہرے تمتما اٹھیں گے۔ ان کی عینکیں درست ہو جائیں گی ——— ایسا ہوتا ہے!

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انقلاب کیوں؟ سوچئے یہی نا کہ زندگی کی تلخ حقیقت روح کو مردہ کر دیتی ہے۔ جنس کا خیال اس میں دوبارہ زندگی ڈال دیتا ہے۔ یہ عین فطرت ہے۔ بچوں کو دیکھئے۔ ایک بچہ دوسرے سے محبت کرتا ہے۔ اس سے جدا نہیں ہوتا۔ ان کی محبت کا تجزیہ کیجئے۔ ان ننھے اور معصوم بچوں کی تہ میں یہی فطری جذبہ جنس کارفرما ہے۔ اس سے چونکئے نہیں۔ رگوں کے دوڑتے ہوئے خون سے نفرت کرنا زندگی کو جھٹلانا ہے

مذہب اور سماج کا ظلم بڑھتے بڑھتے اس حالت تک پہنچ چکا ہے کہ اب اس فطرت کی آواز کا نکلنا بھی بند کیا گیا ہے۔ مذہب اور حکومت کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ مذہب فتوے لگاتا ہے اور حکومت تعزیر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں برس کے قیود کا اثر ابھی تک ہمارے ذہنوں پر ہے۔ اس آزاد خیالی کے زمانے میں بھی ہم آزادی سے اس آواز کو نہیں نکال سکتے۔ اس کے متعلق مذہب اور حکومت کا فتویٰ موجود ہے۔ فحاشی! کتنی ستم ظریفی ہے کہ معبدوں کے در و دیوار پر جنسی جذبات کا اظہار اشاریت میں موجود ہے۔ ان اعضا کی پرستش تک ہوتی ہے جس کا نام لینا اور تحریر میں لانا قانونی گرفت میں آتا ہے۔ مگر اس کے جواز کے لئے قانون میں استثنیٰ موجود ہے۔ مذہب کے نام سے کتنا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

موجودہ تہذیب شعور پر ایک بوجھ ہے۔ جس سے انسان دبے جا رہے ہیں۔ مگر اس دباؤ سے نجات دینے کے لئے جنس کی فطری آواز ہے۔ سائنس نے انسانیت کو مشین کے پھندے میں جکڑ دیا ہے۔ اب وہ زمانۂ قدیم کی سادگی کہاں۔ فطری آواز رنگین مگر سخت قیود میں بند ہے۔ اخلاق کا نام لیکر اس آواز کو بند کر دیا جاتا ہے لیکن جونہی ذرا راستہ ملا، وہ بجلی سے زیادہ تیزی سے زندگی میں دوڑنے لگتی ہے۔ اس نئی زندگی کے اظہار کو اخلاق اور تہذیب فحاشی کا نام دیتے ہیں۔

جنس ایک ساز ہے جس کے تاروں پر صدیوں کا زنگ لگ رہا ہے۔ ان زنگ آلود تاروں کی آواز اتنی شیریں نہیں۔ اس میں آواز کا کیا قصور۔ زنگ کو دور کیجئے پھر دیکھئے کہ آواز کتنی شیریں سنائی دے گی۔

اس زنگ کو کون دور کرے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس کا جواب مذہب تو یہی دیگا کہ یہ جذبہ حیوانیت ہے۔ اسے اور دباؤ۔ قانون فحش کہکر اسے قابل دست اندازی قرار دیگا۔ سائنس کی نظر میں یہ بے حقیقت سی چیز ہے۔ جارج برنارڈ شا کیسے لطف کی بات کہتا ہے "پادری ہمیشہ خود بخود گھس آتا ہے اور وہ زور دیتا ہے کہ جنس کے معاملے میں اُسے حکم (AUTHORITY) مانا جائے ——— پوپ سارے یورپ کا پادری ہے اور وہ زور دار الفاظ میں اس موضوع پر گفتگو کرتا ہے۔ میں تو کبھی ایسے معاملات میں اُن سے کہوں گا کہ وہ دخل دے۔ ہاں اگر یورپ کی سب سے بڑی فاحشہ عورت آئے تو میں اسے مداخلت دونگا

کہ وہ جنسی موضوع پر بات چیت کرے۔ میں کہوں گا۔ یہ ہے وہ انسان جو پیشہ ورانہ طور پر جنس کو سمجھتا ہے۔ اس کے گزر اوقات کا سہارا اسی پر ہے۔ اس لئے وہ اسی معاملہ میں غلط نہیں ہو سکتا ــــــــ ہاں اس کے دوسرے درجے پر میں خود ہوں تمثیل نگار۔"

انہوں نے تمثیل نگار کہکر خود نمائی نہیں کی۔ بلکہ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ فطرت انسانی کو سمجھنے والا ادیب ہی جنس کے بارے میں جان سکتا ہے۔ وہ صدیوں کے دبائے ہوئے دل کے اندر جھانک لیتا ہے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ اس جھانک کے نظارے کو صفحۂ قرطاس پر لائے۔ تصاویر اور وہ بت جو معبد خانوں میں ہیں اس لئے قابل گرفت نہیں کہ ان کے گرد مذہبی ماحول کا ہالہ بنایا جا چکا ہے اور انکو دیکھ کر جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے۔ لیکن الفاظ میں کونسا جادو ہے جو پڑھنے والے کے سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ معبد کی تصویر تو معصوم مگر الفاظ کی اشاریت گردن زدنی۔ بات در اصل یہ ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن فحش پسند ضرور ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کو اپنے مذاق کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اس کا مریض دماغ اس سے تحریک حاصل کرتا ہے۔ ورنہ مذہبی کتابوں میں جن باتوں کا ذکر ہے اس کا لاکھواں حصہ بھی ہمارے ادب میں نہیں ہے۔

صدیوں کا دبا ہوا ہجوم سماج اور مذہب کی بندشوں میں ہم پر چھایا ہے۔ اس کا اٹھایا جانا موجودہ زندگی میں ہلچل نہ مچا دیگا۔ تمام قیود کا یکسر اٹھایا جانا مضر ثابت ہوگا۔ تعمیر کے لئے تخریب لازمی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اس ظلم اور استبداد کے خلاف جو جنس کے معاملہ میں برتا جاتا ہے علم بلند کریں۔ پھر آہستہ آہستہ ایسا انتظام کیا جائے جس میں یہ فطری جذبہ نشو و نما پائے اور اپنی صحت مندانہ ڈگر پر گامزن ہو۔ مذہب الوہیت پرستی سکھاتا ہے جو ایک مرض ہے۔ اس کا مریض سماج کے لئے بذات خود نقصان پہنچائیگا۔

مہذب لوگ کلچر کے خواب دیکھتے ہیں۔ مگر ان کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ زمانۂ جہالت کی طرف لوٹ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم معصومیت اور گناہ، آسودگی اور یاس میں اس کشمکش کو دیکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں تجزیۂ نفسی کی تحقیقات سے پوری توقع ہے کہ وہ کلچر اور جنسی رجحانات کے مابین ایک صحیح راستہ معلوم کرنے کی سعی کریں گی۔

تہذیب کے ارتقا میں جبلت کا اہم حصہ ہے۔ اس سے شخصیت اور انفرادیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ انسانی برتاؤ میں جبلت ایک بجلی کی رو کا کام دیتی ہے۔ جہاں یہ فائدہ مند ہے۔ وہاں اس کی ذرا سی بے احتیاطی تباہی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ مگر اس بجلی کو کس حد تک آزاد چھوڑ دیا جائے؟ اس کے متعلق پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ ہمیں جبلت اور اپنی شخصیت کا امتزاج اس طرح کرنا چاہئے تاکہ ہمارے اندر دباؤ کی جو کشمکش ہوتی ہے۔ وہ دور ہو جائے۔ سب سے اہم جبلت جنس ہے۔ اس سے ہم جس قدر اتحاد رکھیں گے۔ اسی قدر ہمارے برتاؤ پر اس کا اثر ہوگا۔ اس پر جبر کرنا اپنی ہلاکت مول لینا ہے۔

سائنس دان حقائق کو پسند کرتا ہے۔ فلاسفر اقدار کو۔ شعراء حسن کو محبت کرتے ہیں۔ کیوں ہم بھی نہ فطرت کی آواز کی تکمیل کریں۔ سائنس دان کی ہی نہیں بلکہ فلاسفر اور شعراء کی طرح۔ تاکہ ہماری زندگی خشک حقائق کے ساتھ ساتھ رنگین بھی ہو۔ یہ رنگینی ہی فطرت کا سب سے بڑا عطیہ ہے جسے روک کر انسانی ارتقا پر ظلم کیا جاتا ہے۔ سماج کے مظالم کا زیادہ شکار عورت ہی رہی ہے۔ اب اس کا رد عمل شروع ہوگیا ہے۔ اس رد عمل کو روک کر آپ نیک کام نہیں کرتے بلکہ ایک مرض کا علاج کرنے کی بجائے دوسرا مرض پیدا کرتے ہیں۔ ہم اس موقعہ ملکر جنت بنا سکتے ہیں۔ آپنے سر اکو بند کر دیا۔ آدم پر قیود لگادیں جنت جہنم بن گئی اور صدیوں سے بنتی جا رہی ہے۔ ہم اب علم میں بڑھتے جا رہے ہیں۔ ترقی کر رہے ہیں۔ جنس ایک ایسی آگ ہے جو ہمیشہ روشن رہتی ہے اور جسکو کوئی بجھا نہیں سکتا۔ اس سے ذرا غلطی ہو جائے جلاتی نہیں بلکہ جلا کرتی ہے۔ اس آگ میں پڑ کر انسان اور زیادہ چمکتا ہے۔ ذہنی اور روحانی بیماریوں کا شکار ساری دنیا ہو رہی ہے۔ ان سب کی تہ میں کرید کر جب دیکھا گیا۔ تو فطرت کی آواز دبی ہوئی نکلی۔ زندگی کے ساز کے زنگ آلود تار سارے نغمے کو برباد کر رہے تھے۔ یہی نکات تھے جنہوں نے جنت ارضی کو رنگیں بنانا تھا۔

ادب نے جنس کے معاملے میں قدم اٹھایا ہے۔ تجزیۂ نفس نے نفسی گہرائیوں کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا ہے۔ عورت اس کھیل میں پیش پیش ہے۔ وہ جذبات سے کھیلتی رہی ہے۔ اسمیں اگر وہ کہیں بہک جائے تو اس میں اس کا قصور نہیں۔ یہ سماجی پابندیوں کا رد عمل ہوگا۔ اسی طرح وہ جو ان جسم کیلئے جنس شجر ممنوع تھا۔ اس کا پھل کھانا گناہ گردانا گیا۔ آپ لاکھ اسے روکیں مگر ایسا ضرور ہوگا۔ یہ فطرت کی آواز ہے۔ جو دب سکتی ہے۔ مگر بند نہیں کیا جا سکتی۔

سید ضمیر جعفری

محسوسات

شب کی مغموم سی، ویران سی تنہائی میں
دن کے آلام کا تڑپا ہُوا، گھبرایا ہُوا
تلخیِ گردشِ ایام کا سہمایا ہُوا
اپنے ویران سے بستر پہ نڈھال اور غمگیں
نیند کی سعی تو کرتا ہوں پہ نیند آتی نہیں
ہاں مگر دن کے حوادث کی بھیانک زنجیر
ذہن میں میرے اُبھر آتی ہے مثلِ تصویر
ہائے اے تلخیِ اندوہِ گراں بارِ معاش
خود ہتھیلی پہ لئے پھرتا ہوں خودداری کی لاش
آہ! حاکم کی خوشامد! یہ ثنا آرائی!
دب گئی فطرتِ بیباک کی ہر سچائی
جس کو سچ کہتا ہے کوئی اُسے سچ کہتا ہُوں
مجھ کو چُپ رہنے کی تاکید ہے، چُپ رہتا ہُوں
زہر کو دیکھ کے بھی پینے پہ مجبور ہُوں میں
یہ بھی جینا ہے کہ یُوں جینے پہ مجبور ہُوں میں
اپنے ویران سے بستر پہ نڈھال اور غمگیں
نیند کی سعی تو کرتا ہوں پہ نیند آتی نہیں
ہاں مگر دن کے حوادث کی بھیانک زنجیر
ذہن میں میرے اُبھر آتی ہے مثلِ تصویر
اور اِک نرم سِسکتی ہوئی آوازِ ضمیر
توڑ دیتی ہے دل و رُوح میں احساسِ تعمیر
شب کی مغموم سی، ویران سی تنہائی میں

ڈی پی دَر

جواب الجواب

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ترقی پسند شاعری بدترین ادبی اور اخلاقی جرم ہے "اس شاعری کو ادبی جرم کہنا تو شاید مرزا صاحب کے خیالات کے مطابق صحیح ہو مگر اسے اخلاقی جرم بھی کہنا ان کے نظریۂ شاعری کے مطابق کسی طرح مناسب نہیں ہوتا۔ خود مرزا صاحب کا ادبی اخلاق مندرجہ ذیل منقولات سے ظاہر ہوتا ہے فرماتے ہیں:

(۱) "یہ شاعری شاعری نہیں بکواس ہے"

(۲) "کثافت اور گندگی میں آلودہ کرنا"

(۳) "ان کو سمجھانے کی کوشش ہی پاگل پن ہے"

(۴) "عفونت میں بسا ہوا اور غلاظت میں تھڑا ہوا جھلنگا"

(۵) "لیت پت"

(۶) "نجاست میں لوٹنے کی دعوت"

(۷) "پیشہ وری میں ننگے"

(۸) "جاہل اور بے حس"

(۹) "کاہلی اور سفاہت کی بنا پر شدّ و مدّ"

(۱۰) "بغض و حسد و کینہ کے زیرِ اثر شاعر بن بیٹھے"

(۱۱) "بھاگ گھوٹنے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے"

(۱۲) "مزدوری کسانوں کی دلالی وغیرہ وغیرہ" اور اس پر مرزا صاحب کو یہ شکایت ہے کہ ترقی پسند شاعروں میں جذبۂ انتقام و نفرت کار فرما ہے۔ نہ جانے مرزا صاحب اپنے ان الفاظ کو کس طرح محبت اور پریم پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کی گالیاں اُن کے دلائل سے الگ ہیں اور ہمیں عادت ہے کہ ہمیں جو گالی دے۔ اُسے حافظ کا یہ شعر سنا دیا کرتے ہیں ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را

غالباً یہ ان گالیوں کی طفیل ہے کہ مرزا صاحب کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ کہتے ہیں۔ اور اپنے بیانات کے تناقض کو نظر انداز فرماتے ہیں۔

مرزا صاحب نے شاعری کا صحیح مقصد یوں متعین کیا ہے کہ انسان دن بھر کی مصروفیت اور تھکن کے بعد اپنی فرصت کے لمحے اس طرح صرف کر سکتا اور ایسے ماحول میں پہنچ سکتا ہے۔ جہاں دُنیا کے مکروہات سے تھوڑی دیر کے لئے نجات پا جائے۔ اور وہ سکون و راحت میسر ہو سکے۔ دل و دماغ کو جس کی ضرورت تھی۔ اور مرزا صاحب کو یہ شکایت ہے کہ ادب برائے زندگی" یہ نعمت بخشنے سے قطعاً قاصر ہے۔ کیونکہ اپنی بہترین صورت میں بھی اُسی کشاکش کا آئینہ ہے۔ جس کا عملاً سامنا ہوتا ہے۔ گویا مرزا صاحب شاعری کو زندگی اور عمل سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور ان کا تمام غصہ ترقی پسندوں سے بر صرف اس لئے ہے کہ ترقی پسند لوگ ادب کو زندگی کا ایک حصہ اور اس کا آئینہ دار سمجھتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج۔ کیونکہ یہ محض ترقی پسندوں کا ہی عقیدہ نہیں ہے۔ اگر مرزا صاحب کو اعتراض نہ ہو تو میں کلام پاک کی آیت نقل کر دوں۔

ترجمہ۔ شعراء کی باتوں پر چل کر چلنے والے گمراہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ شعرا جو کہتے ہیں۔ وہ کرتے نہیں۔ اور مختلف وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں مگر وہ شاعر جو

جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔"

اب اس آیت پر مرزا صاحب کی تنقید سن لیجئے۔ مرزا صاحب ایک بزرگ کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں "کہ میرا خیال تھا کہ شاعری کی شریعت [illegible] ہے کہ کلام کی خوبی اور حسن قبول پر ہے مگر اب معلوم ہوا کہ شاعر جب تک ولی نہ ہو اس کا کلام ہمارے نزدیک کسی عزت کا مستحق نہیں۔ کاش فاضل تھا ایک ہی ایسے [illegible] خصلت محسن انسانیت شاعر کا نام لیتے جو ابراہیم بن ادہم کی طرح بنی آدم کا خادم بنکر خدا کا برگزیدہ بندہ بن گیا۔" مرزا صاحب نے گویا قرآن کریم کی آیت کا جواب دے دیا ہے۔ مگر اس مسئلہ پر قرآن پاک کی آیت شریفہ قابل قبول نہ ہو۔ تو ہم چند مشہور شعرا کے اقوال پیش کرتے ہیں۔ مولوی رومی کے کلام کے متعلق مشہور ہے کہ ؎

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآن در زبان پہلوی

اور ہمارے دور کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ شاعری کا جو نظریہ بار بار بیان کیا ہے وہ یہی ہے کہ ادب برائے زندگی ہے۔ ادب برائے ادب نہیں۔ لیکن دوسروں کے اقوال شاید مرزا صاحب کیلئے مستند نہ ہوں۔ اس لئے خود انہی کے الفاظ اسی مضمون سے نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ "یہ سچ ہے کہ موجودات عالم میں کوئی شے اور کوئی واقعہ ایسا نہیں جو شاعری کے دائرہ عمل سے خارج ہے۔" اگر مرزا صاحب کا یہ کہنا سچ ہے تو مزدوروں اور کسانوں کے متعلق جو اشعار ہیں۔ انہیں مرزا صاحب "دوالی" کیوں کہتے ہیں۔ اگر ترقی پسند ادیب چند واقعات اور اشیا پر زیادہ زور دیتے ہیں تو انہیں جذبات خود کرنی سے ایسے شاعرانہ نقائص ہیں کہ مرزا صاحب اس شاعری کو "نگو اس" کہتے ہیں۔ ان کو شکایت یہ ہے کہ بقول ان کے ترقی پسند شاعر سوویٹ ذہنیت پھیلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ مرزا صاحب اسی مضمون میں ہندوستان کے ترقی پسندوں کو ذلیل کرنے کی خاطر سوویٹ ذہنیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "روس میں شاعروں اور ادیبوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ خیالی دنیا میں زندگی بسر نہ کرو۔ بلکہ میدان عمل میں کود کر حق اور انصاف کی حمایت اور جور و استبداد کی مخالفت پر کمربستہ رہو۔" یہ لکھ کر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ "ہندوستان کے شاعر محض قلم سے ہنگامہ کارزار گرم کرتے اور مرتے مارتے ہیں۔" تو مرزا صاحب کے مطابق اگر یہ ادیب جنگ آزادی میں کود پڑیں، قید و بند کی سختیاں جھیلیں، پھانسی کے تختوں پر لٹکیں، تو پھر ان کی شاعری قابل قدر ہوگی۔ ہمیں مرزا صاحب کے ساتھ بڑی حد تک اتفاق ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مرزا صاحب اس سے پہلے یہ فرما چکے ہیں کہ "شاعر کا نیک اور نیک عمل ہونا ضروری نہیں"۔ اسی مضمون میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ "ترقی پسند شعرا کے اشعار اور ادب برائے ادب کے اشعار میں" مجھے چنداں فرق نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اگر ایک میں معشوق کی پلکیں صف آرا ہو کر بیچارے عاشق پر تیر باراں کرتی تھیں تو ادب برائے زندگی میں یہ خیالی جانباز مفروضی آلات حرب کا نشانہ ہیں۔" گویا جب تک شاعر کے اپنے جسم پر گولی نہ چلے اُسے حق نہیں کہ دوسرے زخمیوں کے جذبات کا اظہار کرے۔ یعنی اگر شیکسپیئر شائلاک یہودی کے جذبات کا اظہار کرے تو وہ شاعر نہیں۔ جب تک وہ خود کنجوس یہودی نہ ہو۔ خیر ادب برائے ادب کے اشعار اور ادب برائے زندگی کی نظموں میں چنداں فرق نہیں تو۔ تو پھر مرزا صاحب ایک گروہ کو کیوں کوستے ہیں اور دوسرے گروہ کی کیوں قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ اسی مضمون میں مرزا صاحب نے بڑی لمبی بحث کے بعد فرمایا ہے کہ "اگر ہمارا قول صحیح ہے تو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں کوئی حد فاصل نہ رہی۔" ہم نے مان لیا کہ مرزا صاحب کا یہ قول صحیح ہے تو پھر اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پسند طعن و ملامت کے سزاوار نہیں۔

یہ غلط بیانی غالباً اُس غصے کا نتیجہ ہے۔ جس کا اس مضمون میں بار بار اظہار کیا گیا ہے۔ اسی غصہ کی وجہ سے مرزا صاحب نے ترقی پسندوں کی سیدھی سیدھی باتوں کو بھی غلط سمجھا۔ آپ فرماتے ہیں "ادب برائے زندگی کے مدعیوں کا بیان ہے کہ ان کے مخالفین زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں سے بھاگ کر ایک [illegible] میں پناہ لیتے ہیں۔" مرزا صاحب نے یہ سمجھا ہے کہ ترقی پسند لوگ اپنے مخالفین کو دنیاوی حیثیت سے ناکام سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح ان پر طعنہ زنی [illegible] کا یہ مفہوم نہیں۔ ترقی پسند عام زندگی کی تلخی اور غلط سیاسی اور اقتصادی نظام کی برائی بیان کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ مرزا صاحب اور ان کے ہم خیال [illegible] میں ناکام ہیں۔ ترقی پسند تو وہی بات کہتے ہیں جسے مرزا صاحب نے اپنی زبان میں دنیا کی "مکروہات" قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مکروہات [illegible] جا بیٹھے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ "اُن مکروہات کو بھول جاؤ۔ شاعر کا کام ہے کہ تھکے ہاروں کو لوریاں دے دیکر سلادے۔" ترقی پسند کہتے ہیں کہ شاعر [illegible]

تاکہ اُن مکروہات کو بھلا دیں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ شاعر کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو میٹھے سپنوں میں غرق کر دے۔ تھوڑی دیر کے لئے! ———

مجھے مرزا صاحب کو اس سے بھی انکار نہیں۔ اسی مضمون میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اچھے شعرا نے ان خصوصیات کو جن کا اظہار جہدِ حیات میں ہوتا ہے۔ کبھی نظر انداز نہیں کیا" ——— یہاں "جہدِ حیات" قابلِ غور ہے۔ اگر جہدِ حیات کا بیان اچھے شاعروں کا خاصہ ہے تو پھر مرزا صاحب ترقی پسندوں سے کیوں لڑائی کرتے ہیں۔ وہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ "بہتر ترقی پسند شاعری میں بھی یہ بُرائی ہے کہ وہ کشاکش کا آئینہ ہے۔" ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جہدِ حیات کی آئینہ داری تو درست ہے۔ مگر کشاکشِ حیات کی آئینہ داری مکروہ ہے! ———

مرزا صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اُن کے پسندیدہ شاعر "راستی و نکوکاری" کی تعریف کر کے اُن کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ اور ظلم و عمل آزاری وغیرہ کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ مذمت اور رغبت مرزا صاحب کے الفاظ میں۔ مگر جب ترقی پسند شاعر ظلم کی مذمت کرتے ہیں اور لوگوں کو راستی کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ تو مرزا صاحب بگڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ایسا کام نہ کرو۔ اس پر ہماری اجارہ داری ہے۔ مرزا صاحب اس رغبت اور مذمت کے ساتھ "صناعت" کی شرط بھی لگاتے ہیں۔ مگر میری نظر سے آج تک کسی ترقی پسند نقاد کی کوئی ایسی تحریر نہیں گذری جس میں یہ درج ہو کہ شاعری کے لئے "صناعت" غیر ضروری ہے۔

مرزا صاحب مضمون کے آخر میں یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "سماج کا موجودہ نظام مکمل اور بے عیب نہیں ہے۔" اور یہ نظام اصلاح کا محتاج ہے۔ ترقی پسند ادیب اسی نامکمل اور باعیب نظام کی اصلاح چاہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ مرزا صاحب کا خیال ہے کہ پھنسی مرہم پٹی سے درست ہو جائے اور ترقی پسند کہتے ہیں کہ یہ پھنسی نہیں پھوڑا ہے۔ اور ایسا مہلک پھوڑا ہے کہ اگر اس کی جراحت نہ کی گئی تو یہ تمام انسانی نظام کو غارت اور برباد کر دیگا۔ پچھلے سالوں میں جنگِ عظیم کے بعد کئی چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوئیں اور اب ایک اور جنگ کا میدان گرم ہے۔ یہ ہیں اُس نظام کے نتائج جس کی مرزا صاحب لیپ پوت کرنا چاہتے ہیں اور جسے ترقی پسند ختم کرنا چاہتے ہیں۔

سیف اللہ

(ایک روسی افسانے کا عکس)

دستِ تعاون

سینٹ پیٹرزبرگ، روس کا قدیم دارالحکومت ——

سڑک پر عوام کے ہجوم میں گولی چلنے کی آواز نے ایک کھلبلی سی مچادی۔ ایک جواں سال فوجی افسر کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والی اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ یہ اینا تھی —— اینا باغِ حسن کی ایک تیتری۔ اُس کا چہرہ چاند سا، گلاب سے رخسار، اور آنکھیں نیلی نیلی تھیں۔ وہ سراپا شباب تھی۔

وہ قاتل تھی —— اُس کی اس جرأت نے عوام کے ذہن کو ایک حیرانی میں ڈال دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، رنگ رنگ کی افواہیں اڑنے لگیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ شخص جس نے اس کی عصمت کا موتی چرا کر اسے بربادی اور تباہی کے سمندر میں دھکیل دینے کی کوشش کی ہو، کسی طرح بھی قابلِ معافی نہ تھا۔

ملزم پر مقدمہ چلا۔ اس کا حسین چہرہ قانون کی گرفت کو ڈھیلا کرنے میں ناکام رہا۔ عدالت نے اُسے سو کوڑے لگانے کی سزا دی۔ اس عہد کا یہ دستور تھا کہ جس مجرم میں کوڑے کھانے کے باوجود زندگی باقی رہ جاتی۔ اُسے سائبیریا میں بھیج دیا جاتا تھا کہ مہذب دُنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ رہے۔ اینا نے بڑے ضبط سے فیصلہ سُنا۔ ججوں نے حکم دیا کہ اگر کوڑے کھانے کے باوجود وہ زندہ رہی تو اسے "کوپال" کے زندان میں بھیج دیا جائیگا۔ اسے اس بات کی آزادی دی گئی کہ وہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کرلے (کوپال) کا جیل خانہ ایک بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ وہاں کی دنیا صرف وحشت بھرے اور گھاس تک موجود تھی اور پینے کیلئے پانی بھی مشکل میسر آتا تھا۔ داروغہ جیل نے اینا کے سب کپڑے اتار پھینکے۔ ممکن تھا کہ صرف کوڑوں کے خوف ہی سے اس کی موت واقع ہو جاتی لیکن کا یک سپاہی نے کوڑا اٹھانے پر اس نے حقارت اور نفرت کے جذبات حال میں لئے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ داروغہ چلایا "اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لو ہوشیار رہنا آگ نہ کھائے۔" دوسرے سپاہی نے اپنی آہنی مٹھیوں میں اس کے برف کے مانند سرد و سپید اور پھول کی مانند نرم و نازک ہاتھ دبا لئے۔

اینا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی متوالی نگاہیں اس سپاہی کو مسحور کر چکی تھیں۔ وہ پچاس کوڑوں کی سزا برداشت کرنے پر تیار ہو گیا۔ داروغہ حیران تھا اس نے اس کی وجہ دریافت کی تو سپاہی نے جواب دیا کہ وہ اُسے اپنی شریکِ زندگی بنائے گا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے وہ بیوی کی سزا میں حصہ لے سکتا ہے۔

سپاہی کا رنگ برہنہ ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف جکڑ دیئے گئے اور پاؤں سے بارہ بارہ سیر وزنی لوہے کے کندے باندھ دیئے گئے تاکہ وہ کوڑے کھاتے وقت حرکت نہ کر سکے۔ داروغہ نے اپنی پوری قوت سے کوڑا اٹھا کر اُس کی پیٹھ پر مارا اور کہا۔

"کیوں اب بھی آغوشِ حسن میں کھیلنے کی آرزو ہے۔ لو ابھی تمہارے اس جشن کا آغاز ہوا جاتا ہے"

سپاہی نے اپنے لب کاٹ لئے تاکہ منہ سے چیخ نہ نکل جائے۔ اس کے جسم پر کوڑوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ خون میں لت پت نظر آنے لگا۔ اینا کا دل دہل گیا۔ گویا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ پچاس کوڑے لگ چکے سپاہی بولا "دس اور ——"

اینا کو اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دس کوڑے ختم ہونے پر اس نے دس اور کوڑوں کی تکلیف برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اب اینا کیلئے صرف تیس کوڑے باقی تھے۔ بہادر سپاہی نے اس لرزہ براندام مریں پیکر کی طرف نگاہیں اُٹھائیں اور مدھم آواز میں کہا "دس اور ——"

داروغہ دیوانہ وار اُسے کوڑے لگاتا گیا۔ تیرے کوڑے کھانے کے بعد اُس کی طاقتِ گویائی بھی رخصت ہو گئی یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ آیا اس کی سانس چل رہی ہے یا نہیں۔ داروغہ بولا۔

"کیوں بہادر سپاہی، محبوبہ کی خاطر دس کوڑے اور کھاؤ گے؟"

اس نے اشارے سے رضامندی ظاہر کر دی۔ یکایک اینا فوراً دونوں ہاتھ پھیلا کر اس خون میں لتھڑی ہوئی زندہ لاش سے چمٹ گئی اور پکار اٹھی

"دس کوڑوں کی سزا اب مجھے ملنا چاہئے، میرے دیوتا —— میرے مصیبت کے ساتھی ——"

عمدہ کتابیں

صبح بہار، اختر شیرانی ایک خوش گو شاعر ہیں۔ آپ کے کلام میں ترنم، شیرینی اور کیف پایا جاتا ہے۔ لفظوں کا انتخاب بھی خوب کرتے ہیں۔ اور اکثر جو کچھ لکھتے ہیں۔ دل سے لکھتے ہیں۔ تازہ مجموعہ نظم۔ قیمت مجلد سنہری ۱؍۲

شعرستان، درسالہ رومانی لاہور کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب، جس میں حضرت اختر شیرانی کی چیدہ چیدہ نظموں کے علاوہ محترمہ کنیز فاطمہ حیا، عزیز جہاں بیگم ادا، چوہدری خوشی محمد ناظر، اسرار الحق مجاز، عبد المجید حیرت، اختر اورینوی، بشیر ضیائی اور دوسرے کئی ایک عمدہ لکھنے والوں کا کلام شامل ہے۔ جلد اور ڈسٹ کور عمدہ۔ قیمت صرف عہ

ادب اور زندگی۔ پروفیسر مجنوں کے تازہ ترین مقالات کا مجموعہ جس میں تنقید کے جدید تصور اور اسکے نئے اصول و اسالیب سے بحث کی گئی ہے اور پھر انہیں کی روشنی میں اردو شعر و ادب کے بعض اہم مسائل اور چند ممتاز تاریخی شخصیتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

انتخاب الہلال، مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین کا انتخاب مجلد مطلا ۵؍

مخزنِ اخلاق، اگر آپ اپنے گھر اور خاندان کو صحیح اخلاقی تربیت دینا اور دنیا و آخرت میں سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔ تو اس مقصد کے لئے مخزن اخلاق ہی دنیا بھر میں واحد کتاب ہے۔ چھٹا ایڈیشن مجلد مطلا ۲؍

۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں، مرتبہ حلقہ ارباب ذوق، قیمت ۸؍

زندہ چین، جدید چینی کہانیوں کا شاندار مجموعہ، چینی جذبات کی ترجمانی عیر

منٹو کے افسانے، بڑے ساتھ پر افسانوں کا مجموعہ، جس میں سعادت حسن منٹو کے بام عروج پر پہنچانے والے افسانے شامل ہیں۔ قیمت مجلد ۲؍

ہمارا پنجاب، معاشرتی، تاریخی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی حالات کا دلکش مجموعہ ۲؍

آفتاب، اسلام اور اسلامی مفکرین کے متعلق بہترین مقالے عیر

شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک۔ (مولفہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی)، عیر

پیاری زمین، پرل ایس بک کی شہرہ آفاق تصنیف کا ترجمہ از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۱۲؍

جزیرہ سخنوراں۔ ایک لطیف طنز کے پیرائے میں اردو شاعری کے محاسن و معائب اور سخنوروں کی زندگی کے بعض دلچسپ پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ایک ناولٹ مصنفہ غلام عباس قیمت عہ

مکتبہ اردو لاہور

مکتبہ اُردو لاہور کی نئی مطبوعات

آہنگ۔ ترقی پسند حلقوں میں اسرار الحق مجاز کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا مجموعہ کلام اردو شاعری کے موجودہ رجحانات کا بہترین ترجمان ہے۔ خیالی دنیا، جذباتی اور تخیلی ترنم کی قوت کے لئے آہنگ کا مطالعہ کیجئے۔ آہنگ کا پہلا ایڈیشن اشاعت کے فوراً بعد ختم ہوگیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن کافی ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ دیباچہ پروفیسر فیض احمد فیض نے لکھا ہے۔ کتاب نہایت خوبصورت طریق سے شائع کی گئی ہے۔ مجلد قیمت عہ

منظر پس منظر۔ اختر اورینوی ملک کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جن کے دم سے اردو کی داغ بیل مضبوط پڑ رہی ہے۔ انہیں زندگی کا گہرا مشاہدہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی کی خارجی اور داخلی حقیقتوں کا فنکارانہ تجزیہ ملتا ہے۔ ان کا مطالعہ دراصل زندگی کی الجھنوں اور خوبیوں پر نظر ڈالنا ہے۔ آپ اس میں زندگی کے مختلف منظر دیکھیں گے — رنگین اور پھیکے بھی — یہی نہیں بلکہ پس منظر آپ وہ سب کچھ پائینگے۔ جسے زندگی اپنے دامن میں چھپائے رکھتی ہے۔ آپ اس کتاب کے مصنف کو زندگی کے قریب تر پائیں گے۔ مقبول ترین افسانہ نگار کے مقبول ترین افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد عہ

رفیق تنہائی۔ علی عباس حسینی کے رومانی افسانوں کا مجموعہ۔ حسینی کے افسانے، اچھوتے پلاٹ، نادر و دلکش تشبیہات، منفرد مکالمات اور سنجیدہ مزاح کا ایک حسین مجموعہ ہوتے ہیں۔ اس پر ان کے نفسیاتی تجزیے سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں۔ حسینی ماہر فن افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ہر افسانے میں زندگی ایک نئے زاویہ سے پیش کی جاتی ہے۔ حسینی کے افسانے بلا دھڑک یورپ کے بہترین افسانوں کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ قیمت عہ

آیات و نغمات۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے افکار کا تازہ مجموعہ جو اردو شاعری کے دور ارتقاء کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آیات و نغمات میں شاعر انقلاب نے اپنے آپ کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ انکی روح کا عکس ہے۔ انکے نغمات میں اپنے طرز کی دلکشی و نغمگی ہے۔ آپکے دل کے تار دیر تک مرتعش رہینگے۔ بہترین کاغذ پر خوبصورت چھپائی۔

شبستانِ الم۔ زبیدہ سلطانہ کے افسانوں نے دنیائے اردو میں جو شہرت حاصل کی ہے۔ وہ پبلک سے پوشیدہ نہیں۔ شبستانِ الم آپکے جدید غیر مطبوعہ اور کامیاب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ زبیدہ سلطانہ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "لمحات رنگین" بہت مقبول ہو چکا ہے مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ جدید مجموعہ نہ صرف ان کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ دنیائے افسانہ میں بھی ایک مستقل اضافہ۔ قیمت عہ

بگولے۔ احمد ندیم قاسمی کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں۔ آپکے اشعار اور مختصر افسانے اردو ادب کے اس دور جدید میں ایک معزز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو اصحاب ان کے نام سے واقف نہیں۔ اس کی معلومات ناقص ہیں۔ جو ادیب ان کی عظمت کا منکر ہے۔ اس کا ادبی ذوق محل نظر ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر۔

احمد ندیم قاسمی کی زبان صاف ستھری ہے۔ اور فنی نقطۂ نظر سے ان کے افسانے قابل قدر ہیں۔ "ہمایوں" لاہور

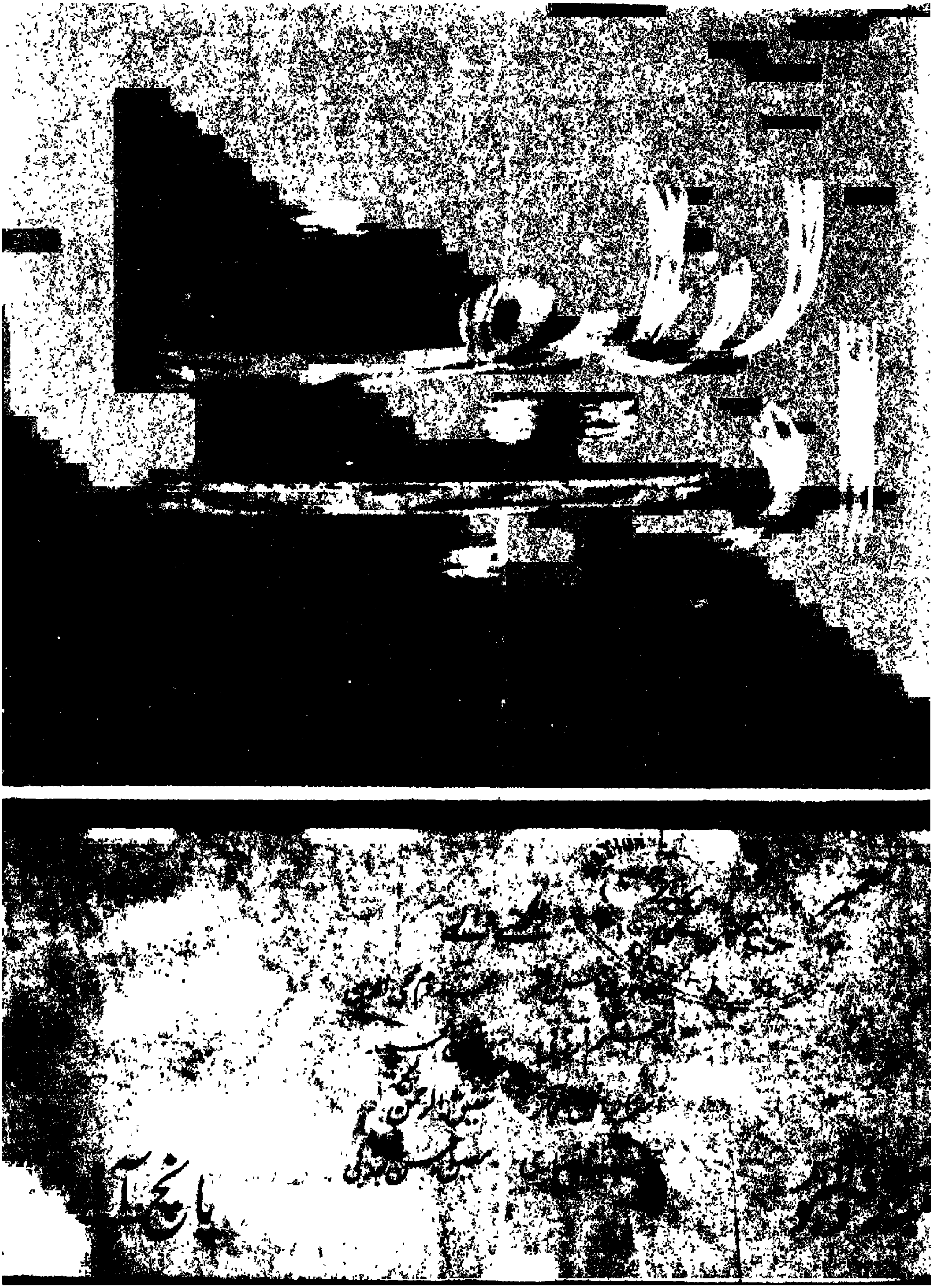
احمد ندیم قاسمی کا شاعرانہ طرز تحریر ان کے افسانوں میں بدرجہ غایت نمایاں ہے۔ "ادبی دنیا" لاہور

مجموعے میں قاسمی کے بیس منتخب افسانے شامل ہیں۔ خوبصورت جلد مع کور۔ قیمت عہ

ادبِ کثیف۔ حاجی لق لق۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا۔ حضرت غالبؔ نے مندرجہ بالا شعر میں لطافت اور کثافت کو لازم ملزوم قرار دیا ہے اور ملک کے مشہور مزاح نگار حاجی لق لق نے اس شعر کے مطابق اپنا "ادب کثیف" میں لطافت اور کثافت کو جمع کر کے اسے آئینہ بنا دیا ہے "ادب کثیف" کا ایک ایک جملہ غمگین سے غمگین شخص کے لب پر تبسم کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ اور پڑھنے والا بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے بلکہ یہ خیال کرنے لگتا ہے۔ کہ اگر یہ "ادب کثیف" ہے۔ تو "لطیف" کس بلا کا نام

June 1942 Regd. L. No. 3521





ایڈیٹر

چودھری برکت علی

چودھری نذیر احمد

سالانہ چندہ

چار روپے چار آنہ

ادبِ لطیف لاہور

فی پرچہ

پانچ آنے

جلد ۱۶ ستمبر ۱۹۴۲ء شمارہ ۱

فہرس

ادارہ

اشارات

افسانہ نمبر آپ کی نظر سے گزرا۔ ملک کے طول و عرض سے جس قدر توصیفی مراسلات موصول ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے لئے حوصلہ افزا ہیں اور بلکہ یوں کہئے کہ جس قدر اُمیدیں ہم نے اس نمبر کو ترتیب دیتے وقت وابستہ کی تھیں۔ یہ نمبر اُن سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوا کاروباری اور ادبی اعتبار سے ہمیں مسرت ہے کہ افسانہ نمبر کے بیشتر افسانوں کو نقادانِ فن نے سالِ رواں کے بہترین افسانوں میں جگہ دی ہے لہذا ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسرت میں آپ ہمارے برابر کے حصہ دار ہیں۔

افسانہ نمبر کی کامیابی کا سہرا ہمارے قلمی معاونین کے سر پر ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اُنہیں اس کے بعد مزید تکلیف نہیں دیں گے بلکہ بطور پیشگی یہ گوش گزار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ وہ سالنامہ کے مضامین نظم و نثر کیلئے ابھی سے لکھنا شروع کر دیں۔ تاکہ ہماری دوسری ادبی پیش کش اپنے تمام سابق ریکارڈوں کو مات کر دے۔ اور ہم کہہ سکیں کہ ادب لطیف کی خدمات ادب اُردو کے لئے تا گزیر ہیں۔ ادب لطیف کا بار ہمارے قلمی معاونین کے کندھوں پر ہے۔ آج تک جس طرح اس فریضے کو ان حضرات نے سرانجام دیا ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی وہ اس رفتار سے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کاوش سے کام لیں گے اور ہمیں بار بار یاد دہانی کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔

ہاں! اور مقدمے کے بارے میں اپیل ہائی کورٹ میں دائر ہو چکی ہے۔ نتیجہ ——— کون جانتا ہے۔

ہم اُن مصنفین سے نادم ہیں جن کو ہم ریویو کے لئے آئندہ شماروں کا انتظار کراتے آرہے ہیں۔ اُن کی اطلاع کے لیے یہ کافی ہوگا کہ آئندہ شمارے سے ہم اس فرض سے سبکدوش ہونا شروع کر دیں گے۔

کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی اور دیگر صعوبتیں ہمارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو سکیں اور ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا ادارہ نشر و اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لے رہا ہے۔ چند نئی کتب جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں: **ان کہی** ممتاز مفتی کی تیرہ کہانیوں کا مجموعہ **بلاستہ** - اختر اورینوی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ۔ **طلوع و غروب** - احمد ندیم قاسمی کی بیس نئی کہانیوں کا مجموعہ۔

ابوالکلام آزاد - ابوالکلام کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن اس کے باوجود بہت کم لوگ ہندوستان کے اس مایۂ ناز فرزند کی زندگی کے حالات سے واقف ہیں۔ ابوالکلام کی شخصیت ہر اعتبار سے ہمہ گیر ہے۔ آپ بیک وقت ایک انقلابی مفکر، سیاستدان، بلند پایہ ادیب اور آتش بیان مقرر ہیں۔ اس کتاب میں آپ کی زندگی کے مکمل حالات افسانوی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اُردو میں ابوالکلام پر اپنے انداز میں یہ پہلی کتاب ہے۔

اختر انصاری

غزلیات

دکھ سے ہو جائے یہ جہان خالی　　　　کاش میں اس جہاں سے اُٹھ جاؤں!
مَیں بہت ہی بُرا ہوں اہلِ بزم　　　　تم کہو تو یہاں سے اُٹھ جاؤں؟
جوشِ مستی اگر سہارا دے
بزمِ بادہ کشاں سے اُٹھ جاؤں

میں ہوں مایوس، کوئی بتلاؤ　　　　دل کی اُمیدیں کیسے جیتی ہیں
کیسے رنج دوں میں آرزوؤں کو　　　　آہ! یہ تو مری چہیتی ہیں
چور ہیں نشّے میں تصوّر کے
میری آنکھیں شراب پیتی ہیں!

قہر ہے اس جہاں کا یہ دستور　　　　کوئی مختار ہے کوئی مجبور!
دل سی اک شے خدا نے کی تھی عطا　　　　وائے قسمت کہ بن گیا ناسُور!
غم سے خائف ہوں اور اسی باعث　　　　بھاگتا ہوں خوشی سے کوسوں دُور
کیوں نہ آنکھوں میں اشک بھر آئیں　　　　دل کی چوٹ اور اس قدر بھرپور!
آرزو اپنی چھب دکھائے تو!　　　　یاس کی سختیاں مجھے منظور
ہائے وہ دُکھ بھری نظر، یعنی　　　　ناتواں دل کی سعیِ نامشکور
لے چل اے لحنِ مطرب لے چل　　　　دُور، اس سرزمینِ غم سے دُور
دل میں پنہاں ہے یوں کوئی اختر
چاند جیسے گھٹا میں ہو مستور

حکیم ارزقی

سنہرے بال

کہانیاں سن سن کے کہنے کا شوق ہوا اور کہتے کہتے لکھنے لگا۔ مگر سنسنی خیز فیشن کی کہانیاں نہیں جن کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر۔ بے جان و بے ترتیب۔ ہم تو مکمل واقعات کے قائل ہیں۔ اس طرح کہ پڑھنے والا ہر بار یہ سوچے کہ اب کیا ہوگا۔ الف لیلہ کی طرح کہ افسانے کی اس فسوں کاری نے شہرزاد کی جان بچالی ایک ہزار رات بادشاہ فردا کا منتظر رہا۔ مگر مجھے عشق و محبت کے افسانوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ عشق تو کرنے کی چیز ہے۔ اپنے کرنے کی چیز۔ یہ نہیں کہ اوروں کی حرکتوں سے لذت اٹھاتے رہنا جیسے پیرس کے قہوہ خانوں میں بے مصرف زندگی بسر کرنے والے بوڑھے جوان اور جوان بوڑھے عشق کو ابتدا سے انجام تک دیکھتے ہیں۔ عشق ہی ہوا نا! — آپ اسے معرفت کہہ لیجئے۔ ملا رومی اسے خمار گندم کہتا ہے دل کے داغوں کو پھول نام رکھتے ہیں

میں تو عقل اور خالص عقل کے عمل سے افسانہ سازی کرتا ہوں۔ اور خالص عقلی افسانوں میں سراغرسانی کا درجہ بہت بلند ہے۔ اردو میں یوں بھی اس قسم کے افسانوں کی کمی ہے۔ ہماری زندگی میں گرمی اور جذبات زیادہ ہے۔ غور و فکر کم ہے۔ لیڈر حضرات تک کا یہ حال ہے۔ اہم سیاسی مسائل پر تقریر کرتے ہوئے داغ کے اشعار گا دیتے ہیں تو گویا ترقی پسندی بھی اسی میں ہے کہ عقلی افسانے لکھے جائیں اور پھر سراغرسانی عملی چیز بھی ہے جرائم کی تحقیق میں بہت مدد ملتی ہے

جب میں کالج میں تھا۔ تو میرے ساتھ کے کمرے میں ایک فلسفہ کا طالب علم رہتا تھا۔ اس کی اخلاقیات کی کتاب چوری ہوگئی۔ مجھے ان دنوں بھی سراغرسانی کے افسانوں کا بہت شوق تھا چنانچہ نیلی چھتری کے نام سے جو ناول چھپا ہے۔ اسکے متعلق میں نے ہی یہ دریافت کی تھی کہ یہ فرانسیسی کے ایک ناول کا سرقہ ہے۔ میری اس شہرت کی بنا پر اور محض اسلئے کہ کسی شک کی وجہ نہیں، وہ طالب علم میرے پاس آیا اور کہا کہ بھائی کھوج لگاؤ۔ میں نے فوراً کہا کہ یہ کسی عربی کے طالب علم کی حرکت ہے۔ اور وہ ضرور داڑھی رکھتا ہوگا۔ اس قسم کا ایک ہی شخص ہمارے ہوسٹل میں تھا۔ چنانچہ اسکے کمرے سے وہ کتاب برآمد ہوئی۔ ہم نے اس کی رپورٹ نہ کی اور علاج کے طور پر اسکی داڑھی منڈا دی اور اب وہ شخص ایک معتبر افسر ہے۔ اور چوری کی لت سے شفا پا گیا ہے۔ میرا استدلال واضح تھا عربی کا تعلق مذہب سے ہے اور مذہب کا اخلاقیات سے اور داڑھی مذہب سے عملی انہماک کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اخلاقیات کی کتاب کا چور بقول حالی کوئی خضر کی صورت والا بزرگ ہے۔

افسانے لکھنے سے میری شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ اس شہرت کی وجہ سے ایک دن صبح سویرے جب میں اپنے بیٹھنے کے کمرے میں غور و فکر میں مشغول تھا مسز طارق تشریف لے آئیں۔ ان کے آنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک نوجوان حسین اور قبول صورت عورت تنہا میرے کمرے میں کن وجوہ سے آسکتی ہے۔ میرا سراغرساں دماغ کام کرنے لگا۔

(۱) میری ذاتی جنسی کشش کی وجہ سے؟ یہ میرا وہم نہیں۔ اسکے عملی ثبوت بھی ہیں۔ مگر مسز طارق اول تو شوہر رسیدہ ہیں اور پھر خاوند سے محبت رکھتی ہیں۔ حقیقتہً شادی ہوئی تھی اور عشق ہی اب تک ملا ہے۔ (دوسرے) پچھلے چھ مہینوں سے ہم ہمسائے ہیں۔ اور پچھلے بیس دن سے مسز طارق سے ملاقات نہیں ہوئی حالانکہ طارق تو ہر بار دو ڈھائی آتا رہتا ہے۔ (سوم) مسز طارق کے چہرے پر اس قسم کی کشش کے آثار نہیں مثلاً آنکھوں میں چمک نہ سانس میں تیزی نہ ہاتھوں میں لرزش وغیرہ وغیرہ۔ البتہ چہرہ کچھ زرد تھا۔

(ب) قرض لینے کے لئے ؟ — مگر وہ تو بہ خوشحال لوگ ہیں اور پھر طارق کو خود مانگنے یا رقعہ لکھکر ادھار لینے میں باک نہیں جبکہ تو کم لینے کے لئے کوئی گرتی ہے
(ج) اپنے افسانوں کی البم میں میرا نام لکھوانے کے لئے ؟ تو مسز طارق پہلے ہی یہ کر چکی ہیں۔
(د) گپ زنی کے لئے ؟ لیکن ابھی ان کی شادی میں اتنی جان ہے کہ میاں بیوی دو ہرانے ہوئے قصے دوہراتے رہیں ۔
(ہ) دعوت پر بلانے کے لئے ؟ سو اسکے لئے خود آنے کی ضرورت نہیں ہمارے تعلقات ایسے نہیں اور میں عورت سے انکار کرنے کا عادی نہیں ۔

اسلئے ہو نہ ہو محض میری ادبی حیثیت کی وجہ سے وہ میرے ہاں آتا اپنی عزت افزائی سمجھ کر آئیں۔ اور شاید میرے ناول کے پیلے ورق پڑھکر۔ یا شاید کسی سفارش کے لئے یا شاید۔ . . ! — غرض یہ بے پناہ قیاسات کا چرخ چل رہا تھا۔ ایک طرح کی دو دلتی کہ جب بیبیاں ان کے مداحین آگاہ ہو جاتا ہوں کہ وہ پہلے اظہار کرتی ہیں۔ ادبی شہرت کا پلہ بھاری نظر آتا تھا لیکن . . . .

آخر وہ ہی بولیں۔ آنکھیں نیچی کر کے بولیں : "میں سخت مصیبت میں ہوں ! —
اتنی خاموشی کے بعد بس اتنا سا فقرہ ! — نجانے کیا مصیبت تھی ؟ —
صراحت کی کہ میرا خاوند مجھے دغا دے رہا ہے۔ بے وفائی کر رہا ہے ! —

میرے منہ سے بے اختیار نکلا "احمق کہیں کا !" — اسپر مسز طارق کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اور اس مغالطے سے میری ان کی شراکت ہو گئی۔ مغالطہ یہ ہوا کہ انہوں نے سمجھا کہ میں نے احمق کا خطاب ان کے خاوند کو دیا اور اس طرح ان کے حسد اور رقابت کو جائز سمجھا۔ حالانکہ میں نے اپنے آپ کو احمق کہا اسلئے کہ میرے قیاسات غلط نکلے اور کی باتیں سوچتا رہا اور سامنے کی بات نظر انداز کر دی۔ مسز طارق کا جذبہ حسد ہمارے حلقے میں ضرب المثل تھا۔ شاید ہی کوئی دوست یا محض صورت آشنا ہو جو کبھی نہ کبھی انکے شکوک کا راز داں نہ بنا ہو۔ طارق کی مزعومہ عشقبازیاں افسانہ بن چکی تھیں۔ مجھے چاہیئے تھا کہ مسز طارق کو اس طرح وارد ہوتے ہی سمجھ جاتا کہ کوئی نئی واردات ہوئی ہے ۔

اب میں اپنے اس فقرے پر پچھتا رہا تھا اور مسز طارق بڑی شکر مندی کے ساتھ مسکرا سی رہی تھیں۔ انہوں نے کہا خاوند نے بیوفائی کی۔ میں نے کہا احمق ! تو انکے خیال میں گویا میں نے ان کے خاوند کی نالائقی پر اپنی ناخوشنودی کا اظہار کیا اور خاوند کے خلاف بیوی کی حمایت کی — اس طرح مجھ سے ایک اور حماقت سرزد ہو گئی۔ اور اب میرے لئے پیچھے ہٹنا مشکل ہو گیا۔ مسز طارق کی شکر مندی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے آہ بھر کر کہا "میرے پاس اسکا ثبوت ہے"۔

میری سراغرسانی نے زور کیا اور میں پھر بے اختیار ہو کر کہا "کیا ثبوت ہے ؟" — یہ کہہ کر میں رکا۔ مگر اب رکنا بے سود تھا۔ جو پہلے مشکل تھا اب ناممکن ہو گیا میں پوری طرح شریک سازش ہو گیا۔ اپنے دوست کے خلاف اسکی بیوی کے ساتھ ! — حماقت در حماقت ! —

مسز طارق سے میری بے تکلفی تو تھی ہی گو میں اسے بالعموم مسز طارق ہی کہا کرتا تھا کبھی کبھی شمیم۔ اب وہ شمیم ہی رہ گئی ۔
شمیم نے اپنے بیگ سے رومال نکالا اور رومال کھول کر میرے سامنے رکھدیا۔ اسمیں ایک دو نہیں چار پانچ چھ سات آٹھ نو بھورے لمبے بال تھے سنہرے بال ! —
میں دوڑ کر دوسرے کمرے میں گیا اور اپنی سراغرسانی والی خورد بین اٹھا لایا۔ یہ تو سنہرے بال تھے۔ مگر ان کی جڑیں سیاہ تھیں۔ اور جڑ سے اوپر تھوڑے سے تیل لگا ہوا تھا۔
میں نے کہا "نقلی سنہرے بال ہیں۔ پیرا وکسائیڈ سے سنہرے ہوئے ہیں اور زیادہ احتیاط نہیں کی ہوئی۔ بعد اپنی نمود ہو رہا ہے"۔
شمیم بولی "جی ہاں۔ نقلی عورت تو ہے۔ بدمعاش کہیں کی — اور اسکے بال جھڑ رہے ہیں"
میں نے کہا۔ عمر رسیدہ ہوگی ۔
شمیم بولی "یہ نہیں۔ طارق بوڑھی عورتوں سے معاملات نہیں کرتا۔ مگر عورت شناس نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس فاحشہ کو نپ محروم رہا ہے بال جھڑنے لگے ہیں

شاید بیماری سے نحیف ہو چکے ہیں۔ طارق کے شانے پر سر رکھ دیا ہوا اور وہ احمق۔ آپ نے احمق کا لفظ خوب تجویز کیا۔ پہلے ہمدردی کے زور سے اور پھر اپنی عادت سے مجبور ہو کر ...." یہ کہہ کر شمیم رُکی اور پھر بے اختیار ہو کر زار و قطار رونے لگی

میں سوچ رہا تھا کہ ذہانت کا زور کس طرح عقل کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ تپِ محرقہ کا خیال خوب نکالا اس عورت نے، نقلی سنہری بال، جوان عورت، نیا نیا تپِ محرقہ سے افاقہ۔ (بنا اس لئے کہ جوان عورت تپِ محرقہ سے جلد سنبھل جاتی ہے اور بال گرنے رک جاتے ہیں) اس عورت کی کھوج نکالنی ناممکن نہ ہوگی۔ اب میں شمیم کا پورا ہمدرد ہو گیا۔ اس کے رونے سے میرا دل پسیج گیا۔ طارق نے سخت زیادتی کی۔ اسے اچھی طرح جھنجھوڑنا چاہیئے۔ احمق کہیں کا! —

شمیم جب پر سر رکھ کر میری سرخ آرام کرسی پر دراز ہو گئی اور مطمئن سی ہو کر کہنے لگی۔ "جب آپ کی مدد لینے کے لئے آئی تھی میں نے کہا تھا۔ میں حاضر ہوں۔" شمیم نے لمبی سانس لی اور کہا کہ "میرے دل کو تسکین ہو رہی ہے آپ کی سراغ رسانی ضرور کامیاب ہوگی۔ اور پھر ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو نہیں بلکہ بیسیوں سیاہ کی مہینہ ٹھیاں گچھوں کے گچھے اس بدمعاش عورت کے سر سے الگ ہونگے۔ کوٹ بھی نیا تھا۔ کل ہی پہنا تھا۔ گندے بالوں سے خراب کر دیا!"

میں اس تندی سے گھبرا سا گیا اور اصرار کے وعدے سے پشیمان ہونے لگا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور شمیم بسکٹ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر رخصت ہو چکی تھی۔

میں کمرے میں تنہا بیٹھا سوچنے لگا۔ کون کون سی عورتوں سے طارق کی واقفیت ہے؟ — نو عورتوں کی فہرست بنی — !

(۱) — لیڈی ذ . . . . . عمر تیس سال۔ لال لگا ہیں تو ہیں مگر اس قسم کی بڑھیا نہیں۔ مزید نام لکھ لینا چاہیئے۔ فہرست مکمل کرنے کے لئے۔

(۲) — بیگم یوسف — خاوند مصر میں فوجی ڈاکٹر لگ گیا ہوا ہے۔ بالوں کی رنگت یاد نہیں مگر چونکہ ملی تھی اور تپِ محرقہ کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ یا شاید سرخی سے لپی ہوئی تھی۔ اس لئے معلوم نہ ہوا۔ غور طلب ہے! —

(۳) — یاسمین — نئی نئی گریجوایٹ ہیں۔ بال غالباً سیاہ ہیں۔ آنکھوں کی طرح — تپِ محرقہ رہا ہے۔ طارق سے کیا ملیگی۔ مگر تحقیقات ضروری ہے۔

(۴) — کوشلیا — نئی بیوہ — غالباً سنہری بال۔ بھوری آنکھیں۔ فرانسیسی ماں۔ ہمارے حلقہ میں نووارد۔ رنگ زرد زرد — بیوگی کی وجہ سے یا شاید اسے تپِ محرقہ رہا ہو — بہت غور طلب! —

(۵) مسز ہوشکین ——— پٹھان عورت۔ فرنگی انجینیر سے شادی کی ہے۔ سنا ہے تپ رہا ہے۔ بال غالباً بھورے ہیں تحقیق طلب ہے! —

(۶) وزیرنی — نیم پردہ۔ خاوند وزارت کے زور پر اوباشی کرتا ہے۔ ہر قسم کی اوباشی — بالوں کی رنگت نامعلوم — دیکھا جائیگا! —

(۷) — مہترانی — فہرست مکمل کرنے کے لئے نام کا اندراج ضروری ہے۔

(۸) آپا خاتون — تپِ محرقہ رہا ہے۔ بال غالباً سیاہ ہیں۔ سوشلسٹ بنتی ہیں۔ خاوند فقید ہے۔ غور طلب! —

(۹) مسز مہتہ — شاعرہ۔ مصنفہ۔ بالوں کی رنگت سیاہ بھی رہی ہے۔ بھوری بھی رہی ہے۔ ہفتے سے ملاقات نہیں ہوئی نجانے اب کیا رنگت ہو۔ یقیناً غور طلب! — [میرے حافظہ کی یہ خاص کمزوری ہے کہ مجھے بالوں کی رنگت یاد نہیں رہتی۔ بالوں کی طرف نظر ہی نہیں پڑتی۔ اسلئے ہر جگہ غالباً لکھ دیا]۔

اس فہرست میں سے کچھ نام تو نظری تھے۔ نمبر ایک اور نمبر سات میں نے کاٹ دیئے۔ نمبر تین بھی سوچ کر کاٹ دیا۔ نمبر چھ بھی — باقی رہ گئے پانچ نام — ان کے متعلق میں نے تفتیش شروع کرنے کا ارادہ کر لیا — نمبر ۲-۴-۵-۸-۹ —

پہلے نمبر ۸ کے ہاں پہنچا — معلوم ہوا کہ پرسوں سے سسرال گئی ہوئی ہیں — اور شاید کل واپس آئیں۔ الحمد للہ۔ یہ قصہ تو کل کا ہے۔

پھر نمبر ۹ کے ہاں پہنچا۔ گھنٹہ بھر بات غور طلب بیگیا۔ کوشلیا میرا نیا ناول پڑھ رہی تھی۔ دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے طارق کا ذکر کیا کہنے لگیں اچھا آدمی ہے۔ مگر بیوی حاسد قسم کی ہے۔ شاید اسی لئے ہفتے بھر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کچھ معلوم ہوتا تھا۔ بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کرتی ہے

میرے ناولوں سے بہت انہماک ہے۔ مجھے ابتک یہ پتا نہ تھا کہ شکلیں بگڑتی رہی۔ دلچسپ عورت ہے۔ ملاقات کے قابل۔ دو گھنٹے بیٹھا رہا۔ اور ہاں انہیں کبھی بھی تپ محرقہ نہیں ہوا۔ صحت مند عورت ہیں۔ اور اب ندوی بھی جا رہی ہے۔ بال غور سے دیکھے واقعی سنہری ہیں مگر طارق کا اس سے کیا تعلق۔ یہ بھی الغلط ہوئیں! ——

لنچ کا وقت ہو رہا تھا۔ اسلئے مسز پانچ سے ملنا ملتوی کیا۔ لنچ اور چائے کے درمیان سستانے کا وقت ہوتا ہے اور جو ذرا دیر سے جاؤ تو ٹرکایا جائے طلبی ہوئی! اسلئے مسز کوشلین کے ہاں شام کو پہنچا۔ میاں بیوی دونوں دورے پر گئے ہیں۔ تین دن سے باہر ہیں۔ یہ بھی خارج از بحث ہوئیں۔

مسز آہلکی کی کوٹھی پاس ہی تھی۔ وہاں پہنچا۔ جاتے ہی انہوں نے اپنی مخصوص حرکتیں شروع کر دیں — باہیں اٹھا کے گردن سکڑ لیتیں، ٹانگیں اور سینہ ابھار لیا تاکہ میں پروانہ ہو کر گردش لے کر باتیں شروع کر دیں۔ مگر بال کوئلے کی طرح سیاہ ہیں۔

اب رہ گئی مسز مہتہ — میاں صاحب ستور رفائیہ تھے۔ مجھے دروازے پر لینے آئیں اور ہم ادیب یہ کہتے ہیں اور ہم ادیب جو ہوتے ہیں یہ بار بار کہا جا رہا تھا۔ ایک نوبیورت رسیدہ کالج کا لڑکا بھی بیٹھا تھا اور بڑی قصیدہ خوان نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے انہیں تک رہا تھا۔ بیا شکار تھا مگر دینی دل کا معمول ضرور تھا۔ پہلی ملاقات بیلتی۔ غرض طارق بری الذمہ تھا کیونکہ مسز مہتہ بیک وقت تعدد تعلقات کی مخالف ہیں۔ رومان میں توحید کی قائل ہیں۔ زبانی نہیں مہتہ کے پاس اسکے ثبوت ہیں۔ بال آجکل سیاہ ہیں! ——

نو بجے میں گھر پہنچا۔ سارے دن کی بربادی پر اتنا افسوس نہ ہوتا اگر سراغرسانی میں ایسی ناکامی نہ ہوتی۔ سب دروازے بند پائے۔ اب کیا کیا جائے۔ سوچا اپنے حلقے سے باہر تلاش کی جائے۔ مگر ہو تو کیونکر ہو —— کل نو بجے کے بعد طارق کے یار غار مسٹر مکرجی کے ہاں پہنچا۔ اسلئے کہ طارق کی کل کی نقل و حرکت کے متعلق تفتیش کروں۔ کچھ گھٹیا سی حرکت معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب تو محض طارق کی بدکرداری کے خلاف اخلاقی احتجاج اور شمیم کی بے بسی سے ہمدردی کا سوال نہ تھا میری سراغرسانی کی قوتوں کا امتحان تھا۔ میرے لئے یہ چیلنج تھا۔ کتنے نقادوں نے کہا تھا کہ اگر پولیس میرے طرزِ استدلال اور طریق تفتیش کی رہنمائی میں کام کرے تو ملک جرائم سے پاک ہو جائے۔ یہ نو بالوں کی گتھی سلجھانا میرا فرض نہیں ادبی عزت و آبرو کا مسئلہ تھا! — ادب اور زندگی کا صحیح سنگم ہو رہا تھا! — مسٹر مکرجی سے کوئی بات نکلوانا کچھ ایسا مشکل کام نہ تھا مگر وہ عشقیہ معاملات میں رازداری کا سختی سے قائل تھا لیکن نام چھپانے کی حد تک —— میں نے چھوٹتے ہی کہا کیوں مسٹر مکرجی تازہ خبر کیا ہے؟ گو اتنا کہنا ہی کافی ہوتا ہے مگر آج مسٹر مکرجی کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ کہنے لگا بھائی ہم دو بیر کچھ نہیں — ہماری میم صاحب کلکتے گئی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا تو پھر تو مزے ہو گئے۔ میدان صاف ہے۔ مکرجی نے کہا تم گنوار لوگ ٹھیک نہیں ہو۔ ہم جسکی لگاتا ہے تو بیوی کیسا تھا جب آنکھ لڑاتا ہے تو بیوی کے سامنے۔ میں نے کہا مگر مکرجی کیا تمہاری بیوی برا نہیں مناتی۔ مکرجی بڑے تفخر سے ہنسا۔ تم گنوار لوگ عورت کی جات کو نہیں سمجھتا۔ ہماری بیوی جب دیکھتی ہے کہ ہم اور عورت لوگ کو بھی خوش کر سکتا ہے تو وہ ہم سے اور زیادہ خوش ہوتی ہے۔ ہماری بیوی ہماری بیوی ہے۔ طارق کی بیوی نہیں ہے۔"

طارق کے نام سے میں چونکا اور چالاکی سے گفتگو کو اپنے ڈھب پر ڈھالنے کا ارادہ کیا مگر مکرجی جاری تھا۔ اسلئے میں یونہی سر ہلا کر چپ ہو رہا۔ کل طارق کی بیوی نے پھر کام خراب کیا۔ ہمارا لکھا نادیں تھا اور شروع ہو گئے اسکے لاچار۔ تم نے کل اس عورت سے بات کی۔ کوشلیا سے مسکرائے۔ یا ہمیں سے ہنسی کی۔ اور ہم بیٹھے منہ تک رہے تھے اور بیوی کبھی طارق کے کاندھے پر سر رکھ کر رو رہی ہے اور کبھی منہ بنا رہی ہے۔ آخر ہم تنگ آ کے اُٹھ آئے۔ اور رات کے نو بجے ہی گھر آ کر سو رہے۔"

بس میں یہی اطلاع چاہتا تھا۔ شمیم نے کل پھر فساد کیا اور طارق غصے میں انتقام کی خاطر نو بجے کے بعد گھر سے باہر چلا گیا ہو گا اور پھر جو نقلی سنہری بالوں والی تپ محرقہ سے بیکی ہوئی عورت ملی ہو گی اس سے ہمدردی حاصل کی ہو گی۔ میں مکرجی کو جلتی چھوڑ کر گھر آ گیا اور دل ہی دل میں طارق سے ملکر جرح و نقد کے ذریعے تفصیلات دریافت کرنے کی ٹھان لی۔ اس اضطراب میں اچھی طرح نیند نہ آئی۔ صبح بھی سوچ کیساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ ابھی فراش نے بیٹھنے کا کمرہ صاف نہ کیا تھا کہ میں نیچے اترا۔ آیا سورج کی کرنیں سرخ آرام کرسی پر پڑ رہی تھیں اور تکیے پر کچھ بال الگ الگ چمک رہے تھے عورت کے بال —— سنہری بال —— ایک دو نہیں پورے ایک درجن بال —— میں نے اپنی خوردبین اٹھائی۔ ان سنہرے بالوں کی جڑیں سیاہ تھیں۔ اور جڑ سے اوپر بھورے تھے۔ تیل لگا ہوا تھا! ——

میں نے محض دل کی تسلی کیلئے طارق سے فون پر تصدیق کر لی کہ شمیم کو حال ہی میں تبدیلی کے لئے تپ محرقہ رہا تھا! ——

اسرار الحق مجازؔ

اُفتاد

نہ ہم آہنگِ مسیحا نہ حریفِ جبریل
تیرا شاعر کہ ہے زندانیِ گیسوئے جمیل

کس کی آنکھوں میں یہ غلطاں ہے جوانی کی شراب
کھول دی آہ یہ کس نے مئے گلگوں کی سبیل

کس طرف جائے کہاں جائے بتا دو کوئی
زُلفِ پُرخم کا گرفتار نگاہوں کا قتیل

عالمِ یاس میں کیا چیز ہے اک ساغرِ مے
دشتِ ظلمات میں جس طرح خضر کی قندیل

کتنی دشوار ہے پیرانِ حرم کی منزل
اِس طرف فتنۂ ابلیس، اُدھر ربِّ جلیل

اُف یہ طوفانِ نشاط اور مری طبعِ حزیں
آہ یہ شورشِ ناز اور میں مجروح و علیل

آہ وہ ہوش کا عالم وہ غموں کی یورش
اُف یہ مستی کہ ہے پھر ہوش میں آنے کی دلیل

شفیق الرحمٰن

زیرِ طبع کتاب شگوفے سے

دو تارے

میں نے دونوں بازو اوپر اٹھائے، پنجوں پر اچھلا اور سر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ خنک ہوا کے جھونکوں میں سے گزرتا ہوا دھم سے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں گر پڑا، میری انگلیاں ندی کی تہ سے جا لگیں۔ تڑپ کر اچھلا اور پانی کی سطح پر آ گیا، ادھر ادھر دیکھا۔ گلدستے کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ میں پورے زور سے تیرنے لگا، ذرا سی دیر میں میں نے گلدستے کو دیکھ لیا۔ مجھ سے کافی دور تھا۔ میں پتھروں سے بچتا ہوا بڑی تیزی سے تیرتا جا رہا تھا میں نے لمبا سا سانس لے کر ایک غوطہ لگایا اور پھولوں کے بالکل پاس جا پہنچا۔ یکایک مجھے پانی گرنے کا شور سنائی دیا۔ پھوار کے بادل اٹھتے نظر آئے۔ آبشار نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے بے تحاشہ تیرنا شروع کیا، اگر فوراً ہی گلدستہ نہ پکڑ لیا تو آبشار میں پھولوں کی پتی پتی بکھر جائے گی۔ آخر ایک لمبے سے غوطے میں میں نے گلدستے کو جا لیا۔ اور شپ سے پکڑ لیا۔ اور بڑی حفاظت سے اسے کنارے تک لایا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھرجھری آ گئی، میں کتنی دور چلا آیا تھا، ندی کے موڑ توڑ اور چیڑ کے درختوں نے اس چٹان کو چھپا دیا تھا جہاں سے میں نے چھلانگ لگائی تھی۔ گول گول پتھروں کو پھلانگتا ہوا ریتیلے کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ مجھے وہ چٹان بھی نظر آ گئی۔ میں حیران رہ گیا، اتنی بلندی سے کس طرح کود گیا تھا، اب تو اگر کوشش بھی کروں تب بھی ہمت نہ پڑے۔

پھر اس چٹان پر ایک سفید سا دھبا بھی نظر آنے لگا، جو بڑا ہوتا گیا۔ یہ پروین تھی، میں نے پھولوں کو پھر سے چھوا، بھلا ایسے پھولوں کو کیونکر ضائع ہونے دیتا، مسکراتے ہوئے رنگ رنگے معطر پھول، کتنے پیارے۔ بالکل پروین کی طرح!

چھوٹی پگڈنڈی کتنی چکر کاٹ کر پہاڑ پر چڑھتی تھی، لیکن اتنی دیر کون لگاتا۔ میں سیدھا چل دیا، لہلہاتے ہوئے سبزے کو روندتا، خودرو پھول دار پودوں اور جھاڑیوں کو پھلانگتا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اب پروین اچھی طرح نظر آ رہی تھی۔ پہاڑوں کا چمکیلا سورج ابھی ابھی جنگلوں سے طلوع ہوا تھا۔ سرد ہوائیں عجیب سی خوشبو پھیلا رہی تھیں۔ نیلا نیلا آسمان، اجلے اجلے بادل، لہراتی ہوئی ٹہنیاں، اور چٹان پر کھڑی ہوئی پروین، سنہرے بالوں اور گلابی چہرے والی۔ جس کی لٹیں ہوا کے جھونکوں سے کھیل رہی تھیں

اور جب میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ تو وہ کچھ مسکرائی میں نے وہ گلدستہ اسے واپس دے دیا، اور وہ پرفسوں آنکھیں دیکھنے لگا۔ جن کی اتھاہ گہرائی میں میری کائنات گم ہو جاتی تھی، کتنی ملائمت تھی، ان میں۔ چاند جیسی پیشانی پر کھیلتی ہوئی لٹیں، جو بکھری ہوئی تھیں۔ میرا کتنا جی چاہ رہا تھا کہ انہیں سنوار دوں۔

وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی، ایسے چمکیلے ماحول میں۔ میں نے سوچا دنیا کتنا حسین مقام ہے مسرت ہی مسرت، رنگ برنگے خواب مسکراتی ہوئی کلیاں، رقص کرتی ہوئی تتلیاں، لہلہاتا ہوا سبزہ اور پھر دھڑکتا ہوا امنگوں بھرا دل۔

ہم واپس گھر چل دئے۔ ایسا عجیب اتفاق ہوا، صبح میں تیرنے کے لئے آیا اور پھر پروین پھول چنتی ہوئی مل گئی۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔ آخر اس نے کہا کہ میں نے یونہی چند پھولوں کے لئے اتنی بلندی سے چھلانگ لگا دی

میں نے کہا کہ میں آیا بھی تو تیرنے کے لئے تھا۔

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

میں نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے سگریٹ نکالا۔ پوچھا

"سگریٹ سلگاؤں؟"

وہ بولی "ہاں"

"اور اگر جان کی اماں پاؤں تو پی بھی لوں"

"ہاں!" پھر خاموشی —— میرا جی چاہتا تھا کہ یہ باتیں کرے

"دیکھئے یہ وادی کس قدر خوبصورت ہے، اودے اودے پہاڑوں کی قطاریں یوں لگ رہی ہوں جیسے سمندر کی لہریں ہوں اور وہ جھلمل جھلمل کرتے ہوئے چشمے —— جیسے چاندی کے تار اُن سفید سفید بادلوں نے آسمان میں کیسے عجیب گنبد بنا رکھتے ہیں —— دیکھا —؟"

"جی!" وہ بولی۔

اب ہم ایک موڑ سے گزر رہے تھے۔

"اور وہ آبشار تو دیکھی ہی نہیں تم نے، کیسی دھندلی سی قوس قزح نے اُسے محیط کیا ہوا ہے، چاروں طرف پھوار پڑ رہی ہے یہ پانی اُن چمکیلی چوٹیوں سے آرہا ہے، وہ اُجلی اُجلی چوٹیاں جن پہ برف جمی رہتی ہے۔ کبھی تم نے یہ پانی چکھا؟ —— ایسا ٹھنڈا اور شیریں ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اگر تم کہو تو کل وہاں چلیں؟"

"اچھا!"

اب ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے تھے، اُن کی کوٹھی پہلے آتی تھی میں چاہتا تھا کہ اس مختصر سے وقفے میں جس قدر باتیں کر سکوں کر جاؤں

"خوب! تو ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے، وہ سامنے صنوبر کا اونچا درخت نظر آرہا ہے۔ آج کیا پروگرام ہے؟ دوپہر کے بعد تمہارے ہاں سب سیر کو چلیں گے نا؟ —— نہیں؟ — ابا دو بندوقیں لائے ہیں، ایک میں لے چلوں گا، چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا شکار کریں گے۔ وہ جو اُس جھنڈ کے پیچھے جھیل ہے نا وہاں چلیں گے وہاں ناشپاتیاں بھی ہیں اور سیب بھی، شاید سٹرابری بھی ہو۔ پھر گلدستہ تمہارے ہاتھ سے گر کر نیچے بہتے ہوئے پانی میں جا پڑے اور میں تم سے چھلانگ لگا دوں"

"لیکن آج دوپہر کے بعد تو — آج ذرا دہ — مجھے کچھ پڑھنا تھا"

میں کچھ چپ ہو گیا۔ اب اُن کا گھر آ گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا "اچھا لائیے جناب ہمارا گلدستہ واپس کر دیجئے"۔ اور پھول واپس لے وہ چلی گئی، میں کھڑا دیکھتا رہا۔ یونہی بے وقوفوں کی طرح!

. . . .

. . . .

پھر ایک سرد شام کو میں لمبی سیر سے واپس آرہا تھا۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ سے بالکل تھکا ہوا، گلے میں کیمرہ، بندوق اور تھیلے اور نہ جانے کیا الا بلا۔ اب میں گھر کے نزدیک ہی تھا، صرف دو موڑ اور رہ گئے تھے، یکایک میری نگاہ چیڑ کے درخت کی چوٹی پر گئی۔ جہاں بڑی روشنی ہو رہی تھی، لمبے لمبے نوکدار پتوں میں سے ایک بڑا چمکیلا تارا جھانک رہا تھا، میں وہیں ٹک گیا، اور اُسے دیکھنے لگا، میرے افسردہ لبوں پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر چکر کاٹ کر اوپر سے پہنچا، ہوا کے جھونکے تیز ہو گئے اور خنکی بڑھ گئی۔ موڑ سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک اور تارہ چمک رہا تھا، اتنا ہی بڑا، اتنا ہی پیارا —— پہلے تارے کے بالکل قریب۔

میں مسکراتا ہوا ایک پتھر پر بیٹھ گیا، اور ان دو تاروں کو دیکھنے لگا، برفانی چوٹیوں سے خنک معطر ہوائیں آرہی تھیں، چیڑ کے درختوں کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ پتے سرسرا رہے تھے۔

وسیع آسمان پر جہاں لاتعداد ننھے ننھے تارے چمک رہے تھے۔ وہاں دو درخشاں ستارے سب کو نیچا کئے دیتے تھے، ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ، جیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہوں

اور فضا کی ظلمت میں دوش بدوش چل رہے ہوں

کتنی دیر تک میں اُنہیں دیکھتا رہا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ یہ تمام منظر پردیپ کو دکھاؤں گا اور جب میں گھر پہنچا تو عجیب خبط مجھ پر سوار ہو گیا، میں ساری رات نہ سو سکا۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد اٹھتا اور باہر نکل کر دونوں تاروں کو دیکھتا کہ دونوں ساتھ ہی ہیں کہیں بچھڑ تو نہیں گئے۔ مگر وہ رات بھر ساتھ رہے۔ جب پچھلے پہر دھندلے ہوئے تب بھی اکٹھے، اور ساتھ ہی غائب ہو گئے۔ میرا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا، صبح صبح میں مسرت سے مغلوب ہو کر دیر تک خود رو پھول توڑتا رہا۔ اور چشموں میں نہاتا رہا۔

اگلی شام کو جب ہم سیر سے واپس آ رہے تھے تو میں نے بزرگوں کو باتوں میں لگا دیا اور ہم دونوں پیچھے رہ گئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم اُسی موڑ پر پہنچے۔ جہاں تنگ سی سڑک کے ایک طرف اونچا پہاڑ تھا اور ایک طرف وادی تھی۔ نیچے کہیں ہلکی ہلکی روشنی ٹمٹما جاتی اور پھر اندھیرا ہو جاتا۔ نیا نیا چاند آسمان میں تیر رہا تھا، کانپتا ہوا۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی، بالکل پھیکی سی۔

جہاں دوسرے تاروں کی چمک چاندنی میں ماند پڑ گئی تھی وہاں وہ دونوں تارے بالکل اُسی طرح چمک رہے تھے، بلکہ چاند سے بھی زیادہ روشن تھے

"وہ تارے دیکھ رہی ہو پردیپ؟" میں نے اشارہ کر کے کہا

وہ لمبی لمبی پلکیں اٹھائے انہیں دیکھنے لگی، میں اُسکے جگمگاتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ ساتھ ساتھ ہیں،" میں نے کہا ——

"اور رات بھر میں انہیں دیکھتا رہا، یہ یونہی اکٹھے سفر کرتے رہے اور غروب بھی اکٹھے ہی ہوئے۔ مجھے یہی ڈر رہا کہ کہیں بچھڑ نہ جائیں ـــ تھکی تھکی جائیں"

اور جب اُس نے بڑی بڑی کٹورے سی آنکھوں سے مجھے دیکھا تو میں بے چین ہو گیا، نہ جانے اُن نگاہوں میں کیا فسوں تھا، کیا پیغام تھا، وہ کیا کہنا چاہتی تھیں؟ مجھے وہ لمحے کس قدر خوشگوار معلوم ہوئے۔ اُس پٹھے دوپٹے کے حاشیے میں وہ گلابی چہرہ ایک خوابیدہ پھول لگ رہا تھا، جیسے ہوا کے جھونکوں نے ابھی ابھی جگایا ہو

میں نے سوچا زندگی کتنا حسین اور سہانا سپنا ہے۔ کس قدر طلاوز پر سپنا، جس میں تڑپ ہے، دھڑکنیں ہیں، نشے ہیں۔ آسمان پر دمکتے ہوئے تارے یونہی نہیں جھلملاتے، ان کے بھی اشارے ہیں، رمزیں ہیں۔ شبنم کلی سے چپکے چپکے کیا کہہ جاتی ہے؟ چاند سمندر کی لہروں سے رات بھر کیا باتیں کرتا رہتا ہے؟ کنول کے پھول ہوا سے کیا سرگوشیاں کرتے ہیں؟ یہ ایک راز ہے — بڑا پوشیدہ راز!

جب ہم واپس آ رہے تھے تو میں انہی تاروں کا ذکر کرتا رہا

میں نے کہا "کہتے ہیں کہ ان تاروں کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق ہے"

"پتہ نہیں" وہ سرد مہری سے بولی۔ "ہوتا ہوگا"،

وہ یک لخت گھبرا گئی جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ڈر جائے، اُس نے پھر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا راستے میں بہت تھوڑی باتیں ہوئیں۔ اب تک میں سوچ رہا ہوں کہ اُس فوری تبدیلی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

. . . .

. . . .

ہمیں پہنچے عرصہ ہو گیا تھا۔ پندرہ بیس میل دور نیچے کہیں ایک سینما تھا، پہلے ایک مرتبہ وہاں جا چکے تھے۔ طے ہوا کہ وہاں چلا جائے اور جیسی بھی پکچر ہو دیکھی جائے۔ بزرگ حضرات میں سے چند ایک نے اختلاف کیا لیکن بعد میں وہ بھی مان گئے۔ میں نے اپنا سیاہ سوٹ نکالا، بو لگائی، اچھی طرح سے بال جمائے۔ اور ہلکی ہلکی خوشگوار خوشبو لگا کر تیار ہو گیا۔ لمبی سی فیملی کار میں ہم سب بیٹھ گئے، میں آگے بیٹھا تھا اور پردیپ پچھلی سیٹ پر، جب

ہم ایک اندھیرے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ تو میں نے سامنے لگا ہوا فیشہ ترچھا کر دیا اب میں پروین کو دیکھ سکتا تھا اور وہ مجھے۔ مجھے پتہ نہیں کہ ہم کیسے کیسے نظاروں میں سے گزرے، کار میں کیا کیا لطیفے ہوئے، کیسی باتیں ہوتی رہیں، میں ٹکٹکی باندھے پروین کو دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے۔ لیکن ایک بات سے میں پریشان تھا، وہ دیکھتے دیکھتے نہ جانے کیوں چونک پڑتی اور جو نگاہیں نیچی کرتی تو میں تنگ ہی آجاتا۔ یہ معمہ بالکل سمجھ میں نہ آیا۔ ہم تھیٹر پہنچے، وہاں پکچر تھی۔ "سنو وائٹ اینڈ سیون ڈوارفس" رنگ برنگا کارٹون۔ سب کے سب مسکرانے لگے۔ اس میں سنو وائٹ ایک بڑی پیاری لڑکی تھی، اور سات چھوٹے مسخرے بونے تھے۔ پروین میرے ساتھ بیٹھی تھی، خوب مسکرا رہی تھی، یکایک مجھے کچھ سوجھی۔

میں نے آپا کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بولیں "چپ۔ !"

پھر امی کے کان میں کہا۔ وہ بولیں "ہشت — !"

آخر میں نے پروین سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔ میں نے پوچھا "کہہ دوں؟"

بولی "کہہ دیجئے!"

میں نے زور سے کہا "ایک سنو وائٹ ہمارے ساتھ بھی ہے۔"

سب پوچھنے لگے "کون؟"

میں نے پروین کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایک قہقہہ پڑا۔ اور وہ بیچاری شرما گئی۔

آپا بولیں "کس طرح بھلا؟"

میں نے آہستہ سے کہا "بالکل ویسی ہی گلابی اور خوبصورت سی لڑکی ہے، بھولی بھالی — اور — !" آپا نے مجھے بری طرح گھورا۔

میں نے پروین کے کان میں چپکے سے کہا "آج سے تم سنو وائٹ ہو، اور یہ حامد میاں، نصرت اور ننھی وغیرہ تمہارے سیون ڈوارفس ہیں۔" وہ کتنی مسرور تھی۔ کس قدر خوش تھی،

جب ہم واپس آنے لگے تو یکایک پروین سکے آگے بیٹھ گئی اور مجھے پیچھے بیٹھنے کا موقع مل گیا۔

پروین کے ساتھ ایک ننھی منی بچی بیٹھی تھی، جس کا نام بہت پیارا سا تھا — نصرت جہاں، اس کے ریشم سے بالوں میں بڑی اچھی خوشبو لگی ہوئی تھی، اور ایک نیلا سا ربن لہرا رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان بیٹھی گڑیا تھی۔

بڑی اچھی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ دریا چاندنی کی چادر پہ ایک نور کا دریا موجیں مار رہا تھا۔ ہوا کے معطر اور خنک جھونکوں سے پروین کے بال پریشان ہو رہے تھے، اس کی لٹیں رہ رہ کر میرے چہرے کو چھو جاتیں اور میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے بال سنوار دوں نصرت ٹکٹکی باندھے پروین کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو نصرت؟" میں نے اس کے کان میں پوچھا

"دیکھ رہی ہوں کہ آپا کتنی پیاری ہیں" وہ بولی۔ اور میں نے اس کے ننھے ننھے ہونٹ چوم لئے

جیسے میری نگاہوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ بھاگتی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں میں وہی دو چھپے تارے جھانک رہے تھے جن سے چاندنی چھلکی ہوئی تھی۔ لیکن وہ دونوں اسی طرح دمک رہے تھے۔

"پروین! — وہ دیکھو دو تارے!"

وہ جیسے سرگوشی میں بولی "ہاں! دیکھ رہی ہوں"

"وہ بائیں طرف کا تارا تمہارا ہے، اور دائیں طرف میرا" میں نے کہا۔ وہ میری بائیں طرف بیٹھی تھی

"ہاں!" وہ چپکے سے بولی۔

میں پروین کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا تم میری روح کی محبوب ہو، میری عزیز ترین شے، تم نے میرے تخیل، میری دنیا کو جیتا کیا ہوا ہے۔ تم ہی سے تو میری خیالی جنت آباد ہے، تم ہی تو میری تیرہ و تاریک زندگی میں ایک روشن ستارہ ہو۔

پتلے پتلے رسیلے ہونٹ، پنکھڑیاں جیسے، بڑی بڑی پرفسوں آنکھیں جن کی گہرائیوں میں میرے تصور کی دنیائیں آباد ہیں۔ جو کسی اتھاہ سمندر میں جل پریاں ناچتی ہیں۔ گلاب کی کلیوں جیسی ملائم پلکیں عجیب طرح سے سنواری ہوئی تھیں — جیسے پریشان بھی ہوں اور بنائی بھی گئی ہوں۔

تب مجھے خیال آیا کہ خدایا میں کس قدر مسرور ہوں، میرا دل کہیں دھڑکتا دھڑکتا ٹھہر نہ جائے۔ اتنی مسرت میرے دل میں کیونکر سما سکے گی؟ میں یہ طوفان کس طرح برداشت کر سکوں گا؟

مجھے پتہ نہیں رہا کہ یہ دلفریب لمحات کیونکر ختم ہو گئے۔ ہم گھر پہنچ گئے۔ پہلے ہماری کوٹھی تھی۔ سب کے سب وہیں ٹھہر گئے میں نے تہیہ کر لیا کہ ضرور آج پروین کو بتا دوں گا کہ مجھے اُس سے کس قدر محبت ہے

میں نے اُسے ساتھ لیا اور ہم دونوں اُن کی کوٹھی کی طرف چل دیئے۔ وہ ایک بڑی حسین چاندنی رات تھی۔ نہایت دلفریب سہانی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اُس سادے لباس میں وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی۔ کہ مجھ سے اچھی طرح دیکھا نہ جاتا تھا۔ ہم دونوں باغیچے میں سے گزرتے ہوئے گلاب کے تختوں میں سے گزرے، جہاں پھول، کلیاں، پتے سب سوئے پڑے تھے، پھر لمبے لمبے سایوں اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں میں سے گزرے ہمیں ننھی ننھی کلیوں نے چھپ چھپ کر دیکھا اُن کلیوں نے جنہیں ہوا کے جھونکوں نے جگا دیا تھا۔

تاروں کے جھرمٹ نے ہمیں اکٹھے چلتے دیکھا، چاند ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگا اور چاندنی کتنی گنا تیز ہو گئی

میں نے سوچا کہ اب پروین سے کہہ دوں۔ میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر رہا تھا۔

"ایک بات ہے پروین؟"

"کیا؟"

"وہ یہ ہے کہ میں ایک عرصے سے چاہتا تھا کہ کہہ دوں!"

"کہہ دیجیے۔"

"اور پھر کہنا ہوتا بھی اچھا ہے، بھلا چھپانے سے کیا فائدہ بات دراصل یہ ہے — کہ وہ — !"

"ہاں ہاں کہیے —" اور وہ مسکرانے لگی۔ میں گھبرا گیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں مدت سے کہنا چاہتا ہوں کہ — ؟"

"اب کہیے بھی!"

"یہی کہ —— یہی کہ یہ تارے بہت چمکتے ہیں، اور یہ تارے بھی خدا نے خوب بنائے ہیں، اگر یہ نہ ہوں۔ تو رات کو بڑا اندھیرا رہا کرے۔"

اب اُن کی کوٹھی بالکل نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے پھر ہمت کی — ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ جو کچھ کہنا ہے اب بھی کہہ دو کیا بزدلی دکھا رہے ہو۔ میں نے گلا صاف کیا اور بولا۔

"نہیں تاروں کی بات نہیں ہے بات اور کچھ ہے، مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم بُرا نہ مان جاؤ۔ لیکن اب کوئی ڈر نہیں، اگر تمہیں بُرا لگتا ہے تو لگا کرے، میں ضرور کہوں گا — !"

"ہاں ہاں کہتے چلیے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"یہی کہ مجھے اتنے دنوں سے تم سے — یعنی مجھے سچ سچ تم سے — یعنی — !"

"ہاں ہاں!"

"مجھے تم سے — ایک شکایت ہے، یہی کہ تم اتنے سادے لباس کیوں پہنتی ہو جبکہ تمہارے پاس ایسے اچھے اچھے لباس ہیں"

وہ ہنس دی۔ اب ہم برآمدے میں پہنچ گئے تھے مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہرگز اُسے نہیں بتا سکتا۔ میں ایک بزدل اور بے وقوف لڑکا ہوں۔

ہم قدِ آدم آئینے کے سامنے سے گزرے۔ میں رک گیا، اُسے بھی ٹھہرا لیا۔ ہم دونوں آئینے کے سامنے کھڑے تھے۔ پیچھے

کے ساتھ کھڑے ہو کر میں عجیب سی شان محسوس کر رہا تھا۔ یہ کتنی پیاری لڑکی ہے، میں بھی اتنا برا نہیں، خاصا ہوں۔ بہت سوں سے اچھا ہی ہوں گا۔

کیا تو وہ لڑکی مسکرا رہی تھی اور کیا یک لخت بے چین سی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ خدایا یہ کیا اسرار ہے؟ اس رویے میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ — جسے میں سمجھ نہیں سکتا۔ آخر یہ لڑکی کیا ظاہر کرتی ہے؟ یہ میرے ساتھ دفعتاً رنجیدہ کیوں ہو جاتی ہے؟ کس قدر پیچیدہ ہے یہ معمہ؟

یہ کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوا، ہر دفعہ یہی ہو رہا ہے، مسکراتے ہوئے چہرے پر یک لخت خوف کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ کہیں اسے مجھ سے نفرت تو نہیں؟ نہیں نہیں نفرت نہیں ہو سکتی، بھلا مجھ میں نفرت والی بات ہی کون سی ہے، اگر ہوتی تو یہ بتا دیتی، مگر بتاتی کس طرح؟ کیونکر کہہ دے کہ مجھے آپ اچھے نہیں لگتے یا مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنے دنوں سے ہم دونوں اکٹھے سیر کرتے ہیں، کھیلتے ہیں، گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ویسے یہ کبھی ایسی علامت ظاہر نہیں کرتی اور جب اس سے محبت کا اظہار کرنے لگوں۔ تو فوراً گھبرا جاتی ہے۔ اور گھبراتی بھی ہے کس قدر؟ یا یہ ہو گا کہ یہ مجھے صرف ایک رفیق سمجھتی ہے، ایک مخلص رفیق —— بس اس سے زیادہ کچھ نہیں، اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتی۔ میں ساری رات یہی سوچتا رہا۔ کئی بار اٹھ اٹھ کر میں نے تاروں کو دیکھا کہ کہیں بچھڑ تو نہیں گئے۔ مگر وہ بدستور اکٹھے مسکراتے ہوئے جا رہے تھے۔ میرے دل کو ڈھارس سی بندھ گئی۔

* * * * * *

* * * * *

دوسرے روز میں نے دیکھا کہ سامنے کی کوٹھی میں کچھ مزدور کام کر رہے ہیں۔ چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو ٹینس کا لان ٹھیک کیا جا رہا تھا، لائنیں لگائی جا رہی تھیں، میری سال بھر کی پڑی ہوئی ٹینس کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جی میں آئی کہ ان لوگوں سے واقفیت پیدا کی جائے۔ ہماری اور ان کی کوٹھی کے درمیان ایک چھوٹا سا نالہ بہتا تھا جس میں میں روز نہایا کرتا تھا۔ اُس کا پل آدھ میل پرے تھا۔ نوکروں نے بتایا کہ سامنے کوئی انگریز کرنل رہتے ہیں۔ اُن کی ایک لڑکی ہر روز تیرنے آیا کرتی ہے۔ مجھے یاد آ گیا۔ ایک انگریز لڑکی کو میں ہر روز نالے کے دوسرے کنارے پر تیرتے دیکھتا تھا۔ لیکن کبھی باتیں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

چند دنوں میں ہماری واقفیت ہو گئی، اُس نے میرے تیرنے کی تعریف کی اور میں نے بھی یونہی الٹی سیدھی ہانک دی۔ ہم صبح اکٹھے تیرتے۔ لطیفے سناتے۔

وہ میری بڑی تعریفیں کیا کرتی۔ آپ بہت اچھا تیرتے ہیں آپ کا قد کتنا اچھا ہے، جسم کتنا خوبصورت ہے بالکل ہیرو جیسا، کبھی ہمارے ہاں بھی آئیے، امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی، میں عموماً اُن سے آپ کا ذکر کیا کرتی ہوں۔ ہم لوگ تنہائی سے تنگ آ جاتے ہیں، ابا باہر گئے ہوئے ہیں، امی کسی سہیلی سے ملنے تین چار میل دور چلی جاتی ہیں، میں اکیلی گھبراتی ہوں۔ ہمارے ہاں پنگ پانگ بھی ہے اور ٹینس بھی۔ میں مووی کیمرے سے تصویریں اتارا کرتی ہوں۔ ہمارے ہاں رنگ برنگے خوبصورت پرندوں کے پنجرے بھرے ہوئے ہیں۔

ایک دن پروگرام بنا کہ دوپہر کو میرے تیرنے کی فلم اتاری جائے، وہ اپنا مووی کیمرہ ساتھ لے آئی۔ میں نے ایک اونچے پتھر سے چھلانگ لگائی۔ اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔

"مجھے آپ اُس پتھر پر سے بلائیے —!" وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولی جو نالے کے درمیان میں تھا۔

اُس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ میں جھک کر پیچھے

چلا گیا۔ لیکن پھر رکتا ہوا آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لطیف بوجھ کو سنبھال لیا۔ اُس نے ایک بازو میری گردن میں ڈال دیا اور دوسرے سے پانی کے چھینٹے اُڑانے لگی۔

"ارے! یہ تو بہت اچھا نہیں — وہ ٹھیک رہے گا" اُس نے ایک دور کے پتھر کی طرف اشارہ کیا

"وہاں روشنی بھی نہیں پڑ رہی اور وہاں سے تصویر بھی بہت اچھی آسکے گی"

میں نے رخ بدل دیا۔ ادھر ادھر چلنے لگا۔ آہستہ آہستہ اُس کا دوسرا بازو بھی میری گردن میں حمائل ہو گیا۔ اُس کا تمتماتا ہوا چہرہ میرے بالکل نزدیک آ گیا۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں بولی

"آپ کے بازو کتنے مضبوط ہیں، سینہ کتنا چوڑا ہے، آپ ایک مکمل جسم کے مالک ہیں، بعض اوقات تو میں آپ کی حسین شخصیت سے اس قدر مرعوب ہو جاتی ہوں کہ بس!" میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی۔

"مجھے ایسے لڑکے بہت اچھے لگتے ہیں، آپ جیسے بے پرواہ اور خوش باش لیکن اتنا بے پرواہ بھی نہیں ہونا چاہیے"۔ وہ کھوئی سی گئی۔ اُس کی گردن ڈھلک گئی، آنکھیں مندنے لگیں، اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں تیزی سے پتھر تک پہنچا اور جلدی سے اُسے اتار دیا۔ وہ کچھ کھسیانی ہو گئی۔ لیکن جلد ہی سنبھل گئی اور مسکرانے لگی۔ اس کے بعد دیر تک وہ میری فلم اتارتی رہی۔

* * * * * * * * *

* * * * * * * * *

گھر میں پروین اور میرے متعلق دبی دبی زبان سے سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ ویسے امی کو پروین بہت اچھی لگتی تھی، ابا کا پتہ نہیں، شاید وہ بھی ناپسند نہیں کرتے تھے۔ پروین کے والدین کا رجحان میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرا زیادہ وقت اُن کے ہاں ہی گزرتا۔ لیکن اس وسوسے سے جیسے میری امنگوں پر اوس پڑ گئی۔ ہر وقت یہی وہم رہنے لگا کہ اگر پروین کو مجھ سے نفرت ہوئی تو۔

ایک صبح کو میں سیر کر کے واپس آ رہا تھا۔ باغ میں سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ پروین اور میری چھوٹی بہن نزہت بیٹھی تھیں۔ پروین پھولوں کا گلدستہ بنا رہی تھی اور ننھی ساتھ بیٹھی تھی۔ جی میں آیا ان کی باتیں سنیں آخر کیا باتیں ہو رہی ہوں گی؟ میں دبے پاؤں بیلوں میں چھپ چھپا کر بالکل اُن کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔

ننھی بولی "تو اب آپ ہمارے ساتھ ہی رہا کریں گی نا؟"

"تمہارے ساتھ ہی تو رہتی ہوں"

"نہیں یوں نہیں — اب ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا کریں گی؟"

"ہمیشہ ہی تو رہتی ہوں تمہارے ساتھ — ننھی گڑیا۔"

"اوں! — میں پوچھتی ہوں آپ ہمارے ساتھ رہیں گی — ہماری آپا بن کر؟"

پروین کا دمکتا ہوا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"بتاؤ نا آپا" ننھی مچلنے لگی۔

"دیکھو نزہت کیسی رنگ برنگی کلیاں ہیں" پروین بولی۔

"نہیں ہمیں کلیاں نہیں چاہئیں، آپ بتائیے کہ چلیں گی ہمارے ساتھ یا نہیں؟"

"ارے نزہت! وہ دیکھو کیسی اچھی تتلی اڑی جا رہی ہے، پکڑ لو تو جانیں"

اور جب ننھی بیٹھی رہی تو پروین خود تتلی کے پیچھے بھاگ پڑی۔

سارے دن یہی سوچتا رہا کہ آخر پروین کو مجھ سے نفرت کیوں ہے۔

شام کو سیر سے واپس آتے ہوئے مجھے موقع مل گیا۔ اور میں نے پروین کو اپنے ساتھ ٹھہرا لیا۔ "آؤ جھیل تک چلیں!" میں نے کہا۔

"دیر تو نہیں ہو جائے گی؟"

"نہیں!"

ہم دونوں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر کتنا ترس آ رہا تھا۔ مجھے اس کا کتنا خیال ہے۔ اور یہ مجھے [illegible]

دور سامنے ادھر پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا، پہاڑ کی چوٹی پر چیڑ کے درختوں کی قطاریں چمک رہی تھی۔ جیسے سنہری بنات تنی ہوئی ہو۔ آسمان شفق کی سُرخی سے جگمگا رہا تھا۔ درختوں پہ پرندوں کے غول کے غول اُڑے جا رہے تھے۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔ معطر ہواؤں کے جھونکے تیز ہونے لگے اور ہم اُس موڑ تک پہنچ گئے، میری نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھ گئیں، دو نوں تارے ابھی ابھی طلوع ہوئے تھے۔ میرا دل مسرت سے اچھلنے لگا۔ میں نے پروین کو دیکھا، اور شاید نگاہوں میں اتنا کچھ کہہ گیا۔ کہ زبانی نہ کہہ سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ آج اس سے ساری بات پوچھو نگا آج اس معمے کو حل کرکے جاؤنگا،

"تمہیں یہ تارے اچھے لگتے ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! بہت!!" وہ بولی۔

"ارے!" مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ "تارا ٹوٹا پروین!"

اُن میں سے ایک تارا ٹوٹا اور ایک نورانی لکیر بناتا ہوا غائب ہوگیا میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی سہم گئی تھی۔

"کون سا تارا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کون سا تھا"

میں نے بہتیرا یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر پتہ نہ چلا کہ کون سا تارا ٹوٹا تھا۔ دہنا یا بایاں!

چیڑ کے درختوں کی نوکدار چوٹیوں پر صرف ایک روشن تارہ جگمگا رہا تھا، مجھے یوں لگا۔ جیسے اُس کی چمک بھی مدھم پڑتی جا رہی ہو۔

جب ہم واپس آ رہے تھے۔ تو جنگل میں سناٹا تھا۔

ایک دو روز تو میں کھویا کھویا رہا پھر سنبھل گیا لیکن جب سوچنے بیٹھتا تو گھنٹوں سوچتا رہتا، پروین کی بے رُخی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، میری باتوں کا جواب سرد مہری سے دیتی، میرے ساتھ اداس ہو جاتی،

آخر وہی ہوا جو میرا دل مجھے کہا کرتا تھا، جس خیال سے میں پریشان ہو جاتا تھا، وہ جنگل سا اندیشہ جسے میں پیچھے لگتا ناز کر دیا جاتا آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور اتنا بھیانک ہوگیا کہ اس نے مجھے ڈرا دیا۔

پروین کو مجھ سے نفرت تھی، شروع سے ہی نفرت تھی اور میں ہمیشہ اُسے غلط سمجھتا رہا۔

نفرت — اُکس قدر مکروہ لفظ ہے، اور محبت کے بعد تو اور بھی! پھر تو زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے ظلمت کی جھلکیاں دیکھیں، وہ بڑھتا ہوا اندھیرا مجھ پر محیط ہو گیا۔ میں نے زندگی کی اُداس و تنہا پگڈنڈی کو دیکھا۔

اونچے اونچے ڈراؤنے درختوں سے گھری ہوئی جھیلوں کی سطح پر میں نے اداسی دیکھی، درختوں کے کانپتے ہوئے سائے دیکھے پتوں کی سرسراہٹ میں سرد آہیں سنیں۔ میں نے سوچا کہ پانی کی یہ سطح میری روح کی طرح ہے جس پر تاریکیاں منعکس ہیں۔ جس پر دہشتناک تاریکی قبضہ جماتی جا رہی ہے۔ میں نے تیرتی ہوئی ٹہنیاں دیکھیں، بڑے بڑے اداس پھول دیکھے جو ڈنٹھلوں پر جھکے ہوئے تھے

تب مجھے پتہ چلا کہ دنیا کتنی غمگین جگہ ہے، یہاں مسرت کی اتنی سی رمق بھی تو نہیں، آہیں ہیں، سسکیاں ہیں، رنج ہیں، پھیکے پھیکے خوابوں میں وحشت ہے، بھیانک سی ویرانی ہے۔ میں چڑچڑا ہو گیا، سارا دن کمرے میں گزارنے لگا، ایک ایک کرکے تمام مشغلے ختم ہو گئے۔ رات کو جب کھڑکی میں بیٹھتا تو مجھے دو روشنیاں نظر آتیں ایک تو وہی تنہا تارا اور دوسری روشنی اُسی لڑکی لوسی کی کوٹھی میں نظر آتی۔ میں سوچنے لگتا کہ لوسی کی کوٹھی کی روشنی اُس تارے کے مقابلے میں کتنی پھیکی اور مدھم ہے۔

· · · · · ·

میں کھڑکی میں بیٹھا ایک سینری بنا رہا تھا، طرح طرح کے رنگ سامنے رکھے۔ منہمک بیٹھا تھا، دفعتاً سے دروازہ کھلا اور

جان خدا سے دوڑتا ہوا آیا۔ پیچھے پیچھے اور بچے تھے۔ ہاتھ میں کرکٹ کا بلا اور گیند تھی۔

"آ ہا! بھیا تصویر بنا رہے ہیں، کیسی رنگ برنگی تصویر ہے، یہ کہاں کی ہے بھیا؟"

"کہیں کی بھی ہو — تم جا کر کھیلو — !"

"ہم تو یہ تصویر لیں گے، ابھی نہیں — جب یہ بن جائیگی تب — دو گے نا بھیا؟"

"دیکھو بھئی تم لوگ دوڑ جاؤ — ورنہ پٹ جاؤ گے"

"اچھا! آپ یہ تصویر ہمیں دے دیجئے نا؟"

"نہیں! ہرگز نہیں!" میں نے غصے سے کہا۔

"اچھا تو ہمارے ساتھ کرکٹ ہی کھیل لیجئے، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ بولنگ سکھائیں گے"

"اس وقت نہیں! پھر کبھی سہی!!"

"آج تو ہم آپ کو ضرور لے کر جائیں گے"

"میں آج ہرگز نہیں کھیلونگا — !"

"اچھا اگر نہیں کھیلتے تو یہ تصویر ہی — !"

"شیطانو" میں چلا کر بولا "تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے، میں تمہارا ڈرل ماسٹر ہوں، یا لنگوٹیا دوست — یہ لو یہ رہی تصویر — !"

میں نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

دیر تک بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا، پھر کوٹ اٹھایا اور باہر نکلا۔ نوکر کو آواز دی کہ موٹر سائیکل لے آئے۔ دو نوکر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک ہنسا اور دوسرے کے کان میں کچھ کہا۔ اُس نے بھی دانت نکال دیئے۔

میں تلملا اٹھا "کیا ہے؟"

"کچھ نہیں حضور!"

"تم اس سے کیا کہہ رہے تھے؟" میں کڑک کر بولا،

"کچھ بھی نہیں حضور!"

"کم بختو! تمہیں بھی ہنسی سوجھتی ہے، صاف صاف بتاؤ کیا بات تھی — ورنہ — !"

"حضور! میں کہہ رہا تھا کہ موٹر سائیکل تو پچھلے ہفتے آپ نے ہی مرمت کے لئے بھیجا تھا"

میں لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں آ گیا، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟

میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا، نہ جانے کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا۔ مجھے نزہت کی میٹھی آواز نے چونکا دیا۔ اُس کا ننھا منا ہاتھ میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔

"بھیا!"

میں پاگلوں کی طرح اُسے دیکھنے لگا۔ "ایں؟"

"بھیا کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں!"

"آیئے! آپا پروین کے ہاں چلیں!"

کسی نے دہکتی ہوئی سلاخیں میرے کانوں میں ٹھونس دیں!

"نہیں! وہاں نہیں جائیں گے"

"تو پھر مجھے اپنے ساتھ سیر کو لے چلئے"

"نہیں! کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ۔ مجھے کام ہے — !"

"کہیں بھی نہیں کام آپ کو، آپ یونہی رات تک یہاں ہی بیٹھے رہیں گے — !"

"بھئی جاؤ! کہا مانا کرتے ہیں بڑوں کا — !"

"نہیں بھیا! ہم تو سیر کو چلیں گے اور وہاں سے آپا پروین کے ہاں!" وہ مچل گئی۔

میں نے اُسے جھڑک کر کہا "نزہت شور نہ کرو"

وہ چُپ ہو گئی، اُس نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا، بڑی بڑی معصوم آنکھیں دھندلی ہو گئیں اور دو موٹے موٹے آنسو اُسکے رخسار پر بہنے لگے۔ وہ چپکے سے باہر جانے لگی، میں نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا اور گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا

کتنی مرتبہ امی نے بھی ٹوکا کہ یہ کیا سارا دن کمرے میں بند رہتے ہو، کیا تو صبح سے شام تک لوگوں کو ہنساتے پھرتے تھے اور کیا اب ہر وقت کا بسورنا رہ گیا ہے۔

پروین کے ہاں سے ہر تیسرے روز شکایت آتی کہ میں وہاں نہیں جاتا۔ ایک روز ابا بولے شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، سامنے کے پہاڑ پر ایک ڈاکٹر رہتے ہیں۔ اُنہیں دکھا آئیں گے، اور میں سامنے پہاڑ کو دیکھتا رہا۔ لُوسی اپنے باغیچے میں پھر رہی تھی، سبز رنگ کا گاؤن پہنے، کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا دل میں آیا۔ جھٹ سے شوخ رنگ کی سبز جرسی پہنی، بال سنوارے اور سیدھا چل دیا پُل کی طرف۔ لوسی کی کوٹھی اور ہمارے درمیان جو نالہ تھا اُس کا پل۔ پہلے پہلے میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ لیکن پھر سنبھل گئے،

میں نے جلدی سے پل عبور کیا، لُوسی نے مجھے دیکھا دوڑی دوڑی آئی۔ اُس کا دمکتا ہوا چہرہ اور بھی دمکنے لگا۔ میری شوخ جرسی کو دیکھا اور بڑی تعریف کی۔ پھر میرے بازوؤں کو دیکھتی رہی، اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیر تک لیے رکھا۔ اُس کی امی کہیں باہر تھیں۔ اُس نے مجھے کوٹھی کا کونہ کونہ دکھایا، پرندے دکھائے۔ پھر صوفے پر بیٹھ کر اپنا البم دکھانے لگی۔ وہ میرا سہارا لیے صوفے کے بازو پر بیٹھی تھی، اُس کی معطر زلفیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں ہم خوب قہقہے لگاتے رہے۔

جب میں لوٹا تو مسرور تھا، مطمئن تھا، سیٹی بجاتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے وہ پل اچھلتے کودتے ہوئے عبور کیا۔

اس کے بعد ہم اکٹھے پھرتے، تصویریں اتارتے، میرا زیادہ وقت اُن کے ہاں گزرنے لگا۔ پروین جیسے غائب ہی ہو گئی کیا ہوا جو کبھی تیسرے چوتھے روز آمنا سامنا ہو گیا، رسمی سا سلام ہوا اور بس!

اب میں پھر ہنس مکھ ہو گیا تھا، چڑ چڑا پن جاتا رہا تھا۔

ایک دن میں اور لوسی دونوں سیر سے واپس آ رہے تھے اچھا خاصا اندھیرا ہو چلا تھا، ہم اُسی موڑ پر پہنچے، میری نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ چیڑ کے درختوں پر ایک تنہا تارہ چمک رہا تھا،

ہم دونوں اُسی پتھر پر بیٹھ گئے۔ جہاں کبھی میں اور پروین بیٹھتے تھے۔ اُن لمحات میں میں نے اپنے آپ کو کس قدر تنہا محسوس کیا، وہ کون سی سلگتی ہوئی آگ کی چنگاریاں تھیں۔ جو بھڑک اٹھیں۔ میرا جی بھر آیا، لوسی شاید کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ سن سکا، کچھ عجیب سی اداسی میری روح میں اتر گئی۔ میں اُس تنہا تارے کو دیکھتا رہا جو شاید اپنے رفیق کی یاد میں اداس تھا۔ تب میں نے لوسی سے کس قدر بے رُخی برتی۔ وہ حیران رہ گئی۔

* * * * *

* * * * *

بعض اوقات میں زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرنے لگتا ان قہقہوں میں بھی کوئی چیز دل میں چٹکیاں لیتی، اور میں ایک عمیق اور بھیانک غار میں گرتا چلا جاتا پتہ نہیں یہ کیا تھا، اپنی شکست کا احساس تھا، یا دل کی ویرانی کا اعتراف، لیکن میں تنہا رہتا تھا،

رات کو سوتے سوتے چونک پڑتا اور باہر نکل آتا، صبح تک کسی پتھر پر بیٹھا یونہی دیکھتا رہتا — چپ چاپ کھڑے ہوئے چیڑ کے درختوں کو، پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں کو ستاروں کے جھرمٹ کو۔ آخر میں ایک تنہا چمکدار تارے پر نظریں جم جاتیں،

دن گزرنے گئے، اور آخر وہ دن آ گیا جب مجھے واپس جانا تھا، ابا کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں، میرا کالج بھی کھلنے والا تھا، ہم سب واپس جا رہے تھے میرا جی تو نہ چاہتا تھا کہ پروین سے ملے بغیر چلا جاؤں، لیکن امی کی خشمناک نگاہوں نے مجبور کر دیا پروین سے ملا جس کی امی

چنے اداس اداس ملے، نہ انہوں نے خود خط لکھنے کا کہا اور نہ مجھے خط لکھنے کی تاکید کی۔ پروین کی آنا اپنے وطن جا رہی تھی، سٹیشن تک اُس کا آدھا سامان جا چکا تھا۔ پہلی کار میں سب جا چکے تھے۔ دوسری میں سامان تھا اور ہمیں او رہا تا ۔

میں سب سے آخر میں پروین سے ملنے اُس کے کمرے میں دبے پاؤں ڈرتے ڈرتے گیا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے مجھے وہاں جانے کا کوئی حق نہ تھا۔ پہلی مرتبہ میں نے اُن کٹورے سی آنکھوں کو جھلملاتے دیکھا۔ اُن میں لرزتے ہوئے آنسو دیکھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"خدا حافظ پروین!" میں جھجکتے سے بولا۔

"خدا حافظ!" اُس نے بڑی سرد مہری سے کہا، اور کھڑکی سے سفید برفانی چوٹیوں کو دیکھنے لگی۔ میں جھجکا اور ٹھہرا، کہ شاید پروین کچھ کہہ دے، لیکن وہ چپ رہی۔ میں واپس چلا آیا۔ ذرا سی دیر میں ہم واپس جا رہے تھے، کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ میں ایک بستر پر آنکھیں میچے سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے چیڑ کے درخت، اودی اودی پہاڑیاں، رنگ برنگے گنج، جھل جھل جھلمل کرتی ندیاں —— سب اڑے جا رہے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ دن یونہی حماقتوں میں گزر گئے۔ اگر یہ یوں نہ ہوتا تو آج میں کتنا مسرور ہوتا۔ مجھے پروین سے کس قدر محبت ہے۔ وہ پگلی سی چپ چپ رہنے والی مجھے کتنی پیاری لگتی تھی۔ کیسے کیسے خواب میں دیکھتا رہا، سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی۔ لیکن وہ خواب کتنے غلط نکلے، اور اُسے میرا ذرا سا بھی خیال نہ ہوا۔ اور جو وہ لوسی تھی وہ ایسی بے وقوف سی لڑکی تھی۔ ذرا سی ٹینس اچھی کھیل لی، سینہ پھلا کر چلا لگا دو میں وہیں خوش ہو جائے گی۔ صبح سے شام تک تعریفیں ہی تعریفیں کیا کرتی۔ لیکن تھی بس یونہی۔

نہ جانے یکایک مجھے کیا خیال آیا، میں نے آنا سے کہا "آنا ایک بات بتاؤ گی مجھے؟"

"کیا ہے؟"

"آنا تم بہت اچھی ہو، پروین کی آنا ہو نا؟ —— مجھے ایک بات تو بتاؤ —— آں ہاں انکار نہ کر دینا کہیں —— اب تم چلی جاؤ گی پھر نہ جانے کب تمہاری زیارت ہو۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو تم؟" وہ خفگی سے بولی۔

"یہی کہ میں کیسا ہوں؟ —— میرا مطلب ہے دیکھنے میں ——!"

"اچھے بھلے ہو!"

"تو پھر پروین کو مجھ سے نفرت کیوں تھی؟ میں یعنی اُسے برا کیوں لگتا تھا؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ——!"

"تمہیں سب پتہ ہے، خدا کے لئے مجھے فقط یہ بتا دو کہ اس نفرت کی وجہ کیا تھی، اتنی کوششوں کے باوجود بھی اُس کے پتھر جیسے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہی۔ آخر کیوں؟"

میں منتیں کرنے لگا۔

"سننا ہی چاہتے ہو تو سُن لو، تم اسے محبت کہتے ہو، یہ خود غرضی ہے یا محبت۔ تم جیسا خود غرض تو کہیں نہ ہو گا، تمہیں کبھی اُس کا خیال نہ تھا۔"

"نہیں نہیں —— یہ نہ کہو ——!"

"کیوں نہ کہوں؟ تم ذرا سی دلچسپی جتا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ تمہیں پوجنے لگے۔ تم نے اُسے دیا کیا تھا جو بدلے میں اتنا کچھ مانگتے تھے۔ کبھی اپنے رویے پر بھی غور کیا، لاپرواہ اور خود سر لڑکے، تم نے اُسے کس قدر ستایا ہے؟ تم نے اُسے کتنے رنج پہنچائے ہیں۔ تم نے اُس کا دل توڑ دیا۔ میری بچی کا دُکھوں کا مارا دل ——!"

میں پاگلوں کی طرح اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"آج سے دو سال پہلے ایسے ہی دن تھے، ہم گرمیوں میں یہاں

آنسو بہتے تھے۔ یہ وہ یہاں مینا کی طرح چہکتی تھی۔ کتنی چنچل تھی کتنی ہنس مکھ، سب اُس کی شوخیوں سے پناہ مانگتے تھے، اُس کا منگیتر بھی یہیں تھا — !"

"منگیتر — !"

"ہاں بیگم کا بھتیجا تھا یا بھانجا، عجیب سا لڑکا تھا، باتونی ایسا تھا کہ صبح سے شام تک بولتا رہتا۔ بچپن سے رشتہ طے ہوا تھا جب میں نے ہوش سنبھال کر [illegible] انہیں دیکھا تھا، اپنی چہکاتی ہوئے [illegible] پر ہم سب پیار کرتے تھے — !"

"وہ لڑکا کیسا تھا؟ میرا مطلب ہے شکل صورت میں — ؟"

میں نے بےچین ہوکر پوچھا۔

"یونہی معمولی سا تھا، سانولا سا، قد میں [illegible] برابر بھی نہ تھا۔ لیکن اُس کا منگیتر تھا، وہ بیچاری بڑی خوش تھی، کتنی بھولی سی تو ہے، پھر اُس کی زندگی میں برا منحوس دن طلوع ہوا اور وہ لڑکا کہیں چلا گیا، اور پھر کبھی نہ لوٹا۔ خبر آئی کہ اُس نے کسی اور لڑکی سے شادی کرلی۔ اُس کی [illegible] پردیس کے [illegible] جانا [illegible] تھی پہلے ہی کا اُسے کوئی خیال نہ تھا۔ — وہ دن اور آج کا دن میں نے اس لڑکی کو کبھی خوش نہیں دیکھا، سدا غمگین رہتی ہے، مسکراتی ہے تو ٹھنڈا سانس بھر کر، اس کی ہنسی میں آنسو چھپے ہیں۔ ایک شوخ لڑکی کی جگہ اب سنجیدہ افسردہ پیکر رہ گئی ہے۔ اس کے نازک دل کو اس صدمے سے ایسی ٹھیس پہنچی کہ وہ کبھی نہ سنبھل سکی ——

اس کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا۔ کہ سب کے سب اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور سب اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ایک ایک کرکے سب۔ اور وہ اکیلی رہ جائے گی۔ اور یہ تمہیں کتنا اچھا کہتی تھی یہ اس کا اندازہ شاید تم نہ کرسکو۔ وہ ہمیشہ مجھ سے تمہاری باتیں کرتی تمہاری خوبیاں، تمہارا خلوص، — ! جب وہ تمہیں دیکھ نہ پاتی۔ اُسے چین نہ آتا۔ تمہاری تصویر اُس کے لاکٹ میں ہے۔ جسے وہ ہردم گلے میں پہنے رہتی ہے۔ اُسے یہی اندیشہ تھا کہ کہیں تم بھی اُسے نہ چھوڑ کر چلے جاؤ، چنانچہ تم نے بھی کیا، تم نے اس کے رہے سہے سہارے کو بھی چھین لیا — وہ بے چاری ہمیشہ [illegible] تمہاری باتوں پر اعتبار تھا لیکن وہ سمجھتی تھی — اور تم ایسے خود غرض نکلے کہ تم نے اُس کی ذرا پرواہ نہ کی۔ اور آخری دنوں میں جب تم نے اُس سے بات چیت چھوڑ دی تو وہ بہت [illegible] اداسی کی کرتی — !"

اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ میں کھوئی کھوئی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ [illegible] رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر میں اس طرح بیٹھا رہا۔ کیا کیا قیامتیں مجھ پر گزر گئیں، کیسے کیسے [illegible]، میرے دل کی دنیا بکھر کر ان جنتوں میں سے گئی۔ وہ کیسی غضب کی ایک گھڑی تھی جس نے مجھے جھلس دیا، ایک تاریکی چھا گئی — وحشت کی تاریکیاں — جن نے سب کچھ ڈھانپ لیا۔

جب میں [illegible] تھا، فضا میں ماتم [illegible] تھا، [illegible] ساتھی [illegible] رہے تھے۔ دل تھکا تھکا دھڑک رہا تھا۔

میرے سامنے [illegible] اشک بار [illegible] تھے۔ [illegible] بھرتی جا رہی تھی۔

میں [illegible] جنت [illegible] ایک گلابی بدلی کے پاس [illegible] تھا [illegible] میں [illegible] سے [illegible] دیکھتا رہا — اُس کی تنہائی [illegible]

* * * * * * * *

میں پہلی [illegible] کرن [illegible] آیا [illegible]

* * * * * * * *

* * * * * * * *

حامد حسن خاں حامدؔ

غزل

جہاں اک منظرِ ویرانیٔ دل ہوتا جاتا ہے
یہ صحرا تیرے دیوانوں کے قابل ہوتا جاتا ہے

مذاقِ زندگی میں کون شامل ہوتا جاتا ہے
کہ دردِ دل ہی دردِ دل کا حاصل ہوتا جاتا ہے

ترا جلوہ نگاہوں کے مقابل ہوتا جاتا ہے
یہ دریا رفتہ رفتہ غرقِ ساحل ہوتا جاتا ہے

جہانِ آب و گِل عکسِ حقیقت ہی سہی لیکن
وہ باطل کہتے جاتے ہیں یہ باطل ہوتا جاتا ہے

مجسم نغمۂ صہبا مکمل شعلۂ مینا
یہ کیا تم ہوتے جاتے ہو یہ کیا دل ہوتا جاتا ہے

نمایاں ہوتی جاتی ہے دلِ خونبار کی سرخی
یہ آنسو اب ترے دامن کے قابل ہوتا جاتا ہے

اٹھاتے جا رہے ہیں وہ نقابِ روئے تابیدہ
جہاں کو امتیازِ حق و باطل ہوتا جاتا ہے

نگاہِ حسن جلوے بخشتی جاتی ہے اے ساقی
مذاقِ عاشقی اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے

الٰہی کیا کوئی گمراہیٔ تقدیر باقی ہے
کہ دیوانے کا رُخ پھر سمتِ منزل ہوتا جاتا ہے

محبت کی ہزاروں عقدۂ دشوار ہیں لیکن
جو آساں ہوتا جاتا ہے وہ مشکل ہوتا جاتا ہے

یقیناً پھر کوئی طوفانِ غم اُٹھنے کو ہے حامدؔ
مجھے پھر اعتبارِ امنِ ساحل ہوتا جاتا ہے

چندر کانت

باپ بیٹا

جیون داس ابھی ابھی کھانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول باہر گلی میں ٹہلنے لگا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نریندر کھانا کھا لے، تو تالا بند کر کے وہ بازار چلا جائے۔ کیونکہ نریندر سے چھوٹا لڑکا تو کہیں رات کو دس بجے کام سے واپس آتا تھا۔ اور نریندر . . . .

اچانک پاس کی مل کا ساتھ بجے کا گھوگھو بجتا ہوا الارم فضا میں تحلیل ہو گیا۔ نریندر اندر بڑے کمرے میں کپڑے بدل رہا تھا۔ الارم کی آواز سنتے ہی اُس نے اپنے پرانے، میلے کچیلے کوٹ کی جیب سے تین پیسے نکالے اور لپکے لپکے ڈگ بھرتا ہوا باہر چل دیا۔

"کھانا کھا لیا؟" جیون داس نے حسبِ عادت آہستہ سے پوچھا۔

نریندر لاپرواہی سے کہنے لگا۔ "نہیں آکر کھاؤنگا۔ وہاں تیس ہزاری کے میدان میں آج دفتر کے کلرکوں کی میٹنگ ہے"

بڑھاپے نے جیون داس کی قوتِ سامعہ کو کافی کمزور کر دیا تھا۔ پہلے دو چار لفظوں کے سوا وہ اور کچھ نہ سن سکا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" جیون داس نے نریندر کے نئے، دھلے ہوئے کپڑوں کا جائزہ لے کر کہا۔

نریندر نے اُس کے کانوں کے عین قریب جا کر وہی الفاظ زور سے دہرائے اور جانے لگا۔

جیون داس اُس کو روکتے ہوئے بولا "نہیں نہیں۔ پہلے کھانا کھاؤ، پھر کہیں جانا"۔ کبھی کبھی وہ غصے میں بھی آ جاتا تھا "میں تمہارا نوکر نہیں ہوں کہ تمہارے آنے تک دروازے پر کھڑا رہوں!"

نریندر ملائمت سے منانے لگا "آپ سیر سے واپس آ کر آرام سے سو رہئے گا۔ میں جگت کے دروازے سے آ جاؤنگا"

"کوئی میٹنگ ویٹنگ نہیں" جیون داس نے تیز ہو کر کہا "جاؤ جا کر کھانا کھاؤ ——— سنتے ہو؟"

"لیکن میٹنگ میں میرا جانا ضروری ہے . . . . دیکھئے ساتھ بج چکے ہیں اور ساڑھے سات تک مجھے وہاں پہنچنا ہے . . . میں جلد ہی واپس لوٹ آؤنگا"

جیون داس نے غصے میں تلملا کر نریندر کی بات کاٹ دی "جو میں کہہ رہا ہوں وہ نہیں سنتے؟"

"سن رہا ہوں . . ." نریندر بڑبڑانے لگا "بوڑھے کی عقل کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے" اور جانے لگا۔

"میں کہتا ہوں کھانا کھا کر جاؤ" جیون داس نے جھلا کر کہا۔

"کھا لونگا ——— ایسے کھانے سے تو بھوکے مر جانا اچھا ہے" اور نریندر اسی طرح بڑبڑاتا بازار کی طرف چل دیا۔

جیون داس اُس کی اس حرکت پر گلی کے سرے پر کھڑا پیچ و تاب کھانے لگا "اس چھوکرے نے تو میرا جینا دشوار کر دیا ہے ——— جو بھی کہو اُسکے برعکس کرے گا ——— میری بات ماننے کی تو اس نے گویا قسم ہی لے رکھی ہے ——— بے شرم کو موت بھی نہیں آتی . . . ."

....

نریندر بیس بائیس سال کا دُبلا پتلا، معمولی تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ حکومت کی جنگی ضروریات کی وجہ سے اگرچہ وہ کسی سرکاری جگہ میں عارضی طور پر نوکر ہو گیا تھا، مگر ساٹھ روپے تنخواہ پانے کے باوجود اُس کا رہن سہن اپنے ساتھ والے کلرکوں کا سا نہیں تھا ——— یونہی معمولی قمیص اور ملگجے لٹھے کا پاجامہ، گھر اور دفتر دونوں جگہ

اُس کی یہی پوشاک تھی۔ البتہ دس آنے گز والی گھٹیا قسم کی سفید زین کی ایک پتلون ضرور اُس کی صحیح ملکیت تھی۔ جو خدا جانے کتنی مرتبہ دھوبن تھے بھر پر چوٹ لگا چکی تھی۔ اور کتنی دفعہ درزی نے اُسکے جانے نشست پر پیوند لگائے تھے۔ کبھی کبھی وہ پتلون بھی اُس کی لمبی، سوکھی ہوئی ٹانگوں میں جھولتی نظر آجاتی تھی۔ جیسے سارنگی کو کسی کر غلاف پہنا دیا ہو۔ ہاں دفتر جاتے وقت وہ چیک ڈیزائن کا ایک کوٹ بھی اپنے کندھے پر لٹکا لیتا تھا۔ جس کے بٹن شاید جنگ میں بڑھتے ہوئے نرخوں کی وجہ سے دوبارہ نہ ٹوٹ سکے تھے۔ اور صابن کی تیزی سے جسے دھوبی کے بیاز حاصل کئے تو ایک مدت ہی گزر گئی تھی — مگر اُسکی نظروں میں ابھی تک وہ کوٹ قیمتی تھا۔ اور وہ اسے سنبھال کر رکھے ہوئے تھا۔ اُس کو تمباکو نوشی کا بھی اچھا شوق تھا۔ جب کوئی اُسکے سامنے سگریٹ سلگاتا تھا۔ تو وہ بھی اپنی ایک پیسے کی دس والی بیڑی نکال کر نہایت شان کے ساتھ پینے لگتا تھا۔ بائیس نمبر کی بیڑی سے اس کو کچھ ایسا ہی عشق تھا کہ کئی مرتبہ یہ بیڑی پیتے پیتے وہ گانا ہی شروع کر دیتا تھا

"دلہن بن کے آئی ہے نمبر بائیس کی بیڑی"

بیڑی کے علاوہ کئی دفعہ اس کو کریون۔ اے، کے سگریٹ کا دھواں اُڑاتے بھی دیکھا جاتا تھا — مگر بہت کم!

ہر مہینے کی پہلی، دوسری اور تیسری تاریخوں کو زبیدر کبھی گھر نہ آیا تھا۔ اور نہ جیون داس نے اب کبھی اُس سے پوچھنے کی ضرورت ہی سمجھی تھی۔ جب تک تنخواہ کے ساٹھ روپے قریب قریب ختم نہ ہو جاتے، زبیدر دفتر اور گھر دونوں جگہوں سے غائب رہتا۔ یہی تین دن تھے، جب وہ دلی کے بہترین ہوٹلوں میں کھانے پر بیٹھ کر مہینہ بھر کی گھر میں کھائی ہوئی دال، مٹی کو اپنی رگ رگ سے نکال دینے کی کوشش کرتا تھا۔ انہی دنوں میں جان پہچان والے اُسکو فتح پوری اور چاندنی چوک، کی سڑکوں پر اکثر ٹہلتے دیکھتے۔ کئی واقفکاروں نے اسکو تانگے کی پہلی سیٹ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے، کئی دفعہ نیا بازار میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ جیون داس کے کرایہ دار جگت نے ایکبار زبیدر کو بھولا رام اینڈ سنز، کی دوکان سے باہر آتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ "کہنا و بھئی زبیدر۔ ادھر کہاں" اور زبیدر نے اُس کو ٹال دیا تھا "یہ چاسر نگر والے بھائی صاحب کا بچہ سخت بیمار ہے، برانڈی لینے آیا تھا"

زبیدر کی شادی ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے اور خدا نے ایک لڑکی بھی دے دی تھی۔ لیکن اُس کی بیوی کو یہاں سسرال میں مشکل ڈیڑھ مہینے ہی رہنا نصیب ہوا ہوگا۔ زبیدر کو اپنے باپ کی طرح اپنی بیوی کا بھی کوئی خیال نہ تھا۔ یہاں تک کہ سردیوں میں جب بیوی اندر کمرے میں سوئی ہوتی تھی، تو وہ باہر گلی میں چارپائی بچھا کر ٹھٹھرتا رہتا تھا۔ ویسے رات کے گیارہ بارہ بجے سے پہلے تو وہ کبھی گھر آتا ہی نہ تھا۔ اور بیسیوں مرتبہ بیوی اسکا انتظار کرتے کرتے بھوکی ہی سو رہی تھی۔ بیوی کے تمام اخراجات بیوی کے والدین ہی برداشت کرتے آتے تھے۔ کیونکہ زبیدر نے بیوی کو تو کیا، اپنی معصوم لڑکی کو بھی آج تک دو پیسے کا کھلونا لا کر نہ دیا تھا بلکہ ایک دفعہ زبیدر کو جب کچھ روپوں کی ضرورت تھی، تو اُس نے چھ اِنچ کا لمبا چاقو نکال کر بیوی کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ اور اُسکے ازاربند سے بندھی ہوئی تالی کھول کر اُسکے سوٹ کیس میں سے طلائی آویزے نکال کر لے گیا تھا۔ جو زبیدر کی نظروں سے بچا ہوا بیوی کا آخری زیور تھا۔ اسی رات زبیدر اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر شراب کے نشہ میں چور گرا پڑا تھا۔ اور آدھی رات گئے بیوی نے اُسے اٹھا کر اندر چارپائی پر لٹایا تھا۔ اگلے دن زبیدر نے جب بیوی کو میکے رخصت کیا تھا تو وہ اس وقت جان گئی کہ اب تقدیر ہی کبھی اُس کو سسرال میں واپس لائے گی۔

گلی محلے والے بھی زبیدر سے کنی کترانے لگے تھے۔ مگر زبیدر تھا کہ جہاں چار واقفکار نظر آتے، جھٹ اُن میں جا مخل ہوتا، بعد میں خواہ ذلیل ہو کر اُسے لوٹنا ہی پڑتا — اُس کی فطرت ہی کچھ

اس قسم کی تھی کہ ہر بات میں ایسا بیچ مار کے اٹا دیتا تھا۔ اور ہمیشہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ کب وہ ہر بات ختم کرے اور وہ اپنی رام کہانی سنائے ـــــ بمبئی کی گھوڑ دوڑ میں پچھلے سال اسی ہزار روپیہ جیتا تھا اور صرف تین ہی مہینوں میں تمام کا تمام ہوٹل، کی نذر کر دیا تھا ـــــ "لیلا چٹنیس" نے جب لاہور میں رقص دکھایا تھا، میں نے پانچ سو روپے کے نوٹ سٹیج پر پھینک دیئے تھے۔ کس میں ہمت ہے کہ نسیم بانو، جیسی مشہور ایکٹریس سے بات کر سکے۔ یہ میں ہی ہوں جو سینہ زوری اُس کے ہاں بنے رہتے تھے۔ لوگ اُس کی گپیں سن سن کر تنگ آ گئے تھے

اسکے علاوہ اُس کی سوسائٹی میں بازاری لوفر اور بے فکرے زیادہ تھے۔ اسلئے کوئی بھی با عزت، بھلا مانس آدمی اُسکے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا خواہاں نہ تھا۔ نریندر کو جب کبھی کسی شریف آدمی کے ساتھ کہیں جانے کا موقع مل بھی جاتا تھا تو وہ سڑکوں پر غیر مہذب اور آوارہ لوگوں کی طرح زور زور سے گانا شروع کر دیتا تھا۔ شاید یہ بھی اُس کی عادت ہی تھی جس سے کئی بار اس کو آتی جاتی عورتوں سے ڈانٹ کھانا پڑی تھی۔ اور دو چار نوجوان لڑکیوں نے تو اُس کی طرف دیکھ کر تھوک بھی دیا تھا

جیون داس نریندر کو سمجھا سمجھا کے تھک چکا تھا۔ اور اب اُس نے کہنا... سننا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی اُسکے دل میں یہ امیدیں تھیں کہ وہ اور نریندر مل کر چھوٹے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے مگر نریندر کے طور و اطوار دیکھ کر اُس نے ان امیدوں کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ کئی دفعہ تنگ آ کر جیون داس نے نریندر کو گھر سے نکال بھی دیا تھا لیکن چند ہی دنوں کے بعد، نریندر جب پھر وہیں چکر کاٹنے لگتا تھا، تو جیون داس اُس کے حال پر ترس کھا کر اسکو واپس بلا لیتا تھا۔ کئی مرتبہ نریندر بھی گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا تھا لیکن دو چار مہینے باہر کی ٹھوکریں کھانے پر اُس کو پھر جیون داس ہی کے پاس آنا پڑتا تھا۔ پچھلے دنوں میں جیون داس نے دو مکان اپنے قصبے میں اور ایک دہلی میں بنوا لیا تھا۔ جن کا تھوڑا بہت کرایہ کسی فرمانبردار بیٹے کی طرح اُس کے بڑھاپے کی مشکلوں میں کام آ رہا تھا۔

نریندر نے آج تک کوئی کام ہی کر نہ دیا تھا۔ جیون داس نے دوڑ دھوپ کر کے اُس کو دو بار سرکاری نوکری دلائی تھی، لیکن اس نے دونوں مرتبہ اپنی روزی پر خود ہی لات مار لی تھی۔ [illegible] آخر پر اُس نے خود بھی چند ایک پرائیویٹ فرموں میں ملازمت حاصل کی تھی، پر اُس کی نا اہلیت آن سے بھی جلدی اکتا گئی تھی۔ ایک دفعہ جیون داس نے پورا ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کر اُس کو صابن کا کارخانہ بھی کھول دیا تھا، مگر وہ تھا کہ چند دنوں میں کارخانہ ہی بیچ کر کھا گیا تھا۔ اس کے سسر نے بھی دو دفعہ اسکو پانچ پانچ سو کی رقم دے کر کہا وہ اپنی پسند کا کوئی بھی کام شروع کرے، اور اُس نے ایسے کام کر کے دکھائے تھے کہ سسر کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ یہی پہلا موقع تھا جب وہ آٹھ مہینوں سے برابر نوکری کر رہا تھا۔

اس رات نریندر پونے بارہ بجے واپس لوٹا۔ جیون داس اور اُسکا دوسرا لڑکا اُسکا انتظار کرتے کرتے، اوپر چھت پر جا کر سو گئے تھے۔ نریندر نے چپکے سے بیٹھک کا دروازہ کھولا لیکن ساتھ ہی جیون داس کی آنکھ بھی کھل گئی۔ نریندر اپنی دھن میں مست رسوئی خانے میں جا کر، لیمپ جلائے بغیر اندھیرے ہی میں کچھ ٹٹولنے لگا اور پھر فوراً ہی باہر گلی کے ایک سرے کی طرف چل دیا۔

جیون داس اوپر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اپنے بڑھاپے کے سہارے کو گلیوں میں گرتے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا ـــــ نریندر اپنے کمرے سے دور، گلی کی واحد نالی میں اپنے پیٹ کا کھایا ہوا کھانا پھینک رہا تھا۔

جیون داس چپ چاپ جا کر پھر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور نریندر جب اوپر آیا تو اُس نے پہلا سوال یہی کیا "کیا بجا ہے اِس وقت"

"یہی دس، سوا دس ہوں گے!" آہستہ سے یہ کہہ کر وہ بغیر بستر کے کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

جیون داس نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "سوا دس بجے گھنٹہ ہو گیا ہے اور تمہارے سوا دس ہی نہیں بجے ہیں یا — بارہ بجے تک کہاں رہے، بیمار ہو یا کچھ اور؟ جب بھی چاہو گئے، جب ہی چلے آئے۔ تمہاری یہ حرکتیں کب تک چلتی رہیں گی؟"

نرنیدر خاموش تھا اور جیون داس اسی طرح کہے جا رہا تھا۔ "یوں دیکھو تو لڑکوں سے بیٹیاں اچھی ہوتی ہیں۔ اور اب کھانا نالی میں پھینک دیا — وہ کیا تمہارے باپ کا پیسا ہے؟"

کوئی جواب نہ پا کر جیون داس اور بھی تیز ہو گیا۔ "میں پوچھتا ہوں کہ بولتے کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتے؟"

لیکن دیر ختم ہو گئی۔ نرنیدر شاید کسی اور ہی خیال میں محو تھا۔

"سو بجے ختم ہو گئی تھی!" — جیون داس نے طنز سے پوچھا "اور کھانا پسند نہیں تھا"

نرنیدر بڑبڑانے لگا۔ "کیا بڑا رائل ہوٹل سے کھایا ہوا تھا"

جیون داس غصے میں تلملا اٹھا۔ "رائل ہوٹل؟ اُن کے بچے ہیں، انہیں رائل ہوٹل کا کھانا چاہیے؟ اگر میرا کھانا پسند نہیں تھا تو رائل ہوٹل میں کیوں نہ چلے گئے؟"

نرنیدر بھی غصے میں آگیا۔ "تو میں نے کونسی رشوت جوش کی پلیٹیں پھینک دی ہیں — بغیر دانے کے وہ چھنک دال ہی تھی نا؟ — اور جلی بھنی چار سوکھی روٹیاں!"

"بڑبڑ مت کر۔ زیادہ بکواس کی تو ابھی گھر سے نکال دوں گا — سمجھے" جیون داس نے جھلا کر کہا۔

نرنیدر زیر خند سے بولا۔ "آپ کیوں نکالتے ہیں، میں خود ہی چلا جاتا ہوں" اور اسی وقت چارپائی سے اٹھ کر نیچے چلا گیا۔

جیون داس بڑبڑا ابھی تک کہہ رہا تھا۔ "جائے جہنم میں، میرا پیچھا تو چھوٹے — خواہ مخواہ میری جان سولی پر لٹکا رکھی ہے — کہیں ڈوب کر بھی نہیں جاتا حرامزادہ۔ اور دنیا کے بیٹے ہی کو موت آتی ہے۔ اس روز روز کے جھگڑے کا فیصلہ تو ہو جائے — ایک بار، دو بار، کب تک یہ حرکتیں دیکھتا رہوں آگے تو ترس کھا کر اسے واپس بلا لیتا تھا، مگر اب اس گھر میں کبھی پاؤں نہ رکھنے دوں گا" یہ کہتے کہتے وہ بھی نیچے اتر گیا۔

اچانک قریبی گھنٹہ گھر نے ایک، بجایا — نرنیدر نے اندر جا کر اپنی وہی پتلون پہنی اور کندھے پر وہی پرانا کوٹ لٹکا کر بازار کی طرف چل دیا۔ جیون داس نے کھٹ سے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔

— ⁂ —

اصل

بعد کی اُڑان

چوم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا، — کوّا
اُڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آپہنچا
کلموہا، کالا کلوٹا، کاجل —
میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے،

دوش پر بکھرے ہوئے ہیں گیسو
بندی دُمدار ستارہ ہے، مگر ساکن ہے،
چلتے چلتے کوئی رُک جائے اچانک جیسے،
غسل خانے میں نظر آیا تھا اُنگلی پہ مجھے سُرخ نشاں،
وہی دمدار ستارے کی نمائش کا پتہ دیتا تھا،
آپ ناپید اٹھا ہے مگر اپنے پیچھے
کسی نقشِ کفِ پا کی صورت
رات کے راستے میں چھوڑ گیا ہے وہ کہانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اِک تان کی حاجت ہی نہ تھی

ایسی ہی ایک لرزتی ہوئی تان آئی تھی
جب پھسلتے ہوئے ملبوس لرزتے ہوئے جا پہنچے تھے۔
فرش پر ایک مسہری کے کٹہرے پہ ہوا آویزاں
"چھوڑ دو، رہنے دو، اس کو تو یہیں رہنے دو"
نیم وا آنکھوں کو پھر بند کیا تھا اُس نے
ہاتھ بھی آنکھوں کے پردوں پہ رکھے تھے یک دم
اور اب ایک ہی پل میں یہ اگر کھل جائیں
یہی آنکھیں جو مجھے دیکھ نہیں سکتی تھیں

دیکھتے دیکھیں مجھے — ہاتھ کہاں رکھیں گی؟
وہیں رکھیں گی — وہی ایک نشانِ منزل
جس جگہ آکے ازل اور ابد ایک ہوئے تھے دونوں
ایک ہی لمحہ بنے تھے مل کر
اسی لمحے میں یہ بندی مجھے دُمدار ستارہ سا نظر آئی تھی
رات کے راستے میں چھوڑ گئی تھی وہ کہانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اِک تان کی حاجت ہی نہ تھی

اب لرزتے ہوئے ملبوس نظر آتے نہیں ہیں، لیکن
اُن کی آنکھوں کو ضرورت بھی نہیں،
وہ تو اِک رات کے طوفان کا اعجاز تھا، طوفان تھا،
کیسا طوفان تھا! — اندھا طوفان
جس کے تھمنے پہ مجھے نوح کی یاد آئی ہے،
اور پھر نوح نے بیٹوں سے کہا
کھول دو پنجرا اسے چھوڑ دو، — اِس فاختہ کو
جا کے خشکی کا پتہ لے آئے
چند ہی لمحوں میں وہ فاختہ لوٹ آئی، مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی،
اور پھر کوّے کو چھوڑا یہی خشکی کا پتہ لائے گا
اُڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آپہنچا،
چُوم ہی لیگا، بڑا آیا کہیں کا کوّا،
کلموہا، کالا کلوٹا، کاجل،

میراجی

ادبی دنیا، جولائی ۱۹۴۲ء

پیروڈی

شعر کا بُھان

کاش ہی لیگا بڑا آیا کہیں کا، ــــ چوہا،
چکّے چکّے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا،
دُم کٹا، بھورا لنگوڑا، پاگل،
میں جو نامرد نہ ہوتا تو بتاتا تجھ سے،

کمرہ میں دبکا پڑا ہے اُلّو
وہ جو مُردار پرندہ ہے، مگر ہمتی ہے،
اُڑتے اُڑتے کوئی تھک جائے اچانک جیسے
چڑیا گھر میں جو نظر آیا تھا ٹہنی پہ مجھے مرغ سنہاں
اُسی مُردار پرندے کی نمائش کا پتہ دیتا تھا
آپ ناپید ہوا ہے مگر اپنے پیچھے
کسی ناخواندہ بلا کی صورت
راگ کے راستے میں چھوڑ گیا ایسی ہے بانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا سب سے
گیت میں ایسی اکھڑتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی،

ایسی ہی ایک اکھڑتی ہوئی تان آئی تھی
جب پھسلتے ہوئے مزدور لڑھکتے ہوئے جا پہنچے تھے
فرش پر ایک عمارت کے کٹہرے پہ چڑھ آیا ہواں
"مجھے چھوڑ دو، اُڑنے دو، مجھ کو بھی یہیں مرنے دو"
نیم وا آنکھوں کو تب بند کیا تھا اُس نے
ہاتھ پھر دونوں کٹہرے سے اُٹھاتے یکدم
اور بس ایک ہی پل میں تھا زمیں پر، دھا تیں!
میری آنکھیں تو اُسے دیکھ نہیں سکتی تھیں

پوچھ مجھ سے تُم ــــ لاش کہاں تُو ہے گئے؟
وہیں تو ہیں گئے، ــــ وہی ایک جہاں کی منزل
جس جگہ آ کے اجل اور ابد ایک ہوتے تھے دونوں
ایک ہو کر بنے تھے مل کر
اسی لمحے میں وہ مردہ مجھے مُردار پرندہ سا نظر آیا تھا
ختم کے واسطے ہے چیز مجھے ایسی پکانی جس کو
کھانے والا یہ کہے گا مجھ سے
محبت پر ایسے گلتے ہوئے پکوان کی حاجت ہی نہ تھی

اب گلتے ہوئے ماکول نظر آتے نہیں ہیں، لیکن
اُن کی بیٹیوں کو ضرورت بھی نہیں
اُونچی دکان کے پکوان کا یہ حال ہے، پکوان پکا
کیسا پکوان تھا؟ ــــ پھیکا پکوان
جس کو چکھنے پہ مجھے لُون کی یاد آئی ہے
اور پھر لُون نے مرچوں سے کہا
"کھول دو ہنڈیا، اسے چھوڑ دو" ــــ اس شوربے کو
جا کے ہلدی کی گرہ لے آئے
چند ہی لمحوں میں وہ شوربہ لوٹ آیا، مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی،
اور پھر چوہے کو چھوڑا یہی ہلدی کی گرہ لائیگا[1]
چکّے چکّے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا،
کاش ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا چوہا
دُم کٹا، بھورا لنگوڑا، پاگل

عاشق محمد، ایم۔ اے

[1] چوہے اور ہلدی کی گرہ کو آپس میں خاص نسبت ہے پنجابی کی ضرب المثل ذہن میں لائیے: "چوہے نے ہلدی کی گرہ پائی تو پنساری بن بیٹھا!" (عاشق محمد)

معین احسن جذبی

طوائف

اپنی عظمت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگیٔ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلون سے مگر
تو نے اس دیدۂ پُرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو

اور یہ زرد سے رخسار، یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار، مری عرضِ وفا سے بیزار

آسی رام نگری

بدگمانی

گاؤں کے کنارے نٹوں کی کئی جھونپڑیاں تھیں۔ گاؤں میں رہنے والی دوسری اونچی قوموں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ گاؤں کے تین طرف ہرے بھرے کھیت اور پرفضا میدان تھے، سو گز کے فاصلے پر برگد کے درخت کے نیچے ایک جھونپڑی تھی۔ اسی میں مہادیو کا تاڑی خانہ تھا۔

کل سے خانہ بدوشوں نے ڈیرا ڈالا ہے۔ یہ گزشتہ سال بھی آئے تھے۔ دو چار گدھے۔ کچھ کتے اور چند بندر ان کا اثاثہ تھے۔ پھر بھی ان کے آنے سے اس میدان میں کافی چہل پہل ہو گئی تھی۔

مہادیو کے تاڑی خانہ میں بھی رونق رہنے لگی۔ نٹوں میں تقریباً سب تاڑی پیتے تھے۔ تاڑی پینے کے علاوہ انہوں نے مہادیو سے لین دین بھی شروع کر دیا تھا۔

شام ہوتے ہی دھوئیں سے بھری ہوئی لالٹین ٹمٹمانے لگتی۔ جیسے جلنے کے لئے اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں تین آدمی اطمینان سے بیٹھے ہوئے تاڑی پی رہے تھے۔ ان میں ایک کسی کی جستجو میں بار بار اندر جھانک رہا تھا۔ آبخورے کی تاڑی ختم ہو جانے کے بعد بھی تاک جھانک جاری رہی۔

آبخورے پھر بھرے گئے۔ وہ بھی خالی ہو گئے۔ لیکن کسی کی دید کی پیاسی آنکھیں تشنہ ہی رہیں۔ آخر ان میں سے ایک سے ضبط نہ ہو سکا۔ پوچھ ہی بیٹھا — "آج کسم نہیں نظر آ رہی ہے ...."

"اپنے نانا کے ہاں گئی ہے" مہادیو نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

تینوں کے چہرے زرد ہو گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے آخری آبخورے کے دام پانی ہی میں گئے۔

مہادیو منہ پھیر کر ہنسا۔ لیکن اس کی ہنسی کوئی دیکھ نہ سکا۔ کسم اس کی بیوہ لڑکی تھی۔ کسم جوان اور خوش رو تھی۔ اسی کی بدولت حسن اور جوانی کے پیاسے اس کی دوکان پر آتے ہیں، اسے مہادیو خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے آزادانہ سب کے سامنے کسم کو آنے دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں میں کافی بدنام تھی۔

کسم کو نہ پا کر تینوں اپنی محرومی پر متاسف ہوئے اور دل ہی دل میں کسم اور مہادیو کو گالیاں دیتے چلے گئے۔

انکے چلے جانے کے بعد مہادیو دوکان کے ایک تاریک گوشے کی طرف دیکھ کر بولا — "تجھے بھی تھوڑی دوں؟"

جنسی جھجکتا ہوا بولا — "دو ایک چکڑ۔ چچا تمہارے پیسے کل بازار سے لوٹ کر دے دونگا" یہ کہہ کر جنسی خاموش ہو گیا۔ اس کے گرد و پیش جیسی تاریکی چھا رہی تھی۔ شاید اندر بھی ایسا ہی اندھیرا تھا

مہادیو نے جنسی کو ایک آبخورہ بھر کر دیا۔ یہ چپ چاپ پی کر اٹھ گیا۔ اسی وقت ایک عورت نے آکر پوچھا — "وہ کیسی ہے؟" اندھیرا ہونے کے باعث وہ بولنے والے کو نہ دیکھ سکا۔ نہ آواز ہی سے پہچان سکا۔ اور آہستہ سے کہہ دیا — "اچھی ہے"

"ارے تم نے پہچانا نہیں؟ میں سکھیا ہوں" — ؟

"تم لوگ کب آئے —"

"کل ہی تو آئے ہیں"

"میری سکھی تو اچھی ہیں؟ کل دیکھنے آؤنگی۔ کوئی بال بچہ ہوا ہے؟"

"ہاں۔ کلو کہاں ہے — ؟"

گھر پہ ہے۔ اسی کیلئے تو تاڑی لینے آئی ہوں۔ دیر ہونے سے گالی دیگا۔ سکھیا مٹی کے ڈبے میں تاڑی لے کر چلی گئی۔ اور جنسی خیالات کی رو میں بہتا ہوا گھر لوٹا۔

* * * * * * * * * * * * *

دلریا کھانا پکا رہی تھی۔ جنسی بھٹی میں آگ سلگا کر بانسریاں سینکنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے تاڑی پینے سے واقعی بدن میں چستی و توانائی آجاتی ہے اور اب یہ آدھی رات تک بانسریاں سینک سکتا ہے۔ تمام دن لہو پسینہ ایک کر دینے والی جانفشانیوں کے بعد بغیر تاڑی پیئے رات میں کام ہونا ناممکن ہے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ جنسی اب بھی کام میں مصروف منہمک تھا۔ اس نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسی لئے دلریا نے بھی نہیں کھایا تھا نیند سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ بھی باہر آئی۔ دیکھا بھٹی میں انگارے دہک رہے تھے۔ جنسی کی آنکھوں میں نیند تھی نہ وہ کسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بس لوہے کی ایک بے جان مشین کی طرح کام میں لگا ہوا تھا۔ اسکے پسینے سے شرابور چہرے کو آگ کی لپک نے اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔ دلریا نیم وا آنکھوں سے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ آہ دو لقموں کے لئے کتنی جانفشانی کرنی پڑتی ہے! بانسریاں ہی اس کی زندگی کا سہارا ہیں۔ سو بھی آجکل نہیں بکتیں۔

اندر ہی اندر گھُلا دینے والی شوہر کی فکر مندیوں سے دلریا بے حد متاثر تھی۔ وہ وہیں کچھ دیر تک کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ پھر ایک طویل سانس کھینچتی ہوئی چولھے کے پاس آ بیٹھی اور چاول کی ہانڈی کی طرف دیکھتی ہوئی اونگھنے لگی۔

اسی طرح تین چار دن گزرے۔ ایک روز دلریا نے کہا — "خالی چاول کیسے کھاؤ گے۔ جاؤ کہیں مچھلی ملے تو . . . . "

جنسی مچھلیاں پھنسانے کے کانٹے اور ڈوریاں لیکر چلا۔ دوپہر تک کئی جگہ مارا مارا پھرا مگر کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر تھکا ماندہ آکر اپنے گھر کے پیچھے والے تالاب میں کانٹے ڈال کر بیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خشک پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سُنکر پیچھے مڑ کر دیکھا تو کسم آ رہی تھی۔

"بابو تمہیں ابھی بلا رہے ہیں؟"

"کیوں — ؟"

بہت ضروری کام ہے۔ چلتے ہو؟"

کسم کی بدنامی سے جنسی ناواقف نہ تھا۔ اس سنسان تالاب کے کنارے جھاڑی کی اوٹ میں کسم کو اپنے پاس کھڑی دیکھ کر ایک نامعلوم خوف سے کانپ اٹھا۔ اور سوچنے لگا یہ چلی جائے تو جان بچے لیکن کسم اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ اور ذرا قریب آ کر بولی۔ کیوں کوئی مچھلی پھنسی؟"

"نہ۔ ایک بھی نہیں . . . . " کہتا ہوا جنسی ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ اسے ہٹتا ہوا دیکھ کر کسم نے بھی جانے کا ارادہ کر کے گردن اونچا اٹھا کر کہا — "دیکھو ضرور آنا۔ نہیں تو بہت برا ہوگا؟ سمجھے تمہیں قسم ہے"

کسم چلی گئی۔ بنسی کو جس بات کا خوف تھا وہی سامنے آئی۔ دلریا نہانے کے لئے پنگھٹ پر آ رہی تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ایک عورت کو اس بیباکی سے مسکرا کر تالاب پر بات کرتے دیکھ کر ایک درخت کے نیچے چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ کسم کی آخری بات اس نے سن لی تھی۔ رشک و حسد اور غم و غصہ سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ وہ لوٹ کر گھر چلی گئی۔ اس کے دل میں بدگمانی کی بجلی سلگنے لگی

بنسی خالی ہاتھ گھر واپس آیا اور بولا —— "کچھ ملا نہیں۔ جو جی میں آئے پکاؤ"

دلریا کچھ نہ بولی ——

"ابھی آ رہا ہوں" کہہ کر بنسی باہر چلا گیا۔

دلریا پھر بھی نہ بولی۔ اور غم و غصہ سے کانپتے ہوئے دل کو دبائے وہیں بیٹھی رہی۔

بہادریو بنسی کو دیکھ کر بولا —— "کسم نہیں مانتی۔ بیچاری کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔ اسکے لئے ایک ساڑی ضروری ہے۔ کل تو تم نے کئی بانسریاں بیچی ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ دے دو۔ اسے ایک ساڑی لادوں"

"اچھا دونگا ......"

"لینا دینا کیا۔ اگر تمہیں آج بازار جانا ہو۔ تو تم ہی لیتے آؤ۔ بوڑھے آدمی کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ؟"

"اچھی بات ہے لا دونگا"

"خوب اچھے کنارے کی لانا" کسم نے باہر نکل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

بنسی کچھ نہ بولا۔ اور سائے کی طرح وہاں سے ہٹ گیا۔

اسکے پاس صرف چار روپے تھے اور گھر میں کھانے کے لئے ایک دانہ نہ تھا۔ اوپر سے بہادریو کا تقاضہ بلکہ نہ دیا بہادر اور بھی بیٹھ گیا۔ اس روز دلریا بنسی سے بولی تک نہیں ——

شام ہوئی اور بنسی بازار جانے لگا تو دلریا سے بولا —— "ایک روپیہ دے"۔ وہ اسی کے پاس اپنی کمائی رکھا کرتا تھا

"کیا کروگے ....؟" دلریا نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ادھار تاڑی پی ہے۔ پیسہ دینا ہے" دلریا کے سامنے یہ کہنے کی جرأت تو تھی نہیں۔ اسلئے بنسی نے آہستہ سے کہا۔ "کام ہے"

اکثر نہ پوچھنے پر بھی بنسی دلریا سے ساری باتیں کہہ دیا کرتا تھا۔ لیکن آج پوچھنے پر بھی اس نے صاف نہ بتلایا۔ اسکے اس برتاؤ سے دلریا کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ اور پیشانی پر بل ڈال کر اس نے چپکے سے ایک روپیہ بنسی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور بھاگ گئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ سچ مچ اپنے شوہر کے نزدیک پرائی ہو گئی ہو ——!

* * * * * * * * * *

کئی دنوں سے سکھیا روزانہ دلریا کے ہاں آتی تھی۔ ایک روز سویرے وہ لال کنارے کی دھوتی پہنے ہوئے آئی۔ اور دلریا کے پاس کھڑی ہوتی ہوئی بولی —— "دیکھیں تیری دھوتی کہاں ہے؟ پہنی کیوں نہیں؟"

دلریا نے تعجب سے پوچھا —— "دھوتی ——؟"

"بات نہ بنا۔ کلو نے مجھ سے بتا دیا ہے"

"کیا کہا ہے — ؟" دلریا نے سکھیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔
"جنسی تیرے لئے دھوتی لایا ہے۔ دونوں نے ایک ہی ساتھ تو خریدی تھی۔ سیاہ پھول دار کناری کی"
دلریا کچھ نہ سمجھ سکی۔ اور بولی — "ہٹ پگلی"
لیکن دوسرے ہی لمحہ اسکے دل میں طرح طرح کے خیالات الجھنے لگے۔ اس کی صورت افسردہ اور سنجیدہ ہو گئی۔ وہ بے دلی سے اٹھتی ہوئی بولی — "نہانے جا رہی ہوں"
"اتنی جلدی کیا ہے ؟"
"نہ ہو" دلریا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اور رسوئی گھر میں چلی گئی۔ سکھیا بھی تنہا کیا بیٹھتی وہ بھی چلی گئی۔
دلریا دھڑکتے دل سے سوچنے لگی۔ اس کا شوہر ضرور کسم کے لئے دھوتی لایا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کل اس نے روپیہ مانگتے وقت اسکی بات کا صاف جواب نہیں دیا۔ اُف یہ چوری . . . . ؟
دلریا کچھ دیر تک بے حس و حرکت مجسمے کی طرح کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ کسم اکثر اسی وقت تالاب میں نہانے آتی ہے۔ آج بھی ضرور آئیگی اگر اسے شوہر نے اسے دھوتی لاکر دی ہوگی۔ تو وہ ضرور پہین کر آئیگی۔
دلریا گھر میں تالا لگا کر گھاٹ کی طرف گئی۔ کسم نہا چکی تھی۔ اسکے کندھے پر ایک دھوتی تھی جس کی کناری واقعی سیاہ تھی۔ اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ایک ہی بازی میں جیسے وہ اپنا سب کچھ ہار گئی۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس میں کچھ سوچنے سمجھنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ اپنے گھر کی طرف دوڑی اور اندر آکر کھڑی رہی۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ جی بھر کر رو دے۔ اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو کہاں تھے۔
اس واقعہ کا ذکر اس نے کسی سے نہ کیا۔ کیونکہ یہ تو اسی کی تحقیر و توہین اور شکست کی بات تھی۔ یہاں تک کہ اس نے جنسی سے بھی کچھ نہ کہا اور حسب معمول گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ ہاں حتی الامکان اس سے الگ اور دور دور رہنے لگی۔ نہ دل کھول کر باتیں کرتی نہ سیدھے منہ اسکی بات کا جواب دیتی۔
دلریا کی اس کشیدگی سے جنسی کی خشک زندگی اور بھی بے کیف ہو گئی۔ محنت و مشقت اور فاقہ مستی و جفاکشی کے باوجود اسے اس کی باتوں سے سکون حاصل ہوتا اور اسکے دم قدم سے اس کی جھونپڑی بھی قصر ارم بنی رہتی۔
جنسی بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی دلریا کی خفگی و کشیدگی کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ آخر مجبوراً اس نے بھی گھر کی بے کیفی سے اُپ کر ادھر ادھر یہاں وہاں۔ مہادیو کی دکان۔ اور تالاب پر وقت گزارنا اور دل بہلانا شروع کیا۔ تمام دن باہر رہتا۔ آدھی رات سے پہلے کبھی گھر نہ آتا۔ اس طرح اس کی زندگی پر غم واندوہ اور افسردگی و بے کیفی کی گھٹائیں محیط رہنے لگیں۔

* * * * * * * * * * *

کئی روز کے بعد سکھیا آکر بولی — "آج رات میں ہم لوگ چلے جائینگے"
"کہاں — ؟"
"یہ کیسے کہوں . . . . خانہ بدوشوں کی کوئی منزل ہوتی ہے ؟"
دلریا کچھ نہ بولی۔ ٹکٹکی لگائے افق کی طرف دیکھتی رہی ——

سکھیا ہنس کر کہنے لگی — "تو بڑی پگلی ہے"۔
دلربا نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
سکھیا پھر ہنسی۔ اور دھوتی دیکھنا چاہی۔ بولی — "دکھا دیتی تو کیا ہوتا؟ گھس جاتی کیا"۔
کوشش کرنے پر بھی دلربا اپنی ٹھنڈی سانس نہ روک سکی، اور آنکھیں پھاڑے سکھیا کی طرف دیکھتی رہی۔
سکھیا نے پوچھا — "کیا سوچ رہی ہے؟"
"میں اس کی کون ہوں جو میرے لئے دھوتی لاتا۔ ۔ ۔ ۔ ؟"
اس کی آواز غم انگیز اور تمکنت آمیز تھی —
سکھیا نے تعجب سے پوچھا — "تو پھر کس کے لئے لایا ہے —؟"
دلربا کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی — "اب میں اس کی کوئی نہیں رہی۔ پرائی ہو گئی۔ سارے سارے دن باہر رہتا ہے اور آدھی رات گئے گھر آتا ہے۔"
سکھیا معاملے کی تہہ تک پہونچ گئی اور بولی — "تو روتی کیوں ہے؟ ہم لوگ کتنی دوائیں جانتے ہیں۔ ایک ہی جڑی دینے سے ٹھیک ہو جائیگا"
اندوہ و آلام کے بے پایاں سمندر میں دلربا نے مسرت وانبساط کی لہر اٹھتی محسوس کی۔ اسکے ہونٹوں پر امید کی برق چمکتی ہوئی بولی — "سچ مچ ایسی کوئی جڑی ہے — ؟ کسم نے بھی شاید اسے دوا ہی کھلا کر ۔ ۔ ۔ ہاں تو جڑی کب دوگی — ؟ تم تو چلی جا رہی ہو۔"
سکھیا بولی — "کلو سے پوچھ کر بتاؤنگی"
"کب — ؟"
"وہ آ جائے۔ کہیں گیا ہے۔"
دلربا بڑی بیتابی سے سکھیا کا ہاتھ پکڑ کر بولی — "سچ بتاؤ دوگی؟ نہیں تو زہر کھا کر مر جاؤنگی۔ سکھیا تیری قسم کھا کر کہتی ہوں۔ زہر کھا کر جان دے دونگی"
"ہاری رے مت۔ اس جڑی میں بڑے گن ہیں۔ منی تو تیری پوجا کریگا"

شام ہی سے دلربا سکھیا کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ کبھی گھر میں جاتی کبھی باہر آتی۔ منی ابھی نہیں آیا تھا۔ سکھیا نہ آنے سے دلربا کی امیدیں یاس میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اسکے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ رہا تھا۔ یہ گھر میں سے نکل کر صحن میں کھڑی تھی۔ چاند نہیں نکلا تھا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ مایوس ہو کر چولھے کے پاس جا بیٹھی۔ دو گھنٹے کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز سن کر باہر گئی تو دیکھا کوئی اس کی طرف آ رہا تھا۔ پوچھنے سے پہلے ہی آنے والے نے کہا — "بہو ادھر آ"
یہ سکھیا تھی —
دلربا دوڑی ہوئی گئی اور بولی — "جڑی کہاں ہے —؟"
"دیتی ہوں۔ پہلے دروازے کی کنڈی تو لگا آ"

دلریا نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگادی۔ سکھیا نے چار پانچ انچ کی ایک جڑی اپنے آنچل سے نکالتے ہوئے آہستہ سے بولی — " بڑی احتیاط کرنا "

دلریا جڑی ہاتھ میں لیتی ہوئی بولی — " اسے کیا کروں گی — ؟ "

" مارے کس کیا ہے ؟ کھانے میں . . . لیکن اتنا یاد رہے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ نہیں تو کوئی فائدہ نہ ہوگا بھی ؟ "

دلریا نے احتیاط سے جڑی آنچل میں باندھ لی۔ سکھیا نے کچھ اور تدبیریں بھی بتائیں۔ ٹھیک اسی وقت باہر کی کنڈی بجی دلریا کانپ گئی۔ باہر سے آواز آئی — " کواڑ کھولو۔ "

منسی کی آواز خلاف معمول کرخت تھی۔ دلریا ڈرتی ہوئی کواڑ کھولنے چلی۔ سکھیا نے دلریا کو روک کر آہستہ سے کہا — " ذرا ٹھہر جا مجھے بھاگ جانے دے۔ نہیں تو سارا کام بگڑ جائیگا "

سکھیا کھڑکی کی راہ سے باہر ہوگئی۔ دلریا نے دروازہ کھول دیا۔ منسی ہوا کے جھونکے کی طرح گھر میں گھس آیا۔ دلریا اسکے خوفناک چہرے کی طرف دیکھتے ہی کانپ گئی۔ منسی پر جیسے بھوت سوار تھا۔ اس نے لال لال آنکھیں نکال کر دلریا کو دیکھتے ہوئے کرخت آواز میں پوچھا — " گھر میں کون تھا — ؟ "

دلریا خوف و ہراس سے کانپ گئی۔ وہ کیسے کہے کہ اسے بس میں کرنے کے لئے سکھیا سے ساز باز کر رہی تھی — بادل ناخواستہ منسی کے خوفناک چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی دبی زبان سے بولی — " کوئی نہیں "

کھڑکی کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ وہ کواڑ کھلنے کی آواز بھی سن چکا تھا

" کوئی نہیں ؟ شیطان کی بچی " کڑکتا ہوا منسی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے دلریا کا داہنا ہاتھ کس کر پکڑا۔ اور اسے مروڑتا ہوا کہنے لگا۔ " تو پھر کس سے میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی تھیں — ؟ ؟ "

دلریا خوف سے کانپ رہی تھی۔ اسکے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ منسی کے مضبوط ہاتھ میں اسکا نرم و نازک ہاتھ بے حس ہوگیا۔ اس نے بال پکڑ کر ایک دھکا دیا۔ وہ زمین پر گر پڑی اور منسی اسکے اوپر خونخوار درندے کی طرح جھپٹ کر اسے مارنے لگا۔ دلریا نہ ہل سکی نہ چیخ سکی۔ مارتے مارتے تھک کر منسی نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا — " حرام زادی جانے کیا اندر ہی اندر کھیل کھیلتی ہے — ؟ "

منسی وہاں ایک لمحہ نہ ٹھہرا اور فوراً گھر سے باہر نکل آیا۔ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہوگیا ؟ کس طرح بات کا بتنگڑ بن گیا ؟ دلریا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کا سارا بدن درد سے چور تھا۔ وہ کسی ہوئی دھوتی کس کس طرح لپیٹ کر اٹھی اور باہر نکلی تو دیکھا اس کا شوہر چند دیہاتیوں کو لئے ہوئے اس کی طرف آ رہا تھا۔ اسکے ساتھ پاس پڑوس کے بچے بوڑھے جوان سبھی تھے۔ لاٹھیں۔ ہجوم۔ ہنگامہ۔ طرح طرح کی باتیں — ! دلریا خوف سے ہیں دیوار کے پیچھے چھپ گئی ۔

منسی کہہ رہا تھا — " شیطان کی بچی کو جان سے مار ڈالتا تو دل ٹھنڈا ہوتا۔ "

ایک شخص بولا — " کہاں ہے حرام زادی ؟ دو چار ہاتھ لگائیں ۔

دوسرا بولا — " منسی تم نے دیکھا کون آدمی تھا — ؟ "

" کیا معلوم کون تھا۔ دیکھتا تو کیا زندہ چھوڑ دیتا۔ گردن نہ کاٹ لیتا "۔ سب مکان میں گھس گئے۔

دلریا کا سر گھوم رہا تھا۔ اسے دیکھتے دیکھتے کیا ہو گیا — ؟ وہ اپنے پھٹے ہوئے سر کو دیوار سے لگائے کان لگا کر سن رہی تھی —

"کہاں گئی — ؟"

"جائیگی کہاں ؟ تلاش کر کے نکالو حرام زادی کو۔ آدمی کا پتہ چل جاتے ہی کالا کر دوں گا" بنسی پیچ پیچ کر کہہ رہا تھا — "میں شیطان کی بچی کی جان لیکر رہونگا۔"

سب کے سب مل کر دلریا کی تلاش کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی استنے آدمیوں کے سامنے وہ کیا کہے گی ؟ اپنے شوہر کی بدگمانی کس طرح دور کرسکے گی — ؟ اگر وہ سچ بات کہے گی تو بھلا کون یقین کریگا ؟ استنے آدمیوں کے سامنے اسکی باتیں خشک پتیوں کی طرح اُن باتوں کے سیلاب میں بہ جائیں گی

"بھاگ گئی ہے — ؟"

"جائیگی کہاں ؟"

بنسی بولا — "چلو اچھا ہی ہوا چلی گئی۔ میں اسے اب دروازے پر کھڑی نہ ہونے دونگا۔ اب ایسی عورت کا منہ دیکھوں تو اپنے باپ کا بیٹا نہیں"

دلریا کو ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آئی۔ کہیں ٹمٹماتا ہوا دیا بھی نظر نہ آیا۔ اب وہ کہاں جائے — ؟ کیا کرے — ؟ ایک بےکس و بےزبان عورت استنے مردوں کے مقابلے میں کیا کر سکتی ہے ؟ اپنے مالک کے پاس واپس جانے کی کوئی صورت نہیں۔ اور اسکے علاوہ سویرے پڑوس والوں کو کس طرح منہ دکھائیگی ؟ وہ مایوس ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔ سوچنے لگی — اُف یہ کلنک — ؟ یہ الزام ؟ مرد بھی کتنے بدگمان ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!

کچھ دیر تک بیٹھی ہوئی دلریا یہی سوچتی رہی۔ دفعتاً اس کا خوف و ہراس کم ہوا۔ سب چلے گئے تھے۔ بنسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ سارا گھر شمشان کی طرح سنسان تھا۔ چاند نکل رہا تھا۔ ہر طرف ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔

وہ سوچنے لگی۔ اب بنسی کو کیا منہ دکھائے۔ قسمت ہی بگڑ گئی تو اپنا بس ہی کیا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اس نے تہیہ کیا کہ اپنی خانہ بدوش سہیلی کے ساتھ در بدر بھیک مانگ کر زندگی کے دن گزار دے گی۔ لیکن گھر کی محبت۔ سارا اثاثہ اور وہاں گزرے ہوئے دنوں کی یاد اس کا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بہت دیر تک دلریا وہیں پڑی روتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر خانہ بدوشوں کے خیموں کی طرف چلی۔

دلریا نے میدان میں آکر دیکھا۔ وہاں خانہ بدوشوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ سب چلے گئے تھے۔ اسی سنسان کھلے میدان میں وہ کچھ دیر تک کھڑی رہی۔ پھر آگے بڑھی۔ وہ کہاں جا رہی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ کہاں جائیگی — ؟ اسے خبر نہ تھی۔ اوپر آسمان نیچے زمین۔ یہی اس کا سہارا، یہی مامن تھا اس کا کوئی مطمح نظر تھا۔ نہ منزلِ مقصود۔ پھر بھی اسکے ناتواں قدم لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے !!

یوسف ظفر

تین سال

تین دیواروں نے محصور کیا ہے مجھ کو
تین دیواریں مجھے قید کئے بیٹھی ہیں
میری ہی عمر کی گھڑیوں سے جو تعمیر ہوئیں
میرے ہی اشکوں سے ہوتی ہے چراغاں جن میں،
جن کی مٹی میں ہیں گوندھی ہوئی میری چیخیں
میرے ہر سانس پہ جو گونج اُٹھا کرتی ہیں،
جن کی اینٹوں میں مرے خون کی آمیزش ہے ———
تین دیواریں ——— دھڑکتا ہے مرا دل جن میں
کوئی دروازہ نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں
کوئی روزن بھی نہیں ایسا کہ میں جھانک سکوں،
زندہ درگور ہوں شاید، کہ مری دیواریں
میرے ماضی کی عمارت سے ہم آہنگ نہیں ———
اِن پہ آویزاں ہیں تصویریں ملاقاتوں کی
چاندنی راتوں کی، جھکی ہوئی برساتوں کی
اُس کی باتوں کی بجائی ہوئی شہنائی سے
گو سجتے نغمے بھی دیواروں پہ آسودہ ہیں
اُس کی تصویریں بھی ہیں زینتِ دیوار یہاں
مسکراتی ہوئی نظریں بھی ہیں ——— یہ دیواریں
غمِ محرومی کے آنسو بھی دکھاتی ہیں مجھے

۲ ———

بڑھتی جائیں گی یہ دیواریں مری عمر کے ساتھ
وہ بھی آنے کو ہے ——— آئے گی ——— عمارت اُس کی
میری دیواروں سے پیوستہ نظر آئے گی،
کوئی دن ہی میں یہ تصویریں، یہ دیواریں تمام
دھڑکنیں عمر کی، ماضی کی سہانی یادیں
وقت کی درد بھری چیخیں، مری فریادیں
ایک فرسودہ سے منظر میں بدل جائیں گی
اور اب تین ہی دیواریں ہیں ——— لیکن افسوس
عمر بھر میں یہیں محصور نہیں رہ سکتا ———



یہ کہانیاں مکمل آپ بیتیاں ہیں۔ جنہیں پڑھنے والے اُنکے کرداروں
کے ساتھ سانس لیتے ہیں اور بعض اوقات اپنے آپ کو ان کہانیوں کے
چلتے پھرتے کردار محسوس کرنے لگتے ہیں۔

Rs. 2/-

اس رات وہ ایب غافل سویا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ صبح الحمد للہ گھٹنے کا ورم بہت گھٹا ہوگیا تھا۔ وہ پڑیک الک میں بیٹھا شعر موزوں کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت ان دو چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام نک اور رِک تھا ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ ہفتے کا دن تھا اس لئے وہ اسکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا ایک چھ سال کا شریر لڑکے۔ رنگ بہت گورا تھا اور بالوں کی رنگت بھی سنہری۔ مسٹر الیشرسٹ سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے چنانچہ تھوڑی دیر میں دونوں پٹر پٹر باتیں کرنے لگے سوائے مچھلیوں کے باقی جانوروں کے مارنے کے جتنے طریقے انھیں یاد تھے چلدنے تک ایک ایک کرکے الیشرسٹ کو سکھلا دیئے۔ پھر پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر پیٹ کے بل ندی کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں لیٹ گئے۔ گویا اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انھیں ضرور حاصل ہے۔ لیکن ہنستے اس قدر تھے اور غل اس قدر مچاتے تھے کہ ایک مچھلی بھی قریب نہ پھٹکی۔ الیشرسٹ بیچ کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پہ بیٹھا پرندوں کے گیت پر کان لگائے انھیں دیکھتا رہا۔ آخر کار نک جو ان دونوں میں سے بڑا تھا۔ مچھلیوں کے کھیل سے اکتا کر اس کے پاس آکھڑا ہوا اور بولا۔

"جپسی ہوا اس پتھر پر بیٹھتا ہے۔"

"وہ کیا ہوا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ کبھی اسے دیکھا نہیں مگر میگن کہتی ہے کہ وہ یہیں بیٹھتا ہے۔ بڑے جِم کو ایک دفعہ نظر آیا تھا جس دن بابا کے سر میں ٹٹو نے لات ماری۔ اس سے پہلے رات کے وقت ہوا یہاں بیٹھا ہوا تھا وہ یہاں بیٹھ کر سارنگی بجاتا ہے۔"

"کون سا راگ بجاتا ہے وہ؟"

"معلوم نہیں۔"

"اس کی شکل کیسی ہے؟"

"کالے رنگ کی بڈھا جم کہتا ہے اس کے جسم پر بال ہی بال ہیں۔ بڑا سخت ہولا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آجاتا ہے۔" پھر اپنی ترچھی سیاہ آنکھوں کے ڈھیلے پھرا کر کہا۔ "مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جائے گا میگن اس سے بہت ڈرتی ہے۔"

"میگن کو کبھی نظر آیا ہے؟"

"کبھی نہیں۔ لیکن میگن آپ سے نہیں ڈرتی۔"

"واہ مجھ سے بھلا کیوں ڈرتی؟"

"وہ آپ کے لئے دعا مانگتی ہے۔"

"چل بدمعاش۔ بھلا تجھے کیسے معلوم ہے؟"

"جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر الیشرسٹ پر بھی۔ بڑی دھیمی آواز میں دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے خود اسے سنا ہے۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ جو باتیں تمہیں خود بھی نہ سننی چاہئیں تھیں وہ تم اوروں کو سنا رہے ہو۔"

لڑکا چپکا ہوگیا اور پھر بڑے فخر سے بولا۔

"میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ میگن تو کھال اترتی ہوئی بھی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا جناب کو یہ اچھا لگتا ہے! جن کہیں کا!"

"جن کیا ہوتا ہے؟"

"جن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہو۔"

چھوٹے لڑکے نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔ "جو خرگوش ہم کھاتے ہیں وہ تو مرے ہوئے ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے نک۔ میں معافی مانگتا ہوں۔"

"میں مینڈک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں۔"

لیکن ایشرسٹ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ "خدایا ہم سب پر فضل کر!" مسٹر ایشرسٹ پر بھی۔ نک نے دیکھا کہ ابھی تو ابھی خاصی باتیں کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑتا ہوا پھر ندی پر جا پہنچا۔ جہاں پھر دونوں نے مل کر ہنسنا اور غل مچانا شروع کر دیا۔

جب میگن چائے لے کر آئی تو ایشرسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ جپسی ہوتا کیا چیز ہے؟"

میگن نے چونک کر سر اٹھایا۔

"اس کا قدم بہت منحوس ہے۔"

"تم بھوت پریت کو مانتی ہو؟"

"اللہ کبھی اس کی شکل نہ دکھائے۔"

"نظر کیوں کر آئے گا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ شاید تم نے یونہی کسی ٹنڈ کو دیکھ لیا ہوگا۔"

"نہیں ان چٹانوں میں بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ یہاں ان لوگوں کے بھوت رہتے ہیں جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے۔"

"تو پھر یہ جپسی تو نہ ہوئے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو جپسیوں کے آنے سے بہت عرصہ پہلے مر کھپ گئے تھے۔"

میگن نے صرف اتنا کہا۔ "سب منحوس ہیں۔"

"پر کیوں! اور اگر یہاں بھوت ہیں بھی تو خرگوشوں کی طرح اپنا جنگل میں رہتے ہیں۔ اب جنگل پر جو پھول اگتے ہیں وہ منحوس ہوتے ہیں۔ پر یہ سارے درخت بھی تو سب خود رو ہیں۔ یہ تو منحوس نہیں اور بھوت منحوس ہو گئے! میں رات کو جنگل میں جا کر اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھ آؤں گا۔ بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی کر آؤں گا۔"

"ارے نہیں! نہیں!"

"میں ضرور جاؤں گا اور جا کر اس چٹان پر بیٹھوں گا جہاں جپسی بیٹھتا ہے۔"

لڑکی نے اپنا ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لئے!"

"پر کیوں؟ اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا تو کیا مضائقہ ہے؟"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایشرسٹ پیار کے انداز میں بولا۔
"میری چھوٹی رہنا ہی بہتر رہے۔ آخر اب یہاں سے بھی تو جلد کوچ کرنا پڑے گا۔"
"جلد؟"
"تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دیں گی؟"
"ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کرایہ پر دیتے ہیں۔"
ایشرسٹ نے لڑکی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔
"تم چاہتی ہو میں ٹھہر جاؤں؟"
"ہاں۔"
"تو آج رات میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

ایشرسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چیں بجبیں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایشرسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھیں۔ اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ تم نے کیا کیا؟ خوشنما پھولوں کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کچل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ گارٹن کی طرح گدھا ہوں۔ شہر کا رہنے والا۔ کالج کا طالب علم۔ اس لڑکی کو سمجھنے سے بالکل قاصر!

(۴)

اگلے ہفتے ایشرسٹ کو یقین ہو گیا کہ اب گھٹنے کی تکلیف جاتی رہی۔ کیونکہ اس نے اردگرد کے علاقہ کی خوب سیر کی۔ ایشرسٹ پر اب کے سال موسم بہار کی وہ کیفیتیں آشکارا ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی پیڑ کے سرخ و سفید شگوفوں کو جو گہرے نیلے آسمان کے بالمقابل دھوپ میں کھلے ہوتے یا کبھی سکاچ فر کے تنوں اور ٹہنیوں کو جو تیز روشنی میں نیلے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشہ کے عالم میں بیٹھا دیکھتا رہتا۔ یا پھر جنگل میں تاڑ کے درختوں کا نظارہ کرتا۔ جو ہوا کے زور سے ساکن ہو گئے تھے۔ نچلے پتے کالے کالے تھے۔ اوپر کی ٹہنیوں پر کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جو ہوا کے جھونکوں سے پھڑک اٹھتیں تو درخت میں ایک زندگی سی آ جاتی۔ کبھی سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا۔ اور بنفشے کے پھولوں، مچھیوں کو دیکھتا رہتا یا سوکھے ہوئے سبز کمین میں کھڑا فیڈیری کی گلابی گلابی کلیوں کو جن کے آرپار دکھائی دیتا تھا انگلیوں سے چھیڑتا رہتا۔ کبھی گلو چھپانے لگتے۔ کبھی سبزہ بول اٹھتے۔ کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لارک اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہاریں سبزہ وگل کی بہاریں تھیں۔ یہ بہار دل کی بہار تھی۔ دن کے وقت گھر کے لوگوں سے ملنا کم ہوتا۔ جب میگن کھانا لے کر آتی تو یا گھر کے کسی کام کاج میں ہوتی یا اسے احاطے میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی اس لئے ایک دو باتوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔ لیکن شام کے وقت ایشرسٹ باورچی خانہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پائپ سلگا لیتا۔ نک ٹیلے جم یا مسز نریڈ کو سب سے باتیں کرتا رہتا۔ لڑکی سینا پرونے بیٹھتی یا کھانے کے برتن سنبھالتی پھرتی۔ بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی چمکیلی ہوئی بھونرا سی کالی آنکھوں سے

[illegible] سے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب نخوت آمیز مسرت ہوئی۔ دل کی وہ کیفیت ہوتی جو ایک بلی کی ہوتی ہوگی جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ بعد گزر گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت البرٹ باغیچے میں بیٹھا بلیک برڈ کی آواز پر کان لگائے ایک عشقیہ نظم موزوں کر رہا تھا کہ راستے میں پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اور درختوں کے بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال بالوں والا دہقان بھاگتے نظر آئے۔ البرٹ سے بیس گز کے فاصلہ پر آ کر لڑکی ٹھہر گئی۔ جونہی وہ آ پہنچا، دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ البرٹ گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ وہ آگے بڑھا گیا۔ لڑکی سے پیچھے ہٹتی رہی۔ لڑکی کے چہرہ پر طیش اور پریشانی تھی۔ اور لڑکے کا چہرہ؟ کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس دہقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ البرٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے اسے دیکھا۔ میگن نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور ہنستی ہنستی ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ دہقان گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور پھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔ البرٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس آیا۔ وہ حسن کی مورت ہونٹ کو دانتوں میں دبائے بالکل بت بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔

البرٹ نے کہا۔ "میں معافی مانگتا ہوں۔"

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پلکیں، اٹھا کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے البرٹ کو ایک نظر دیکھا۔ ایک سسکی بھری اور مڑ کر چل دی۔

البرٹ اس کے پیچھے گیا۔

"میگن۔"

لیکن وہ نہ رکی۔ آخر البرٹ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ لیا۔

"ٹھہر جاؤ۔ مجھ سے بات تو کرو۔"

"آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں؟ مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا تو میں جو سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

"اسے میرے پیچھے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تم پر عاشق ہوگا اور کیا؟"

لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر ملا۔

البرٹ ہنس دیا۔ "کہو تو میں اسے ڈانٹ دوں؟"

لڑکی یکلخت جذبہ سے بے قرار ہو کر رونے لگی۔

"آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔"

البرٹ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ حتیٰ کہ اس کا تمتایا ہوا چھوٹا سا چہرہ اس کے پریشان بال ایک سیب کے درخت کے گلابی شگوفوں میں جا لگے۔ البرٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ دل میں سوچا کہ

یہ ایشرسٹ کی پہلی فتح کی بات ہے۔ وہ اکثر تو میرے مقابلے میں کتنی حقیر ہے اور یہ احساس محض اتنی بات سے پیدا ہوا کہ اس نے کچھ عرصہ پہلے اس کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔ میگن اس وقت تک اپنا جسم چرائے کھڑی کی کھڑی رہی لیکن یکایک تھرتھراتی ہوئی ایشرسٹ کی طرف بڑھی۔ نیم گرم سی حرارت ایشرسٹ کے بدن میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھولی بھالی دوشیزہ کو میرے ہونٹوں کے لمس سے خوشی ہوئی ہے۔ بے ساختہ بے تاب ہو کر بانہیں اس کے گرد ڈال دیں۔ اور سینے سے لپٹا کر اس کا منہ چوم لیا۔ پھر کچھ سہم گیا۔ میگن کا رنگ سفید تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے بے رنگ رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔ بے جان بازو پہلوؤں کے ساتھ لٹکے تھے۔ اس کے سینے کے مس سے ایشرسٹ کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ایک آہ بھر کر کہا۔ میگن اور اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس گہری خاموشی میں ایک بلیک برڈ چہچہایا۔ پھر لڑکی نے ایشرسٹ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ پہلے رخسار پھر ہونٹوں سے لگایا۔ اور اسے دیوانہ وار چوما اور پھر بھاگ کر سیب کے درختوں کے کائی دار تنوں میں غائب ہو گئی۔

ایشرسٹ ایک پرانے مڑے تڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور ہوش پریشان تھے۔ ان گلابی گلابی کلیوں کو جن میں کی ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی، ان شگوفوں کو جنھوں نے میگن کے بالوں کے ارد گرد پھولوں کا ایک تاج گوندھ دیا تھا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا رہا جن کے ہاتھوں شکست کھائی گئی یا فتح پائی جا سکے۔ بہار کا جادو چل گیا تھا۔ بہر حال دل مسرت اور احساس فتح مندی سے لبریز تھا۔ ٹانگیں اور بازو پھڑک رہے تھے۔ کچھ سہما ہوا بھی تھا۔ یہ آغاز ہے مگر کاہے کا آغاز؟ بھنگے اسے کاٹ رہے تھے۔ مچھر اڑ اڑ کر اس کے منہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ککو اور بلیک برڈ چہچہا رہے تھے۔ بیضل ہنس رہے تھے۔ سورج کی شعاعیں زمین کے متوازی پڑ رہی تھیں۔ سیب کے شگوفے کھلے ہوئے تھے اس کے چاروں طرف بہار کی کیفیات میں پہلے سے زیادہ حسن اور پہلے سے زیادہ زندگی آگئی تھی۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا۔ اسے کسی کھلی جگہ اور کھلے آسمان کی ضرورت تھی۔ جہاں چل پھر کر اپنے جذبات سے مفاہمت کرے۔ اس نے جنگل کا رخ کیا۔ جھاڑیوں میں سے ایک میگ پائی نے اس کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔

جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب رقص کی تعلیم لے رہا تھا تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ اسکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ کم و بیش دور سے کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے زیادہ نرالا تھا یہاں دوری کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو روح مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکمیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو ہاتھوں میں تھامے رہنا جب دل چاہے اسے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مارے کانپتے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔ ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ساتھ ایک الجھن بھی ہے۔ اس پھول کو آخر کرے کیا! دوبارہ اس لڑکی سے کس طرح ملے؟ پہلا پیار تو کچھ ٹھنڈے دل سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا! لیکن اب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے کہ اسے بھی مجھ سے عشق ہے کس جذبے کے ساتھ اس نے میرا ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انھیں خراج عشق ادا کیا جائے تو ان کی فطرت میں ایک گرمجوشی آجاتی ہے۔ لیکن ایشرسٹ ان لوگوں میں سے تھا جو محبوب بن کر جھجک جاتے ہیں۔ کسی کو گرویدہ دیکھ کر خود مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی اور طبیعت میں گداز پیدا

مطلب ہے۔ وہ عشق کو ایک ہجرہ سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کی فطرت میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

گلبرٹ جنگل کے ٹیلوں کے پاس بیٹھا عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ دل کے اندر جو بہار کھل گئی تھی۔ اس کے مزے لوٹنے کیلئے تو تیار تھا۔ لیکن ڈر بھی تھا۔ یہ معلوم تھا کہ بس چند ہے لیکن تھوڑا مغرور تھا دل سے کہتا ایسی خوبصورت لڑکی جیسا اجلا چہرہ جھلکتی چمکتی آنکھیں۔ اس کے دل پر فتح حاصل کر لینا کیا کچھ کم فخر کی بات ہے اب خدشہ کا ہے کا ہے۔ لیکن پھر ایک معنوی سنجیدگی کے ساتھ سوچتا۔ سب کچھ سہی۔ لیکن تم انجام سے پوری طرح واقف ہو۔ سمجھ سے کام لو۔

اپنے خیالات میں کھو کر تھا کہ شام ہو گئی۔ چٹانوں کے ترشے ہوئے شاہی وضع کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ اور قدرت کی آواز نے کہا۔ یہ تمہارے لئے نئی دنیا ہے۔ جس طرح انسان گرمیوں کے موسم میں صبح چلنے کے لئے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند پرند اسے گھور کر دیکھتے ہیں۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی محسوس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور بیری کی جھاڑیوں کے بیچ سے راستہ ٹٹولتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ سڑک کی پگڈنڈی پر نکلا اور پھر موڑ کے برابر ہوتا ہوا باغیچے میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیا سلائی جلائی اور گھڑی کو دیکھا ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے! چھ گھنٹے پیشتر دن کی روشنی کچھ کچھ باقی تھی اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی اور کہیں کہیں زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔ اور پھر اس نے یکلخت اپنے عشق رومانی کو بیرونی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ تصور میں اس کے سامنے عورت یعنی مسز نیرو کو سب کی ترشروئی اس کی سانپ کی سی مڑی ہوئی گردن اس کی تیز سیاہ آنکھ سب باتوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دی۔ جیسی وضع داروں کے شبہات اور ان کے ناشائستہ طعنے سنائی دیئے۔ اکمزو کا چہرہ غصہ سے لال نظر آیا۔ صرف دکھ بھری آنکھوں والا لنگڑا جم ہی ایسا تھا جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا گاؤں کے شراب خانے میں کیا کیا چہ میگوئیاں نہ چل گئی۔ بوڑھی عورتیں جنہیں اکثر سیر کے وقت سڑک پر چلتے دیکھا تھا کیا کیا باتیں نہ بنائیں گی۔ اور پھر اس کے اپنے دوست کیا کہیں گے۔ رابرٹ گارٹن تو رخصت ہوتے وقت واقفکارانہ انداز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل گھن سے بھر گیا۔

مجھ کو اسے اس مستقل صنعت زدہ دنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گذارنے پر مجبور ہے جس پھاٹک کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی سیاہی مدھم پڑ گئی۔ اور ایک نور کی جھلک اس کے پاس سے گذر کر نیلی تاریکی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا۔ گلبرٹ نے مڑ کر دیکھا عجیب نظارہ تھا چاند مٹی کے پشتہ پر دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سرخ اور تقریباً گول۔ گلبرٹ نے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ پگڈنڈی پر رات اور گوبر اور نو خاستہ سبزے کی خوشبو آ رہی تھی۔ احاطے میں مویشی بڑے بڑے کالے کالے دھبے سے معلوم ہوتے تھے۔ اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں کے قوس دکھائی دیتے تھے جیسے آسمان سے ہلال نوکوں کے بل آ گرے ہوں گھر میں کہیں روشنی نظر آئی۔ دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک یو کے درخت کی تاریکی میں گم ہو کر میگن کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ نہ معلوم میگن سو رہی ہے یا اس کی جدائی میں پریشان اور بے قرار کروٹیں بدل رہی ہے۔ کھڑکی کو تکتے ہوئے اکیلا الو بولا۔ بجز ندی کے ہلکے ہلکے مسلسل متواتر شور کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ الو کی آواز جیسے تنہائی میں گونج اٹھی۔ دن کو کوؤں کا ہجوم تھا۔ رات کو الوؤں کا راج تھا۔ گلبرٹ کے دل کے ہنگاموں کا ان سے بہتر ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ دفعتاً میگن نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ گلبرٹ درختوں سے ذرا ہٹ آیا اور نہایت ہلکی آواز میں بولا۔ "میگن میگن پیچھے ہٹی۔

غائب ہو گئی۔ پھر آئی باہر کو جھکی۔ ایلشرسٹ اس گھاس کے قطعہ پر پنجوں کے بل آگے بڑھا۔ سبز گریس سے شور کا گیا۔ وہ ایک لمبا ستون کے چہرے اور پھیلے ہوئے سب دیں جو غیر واضح نظر آ رہے تھے کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایلشرسٹ نے کرسی کا سہارا کر دیوار کے ساتھ لکڑی کے چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دروازے کی ایک بڑی سی چابی تھی ایلشرسٹ نے گرم ہاتھ ٹھنڈی چابی سمیت زور سے پکڑ لیا۔ میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانت چمک رہے تھے۔ اور بال پریشان تھے کپڑے اس نے ابھی نہ اتارے تھے۔ بے چاری ایلشرسٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "خوبصورت میگن!" اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں ایلشرسٹ کی انگلیوں سے لپٹ گئیں۔ بشرے سے کوئی گھبراہٹ معلوم ہوتی تھی چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی اس کے چہرہ تک ہاتھ پہنچ جانا بھی کیسی خوش نصیبی ہے! "تو پھر ہوا۔ سویٹ برائر کی خوشبو ایلشرسٹ کے نتھنوں میں سما گئی۔ فارم کا ایک کتا بھونکا۔ میگن کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"گڈ نائٹ میگن!"

"گڈ نائٹ جناب!" وہ چلی گئی۔ ایلشرسٹ آہ بھر کر نیچے اترا۔ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ بس کے سوا اب کیا ہو سکتا ہے کہ چپ چاپ جا کر سو رہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے بازوؤں میں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نیم متبسم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہ گرم انگلیاں۔ اسے یاد آ رہی تھیں جو چابی اس کی ہتھیلی میں دبا کر اس کے ہاتھ کو لپٹ گئی تھیں۔ اور ایلشرسٹ پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

(۵)

رات کو سو کا ہی سو گیا تھا۔ لیکن صبح اٹھا تو طبیعت میں گرانی تھی۔ جیسے رات کو کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ کل کی سرگزشت عشق برسوں پہلے کی ایک کہانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس دن پھر صبح میں ایک عجیب سی دلفریبی تھی۔ بہار کا موسم آج پورے جوبن پر تھا۔ ماؤں رات سنہری پھول تمام مرغزار پر چھا گئے تھے۔ اور کھڑکی میں سے باغیچہ سیب کے شگوفوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لباس بچھا دیا ہو۔ جب ایلشرسٹ نیچے اترا تو دل ڈر سا رہا تھا کہ میگن سے سامنا نہ ہو جائے لیکن جب اس کا ناشتہ میگن کے بجائے مسز نریڈ کو میٹ لے کر آئی تو ایلشرسٹ کو ناگوار گذرا اور مایوسی ہوئی۔ آج مسز فریڈ کو سب کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چوکنا تھی۔ اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا۔؟

"اچھا مسٹر ایلشرسٹ۔ رات آپ گویا چاند کے ساتھ ساتھ سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں؟"

ایلشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

"ہم نے تو آپ کے لئے کھانا رکھ چھوڑا تھا لیکن میں جانوں آپ کا دماغ اتنا مصروف تھا کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہوگا۔"

کیا وہ اپنے ویلز کے لہجے میں (جس پر کیم کی بولی بہت غالب آ گئی تھی) اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو بس ——! ایلشرسٹ نے اس وقت دل سے کہا "نہیں ہیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

لیکن ناشتہ کر چکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش بڑھ تو رہی تھی۔ دل میں ڈر تھا کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی ویسی بات نہ کہی ہو جس سے سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ تاہم دل میں کچھ ملال کا احساس ضرور ہے جو صبح سے اس نے قبول تک نہیں کیا۔ وہ حسین نظم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی ہوئی تھی اب اسے اتنی پھیکی معلوم ہوئی کہ مسودہ پھاڑ ڈالا اور اس کی چندیاں بنا بنا کر اس نے پائپ سلگایا۔ اس ہاتھ کو پکڑ کر چوم لینے سے پہلے وہ عشق کی رمزوں سے بے خبر تھا۔ اور اب آگ کی سی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ بے خبر ہو۔ لیکن ان کیفیات کو نظم کرنا گویا پانی کی لہریں گننا ہے۔ ایک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں گیا۔ وہاں پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میگن اس کا بستر لگا رہی تھی۔ ایشرسٹ دروازہ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میگن نے جھک کر تکیے کو عین اس کی جگہ پر جہاں ایشرسٹ کے سر رکھنے سے جھک گیا تھا چوم لیا۔ ایشرسٹ کے دل میں یکلخت مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر دبے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے آہٹ سن پائی تو اور بھی برا ہوگا۔ میگن نے تکیے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خود کے نقش کو مٹانا نہیں چاہتی۔ پھر اسے نیچے رکھ دیا۔ اور دروازہ کی طرف مڑی۔

"میگن"

لڑکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لیے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشرسٹ کے اوپر دیکھ رہی تھیں۔ ایشرسٹ کو ان چھلکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی، پاکیزگی اور ان میں رقت انگیز وفا کی جھلک۔ ان کا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رک رک کر بولا۔

"رات تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟"

لڑکی کچھ نہ بولی۔

"میں رات جنگل میں ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ اب میں یہ کتاب لینے ادھر آیا تھا۔"

میگن کا وہ تکیہ کو بوسہ دینا یاد آیا۔ ہمت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔ قریب آیا اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔ رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے کہا۔ "اب بتاؤ کل جو کچھ ہوا تھا۔ وہ تو ضرور اضطراری حالت میں سرزد ہوا تھا لیکن اب؟ اب کس منہ سے کہو گے کہ...." لڑکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے الگ نہ کیا۔ ایشرسٹ کے ہونٹ نیچے کھسکتے گئے اور آخر کار میگن کے ہونٹوں سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو مکمل احساس عشق کے ساتھ چوما ہو۔ بوسہ جس میں کیف اور نشہ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک معصومیت سی بھی تھی۔ اس سے دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہوگا؟

"رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سیب کے درخت کے پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو۔"

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں۔"

میگن کا رنگ فق تھا۔ ایشرسٹ نے کچھ اسے دیکھ کر پھر اس سارے واقعہ پر غور کیا۔ سہم گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر نچلی منزل میں آ گیا۔ جانتا تھا کہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے عشق کو قبول کر لیا۔ اپنا عشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ کتاب لانا تو بھول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس سبزہ کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے سامنے اور پیچھے فارم کے لوگ کام کاج میں مشغول تھے۔ لیکن

ایشرسٹ کی نظریں مبہوت تھیں۔ پاؤں ابھی وہیں تھے۔ پچھتا بھی رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر جو دیکھا تو دائیں ہاتھ کو ذرا پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر سے ابھی ابھی لوٹا ہے۔ جسم کا بوجھ کبھی اس ٹانگ پر ڈال دیتا کبھی اس ٹانگ پر۔ چہرے کا رنگ ڈوبتے سورج کی مانند تھا۔ نیلی قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ بازوؤں کی رنگت اور چمک پکے ہوئے آڑوؤں کی مانند تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سنائی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں سن کی سی پلکیں۔ نظریں ایشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ایشرسٹ نے طنز سے پوچھا۔

"کیوں جو۔ کوئی خدمت میرے لائق؟"

"ہاں"

"کیا؟"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں!"

ایشرسٹ پہلے ہی کون سا مسکین صورت تھا۔ اور اب تو وہ اور بھی تن کر بولا۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ لیکن تمہیں خدائی کا دعویدار بننے کو کس نے کہا؟"

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ محنتی نوجوانوں کے پسینے کی بو ایشرسٹ کے نتھنوں کو ناگوار گزری۔

"تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟"

"میری مرضی"

"چندیا کی استری ہوگی تو مرضی سب بھول جائے گی"

"تو تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے؟"

جو نے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور بھی تیز ہو گیا۔ جوان اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی غصہ کے مارے چہرے کے پٹھے اینٹھ گئے۔

"میگن تمہیں نہیں چاہتی"

اکھڑ، بدتمیز دہقان کی یہ بات سن کر ایشرسٹ کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حقارت اور غصہ اور حسد سے آگ بگولا ہو گیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ یکلخت اٹھ کر کرسی پیچھے کو دھکیل دی اور بولا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری"

یہ الفاظ منہ سے نکلے تو سامنے میگن نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا کتے کا پلا گود میں اٹھائے دروازہ میں کھڑی تھی۔ جلدی سے پاس آئی اور بولی۔

"دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں"

جو چل دیا۔ گردن کا رنگ بیچ بیچ قرمزی ہو رہا تھا!

ایشرسٹ نے کتے کے ہونٹوں کو پیار سے چھیڑا۔ کتا بڑے مزے سے مینڈک کی مانند موٹا تازہ [illegible]

میگی کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔

"یہ ابھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ بچے تم سے پیار کرتے ہیں"

"تو آپ اس سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہہ رہا تھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگی کو تمہاری ضرورت نہیں"

لڑکی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک بیزار سی نظروں سے ایشرسٹ کو دیکھا۔ ایشرسٹ کانپ اٹھا جیسے کسی پروانے کے پر جلتے دیکھ لئے ہوں۔

"نہیں!" سر جھکا کر بچے کو پیار کیا اور اس کے موٹے تازے جسم سے چہرہ ڈھانپے اندر چلی گئی۔

ایشرسٹ بڑی زندہ دلی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ فرغ اس کے پھاٹک پر وہ لنگڑا آدمی تھا۔ کھیں چرا رہا تھا۔ ایشرسٹ بولا "ہم بڑا اچھا موسم ہے"

"مگر اس کے لئے بہت اچھا ہے۔ اس لئے اوک کے درخت ایش کے درختوں سے پہلے ہرے ہوں گے۔ مثل ہے کہ جب اوک کے درخت ایش سے پہلے ـــــ"

ایشرسٹ نے یونہی پوچھا۔ "ہم جب تمہیں جپسی ہو نظر آیا تھا تو تم کہاں کھڑے تھے۔؟"

"بس اس بڑے سیب کے درخت کے نیچے سمجھ لیجئے"

"کیا واقعی بھی کچھ تھا یا یونہی؟"

"اب یہ تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا کہ کھڑا ہے"

"یہ ہوا آتا کیوں ہے؟"

لنگڑے آدمی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کسی کی برائی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ مسٹر نیرد کو سب نسل کا جپسی تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جپسی لوگ اپنی نسل کے آدمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انھیں کسی نہ کسی طرح خبر پہنچی ہوگی کہ مسٹر نیرد کو سب مرنے والا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھوت کو بھیج دیا کہ جاؤ تم پاس رہو ـــــ میں تو یہی سمجھتا ہوں"

"دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"چہرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فڈل اٹھا رکھا ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں بھوت پریت سب جھوٹ ہے۔ لیکن صاحب اندھیری رات میں اس کتے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوئے تو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ خود چاہے مجھے بھوت نظر نہ آیا ہو"

"چاند نکلا ہوا تھا؟"

"کوئی بارھویں تیرھویں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ اور ان درختوں کے پیچھے سنہری سا دکھائی دے رہا تھا"

• تمہارا خیال ہے بھوت خوش ہوتے ہیں؟

لنگڑے گارٹن نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکائی اور اپنی گہری نظروں سے ایشرسٹ کو اوپر نیچے دیکھنے لگا۔

• صاحب یہ تو خدا جانتا ہے لیکن یہ خوبصورت ہیں۔ ارے ارے کیوں پھرتے ہیں یہ، میں یہ کہتا ہوں کہ خوش نصیب ان بھوتوں کو ہم کیا جانیں۔ بعض لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے بعض کو نہیں آتا۔ اب آپ ہی ہیں جو کیا ہمارے لوگوں کو کیجئے۔ سامنے کی ہر چیز دکھائی نہیں دیتی لیکن میگن کی نظر کی مجال جو کبھی چوک جائے۔ جو ہو گا دکھائی دے گا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔

• وجہ یہ ہے کہ وہ حساس ہے۔

• کیا مطلب؟

• میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے۔

• یہ سچ ہے۔ میگن کا دل بڑا نرم ہے۔

ایشرسٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ • لو پائپ بھر لو۔

• شکریہ حضور۔ بس لاکھوں میں ایک ہے یہ لڑکی۔

ایشرسٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی لپیٹ لی اور چل دیا۔

• اس کا دل نرم ہے۔ بجا لیکن میں بھلا کس فکر میں ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔ ادھر ادھر کھیتوں میں گھومتا پھرا۔ لیکن اس خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بٹر کپ کے پھول اگ رہے تھے اور لال رنگ کے بچھڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے۔ لیکن اوک کے درختوں پر بھورے بھورے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت کا رنگ جدا تھا۔ کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے بھورے جوبن پر تھا۔ ککو اور ہزاروں پرندے چہچہا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی دمک رہا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے...... باغ جنت میں...... ایک بھڑ اس کی آستین پر آ بیٹھی۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں پیدا ہوتی ہیں اور ایک بھڑ کو مار ڈالو تو گویا جو سیب ان شگوفوں سے اگیں گے۔ وہ دو ہزار بھڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ پر کون ایسا سنگدل ہو گا جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی بھی جان لے سکے۔ ایک کھیت میں سرخ رنگ کا ایک جوان سانڈ چر رہا تھا۔ ایشرسٹ نے اسے دیکھا تو جو کی شکل یاد آ گئی۔ لیکن سانڈ نے ایشرسٹ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ شاید یہ پست قد جانور خود بھی اس سنہری چراگاہ کی خوبصورتی اور موسیقی سے مست تھا۔ ایشرسٹ بے کھٹکے ندی کے پاس ڈھلوان پر جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی تھی۔ بلیو بل اس کثرت سے اگ رہے تھے کہ ذہن پر ایک نیلی سی دھند چھا گئی تھی۔ اور سیب کے کوئی بیس درخت شگوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے درختوں اور بٹر کپ کے پھولوں کا سنہری رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن یہاں نیلے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں آ پہنچے ہیں تو اس کا حسن زمین پر اتر آیا تھا۔ ایشرسٹ اس رنگ کو دیکھ کر مبہوت تھا۔ ککوؤں کا چہچہانا اور ندی کا شور البتہ ویسے ہی سنائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھی کے سوا اور کوئی تماشائی نہ تھا۔ سورج نے رفتہ رفتہ اپنا رخ بدل لیا اور سیب کے درختوں کے سائے بلیو بل کے پھولوں پر پڑنے

گئے جہاں وہ پہلی بار اس کے ساتھ آیا تھا، اس رات سیب کے پیڑ کے نیچے ملاقات ہوئی۔ چاندنی ویسے ہی درختوں پر چمک رہی تھی اور سیب کے پتے ہری ہری رنگت کے تھے، لال لال دانے ... پتوں میں چھپے ہوئے تھے وہ شخص ... تھا ... پہاڑی ... ویسے ہی تھی لیکن سیب کا پیڑ پہاڑی کے پیچھے جا چھپا تھا۔ ڈھلوان پر ایک خنکی سی آ گئی تھی اور کہیں کہیں گھاس ... آنے لگے تھے۔ سوچا "آج کی رات" جس طرح پہلے زمین سے ابھری ہوئی تھی۔ اور ایک بے خبری ہاتھ کی نرم اور چلبلی شاخیں ... اس کا حسن ... آشکار ہو رہا تھا اسی طرح اس کے دل اور اس کے حواس کی کھچی جیسے تہیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر ... سیب کے درخت کی ... ایک ٹہنی توڑی، شگوفوں میں وہ ... حسن ... وہی ہی سب شہابی رنگ ... اور کھلے ہوئے پھولوں میں ... سی سفید رنگت۔ وہی دل کو موم کر دینے والی دلفریبی جلوہ گر تھی، ٹہنی کو کوٹ میں لگایا۔ دل کے اندر جو بہار کھل رہی تھی اس کا تمام زور جوش تمنا کی ایک گہرے سانس کے ساتھ ہونٹوں سے باہر نکلا لیکن خود کوشش ہو کر ... گئے۔

(۶)

اندلیسہ کی جلد آدھ گھنٹے سے ایشرسٹ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ خیالات کے گیارہ بجنے والے تھے کتاب بند کی اور احاطے میں سے ہو کر باغیچے میں پہنچ گیا۔ پہاڑی کے عقب سے سنہری رنگ کا چاند ابھی ابھی نکلا تھا اور ایک بیاشی کے درخت کی نیم برہنہ ٹہنیوں میں سے ایک نورانی پرجلال محافظ فرشتہ کی طرح جھانک رہا تھا۔ سیب کے پیڑوں کے نیچے ابھی اندھیرا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا ہے۔ ناہموار گھاس کو پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے قریب ہی کسی تاریک چیز نے حرکت کی اور ڈکار لینے کی سی آواز آئی۔ تین بڑے بڑے سور ... ہل جل کر پھر ایک دوسرے کے پہلو میں دیوار کے نیچے لیٹ گئے۔ اس نے کان لگا کر سنا ہوا بند تھی۔ لیکن راہ میں ندی کی سرگوشیاں اور قہقہے دو چند سنائی دیتے تھے۔ ایک پرندہ نہ معلوم کون سا، لگاتار چپ۔ چپ۔ چپ کر رہا تھا اور ... جار کے اڑنے اور ایک الو کے ... کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ ایک دو قدم آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر کے ارد گرد ایک دھندلی سی سفیدی چھائی ہوئی ہے جس میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ساکن اور سیاہ ... پر بے شمار کلیاں اور شگوفے، جن کے نقش پھیلے ہوئے اور دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی چاندنی کے طلسم سے زندہ ہو رہے تھے۔ اسے ایک عجیب احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں بلکہ رفیقوں کی صحبت میں ہے۔ گویا کئی لاکھ پروانے ... کہیں سے اڑ کر آئے ہیں اور تاریک آسمان اور تاریک تر زمین کے درمیان آ کر ٹھہر گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے برابر اپنے پر کھول رہے ہیں اور بند کر رہے ہیں۔ اس پرکشش زبان کے حسن سے ... ہو کر جس میں کوئی آواز کوئی خوشبو نہ آتی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ باغیچے میں کیوں آیا تھا۔ وہ حسن ... جسے دن بھر ... کر رہی تھی۔ چاندنی اسے تحلیل نہ کر سکی۔ مسرت اس کی روح پر چھا گئی۔ جھاڑیوں اور شاخوں میں سے ہوتا ہوا جن پر وہ زندہ سفیدی سفوف کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ آگے نکل گیا اور ... سیب کے درخت تک جا پہنچا۔ اندھیرے میں بھی وہ درخت باقی درختوں سے گھیر اور بلندی میں زیادہ ... میدان اور ...

جیسا کہ سامنے بہتا جاتا تھا گھنی ٹہنیوں کے نیچے پہنچ کر وہ رک گیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اور نیم خوابیدہ سؤر دھیمی آواز میں ڈکار رہے تھے۔ ان کی سانس سے ندی کی کھردری کائی دار سطحوں سے اٹھتی ہوئی نمی کی خوشبو نکلی کیا وہ آئے گی؟ کیا سچ مچ! تھرتھراتے ہوئے سہما تا ہوا درختوں کے درمیان اس کے دل پر ہوا رات کی ہوا نے احاطہ کر لیا۔ یہاں کوئی شے بھی اس دنیا کی معلوم ہوتی تھی یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لئے نہیں ہے۔ ایشرسٹ اس دیہاتی لڑکی کے لئے نہیں۔ صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے بنا ہے۔ اگر وہ ذاتی ذوق کی طبیعت کا ایک لطیف سا احساس نہ ہوگا! لیکن پھر بھی اس کے کان اس کی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ وہ معلوم ہوتا بدستور سب سب کر تعلقی کا شعر بدستور ٹانی دے رہا تھا۔ اور درخت کی ٹہنیوں میں ہو بس چاندنی کو چمک رہا تھا۔ سکھ کہ ہر ہر شگوفہ کھلتا معلوم ہوتا تھا پر لحظہ زندہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا پراسرار نقرئی حسن بھی ایشرسٹ کی بے تابی کا ایک جزو بنا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ٹہنی جس پر تین شگوفے کھل رہے تھے، توڑ لی پھل دار درختوں کے شگوفوں کو نرم۔ پاکیزہ۔ مقدس۔ دلفریب شگوفوں کو توڑنا اور پھر پھینک دینا کیا یہ گناہ عظیم نہیں! یکلخت پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ سؤر پھر جاگ اٹھے اور ڈکرانے لگے۔ ایشرسٹ درخت کے ساتھ سہارا لگائے کھڑا تھا اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبا رہے تھے۔ میگن کو دیکھا تو جیسے دھڑک لیا اس کی خاموش رفتار کی ایک پری کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تاریک جسم ایک چھوٹے سے درخت کا حصہ ہے۔ اس کا سفید چہرہ شگوفوں میں ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ ایشرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے دھیمی آواز میں کہا میگن! اس نے ہاتھ بڑھا دیئے وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آلگی۔ جب اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس کیا تو ایشرسٹ نے اپنے دل کو توقیر نسواں اور وفور عشق سے لبریز پایا۔ چونکہ وہ اس دنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی۔ معصوم تھی۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو اور کیا کرے؟ مگر چونکہ وہ ہمہ تن حسن اور سپردگی تھی۔ اور زندہ شگوفوں کی طرح بہار کی اس رات کا ایک جزو تھی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ دے اسے وہ سب کا سب قبول نہ کرے۔ اور اپنے دل کی بہار اور اپنے دل کی ہیجانوں کی تکمیل نہ کرے! یہ دو جذبے اپنی اپنی طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ لڑکی کو زور سے سینے کے ساتھ لگایا اور اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کتنی دیر دونوں یونہی خاموش وہاں کھڑے رہے۔ ندی بڑبڑاتی رہی۔ اُلّو بولتے رہے۔ چاند چپکے چپکے بلند اور سفید ہوتا گیا۔ ان کے اردگرد شگوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکن سے اور بھی چمک اٹھے۔ ہونٹوں کے وصل نے گفتگو کے وسائل سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گفتگو کا یہاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرسراتی ہے۔ اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول پھوٹتی ہوئی کونپلیں۔ ندیوں کا سبک پانی۔ ان کی خوش آہنگ والہانہ جستجو یہ تو ہر دو گفتار سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ اسی طرح بہار بعض اوقات زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اور ایک پراسرار ساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی باہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنی انگلیوں کے مس سے ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے۔ اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے پھر اس دنیا کے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جب میگن کا دل اس کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھڑک رہے تھے ایشرسٹ کے دل کو شدید مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ بہشت ہی ہی لگتا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو نہ چھوڑے عشق کا ہو

سکتا۔ پھر ملیگی جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ جدا ہوئے تو درمیانی فضا حائل ہوئی۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ مو ثر ہو رہا تھا۔ ایشرسٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"او میگن۔ تم کیوں آئیں؟"

میگن نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی، کچھ مجروح۔

"جناب آپ ہی نے بلایا تھا۔"

"میری جان مجھے جناب نہ کہو۔"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"فرینک۔"

"میں نہیں کہہ سکتی۔ ہرگز نہیں۔"

"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"دل پر میرا زور نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں اور بس۔"

"بس۔"

دھیمی آواز میں جو بمشکل سنائی دیتی تھی۔ میگن نے کہا

"آپ کے پاس نہ رہ سکی تو میں مر جاؤں گی۔"

ایشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔

"تو آؤ پھر میرے پاس آؤ۔"

"اوہ"

اس "اوہ" میں جو شدت اور مسرت تھی۔ اس سے ایشرسٹ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہیں لندن لے چلوں گا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیر کراؤں گا۔ اور میگن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گا۔ کبھی تم سے درشتی کے ساتھ پیش نہ آؤں گا۔"

"اگر میں آپ کے پاس رہ سکوں تو یہی کافی ہے۔"

ایشرسٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا

"کل میں ٹورکی جاؤں گا اور وہاں سے روپیہ لے کر تمہارے لئے کپڑے خرید دوں گا۔ ان کپڑوں میں لوگ خواہ مخواہ شبہ کریں گے۔ پھر ہم چپکے سے لندن چلے جائیں گے۔ اور وہاں پہنچ کر اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوئی تو شادی کر لیں گے۔"

میگن کے بالوں کی تھرتھراہٹ سے اس کے سر کی جنبش کا پتہ چلتا تھا۔

"نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

اپنی مردانگی سے خود ہی مسحور ہو کر ایشرسٹ نے کہا

"نہیں۔ بالکل میں تمہارے قابل نہیں۔ میگن بتاؤ مجھ سے محبت کب پیدا ہوئی؟"

"جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ پہلی ہی رات مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی لیکن مجھے میرے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ آپ مجھے چاہیں گے۔"

یکلخت گھٹنوں کے بل جھک کر ایشرسٹ کے پاؤں چومنے لگی۔

ایشرسٹ کانپ اٹھا۔ فوراً اسکو اٹھا لیا۔ اور بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔ میگن نے کہا۔ "آپ مجھے چومنے کیوں نہیں دیتے؟"

"مجھے تمہارے پاؤں چومنے چاہئیں۔"

میگن کی مسکراہٹ سے ایشرسٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چاند کی روشنی میں ایشرسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ، ان میں سیب کے شگوفوں کا سا زندہ غیر ارضی حسن تھا۔

اور پھر یکلخت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا کسمسا کر اس کی آغوش سے اپنا آپ چھڑا لیا اور بولی۔

"وہ دیکھو!"

ایشرسٹ کو روشن ندی، ہلکے سنہری رنگ کے چمکتے ہوئے بیچ کے درختوں اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پہاڑی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جپسی جو!"

"کہاں؟"

"وہ درختوں کے نیچے۔ پتھر کے پاس۔"

ایشرسٹ نے بازو چھڑا کر ندی کو پھاندا اور بیچ کے درختوں کی طرف چلا۔ چاندنی کا فریب ہے! کچھ بھی نہیں! اجالے اور تاریکی کے درختوں کے بیچ میں بڑبڑاتا، اور لعنتیں بھیجتا ادھر ادھر بھاگتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ واہیات! فضول! پھر سیب کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اسے ایک سرسراہٹ، سؤروں کے ڈکرانے اور پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلی گئی۔ صرف وہ پرانا سیب کا درخت وہاں رہ گیا۔ اس نے اپنی بانہیں تنے کے گرد ڈال دیں۔ کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ کھردرا تنا! کھردری کائی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ کہاں اس کا کھردرا پن۔ کہاں اس کا نرم رخسار! صرف خوشبو، جنگل کی خوشبو کچھ کچھ ویسی تھی۔ اور اس کے اوپر اور اس کے اندر گرد شگوفے پہلے سے زیادہ زندہ۔ چاندنی میں پہلے سے زیادہ روشن۔ دمکتے اور سانس لیتے معلوم ہوتے تھے۔

(۷)

ٹورکی اسٹیشن پر ریل سے اتر کر ایشرسٹ نے سمندر کا رخ کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ملک ملک کر ٹہلنے لگا۔ کیونکہ

البتہ سیکساجل شناخت کی اس ملائمی لڑکی سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اپنے لباس کا چنداں خیال نہ تھا۔ اس لئے کسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک موٹی سی نارفوک جیکٹ، گردآلود پتلون اور پھٹی پرانی ٹوپی پہنے لمبے لمبے قدم اٹھاتے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ لوگ اس بات کو حیرت سے تک رہے ہیں۔ اس کا بینک سنسان میں تھا لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کوئی شاخ موجود ہو تو وہیں سے روپیہ نکلوا لے۔ جب بینک میں پہنچا تو اس کے خوشگوار خیالات کو سپاہ دھچکا لگا۔ انھوں نے پوچھا آپ لندن میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ لندن تار بھیج دیجئے، وہاں سے جواب آنے پر ہم بڑی خوشی سے روپیہ ادا کر دیں گے۔ تجربہ کار کاروباری دنیا کے مشتبہ سائنس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھندلا کر دیا۔ لیکن تار اس نے بھیج دیا

فاکھنڈ کے سامنے عورتوں کے ملبوسات کی ایک دکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو انوکھے پن کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی محبوبۂ دہقان کے لئے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دکان کے اندر گیا ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ماتھے پر خاص تعجب کے آثار تھے۔ الفریسٹ بغیر کچھ بولے اسے تکتا رہا۔

"کہئے جناب؟"

"مجھے ایک نوجوان خاتون کے لئے لباس خریدنا ہے۔"

نوجوان عورت مسکرا دی۔ الفریسٹ نے ماتھے پر تیوری ڈالی۔ یکلخت اور بڑے شدومد سے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ فرانسش لڑکی فرانسش ہے۔

نوجوان عورت نے جلدی سے کہا

"کس قسم کا لباس چاہیے آپ کو؟ بہت وضعدار؟"

"نہیں سیدھا سادا"

"یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ بس تم سے دو انچ چھوٹی ہوں گی؟"

"کمر کا ناپ آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟"

میگن کی کمر!

"بس یہی جو عام طور پر ہوتا ہے!"

"بہت خوب!"

جب وہ چلی گئی تو الفریسٹ کھڑکی میں رکھے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور یکلخت اسے خیال پیدا ہوا کہ میگن ـــــ اس کی میگن۔ سوائے کمردی کی پٹی کے سائے۔ کمر سے جاکٹ اور دہقانی ٹوپی کے یعنی سوائے ان کپڑوں کے جن میں اسے بارہا دیکھا تھا کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عورت بازو پر بہت سے کپڑے ڈالے واپس آئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے مرمریں جسم سے لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک کا قاضی رنگ الفریسٹ کو بہت پسند آیا

لیکن بیگی کو یہ لباس پہنے ہوئے تصور نہ کرسکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند ماہ کپڑے اٹھالائی لیکن فیرس نے کہا تھا "جیسا تھا کیا چنے اور کیوں کھینچے؟ ٹوپی اور جوتا اور دستانوں کی بھی ضرورت ہوگی اور فرض کر وسب کچھ خرید کر اسے پہنا دیا اور اس لباس نے اسے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا جیسے اوپرا کے کپڑے اکثر دیہاتیوں کو بنا دیتے ہیں۔ تو پھر کیا ہوگا؟ سفر میں بھی اپنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے؟ ہاں۔ لیکن ان کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہوگی۔ یہ ہنسی کھیل نہیں۔ خود فکر کا معاملہ ہے۔ نوجوان عورت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ تازگی ہو اور مجھے ایک بدمعاش شخص سمجھتی ہو۔ آخرکار بولا۔ مہربانی کرکے رنگ کالباس تہ کرکے رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کرسکتا۔ دوپہر کے بعد آؤں گا۔"

نوجوان عورت نے ایک آہ بھری۔

"بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے عمدہ لباس نہیں مل سکتا۔"

الیشرسٹ نے کہا "غالباً نہیں" اور چل دیا۔

مشتبہ دنیا کے کاروباری پن سے ایک بار پھر آزاد ہو کر اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور پھر اپنے تصورات میں مشغول ہوگیا۔ تصور میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دونوں رات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ وہ جنگل میں جارہے ہیں۔ اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جارہی ہے۔ علی الصباح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اسٹیشن پر صبح کی گاڑی تیار کھڑی ہے جس میں سوار ہو کر وہ اپنے ہنی مون کے سفر پر روانہ ہوگئے ہیں اور پھر لندن نے انھیں نگل لیا ہے اور عشق کے خواب سچے ثابت ہو رہے ہیں۔

"فرینک الیشرسٹ! واللہ رگبی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے!"

الیشرسٹ کے ماتھے کے شکن صاف ہوگئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بشرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا جس کا آفتاب دل آفتاب فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشانی بخش رہا ہو۔

"ارے فل ہیلی ڈے!"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ روپیہ لینے آیا تھا۔ میں جنگل میں رہتا ہوں۔"

"لنچ کے لئے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ۔ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہیں، انہیں خسرہ نکلا تھا۔"

ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دونوں وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی پر سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے۔ ہیلی ڈے کا چہرہ آفتابی تھا تو آواز میں بھی بشاشت اور تازگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ یہاں اجاڑ مقام میں تو سوائے نہانے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں۔ ہوتے ہوتے مکانات کی ایک بالائی قطار کے سامنے آکر ٹھہر گئے جو سمندر سے نمایاں کرواتی تھی۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔

میرے کمرے میں آکر منہ ہاتھ دھو لو۔ لنچ ابھی تیار ہوا چاہتا ہے۔"

ایشرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہاؤس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو قمیصوں پر گزارہ کیا تھا اور میاں تو کچی کپڑے اور کئی برس رکھے تھے۔ سوچا عجیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ —— کاہے کا احساس؟ یہ اسے ٹھیک معلوم نہ تھا۔

ہیلی ڈے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں پہنچ گئے تو تین حسین چہرے نظر آئے۔ رنگ بہت گورے، آنکھیں نیلی۔ ہیلی ڈے نے کہا۔ "یہ فرینک ایشرسٹ ہیں۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔" تینوں کے چہرے یکلخت دمک اٹھے۔ دو تو بہت ہی چھوٹی تھیں، ایک دس سال کی، ایک گیارہ سال کی لیکن تیسری کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا۔ بال ہلکے رنگ کے۔ سرخ سفید رخسار جن کو سورج نے ذرا سنولا دیا تھا۔ بھنویں سنہرے سے کچھ۔ دائیں بائیں ذرا اٹھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی رنگت سر کے بالوں سے قدرے گہری تھی۔ آوازیں تینوں کی ہیلی ڈے کی طرح بلند اور بشاش تھیں۔ تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا۔ ایشرسٹ پر ایک متجسس نظر ڈال کر فوراً آنکھیں پھیر لیں۔ اور سہ پہر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک شانتا اور باقی دو اس کی داسیاں معلوم ہوتی تھیں۔ فارم کی زندگی کے بعد ان کی شوخ، پرجوش، بے تکلف گفتگو۔ ان کا پرسکون مگر جواب بے تکلف انداز، شائستگی پہلے تو انوکھا اور پھر اس قدر مانوس معلوم ہوا کہ فارم ہاؤس کا ماحول یکلخت کسی دور دراز دنیا کا خواب معلوم ہونے لگا۔ چھوٹی بہنوں کا نام سبینا اور فریڈا اور بڑی کا نام اسٹیلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سبینا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

"آپ ہمارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلیں گے؟ بڑا لطف رہے گا۔"

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر ایشرسٹ نے کہا۔

"مجھے تو آج سہ پہر واپس جانا ہے۔"

"اچھا؟"

"جانا ملتوی نہیں کر سکتے؟"

یہ سٹیلا کا فقرہ تھا۔ ایشرسٹ اس کی طرف مڑا اور مسکرا دیا۔ کیا حسن تھا۔ سبینا نے افسوس کے لہجے میں کہا "ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہو۔" اس کے بعد پھر غاروں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"آپ بہت دور تیر سکتے ہیں؟"

"تقریباً دو میل۔"

"سچ مچ؟"

"خوب۔"

"واقعی؟"

تینوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دی تھیں۔ ایشرسٹ کو اپنی نئی اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار احساس۔ ہیلی ڈے نے کہا۔

"ایشرسٹ تمہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلو گے؟"

"میں تو کہتا ہوں رات یہیں ٹھہر جاؤ۔"

"ہاں ضرور۔"

لیکن ایشرسٹ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اس پر یکلخت ہی لڑکیاں اس کے کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑ اس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کالج میں کشتی بھی چلاتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں شامل تھا اور ایک میل کی دوڑ میں اوّل بھی آیا تھا۔ لنچ ختم ہونے تک اس نے اپنی ان صفات کی بدولت لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں مصر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ چل کر وہ غار دیکھئے۔ جہاں ہم کھیلنے جاتی ہیں۔ چنانچہ طوطوں کی طرح باتیں کرتی وہ ایشرسٹ کو ساتھ لے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے سٹیلا اور اس کا بھائی تھا۔ غار دوسرے غاروں کی طرح سیلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہی تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑ کر بوتلوں میں بند کئے جا سکتے تھے۔ سبینا اور فریڈا نے جن کی سڈول سانولی پنڈلیاں موزوں سے بے نیاز تھیں۔ تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایشرسٹ کو شمولیت کی دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے مچھلیاں پکڑیں۔ ایشرسٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دیئے۔ جس کے دل میں احساسِ حسن ہو اسے وقت گزرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ نوجوان ڈائنا کنارے پر کھڑی تھی۔ اور جو کچھ یہ تالاب میں سے نکالتے تھے اسے حیرت اور تعجب سے پکڑتی جاتی تھی۔ ایشرسٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا جب گھڑی جیب سے نکالی تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بج چکے تھے۔ گویا بنک بند ہو گیا ہو گا۔ اور روپیہ آج نہ مل سکے گا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

"آہا — اب تو آپ کو ٹھہرنا ہی ہو گا۔"

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے میگن کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ناشتہ کے وقت میگن سے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ "میری جان میں سامان خریدنے ٹورکی جا رہا ہوں۔ آج شام واپس آ جاؤں گا۔ اگر موسم اچھا ہوا تو آج رات ہی چل دیں گے۔ تم تیار رہنا۔" اسے یاد آیا کہ میگن تھرتھرا اٹھی تھی اور اس کے الفاظ کو سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ دل میں کیا کہے گی؟ پھر یکلخت احساس ہوا کہ تیسری لڑکی۔ لمبا قد۔ گورا رنگ۔ ڈائنا کا سا حسن۔ تالاب پر کھڑی تیز نیلی آنکھوں سے اس کو بغور دیکھ رہی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ انہیں کیا معلوم کہ آج رات کے لئے اس کے دل نے کیا ٹھان رکھا تھا؟ اگر انہیں معلوم ہو جائے تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اسے تنہا غار میں چھوڑ کر خود چلے جائیں۔ اس خیال سے کچھ مایوسی ہوئی۔ کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر یکلخت بولا۔

"آہا — اب تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائیں گے۔؟"

"خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سٹیلا مسکرا رہی تھی۔ ہیلی ڈے کہہ رہا تھا۔ "لطف آ گیا بس رات کے کپڑے

باتیں دہرانے لگا۔ اس تمام خوش دلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا لیکن پھر کچھ پشیمانی اور تمنا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا۔
اداسی کے لہجے میں بولا۔

"مجھے ایک تار بھیجنا ہے۔"

تالاب کے کھیل سے تھک گئے تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ ایشرسٹ نے مسز نیرد کو سب کے پتہ پر اس مضمون کا تار بھیجا۔
"افسوس ہے مجھے رات یہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کل آؤں گا۔" اس سے دل کچھ ہلکا ہوگیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی سی گرمی جسم کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پرسکون اور نیلا تھا اور ایشرسٹ تیراکی کا شوقین۔ خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس کی نخوت کی تسکین ہوتی تھی۔ سٹیلا اور ہیلی ڈے کے بشاش چہرے کو دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا میگن کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے۔ ہیلی ڈے سے غسل کا لباس مستعار لیا اور دیکھے روانہ ہوئے۔ ہیلی ڈے اور ایشرسٹ نے ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کپڑے اتارے۔ سب سے پہلے ایشرسٹ پانی میں داخل ہوا اور اپنی تیراکی کی جو تعریف ان کو سنا چکا تھا اس کو سچ ثابت کرنے کے لئے جان بوجھ کر دلیرانہ تیر کر بہت دور نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ہیلی ڈے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ لڑکیاں پانی میں اچھل رہی تھیں اور ڈبکیاں لگا رہی تھیں اور چھوٹی لہروں کے سامنے بھی اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھیں۔ ایشرسٹ عام طور پر ایسے نظارے کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معقول اور دلکش معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں اس کا اپنا کمال بہت نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ جب ان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا میں ایک اجنبی ہوں۔ میری شمولیت کہیں ان کو ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک بدن دوشیزہ کے قریب جاتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن سبینا نے اسے خود بلایا اور کہنے لگی مجھے تیرنا سکھا دیجئے۔ چھوٹی لڑکیوں نے اسے اس قدر مصروف رکھا کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہ آیا سٹیلا اس کے قرب سے مانوس ہو چکی ہے۔ یا نہیں۔ موقع ہی نہ ملا۔ یکلخت سٹیلا چونک کر پکاری۔ ایشرسٹ نے دیکھا تو سٹیلا مرمریں اور نازک بازو پھیلائے جسم ذرا آگے کو جھکائے کمر کمر پانی میں کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر دھوپ کی وجہ سے چھینٹیں سی پڑ رہی ہیں اور وہ سہمی ہوئی ایک طرف کو اشارہ کر رہی ہے۔

"فل کو دیکھو! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے دیکھو!"

ایشرسٹ تاڑ گیا کہ فل خطرے میں ہے۔ وہ ایشرسٹ سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یکلخت اس نے چیخ ماری۔ بازو اوپر نیچے کئے اور پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن ایشرسٹ نے "واپس جاؤ سٹیلا" کہہ کر اسے روک دیا اور خود لپکا۔ عمر بھر اس قدر تیز کبھی نہ تیرا تھا۔ ہیلی ڈے دوسرے زیادہ غوطے نہ کھانے پایا تھا کہ ایشرسٹ نے اسے پکڑ لیا۔ حادثے کی وجہ تشنج اعضا تھی۔ لیکن اسے بچانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کیونکہ اس نے مطلق مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہنچے جہاں ایشرسٹ لڑکی کو روک گیا تھا۔ جب زمین پر پاؤں لگے تو لڑکی بھی آگئی۔ فل کو اٹھایا اور ساحل پر لے گئے۔ ایشرسٹ اور سٹیلا اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی مالش کرتے رہے۔ چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی پاس کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر میں ہیلی ڈے مسکرانے لگا۔ اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ ایشرسٹ سے بولا۔ "ذرا سہارا دو تو میں کپڑے بدل لوں۔" ایشرسٹ سہارا دینے لگا تو سٹیلا کے تر، نمک آلود سرخ چہرے پر کچھ کن

برہم ہو چکا تھا۔ نفرت ہی تو ہو چنے لگا میں نے اسے سیلا کر کے بچا لیا تھا۔ اس نے برا تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے تو بیلی ڈے نے نیچی آواز میں کہا

"ایلفرسٹ تم نے مجھے موت سے بچا لیا ہے"

"کیا کہہ رہے ہو!"

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے پی کر بیٹھ گئے۔ بیلی ڈے کو ناعلیہ مربہ اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی تو سبینا بولی۔

آپ نے تو بہت بہادری دکھائی۔"

اور زینیا بولی۔

"آپ کمال کے آدمی ہیں!"

ایلفرسٹ نے دیکھا کہ اسٹیلا کی نظریں نیچی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور وہاں سے اس نے سینا کو دھیمی آواز میں کہتے سنا۔ آؤ خونی قسم کھائیں کہ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ زینیا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ انکھیوں سے دیکھا کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چبھا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے اور کاغذ کے ایک ورق پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب ہم سے نہ بچئے یہاں آئیے۔" چھوٹی لڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں۔ میز پر وہ کاغذ پڑا تھا جس پر خون سے ایک انسان کی تصویر بنی تھی۔ اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے۔ سٹیلا بیلی ڈے۔ سبینا بیلی ڈے۔ زینیا بیلی ڈے۔ کاغذ پہ بہتے ہوئے لہو سے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے کی شعاعیں ادھر ادھر پھیل رہی ہوں۔ سبینا بولی

"یہ بیچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ اب تو ہم تمہیں چومیں گی!"

اور زینیا بولی۔ "ارے ہاں واقعی!"

ایلفرسٹ کے لئے کوئی مفر نہ تھا۔ اس کے گیلے بال اس کی آنکھوں کے سامنے لٹک آئے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو پر کسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آ لگے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور زینیا بولی۔

"سٹیلا اب تمہاری باری ہے!"

ایلفرسٹ کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔ میز کے اس طرف اسٹیلا کا بھی یہی حال تھا۔ سبینا نے ایک طفلانہ قہقہہ لگایا اور زینیا پکاری۔

"اب چلو بھی نہیں تو سب مزا کرکرا ہو جائے گا!"

ایلفرسٹ کے جسم میں ایک عجیب و غریب محبوب سے اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"کمبخت۔ بہت شریر لڑکیاں ہو تم!"

سبینا پھر ہنس دی۔

"اچھا تو سٹیلا اپنے ہاتھ چومے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک بھی اسی طرف کو مڑی ہوئی ہے۔"

سٹیلا نے سچ مچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایشرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس خنک نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگا لیا۔ چھوٹی لڑکیاں تالی بجانے لگیں۔ فریڈا بولی۔

"بس اب جب موقع آیا ہے آپ کی جان بچائی ہوگی۔ میں چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سٹیلا؟ لیکن ایسی ہلکی پانی کی چائے نہیں جیسے تم نے پہلے مجھے دی تھی؟"

چائے کا دور پھر چلنے لگا۔ ایشرسٹ نے وہ دستاویز تہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ پھر خربوزے پر، نارنگیوں پر۔ پیچھے شہد کھانے پر اور اسکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایشرسٹ چپکا سنتا رہا۔ صرف کبھی کبھی سٹیلا سے حسین کے چہرے کی سرخ سفید رنگت پھر عود کر آتی تھی آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں ہی نظروں میں عہد رفاقت کا اعادہ ہوتا رہتا۔ ایک اجنبی کے ساتھ ان بشاش لوگوں کے مشفقانہ سلوک سے ایشرسٹ کے دل کو راحت ہوئی۔ ان کے ہنستے ہوئے چہروں سے آنکھیں نہ ہٹا سکتا۔ چائے کے بعد چھوٹی لڑکیاں تو سمندری کائی کو خشک کرنے کے شغل میں مصروف ہو گئیں۔ اور ایشرسٹ کھڑکی کے قریب جو نشست تھی اس پر بیٹھ کر سٹیلا سے باتیں کرتا رہا اور سٹیلا کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور اہمیت اور حقیقت کا احساس معطل و معلق ہو گیا تھا کل وہ پھر میگن کے پاس چلا جائے گا۔ اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوگی۔ بجز اس کاغذ کے جو ان بچوں کے خون سے رنگین تھا۔ بچے! سٹیلا تو عمر میں میگن کے برابر ہے۔ وہ بچہ کیونکر ہوئی؟ اس کی باتیں تیز تیز، قدرے خشک اور عجیب تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ایشرسٹ کی خاموشیوں میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونج اٹھتی تھیں۔ سٹیلا کے، بدازیں ایک غنچگی، ایک دوشیزگی پائی جاتی تھی۔ جیسے کسی افسانے کی محبوبہ پھولوں کی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ ہیلی ڈے کے پیٹ میں بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا اس لئے وہ کھانے پر نہ آیا۔ کھانے کے دوران میں سبینا بولی۔

"میں تو آپ کو فرینک بلایا کروں گی۔"

اور فریڈا پکار اٹھی۔ "فرینک۔ فرینک۔ فرینکی۔"

ایشرسٹ نے مسکرا کر تعظیماً سر جھکا دیا۔

"جب کبھی سٹیلا آپ کو مسٹر ایشرسٹ کہہ کر بلائے۔ اسے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ مسٹر ایشرسٹ کہنا کیا فضول رسم ہوتا ہے۔"

ایشرسٹ نے سٹیلا کی طرف دیکھا جس کا رنگ حجاب سے سرخ ہو رہا تھا۔ سبینا ہنس دی۔ فریڈا بولی۔

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرما رہی ہے۔ اللہ رے شرم۔"

ایشرسٹ نے دائیں بائیں دونوں لڑکیوں کے سنہری بال پکڑ لئے۔ اور بولا۔

"دیکھو لڑکو سٹیلا کو مت چھیڑو ورنہ میں تم دونوں کو باندھ دوں گا۔"

فریڈا ہیلی۔ "تم بہت وحشی ہو!"

دوستینا نے محتاط بن کر کہا۔ "تم جو اسے سٹیلا بلاتے ہو۔"

"تو کیوں نہ بلاؤں؟ سٹیلا بہت اچھا نام ہے۔"

اشرسٹ نے ان کے بال چھوڑ دیئے۔ سٹیلا! اس گفتگو کے بعد وہ سمجھا کہ کس نام سے پکارے گی! لیکن اس نے نام استعمال ہی نہ کیا۔ سونے کا وقت آیا تو اشرسٹ نے کہا۔

"گڈ نائٹ سٹیلا!"

"گڈ نائٹ مسٹر گڈ نائٹ زینگ! آج تم نے بہت ہی بہادری دکھائی۔"

"اس کا ذکر مت کرو۔"

سٹیلا کا مصافحہ سیدھا سادا مصافحہ تھا۔ لیکن لمحہ بھر کو اس نے اشرسٹ کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اور پھر یکلخت اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

اشرسٹ خالی کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ صرف کل رات کا ذکر ہے کہ سیب کے پیڑوں اور زندہ شگوفوں کے نیچے کھڑا میگن کو سینے سے چمٹائے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے تھپیڑے سے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی تمنا صرف یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ اور یہ سب کچھ ملتوی ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے آگے جا پڑا۔ محض اس لئے کہ ـــ اس نے اپنی لڑکی کو دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کرلئے۔ جبکہ خود معصومیت ہی کو خیرباد کہنے والا تھا! لیکن پھر سوچا میرا ارادہ تو اس سے شادی کرنے کا ہے۔ میں نے اسے کہہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔ ہیلی ڈے کا کمرہ راستے میں پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے گذرا تو ہیلی ڈے اندر سے پکارا۔

"تم ہو اشرسٹ! اندر آجاؤ۔"

ہیلی ڈے بستر پر بیٹھا پائپ منہ میں لئے پڑھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

اشرسٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

ہیلی ڈے یکلخت بول اٹھا۔ "تمہیں معلوم ہے آج دن بھر مجھے بار بار تمہارا ہی خیال آتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو گذشتہ زندگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن میرے معاملے میں ابھی کا بقیہ حصہ جوں کا توں مدفون رہا شاید میں اس سے ابھی بہت دور تھا۔"

"تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟"

بیٹھانے سے پہلے تو کچھ دیر لگا اور پھر کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا جس سے میں ایک دفعہ ——— تقریباً ——— اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔ بہرحال تمہاری بدولت میں زندہ ہوں۔ ورنہ اس وقت تک مجھے سمندر میں تو شراحت ہوتی۔ وہاں نیچے تک اتر شاید پینے کو مل جاتا۔ مجھے بھی نہ ملتا۔ ایلبرسٹ جب ہم مر جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟"

ایلبرسٹ بولا۔

"ہم بالکل شمعوں کی طرح بجھ جاتے ہیں۔"

"واللہ!"

"شاید۔ بجھنے سے پہلے تھوڑا بہت ٹمٹماتے ہوں۔"

"یہ تو بہت غم انگیز خیال ہے۔ بہرحال ——— میری بہنیں تو اچھی طرح پیش آئیں۔"

"بہت اچھی طرح۔"

بیلی ڈے نے اپنا پائپ ہٹا دیا اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے ایک دوسرے پر رکھ لئے۔ اور لڑکی کی طرف سر کو موڑ لیا۔

"بیچاری بڑی بہنیں۔"

بیلی ڈے بستر پر دراز تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر شمع کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ایلبرسٹ نے اپنے دوست پر نظر ڈالی تو کپکپی سی جسم میں دوڑ گئی۔ اگر زندہ نہ ہوتا تو سمندر کی تہہ میں پڑا ہوتا۔ چہرے پر مسکراہٹ نہ ہوتی۔ اور پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتی۔ شاید لیٹا بھی نہ ملتا۔ ریت ہی میں دفن ہو گیا ہوتا۔ اور ختم کرنے کے لئے دو دن کا کام منتظر رہتا۔ دفعتاً ایلبرسٹ کی مسکراہٹ عجیب و غریب چیز معلوم ہونے لگی۔ یہی زندگی کا شعلہ ہے یہی سب کچھ ہے۔ اٹھ کر اس نے دیکھی اور اس نے کہا۔

"میرے خیال میں تمہیں سو جانا چاہئے۔ شمع بجھا دوں؟"

بیلی ڈے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم جانتے ہو جو کچھ میرے دل میں ہے وہ ادا نہیں کر سکتا۔ موت بہت بڑی چیز ہے گڈ نائٹ ایلبرسٹ۔"

ایلبرسٹ کا دل بھر آیا۔ بیلی ڈے کے ہاتھ کو دبا کر نچلی منزل میں آ گیا۔ اس کا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ اس میں سے گزر کر مکانوں کی قطار کے سامنے جو چمن تھا۔ وہاں جا بیٹھا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ تارے چمک رہے تھے اور ان کی روشنی میں بانگ کے پھولوں کی رنگت کہیں کہیں ایسی پراسرار دکھائی دیتی تھی جیسی رات کے وقت اکثر پھولوں کی دکھائی دیتی ہے۔ اور جس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ ایلبرسٹ نے اپنا خمدار لمبی پر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کیں تو یکلخت کے تنکے کیسینے سے چپٹے سامنے لڑکی دکھائی دی۔ "مجھے کیمبرج کی ایک لڑکی کا خیال آیا جس سے ایک دفعہ ——— تقریباً ——— میں نے شکر کیا کہ اس کے بارے میں میرا ضمیر صاف تھا۔" یکلخت سر کو تکلف کی شاخ سے ہٹا لیا۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔ دونوں ستونوں پر عجیب روشنی تھی۔ ان کی روشنی میں شعلہ لرز کر پھر زندہ ہو گیا۔ ایلبرسٹ اس کے ساتھ شگوفوں کی زندہ سانس لیتی ہوئی مسینک کے پیچھے گہرا اندھیری بلند کھیل رہی تھی چاندنی کی لہر سی تالاب کے کنارے پر چمک رہی تھی۔ وہ اوپر کو اٹھا ہوا چہرہ۔ اس پر تعجب اور حسن بیاز مندی کی جھلک۔ وہ لگ

فلسفہ دانوں سے پہلے اس کائنات کا وہ حسن اور دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد دلا دیا۔ لائٹ کے سلسلے میں ہمیشہ کھڑا ہو گیا۔ یہاں رات کے وقت ندی کی آواز نہ تھی یہاں سمندر کا شور تھا اور سمندر سر پٹک رہا تھا اور اس میں بہہ رہا تھا کوئی نغمہ نہ تھا۔ کوئی گو۔ کوئی ناٹک جو پیں بولتا ناچتا تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آ رہی تھی اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے قینچی سے کتر دیا تھا۔ اسٹائل کی خوشبو سے فضا معمور تھی۔ کسی اونچی منزل میں ہوٹل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب حالات کے شورش بپا کر دی۔ جیسے کوئی ایک ہی جذبہ پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ الجھا جا رہا ہو۔ پٹا جا رہا ہو۔ جیسے پیار اور عشق پریشانی کے عالم میں ٹکریں مار رہے ہوں۔ راستہ ڈھونڈ رہے ہوں انھیں راستہ مل رہا ہو۔ لڑکی جس نے اسے زینک کہہ کر پکارا تھا۔ جس کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو دفعتاً بھینچ لیا تھا۔ یہ شائستہ اور پاکیزہ لڑکی اس کے برعکس۔ خلاف فرح عشق کا حال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف منہ موڑے آنکھیں بند کیے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت اپنی پالتی مار کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا کہ جنگلی پھول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور ـــ شاید ـــ پھر اسے بیسکٹ ہی ایمی پر ایک لڑکی تھی جس سے میں ایک دفعہ تم خود ہی سمجھ لو؛ دونوں ہتھیلیاں دائیں بائیں گھاس پر رکھ کر دبا دیں۔ ابھی گھاس میں گرمی کچھ کچھ باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی نہ آئی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا۔ اپنے آپ سے پوچھا "میں کیا کروں؟" شاید میگن کھڑکی کے پاس کھڑی شگوفوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں محو ہے بے چاری میگن! پھر خیال آیا۔ "کیا یہ سچ ہے! میں تو اسے چاہتا ہوں! لیکن ـــ لیکن۔ کیا مجھے اس سے واقعی محبت ہے؟ یا صرف اس کو اس لیے چاہتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے؟ میں کیا کروں؟" پیانو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایشرسٹ مبہوت ہو کر کنارے سمندر کو تکتا رہا۔ آخر اٹھا۔ اعضاء جیسے جڑ گئے تھے۔ اور جسم کو خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں اب روشنی نظر نہ آتی تھی۔ جا کر سو رہا۔

(۸)

ایشرسٹ گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی اور آنکھ کھل گئی۔ پھر کسی کی کرخت آواز میں پکارا

"اٹھو بھائی ناشتہ تیار ہے۔"

ایشرسٹ یکلخت اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں ـــ ہاں ہاں یاد آگیا!

باقی لوگ سر پر کھڑے تھے۔ سٹیلا اور سبینا کے درمیان ایک نشست خالی تھی۔ ایشرسٹ اس پر جا بیٹھا۔ سبینا کچھ دیر اسے بغور دیکھتی رہی۔ اور پھر بولی۔

"ذرا جلدی کیجیے ساڑھے نو بجے یہاں سے چلنا ہے۔"

"ایشرسٹ ہم بیری ہیڈ گارڈز جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی چلنا ہوگا۔"

ایشرسٹ نے سوچا۔ "میں ان کے ساتھ جاؤں ناممکن! مجھے تو چیزیں لے کر واپس جانا ہے۔" اس نے سٹیلا کی طرف دیکھا۔ سٹیلا نے بجا ارشاد کیا ہے کہا۔

"ضرور چلیے۔"

—— سینا بولی۔

"آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئے گا؟"

زینیا اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

"آپ چلے نہیں تو میں آپ کے بال کھینچوں گی۔"

الیشرسٹ نے سوچا۔ "ایک دن اور سہی۔ اس میں کچھ غور بھی کر لوں گا۔ ایک دن اور!" اور پھر بولا۔

"اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میرے بال کھینچنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہرا!"

اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک تار اور بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن لکھ کر پھاڑ ڈالا۔ انھیں کیا بتائے کہ کیوں نہیں آسکتا۔ کیمپ سے ایک چھوٹی لمبی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ الیشرسٹ سینا اور زینیا کے بیچ میں چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ گھٹنے سیلا کے گھٹنوں سے جا چھوتے تھے۔ جاتے ہیں۔ آپ جینگنز کا کھیل کھیلتے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا یہ تھا کہ ایک دن مزید غور کرنے میں صرف کر دوں گا لیکن اب غور کرنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ دن بھر دوڑتے رہے۔ کشتی لڑتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں بھاگے پھرے۔ نہانے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا۔ گیت گاتے رہے۔ کھیل کھیلتے رہے۔ اور جس قدر سامان خورد و نوش ساتھ لائے تھے سب چٹ کر گئے۔ واپسی میں چھوٹی لڑکیاں الیشرسٹ کے کندھے سے سر رکھ کر سو گئیں۔ الیشرسٹ کے گھٹنے سیلا کے گھٹنوں سے چھو رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ تیس گھنٹے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس قدر دائم تھے) کسی کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ سیلا سے شاعری کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ سیلا نے الیشرسٹ کو اور الیشرسٹ نے سیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعرا کے نام بتائے۔ یکلخت لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"فل کہتا ہے۔ آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ تو بہت بری بات ہے زینک!"

الیشرسٹ نے پریشان ہو کر کہا

"نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے کہ ہم حیات بعد الموت کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔"

لڑکی نے جلدی سے کہا

"میرا ایسا عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا بھلا پھر فائدہ ہی کیا؟"

ان خوبصورت ابروؤں کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے الیشرسٹ نے جواب دیا۔

"یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا ہو اس کے وجود پر انسان ایمان ہی لے آئے۔"

"لیکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں تو انسان کو دوبارہ زندہ ہونے کی تمنا ہی کیوں ہوتی ہے؟"

یہ کہا اور نظر بھر کر الیشرسٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

الیشرسٹ اس کے جذبات کو مجروح نہ کرنا چاہتا تھا لیکن برتری کی خواہش غالب آ گئی۔ بولا۔

"جب تک انسان زندہ ہے اس وقت تک اس زندگی کو دائمی بنا لینے کا آرزومند ہوتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا

بچہ۔ مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں:

" تو کیا تم انجیل کو نہیں مانتے؟"

ایشرسٹ نے سوچا اب ضرور اسے صدمہ ہوگا۔ بولا۔

" یسوع مسیح نے پہاڑی پر جو وعظ سنایا تھا۔ میں اس کو مانتا ہوں کیونکہ وہ بہت دلکش ہے اور اس کے الفاظ ہمیشہ سچے رہیں گے:"

" لیکن کیا تم یسوع مسیح کو خدا کا جز نہیں سمجھتے؟"

ایشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

لڑکی نے اپنا چہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ایشرسٹ کو یکلخت میگن کی دعا یاد آگئی۔ " خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی۔" اور کون ایسا ہوگا جو اس لڑکی کی طرح یوں اس کے لئے دعا مانگے۔ اس لڑکی کی طرح جو اس وقت خود منتظر ہوگی اور سڑک پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ دل نے کہا۔ " تم کس قدر ذلیل ہو۔"

یہ خیال بار بار دل میں اٹھتا رہا لیکن اس کی چبھن رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی تا آنکہ کسی کو ذلیل جتانا نہایت معمولی بات معلوم ہونے لگی اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے اس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا ذلیل بات ہے یا اس سے ملنے کا خیال ترک کر دینا۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کھیلتے رہے۔ اور جب بچوں کے سونے کا وقت آ پہنچا اور وہ چلے گئے تو سٹیلا پیانو پر جا بیٹھی۔ ایشرسٹ کھڑکی کے باہر اندھیرے میں بیٹھا شمعوں کے بیچ میں سے سٹیلا کو دیکھتا رہا (سر کے بال ہلکے رنگ کے اور ان کے نیچے وہ لمبی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی)۔

سٹیلا کے پیانو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہیں تھی۔ لیکن بلا تکلف بجاتی تھی۔ ایشرسٹ کو وہ ایک دلکش مورت معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے اردگرد ہلکے نیلے رنگ کا نور جھلملاتا تھا گویا انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں جیسا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ لچک رہا تھا کس کی جرات تھی کہ بے عنان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گذر بھی ہونے دے۔ وہ شومان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام "وارم" تھا۔ اس کے بعد بیلی ڈے نے اپنی بانسری نکالی۔ اور طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر انھوں نے ایشرسٹ کو گانا سنایا اور سٹیلا شومان کی گیتوں کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر اس کے ساتھ پیانو بجاتی رہی۔ "اِخ گرول نخت" کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ چھوٹی لڑکیوں نے (جو نیلے رنگ کے ڈریسنگ گاؤن پہنے تھیں) دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر پیانو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے بعد کھلبلی مچ گئی اور بقول سبینا کے بڑا مزہ آیا۔

اس رات ایشرسٹ کو نیند نہ آئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ دو دن کے اندر اندر ان لڑکیوں سے اس قدر ملا جلا ہو گیا تھا ان کی بے تکلفی اور اپنائیت نے اس کے دل پر اس قدر قبضہ جما لیا تھا کہ فارم اور میگن ــ خود میگن! خواب و خیال ہو گئی کیا یہ سچ ہے [illegible] کیا تھا [illegible] [illegible]

[illegible] اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا؟ جیسے جیسے وہ مسرور ہو گیا تھا اس پر جادو چل گیا۔ بار کا۔ رات کا عجیب [illegible] اس کو۔ اس کمسن لڑکی جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی۔ یادداشت بتا تا اس خیال کے کہ [illegible] ہے سے نفرت ہونے لگی لیکن پھر بھی جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دل سے کہا۔ میں نے بہت برا کیا۔ میں نے بہت برا کیا۔ خیال کی موسیقی اس کے پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے لگی اسے تصور میں سیلا کا چہرہ نظر آیا۔ پرسکون۔ موری جیسے چمک کے بال۔ چاند اور گردن۔ اور گرد فرشتوں کا سا لفظ۔ اس نے سوچا میرے پاس قائم نہ تھے۔ میں دیوانہ تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ بدنصیب بیگن! "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایلبرسٹ پر بھی!" میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں"۔ اور اس نے چہرہ تکیے میں ڈھانپ لیا۔ ہچکی بندھ چلی تھی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا واپس چلا جائے تو مصیبت۔ نہ جائے تو اور بھی آفت!

برا ان آدمی اگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے تو اس کی بے چینی مٹ جاتی ہے۔ ایلبرسٹ کی آنکھ لگ گئی جب نیند کھلی تو سر پر ہاتھ۔ "آخر کیا ہوا ۔ چند لمحے ۔ ۔ ۔ ہفتہ بھر میں بھول جائیں گے"

اگلے دن کام کے وقت اس نے چیک کے روپے وصول کئے لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی رہا کا اس نے فاختی رنگ کے لباس کو بیچا ہے اپنی ضرورت کی چند چیزیں خریدیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے لڑتا رہا ہے۔ دونوں سے دل میں۔ آنکھیں اکھڑی تھیں لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سیلا نے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شرما کر بولی۔

"زینک تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"

فیوری "سوانح یسوع" ایلبرسٹ مسکرا دیا۔ سیلا اس کے عقائد کے متعلق کس قدر فکرمند ہے۔ اس پر کچھ ہنسی آئی۔ کچھ پیار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوتی کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے یا کم از کم ان کے عقائد کی حمایت میں کچھ پہلے شام کے وقت چھوٹی لڑکیاں اور بیل نمے اپنے اپنے جال کی مرمت کر رہے تھے۔ ایلبرسٹ سیلا سے مخاطب ہوا۔

"مذہب انعام اور سزا کا لالچ دلاتا ہے کہ نیک زندگی بسر کی تو یہ کچھ ملے گا۔ گو یا انعام کے لئے ہی نیکی کی جا سکتی ہے یہ رجا در حقیقت بیم سے پیدا ہوتا ہے"

وہ موڑ پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے پر گانٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے یکلخت نگاہ دوڑائی۔

"نہیں اس کی وجہ اور ہے اور اس سے کہیں گہری ہے"

ایلبرسٹ کے من میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی اور بولا۔

"کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ حسین ہے اور اس کی تہہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے"

سیلا نے ہاتھ پر ٹھوڑی کا قتل لی۔

"میں یقین کبھی"

ایشرسٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا اور بولا۔

"ذرا غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آخرت کے معتقد بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لئے ہوں کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے۔"

"تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں؟"

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل! ایشرسٹ نے شش و پنج میں سر ہلا دیا۔

"اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے بھی سکھا دو۔"

جب گرہیں لگا رہے تھے تو اسے راحت ملی تھی۔ سونے کو جا تو پایا ارادہ اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کے درخشاں پرسکون، خاموشانہ تصور کے انبار سے اپنا آپ یوں ڈھانپ لیا جیسے اس طرح میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ اگلے دن وہ لوگ ریل میں سوار ہو کر ٹوٹنس جانا چاہتے ہیں۔ اور بیری ہیڈ کے ساحل کے مقام پر پکنک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ماضی کو دل سے محو کر دینے کا جو مصمم ارادہ کر چکا تھا اس نے اسے ترغیب دی۔ اس گاؤں کی طرف پیٹھ کر کے ہیلی ڈے کے ساتھ لینڈو میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور اسٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے کہ ایشرسٹ کا دل دھک سے رہ گیا۔ میگن ——— خود میگن! ——— پیلی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ وہی پھٹا پرانا سایہ اس نے پہن رکھا تھا۔ وہی جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور راہگیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر ایشرسٹ نے یکلخت ہاتھ اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ظاہر یہ کیا گویا آنکھ میں سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دہقانوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متامل تھے۔ اور اس کی حالت رحم کی طالب۔ جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے جدا ہو گیا ہو۔ اسے نہ جانتا ہو کہ سیدھا دوڑتا چلا جائے۔ یا واپس پلٹ جائے اور جائے تو کہاں؟ یہ یہاں کیسے آ گئی؟ بہانہ کیا بنایا ہوگا؟ یہ کس امید میں پھر رہی تھی؟ گاڑی کے پہیے گھومتے چلے گئے اور وہ میگن سے دور تر ہوتا گیا۔ لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور چیخیں مار مار کر اس سے کہہ رہا تھا کہ ٹھہر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ جب گاڑی اسٹیشن کی طرف مڑی تو ایشرسٹ سیدھا ہو گیا۔ دروازہ کھول کر بولا۔ "میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آؤں گا۔ اور تمہیں کاسل میں آ ملوں گا۔" یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ ٹھوکر کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر سنبھلا اور چل پڑا۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ لیکن ان کی گاڑی آگے نکل گئی۔

موڑ سے سامنے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ چند قدم دوڑا۔ پھر رک گیا۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن کے قریب تر اور ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں سے دور تر ہوتا گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے۔ اسے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوا کیا فرق پڑ گیا؟ اس سے جو ملاقات ہوگی اور اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوگا۔ اس کی کراہت کو کیونکر کم کرے۔ اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہیلی ڈے کی بہنوں سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ میگن سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کرے گا۔ تکلیف میں رہے گا۔ پچھتائے گا اور پھر اکتا جائے گا۔ محض اس لئے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالے گی۔ اس لئے کہ وہ

سامنے دیکھتا ہے۔ سمولی ہے شبنم آلود ہے۔ لیکن شبنم جذب شدہ ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دور سے ہلکے رنگ کا ایک دھبہ سا معلوم ہوتی تھی، ہجوم میں نظر آ رہی تھی جس سے میگن کی متلاشی حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر کھڑکی پر نگاہ ڈالتی تھی کیا کسی کو اس سے بھی زیادہ دکھ کا لمحہ نصیب ہوا ہوگا! جلا دہ کرتا تھا۔ دل اسی پر واسطہ کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا مدد کی ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی جیسے ستار کا ایک تار ٹوٹ گیا ہو مگر اس کا منہ تکنے لگی۔ سامنے دیکھا تو میگن ساحل سمندر کے پاس جو دیوار کی لکڑی تھی اس کے ساتھ سہارا لیے کھڑی ہو گئی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ بھی رک گیا شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس نظارے سے باز نہیں رہ سکتی۔ ایشرسٹ نے سوچا اس بیچاری نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل ابھی نہ جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔ چند ہفتوں کے عیش کی خاطر اس کی زندگی کے چیتھڑے اڑا دوں؟ ایک تصویر میں سٹیلا کی پرسکون آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے لائق بالوں سے اس نے ہاتھ پھیلتے ہوئے یہ دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جن چیزوں کو قابل احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور احترام نفس سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے گا۔ مڑ گیا اور جلد جلد اسٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سراسیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی منتظر آنکھیں راہ چلتوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور وہ پھر سمندر کی طرف چلا۔ وہ ٹوپی سب نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی وہ دھبہ سیر کرنے والوں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ سینے میں خلا محسوس ہوا جیسا اکثر وقت کمال کی وجہ سے کوئی چیز ہاتھ سے چھن جائے تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہیں دی۔ آدھ گھنٹہ تک اس کی تلاش میں پھرتا رہا اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پڑ کر اوندھا لیٹ گیا۔ جانتا تھا کہ اس سے ملنے کی سبیل تو یہ ہے کہ اسٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔ یا کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یا ریل پر سوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس آئے تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اور اس کے آس پاس بے پروا بچے بیٹھے اور بالٹیاں لئے کھیلتے رہے۔ اس متلاشی سرگرداں لڑکی پر رحم ضرور آتا تھا لیکن یہ رحم بھی کم دیتی خون کی اس سرگرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا جو ہمارے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے عنان جذبہ باقی رہ گیا تھا تو قیر نسواں کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی نو جوش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں، اس کے نازک اور گداز جسم۔ اس کی وارفتگی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرم جوشی کے لئے دل پھر بے قرار ہو گیا۔ مہتاب سے روشن سیب کے درختوں کی شاخوں تلے۔ اس رات کا پھر لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لئے یوں مضطرب تھا جیسے کوئی جنگل کا دیا کسی بن دیوی کے لئے مضطرب ہوتا ہے۔ اس ندی کا پر کیف شور سبز لیمپ کے پھولوں کی دمک۔ وہ پرانی تاریکی چٹانیں۔ گلو اور سنبل کی کوک الوؤں کا بولنا سرخ چاند کا مکمل تاریکی میں سے شگوفوں کی زرد سفیدی کو جھانکنا۔ وہ کھڑکی میں اس کے چہرہ کا نظر آنا اور ہاتھ ڈالے ہوئے کر رہ جانا تھا۔ اس کی عشق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں۔ سیب کے درخت تلے دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملنا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان تصورات نے اس کے دل کو مسحور کر لیا۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ کیا ہے جو جسم کے جذبات اور ان بے قرار خواہشات کے ساتھ دست و گریباں ہے۔ اور جس نے اسے مطیع بنا کر گرم گرم ریت پر لٹا رکھا ہے۔ تین طلائی بالوں والی لڑکیاں۔ ایک دل فریب چہرہ۔ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے ایک

جیسے ہاتھ جو اس کے ہاتھ کو کھینچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے۔ من کتا تم پکار کر کہتی ہے: "تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں!" یہ کہہ منظر اس کے علاوہ ایک عجیب سا نظر آتا ہے جیسے چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔ قدیم انگریزی وضع کا جس میں ہر طرح کے گلابی رنگ کے پھول ہوں۔ کارنیشن اور گلاب کے پھول اور لونڈر اور تائم کی خوشبو ہو۔ لمک اور دلفریب۔ انسانی حس سے بے غرض منظر۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا مجموعہ جنہیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا تھا بیلفرٹ کے خیال آیا۔ ممکن ہے وہ اخروٹ کو ہٹانے اور مجھے دیکھ پائے: اٹھ کھڑا ہوا ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی اس پر جا بیٹھا۔ سمندر کی چھینٹیں اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھیں۔ اس سے ہوش و حواس پھر بحال ہو گئے۔ فارم کو واپس چلے جانا اور ان جگہوں میں جو چٹانوں کے درمیان رہ کر میگن سے عشق کرنا یعنی روستائی ماحول میں اس دہقان لڑکی کو چاہنا۔ قطعاً ناممکن ہے۔ اسے کسی بڑے شہر میں لے جانا اور کسی فلیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی یقیناً منتظر کسک جذبہ ہے۔ اسے شہر میں لا کر رکھا تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کر رہ جائے گا اور دنوں ہی میں غائب بھی ہو جائے گا شہر میں اس کی سادگی اور اس کا گنوار پن اس قدر نمایاں ہو گا کہ اسے بعض کمرے میں چھپا کر رکھنا پڑے گا۔ جس سے چوری چھپے دل بہلا لیا جائے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ایک سبزی مائل تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا ان خیالات میں محو تھا اور یہ سب باتیں اس پر روشن تو ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میگن کا بازو اس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ نیچے کھسکا جا رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے۔ میگن کا چہرہ اوپر تک رہا ہے۔ اس کی کھوئی ہوئی نظروں میں ایک التجا ہے۔ اور اس کے سیاہ بال بھیگے ہوئے ہیں۔ اس تصور نے دل میں بیچ کا ڈر دیئے پھر خدا سے دل سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہ خیال اسے دور کرتا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے قریب ایک غار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل بہل جائے اور یہ بخار اتر جائے۔ کپڑے اتار دیئے اور تیر کر وہ نکل گیا۔ چاہتا تھا تھک کر چور ہو جائے تاکہ حواس سن ہو جائیں۔ اس لئے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے۔ پھر دفعتہً بغیر کسی وجہ کے اسے خوف سا معلوم ہوا فرض کرو وہ واپس ساحل تک نہ جا سکا اور سمندر کی ندا اسے بہا کر لے گئی۔ یا بیلی ڈسے کی طرح اس کے پیچھے اینٹھ گئے تو کیا ہو گا؟ یہ سوچ کر وہ واپس پلٹا۔ سرخ رنگ کی چٹانیں بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ ڈوب گیا تو کسی کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑے گی۔ بیلی ڈسے اور اس کی بہنوں کو تو خبر مل جائے گی۔ لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پائے گا۔ فارم کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے۔ فل بیلی ڈسے کے الفاظ پھر یاد آئے۔ "کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے ہی شاید ——— بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے!" مجنونانہ خوف کے اس لمحے میں اس نے قسم کھائی کہ میگن کی طرف سے اپنا ضمیر صاف رکھوں گا۔ لیکن خوف جاتا رہا۔ اطمینان سے تیرتا ہوا ساحل پر آن پہنچا۔ دھوپ میں جسم سکھایا اور کپڑے پہن لئے۔ اس کا دل زخمی تھا لیکن وہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ جسم خنک اور تر و تازہ ہو گیا تھا۔

ایشرسٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جب واپس بیلی ڈسے کے کمرے میں پہنچا اور چاشتہ پر خوب پیٹ بھر کر کھا لیا۔ تو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک بخار آیا تھا جو اب اتر چکا ہے۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم ہوتی تھی۔ چائے۔ توس اور [illegible] کا مربہ۔ غرضیکہ ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا۔ تمباکو کی خوشبو [illegible] اتنی اچھی معلوم ہوئی

[illegible] کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا رک جاتا۔ کبھی اس چیز کو دیکھتا کبھی اس کو چھوتا پھر سٹیلا کے سینے پر ڈھلکی ہوئی ارغوانی ٹائی کی [illegible] اور عنابی رنگ۔ ریشم کی ملائم [illegible] کو مس کرتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں ایک تھیلی تھی۔ جو کسی خوشبودار بوٹی سے بھری ہوئی تھی۔ اسے سونگھ کر وہ پھر پیانو کے پاس جا بیٹھا اور ایک انگلی سے مختلف سُر بجاتا رہا۔ پھر سوچنے لگا۔ کل پھر وہ بجائے گی۔ اور میں پاس بیٹھا اسے دیکھتا رہوں گا۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جو کتاب اسٹیلا نے اس کے پاس لاکر رکھ دی تھی وہ بھی پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا لیکن میگن کی اداس شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی میں سے جھانک کر باغیچے میں جو [illegible] رہے تھے۔ ان کو [illegible] اور سمندر کا نظارہ کرتا رہا جو درختوں کے نیچے نیلا نیلا اور خواب آلود نظر آ رہا تھا۔ ایک ملازمہ اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی لیکن وہ دیر تک وہیں کھڑا شام کی چھاؤں کا لطف اٹھاتا رہا اس کوشش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں پھاٹک میں سے اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ سٹیلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے فل اور فل کے پیچھے چھوٹی لڑکیاں اپنی اپنی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایشرسٹ اضطراراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا اور ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے سحر کو محسوس کرکے چڑتا تھا۔ لیکن ان کی پُرسکون معصومیت اور سٹیلا کی دید سے مستفید ہونا چاہتا تھا۔ پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا کہ سٹیلا اندر داخل ہوئی۔ لیکن کچھ گھبرائی سی جیسے کوئی [illegible] ہوئی ہو۔ پھر ایشرسٹ پر نظر پڑی۔ مسکرادی۔ اس کا تبسم بجلی کی طرح سریع اور درخشاں تھا جس سے ایشرسٹ کو مسرت بھی ہوئی اور [illegible] بھی [illegible]۔

"فرینک تم نہ گئے نا؟"

"ہاں آ تا ہی نہ ہو سکا۔"

"دیکھو ہم کیسے جنگلی کے پھول چن کر لائے ہیں۔ اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے۔" سٹیلا نے پھول آگے بڑھا دیئے۔ ایشرسٹ نے انہیں سونگھا۔ دل میں مبہم سی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یک لخت مر بھی گئیں۔ میگن کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ اوپر تک رہی تھی۔ راہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "بہت خوبصورت ہیں" اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور بستر پر جا گرا اور دونوں بازوؤں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ [illegible] چکنے کے بعد۔ میگن کو چھوڑ چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ قسمت نے یہ کیا ظلم کیا کہ انہیں یہاں لے آئی اور اس کے اولین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھایا کہ یہ عشق اوباشی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سٹیلا کا کیا حق تھا کہ اس کا لذیذ مجرب حسن اسے یقین دلا سکے کہ میگن سے کبھی شادی نہیں کرے گا اور اس کے عشق کو مذموم ثابت کرکے اس کا دل تاسف اور حسرت اور رحم سے بھر دے۔ میگن بیچاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہوگی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہوگی کہ ایشرسٹ پہلے سے پہنچ گیا ہوگا۔ تاسف اور حسرت سے بے تاب ہو کر ایشرسٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اداس اور چپ چپ [illegible]

حالانکہ دیکھ کر بچے بھی پژمردہ ہو گئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے اس لئے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کے وقت جب کئی روز گذشتہ کی بار ایلشرسٹ کی سٹیلا سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پریشان اور مجروح نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایلشرسٹ گھبرا گیا تھا اس لئے بس یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رات بھر بے چین رہا۔ صبح بہت سویرے اٹھا اور باہر نکل گیا ساحل سمندر کے پاس ہی بیٹھ کر تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے درخشاں سمندر کو دیکھ کر اس کا دل تھوڑے ہی سنبھلا۔ مگر اس نے سمجھا کہ سٹیلا بہت ہی معصوم ہے ہفتہ دو ہفتے میں بھول بھی جائے گی۔ باقی رہا وہ خود تو اسے اپنی پاکبازی کا صلہ ملے گا! نیک رہا! سٹیلا کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اس ضبط نفس کو کس قدر سراہے۔ مجھے شیطان کی قائل ہے۔ وہ شیطان کو نیچا دکھایا یہ خیال آیا تو ایک گرم قہقہہ لگایا۔ لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے متاثر ہو کر اس کا غرور کم ہونے لگا۔ نہایا اور گھر کو چلا

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری اسٹول پر بیٹھی تصویر بنا رہی تھی چپکے سے اس کے پیچھے جا کر دیکھا وہ کس قدر حسین ہے۔ جسم آگے جھکائے۔ مو قلم ہاتھ میں تھامے۔ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہے۔

بڑے ملائم لہجے میں بولا

"سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی۔"

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی حسب عادت جلد جلد بولی

"اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ بات ہو گی۔ لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے ہے نا؟"

ایلشرسٹ نے جواب دیا۔

"ہاں دوستوں میں ـــ تو ہم آپس میں دوست ہیں نا؟"

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برق صفت سرخ لب اور درخشاں تبسم سے اس کے چمکتے دانت پھر دکھائی دینے۔

تین دن کے بعد ایلشرسٹ ان لوگوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھتا تو کیا لکھتا؟

اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی ....

یہی وہ واقعات تھے جن کی یاد اب ایلشرسٹ کے دل میں جبکہ وہ اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ کے دن گورکس کے چرچ کی دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو رہی تھی۔ جہاں اب پہنچ پر رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہوگا جہاں میگی اسے پہلی دفعہ آسمان کے بلند بادل کھڑی دکھائی دی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس مقام اور

بیٹھا رہے مجھی ہوتے والے مرغزار کو پھر جا کر دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگے گا۔ سٹیوا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

خچر کی پروا چھوڑ کر وہ درختوں کا جھنڈ اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان اسے اچھی طرح یاد تھی۔ اقدام کے دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔ وہ پتھر کی تپی عمارت، پرانے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے بالکل ویسے کے ویسے تھے دھوپ اسی رنگ کی ہلکی سی بھی ویسی ہی کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی۔ جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لی تھی پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سونگچی ادھر ادھر پھر رہا تھا گویا پچیس چھبیس سال گزر چکے ہیں یا محض کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگن اس کا انتظار کر رہی ہے؟ خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دنیا میں واپس آ گیا پھاٹک کھول کر باغیچے میں داخل ہوا اور خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کنارے تک جا پہنچا جہاں وہ پرانا سیب کا درخت کھڑا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا! بلکہ ٹہنیوں کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے سوا اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے۔ جب میگن کے بھاگ جانے کے بعد وہ ٹیک دے کر اسی کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا اور اس کی خوشبو سے جو جس سے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے ایک ککو کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سا تالاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت نہایا کرتا تھا اور پانی اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ دیران مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا۔ ساحل کے پاس وہی پتھر جہاں بیٹھے تھے جیسی ہی آن کر بیٹھتا ہے۔ گم گشتہ شباب کا خیال آیا، عشق کی بربادی کا خیال آیا کس بے دردی سے اس کی شیرینیوں کو ضائع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس ایک ہوک اٹھی جس نے ایشرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس غیر فوت حسن سے بھری ہوئی دنیا میں انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جو مسرت اسے حاصل ہو اسے دل سے جانے ہی نہ دے۔ جس طرح یہ زمین یہ آسمان جدا نہیں ہونے دیتے؟ لیکن انسان بے بس ہے!

ندی کے کنارے پہنچا تو اس جھرنے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا شباب اور بہار کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے پھر یکلخت ڈر گیا کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا اور کسی سوچ میں کھویا ہوا پھر اسی چوراہے پر جا پہنچا۔

موڑ کے پاس ایک گورے بڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شوق سے باتیں کر رہا تھا۔ ایشرسٹ کو دیکھ کر وہ یکلخت رک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور تعظیماً ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہو لیا۔

ایشرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟"

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دل میں کہہ رہا ہے۔ "مجھ سے بہتر تمہیں بتانے والا اور کون مل سکتا ہے؟ بھلا!" یہ ایک قبر ہے۔"

"لیکن یہاں کیوں؟"

بڈھا مسکرا دیا۔ "یہ بھی داستان ہے جو میں کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ ڈھیری کیسی ہے۔ ہم لوگ اسے دوشیزہ کی قبر کہتے ہیں۔"

ایلفرسٹ نے تماکو کی تھیلی آگے بڑھادی۔ "پائپ بھر لو۔" بڈھے نے اپنی ٹوپی کو چھوا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی مٹی کا پائپ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو جھریوں اور بالوں میں سے اوپر کو تک رہی تھیں ابھی چمک باقی تھی۔

"جناب اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ٹانگ دکھ رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اسی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔

"اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھول پڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسی تنہائی بھی نہیں یہاں۔ اب تو جب سے یہ موٹروں کا جھمیلا شروع ہوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گزرتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی اور بات تھی۔ اب تو یہاں چہل پہل رہتی ہے۔ اس بے چاری نے خودکشی کرلی تھی۔"

ایلفرسٹ نے کہا۔ "سمجھ گیا۔ یعنی تو چوراہے میں دفن ہے۔ میرا خیال تھا اب یہ دستور نہیں رہا۔"

"مگر یہ تو بڑے عرصے کی بات ہے۔ ان دنوں یہاں کا پادری بڑا خدا ترس شخص تھا۔ اگلے مکلمس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائیں گے۔ اور جب یہ واقعہ ہوا اس وقت میں پچاسویں برس میں تھا۔ اب تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں جسے اس کا حال مجھ سے بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی فارم میں جہاں مسز نیرو کومب کے ہاں کام کیا کرتا تھا اب وہ فارم جیک نیرو کومب کے پاس ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے ہاں بھی متفرق کام کرلیتا ہوں۔"

ایلفرسٹ پھاٹک کے سہارے کھڑا پائپ سلگا رہا تھا۔ دیا سلائی بجھ گئی۔ لیکن ایلفرسٹ نے دیر تک خمیدہ ہاتھوں کو چہرے کے سامنے سے نہ ہٹایا۔

اس نے کہا۔ "اچھا!" لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔

"وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! جب میں گزرتا ہوں یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی گو انھوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا۔ نہ وہیں دفنایا۔ جہاں وہ خود چاہتی تھی۔"

بڈھا ذرا دیر ٹھیر گیا اور اپنا بالوں والا لاغر ہاتھ کھول کر اس ڈھیری پر بلیو بل کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔

ایلفرسٹ نے کہا۔ "اچھا!"

بڈھے نے کہا۔ "بس یوں سمجھیے کہ کسی سے عشق ہو گیا تھا اس لڑکی کو۔ گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے لیکن میرا خیال ہے کہ اسے کسی سے عشق تھا۔"

قبر پر ہاتھ پھیرا۔ "مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی۔" اس نے نظر کو اوپر اٹھایا۔ اور ایلفرسٹ نے جس کے ہونٹ اس کی داڑھی کے بالوں میں چھپے ہوئے تھے لیکن پھڑک رہے تھے کہا۔

"اچھا؟"

"معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہی موسم تھا جب یہ یا ذرا چند دن بعد ہوگا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ قدم میں ایک لڑکا نوکر رکھا گیا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ اپنا ذرا سا کام کرتا رہتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ ہم نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے کہ اسی نے اس لڑکی کا سر پھرا دیا تھا۔"

بڈھے نے پائپ منہ سے ہٹایا۔ زمین پر تھوکا۔ پھر بولا۔

"بات یہ ہوئی کہ وہ لڑکا ایکا ایکی یہاں سے چل دیا اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھیلا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک قدم میں پڑی ہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا ہوں کہ اس نے اپنی چیزیں منگوائی کیوں نہیں۔ ایلبرٹ یا ایسا ہی کچھ نام تھا اس لڑکے کا۔"

ایلبرٹ نے پھر کہا۔ "اچھا!"

بڈھے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس دن سے اس لڑکی کے ہونٹوں پر تو جیسے مہر لگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے حواس بجا نہ ہوں۔ نہ تو کچھ دیوانی سی ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ قدم میں ایک دوسرا لڑکا تھا۔ جو تھی۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ میں بھی لڑکی اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات میں شام کے وقت بچھڑوں کو سنبھالتا تو وہ لڑکی باغیچے میں بیٹھے سیب کے درخت کے پاس کھڑی ہوتی۔ اور بالکل سامنے تک رہی ہوتی۔ میں دل میں کہتا کہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے لیکن تمہاری حالت زار ہے۔"

بڈھے نے اپنا پائپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایلبرٹ نے کہا۔ "اچھا؟"

"ایک دن مجھے یاد ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میگن تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔ (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اور اس کی خالہ بڑھی مسز نیرڈ کو سب دو توں دیلز سے آئی تھیں) میں نے کہا تمہیں ضرور کوئی دکھ ہے۔ کہنے لگی نہیں جم مجھے کسی چیز کا دکھ نہیں۔ میں نے کہا دکھ کیسے نہیں۔ ہے اور ضرور ہے۔ کہنے لگی نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے۔ میں نے کہا پھر تم ملتی کیوں ہو؟ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائے گا۔ پھر کہنے لگی۔ جم اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے اس سیب کے درخت تلے دفن کیجئو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا تمہیں کیوں کچھ ہونے لگا۔ پگلوں کی سی باتیں منہ سے نہ نکال۔ وہ بولی نہیں میں پگلوں کی سی باتیں نہ کروں گی۔ میں نے دل میں سوچا لڑکیوں کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی چنانچہ اس بات کا خیال میں نے دل سے نکال دیا لیکن دو دن کے بعد کوئی شام کے چھ بجے میں بچھڑوں کو لئے آ رہا تھا کہ میں نے ندی میں سیب کے درخت کے پاس کالی سی کوئی چیز پڑی دیکھی۔ میں کہا سمندہ ہے۔ پھر خیال آیا یہ بھی کوئی سور کے بیٹنے کی جگہ ہے۔ قریب پہنچا تب معلوم ہوا کہ کیا ہے؟"

بڈھا رک گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو تک رہی تھیں۔ نظر میں چمک تھی اور دکھ بھرا تھا۔

"ندی میں ایک چٹان ہے۔ اس میں رک کر پانی کا ایک تالاب سا بن گیا ہے۔ وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر پہلے اس لڑکے کو ایک دو مرتبہ نہاتے بھی دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں اوندھی پڑی تھی۔ اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کا نشان تھا

جیسے سنہری پھولوں کا ایک پودا اگ رہا تھا۔ چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا حسن آگیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی طرح معصوم اور خوبصورت تھا۔ جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ اسے دفنانا یا اڑا دینا تو ناممکن ہے۔ اور سچ پوچھو تو اس کے چہرے سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زار و قطار رو دیا۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ جون کا مہینہ تھا کسی نے سیب کے شگوفے کی ایک آدھ ٹہنی کہیں سے مل گئی تھی یا اسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اسے شادی کی امنگ ہوئی تھی۔ صرف اس بات کا ڈر تھا کہ کیوں مرتی۔ اور پھر پانی بھی تو ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن میں آپ سے کیے دیتا ہوں کہ یہ جنگل بھید کی جگہ ہے۔ پہلے بھی معلوم ہے اسے بھی معلوم تھا۔ اور کوئی کہے کہ سمجھداری نہیں۔ تو میں کبھی نہ مانوں۔ میں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ سیب کے درخت تلے دفن ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سن کر لوگ اور بھی خلاف ہو گئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اگر یہ بات ہے تو ضرور خودکشی کی ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے یہاں دفنا دیا۔ ہمارے پادری کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا۔"

بڈھے نے پھر ڈھیری پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر یک رک گیا۔

"لڑکیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

داد لینے کے لئے اس نے نظر اوپر اٹھائی۔ لیکن ایشرسٹ وہاں سے چل دیا تھا۔ اس طرح کہ گویا اور کوئی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر جہاں لنچ چن رکھا تھا اس سے پرے نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ تو اس کی پاکبازی کا صلہ یہ تھا! یہ عشق کی دیوی سائپرین کا انتقام! اس کی پرنم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جس کے سیاہ بھیگے ہوئے بالوں میں سیب کے شگوفے لگے تھے۔ اور اس نے دل سے پوچھا۔

"میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟" لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات خیز گل ریز مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے اور میگن دونوں کے دل میں۔ لیکن کیا دراصل عشق کو محض کسی کی جان لینا مطلوب تھا! تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر ہے۔ اور "ہپالٹس" کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے
اور اس کے پروں کی چمک سنہری ہے
اور جب وہ جست بھر کر اڑتا ہے
تو کوئی اس کے جادو کی تاب نہیں لا سکتا۔
وہ تمام زندگی جو پہاڑ اور موج اور آب جو میں
شباب اور خود سری سے مست ہے
ہر وہ شے جو سینۂ زمین سے پھوٹتی ہے
یا سورج کی شہابی شعاعوں میں سانس لیتی ہے۔

اماں یہ سب کچھ ہر مرد اور ہر عورت
سب کے اوپر اسے سانپ پر یہ تو حکومت کرتی ہے
صرف تو ـــ
یہ انا سچ کہتا ہے۔ میگن حسرت زدہ سی ہو گئی: پہاڑی سے نیچے اترتی ہوئی! میگن پرانے سیب کے درخت کے نیچے رکتی ہوئی! بیچاری۔ مردہ میگن جس پر حسن کی مہر ثبت ہے!
ایک آواز کانوں میں پڑی۔
"وہاں ہم تم۔ لو آؤ دیکھو!"
ایشرسٹ اٹھا۔ بیوی نے جو تصویر کھینچی تھی، اسے ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔
"فرینک، اس کا پیش منظر ٹھیک ہے؟"
"ہاں"
"لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ہے نا!"
ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کمی! سیب کا درخت۔ موسیقی اور سنہری پھول!"

(کارواں)

ترجمہ: پطرس

نوعِ انسان کی کہانی

دُنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ دھندا ہے۔

ہم کون ہیں؟

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ان سوالات کا جواب افق سے بھی پرے کہیں دور ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اور ہم بہت ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور ہمت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی!

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں کہ اپنے غور و فکر کی بدولت کئی اور باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اس باب میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ غالباً انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کا کیا حال تھا!

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کرۂ زمین پر جان دار اشیاء کا وجود کتنے عرصے سے ممکن ہے، اور مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں کہ جو ننھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی گئی ہے وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسان یا انسان کی طرح کی مخلوق یہاں کتنے عرصے سے رہتی ہے۔

انسان سب سے آخر میں آیا لیکن عقل کے ذریعہ قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے پہلے کیا۔ اسی لئے ہم بلیوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے انسان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے گو اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کرۂ زمین جس پر ہم آباد ہیں شروع شروع میں شعلہ بار مادے کا ایک بہت بڑا گولا تھا اور فضا کے ناپیدا کنار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی مانند اڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح جل چکی تو اس پر چٹانوں کی ایک پتلی سی تہہ نمودار ہوئی۔ ان چٹانوں پر مسلسل موسلادھار مینہ برسا۔ سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو گئے۔ اور گدلا پانی ان وادیوں میں بہہ نکلا جو گرم گرم زمین کی اونچی اونچی

پہاڑیوں کے درمیان جھیلیں بن گئیں

آخر ایک زمانہ ایسا آیا جب سمندر کے بادلوں میں سے پانی برسا اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین کی سطح پر پانی کے چشمے اب سے بن گئے۔ یہی تالاب جیسے مشرقی اور مغربی نصف کرّوں کے عظیم الشان سمندر بن گئے۔

پھر ایک ایسا وقت آیا جب پانی نے جانداروں کو جنم دیا۔

پہلے پہل جاندار رفتہ رفتہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا۔

کئی سال تک یہ زندہ چیز پانی کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ اس عرصے میں رفتہ رفتہ زمین کے ناموافق حالات سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور باقاعدہ زندگی کی مشکلات پر قابو پایا جیسا ہونا ہے۔ پہلے پہل جو مچھلیاں اور جانور تھے ان کی شکلیں گھونگھوں جیسی تھیں۔ پھر پہلی مچھلی پانیوں سے باہر نکلی، اس میں ہڈیاں تھیں اور یہ پودے بن گئے بعض نے کسی جگہ ٹھہرنا سیکھا اور ابھر کر سطح پر آ گئے۔ ان کے جسم میں سے پھیپھڑوں کی سی چیزیں نمودار ہوئیں۔ اور وہ سمندر کے پانی سے نکل کر خشکی اور تری کے درمیان جو جل مچھلیاں تھیں ان سے مشابہ تھے۔ بعض مچھلیاں ایسے تھے جنہیں خوراک کی تلاش میں ادھر ادھر جانا پڑا۔ ان کی بدولت سمندر رفتہ رفتہ مچھلیوں سے آباد ہو گیا۔

اس عرصے میں پودوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں جب نئے نئے جگہیں تلاش کرنی پڑیں۔ وہ دور دراز تک پھیل گئے اور پہاڑوں کے دامن میں کیچڑ اور دلدلوں کے اندر سکونت اختیار کی۔ ان میں جو دو قدم چلنے کی وجہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن باقی تمام وقت بڑی بڑی چٹانوں سے ہمیشہ الجھتی ہوئی جو زمین کی سطح کو چھوتی تھی۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے کئی صدیوں کی تربیت کے بعد اس قابل ہوئے کہ کسی طرح پہلے پانی میں رہتے تھے۔ ایسی نسلوں کے ساتھ اب ہوا میں سانس لینے لگے۔ بڑے درخت اور جھاڑیاں [illegible]۔ اور پھول پیدا ہونا سیکھا۔ جب پھول اُگے تو بھونرے اور رس چوسنے لگے۔ پرندے چہچہانے لگے۔ یہاں تک کہ سبزے نے اپنی چادر پہاڑی اور بڑے بڑے درختوں نے اپنے سائبان پھیلا دیے۔

بعض مچھلیوں نے بھی سمندر سے باہر قدم رکھا اور گلپھڑوں کی بجائے پھیپھڑوں سے سانس لینا سیکھا۔ ایسے جانوروں کو ذوحیاتی کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خشکی اور تری دونوں جگہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ کسی مینڈک سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ ذوحیاتی جانور کس طرح سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

جب ایک دفعہ پانی سے باہر نکل آئے تو یہ جانور رفتہ رفتہ خشکی ہی کے ہو کے رہ گئے۔ بعض نے رینگنا سیکھا اور سنسان جنگلوں میں کیڑے مکوڑوں کے ساتھ رہنے لگے۔ نرم نرم زمین پر تیزی سے چلنے کی خواہش پیدا ہوئی تو رفتہ رفتہ ٹانگیں بڑی ہو گئیں۔ ساتھ ہی جسامت بھی بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا بڑے بڑے جانوروں سے آباد ہو گئی۔ علم حیوانات کی کتابوں میں دفتیا سورس (Ichthyosaurus) میگا لوسورس (Megalosaurus) اور برانتو سورس (Brontosaurus) نامی جانوروں کا ذکر آتا ہے جو تیس تیس چالیس چالیس فٹ لمبے تھے اور کشتیوں سے اس طرح کھیل سکتے تھے جس طرح بلی اپنے بچوں سے کھیلتی ہے۔

ان رینگنے والے جانوروں میں سے بعض جانور درختوں پر جا چڑھے اور وہیں رہنے لگے۔ درخت ان دنوں سو سو فٹ سے زیادہ اونچے تھے) چنانچہ انہیں اس قدر اونچائی تک جانا پڑتا۔ لیکن ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پہنچنے کے لیے اپنی جلد کی جھلی

چھپکلیاں اور مینڈک پنجوں کی انگلیوں کے درمیان اس ناخن سے اس ناخن تک چمگادڑ کی طرح پردہ بنا لیا۔ پھر اس کھال کو پر بنا لئے دھیرے دھیرے ترشنے لگے ان کے بال اڑ گئے اور ان کے پنکھے پر نکل آئے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بڑے عظیم الجثہ ریپٹائل جانور سب کے سب مر گئے۔ اس کا سبب آج تک معلوم نہیں ہو سکا شاید آب و ہوا یک لخت تبدیل ہو گئی۔ یا شاید بھوک سے مر گئے کیونکہ یہ بہت ممکن ہے وہ اتنے بڑے ہو گئے ہوں کہ زندہ رہنے کے قابل نہ رہے ہوں نہ چل سکے نہ دوڑ سکے۔ اور بڑے بڑے پودے اور درخت سامنے رکھے رہے ہوں لیکن وہاں تک پہنچ نہ سکے ہوں بہرحال بڑے بڑے ریپٹائل جانور دس لاکھ سال تک اس دنیا پر مسلط رہے اور پھر یہاں سے چل بسے۔

ان کی جگہ بالکل ہی مختلف جانوروں نے لے لی۔ یہ انڈے تو ابھی دیتے تھے ریپٹائل جانوروں کی طرح لیکن ان میں بڑا فرق یہ تھا کہ اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلاتے تھے اس لئے انہیں دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں۔ مچھلیوں کے سے پر ان کے جھڑ چکے تھے۔ پرندوں کے سے پر نہ تھے بلکہ ان کی کھال پر بال آ گئے۔ آہستہ آہستہ ان دودھ پلانے والے جانوروں نے بعض ایسی عادات سیکھیں جن کی بدولت ان کی نسل کو باقی تمام جانوروں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ جیسے بچے پیدا ہوتے تو وہ اپنے انڈے جسم کے اندر ہی اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ باقی سب جانور اپنے بچوں کو گرمی اور سردی کے رحم پر چھوڑ دیتے لیکن دودھ پلانے والے جانور بہت مدت تک اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے اور جب تک وہ طاقت ور ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جاتے ان کی حفاظت کرتے۔ اس طرح دودھ پلانے والے جانوروں کے بچے کئی باتیں اپنی ماں سے سیکھ لیتے اور زیادہ آسانی سے زندہ رہ سکتے۔ کسی بلی کو دیکھو کس طرح بچوں کو اپنی حفاظت کرنا اور منہ دھونا اور چوہے پکڑنا سکھاتی ہے۔

لیکن ان دودھ پلانے والے جانوروں کے حالات بہت تفصیل سے بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں۔ باہر ہیں اور گھر پر تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور جو اتنے عام نہیں انہیں تم چڑیا خانے میں جا کر دیکھ سکتے ہو۔

ان بے شمار جانوروں میں سے ایک جانور نے باقی سب سے الگ ایک راستہ اختیار کیا۔ عقل و شعور سے کام لیا اور اس کی بدولت زندگی کی کشمکش میں اپنی نسل کی رہنمائی کی۔ یہ جانور انسان کہلایا۔

تھا تو یہ بھی دودھ پلانے والا جانور لیکن خوراک مہیا کرنے اور جان بچانے میں سب سے ہوشیار تھا۔ پہلے اگلی ٹانگوں سے شکار پکڑنے کی عادت ڈالی۔ رفتہ رفتہ پنجے کی شکل ہاتھ کی سی بن گئی۔ پھر بے انتہا کوششوں کے بعد پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھا (یہ کرتب اب بھی کچھ ایسا آسان نہیں۔ انسان دس لاکھ سال سے اس کا عادی ہے پھر بھی بچے کو یہ از سر نو سیکھنا پڑتا ہے)

پہلا انسان دیکھنے میں کچھ بندر، کچھ بن مانس سے ملتا جلتا تھا لیکن ذہانت میں دونوں سے بڑھ کر تھا۔ شکار میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ ہر قسم کی کھانے کی چیزیں ڈھونڈ لیتا تھا۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا تو حفاظت کی خاطر ہم جنسوں کی ایک ٹولی بنا کر سفر کرتا۔ بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ کئی لاکھ سال بعد انہی آوازوں سے گفتگو کرنا سیکھا۔

تمہیں یقین کرنا مشکل ہے ایسا کہ ہم تم سب اسی جانور کی اولاد ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔

وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا

میں انسانی زندگی کی بھول بھلیوں پر جس قدر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے کہ جس طرح قدیم عہد کے لوگ بخشش اور نجات کے لئے مجسّس اور متقیوں کا دامن پکڑتے تھے اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رحم کا دامن پکڑنا پڑتا ہے

طنز اور رحم سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری راہنما نہیں ہو سکتی۔ طنز سے زندگی کے ہر موڑ پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور رحم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بناتا ہے

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں۔ وہ محبت اور حسن کا مضحکہ نہیں اڑاتا۔ وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے اس کا تبسم دشمن کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پر ہنسو ان سے نفرت مت کرو۔ کیونکہ یہ کمزوری کی نشانی ہے۔

ایک بہت بڑے فرانسیسی کے ان دانش مندانہ الفاظ پر میں اس کتاب کو ختم کرتا ہوں اور رخصت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

ماخوذ از کتاب: نوع انسان کی کہانی۔ مصنف ہنڈرک وان لون

ترجمہ پطرس

بچے کا پہلا سال

ایک زمانہ تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے۔ جب تک بچہ کچھ بولنا شروع نہ کرتا۔ اسے صرف ماں یا دایہ کی زیر نگرانی رکھا جاتا تھا۔ اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ صنف نازک بچے کے نیک و بد کو ایسی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن فی الحقیقت لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پاتے کہ مر جاتے اور جو زندہ رہتے۔ ان میں سے کئی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی۔ غلط تربیت کی وجہ سے خوفناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی۔ یہ حقیقت ابھی حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے ماں کی ممتا اور بچے کے لاڈ سے پیار کا جو دلاویز تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ نادان محبت اور لاڈ پیار دو چیزیں ہیں۔ اصل محبت وہ چیز ہے جو والدین کو اپنے بچوں سے ہے۔ اور اصل محبت ہے وہ ان کی تربیت کے لئے سائنس کے اصول پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ اس قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ یا جو دوسروں کی مانند اپنے بچوں کو کسی تیم کے موقع کو نہیں چاہتے۔ بہرحال تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متنفر ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان پڑھ لوگوں میں بھی سائنس کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی اموات روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری احتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہت بہتر ہوگی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر لوگ ہیں وہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے۔ اور ان پر اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کما حقہ خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں حارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر چند کہ جسمانی صحت پہ بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے تاہم اس موقعے پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آ سکیں۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکھنا پڑتا ہے۔ اور بعض بچے تو دیر ہی سے اسی لئے ہاتے ہیں کہ تنفس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش بچہ فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور

وہ بچہ مشکل سے اٹھتا ہے جب تک کہ اس عمل میں مصروف رہے بہت خوش رہتا ہے۔ باقی تمام وقت وہ ایک تحریک کے عالم میں گذارتا ہے جس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اعصاب کا بیشتر حصہ غیر مستعمل پڑا رہتا ہے۔ بچوں کے جسم بہت جلد بدل جاتے ہیں۔ بعض باتیں (مثلاً دودھ پینا وغیرہ) تو عمر کے ساتھ خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے بچہ ان باتوں کا مستحق رہتا ہے جن پر کچھ عرصہ بعد وہ بعض چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا عادی ہو جاتا ہے ان کو چھوڑنا مشکل ہے کیونکہ عادات پختہ بن جاتی ہیں۔ مثلاً چند بچے ایسا کرتے ہیں کہ ہر نئی چیز سے وہ خائف ہوتے ہیں اگرچہ اس عمر میں بچے کے لئے قابل ہوتا ہے کہ بڑوں کی طرح اپنی پسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کر سکے اس عمر میں سب ہم بہت سی نئی باتیں سیکھ کر سیکھتے ہیں۔ ہم شیر خوار بچے نئی عادتیں بہت جلد اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت پڑ جائے تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیر خواری کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے۔ مثلاً شیر خوارگی کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہوتی ہے کہ بڑے ہو کر وہ بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اعمال پر اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے جو عادات بعد میں سیکھی جائیں ان میں یہ پختگی کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے زمانۂ طفلی کی عادات خاص طور پر اثر رکھتی ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اوّل اور سب سے مقدم صحت، دوم سیرت۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے اوصاف پسندیدہ ہوں اور جو اپنے گردوپیش سے بہتر اثر حاصل کر سکے۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ صحت اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہی ہیں۔ جو چیز ایک کے لئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے مفید ہے۔ یہاں بحث سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے لئے وضع کریں گے وہی صحت کے لئے بھی مفید ہیں گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تنومند تو ہو لیکن اس کے اخلاق بگڑے ہوں۔ یا نیک سیرت تو ہو لیکن اس کا جسم امراض کا شکار ہو۔

آج کل ہر تعلیم یافتہ ماں جانتی ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہئے اس سے بچے کا ہاضمہ درست رہتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک نہایت معقول وجہ ہے لیکن اس کے علاوہ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیر خوار بچہ اتنا بے عقل نہیں جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں اسے ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ ضرور روئے گا لیکن جب بڑا ہو کر اسی عادت کے زیر اثر وہ ہر وقت روتی صورت بنا کر لوگوں کے گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے چمکارنے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ لوگوں کا یہ سلوک اسے ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور ہمدردی کے جذبے سے معرا سمجھ لیتا ہے۔ اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر اسے حسین بنا دے تو بے جا توجہات اسے بے جا فرمائشات کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت مند لوگوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے ہیں تو پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں جس شخص کی پرورش شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر کوئی اقتدار ہے تو ضدی اور حریص ہوتا ہے اور اگر بے بضاعت ہے تو لوگوں کی معزولی بے توجہی سے گرفتار رہتا ہے اس لئے اخلاقی تعلیم روز اوّل ہی سے شروع کر دینی چاہئے۔ تاکہ نہ غلط توقعات پیدا ہوں۔ نہ بعد میں انہیں مجروح ہونا پڑے۔ اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں بچے کی خواہشات کا شکار ہونے سے اس کے دل میں غصے اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہئے کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں سے بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل بے توجہی برتی جائے مثلاً جو بات صحت کے لئے ضروری ہے اس میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے۔ بچے کو ہوا اور بارش سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو اسے اٹھا لینا چاہئے۔ تاکہ سردی نہ لگے اور وہ بھیگے نہ جائے لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی تکلیف کے رونا شروع کر دے تو اسے رونے دینا چاہئے ورنہ وہ بے جا خدمت کرانے کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور اہتمام کا مظاہرہ ... مناسب ہو وہ کر دینی چاہئے اور

ضرورت سے زیادہ پیار محبت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ بچوں کی پرورش چاؤ چونچلوں سے نہیں بلکہ متانت اور سنجیدگی سے کرنی چاہیے۔ گویا وہ بچہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا انسان ہے۔

بچوں میں بڑوں کی سی عادتیں تو پیدا نہیں ہو سکتیں لیکن ہمیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ان کی عادت کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ تاکہ بچہ مزاج دار نہ بن جائے۔ ورنہ بعد میں سخت مایوسی کا سامنا ہوگا اور اگر دیکھئے تو وہ خود بھی اس قابل نہیں کہ اس میں اس قدر اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

بچوں کی پرورش میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ والدین کو فضلت اور لاڈ کے بیچ میں رہنا پڑتا ہے۔ بچے کی صحت کو درست رکھنے کے لئے ہر وقت اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے، اور اس کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ وجہ ہے کہ والدین کو بچے سے بہت زیادہ الفت ہو جاتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ جہاں والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے وہاں اکثر ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے۔ ان کے نزدیک اولاد کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اگر احتیاط نہ برتی جائے تو بچہ بھی اس بات کو محسوس کرنے لگتا ہے اور جتنا اہم اسے والدین سمجھتے ہیں اتنا ہی اہم وہ بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہے جب اسے خود بینی کی عادت پڑ جاتی ہے اور جب بڑے لوگ والدین کی طرح اس کی خوشامد اور آؤ بھگت نہیں کرتے تو اسے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف پہلے سال بلکہ بعد میں بھی جب کبھی بچہ بیمار ہو والدین خندہ پیشانی اور بظاہر بے فکری کے ساتھ اس کا علاج کریں۔ اور بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔

پرانے زمانے میں بچوں کو جکڑ کر بھی بہت رکھا جاتا تھا اور ان سے لاڈ بہت کیا جاتا تھا۔ ان کے اعضاء کو حرکت کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تھا کپڑے ضرورت سے زیادہ گرم ہوتے تھے فطری حرکات پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو ہر وقت گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ان کے سامنے گانے گاتے پھرتے تھے۔ اور انہیں چوبیس گھنٹے چرا چاپی کا تختۂ مشق بنائے رکھتے تھے۔ یہ بہت غلط طریقہ تھا اس سے بچے بگڑ جاتے تھے اور ہر وقت ماں باپ کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ نہ بچے کی فطری حرکات و خواہشات پر پابندیاں عائد کیجئے نہ اسے ان سے تجاوز کرنے دیجئے۔ بچے کے لئے آپ جو تکلیف اٹھاتے ہیں اس سے بچے کو بے خبر رہنا چاہیے۔ قدرت کو اپنا کام بطور خود کرنے دیجئے جہاں تک ممکن ہو ایسی کامیابی کا لطف اسے ضرور اٹھانے دیجئے جو خود اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہو۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچے کو خارجی قواعد و ضوابط کی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود بچے کے دل میں انضباط کا احساس پیدا کیا جائے۔ اس احساس کا پیدا کرنا عمر کے پہلے سال میں نسبتاً آسان ہوتا ہے مثلاً جب بچے کو سلانا ہو تو اسے گود میں نہ لینا چاہیے، بازوؤں میں تھام کر "سو جا سو جا" نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس کے پاس تک نہ ٹھہرنا چاہیے۔ اگر آپ ایک مرتبہ یوں کریں گے تو بچہ دوسری مرتبہ بھی یہی چاہے گا اور تھوڑے عرصہ میں بچہ کا سلانا ایک مصیبت بن جائے گا۔ بچے کو اٹھا لٹا کر بستر میں سلا دینا چاہیے اور ایک دو باتیں کر کے اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ چند منٹ تک روتا رہے لیکن اگر وہ بیمار نہیں تو تھوڑی دیر میں خود بخود چپ ہو جائے گا۔ اس کے بعد جا کر دیکھئے تو مزے کی نیند سو رہا ہوگا۔ لاڈ پیار سے ایک تو اس کی سیرت بگڑ جائے گی۔ دوسرے وہ سوئے گا بھی کم۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نوزائیدہ بچہ ماں کے پیٹ سے کوئی عادت ساتھ نہیں لاتا اس کی عادات فطری اور اضطراری ہوتی ہیں چنانچہ اسے اشیاء کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اشیاء کے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ اشیاء کو پہچانے اور اشیاء کو پہچاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیاء کا بار بار تجربہ ہو۔ سو وہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوتا ہے پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد بچہ پنگوڑے کے مس، ماں کی چھاتی یا دودھ کی بوتل کے مس اور خوشبو اور ماں یا دائی کی آواز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ماں یا پنگوڑے کو دیکھنے کی قابلیت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نوزائیدہ بچے کی آنکھیں ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ

وہ اشیاء کی شکلوں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ جب رفتہ رفتہ مختلف احساسات کے اختلاف سے بچے کے ذہن میں عادت واضح ہو جاتی ہیں تو حس اور بعد
نزولی حرکات ذہن میں اشیاء کے تصورات تشکیل پذیر ہونے لگتے ہیں۔ خاص خاص احساسات اس کے دل میں خاص خاص اشیاء کی توقعات پیدا
کرتے ہیں۔ (وہ کسی آواز کی تہ کے بعد آ رہی چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔ جو فاصلہ سے ان کی آواز آتی ہے تو ان کی شکل دیکھنے کا منتظر رہتا ہے وغیرہ وغیرہ) تاہم
کچھ عرصہ تک شناخت اور اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جس بچے کو کبھی بوتل کا دودھ اور کبھی چھاتی کا دودھ پلایا جائے۔ اس کے نزدیک کچھ عرصہ تک
ان دونوں اور بوتل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں جن سے وہ دودھ حاصل کرتا ہے۔ خصوصاً جسمانی ضرورت سے پیدا ہونے والی خواہشات تمام حرکات (جو زیادہ تر کرامات اور
خوراک تک محدود ہوتی ہیں) اور ان کے تمام بچے محض جسمانی ہوتے ہیں۔ ان سب حواس اور اس کی عادات یوں تشکیل پذیر ہوتی ہیں کہ جو چیز اس کے ذہن
میں مسرت سے تعلق رکھتی ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو دکھ سے متعلق ہو اس سے گریز کرتا ہے۔

بچے کا رونا ایک مدت تک ایک اضطراری حرکت ہے جو تکلیف کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے۔ اور ایک حد تک یہ ارادی فعل ہے جو بچہ مسرت
حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ محض دکھ کی وجہ سے روتا ہے لیکن جب اس کو کرنا دیا جائے (پیار کیا جاتا ہے) تو بچے
کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ رونے کے نتائج خوش گوار ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ بچے کی عادت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دکھ دور کرانے کے لئے
روتا ہے بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس حربے کو کام میں لاتا ہے۔ یہ اس کی عادت کا پہلا نتیجہ ہوتا ہے لیکن بالعموم بے اعتنائی کے سبب
تک روتے رہنے دیتے ہیں۔ ابھی وہ رونا شروع ہی کرتا ہے کہ اسے فوراً اٹھا لیا جاتا ہے۔ ہوشیار مائیں اس قسم کے رونے اور اس قسم کے رونے میں بخوبی تمیز کر
سکتی ہیں۔ عقلمندی یہی ہے کہ جب بچہ کو رونے کی عادت ہو تو اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ بچے کو لٹائے رکھنا اور اس سے نپٹتے رہنا یا اس کے سامنے گانا
گانا آسان بھی ہے اور پُر لطف بھی۔ لیکن بہت جلد بچہ اس قسم کی تفریح کا عادی ہو جاتا ہے جو اس کی نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ تیز رفتار بچے کا بیشتر وقت
(سوائے دودھ پینے کے اوقات کے) نیند میں گزرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ بعض والدین کو یہ باتیں سخت معلوم ہوں لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچے
کی صحت اور خوشی کے لئے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔

بچے کے لئے جو تفریحات والدین مہیا کرتے ہیں ان کو ایک خاص حد کے اندر رکھنا چاہیے۔ لیکن جو تفریحات وہ خود اپنے لئے پیدا
کرے ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شروع ہی سے اس بات کا موقع دینا چاہیے کہ وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔ وہ اپنے عضلات کو
کام میں لاسکے۔ پرانے زمانے کے لوگ بچوں کو باندھ کر رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سستی کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ جن بچوں کو کھلا رکھا جائے ان کی نگہداشت
زیادہ کرنا پڑتی ہے اور یہ ہے کہ ان لوگوں کی ماتا بھی ان کی سستی پر غالب نہ آسکتی تھی۔ جب بچے کی نظر ٹھیک ہو جاتی ہے تو اسے متحرک چیزوں کو خصوصاً
جو چمکتی ہوں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ اشیاء کو پکڑنا نہ سیکھ لے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے جب پکڑنا سیکھ
لے۔ تو یہ دائرہ یک لخت وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو محض گرفت ہی کی مشق اتنی مسرت انگیز ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں اسی میں مشغول رہتا ہے۔ کھینچنے
کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ کھینچنے کے زمانے سے قبل پہلے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں پر قابو حاصل کرتا ہے شروع شروع میں پاؤں
کی انگلیوں کی حرکات محض اضطراری ہوتی ہیں۔ بعد میں بچہ یہ دریافت کرتا ہے کہ میں انہیں اپنی مرضی سے بھی ہلا سکتا ہوں۔ اس احساس سے وہ اتنا خوش
ہوتا ہے گویا بہت بڑی مملکت حاصل کر لی ہے کیونکہ انگلیاں سب اپنی نہیں رہتیں۔ بلکہ جسم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر بہت سی چیزیں بچے
کے آس پاس ایسی ہوں جنہیں وہ پکڑ سکے تو اسے دل بہلانے کا بہتر سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بچے کو تفریح بھی ایسی ہی حرکات سے ہوتی ہے جو تعلیم کے
نقطۂ نظر سے ضروری ہیں البتہ گر جانے یا چوٹ لگ جانے یا کسی تکلیف دہ چیز مثلاً چھری یا سوئی کے نگلنے سے اسے بچانا ضروری ہے۔

بچہ تین مہینے کے عرصے میں بچہ، وہ سیکھتا ہے رفتہ تربیت شروع ہوتی ہے لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اتنی لچکدار ہوتی ہے جب وہ دو مہینے میں چلا جاتا ہے بچہ جاگنے والا ہوتا ہے اور ڈھلانے میں سے مزید رہتا ہے۔ انسان کی خوشی کا انحصار اس کی ذہنی قابلیت پر ہے لیکن تین مہینے کی عمر کے بچے کا احساس بچہ کافی تجربہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس لئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ جانوروں کے بچے دنیا میں جس منزل سے شروع ہوتے ہیں قابل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی مسرتیں فطری ہوتی ہیں اور تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر محض جبلت پر تکیہ کرے تو اس کی خوشیوں کا دائرہ بہت تنگ رہتا ہے۔ بچہ اپنی عمر کے پہلے تین مہینے عام طور پر لیٹا رہتا ہے اس کا کھانے پینے میں بھی وقت رہتا ہے۔ اس سے ذہنی طور پر ترقی کرتا ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہو جاتا ہے تو مسکرانا سیکھتا ہے اور اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیاء سے مختلف ہونے لگتے ہیں۔ اس عمر کو پہنچ کر ماں اور بچے میں سوشل تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ اور نہ صرف جانوروں کی مانند بلکہ دوسری طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تحسین و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظاہر ہوئے۔ میز پر ایک وزنی گھنٹی پڑی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اسے اٹھایا اور گھمایا اور پھر فخریہ مسکراہٹ سے سب کی طرف دیکھنے لگا جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ یہ حربہ تعریف اور ملامت کا حربہ ہے۔ بچپن کے تمام تربیتی پروگرام میں اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حربے کو بڑی احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ عمر کے پہلے سال میں بچے کی مذمت بالکل نہ کرنی چاہئے بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ کی اس قدر حد سے زیادہ نہ کرنی چاہئے کہ اس کی قدر ہی جاتی رہے اور اس نجی کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سراہنے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ جب بھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہئے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہئے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمدردی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے محض مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ ہم ذرا کرا سکھاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ باقاعدہ الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی متعین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتے دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ان پر قابو پاتا ہے اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کہ طبیعت کو اکسا نہ سکیں ہم کچھ سیکھتے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہئے کہ ایک دفعہ بچے کو کر کے دکھا دیں۔ مثلاً اس کے سامنے ایک دفعہ جھنجھنا بجا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں۔ وہ محض شوق پیدا کرنے کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے۔ اسے تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سال میں بہت ضروری ہیں۔ نیند، خوراک اور رفع حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہئے۔ گردوپیش کے حالات و واقعات کا مانوس ہونا ذہنی نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے اگر ایک ہی بات بار بار پیش آتی رہے تو بچے کو اسے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ اور یہ محسوس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں

پیار سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے تسکین کی ضرورت ہے اگر اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہر بات پر اس کی ہر گھڑی سراہا جاتا ہے اور کوئی کی بات بگڑنے اس کی زندگی میں خلل نہیں ڈال سکتی۔ تو وہ خوش رہتا ہے۔ ذرا بڑے ہو تو بچے کو نئی باتوں کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن زندگی کے پہلے سال میں ہر نئی بات میں بچہ کو خطرہ محسوس ہوتا ہے جس سے جہاں تک ممکن ہو محفوظ رکھنا چاہیے

اگر بچہ بیمار ہو تو آپ فکر تو اپنا فرض ہی ہے لیکن اس پر ظاہر نہ ہونے دیجئے ورنہ وہ بھی متفکر ہو جائے گا۔ کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیے جس کو بچہ محسوس کرے کہ جیسے بیمار ہو گیا ہے کہ ٹھیک نیند نہ آئے۔ اس کا پیٹ خراب ہو تو بچہ کے سامنے بے پروائی ظاہر کرنی چاہیے۔ اسے یہ احساس نہ ہونا چاہیے کہ اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ورنہ وہ معمولی باتوں میں بھی آپ کی توجہ چاہے گا اور ترغیب کا کوئی بس نہ ہوگا۔ اس بات کا خیال نہ صرف بچے کے پہلے سال کے بعد بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ بچہ بڑا ہو تو اس اصول پر پیش نظر بند ہونا چاہیے۔ بچے کے دل میں یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دینا چاہیے کہ اس کے معمولی افعال مثلاً کھانا پینا جو اس کے لیے مسرت کا موجب ہیں آپ کی ممنونیت کا باعث ہیں۔ اگر اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ خوشامد کا متمنی رہتا ہے علاوہ اسے ایسی باتیں خود بخود بغیر ترغیب کے کرنی چاہئیں۔

یہ بھی خیال مت کیجئے کہ بچے میں اتنی عقل کہاں جو ان باتوں کو سمجھے۔ بچے کے قوا سے کم ہوتے ہیں اور اس کا تجربہ محدود۔ لیکن جہاں یہ کوتاہیاں اس کے رستے میں حائل نہ ہوں وہاں اس کی ذہانت بڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ جو کچھ شروع کے ایک سال میں سیکھتا ہے پھر عمر بھر ایک سال کے عرصہ میں اتنا نہیں سیکھ سکتا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچے کی ذہانت بہت تیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچے کو یہ سمجھ کر پالو کہ ایک دن اسے بڑا ہونا ہے اور دنیا کے کاروبار میں حصہ لینا ہے۔ اس کی موجودہ سہولتوں پر یا اپنی خوشی پر اس کی آئندہ بہتری کو قربان مت کیجئے۔ اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ٹھیک تربیت دینے کے لیے محبت اور علم دونوں کا ہونا ضروری ہے

ماخوذ از کتاب تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں۔

مصنفہ برٹرنڈ رسل ـــ مترجمہ [illegible]

دیہات میں بوائے سکاوٹ کا کام

مکھیوں کا بادشاہ

ایک دن سقراط گاؤں کے اسکول میں آیا۔ سب لوگ اسے جانتے تھے کہ جونہی بچے بچیوں نے اس کی صورت دیکھی ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ پڑھنا لکھنا بھول گیا۔ اور سب کی نظریں دروازے پر گڑ گئیں جہاں بڈھے میاں مسکرا کر بڑے غور سے بچوں کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے کچھ کہے سنے بغیر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ پھر اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں باتیں کرنے لگا: "نہ کسی کے کانوں میں پھنسیاں دیکھیں۔ نہ ناک میں نزلہ، نہ کسی کے چہرے پر میل، نہ کسی کی ناک بہہ رہی ہے، نہ ناخن بڑھے ہوئے ہیں (اوہ، یہ کیا؟ اس بچی کے ناخن تو بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے! لیکن خیر یہ کوئی نئی لڑکی ہوگی) اور ہاں نہ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے، نہ چہرے پر زردی ہے، نہ آنکھیں خراب ہیں، نہ کپڑے میلے ہیں۔ سب کے چہروں پر خوشی اور مسکراہٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصلاح اور ترقی کے لیے جو ہم نے کوشش کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی۔"

چوتھی جماعت کے ایک شوخ لڑکے نے کہا: "بڑے میاں یہ ہم پر منتر پڑھ پڑھ کر کیا پھونک رہے ہو؟"

سقراط یوں چونک اٹھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بولا: "سلام اے لوگو! ہاں میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔"

"تو بڑے میاں! اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ تم خواب دیکھنے کے عادی ہو لیکن ہم تو خواب نہیں دیکھ رہے ہم تو سب جاگ رہے ہیں۔"

"تو پھر عزیزو میرے خوابوں میں سے ایک خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ایک ننھے سے لڑکے نے کہا: "واہ واہ۔ لو اب سقراط میاں ہمیں ایک کہانی سنائیں گے۔"

سقراط کے آنے سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی اپنے شاگردوں کی طرح خوشی سے دمکنے لگا تھا۔ انہوں نے پوچھا: "کہئے آپ کا کون سا خواب سچا ثابت ہوا؟"

"میں چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایسا اسکول دیکھ رہا ہوں۔ جس میں گندگی نام کو بھی نہیں۔ جہاں نہ کوئی بچہ بیمار ہے، نہ کسی نے سونے چاندی کے زیور پہن رکھے ہیں۔ یہی خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ مہینوں سے ہمارے اسکول کی یہی حالت ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیا بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن ہم جلد ہی اسے بھی راہ پر لے آتے ہیں۔"

عین اس موقع پر ایک عورت داخل ہوئی۔ وہ چپ چاپ اور شرمائی ہوئی تھی لیکن تھی چست چالاک اور اکثر یہاں آیا کرتی تھی اس

بستے میں ایک کتاب ہوا کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر سب لڑکے اور لڑکیاں منہ کھول کر ہنستے اور تعجب سے دیکھتے۔ تھوڑی دیر میں سب لڑکے ایک طرف ہو گئے اور سب لڑکیاں دوسری طرف۔ تب اس عورت نے لڑکیوں کو سوئی کا ایک سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ سقراط نے کمرے سے چل جانا چاہا۔ مگر لڑکے اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے اور سب کے سب چلا اٹھے: ”میں، میں بڑے میاں کہاں چل دیئے؟ ٹھہرو تم ابھی نہیں جا سکتے۔ تم پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ ان لڑکوں سے بچ نکلنے کے لیے تم نے کیا کام کرنے کا قصور کیا ہے؟“

سقراط نے کہا: ”یہاں میری ضرورت ہی کیا ہے۔ جو کچھ میں نہیں بتا سکتا ہوں تمہارا استاد اس سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ میں کسی ایسی جگہ جاؤں گا جہاں میری ضرورت ہو۔“

استاد نے کہا: ”نہیں آپ نہیں جا سکتے۔ ہم نے سب کچھ آپ ہی سے سنا ہے۔ کچھ دیر یہاں ٹھہریے اور عقل کی بات بتائیے۔“

سقراط نے کہا: ”میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں استاد تھوڑا ہی ہوں۔“

اسی شوخ لڑکے نے پھر کہا: ”اچھا تو کوئی کہانی ہی سناؤ۔“ کہانی کا نام سنا تھا کہ سب لڑکے چلا اٹھے: ”ٹھیک ہے کہانی، کہانی کہانی۔“

سقراط نے کہا: ”میں کہانیاں وانیاں نہیں سنایا کرتا۔“

اس پر کئی لڑکے بول اٹھے: ”ہم نہیں مانتے۔ تم بچوں والے ہو۔ اپنے بچوں کو تو ضرور کہانیاں سناتے ہو گے۔“

سقراط نے کہا: ”یہ کام میرا نہیں۔ ان کی ماں انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہے لیکن تمہاری ماؤں کو اپنے کام دھندے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔“

اس پر کئی لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا: ”ہرگز نہیں۔ تمہیں ہماری ماؤں پر یہ الزام لگاتے شرم نہیں آتی۔ انہوں نے تو یہ کام برسوں سے چھوڑ رکھا ہے۔“

سقراط نے کہا: ”خوب خوب۔ مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری ماؤں پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے۔ مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے۔“

”معاف تب کریں گے جب تم ہمیں کوئی کہانی سناؤ گے۔“

”اچھا تو سنو۔ ایک تھا گھوڑا بہت ہی بڑا ــــ“

”رہنے دو۔ ہم ایسی بے ہودہ کہانی نہیں سننا چاہتے۔ سنانی ہے تو کسی کام کی کہانی سناؤ۔“

”دیکھو میاں سقراط! عقل کے ناخن لو اور ہمیں اچھی کہانی سناؤ جس میں بادشاہ ہوں، شہزادے اور شہزادیوں کا ذکر ہو۔ اگر تم چاہو تو ایسی کہانی سنا سکتے ہو۔“

”اچھا تو سنو۔ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست پر حکومت کرتا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ جہاں بادشاہ کا پسینہ گرتا وہاں رعایا اپنا خون بہانے کو تیار ہو جاتی۔“

لڑکوں نے کہا: ”اب آئے نا راہ پر۔ ہاں تو پھر کیا ہوا؟“

”اس چھوٹی سی ریاست سے ملی ہوئی ایک بہت بڑی ریاست تھی جس پر ایک بہت ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ اس بادشاہ کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس چھوٹی ریاست پر قبضہ جمالوں۔ اس چھوٹی ریاست کے بادشاہ کے ہاں کوئی بیٹا تو نہ تھا ہاں ایک بہت خوب صورت بیٹی تھی۔ بڑے بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میرے بیٹے کی شادی اس چھوٹے بادشاہ کی بیٹی سے ہو جائے تو بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت پر میرا قبضہ ہو جائے گا۔

لیکن چھوٹا بادشاہ اور اس کی رعایا اس کی نیت سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کرنے

سے انکار کیا۔ اس پر بڑا بادشاہ بہت ہی جھنجھلایا اور اپنے امیروں وزیروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ وزیروں نے کہا۔ اس چھوٹے بادشاہ نے ہمارے بادشاہ کو تنگ کیا ہے۔ ہمیں اس پر چڑھائی کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب چھوٹے بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے دل میں بہت فکرمند ہوا۔ اس کی فوج بڑے بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو بلایا اور کہا: "اگر ہم لڑے تو یہ بادشاہ ساری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ اور اگر ہم اپنی جگہ بیٹھے رہے تب بھی وہ ہماری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ ہم کیا کریں؟"

اس کی رعایا نے جواب دیا: "ہم لڑیں گے اور اپنی جانیں حضور پر فدا کر دیں گے۔"

بادشاہ نے کہا: "لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ دشمن کے مقابلے میں ہماری فوج بہت ہی تھوڑی ہے۔"

اب سب چپ ہو گئے لیکن اس ریاست کے تمام باشندے اپنے بادشاہ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ کیا دیہات میں اور کیا شہروں میں سب جگہ لوگوں کو یہی فکر تھی کہ ہم اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کو دشمن کے ہاتھ سے کس طرح بچائیں۔ یہاں تک کہ حیوانوں اور پرندوں کو بھی اپنے بادشاہ کی امداد کی فکر ہوئی۔

جب بادشاہ نے دوسری مرتبہ اپنے امیروں وزیروں کو طلب کیا تو اس موقع پر شیر بھی آئے اور کہنے لگے: "ہم دشمن کے گھوڑوں اور مویشیوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔"

بھیڑیے اور گیدڑ آئے اور کہنے لگے: "ہم دشمن کے خیموں کے ارد گرد گھومتے رہیں گے اور جو کوئی اکیلا دکیلا باہر نکلا اسے کھا جائیں گے۔"

کتوں نے کہا: "ہم ان کی ہڈیاں تک نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن بادشاہ نے کہا: "یوں کام نہ چلے گا۔"

عین اس موقع پر ایک مکھی بادشاہ کی ناک پر آ کر بیٹھی۔ بادشاہ نے ہاتھ سے اڑا دی مگر مکھی وہاں سے جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس دفعہ وہ آ کر بادشاہ کے کان پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جھنجھلا اٹھا اور کہنے لگا۔ "اس مکھی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ یہ مجھے کیوں تنگ کرتی ہے! میں پہلے ہی پریشان ہو رہا ہوں۔"

بادشاہ کے کان میں بھنبھناہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا ہو: "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ چونک اٹھا اور کہا: "یہ کون بولا؟"

وزیر نے عرض کیا: "حضور! کوئی بھی تو نہیں بولا۔"

بادشاہ کے کان میں پھر وہی باریک آواز آئی: "میں بولا تھا۔"

اب تو بادشاہ اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگا مگر اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ناچار پھر آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا مگر دل ہی دل میں سخت حیران ہوتا اور کہتا تھا کہ میری پریشانیوں اور اندیشوں نے کہیں مجھے دیوانہ تو نہیں بنا دیا۔

اتنے میں پھر وہی آواز سنائی دی کہ: "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

امیر وزیر سب دم بخود ہو کر رہ گئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ مگر اب بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی ایسی ہستی کی آواز ہے جو نظر نہیں آتی۔

بادشاہ نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

"میں مکھیوں کا بادشاہ ہوں اور آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

بادشاہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔ "جاؤ اپنا فضول وقت ضائع نہ کرو۔ بھلا تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر مجھ سے مذاق کرنے آئے ہو۔"

"نہیں، میں اس خیال سے ہرگز نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ اور اگر آپ وعدہ کریں کہ جو کچھ مانگوں آپ دیں گے تو میں آپ کی مدد سے دریغ نہ کروں گا۔"

"میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے اور جہاں چاہوں اڑ سکوں۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا: "جاؤ تمہیں اجازت ہے۔ میرے دشمن لیہیاد کے لئے میں اپنا سامان درست کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نہ تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو نہ میرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔"

اس پاس جو لوگ بیٹھے تھے جب انہوں نے بادشاہ کو آپ ہی آپ باتیں کرتے اور ہنستے دیکھا تو انہیں بہت فکر ہوئی۔ وہ سمجھے کہ پریشانیوں کی وجہ سے بادشاہ کا سر پھر گیا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنس رہا ہے۔ لیکن بادشاہ نے سارا واقعہ ان سے بیان کر دیا۔ اس بات کا تو کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ مکھیاں ہماری کچھ امداد کر سکتی ہیں۔ البتہ اس خیال پر انہیں بہت ہنسی آئی کہ مکھیاں ہماری سلطنت کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں۔ اس موقع پر ایک بڈھا جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور مکھی کی شرطیں مان لینے کے خلاف رائے دینے لگا۔ اس نے چلا کر کہا: "بادشاہ سلامت! آپ نے اپنے معززہ اقدام سے لیہیاد سے بھی زیادہ خطرناک دشمن کے ہاتھ اپنی سلطنت بیچ ڈالی ہے۔"

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ "چپ رہو بڈھے، کیا بکتا ہے؟" اور بے چارے بڈھے کو زبردستی خاموش کر کے اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مجلس ختم ہو گئی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مگر اس وقت میں بڈھا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔"

ایک لڑکے نے کہا: "خدا جھوٹ نہ بلوائے تو وہ بڈھا ضرور سقراط ہی ہوگا۔"

سقراط نے کہا: "اگر تم یوں میری بات کاٹو گے تو میں باقی کہانی تمہیں نہ سناؤں گا۔"

ایک ننھی سی لڑکی نے کہا: "یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس خوب صورت شہزادی کا کیا حال ہوا؟"

سقراط نے چپکے سے اسکول سے باہر نکلتے ہوئے کہا: "یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج صبح میں نے پہلے ہی تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد سقراط اپنی کہانی کا باقی حصہ سنانے پھر اسکول میں آیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسکول کے احاطے میں ادھر ادھر اونچے نیچے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسکول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

لڑکوں نے پوچھا: "احاطے میں تمہاری جو چیز کھو گئی تھی وہ ملی یا نہیں؟"

سقراط نے جواب دیا: "نہیں۔"

ایک لڑکے نے کہا: "ہمیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟"

"میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی اور جو چیز میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے نہیں ملی اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہیں ملی۔"

کئی لڑکوں نے زِچ ہو کر پوچھا: "تمہاری کوئی چیز گم بھی نہیں ہوئی اور تم دیکھ لو ہر جگہ ہر کوشش بھی کر سکتے ہو اور جب وہ تمہیں نہیں ملی تو تمہیں خوشی بھی ہوئی۔ یہ تو عجیب سی پہیلی ہے۔"

"اچھا۔ اگر تم اسے پہیلی سمجھتے ہو تو پہیلی ہی سہی۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "مجھے معلوم ہے آپ اُس چیز کی تلاش کرتے تھے۔ آپ کوڑا کرکٹ تلاش کر رہے تھے لیکن وہ آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔"

سقراط نے کہا: "بجا فرمایا آپ نے اور اس کے لئے میں آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں مگر کوڑا کرکٹ کا ایک تنکا بھی تو لڑکوں کے پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ تمام گندگی اور کوڑا کرکٹ اسکول کے کمروں میں پہنچا جاتا ہے۔ یقین جانئے مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد سقراط چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا: "مجھے امید ہے کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور اسکول چھوڑو گے تو اپنی ان تمام اچھی عادتوں کو کبھی نہ بھولو گے۔"

استاد نے کہا: "اس کی طرف سے آپ بے فکر رہئے۔ اب صفائی ان کی فطرت کا جزو بن گئی ہے اور غلاظت سے انہیں دلی نفرت ہے۔ اور یہ نفرت ان کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ سبق پڑھنے سے پہلے یہ ہر روز اپنے اسکول کی صفائی کرتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ جگہ گندی رہے تو اس کے خیال سے بھی انہیں یہاں بیٹھنا دوبھر ہو جائے۔"

یہ سن کر سقراط کے منہ سے بے اختیار "مرحبا" نکل گیا۔

اب کئی لڑکوں نے پوچھا: "ہاں بڑے میاں! اب وہ کہانی بھی تو سناؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!"

سقراط نے کہا: "وہ بھی سنائے دیتا ہوں۔ اچھا تو کہاں چھوڑی تھی کہانی؟ ہاں ہاں یاد آگیا۔ جب صاحب شہزادی باغ میں بیٹھی جھولا جھول رہی تھی۔"

"نہیں یہاں تو نہیں چھوڑی تھی۔"

"تو پھر یہاں چھوڑی ہو گی کہ "بہادر نوجوان شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال لی۔""

"نہیں، یہاں بھی نہیں چھوڑی۔ سقراط تم جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ خیر ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ تم نے کہانی وہاں چھوڑی تھی جہاں مکھیوں کے بادشاہ نے چیونٹی کی سلطنت کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ یہیں چھوڑی تھی۔ اچھا صاحب! یہاں سے رخصت ہو کر مکھیوں کا بادشاہ بھن بھن کرتا ہوا سیدھا بڑے بادشاہ کی سلطنت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا تو دیکھا بادشاہ چڑھائی کے لئے اپنی فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اپنی راجدھانی میں ایک بہت شاندار جشن منانا چاہئے جس میں ہمارے تمام نوجوان شامل ہوں اور دنگل میں سب اپنے اپنے جوہر دکھائیں اور اس طرح ان میں سے تمام بہادروں اور سورماؤں کو چن کر اپنی ایک زبردست فوج تیار کر لوں جو میرے گستاخ ہمسائے کو تباہ و برباد کر ڈالے۔

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک شاندار جشن منایا گیا اور ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آ کر اس میں شامل ہوئے۔ جس جگہ نظر جاتی تھی لوگوں کے غول ہی غول دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جب جی چاہتا بادشاہ کے خرچ سے منہ کھانے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے۔ انہوں نے بادشاہ کی راجدھانی کی تمام زمین اور پانی کو گندہ اور نجس بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیماری وبا پھیل گئی اور بہت سے لوگ بیمار ہو گئے۔ بہتیرے جن

ملک کے کونے کونے سے مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ تاجر بادشاہ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ میرے سفیر تم سب کے پاس خود پہنچیں گے اور تم میں سے جو بہادر اور نوجوان ہیں، ان کو فوج میں بھرتی کر لیں گے۔ یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے دیہات اور شہروں کو واپس لوٹ گئے اور اپنے ساتھ بیماری کو بھی لیتے گئے اور اس طرح بڑھتے بڑھتے بادشاہ کی تمام سلطنت میں وبا پھیل گئی اور چند ہی روز میں ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے تب بادشاہ نے اپنی سلطنت کے ججوں، امیروں، وزیروں کو بلایا۔ انہوں نے کہا "بادشاہ سلامت! ہمارے تمام نوجوان مر چکے ہیں۔ ہمارے گھر ویران ہو گئے ہیں ہم اب جنگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہادر سورماؤں کی فوج تیار کرنے کے لئے جو حکم دیا تھا اس نے نہ صرف اس فوج ہی کو برباد کر ڈالا بلکہ ہمارے ملک میں بھی تباہی پھیلا دی۔"

بادشاہ نے کہا: "افسوس! اب کئی سال تک ہم جنگ نہیں کر سکتے۔" وہ سب بڑے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس خوفناک وبا کا حال پھیلتے پھیلتے بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا اور اس کے امیر وزیر ایسے طاقت ور دشمن کے حملے سے بچ جانے پر بہت حیران ہوئے۔ ٹھیک جس وقت وہ بادشاہ کے آس پاس بیٹھے تھے تو مکھیوں کا بادشاہ بھی بھن بھن کرتا ہوا ان کے پاس آیا اور اپنی ننھی سی ترلی بجا کر تیز اونچی آواز میں جو سب کے کانوں تک پہنچ جائے چلا کر کہنے لگا: "بادشاہ سلامت لائیے میرا انعام! میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔ "اے مکھیوں کے ننھے بادشاہ! ذرا ہمیں بھی معلوم ہو تم نے کیا کام سر انجام دیا ہے؟ ہمارے دشمن اگر مرے ہیں تو وبا سے مرے ہیں۔ اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے؟ تو جھوٹا اور دغا باز ہے۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا: "میں ہرگز دغا باز نہیں۔"

بادشاہ نے کہا: "ثابت کر۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا: "میں ثابت کرتا ہوں سنئے۔ جب اس ملک کے دیہات اور شہروں سے نوجوان بادشاہ کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئے تو ہم بھی ان کی پیٹھوں، ان کے اسباب اور ان کے گھوڑوں اور بیلوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں ہر جگہ اپنے خیمے گاڑ دیے اور بڑی بے احتیاطی سے رہنے سہنے لگے وہ اور ان کے بیل اور گھوڑے جہاں جی چاہتا پاخانہ اور لید کر دیتے۔ اور کوئی شخص زمین صاف نہ کرتا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص ایک ایسی جگہ سے آیا تھا جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا وہ اپنے ساتھ اس بیماری کے جراثیم بھی لیتا آیا تھا ہم سب بھنبھناتی ہوئی اور میرا لشکر پہلے گندگی اور کوڑے کرکٹ پر بیٹھتے اس کے بعد ان لوگوں کے کھانوں اور مٹھائیوں اور ان کے ہونٹوں اور آنکھوں پر جا بیٹھتے۔ ہم گندی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد اپنے پاؤں صاف کرتے اور نہ جوتے اتارتے۔ پہلے تو ہم نے دستوں کی بیماری پھیلائی پھر جب ہم نے دیکھا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہیضے کے جراثیم بھی لایا ہے تو ہم نے ہیضہ بھی پھیلا دیا۔" یہ کہہ کر مکھیوں کے بادشاہ نے پھر اپنی ترلی بجائی۔ اور چلا کر کہا: "اے عادل اور انصاف پسند بادشاہ اب میں اپنا انعام مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر سب لوگ خوف سے تھرا اٹھے اور بادشاہ نے کہا: "بے شک تم انعام کے حقدار ہو۔ میں اپنے قول کے مطابق تمہیں انعام دوں گا۔ اور تمہیں میری مٹھائیوں پر بیٹھنے اور جہاں جی چاہے اڑنے کی اجازت ہو گی۔"

اب وہی طبیب جس نے بادشاہ کے حکم کی شرطوں یعنی ہیضے کی مخالفت کی تھی اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا: "بادشاہ سلامت! میری التجا ہے کہ آپ نے مکھیوں کے بادشاہ سے جو اقرار کیا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھئے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "بڑے میاں یہ کیوں؟"

اس کے جواب میں وہ بڈھا جو پاس ہی کھڑا تھا اور اس دن تم لوگوں نے ٹھٹھا کیا تھا کہنے لگا: "جب آپ نے مکھیوں کے بادشا

کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ تو آپ نے انسان کے سب سے خطرناک دشمن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بادشاہ سلامت آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہی گندے ناپاک جانور کی بیماریاں پھیلاتی رہتی ہیں ان میں سے زیادہ یہی مکھیاں پھیلاتی ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا "اب میں کیا کروں؟"

سفر الدولہ: "حضور! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مکھیوں کو آپ کی مٹھائیوں پر بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور وہ جہاں چاہیں گی اڑ سکیں گی۔"

بادشاہ نے کہا: "ہاں! اور اس قول کو نبھانا میرا فرض ہے۔"

سفر الدولہ: "تو اپنے قول کو نبھائیے، لیکن خبردار رہیے کہ مکھیوں کا بادشاہ کہیں آپ کے دشمن کی سلطنت کی طرح آپ کی سلطنت کو بھی تباہ نہ کر ڈالے۔ مکھیاں گندگی میں پرورش پاتی اور بچے دیتی ہیں اور آپ نے یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ آپ ان کے لیے گندگی بھی مہیا کرتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے کہا: "نہیں میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ وہ بادشاہ کے سوا کسی اور کے دسترخوان پر بھی بیٹھ سکیں۔"

یہ سن کر ایک چھوٹے قد کا شخص جو مکھیوں کا بادشاہ تھا۔ بول اٹھا: "بادشاہ سلامت! خدا کے لیے اس طاقت ور دشمن کو تباہ نہ کیجیے۔" لیکن بادشاہ نے اس کی بات کی کچھ پروا نہ کی اور کہا: "ہمیں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ان مکھیوں نے جس طرح ہمارے پہلے بادشاہ کی فوج میں وبا پھیلا کر اسے تباہ کر ڈالا ہے اسی طرح ہمیں بھی تباہ کر ڈالیں گی۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے اپنا ننھا سا پاؤں زمین پر مارا اور بڑی بے صبری سے پوچھا: "تو بادشاہ! مجھے انعام کب ملے گا؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "اسی وقت لیکن میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس سے زیادہ بھی تم قدم نہ بڑھا سکو گے۔"

یہ سن کر مکھیوں کا بادشاہ اڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں اپنا لاؤ لشکر لے آیا۔ تمام مکھیاں بادشاہ کی مٹھائیوں کے دسترخوان پر جا جا کر بیٹھتیں اور جہاں چاہتیں اڑتی پھرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ تھوڑے ہی دنوں میں بیمار پڑ گیا لیکن چونکہ اور کسی نے مکھیوں کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا اس لیے اور کسی کو کچھ ضرر نہ پہنچا۔ وہ اپنی کھانے پینے کی چیزیں یا تو باریک کپڑوں سے ڈھک کر رکھتے یا الماریوں، برتنوں اور مجسوں میں بند کر کے رکھتے۔ اس طرح مکھیوں کا کچھ بس نہ چلتا۔ اور وہ وبا نہ پھیلا سکیں۔ اور چونکہ مکھیاں گندگی میں انڈے دیا کرتی ہیں۔ انہوں نے غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے لیے الگ گڑھے کھود لیے۔ وہ ان میں تمام کوڑا کرکٹ پھینک دیتے۔ اور کسی جگہ گندگی وغیرہ کا نام تک نہ رہنے دیتے۔ وہ اپنے گھروں اور دیہات کو ایسا صاف ستھرا رکھتے کہ مکھیوں کو انڈے دینے کے لیے کوئی جگہ ہی نہ ملتی۔ پہلے تو وہ لوگ جہاں جی چاہتا پاخانہ کر لیتے تھے لیکن اب انہوں نے اس رسم کو بالکل بند کر دیا اور یہ قانون بنا دیا کہ کوئی شخص بھی سوائے گڑھوں اور گھروں کے پاخانوں کے جو انہوں نے خاص طور پر اس کام کے لیے بنائے تھے۔ اور کسی جگہ رفع حاجت نہ کر پائے۔ اور وہ اپنے اصطبلوں اور مویشی خانوں کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے اور لید اور گوبر وغیرہ گڑھوں میں پھنکوا دیتے وہ ان گڑھوں کو پانی سے تر کرتے رہتے تاکہ وہ گرم رہیں۔ اور ان میں خمیر اٹھتا رہے۔ اور مکھیاں ان میں انڈے نہ دینے پائیں۔ جب گڑھے بھر جاتے اور تمام کوڑا کرکٹ اور گندگی مٹی میں گھل مل کر نہایت عمدہ کھاد بن جاتی تو وہ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے۔ اب انہیں مکھیوں کا کچھ اندیشہ نہ تھا۔ انہیں نہ صرف بیماریوں اور مکھیوں ہی سے چھٹکارا مل گیا بلکہ ان کی کھیتیاں بھی پہلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں۔ اور ان کی جسمانی صحت بھی پہلے کی نسبت اچھی ہو گئی۔

اس طرح انہوں نے اپنی سلطنت کو نہ صرف اپنے ظالم ہمسایہ بادشاہ ہی سے بچا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن یعنی مکھی کے شر سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی سلطنت کی رعایا نے بڑی سلطنت کی رعایا سے دوستی بھی پیدا کر لی۔ اور دونوں نے آپس میں عہد کر لیا کہ ہم پہلے کی طرح ایک دوسرے سے لڑنے کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گندگی، مکھی اور وبا کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔ اور چھوٹی سلطنت کی شہزادی

سنڈریلا کی حالت سدھر گئی، شہزادے سے شادی کرلی اور وہ اور اس کی ساری حیثیت ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔"

ستو والے نے لڑکی سے کہا: "کیوں ننھی، اب تو تم خوش ہو؟ سب ٹھیک ہو گیا، شہزادی پھر خوش رہنے لگی ہے۔"

پھر وہ بڑی ہوشیار لڑکی کو مخاطب کر کے بولا: "دیکھو اب جب ساتھ تمہاری شادی ہو گی تو اس کہانی کو یاد رکھنا جو میں نے تمہیں سنائی ہے۔ ہلکے تیار کر کے رکھنا۔ اس میں بہتیری [illegible] سا لباس تیار کرنا اور اس کے شانوں پر پڑ کی [illegible] جب تمہارے مادر [illegible] اس ہلکے لباس [illegible] کو پہن کر [illegible]۔ اگر تم سنبھالے رکھو گے [illegible] اس قدر خیال کیوں رکھتے ہو اور تمہیں اپنے مکان، احاطے اور دیہات کو صاف ستھرا رکھنے کی اتنی فکر کیوں ہوتی ہے؟"

(دیہات میں ایک سکول کا کام)

از ایف۔ ایل۔ برین، ایم۔ سی، آئی۔ سی۔ ایس

مترجم: پطرس

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہارات سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع ہی میں بتا دینا مناسب معلوم ہوا کہ شاید آپ پہچان نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزنامہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ یہ اشتہار آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ ہمیں کئی جواب ملے تھے، امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تو دو دو چار چار دن چلانے کے بعد معلوم ہوا کہ لیاقت تو ان میں سے کسی میں بھی نہیں۔ مختصر سے زیادہ لکھنے کا پایا ہے اس لئے سمجھتے ہیں یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے تھے، ہمارا مطلب کچھ اور تھا۔ مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا۔ جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات پوری نہ ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوئے۔ تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چلتے ہوئے اور کئی بغیر چلے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اندر وہ باہر کھڑے نعرے لگا لگا کے جس پر پولیس نے ہم کو دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر ایڈیٹر ہی کے شائع کرنا پڑا۔ چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے۔ اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لئے سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو۔ ایک نوجوان کو ہم نے شروع ہی میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بگڑ کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربہ کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے۔ ایک تیسرے صاحب نے ہمارے املا اور ہمارے صرف و نحو پر نکتہ چینی کی۔ اس لئے ہم واضح کئے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لئے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً ساتھ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنے یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مصغر۔ اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا

ہے

یہ بھی [illegible] نہیں [illegible] پیسے [illegible] خیال [illegible] بات کو صاف کر دیا جائے۔ [illegible] صاحب ایڈیٹر [illegible] ہے تو [illegible] لیکن یہ خیال [illegible] شاید [illegible] جب [illegible] کیا جائے [illegible] کے [illegible] عیب عیب [illegible] اب تو اس پر بھی [illegible] کا خاتمہ [illegible] کہ آپ کی [illegible] کے پیٹ [illegible] بہترا سمجھایا کہ [illegible] سے کیا تعلق [illegible] آپ [illegible] تو وہ آپ کی [illegible] کے متعلق [illegible] بیان کریں کہ آپ [illegible] خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا

ہمارے اخبار میں [illegible] پطرس [illegible] کا اقدام سب سے [illegible] ایک [illegible] انہوں نے محض خدمت خلق اور رفاہ عام کے لئے جاری کیا ہے اس لئے [illegible] پبلک [illegible] شخصیت اور مشاغل [illegible] وقت [illegible] چنانچہ [illegible] ان کے [illegible] کامیابی [illegible] حیرت انگیز [illegible] ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع [illegible] جہاں خود [illegible] کا انتظام بھی [illegible] پطرس [illegible] بچوں کے [illegible] سال اور لڑکی کی پانچ سال [illegible] شریک [illegible] شامل ہوں گے [illegible] ایڈیٹر [illegible] تقریر کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ [illegible] دلچسپی [illegible] پریس کانفرنس [illegible] ہندوستانیوں کی [illegible] کی طبیعت سنبھل۔

ہمارے اخبار کا نام آسمان ہے۔ پیشانی پر [illegible] آسمان [illegible] اس تقریب [illegible] ایڈیٹر کی کوشش نہ [illegible] کیونکہ یہ خود [illegible] پطرس صاحب کا انتخاب ہے [illegible] شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے [illegible] اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان آتا ہے ہم نے کہا بجا لیکن خاص اس مصرعے میں کیا خوبی ہے [illegible] علامہ اقبال کا مصرع ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے۔ اس پر ہم چپ ہو گئے [illegible] اخبار [illegible] کیا ہوا ہے اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پر یہ مصرع ضرور رکھا۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں [illegible] سوالات پوچھنے لگتے ہیں۔ ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم [illegible] ہرگز نہیں [illegible] چنانچہ ایک دن تو ہم نے پریذیڈنٹ ٹرومین کے [illegible] اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی لیکن [illegible] پالیسی [illegible] کے کالم [illegible] ایڈیٹر

۳۔ سلسلہ ہم سے ہدایت مبنی بر زبر لی گئی۔ ہندوستان میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ پنڈت نہرو کی پالیسی سے بیٹا سرکار ہو ہم ہر جگہ سے بچے رہیں تاکہ بالائی جماعتوں کا خاتمہ کیا جائے اور ان کے لڑکے کی شادی ہو جائے پر دوبارہ کی لڑکی سے ملے پاکستان ہے اور خیال ہے کہ ہم سرمائے شادی کر دی جائے،

جس کے متعلق جاننا خاص طور پر ضروری ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور ہر پروف ریڈر کی مشق بہت بہتر ہو جانی چاہیے گی۔ مثلاً پاکستان کا نہیں معروف و جاہل آتا ہے، ہر لفظ جسا ذرا سا نہیں بگڑ جاتا ہے۔ مترجموں کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے تمام کالم اور ... کی خوشی اور تین کا دی ہوگئے۔ حالانکہ انہیں کہنا چاہیے تھا کہ دو صوبوں کے مقابلے کا انتظام ہوا۔ جب کبھی کسی جگہ چند اشخاص جن کی تعداد تین تک ہوتی ہے مختلف طور پر مجروح ہو جائے۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں پیتل کا ایک ٹکیہ لٹکانا ضروری ہے جس پر نمبر لکھا ہوگا۔ ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں تو ہونا چاہیے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں آپ دو سوا طاقہ ڈال دیا جائے۔

سینما کے خبریں سب ایڈیٹرز کے مشاہدے میں شامل نہیں۔ ہمارے ایڈیٹر کے تمام تبصرے ہیں اور خبریں ان کا استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ یہ پروپیگنڈا نگار خانے کے کام آتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں ہدایات مل سکے اور ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے۔ اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریک کے ذریعے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا۔ علی ہذا جو اشیا ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات، صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا۔ ہمارے پرچے کی اشاعت کئی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اشاعت بہت بڑھ رہی ہے بہت بڑھ رہی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جب ہم دفتر میں بیٹھے رہ جاتے ہیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اصولاً اشاعت بڑھانے کے خلاف ہیں۔ دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ اشاعت زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے۔ یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات؟ کون سی بات؟ اپنے ڈائریکٹر بھی وہ کیسے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتلاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

دوستؔ کے نام

جولائی

میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں بعنوان ... کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی ـــــ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون کون اصحاب ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوق بھی صحیح رکھتے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطہ پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سا شغف نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کہ چلو ایسے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویتِ قلب نصیب ہوگی۔ مدت تک کتابوں اور تصویروں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی تازگی پر تنہائی کی وحشت اور تنگی غالب آنے لگتی ہے۔ انسان دیوانہ نہیں تو علیل دماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرع قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں رازداں کو میں۔"

لیکن میرے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی اخبار نے تلملا کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا وقت آیا ہوا ہے۔ اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصوری اور رقاصی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر روما اور نیرو کی ستار نوازی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی دستوری چشم بددور ہیں آپ دیں سے ... نے مسجدوں میں دعا کرتے ہوئے آپ کے لہو و لعب اور تفریح کوشی پر لعنت نہیں کی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتویٰ لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

ہمہ آہنگ چنگ خموشے کہ مکتب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا منافقت کے مرقعے پر کسی نیم تعلیم یافتہ صحافی نے جو شعر و ادب میں آپ سے برتری کا دعویٰ رکھتا ہے آپ کی آزادیٔ مشق کا مذاق نہیں اڑایا؟ اور جب آپ نے جوابی تقریر کی تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوئے؟

اگر آپ کو ایسی منزلوں سے سابقہ نہیں پڑا تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی یا پھر بیزار رنگ اور بددلی کیفیت رہی ہوگی اور آپ کو ایک مکانی پاکستانی شہری ہوگی ورنہ جس خوش مذاق نوجوان کو فرصت ہے وہ آج کل ایک مہاجر مریض کی طرف سے ... کتابت کے کرنے میں سرگرداں نظر آتا ہے

• سہارا بہت پڑ چند برس رہا ہے اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائد اعظم یہاں تشریف لائے تھے ــــ اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے، اس میں جو تقریب "رونمائی" منائی تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا، "رونمائی" کا نام "گلستان فاطمہ" رکھا گیا۔ وہ مقام ایک بلند پر ہے کہ باغ میں جو چھوٹی سی پہاڑی ہے جنوں کی خوب صورت محراب استادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت بیچارہ بہت ہی مختصر تھی۔ کہ دوسرے رنگوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ بنا سکتے تھے۔ جو شرم آتی "گلستان فاطمہ" کی سیدھی سادی ترتیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت یہ وہ غریب ہے جو اس ہم سے اور بھی چلے گئے جو دو پہر کے وقت درختوں کے سائے میں اپنا گرد و غبار جھاڑتا مرکے نیچے کہ کر اس بارش میں سو جاتے ہیں۔ نہ وہ جگنو اور گوشے جو بہار میں کوئی نکتہ چین ہیں کے جو غصہ کے وقت موڑوں میں سرد ہو کر یہاں نہیں کھینچتے تنے ہیں۔ لیکن جب ان جوہر کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے سے یوں ایک نمایاں جگہ پر نقوش دیکھا تو فوراً دل و دماغ پر جو ت ہوئے کہ کیا ایسے شاندار موقع کے لئے اس سے بد صورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس متانت اور ہنر مندی سے لکھے کہ آج بھی ان کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے۔ پنجاب کا علاقہ وہ خطہ ہے کہ نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے اور اس پر یہ عالم کہ اس تقریب جیسے پر اس شہر میں مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھے پڑے ہیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہیں اور نشست بے ڈھنگی ہے۔ آپ دیکھئے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں جذبات کا فروغ نظر آتا۔ اور آپ پژمردہ ہو جاتے اور آخوند صاحب پہ بے کس کے پاس جا کر شکایت کرتا۔ اور اگر آپ کچھ پہلے گئے اور یقین ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بد تمیز سمجھتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کچھ سے لحاظ کا الزام عائد ہو آپ کی وفاشعاری پر حرف آتا۔

اب آپ اس انجمن کے جلوے میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم بیٹھے ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں درد مند دل رکھتے ہیں یہ سمجھنے سے کیوں کر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آبا و اجداد تو قطعات لکھتے اور خم اندر اہے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوفی اور طغرے، نستعلیق اور نسخ، کون سی طرز ہے جو انہوں نے بے حد نقش کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو، ان کے طغرے اور مذہب نسخوں کو دیکھو، ان کے روضوں اور محلوں، ان کی مسجدوں اور خانقاہوں کے فرامین اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام، سلطنت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب، دھات، سنگ و سنگ پر ثبت نہ کر دئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے گھر کے حیا اور تحفظ کے عتاب کرتی تمہارے اختیار دے دی ہیں تمہیں کیا ہوا کہ اس جشن کو کتبے جانے دو گے اور عہد کرو کہ آج سے تمہاری دکانوں تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں، تمہارے سرناموں اور تمہارے نقوش پیڑوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ایک حرف بھی لکھیں گے اسلاف کا نام روشن کریں گے اور جو زیبائش اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی تھیں ان کو مٹنے نہ دیں گے تاکہ جہاں کسی کی تمہاری تحریر پر نظر پڑے وہ جان لے کہ یہاں اس قوم کا نشان ہے جس نے دنیا میں خوشخطی کا مرتبہ بلند کیا اور جو اب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کر سکتی ہے

یہ لکھتے ہوئے آپ کچھ ٹھٹک تو نہیں گئے، لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں بھی ایسے لوگ ہیں؟ فنونِ لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنا لی ہے۔

اور پھر نقش و نگار کی حوصلہ افزائی بھی ضرور ہوگی لیکن کیا آئندہ بھی یہاں کے لوگ تصویروں کا ذکر بھی کریں گے؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا انتظام کر رہے ہیں۔ یہ بہت اچھا ہے، دوست وقتاً فوقتاً آپ کی خیریت سے مطلع رہتے رہیں گے۔ کیونکہ کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بہت سی مشکلات سے کام لینا پڑے گا اور جب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر جرأت پیدا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چیزیں ملا جلا کر پھینک دی گئی تھیں اور اس معجون کی ایک تازہ منشا یہ کہ صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک۔ اس سال تو ایک پرچی حکام نے تقسیم کی ہے جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں۔ وہ کبھی ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی صاحب ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئے تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام تھا اگر اسے کسی مرد کے سپرد کیا گیا تو زلزلے نہ آ جائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو ترک کر دی گئی ہے کیونکہ ظاہر ہے بھلا کسی کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے سامنے یہ کہہ سکے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؛ باقی رہی تصویر کشی تو ایک سنتے والے اسے دن منانے کو ایک کا کچھ نہ کہو۔ بیبیاں ہماری لڑکیاں جانداروں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہا ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب، ناشپاتی، مرتبان یا پیالہ، جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں عیوب خود سرایت کر جاتے ہیں کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹوگرافر بھی تو بڑے فن کار ہوتے ہیں جو اب طارق چابکدستی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرضیکہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹوگرافر کا کام حق رہ سکتا ہے جو آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر چار آنے میں تصویر کھینچتا ہے یہ حال تو جاندار اشیاء کا ہے باقی رہے جنگل پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی نہ کوئی جیسے معصوموں کے "عبرت" کو گردن سے جا دبوچے گا۔ اور آپ چیختے رہ جائیں گے کہ یہ تو وین گاگ ہے! یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے جینے کا امکان بہت کم ہے کوئی بات "سچ" بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ درخت تک آدمیوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا اور صرف مردوں ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزال چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات محرم کے بند تک دکھائی دے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں کئی ڈوپٹے، پھندنے بہت ہوتے ہیں، اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ تکیہ یا ڈوری میلے کے لباس کا حصہ ہے یا قدرت کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت مزید نظر آتی ہے وہ یہ کہ نہ دسے کہیں ایک بار اسے دفن کر دیا تو یہ دباؤ سا ختم ہو جائے گی اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہی مغلوں کی قدیم تصویریں یا ایرانی مصوروں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور تبرک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی امید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کئے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی۔

لیکن یہ کوشش ہے کہ آپ کی ان سا ایسا جو ہمیشہ اور ان سے کم شعور یا علم ہیں یا جاہل ہیں کہ ملک کے منتظمین کی اِن روحوں تک
جو پہنچائی گئی ۔ آپ کی تحریر اور تخلیق کی سوجھ بوجھ رہی ہے لیکن یہاں آ کر بات ختم ہو جاتی ہے ۔ آرٹسٹ سے لے کر عوام تک اور آرٹسٹ کی قدر کی
دیکھئے ۔ آپ کوئی سا پیمانہ بنا لیجیے ۔ آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کرتا ہے ۔ رنگ برنگے مناظر والا ... سب سے پہلے اسی چیز
کا اثر لیتے ہیں ۔ آپ کہتے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ڈنڈیاں بنا بنا کر بازاروں میں ... پھرتے ہیں کہ کسی کا روزہ ... یہ اسلام
کی دولت ہے کہ ... شرما جاتی ہے کہ اس کے ... ہیں ، مگر سنگسار کریں ؟ آپ حیا کی تلقین کیجئے تو لوگ سر پر تار ... سے ... جھکے
ہوئے ہیں اور بچوں پر اپنا بیانہ ... ہیں ۔

مجھ کو آشنا دی ہے اور تنگ ... نہ تھی
اس دور کے ... ہیں کیوں تنگ استادی ؟

ایسے ... دشمن کی فضا میں کبھی آج تک کہیں آرٹ پنپا ہے ؟ آرٹ کے لئے تو ضبط اور ضبط و استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں
یا پھر کوئی ولولہ کوئی امنگ کوئی تشنگی ہو ان کے دو ... میں سے شعور وحسن ، نغمہ و رنگ کے خزانے اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں ۔ کیا
کبھی آرٹ ایسے میں پنپا ہے کہ ہر طبقہ کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر چہرہ اپنی بے بشاشی کا بدلہ ہر سامنے کے
راہگیر سے لینے پر تلا ہو ؟ نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ ... سے نجات پا کر
قناعت کی گود میں ... نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو ۔ نہ مسرت ... ایسا
ہو ... کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں ۔ نہ اذیت کا کوئی ... ایسا ہو جہاں آپ کا
... ہو کر بیٹھ جائے اور آپ کے لئے تصویریں بنا سکے ، نہ اس پاس کوئی ایسی ... ہو جہاں شاعر غریب شہر ... ہے اور لوگ اسے
دیوانہ ... دیں ۔ فنونِ لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنائی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخرب
اخلاق ... کر کے جلا دیا جائے ۔ چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے یا پھر ان پر ایسے لوگ مسلط کر دئے جائیں جو
ان کے ہنر ... سے ... کی کسوٹیوں پر پرکھیں اور ان پر واضح کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعویٰ ہے تھا اس کا ... ہو گیا ۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے ۔ نہ محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے ۔ آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاندار کی تصویر
پر اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو ۔ جس کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے ، جو شغل چاہے اختیار کرے ۔ ضرورت یہ ہے کہ زندہ ہے اور امیر غریب ، چھوٹے
بڑے ، دونوں کے ... سب پر اپنی بخششیں ... فرمائے ۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا ۔ آپ تو اس
... کو واپس لانا چاہتے ہوں گے ۔ تا کہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں ، کسان کے ... میں ، ... کے ہاتھ کی چوڑیوں میں ، پنہاری کے مٹی کے
گھڑوں میں ، غرض زندگی کے ہر گوشے میں ... ہو لیکن ... یہاں وہاں ... ہی ہیں انہیں ہی ... دیا گیا تو ... انسانوں کی زندگیاں
... کیسے ... گی ؟ کیا آپ کے ہم جلیس بھی انہیں اس بات کا احساس ہے ؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ
آرٹ کی ایک ... ہے ۔ انہیں اس ... ماحول میں ... پڑیں گے ۔

فرشتے نیست، نہ پہلے تھی سے فرق ہست
مہ زہر رو جہاں گم شب با تو نیست

مگر یہ محض میرا ہی قیاس ہے، دوست پورا پی سب سے الگ تھلگ رہی ملو۔ کی آپ اسے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہوگا آپ کے اخلاص اور محبت ماننے والے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں حتیٰ کہ وزارت جلیلہ بڑے بڑے ارباب حل و عقد کا تقرب نصیب [illegible] ہو گیا ہوگا

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

(نقوش جشن آزادی نمبر ۱۹۴۸ء)

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے، جن کی کئی قسمیں ہیں۔ کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے۔ کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگھوڑے میں ہی چلاتا ہے۔ جہاں بیٹا، چلنے پھرنے پر بچے نے پاؤں پاؤں کام کرنے لگے بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک ادھم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ پیدا ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں یہ میں نے اور حکماء کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قائل نہیں۔

کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ذائقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ننھا سا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کراؤ۔ میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں، شعر پڑھے ہیں، ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں، الّو کی طرح چیخ کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں، بلی بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو یا جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو۔ خدا جانے ایسا کچھ دیکھتا ہے اور سنتا ہے کس وقت؟

بچوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب ان کے منہ سے کسی نہ کسی قسم کا شور صادر نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجئے۔ ہنسانا ہو تو عجیب سے نقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دے دیجئے۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجئے لڑھکتا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری مکروہ آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے ماموں یا چچا ہونے کے جوش میں آ کر برخوردار کو ایک عدد ربڑ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لئے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں سوائے شاید اس ربڑ کے کھلونے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں۔ بدقسمت ہیں تو وہ بےچارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بےچارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ رو کے تھک

آپ دیکھیے۔ ان کا شرف [illegible] ہیں۔ رات کی ڈیوٹی [illegible] بجے اٹھ بیٹھے ہیں۔ [illegible] سی آتی ہے۔ [illegible] شروع ہو جاتا ہے۔ [illegible]
آنکھیں کھلی ہوئی، سرکی کھال پر تیل [illegible] کانوں میں روئی [illegible] ٹوپی [illegible] سب لیتے ہیں۔ آپ کو [illegible] نیند [illegible]
کبھی مرزا صاحب کے گھر پر جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک [illegible] کر لیا کریں۔ کل وقت دل میں آیا مرزا صاحب
کے ہاں حضرت! آپ کی ان غور سوچوں نے میری زندگی [illegible] کام کر سکتا ہوں۔ [illegible] کر سکتا ہوں۔ پہلے میں یہی کہتا رہتا تھا کہ ان کا
ایک بچہ کیسے ہی اچھے ہیں [illegible] مرزا صاحب [illegible] کہتے ہیں [illegible] بس [illegible] صاحب بڑا اچھا بیٹا ہے۔
کبھی منہ میں [illegible] کبھی [illegible] کبھی [illegible] میں اچھی طرح جانتا ہوں [illegible] سب گلا پھاڑ پھاڑ کے رونا ہے۔ مرزا
صاحب [illegible] کے زور شور [illegible] نہیں [illegible] بیٹا [illegible] کا منہ بھی چومتا ہوں۔
نہ جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے [illegible] کرتے تھے اور کبھی کبھار [illegible] آ نکلا۔
تو نہ جانے [illegible] کیونکہ ایسے موقع [illegible] لیکن [illegible] بسی [illegible] ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ
پہنچائی تھی۔

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے اور صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام سرگرمیاں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی کے گرد میز پر جو اشیاء کا ذخیرہ رکھا ہے اس کے چند دستیاب ہو جائیں، جیسے چند دن مہینے کے بعد انھیں پرنسل کر لیا، ہر ہفتے ناخن ترشوالئے۔

مجھے کالج کا مرض لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چلے ہیں۔ شباب کا زمانہ عام امتحانوں میں جو بات تھی ختم ہو گئی۔ اب زندگی کے جو دو چار دن باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرتے کرتے گزر جائیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا آغاز تھا، لیکن تھا اس کے بعد مرض نے ایسا گھیرا ہے کہ بستر پر لیٹا ہوں ہم — ہرچند کہیں کہ ہے — نہیں ہے۔ طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا، نرم نرم گدیلوں پر گاؤ تکیہ لگائے البتہ عیش پر دراز تھا۔ اب تو صاحب فراش ہوں۔ اب ہمیشہ صرف اس قدر نصیب ہے کہ اکثر کھانا کھا لیا، غسل کر لیا، ناخن ترشوالئے۔

تمام دنیا کالج لائبریری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک تنگ کمرے میں محدود ہے۔ ان دونوں کے درمیان کا برآمدہ ایک کوریڈور معلوم ہوتا ہے —

کبھی راوی سے بہت دل چسپی تھی۔ روزانہ علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کہ کہیں نہ کہیں سلام دستانی کھینچ ماریں گے۔ ہال میں سے گزرنا قیامت ہے۔ وہم کا یہ عالم ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کالج کے جلسوں میں اپنی دیرینہ دلچسپی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا ہوں کہ ذہن سست ہے، فقرہ رفتہ ہے۔ وہ معاملہ ہے اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خنک سا ضعف بدن پر طاری ہو جاتا ہے۔ جانتا ہوں کہ کرسیٔ صدارت کی سولی پر چڑھنا ہو گا اور سولی بھی ایسی کہ اناالحق کا نعرہ بھی نہیں لگا سکتا۔

قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بدگمانی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پر بٹھا دیا اور میری ہر حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے ارد گرد محفل گرم تھی اور میں اس میں کنچن چنگا کی طرح اپنی بلندی پر جا بیٹھا تھا۔

جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی تو مرا اداس سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تمہارے پوش، آخر یہ برادر صاحبان کی نوازشیں دن کے بارہ ایک بجے تک منتظر رہیں گی۔ دن بھر لڑکے چوں چوں کر جا بجا چوک کے ڈھیر لگا دیں گے جو رفتہ رفتہ آثار قدیمہ کا سا خیالی رنگ اختیار کر لیں گے۔ جہاں کسی کو ایک کرسی اور سٹول میسر آ گیا وہیں کھانا منگوائے گا اور کھانا کھا چکنے پر کوڑا، اور چھلکوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا تاکہ دنیا میں نام برقرار رہے۔ اب یہ حال ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اس چھٹی کے دن بال کٹوانے اور پھر بات کرنی کی تعطیلات

[illegible] مولوی صاحب سے اپنی کتاب [illegible] [illegible] طبیعت خراب ہوگی۔
[illegible] سوچتا ہوں کہ اس [illegible] کے پاس [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] گھڑی [illegible]
[illegible] گھڑی سے سات منٹ [illegible] ہے۔ [illegible] دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پیچھے
[illegible] اور تیسری گھنٹی ہال کی گھڑی سے [illegible] منٹ پیچھے [illegible] تو کس کا سر پھوڑا جائے۔

[illegible] شعر [illegible]

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی ۔۔۔ اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

"پطرس"
(راوی سنہ ۱۹۲۹ء)

مضحک اشیائے کے متعلق چند عام اصول

(پروفیسر ہنری برگساں کا فلسفۂ خندہ)

ہنسی کے کیا معنی ہیں؟ کسی مضحک چیز میں ہنسانے والا عنصر کون سا ہے؟ ہم کسی کے منہ چڑانے پر یا کسی مسخرے کی الٹی سیدھی حرکات پر اور کبھی کسی شخص کی ہیئت کذائی پر ہنس دیتے ہیں۔ ان سب میں مشترک کیفیت کون سی ہے؟ ہم کو وہ جوہر کیونکر دستیاب ہو جس کا اثر ان سب کی تہہ میں آ نکلتا ہے جو ایک روح کی طرح مختلف اجسام میں آ کر مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور مختلف تضحیک میں اس قدر تنوع پیدا کرتی ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ارسطو سے لے کر آج تک اکثر حکماء اپنا دماغ صرف کرتے رہے لیکن جو ہمیشہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ان کی ہنسی اڑاتا رہا۔

جانِ خندہ یا روحِ ظرافت یا عنصرِ مضحک جو نام بھی آپ اس پری کے لئے تجویز کریں۔ اس کو منطق کے اصولوں پر کسی تعریف کے بند میں جکڑ دینا فضول ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ روحِ خندہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہئے۔ اور ایک آدھ فقرہ میں اس کی تمام ہستی کو سمو ڈالنا اس کی توہین کرنا ہے ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس کا نظارہ کریں کہ وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اور کس طرح نشوونما پاتی ہے۔ دیکھیں کہ کس کس ڈھنگ سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ممکن ہے ہم اس دیرپا آشنائی کی وجہ سے اس کو اچھی طرح جان سکیں۔ اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہی نہ رہے۔ کہ کوئی ایک فقرہ کی حدود کے اندر اس کو بند کر کے ہمارے سامنے کا نقشہ پیدا کر دے۔ اور ممکن ہے یہ آشنائی ہمارے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو۔ کیونکہ روحِ خندہ کی بھی ایک منطق ہے۔ وہ بھی اپنا ایک مقررہ طریق عمل رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی آوارہ و وارفتہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کئی مضحک باتیں ایسی ہیں جن کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ انسان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جن پر ایک قوم کی قوم ہنس پڑتی ہے۔ جن پر ایک ملک کا ملک دم بخود ہنستا ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم روحِ خندہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ تو ساتھ ہی ہمیں عوام الناس کے تخیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل نہ ہو جائے۔ ہنسی خود زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور فن کی بہت ہی قریبی رشتہ دار ہے۔ تو ممکن ہے یہ زندگی اور فن پر بھی بہت سی روشنی ڈالے۔

شروع شروع میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہنسی کے متعلق تین بنیادی اصول بیان کر دئے جائیں ان اصولوں کا خود مضحک اشیأ سے بہت تعلق نہیں لیکن ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے میدانِ تضحیک کی حدود قائم کی جا سکتی ہیں۔

فصل۔ دوران بحث میں سب سے پہلی بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے یہ ہے کہ کوئی سامانِ تضحیک انسانی دائرہ کے باہر نہیں پایا جاتا۔ کسی دریا یا پہاڑی کا منظر ممکن ہے کہ خوب صورت ہو۔ ممکن ہے کہ دلفریب و دل کش ہو یا ممکن ہے کہ بالکل ہی حقیر و بد نما ہو لیکن مضحک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایک جانور کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جائے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ہماری نگاہ کو اس جانور

لا تعداد بے جان چیزوں میں اگر انسانوں کی سی حرکت محسوس ہو جاتی ہے وہ ساتھ ہی مضحک بن جاتی ہے ممکن ہے کہ کسی وقت کسی ایک عجیب سی ٹوپی پر [illegible] ہم اس پر ہنس پڑیں۔ لیکن اس میں جو چیز مضحک ہے وہ اس ٹوپی کا کپڑا نہیں۔ وہ شئے دراصل ٹوپی کی شکل ہے۔ وہ شکل جس کو انسان ہی کی طبیعت میں مصلحتاً یا ہوس کی انسانی ہاتھ نے دیا ہے یعنی مضحک چیز ٹوپی کی قطع و وضع ہے جو اس وجہ سے مضحک ہے کہ وہ کسی انسانی دماغ کے ایک عجیب و غریب خیال کی ترجمان ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسا اہم اور ایسا سیدھا سادہ مسئلہ فلسفیوں کی تفتیش سے اس قدر نظرانداز رہا ہے۔ اکثر لوگوں نے انسان کو "حیوان ناطق" کے نام سے پکارا ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان نہ صرف "حیوان ضاحک" بلکہ "حیوان مضحک" بھی ہے۔ اگر کوئی اور حیوان یا کوئی بے جان چیز ہنسی کا باعث ہوتی ہے۔ تو ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ وہ مضحک یا کوئی انسانی مشابہت ہو کہ جس صفت انسانی کا کوئی نقش اسے مضحک بنا دیتا ہے۔ جو کوئی انسان اس چیز سے لگا ہو۔

دوسری بات جس کا بیان کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اکثر ہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مضحک چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کر سکتی جب تک روح انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم کسی ایسے شخص کی ہنسی نہیں اڑا سکتے جس پر ہم ترس کھاتے ہوں۔ یا جس سے ہمارے الفت و محبت کے تعلقات وابستہ ہوں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ایسے شخص کی ہنسی اڑانے کے موقع پر ہم اتنی دیر کے لئے رحم اور محبت کی زبان بندی کر دیتے ہیں۔ چند ایسے اشخاص کی جماعت میں جو صرف دماغ ہی دماغ رکھتے ہیں اور جن کا دل (ان معنوں میں کہ وہ جذبات کا خزینہ ہوتا ہے) معدوم ہو۔ شاید کوئی شخص بھی کبھی روتا ہوا نہ پایا جائے۔ لیکن ہنسنے والے پھر بھی اس میں موجود ہوں گے اس کے مقابلے میں ایک جماعت ہمدرد کی مساوی طبیعت رکھنے والے اشخاص کی ہے جن کا دل زندگی کی اہمیت کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے یعنی وہ اشخاص جن کو اہل دل کہا جاتا ہے اور جن کی فطرت میں ہر ایک واقعہ ایک جذباتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے (جو ہمیشہ کمال کو پہنچی رہتی ہے۔) ایسے اشخاص دو ہنسی سے آشنا ہیں نہ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ جو آوازیں آپ کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا جو حرکات و افعال آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوتے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ دلچسپی پیدا کر لیں۔ اگر آپ تصور و تخیل میں دوسروں کے افعال میں ان ہی کی طرح شریک کار ہو جائیں اور انہی کی طرح سب کچھ محسوس کرنے لگیں۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اپنے جذبۂ ہمدردی کو پوری طرح وسعت دے دیں تو چھوٹی سے چھوٹی چیز آپ کی نظروں میں اس قدر وقیع و اہم بن جائے گی۔ گویا کسی طلسم نے دنیا کی حقیقت کو یکلخت بدل دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمام محسوسات پر ایک تاریکی چھا جائے گی۔ جو آپ کو ہنسی سے محروم کر دے گی۔ اب اگر آپ کشمکش حیات سے الگ ہٹ کر اور اپنے آپ کو بالکل لاتعلق بنا کر اس کا تماشا دیکھیں تو کئی باتیں آپ کے لئے مضحک بن جائیں گی۔ اگر کہیں موسیقی کے ساتھ باقاعدہ تال پر ناچ ہو رہا ہو تو آپ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر آپ اپنے کانوں کو اس طرح بند کر لیں کہ موسیقی کی آواز آپ بالکل نہ سن سکیں تو نظارہ رقص مضحک ہو جاتا ہے۔ اور شاید ہی کوئی فعل انسانی ایسا ہو۔ جو اس طرح کی آزمائش میں پورا اترے اگر ہم افعال و حرکات کو جذبات کی ہم آہنگ موسیقی سے علیحدہ کر کے ان پر نظر ڈالیں تو ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو فوراً متانت سے گرے ہوئے نظر آنے لگے۔ ثابت ہوا کہ کسی مضحک چیز کے پورے طور پر اثر پذیر ہونے کے لئے ایک عارضی انعدام جذبات ضروری ہے۔ تضحیک کا تعلق عقل و فہم اور صرف عقل و فہم سے ہے۔

لیکن ہنسی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا دماغ اور انسانوں کے دماغوں سے وابستہ ہو۔ اور جیسا کہ اکثر ہے جو آپ کا خیال ہے اگر آپ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور اکیلا محسوس کریں تو آپ مضحک اشیاء سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہنسی کے لئے ہمیشہ ایک گونج ایک صدائے بازگشت یعنی شرکت و رفاقت کا ہونا ضروری ہے۔ آپ خود ہنسی کی آواز کو غور سے سنئے۔ یہ صاف، واضح یا اپنی جگہ مکمل اور ختم شدہ آواز نہیں۔ خود ہی آواز [illegible]

۔ کیا [illegible] کوئی بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ ایک بچے کی طرح [illegible] سے پہلے اگر [illegible] معلوم ہوتی ہے [illegible]
کے ساتھ [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] بعض لوگ ایسی باتوں پر [illegible] ہیں [illegible] سے اس کے [illegible]
[illegible] ہے اور اس سے [illegible] ہنسی ہمیشہ ایک جماعت [illegible] معلوم ہوتی ہو تو آپ کو [illegible]
کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر چار پانچ آدمی آپس میں ایسی باتیں کر رہے ہیں جن [illegible]
[illegible] ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اگر آپ بھی ان کی صحبت میں شریک ہوتے تو آپ [illegible] آپ [illegible] تو [illegible]
ایک دفعہ ایک شہر کی جامع مسجد میں اس شہر کے ایک بڑے مولوی وعظ فرما رہے تھے۔ ان کی تقریر اس قدر موثر تھی کہ سب سامعین زار و قطار رو رہے تھے مگر
سامنے ایک کے جو پاس ہی مطمئن بیٹھا تھا۔ جب اس شخص سے اس کے اس قدر غیر متاثر ہونے کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے جواب میں کہا "میں
اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں تو اجنبی ہوں۔" رونے کے متعلق اس شخص نے جس خیال کا اظہار کیا وہ ہنسنے کے متعلق اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ ہنسی بھی
بے اختیاری کی ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ایک ہنسنے والے کو ہنسنے کے لئے اور ہنسنے والوں کے ساتھ (خواہ وہ حقیقت میں
موجود ہوں یا محض تصور میں) سازش کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ محض دوسروں کی مدد ہی سے ہنس سکتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ تھیٹر میں تماشہ
دیکھنے والوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر ان کی ہنسی بھی زیادہ بے قابو ہوتی ہے۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زبان میں بہت سی ظرافت
کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو ظرافت سے خالی رہ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت ایک خاص
قوم کے رسم و رواج اور خیالات سے تعلق رکھتی ہے جنہوں نے اس نکتہ کو نظر انداز کیا ہے وہی لوگ ہیں جن کے نزدیک ظرافت ایک نہایت ہی حقیر
شغل سے زیادہ قابل غور حقیقت نہیں رکھتی۔ اور جو ہنسی کو حیات انسانی کی باقی تمام دوسری باتوں سے بالکل ہی بے تعلق سی چیز خیال کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ظرافت
کی یوں تشریح کرتے ہیں کہ "ظرافت ایک تقابل ذہنی کا نام ہے" یا "ظرافت ایک محسوس بے جوڑ پن کا نام ہے۔" ممکن ہے یہ تعریفیں ٹھیک ہوں لیکن
یہ اس سوال کا جواب دینے سے قطعی قاصر ہیں کہ آخر بعض چیزوں پر ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ بعض محسوسات تو ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے یا
سنتے ہی ہمارے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں علاوہ اور ہزاروں اشیاء بھی دنیا میں موجود ہیں جن کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہنسی کی حقیقت کو سمجھنے کے
لئے ہمیں ہنسی کو ہنسی کے گھر میں جا کر دیکھنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ ہنسی کا گھر انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں :-

(۱) سامان تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔

(۲) ہنستے وقت جذبات معطل ہو جاتے ہیں۔

(۳) ہنسی کے لئے ایک سے زیادہ (حقیقی یا خیالی) ہنسنے والوں کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی ہنسی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسانوں
کی ایک جماعت اپنی توجہ اپنے ایک فرد کی طرف اس طرح منعطف کرتی ہے کہ اپنے جذبات کو معطل کر دیتی ہے اور صرف اپنے عقل و فہم سے کام لیتی
ہے۔

مثال۔ ایک شخص بازار میں سے چلا جا رہا ہے۔ یکایک وہ لڑکھڑا کر گرتا ہے اور جتنے دیکھنے والے ہیں سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے [illegible]
[illegible] زمین پر گر پڑا ہے۔ [illegible] لوگ سمجھتے ہیں کہ اس شخص [illegible]
تھا۔ [illegible] اس شخص کے [illegible] ایک حقیر [illegible] نہیں بلکہ اس [illegible] ہے۔ [illegible]

تھا اس پتھر سے ٹھوکر لگی ہے۔ اس سے بچ سکتا تھا یا اپنی رفتار بدل دیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور تو نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں کیفیت تھی ابھرنے کی قابلیت نہ تھی یا شاید وہ کسی دوسرے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا یعنی اس کا خیال کہیں اور حاضر تھا، اور اس کے جسم میں اتنی لچک اور چستی کی قابلیت نہ تھی کہ وہ خیال کے بجائے حاضر ہو جانے پر اپنے جسم کے توازن کو فوراً سنبھال لیتا۔ اس سے اس کے اعصاب اپنے چلنے کی حرکت ہی میں مصروف رہے حالانکہ نئے حالات کچھ اور چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ گر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ہنسی بھی آئی۔

اب ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا معمول نہایت ہی باقاعدہ ہوتا ہے۔ اور جو چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اپنے معمول سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ اس کی تمام اشیا ایک مقررہ طریقے اور ترتیب سے لگی رہتی ہیں اور وہ بہت ہی باقاعدگی سے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اب فرض کیجئے کوئی شریر لڑکا ان تمام چیزوں کی ترتیب کو بدل دیتا ہے۔ اب وہ شخص میز پر سے قلم اٹھانے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں چاقو آ جاتا ہے جب وہ الماری میں سے طب کی کتاب نکالتا ہے تو اس کی جگہ ... کا ناول نکل آتا ہے جب وہ کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے تو دھم سے زمین پر جا گرتا ہے کیونکہ اس سے کرسی کا کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ عادت اس کو مجبور کرتی ہے کہ جب اسے کرسی پر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر بیٹھ جائے۔ اب اگر خلافِ معمول کرسی وہاں موجود نہیں تو چاہئے تھا کہ وہ اپنی اس حرکت کو روک لیتا یا موقوف کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک مشین کی طرح بےخطا مستقیم چلتا رہا۔ گویا جو شخص اس قسم کی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی حالت بھی ایک طرح سے اسی شخص کی سی ہے جو دوڑنے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ سامانِ تضحیک دونوں حالتوں میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں اشخاص میں ان خاص موقعوں پر بدل کھانے یا لچک جانے کی قابلیت کافی مقدار میں نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ہم ایک انسان سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ نہایت ہی بیداری سے حرکت کرے اور اس میں متاثر ہونے کی قابلیت پائی جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان دو اشخاص کی مضحکہ کیفیتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو ہنسنے کا سامان سڑک کے اتفاق نے مہیا کیا تھا اور دوسری حالت میں ایک لڑکے کی شرارت نے۔ ان دو وجوہات سے ان دو شخصوں میں لچک اور بدلنے کی قابلیت کی کوتاہی ظہور میں آئی۔

لیکن ان دونوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ جو مضحکہ خیز نتیجہ رونما ہوا اس کی علت خارجی تھی یعنی ان اشخاص کی اپنی ذات میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب اگر اس لچک کی کوتاہی کے ظہور کے لئے سڑک میں کسی پتھر کے پڑے ہونے یا کسی شریر لڑکے کی شرارت کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ کوتاہی قدرتی اور طبعی طریقے پر خود اپنے خزانے میں سے اپنے ظہور کے لئے کوئی موقع نکال لے تو سامانِ تضحیک کی علت خارجی نہ رہے گی بلکہ داخلی بن جائے گی۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا دماغ اپنے گذشتہ افعال کے متعلق مصروف رہتا ہے۔ اور اس بات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا کہ وہ فی الحال کیا کر رہا ہے۔ یعنی اس کے خیالات زمانۂ حال سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں تو وہ اس کا وہی جواب دیتا ہے جو کہ اس نے کسی اور شخص کو کسی اور بات کے متعلق دیا تھا۔ اگر اس کے سامنے ایک گاڑی آ کر رک جاتی ہے تو وہ اس پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیتا ہے جس طرح وہ صبح اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا۔ یعنی چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حواس اور عقل دونوں میں ایک لچک اور چستی کی ایسی کمی اور کوتاہی ہے۔ کہ وہ زمانۂ حال میں وہ آوازیں سنتا ہے جو کچھ عرصہ ہوا بند ہو گئیں اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو آنکھوں سے کب کا اوجھل ہو چکا۔ اس کے حواس اور اس کی عقل میں اتنی لچک نہیں کہ وہ ان پر زور ڈال کر ان کو گرد و پیش کے حالات کے ساتھ مطابقت دیتا رہتا۔ جب کہ اس پر واجب یہ ہے کہ اس کے افعال حقیقتِ حاضرہ کے موافق ہوں۔ ایسی حالت میں سامانِ تضحیک (اور اس کی علت ظہور) خود اس شخص کی ذات کے اندر موجود ہے۔ ایسا شخص بعض اوقات بہت ہی مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو شیخ چلی کی کئی ایسی باتیں یاد آ جائیں گی جو اس خیال کی ترجمانی کریں گی۔

خیال کی غیر حاضری کا جز تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ اس کا مضحک ہونا بعض اوقات دیگر وجوہ سے اور بھی زیادہ قوت پکڑتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کو کسی شخص کے خیالات کے یوں غیر حاضر رہنے کی ساری تاریخ سے واقفیت ہو اس کی وہ تمثیل گویا آپ کی آنکھوں کے سامنے پیدا ہو۔ وہ آپ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ وہ کیسے بڑھتی رہتی ہے۔ اور کن وجوہ سے ترقی کر رہی ہے تو آپ کو اور بھی زیادہ ہنسی آئے گی۔ فرض کیجئے ایک شخص رات دن مجنوں اور فرہاد کے قصے پڑھتا رہتا ہے۔ اور چوبیس گھنٹے اس کا دل و دماغ عشق کی وحشت، صحرا نوردی، خود فراموشی، بے خودی اور دیگر کیفیات میں مبتلا رہتا ہے۔ صبح کو تسبیح، نماز وغیرہ کو ترک کر کے اتنا مجذوب و دلکش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کرنے لگ جاتا ہے۔ اب وہ چپکے چپکے اپنے آپ کو مجنوں کہتا رہتا ہے۔ اور اس کے خیالات اور ارادے اسی کی طرف مائل ہوتے ہوتے بالکل اسی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اگرچہ سے اس کی یہی حالت رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ اگر اور لوگوں کی صحبت میں شریک ہوا تو اس طرح گویا ایک مسلسل خواب اس پر طاری ہے۔ اور وہ اسی خواب میں رہ رہ کر چل پھر رہا ہے۔ اس کی باتیں اس طرح کی ہوں گی جیسے کوئی نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔ اب اس کی تمام حرکتیں کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسے شخص میں سامان تضحیک کس قدر موجود محسوس ہوتا ہے۔ جب آپ اس سے وقت پوچھتے ہیں تو وہ ایک شعر پڑھ دیتا ہے۔ اور کبھی وہ آپ کو اپنا محبوب فرض کر کے ایک قصیدہ پڑھنے لگ جاتا ہے۔ ایسے شخص کے خیال کی غیر حاضری میں یہ بات نہ سمجھئے کہ اس کا خیال غیر حاضر تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ کسی اور جگہ حاضر بھی ہے جہاں وہ موجودات کو بے خبر ہے۔ وہاں تخیلات سے باخبر بھی ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ گردوپیش سے بے کار ہے۔ بلکہ وہ ایک اور دنیا میں مصروف بھی ہے۔ ایسی ہستی اس شخص سے زیادہ مضحک ہے۔ جس کے خیال کے متعلق آپ صرف یہی جانتے ہیں کہ غیر حاضر ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ آخر وہ ہے کہاں؟ مگر جب آپ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ واقعات موجودہ سے بے خبر اس کا دماغ کس بات میں مصروف ہے تو وہ زیادہ مضحک ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص کو عوام میں جنونی اور پاگل کہتے ہیں۔ ان دیوانوں کو دیکھ کر جب ہمیں ہنسی آتی ہے تو ہمارے سامنے ہستی میں وہی تار لرزاں ہوتے ہیں جو کسی ایسے شخص کو دیکھ کر لرزاں ہوتے تھے۔ جو ایک شریر لڑکے کی شرارت کا تختۂ مشق بنتا ہے یا جو بازار میں دوڑتا ہوا پھسل کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیوانے بھی ایک نصب العین کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور اس تگ و دو میں کسی سخت درخت حقیقت سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اس بات میں بڑھے ہوئے ہیں۔ کہ ان کی بے خبری باقاعدہ منظوم و منضبط ہوتی ہے۔ اور ایک خاص مرکز کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے ان کے سوانح اور ان کے حالات و معاملوں کے ایک خاص سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو باہوش انسانوں کی منطق سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی عقل میں بھی کی ایک ایسی کمی ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنے حواس کو اپنی دنیا سے موڑ کر اس دنیا کے حواس کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ سکتے۔

مذکورہ بالا شخص کے ایک خاص خیال میں اس قدر ہٹ اور ضد ہے کہ وہ دماغ میں سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اس کے خیالات اس کے دماغ میں جگہ نہیں پا سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص مضحک حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اب ذرا اس سے آگے چلئے۔ اور غور کیجئے کہ جو تعلق ایک خاص خیال کی ہٹ کو انسانی دماغ سے ہے۔ وہی تعلق بعض برائیوں کو انسان کی سیرت سے ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بد اخلاقیاں دو قسم کی ہیں۔ بعض برائیاں ایسی ہیں کہ روح انسانی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ ان میں کود پڑتی ہے اور اپنی حیات سے ان برائیوں کو گویا زندگی بخش کر ان کو اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹتی چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح سے مختلف شکلوں میں انہیں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ایسی برائیاں درد انگیز اور علو تاثیر ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے مضحک برائی گویا ایک چوکھٹا سا ہوتا ہے۔ جس میں انسان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم میں حلول کر جائے وہ ہم پر مسلط ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے اپنے رنگ تنوع میں رنگ دیں۔ وہ ہمیں اپنی یکسانیت کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ ڈرامے اور کامیڈی میں فرق صرف اسی سے ہے۔ ممکن ہے کہ ڈرامے میں چند ایسی برائیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہو جو خاص اسماء سے موسوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ بھی اس طرح سے کیریکٹر کا جزو بدن بن

جاتی ہیں کہ ہم ان برائیوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ ان سے خواص کو اسے موسوم کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ان برائیوں کا خیال تک نہیں آتا۔ بجائے اصل کے جملہ پیش نظر صرف وہ کیریکٹر ہوتا ہے جس کی ذات میں ان برائیوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اسی لئے ایک ڈرامہ کا نام کوئی اسم ہوتا ہے۔ مثلاً اتھیلو، ہیملٹ وغیرہ لیکن ایک مضحک برائی خواہ وہ ایک شخص سے نہایت ہی چسپیدگی کے ساتھ وابستہ ہو پھر بھی اپنی علیحدہ نوعیت اور ہستی کو قائم رکھتی ہے۔ وہ بذات خود ایک کیریکٹر بن جاتی ہے جس کے اردگرد زندہ کیریکٹر گھومتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مضحک برائیاں کیریکٹروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں۔ اسی لئے ایک شخص جتنا زیادہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہوگا اسی قدر مضحک بھی ہوگا۔ ایک ڈرامے کے کیریکٹر کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ کیا ہے اس میں کونسی برائیاں ہیں۔ اور ان برائیوں کو ہم کس نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ میں کوئی مناسب تغیر پیدا کرنا چاہے لیکن جہاں صاحب تماشا محض اپنے مضحک ہونے کا احساس ہوا، وہیں وہ اپنی ذات میں ترمیم شروع کر دیتا ہے یا کم از کم یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اب اس میں وہ بات نہیں رہی۔ کچھ نہ کچھ تغیر ہوتا ہے وہ گویا ہنسی کی جنس مصلح اخلاق ہے۔

سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص میں جو دوڑتے ہوئے گر پڑتا ہے، اور اس شخص میں جو کسی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اور اس شخص میں جو ایک خیالی دنیا میں مبتلا ہے اور اس شخص میں جس کی سیرت کے نقائص مضحکہ انگیز ہوتے ہیں ان سب میں لچک یا فوری تبدیلی کر سکنے کی کمی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اور یہی سامان تضحیک کی رونمائی کا باعث ہوتی ہے۔ کشمکش حیات اور سوسائٹی کے تقاضے ہم سے ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری توجہ ہر وقت بیدار رہے اور ہم اس کے ساتھ واقعات حاضرہ کو پیش نظر رکھیں۔ ساتھ ہی ہمارے جسم اور دماغ میں وہ لچک پائی جائے جس کی بدولت ہم اپنے آپ کو موجودات کے ساتھ مطابقت دیتے رہیں۔ اگر ہمارے جسم میں اس کی کوتاہی ہو تو ہم مختلف عوارض و حادثات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر یہ کوتاہی ہمارے دماغ میں پائی جائے تو ہر ایک قسم کی بے وقوفی اور ہر ایک قسم کا جنون ہماری زندگی میں خلل انداز ہوتا ہے اگر یہ کوتاہی ہماری سیرت میں پائی جائے تو ہماری ہستی اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی میں بے جوڑ سی رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ اور طرح طرح کے جرائم ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ ہنسی گویا سوسائٹی کی ایک اخلاقی سزا ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق محض ظرافت طبعی سے نہیں۔ اگرچہ یہ کون نہیں جانتا کہ ہم ہنستے صرف اسی وقت ہیں جب ہم تھوڑا سا نفس کے تفکرات سے آزاد ہوکر ایک دوسرے کو صرف مخلوق فن اور دلچسپ صنعت کاریاں تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

"پطرس"

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

یہ مضمون آج سے چھتیس سال قبل لکھا ہے۔ اس وقت فرانس کے مشہور فلسفی ہنری برگساں کا فلسفہ بہت مقبول تھا۔ "عالم خواب"، "دماغ و قوت" اور "خندہ" کے متعلق اس کے نظریات دنیائے مغرب سے خراج تحسین وصول کر رہے تھے۔ پطرس نے اس کے فلسفۂ خندہ سے اردو کو پہلی مرتبہ روشناس کیا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ قابل مضمون نگار نے اس کے فلسفہ میں ادب کی انگریزی مثالوں کو اپنی معاشرت کے حسب حال بنانے میں مجتہدانہ قدرت سے کام لیا ہے۔

(ادارہ)

پاکستان میں تعلیم کا مستقبل

یہ امر یقیناً قابل مسرت ہے کہ سب سے پہلے جو کل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی وہ تعلیمی کانفرنس تھی جو سال گذشتہ ماہ نومبر میں کراچی میں ہوئی یہ وہ وقت تھا جب سرحد پار سے مہاجرین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا اور کشمیر کا مسئلہ روز بروز اس قدر نزاکت پکڑتا جا رہا تھا کہ بہ مشکل توجہ کسی دوسری طرف مبذول کی جا سکتی تھی اور پھر وہی اہم ترین سیاسی مسائل کے مقابلے میں تعلیم کا نمبر ویسے بھی بعد میں آتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تقریباً ایک سال گذر چکا اس عرصہ میں نہ تو تعلیم کی مد میں کوئی کثیر رقم مخصوص کی گئی اور نہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ ہوا نہ ہمارے نظام تعلیم اور طریق امتحان میں کوئی انقلاب برپا ہوا، اور نہ رضاکاروں اور کارکنوں کی کوئی جماعت ناخواندگی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے میدان عمل میں اتری لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا، تو بھی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے آزادی کے پہلے سال کو رائیگاں کھو دیا تو وہ بر خود غلط ہے اس لئے کہ اس عرصہ میں تعلیمی مسائل پر جوش و خروش سے گرما گرم بحثیں بھی ہوئی ہیں اور سنجیدگی و متانت سے غور و خوض بھی ہوا اور کل سال ہی میں پاکستان کے طول و عرض سے ماہرین تعلیم کا اجتماع منعقد ہوا تاکہ پاکستان کے تعلیمی مسائل کو سامنے لاکر ان کا حل تلاش کیا جائے۔

اگر مجھے ایک فرسودہ سا استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ ہماری تعلیمی آزادی ہماری پونجی ہے محض اس کی ملکیت احساس فخر و اعتماد پیدا کر دیتی ہے لیکن جلدی یا دیر میں ہمیں اس پونجی کو فوراً استعمال کرنا پڑے گا ورنہ اس کی حیثیت مردہ دھات سے زیادہ نہ رہے گی استعمال کی کئی صورتیں ہیں۔ یہ پونجی فضول خرچ لڑکے کے ہم دوبارہ مفلس بن سکتے ہیں پونجی کو ایسی مد میں لگایا جا سکتا ہے جہاں سے کوئی فائدہ نہ ہو یا سوچ سمجھ کر پونجی کو کسی سود مند کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے تعلیمی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہم جس طرح چاہیں جس کو چاہیں جو چاہیں پڑھائیں تعلیمی آزادی کا مطلب یہ ہے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم بلکہ یوں کہیے مکمل نصاب تعلیم میں حسب ضرورت مناسب رد و بدل کرنے کی آزادی۔ سات کروڑ بندگان خدا کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے کے لئے نہایت تفصیلی ڈھانچہ تیار کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلے میں مفصل تعلیمی رپورٹوں کی ترتیب و تدوین بھی ایک امر ناگزیر ہے پاکستان کے ماہرین تعلیم خواہ دفاتر میں ہوں خواہ یونیورسٹیوں میں خواہ خالص علمی حلقوں میں کئی ماہ سے غیر معمولی خلوص اور محنت سے اس قسم کی رپورٹیں مرتب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں ان کوششوں کے نتائج تاحال بار آور نہ ہو سکنے کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف تعلیمی مسائل پیچیدہ ہیں بلکہ ہمارے سامنے تعلیم کا نصب العین بھی مکمل طور پر واضح نہیں بہت سی حقیقی اور واضح چیزیں غیر حقیقی اور مبہم چیزوں سے کچھ اس طرح خلط ملط ہو چکی ہیں کہ امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ طریق تعلیم کو گذشتہ کئی برسوں سے بالاتفاق آمرانہ مذموم قرار دیا جاتا رہا ہے موجودہ نظام تعلیم سے بے اطمینانی و بددلی کے احساسات ہر جگہ موجود تھے اگرچہ ان جذبات کے اسباب و علل مختلف جگہوں میں مختلف تھے یہی وجہ ہے کہ پاکستان بنتے ہی لوگوں نے فوراً اس طرف توجہ کی اور موجودہ نظام تعلیم سے۔

نقائص سے آگاہ ہونے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ موجودہ نظام کے نقائص و عیوب کی مفصل و مکمل فہرست تیار کرنا غیر ضروری ہے صرف تین باتوں پر اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اوّل تو انگریزی زبان کی حیثیت ـــــــ ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم اور لازمی مضمون ہونے کی حیثیت سے جو اہمیت حاصل ہے وہ قومی نقطۂ نظر سے بھی اور علمی نقطۂ نگاہ سے بھی سب سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس اقدام کا نتیجہ ہمارے نظام کی بنیادی حماقت ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرا نقص ہے ہماری تعلیم کی غیر قومیت ـــــــ غیر قومیت کے مختلف مظاہر میں مثلاً ایک طرف تو یہ کہ دیسی ملکی زبانیں کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم نہ صرف مادی اعتبار سے فضول ہے بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ناکارہ اور لا یعنی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے ہماری تعلیم کی محدودیت ـــــــ پڑھے لکھے لڑکوں اور مردوں کی تعداد چند فی صد سے بھی کم ہے اور ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو محض دستخط کرنا جانتے ہیں اور عورتوں کا تناسب تو اس سے بھی کہیں کم ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نقائص کو دور کرنے کا ہمارے پاس کیا طریقہ ہے۔ ابھی تک ہم کسی آخری فیصلہ کن تعلیمی نتیجے پر تو نہیں پہنچ سکے لیکن بحث و تمحیص کے دوران میں بعض جدید رجحانات اور نئے میلانات منظرِ عام پر آئے ہیں ان کا جائزہ لے لینا بے سود نہ ہوگا۔ مثلاً زبانوں کے مسئلے پر کراچی کی تعلیمی کانفرنس میں بہت کچھ کہا گیا لیکن پھر بھی بہت کچھ نہیں کہا گیا۔ میں نے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ ...

"پاکستان میں صوبائی زبانوں کو نشو و نما کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے ہوں گے چنانچہ ہمیں ان صوبائی زبانوں کو مختلف صوبوں میں نہ صرف ذریعہ تعلیم قرار دینا ہوگا بلکہ دیگر ایسے طریقے بھی اختیار کرنے ہوں گے جن سے وہ تہذیب و تمدن جو کسی خاص صوبائی زبان سے مختص ہے اس زبان کے توسط سے ترویج و ترقی پائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی مدِنظر رکھنا ہوگا کہ ہماری (پاکستانی) کلچر کی وحدت و یگانگت کو صدمہ نہ پہنچنے پائے۔ ثقافتی وحدت کو برقرار رکھنے اور مختلف صوبوں کے درمیان ذریعہ مراسلت و مکاتبت و اظہارِ مشترکہ کا کام دینے کے لیے ایک خاص زبان کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں اردو زبان کے حقوق خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ اردو نہایت آسانی اور عمدگی سے بیرونی زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمو لینے اور جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو کا تعلق فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی سے تاریخی ہے اور اردو میں گراں بہا ادبی سرمایہ موجود ہے۔ ان سب وجوہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اردو پاکستان کی قومی زبان بننے کی مستحق ہے۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا یقیناً مضرت رساں ہے لیکن پھر بھی آئندہ کئی سال تک ہمیں انگریزی زبان کو یونیورسٹی کی تعلیم میں اور بین الاقوامی مراسلت و مکاتبت کے ذریعے کی حیثیت سے صفِ اوّل میں جگہ دینا پڑے گی۔ گزشتہ تیس چالیس برس سے فرانسیسی کی جگہ انگریزی دنیا کی ممتاز ترین زبان ہوتی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں محض ذاتی منفعت کے نقطۂ نگاہ سے قطعِ نظر

ہمیں اس قدر طلبا کو ایک ایسی زبان ہاتھ سے نہیں کھو دینی چاہیے جو نہایت آسانی سے ہمیں مغربی سائنس اور کلچر سے روشناس کرواتی ہے۔

فارسی اور عربی زبانوں میں ہمارا ثقافتی اثاثہ محفوظ ہے لہٰذا ان زبانوں کے مطالعہ کو بھی ہمارے نظام تعلیم میں ممتاز حیثیت حاصل ہوگی۔

(خطبہ صدارت پہلی کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)

اس اقتباس کو دو مرتبہ پڑھنے کی ضرورت ہے پہلی مرتبہ تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس میں ہماری قیادت کا کلی سامان ہے لیکن دوسری دفعہ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں ایک پیچیدہ مسئلہ کو صرف بیان کیا گیا ہے حل معلوم کرنا سوال باقی ہے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک کچھ نہیں تو نصف درجن زبانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہے اردو کو خاص اہمیت دی جائے گی کیونکہ یہ ثقافت و روحانیت کی خاطر صوبائی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ نشوونما کا موقع دیا جائے گا تمدن کی خاطر انگریزی کو صف اول میں جگہ دی جائے گی سنت کی خاطر فارسی اور عربی کو "ممتاز جگہ" دی جائے گی ثقافتی اثاثہ کی حفاظت کے سبب اب سوال یہ ہے کہ آیا تکمیل حیات ملی کے خاطر ہمارے لئے ان تمام زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے یا ان میں حق انتخاب یا کم از کم حق ترجیح بھی ہو سکتا ہے مختلف صوبوں میں مختلف حلقوں میں اس مسئلہ پر غور و فکر ہو رہا ہے لیکن ابھی تک کسی سے نقش قطعی کے صدور کی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

زبان اردو کے متعلق مختلف نظریوں کا اظہار کیا گیا ہے صدارتی خطبہ میں اسے پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) بننے کا مستحق قرار دیا گیا ہے لیکن یہ بہت غیر واضح اور مبہم سی بات ہے اور بعد کے مباحث سے ظاہر ہوا کہ اس سے مختلف معانی تعبیر کرنا ممکن تھا اس مسئلہ پر جب کمیٹی میں بحث ہوئی تو کمیٹی نے سفارش کی کہ اردو کی تعلیم و تدریس کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا جائے اور اسے تدریجاً زیادہ سے زیادہ حد تک ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے دوسرے لفظوں میں مشرقی پاکستان والے اسکولوں میں بنگالی کو ذریعۂ تعلیم تو رکھ سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصے تک نہیں، یہ تو ہوئیں کمیٹی کی سفارشیں جن میں پنجابی ممبروں کی اکثریت تھی لیکن جب معاملہ پوری کانفرنس میں پیش ہوا تو مشرقی بنگال نے اس کی زبردست مخالفت کی اور آخری جو سمجھوتہ ہوا اس کی حیثیت کچھ نیچے درجے کی سی تھی کانفرنس نے مجلس دستور ساز سے سفارش کی کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) تسلیم کر لیا جائے۔ یہ حیثیت اس سے بھی کمتر تھی جو صدارتی خطبے میں دی گئی تھی۔ کانفرنس نے یہ بھی سفارش کی کہ اردو کی تعلیم کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے لیکن اسے کس منزل سے شروع کیا جائے اس کی تعیین کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دے دیا گیا صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو اسے ذریعۂ تعلیم بنائیں اور نہ چاہیں تو نہ بنائیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ اردو کو اکثر قومی زبان کے خطاب سے نوازا جاتا ہے لیکن وقت آنے پر صورت مختلف ہو جاتی ہے ممکن ہے سیاسی رہنماؤں کی زیر قیادت مشرقی بنگال اردو زبان سے قطعی بے تعلقی کا اعلان کر دے لیکن مشرقی بنگال میں اردو زبان کے لئے بیش از بیش جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت ہے جب تک انگریزی موجود ہے اس وقت تک ایسے صوبے کے لئے اردو کا قومی زبان (لنگوا فرانکا) ہونا بھی زیادہ وقعت نہیں رکھتا سندھ اور صوبہ سرحد نے پنجاب کا ساتھ دے کر اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ آگے چل کر اگر سندھی نہیں تو پشتو یہ دعویٰ نہ کر دے کہ قومی یگانگت کے اندر ثقافتی انفرادیت کے تحفظ و بقا کی خاطر پاکستان کی تعلیمی ترقی میں مجھے اور زیادہ اہمیت ملنی چاہیے۔

مغربی پنجاب تو بلا شبہ اردو کا سب سے بڑا پرستار ہے مغربی پنجاب میں پنجابی کی حمایت کرنا یہاں سے غداری کے مترادف سمجھا جاتا ہے اس کی کچھ وجہ یہی ہے کہ پنجابی کو سکھوں نے اپنی محبوب زبان قرار دیا ہے ممکن ہے جب سکھوں کی یاد محو ہو جائے تو پنجابی کا گناہ بھی معاف ہو جائے لیکن اس سے پہلے نہیں لہٰذا یہاں مغربی پنجاب میں اردو نہایت آسانی اور سہولت سے اپنا راستہ طے کر رہی ہے جیسا ماضی میں تقسیم سے پہلے اردو کی نشوونما و ترقی میں ان لوگوں

نے خدشہ ظاہر کیا کہ وہ غیر مسلم ذہنی طور وہ تعلقات رکھتے تھے جن کے [illegible] انہوں نے چند بزرگوں کے ذہنوں میں یہ بھی خیال قائم ہو سکتا [illegible] جدید [illegible] منصوبہ دشمن کی چالیں ہیں ان کی چالیں [illegible] چند برس ہوئے کہ صوبہ پنجاب [illegible] نے فیصلہ کیا ہے کہ [illegible] اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہو [illegible] اردو اور دیگر ثقافتی مضامین کے [illegible] اہمیت دی ہے۔

اردو کی تحقیقی ترقی [illegible] کی بہت ضرورت ہے [illegible] ان مضامین پر کس قدر عمدہ کتابیں [illegible] علمی و تحقیقی [illegible] کے ذہنی ذوق کے لئے وسعت [illegible] پاکستان [illegible] کوئی [illegible] واضح قائم کر سکتے [illegible] متعلقات [illegible]

ہماری تعلیم [illegible] قومی ضروریات [illegible] ذیل [illegible] اس سلسلے میں کراچی کانفرنس کی سفارشات [illegible] منظور کی گئیں۔

پاکستان کے نظام تعلیم کی اساس اسلامی طرز فکر پر ہونی چاہئے [illegible] ملت [illegible] وحدت [illegible] پر زیادہ زور دیا جائے۔

عوام میں یہ کہنا "آزادانہ" [illegible] اعلان کہہ سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بالاتفاق منظور کر لیا گیا تھا در حقیقت اس قرار داد نے بہت سے ماہرین تعلیم میں تشویش [illegible] ان کا کہنا تھا کہ [illegible] اسلام سے مختلف ہیں کوئی مذہب بھی ان کے [illegible] اوصاف و فضائل کی بجائے عقائد [illegible] کا نظریہ یہ تھا کہ [illegible] توحید، رسالت، آخرت [illegible] اسلام [illegible] سے دو طرح کی فکر ہماری تعلیم پر غلبہ پانے کے لئے [illegible] قومیت کا مفاد [illegible]

یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری تعلیم اسلامی رنگ میں [illegible] مسلمانوں کی ہوگی لیکن سوال محض تشکیل کی ماہیت اور وسعت کا ہے اگر اس مسئلہ پر آزادانہ بحث کا موقعہ دیا جائے تو ہماری قوم کی ذہنی کشمکش مختلف مظاہر میں عیاں ہو جائے گی اور اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جو کمیٹی یا بورڈ موجودہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے وہ اس ذہنی کشمکش کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے چلئے یہ مان لیا کہ ہماری تعلیم پر قومی رنگ ہونا چاہئے لیکن "قومیت" کے مفہوم میں اختلافات ممکن ہیں یہ اختلافات جگہ جگہ اپنا سر ابھار دیتے ہیں مثلاً ہماری قومی زبان اردو ہے لیکن عربی بھی ہے کیونکہ "قومی" کا مطلب "پاکستانی" بھی ہو سکتا ہے "مسلم" بھی ہو سکتا ہے لیکن بعض ماہرین تعلیم نے تو نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ عربی کو درسوں کے ابتدائی مدارج میں ہی لازمی قرار دے دیا جائے پنجاب کی ایک کمیٹی میں یہ احساس قوی تھا کہ مڈل سکول میں عربی اور فارسی کو لازمی مضامین ہونا چاہئے (غالباً اردو اور انگریزی بھی) لیکن اس سے چشم پوشی اختیار کر لی گئی تھی۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ عربی اور فارسی میں سے ایک کی تعلیم لازمی قرار دے دی جائے لیکن اس تجویز کو اس خدشہ کی بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ اگر طلبا کو حق انتخاب دیا گیا تو وہ زیادہ تر عربی کی بجائے فارسی ہی لیں گے اس سے کم از کم والدین اور نصاب مرتب کرنے والوں کی آراء کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔

مصری کی کشمکش، دینی اور اخلاقی مضامین کے بارے میں ہے۔ افادیت کے حامی ادبی مطالعہ کو محض تعیش ذہنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جہاں تک ان سے بن پڑتا ہے وہ اقبال کے قومی شاعر ہونے کی ترجیح دیتے ہیں۔ یہ پیش کرتے ہیں ان کا تجزیہ کے علاوہ وہ اور بڑی بڑی الجھنیں ہیں۔ نہ موجودہ برصغیر کے طالب علم/استاد — فارسی صرف گلستان کے ذریعے پڑھائی جاتی ہے۔ قدیم "کیمیائے سعادت" پڑھنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ نہ مذہبی طرز فکر پر متاثر ہو کر طرز فکر — تاریخ تصوف کو، فلسفی فکر ذہن کے ارتقا کے مطالعے کی حیثیت سے پڑھا جاتا ہے، بلکہ یا محض کلمات کفر کے مجموعے کی حیثیت سے۔

یہ الجھنیں ہمیں ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہیں جہاں ہمیں ایک حرف ناجاں جنگ کا پیش کیا ہوا۔ اسلام اور مغربی طرف آتی ہیں اور فکر کی کا حقیقی یا غیر حقیقی تیئیج نظر آتا ہے۔ اس پر زبردست اختلاف ہے کہ کس حد تک اسلام بغیر اپنی مخصوص اساس کھوئے افکار جدید کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کیا ہم جدید ہونے کے ساتھ ساتھ "اسلامی" بھی ہو سکتے ہیں؟ کسی نے کبھی یہ سوال نہیں کیا کہ "کیا ہمارے لئے واقعی اسلامی ہونا بالکل ضروری ہے؟" سوال ہمیشہ یہ کیا گیا ہے کہ آیا ہمیں "ماڈرن" ہونے کی ضرورت ہے؟

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات مختلف اور متضاد ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح ان سب کو ایک نظم میں پرونا ہوگا ورنہ ہمارا نظام تعلیم ہماری احتیاجات کا بار اٹھانے کی استعداد سے محروم ہو جائے گا۔ سرسید کے زمانے میں بھی اس قسم کے سوالات کئے گئے تھے اور اس قسم کی الجھنیں اور پیچیدگیاں اس وقت بھی سطح پر ابھر آئی تھیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سرسید پر ہندوستان میں اسلام کی بیخ کنی کا الزام دھرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی ہمیں روحانی اور ذہنی سکون حاصل نہیں۔

اس مسئلے کا حل یا تو وقت کے ہاتھوں ہو سکتا ہے، جس میں دیر لگے گی، یا زبردست جنگ کے ذریعہ، اس میں خدشہ ہے کہ تعمیر سے زیادہ تخریب ہوگی یا قابل قیادت کے توسط سے جو اس وقت موجود معلوم نہیں ہوتی۔ جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی مباحث کا نتیجہ محض تبادلہ خیالات نہیں ہے بلکہ اشتعال کی صورت میں ظاہر ہوتا رہے گا۔ اشتعال کی علامتیں ابھی سے ظاہر ہیں۔ اگر ہم ہر مختلف زاویہ نگاہ کو تسلیم کر کے اپنے نصابوں میں اضافہ کرتے گئے تو طلبا اور ایک طرف سے ہماری تعلیم بجائے خود اس بار گراں کی شاید متحمل نہ ہو سکے۔ ہر تجویز کو اس شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے اور اسے لازمی قرار دئیے جانے پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نظام کے تحت جو طالب علم بھی کامیاب ہو کر نکلے وہ ایک ہی وسیع طالع کے مطابق چلا ہو۔ اب تک انگریزی، اردو، فارسی، عربی، دینیات، اسلامی تاریخ، عسکری تربیت اور سائنس، ان سب کو لازمی مضامین قرار دئیے جانے کی تجویزیں پیش کی جا چکی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ انہیں نہ صرف کالجوں اور سکولوں میں بلکہ مقابلے کے امتحانوں میں بھی لازمی قرار دے دیا جائے۔ ہمارے سامنے جو خطرہ اس وقت درپیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعلیم کا معیار بہت کم ہوگا بلکہ یہ کہ بہت بھاری ہوگا، اس قدر بھاری کہ یا تو تعلیم بالکل ناممکن ہوگی یا بالکل فضول ہوگی۔

تعلیمی حلقوں میں انگریزی کے متعلق بہت کم کچھ کہا سنا جاتا ہے بس خاموشی سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انگریزی ابھی جاری رہے گی۔ لیکن انگریزی کی پرجوش حمایت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بین الاقوامی رتبہ اور اہمیت کا تو احساس ہے لیکن اس کی معاشری اہمیت پہلے ہی بہت کم ہو چکی ہے اور اس کی پچھلی وقعت سے اگرچہ اعلانیہ انکار تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ ان حالات میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہوگا یا یہ کہ آیا اس کا مستقبل بھی ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی کے خلاف جو معاندانہ جذبہ پایا جاتا ہے خواہ وہ فطری اور حقیقی ہو اور خواہ انتقامی ہو اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ اس مضمون کی تعلیم کا معیار گر جائے گا۔ ایسے ماہرین تعلیم بھی موجود ہیں جو اس قسم کی صورت حال کو خالی از خطرہ تصور نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں منصوبہ اور ہادیوں و ماہرین کے بعد ادب کے مقابلے کا تعداد علمی از سر نو تیار کرنا پڑے گا لہٰذا ہمیں زمانہ حال کو زمانۂ تراجم بنانے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی کی مراجعت

یا اول سے پیچیدہ ہیں سے مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی تمام راز ہائے قدرت، خواہ چھپے ہوں یا کھلے، نظام کائنات سے برملا [illegible] اپنے علم اور زبان کے۔
تحفظ اور بقا کے جوش و خروش میں ہم انگریزی زبان سے بھی اجتناب [illegible] دوسرے درجے کی صنعت پیش ہو سکتی ہے

ان خطرات، مشکلات اور الجھنوں [illegible] کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک اتفاقی جنگ کی [illegible] جنگ بلکہ لڑائیاں [illegible]
کی کامل تربیت کی خواہش پاکستان میں اس وقت سب سے بڑی اہم ہے [illegible] کرنے سے آلات جنگ کی [illegible]
سنائی دیتی ہے حتیٰ کہ اس فزائیدہ مملکت کو بھی اپنے معاملات کو [illegible] سائنس کی جان کو
لیکن زندہ رہنے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی [illegible] سائنس کو محض چند ظاہری
شرائط کا پابند بنا کر منظور کرلے [illegible] سائنس داں، ٹیکنیکل ماہرین اور تجربہ کار [illegible] ٹیکنیکل [illegible] کی قیمت
برتری دی جاتی ہے اور تعلیمی مباحث میں سائنس [illegible] جاتی ہے [illegible] تعلق ہے جو
ہمارے دور میں [illegible] کی بنیاد [illegible] سائنس کا [illegible] حقیقت، صداقت،
بہت محدود اور تنگ ہے [illegible] احساس [illegible] کی صلاحیت [illegible] غیر اخلاقی
(اخلاقیات سے بے نیاز) نقطہ نظر کا بھی [illegible] تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود [illegible] الجھنوں اور پیچیدگیوں سے نکلنے میں
مدد دے سکتی ہے [illegible] بہتر ہے۔

اختتام سے قبل تعلیم عامہ و تعلیم بالغاں کے بارے میں بھی [illegible] مناسب ہیں [illegible] تعلیم کی موجودہ رفتار جاری
رہی [illegible] ناخواندگی اور جہالت دور کرنے کے لیے [illegible] سو سال درکار ہوں گے [illegible] کوشش کا مظاہرہ کریں اور اپنے
تمام وسائل کو بروئے کار لے آئیں [illegible] پڑھے لکھے آدمی کو استاد بنا دیں [illegible] سکول [illegible] سو سال کا کام [illegible] صدی میں سے
پایہ تکمیل [illegible] افسوس [illegible] بات قابل ذکر نہیں [illegible] برطانوی سامراج پر [illegible] ہمارے [illegible] نہیں
اپنے فائدے کے لیے پڑھایا

کس قدر افسوس کا مقام ہوگا اگر ہمارے ارباب اختیار بھی برطانوی روایت کو برقرار رکھیں اور اسے نہایت احتیاط سے پروان چڑھاتے
رہیں۔

———

ایڈیٹنگ کا فن

بہرحال خوش قسمتی سے یہ وہ حضرات بھی ایسے مل جائیں جو اس مضمون کو پڑھنا گوارا کریں۔ ان میں سے کم از کم ایک بزرگوار تو ایسے ضرور ہوں گے جنہیں سینما سے نفرت ہے اور اظہارِ نفرت میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔ باقی حضرات میں بھی بعض ایسے ہوں گے جو کبھی کبھی اس گناہ کا ارتکاب تو کر لیتے ہیں لیکن اقبالِ جرم نہیں کرنا چاہتے اور اکثر اوقات اپنے سینما تشریف لے جانے کی تاویل یوں فرمایا کرتے ہیں۔۔۔

”شام کو کوئی شغل نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں میری بیوی رونلڈ کالمین کے لمس کو بہت پسند کرتی ہے میں نے سوچا کہ لاؤ ہم بھی چلے چلیں چنانچہ ہم . . . .“

لیکن اس جگہ نہ تو میں ان صاحب کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں جنہیں سینما سے نفرت ہے نہ دوسرے گروہ کو جسے بیوی کے ساتھ ہم تصویر میں لطف آتا ہے اس لطف و مسرت سے محروم کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر سینما واقعی آرٹ کہلانے کے قابل ہے اور اس کے کمالات کا کوئی جداگانہ مظہر اور اس کے آرٹ کا کوئی مخصوص وسیلۂ اظہار ہے تو وہ کیا ہے؟ مصور کے کمالات کا مظہر خطوط اور رنگ ہیں۔ شاعر الفاظ کے ذریعے اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فلم کار کن چیزوں سے کام لیتا ہے، اس کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس مواد کے امکانات کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

اس قسم کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ فلم کیوں کر بنایا جاتا ہے کیونکہ اس طرح ہمیں یہ بتانے میں آسانی ہوگی کہ سینما میں کس قدر وسعت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فلم متحرک کیمرے کی تصاویر کے ایک سلسلہ کا نام ہے۔ جو یکے بعد دیگرے دکھائی جاتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ سینما کے شاٹ جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں۔ تو انہیں فلم کہا جاتا ہے۔ ”شاٹ“ فلم کے ایک ایسے ٹکڑے کا نام ہے جس کی تصویر متحرک کیمرہ میں بیک وقت لی جاتی ہے جہاں تسلسل ٹوٹا ”شاٹ“ ختم ہو جاتا ہے جب کیمرہ دوبارہ چلنے لگتا ہے تو دوسرا شاٹ شروع ہو جاتا ہے۔

قصہ (یا جو کچھ بھی فلم کا موضوع ہو) کے انتخاب کے بعد دوسرا مرحلہ فلم نامے کا مرتب کرنا ہے۔ میں یہ تو بہ تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ فلم نامہ کتنے مرحلوں سے گزرنے کے بعد تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے بلکہ میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ فلم نامے میں قصے یا موضوعِ فلم کی تمام روئداد کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اسے ”شاٹوں“ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر شاٹ کا حال پوری تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے اس کی تمام جزئیات کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے گویا وہ تمام اجزا ہیں جن کی ترکیب سے فلم کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی ترتیب اور تقدم و تاخر کے ساتھ فلم بند کر لئے جاتے ہیں جس ترتیب کے ساتھ انہیں پردے پر دکھانا منظور ہے۔ ہر شاٹ کے متعلق پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شاٹ کا موضوع

سا ہوگا

تیار ہو کر پیش کی جائے گی۔ یہ کہانی کس بات پر ختم ہوگی یا سینمائی صورت میں بیان کس طریقے سے۔ ابتدا میں رفتار پر لایا جائے گا یا؛ ابتدا میں سست تیز ہوتی جائے گی۔ رفتار پر بتدریج زور دیا جائے گا۔ اور یا تصویر کے نمودار ہونے اور غائب ہونے کا عمل آہستہ آہستہ ہوگا یا بسرعت۔ اور اگر دونوں صورتیں نہیں تو زیادہ پیچیدہ شاٹ میں سے رفتہ رفتہ نمودار ہو کر کے شاٹ میں تحلیل ہو جائے گی جسے اصطلاح میں حل تحلیل کہتے ہیں اور یا عمل تحلیل آہستہ آہستہ ہوگا یا تیز۔ اس کے علاوہ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شاٹ لیتے وقت کیمرہ ایک ہی جگہ رہے گا یا کہ "حرکت" کے قریب ہو جائے گا یا پیچھے ہٹ جائے گا یا اس کے متوازی حرکت کرے گا۔ اور گھوم کر پورے منظر کی تصویر لے گا۔

"فلم نامہ" میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ کس چیز کا شاٹ لیا جائے۔ کیمرہ اس کے سامنے کتنی بلندی پر ہوگا یعنی بلندی پر انسان کی آنکھ ہوتی ہے یا کسی اور نقطۂ بلندی سے شاٹ لیا جائے گا کیمرہ اس سے کس قدر فاصلے پر ہوگا شاٹ قریبی ہوگا یا وسطی یا بعیدی۔ غرض فلم نامے میں ان تمام سوالوں کے جواب اور ہر شاٹ کے متعلق تفصیلی ہدایتیں موجود ہوتی ہیں۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ فلم نامے میں شاٹ اسی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں جس ترتیب سے انہیں پردہ پر دکھایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاٹ لیتے وقت بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ شاٹ تو اسی ترتیب سے لئے جاتے ہیں جس میں سہولت ہو۔

فرض کیجئے کہ ایک کہانی کا آغاز ایک جنگل سے ہوتا ہے اور خاتمہ بھی۔ اگر صورت یہ ہے تو آپ جنگل کے تمام سین پہلے لیں گے اور باقی بعد میں اور پھر انہیں فلم نامے کے مطابق مرتب کرلیں گے۔ وہ اگر کیفیت یہ ہو کہ کہانی کا ایک سین تو ایک مقام قدرتی یا سٹوڈیو میں مصنوعی طور پر بنایا گیا ہو سے متعلق ہو تمام اور دوسرے سین کا تعلق کسی دوسرے مقام سے ہو [illegible] مقامات اسی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ فلموں میں ہوا کرتا ہے تو آپ وہ تمام مناظر جو ایک جگہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک مرتبہ لے لیں گے۔ اور پھر دوسری جگہ پہنچ کر تمام متعلقہ مناظر کا عکس لے لیا جائے گا۔ اس بات کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ ترتیب کے لحاظ سے جو سین پہلے ہے اسے پہلے لیا جائے۔ اور جو بعد میں ہے اسے بعد میں "فلم بند" کیا جائے۔ اس کے بعد آپ کو آخر تمام [illegible] کے فوٹو لے لیں گے۔ جب تمام واقعات اور حرکات کا عکس لے لیا جائے گا تو مسودات کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ایک ایک شاٹ الگ کرلیا جائے گا پھر ہر شاٹ میں کسی قدر کاٹ چھانٹ ہوگی (ہر شاٹ کے دونوں سروں پر کسی قدر زائد فلم لے لیا جاتا ہے تاکہ بعد میں اسے کاٹ کر تناسب پیدا کر دیا جائے) اور آخر میں یہ شاٹ مناسب ترتیب کے ساتھ جوڑ دیئے جائیں گے۔ اور فلم کی تکمیل ہو جائے گی فلم کی قطع و برید اور از سرِ نو شیرازہ بندی جسے تدوین یا ایڈیٹنگ کہتے ہیں۔ فلم سازی کا ایک اہم مرحلہ ہے کہ بعض ڈائریکٹر خصوصاً روسی ماہرین تو حقیقت میں فن اسی کو سمجھتے ہیں۔

سینما ایک "صوری" فن ہے۔ تمام صوری فنون سے کم عمر لیکن اس کم عمری کے باوجود اسے ایک حیثیت سے ان پر فوقیت حاصل ہے تمام صوری فنون "حرکت" کے اظہار سے قاصر ہیں۔ بہت ہوا کہ انہوں نے حرکت کا مفہوم ادا کر دیا۔ لیکن فلم کو یہ دشواری نہیں۔ وہ "حرکت" کو بین اور واضح طور پر ظاہر کر سکتا ہے۔ عمل ڈرامے کی جان ہے اور فلم میں بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہے کیونکہ فلم میں تو کوئی چیز دکھائی ہی نہیں جاتی۔ جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیات کی ترجمان ہو اور جس میں واضح طور پر حرکت نظر آئے۔ اور وہ فلم ہی کیا ہے جس میں حرکت، اور عکس کا اتار چڑھاؤ "ہم آہنگ" یا ہلاک دیا جانا اور یا حرکات کا باہمی تصادم نہ دکھایا جائے۔ تمام صوری فنون میں یہ امتیاز فلم کو ہی حاصل ہے کہ مسلسل حرکات اور روانی کو اس کا اصول موضوعہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ فلم کا آغاز حرکت سے ہوتا ہے اور ایک شاٹ سے دوسرے شاٹ کے درمیانی فاصلہ میں بھی تسلسل یا روانی موجود ہوتی ہے اور

یہی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے فنون سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ نے بہتر سے بہتر تصویر دار پوسٹ کارڈوں کے البم دیکھے ہوں گے جن پر تفریح گاہوں اور صحت افزا مقامات کے مناظر ہوتے ہیں۔ یہ تصاویر ایک خاص تعلق کی بنا پر یکے بعد دیگرے منسلک نظر آتی ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت کہاں ہے کہ ایک تصویر دوسری تصویر میں داخل ہو جائے اور ان متواتر تحلیل سے ایک تسلسل پیدا کرے جس سے فوراً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ لیکن یہ کون بتائے کہ کیوں کر ہوا؟ اس کے اظہار پر صرف فلم ہی قادر ہے۔ جب تک وقوعہ کی پوری ترتیب اور پوری صورت اور کیفیت اس کی ماورا ماہیت کو ہم میں دکھا جائے طمانیت نہیں آتی۔

ناول نگار اپنے منظر کی تصویر کھینچتا ہے۔ فلم ساز مناظر سے یہ کام لیتا ہے۔ فلم نگار کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ فلم نامہ لکھنے کے لئے قلم اٹھائے تو اس کے ذہن میں ایسی ہی اشکال ہوں جو بہ آسانی ایک دوسرے پر تحلیل ہو جائیں۔

ایک کہانی جو فلم کے لئے لکھی گئی ہے ایک فقرہ یہ ہے:۔

"زید اس کے مکان میں اکثر آیا کرتا تھا۔" یہ جملہ بحیثیت فقرے کے با معنی اور اعتبار مطلب پوری طرح ادا ہے۔ لیکن اسے اسی قسم کی صورت میں منتقل کر دینا ناممکن ہے۔ ناول نگار کے قلم سے جب یہ جملہ نکلا تو اس کے ذہن میں اشکال و صور نہیں بلکہ الفاظ تھے۔ یہ اسی صورت میں فلم کے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے ذہن میں الفاظ کے بجائے تصاویر ہوتیں۔ اکثر ایک غیر معین عدد ہے جس کے معنی کئی مرتبہ کے ہیں۔ اگر فلم میں زید کو اس مکان پر پانچ چھ مرتبہ آتا دکھایا جائے تو کہیں جا کر "اکثر" کا مفہوم ادا ہو گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر کا مفہوم ادا کرنے کا یہ طریقہ بے حد مسرف ہے۔ ایک فلم میں یہ مشکل اس طرح حل کی گئی تھی کہ زید مکان میں قدم رکھتا ہے تو بچے خوشی سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اور کتا اچھلتا اور دم ہلاتا اس کی جانب لپکتا ہے۔ اس طرح تماشائیوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ زید اس مکان میں نو وارد نہیں بلکہ اکثر آتا ہے۔

"اے وومن آف پیرس" نامی فلم میں جس کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا یہی مفہوم زیادہ لطیف طریقہ پر ادا کیا گیا ہے۔ مکان میں نہ تو بچے دکھائے گئے ہیں اور نہ کوئی پالتو حیوان تھا۔ عورت کے سوا مکان میں کوئی نہ تھا۔ زید ایک مکان میں داخل ہوتا ہے صوفے پر جا بیٹھتا ہے۔ کچھ دیر سگریٹ پیتا رہتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ میرے پاس رومال نہیں۔ وہ بغیر کسی پس و پیش کے اٹھتا ہے اور دوسرے کمرے میں جا کر نہایت بے تکلفی سے ایک دراز کھول کر ایک رومال نکال لیتا ہے۔

لیکن یہ تو ایسی مثالیں ہیں کہ کہانی پہلے موجود تھی۔ بعد میں اسے فلم کی صورت میں ڈھال لیا گیا اور بہتر یہ ہے کہ تصاویر سے کہانی مرتب کی جائے۔ گویا تصویر بمنزلہ بیج کے ہے جو کہانی کے پودے کو جنم دیتی ہے۔ اس کے برعکس کہانی کو بیج اور تصویر کو پودا فرض کر لینا سخت غلطی ہے۔ میں یہاں بعض اچھے فلموں کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں۔ جس کی ترتیب میں کسی خاص غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک نقاد نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہی فہرست بطور دلیل پیش کی ہے۔

دی کروزر پوٹمکن۔ دی کیبنٹ آف ڈاکٹر کیلی گاری۔ اے وومن آف پیرس۔ وارننگ شیڈوز۔ دی سالویشن ہنٹرز۔ ورائٹی۔ دی پلگرم۔ برلن اور دی میوزیکل سرکل۔

یہ سب کے سب کامیاب فلم ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی کسی ناول یا ڈرامے سے ماخوذ یا مقتبس نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب کسی ناول کو فلم کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو کیوں ناکامی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "ٹیس" کو لیجئے۔ فلم میں اگرچہ ایک قریب جا بجا تصرف کیا گیا ہے کہ کہانی کو مسرت انجام بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے ذرا قطع نظر کر کے دیکھئے تو بھی فلم اکثر حیثیتوں سے ناکامیاب نظر آئے گی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹامس ہارڈی نے جو مطالب الفاظ میں ادا کئے ہیں۔ انہیں تصاویر میں ظاہر کرنے کے لئے ہارڈی جیسے نکتہ رس دماغ کی ضرورت ہے جس میں اتنا تعمق ہو

فلم کار تصویر کے فن میں اتنی ہی مہارت رکھتا ہو جتنی عبارت پردازی میں ناول نگار رکھتا ہے۔ اس وجہ سے دونوں کی مشابہت سے موہوم تھا۔ اس فلم نے بہترین حصے جس میں ناول نگار نے بڑے زور سے ان کو صرف کیا ہے۔ دیکھئے زار سے زیادہ آپ سے …… کی کتاب کا بھا سا مصور ایڈیشن معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کا مقابلہ ایک اور فلم سے کیجئے یوں تو وہ بھی ناول سے ہی ماخوذ ہے لیکن جو حصہ میں پیش کر رہا ہوں اسی کے اعتبار سے کامیاب اور مختلف حیثیت سے جاتی ثابت ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فلم کا ڈائریکٹر ونش جیسا شخص ہے جس کا شمار کامیاب فن میں کیا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں فلم کی کامیابی کا راز خود ناول میں پنہاں ہے۔ ذیل میں ناول سے ایک ٹکڑے کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

" یکایک ذرا فاصلہ پر کھڑا ہو گیا اور اس کا ایک ہاتھ سلام کے لئے ٹوپی پر جا پہنچا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کا بے حس و حرکت مورت کھڑی ہے۔ زار کے پیش خدمت کا چہرہ تنگ کی رنگت جیسا ہوتا تھا۔ اور سپاہی پر رعب طاری ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے اس کے کندھے زار کی کے ساتھ ہو بہو بیٹھ گئے ہیں۔ کیپٹن کی چھاتی پر …… جاتا تھا۔

زار دروازے میں کھڑا تھا۔ آنکھوں نے چہرے پر چمک سے گئے۔ جو سیاہ تھیں۔ بھویں گھنی تھیں۔ اس کی نظر سے گذر کر برآمدے کے بیرونی حصے تک جا پہنچی تھیں۔ زار اس کیفیت میں آہستہ آہستہ قدم رکھتے بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر بدستور زرد رنگ چھائی ہوئی تھی۔ اس کا دہانہ کھلا ہوا تھا۔ جیسا معلوم ہوتا تھا کہ زار کچھ کہنا چاہتا ہے مگر وہ کیپٹن کے پاس سے گذرا۔ پھر بھی کچھ نہ بولا اور سلطنت کے بیرونی حصے میں جا کر ایک پھٹی ہوئی بجلی کے سامنے کے قاعدے کے مطابق سیدھا کھڑا ہو گیا۔ زار نے اشارہ کیا اور کپتان کے چہرے پر موت کی طرح زردی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد بلند آواز میں پکارا۔

" مرادیف "

ایڈجوٹنٹ تین قدم آگے بڑھ کر زار کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ زار نے شاہ کپتان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اسے بطور تنبیہ پیدل فوج کی رجمنٹ متعینہ مولیت میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

مرادیف نے حکم کی یادداشت رکھ لی۔ زار کی ملاقات کا وقت ختم ہونے پر اس کا مضبوط جسم اور خشونت آمیز چہرہ نظر آتا تھا۔ آپ نے نیم باز آنکھوں سے معتوب کپتان پر نظر ڈالی جس کی نگاہوں میں غصہ کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اور اس کے ابرو کسی قدر اوپر چڑھ گئے۔"

کیا اس سے زیادہ واضح اور سینما کے مقاصد سے اس قدر مطابقت رکھنے والا کوئی ناول لکھا جا سکتا ہے۔ ہر فقرہ بجائے خود ایک تصویر ہے جس میں جنبش حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر جب فلم نگار کا قلم ان تصویروں میں رنگ بھرتا ہے تو اور کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً زار ایک جگہ کہتا ہے سمرا میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں۔ میرا باپ بھی قتل کیا گیا تھا اور غالباً میرا بیٹا بھی کسی دن میری طرح قتل کر دیا جائے گا۔

اس فلم کا اصل جدت طرازی دیکھئے کہ زار کے منہ سے یہ الفاظ کہلوانے کی بجائے اس کے باپ دادا کی تصویر دکھائی جاتی ہے جو نہایت مؤدب طریق پر ہماری نظروں سے گذرتی ہے۔ آخری تصویر کے سامنے جو اس کی اپنی شبیہ ہے ٹھہر جاتا ہے۔ یہ عجیب پُرحسرت منظر ہے۔ زار کی آنکھوں میں انجام کی اور استفہام کی ملی جلی کیفیت نظر آتی ہے گویا ہی کچھ مانگ بھی رہی ہیں کچھ پوچھ بھی رہی ہیں۔

ایک جگہ تاو دست افکن ہے کہ" زار نے گھونسا تان کر کہا۔ میں زار ہوں اور زار رہوں گا" فلم نگار نے یہاں بھی اپنی صنعت آفریں قلم کے عجیب کرشمے دکھائے ہیں۔ زار بھاگ کر اپنے دربار کے کمرے میں پہنچتا ہے۔ قاتل پیچھے پیچھے ہیں۔ زار بھاگ کر چبوترے پر چڑھ جاتا ہے اور تخت کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اپنا ہاتھ بلند کر کے کہتا ہے۔

* میں زندہ ہوں ۔۔۔ رہوں گا۔

فلم نگار کے قلم کی ذرا سی جنبش نے اس منظر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جب ناول کے مقاطع کو جو خود تصاویر سے کم نہ تھے زبانِ واضح ترک کر دیا جائے تو ایسی فلم کی کامیابی پر کیسے تعجب ہو سکتا ہے۔

فلم جن مرئی اشکال سے بنتا ہے وہ بہ آسانی دوسرے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔ ایک تصویر پردے پر جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری تصویر لے لیتی ہے۔ وہ یہ رنگ بدلنے اور نئے نئے پیکر اختیار کرنے والی شکلیں اپنے حالات کی ترجمان آپ ہوتی ہیں۔ ہر تصویر واضح اور غیر مبہم معنی رکھتی ہے جن کی شرح بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ذہن خود بخود انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہر خیال کو سینکڑوں طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہزاروں تصویریں بن سکتی ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ پہلے غور و فکر کے بعد تصاویر کا انتخاب کیا جائے، اور وہی تصاویر منتخب کی جائیں جو سب سے زیادہ واضح ہوں، اور ہمارے مقصود ذہنی کو پوری طرح ادا کر سکیں۔ کیمرہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، چھوتا ہے، سونگھتا ہے، چکھتا ہے۔ گویا وہ انسان کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے لیکن اس کی آنکھ بے پروا تماشائی کی آنکھ نہیں، بلکہ وہ ہر چیز کا مطالعہ ناقد نگاہ سے کرتا ہے اور فنکار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیمرہ کی وسیع طاقت اور قوت سے سہارا لینے کے لئے موجود ہے۔

فرض کیجئے کہ ہمارے سامنے دربار شاہی کا منظر ہے۔ تماشائی اگر اس منظر کا پوری طرح مشاہدہ کرنا چاہے گا تو وہ بالا خانے پر چلا جائے گا تاکہ بلندی سے تمام منظر اچھی طرح دیکھ سکے۔ پھر بھی اس کی خواہش یہ ہو گی کہ بادشاہ کو قریب سے دیکھے درباریوں کے ہجوم میں مل کر ایک ایک چیز پر نظر ڈالے۔ لہٰذا تماشائی کی آرزو پر پوری طرح تصرف کرتا ہے۔ تماشائی انہیں چیزوں کو دیکھتا رہتا ہے جنہیں فلم ڈائریکٹر انہیں دکھانا چاہتا ہے اور پھر ان مناظر کا انتخاب اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ تماشائی انہیں صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی مقام پر فلم کار کے جوہر کھلتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ فلم میں جو قدرت ہے وہ تھیٹر میں نہیں۔

فلم کی قدرت کا دائرہ اس اعتبار سے بھی وسیع ہے کہ وہ جزئیات اور تفصیلات کو نہایت واضح طور پر پیش کرنے کی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ فلم کا کیمرے کی مدد سے ہر چیز کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور تصویر کی روح کو بے نقاب کر دیتا ہے چنانچہ ایک نقاد لکھتا ہے کہ

کیمرہ ہمیشہ زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی ایسی پوشیدہ چیزوں تک پہنچتا اور انہیں بے نقاب کر دینا چاہتا ہے جنہیں عام تماشائی کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ کیمرے کی قدرت کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ جو چیز بھی اس کے سامنے آتی ہے وہ اسے سلولائڈ پر محفوظ کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی تصویر کو دیکھتے ہیں تو بہت دیر کے بعد اچھی خاصی کوشش کرکے ہماری نگاہ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم تصویر کے محاسن کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن فلم میں نہ اتنا وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے نہ تصویر کی خوبیاں سمجھنے کے لئے کسی کوشش کرنا ضروری ہے۔

فلم کو ایک اور بھی سہولت حاصل ہے جو اس سے بھی بڑھ کر کہیں اہم ہے۔ فلم اپنے لئے الگ زمان و مکان پیدا کر لیتا ہے جو حقیقی زمان و مکان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سٹیج میں کسی حد تک یہ بات ہے کہ اختتام زمانہ کو واضح کرنے کے لئے پردہ گرایا جاتا ہے یا اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن فلم اس بارے میں تھیٹر پر سبقت لے گیا ہے۔ سٹیج پر ہر کریکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک حرکت کرتا ہے اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی اہم واقعہ اسی وقت رونما ہوتا اور کسی ایکٹر یا پروڈیوسر کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس بعد مکانی کو جو ان دونوں نقاط کے درمیان حائل ہے دور کر سکے یا اس وقت کو جو فاصلہ طے کرنے میں صرف ہوتا ہے مٹا ڈالے اور تماشائی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جب کیریکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی جانب حرکت کر رہا ہو تو وہ اپنے ذہن کو معطل کر سکے۔

اب دوسری طرف ملاحظہ کیجیے جو اس بعد مکانی کو زمانی سالمیت سے متاثر کرتی ہے۔ ایک شاٹ اس وقت قطع ہوتا ہے جب کیمرہ فقط سامنے ہوتا ہے۔ اور دوسرا اس وقت جب وہ نقطہ تک پہنچ جاتا ہے پھر دونوں شاٹ ملا دیے جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر سے آپ کی ساری توجہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وقت کو ایک دھارا سمجھئے جس کے بعض لمحے اہم ہوتے ہیں اور بعض غیر اہم۔ فلمساز بس ضروری جز ہی اہم سمجھ کر ان کو انتخاب کرتا ہے بلکہ جوڑ کر کے ایک نیا زمان پیدا کر دیتا ہے جس میں صرف اہم لمحے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہے تو ایک جگہ وقت کو روک کر آگے جائے اور دوسری جگہ جست دکھائی دے اور دو مختلف مقامات میں یک وقت دو مختلف کیفیتیں نظر آئیں اور وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ وقت کا سیل دو شاٹوں میں تقسیم ہو جائے۔ وہ دو حادثے پہلو بہ پہلو بیتتے نظر آئیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فلم میں جب کوئی ایسا منظر دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف ایک مصیبت زدہ کی زندگی کے آخری لمحے ہیں اور دوسری طرف کوئی اسے نجات دلانے چلا ہے تو فلمکار اپنے فن کے ایسے ہی عجائب و غرائب دکھا رہا ہے۔

جس طرح آپ فلم میں نیا زمان پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح نیا مکان بھی خلق کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک ڈائریکٹر چند ایسے مناظر فلم بند کرتا ہے جو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بعد مکانی حائل ہے لیکن وہ ان تمام اجزا کو ملا کر ایک نیا "فلمی مکان" بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک روسی نقاش کلیشوف نامی نے جو فلم سازی کے فن میں بصیرت رکھتا ہے ۱۹۲۰ء میں تجربے کے طور پر حسب ذیل مختلف شاٹ جمع کئے تھے۔

۱۔ ایک نوجوان بائیں جانب سے دہنی جانب جاتا دکھائی دیتا ہے۔
۲۔ دوسری جانب سے ایک عورت آتی ہے۔
۳۔ وہ دونوں ملتے اور ہاتھ ملاتے ہیں۔ نوجوان انگلی سے اشارہ کرتا ہے۔
۴۔ ایک وسیع سفید رنگ کی عمارت دکھائی جاتی ہے جس کی سیڑھیاں بہت فراخ ہیں تو وہ سیڑھیوں سے چڑھ کر مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام مناظر الگ الگ مقامات پر لئے گئے تھے۔ اور پھر انہیں مندرجہ صدر ترتیب سے فلم کے پردے پر دکھایا گیا تو دیکھنے والوں کو ایک مرتب واقعہ نظر آیا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک عورت آپس میں ملتے ہیں۔ مرد پاس کے مکان کی طرف اشارہ کر کے اندر چلنے کی دعوت دیتا ہے اور دونوں مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سارے اجزا الگ الگ مقامات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً وہ نوجوان ماسکو کی ایک پبلک عمارت کے قریب تھا اور عورت شہر کے دوسرے حصے میں تھی۔ مصافحہ انہوں نے ایک تھیٹر کے پاس کیا جو ان دونوں مقامات سے بہت دور واقع ہے۔ سفید رنگ کی عمارت کا شاٹ کسی امریکن فلم سے لیا گیا تھا (درحقیقت یہ سفید رنگ کی عمارت امریکہ کا مشہور قصر سفید تھا اور سیڑھیاں جن سے وہ چڑھ کر مکان میں داخل ہوئے ایک گرجا کی سیڑھیاں تھیں) اب دیکھیے کہ سلولائڈ کے مختلف ٹکڑے ملانے سے ایک نیا "فلمی مکان" پیدا ہو گیا جو محض نمائشی سراب ہے اور درحقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہی چیز ہے جسے "تخلیقی جغرافیہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پڈوکن سب سے پہلا فلمکار ہے جس نے فلمی مکان و زمان کا تخیل وضاحت سے پیش کیا۔ گو اب دنیا کے ہر ملک میں اکثر ڈائریکٹر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور فائدہ کیوں نہ اٹھائیں اس سے کیمرہ کی قدرت کے امکانات بھی بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سال جو بات پڑی تھی اس سے اگلے سال کام لیا جا سکتا ہے۔ ایکٹر دیکھیے قطب مینار سے کودتا ہے اور ریلوے سائڈنگ میں آگرتا ہے۔ آپ کسی کمرے سے باہر قدم رکھئے۔ اپنے آپ کو شالامار باغ میں پائیے گا۔ خواہ آپ نے کمرے سے باہر نکلنے سے کئی سال پہلے یا کئی سال بعد شالامار باغ میں قدم رکھا ہوگا

اب آپ پر واضح ہو گیا کہ فلم کے حدود کس قدر وسیع ہیں۔ انسان کا ذہن کہاں سے کہاں تک پہنچا ہوا ہے۔ فلم کا منظر تو ایک ہنر ہی ہے اور جس زاویہ سے چاہے دنیا پر نظر ڈالے۔ جس نقطہ سے چاہے مشاہدہ کرے۔ اور ساری جزئیات کو ایک ایک کر کے دیکھا جائے اس میں یہ بھی قدرت ہے کہ زمان و مکان دونوں پیدا کرے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ڈائریکٹر کی خواہش کے ساتھ کیمرہ کا ہاتھ نہیں۔ فلم کے سامنے ساری کائنات اور زمانہ کا تمام سلسلہ پڑا ہے اسے اختیار ہے کہ زمان و مکان کے دامن میں جتنے نقش و نگار جلوہ گر ہیں ان میں سے جسے چاہے منتخب کرے اور جسے چاہے چھوڑ دے البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے۔ اور ایک فلم پر کیا موقوف ہے ہر فن میں انتخاب کو اہمیت حاصل ہے۔ میں پہلے مثال کے طور پر "مسعود حسن آشتیاں" کے ایک شاٹ کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا۔ اور یہ پہلا فلم تھا جو چارلی کی نگرانی میں تیار ہوا۔ لیکن اس میں خود اس نے پارٹ نہیں کیا بجز ایک نہایت ہی معمولی مختصر پارٹ کے۔ جہاں تک ڈائریکٹر کے فرائض کا تعلق ہے۔ یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ میں نے جو مثال پیش کی تھی وہ آپ کو یاد ہو گی۔ اور ابھی آپ کے ذہن سے اس شخص کا خیال محو نہیں ہوا ہو گا۔ جس نے دروازے سے رومال نکالا۔ تو ایک مردانہ کالر بھی گر پڑا۔ اس نے کالر اٹھایا اور پھر دراز میں رکھ دیا۔ عورت کے مکان میں مردانہ کالر کا پایا جانا اور مہمان کا اس پر اظہار تعجب نہ کرنا۔ غور کیجئے ایک کتنا بلیغ انداز بیان ہے جس انتخاب کی بدولت جزئی باتوں میں کیا کیا نزاکتیں بھری جا سکتی ہیں اور کیا کیا معنی پنہاں کئے جا سکتے ہیں۔ "ان ٹالرنس" میں جس کا ڈائریکٹر ڈی ڈبلیو گرفتھ تھا ایک عورت دکھائی گئی جس کا خاوند کسی عدالت میں ماخوذ تھا۔ وہ بیچاری کاس انتظار میں بیٹھی ہے کہ دیکھیں جج مقدمہ کا کیا فیصلہ کرتا ہے۔ یہیں صرف اس کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ یا ہاتھ جنہیں وہ بار بار مروڑتی ہے لیکن اس کا بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ تشویش و فکر کے جتنے مظاہرے ہو سکتے تھے ان میں سے ڈائریکٹر نے صرف وہی منتخب کئے ہیں جو سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوں

ایک اور مثال سنئے۔ پچھلی گرمیوں میں "واشٹ پر فارمنس" نام ایک فلم لاہور میں دکھایا گیا تھا پال جونس ڈائریکٹر تھا اور کونراڈ ویٹ ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ کہانی کا موضوع اگرچہ ایسا شاندار نہ تھا لیکن صنعتی اور فنی حیثیت سے یہ فلم حد کمال کو پہنچا ہوا تھا اور ڈائریکٹر نے اپنی قابلیت کے جو کرشمے دکھائے ہیں ان کے لحاظ سے بہت قابل تعریف تھا۔ اس میں سے ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

ایک مداری ایک شعبدہ دکھاتا ہے وہ یہ کہ اس کا ایک اسسٹنٹ ایک صندوق میں داخل ہوتا ہے۔ صندوق کے پہلوؤں میں سوراخ ہیں جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں۔ ان سوراخوں میں سے صندوق میں اس طرح تلواریں داخل کی جاتی ہیں کہ اس کا بچ جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے تلواریں نکال لی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ تلواریں نکال لی جاتی ہیں اور صندوق کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے کہ وہ صحیح و سالم نکل آتا ہے۔ ایک دن مداری کی نیت بدل جاتی ہے اور وہ ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے کھیل ہی کھیل میں سچ مچ قتل کر ڈالے۔ اب غور کیجئے۔ کھیل دیکھنے والے اس ارادۂ قتل سے آگاہ کر دیا جاتا ہے تماشائی اس کے نتیجے کے لئے بیٹھے تھے۔ سب بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ کہ کب صندوق کا ڈھکنا اٹھتا ہے مقصود اس بے چینی کو بڑھانا اور کانپتے ہوئے دلوں کی ترجمانی کرنا ہے۔ صندوق سے تلواریں نکال کر اس طرح سٹیج پر کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ ان کے قبضے اوپر کی جانب ہیں۔ اور نوکیں فرش پر دھنسی ہوئی ہیں ڈائریکٹر کو اس مقام پر یہ فکر تھی کہ کسی طرح دیکھنے والوں پر اضطراب و بے تابی اور تذبذب کی کیفیت طاری ہو جائے چنانچہ اس نے ایک ایسا شاٹ لیا جس نے تماشائیوں کو عجیب حیص بیص اور گومگو میں مبتلا کر دیا۔

مداری سٹیج پر کھڑا ہے اور اس کے سامنے تلواروں کا ایک کٹہرا سا بن گیا ہے کیمرہ نشیب میں رکھ دیا گیا تاکہ مداری کا سر تلوار کے دستوں کے عین اوپر نظر آئے تلواروں کے دستے بر محل ہیں اس لئے ان میں ایک لرزش سی پیدا ہو گئی ہے اور پھل چمک رہے ہیں ان کے اوپر مداری کا ہیبت ناک چہرہ دکھائی دیتا ہے اس شاٹ نے دیکھنے والوں پر وہی کیفیت طاری کر دی۔ جو آرکسٹرا کے گمبیر نغموں کا زور سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

ایک منظر جب پردے پر دکھایا جاتا ہے تو [illegible] ہیں۔ اس منظر کے پہلے شاٹ میں آپ کو [illegible] دکھایا گیا ہے۔ دوسرے شاٹ میں [illegible] اس کے بعد تین شاٹ [illegible] شاٹ میں [illegible] کی تفصیل [illegible] ہیں۔ تیسرے میں [illegible] ایک شاٹ [illegible] تصویریں [illegible] شامل ہے۔

[illegible] ایک اور مثال لیجئے۔ [illegible] انتخاب کی [illegible] شاٹ لیے جاتے [illegible] ہندوستان میں [illegible] تماشائیوں [illegible] اور تماشائی [illegible] ہیں۔ [illegible]

اس پہلی مثال سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ تصویروں کے انتخاب میں [illegible] فلم کار کے حسن انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ [illegible] لیکن یہ فیصلہ تو فلم کار ہی کا کام ہے کہ وہ کیا دیکھے اور کیا دکھائے۔

فلم کے مناظر جیسے کا فن جوں جوں ترقی کرتا جاتا ہے فنکار ایسے نئے نئے طریقے دریافت کرتے جاتے ہیں جن کی بدولت وہ فلم کی جزئیات کو نمایاں کر کے پیش کر سکتا ہے ان نئے نئے طریقوں کے طفیل ڈائریکٹر کو یہ قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اظہار واقعات پر [illegible] اہم واقعات کو زیادہ نمایاں اور واضح کر کے پیش کرتا ہے ان میں رنگ بھرتا ہے اور جو واقعات زیادہ توجہ کے محتاج ہیں انہیں ہمارے ذہن پر نقش کر دیتا ہے۔

تصویر کو واضح اور نمایاں طور پر پیش کرنے کا ایک طریقہ "کلوز اپ" یا قریبی شاٹ ہے۔ کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے تو قریبی شاٹ سے وسطی شاٹ تک پہنچتا ہے اور وسطی شاٹ سے [illegible] تبدیلی پیدا ہوتی ہے گویا جوں جوں جزوی حرکات کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے وہ پیچھے ہٹتا جاتا ہے جب تصویر مدھم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے تو تماشائی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ منظر سے رفتہ رفتہ جدا ہو رہا ہے۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ ابھرتی ہے تو جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اوقات کیمرہ گھومتا ہے اور پورے منظر کا [illegible] ہے بعض اوقات سارا وسیع منظر سامنے ہوتا ہے۔ تمام جزئیات دکھائی دیتی ہیں۔ اور پھر کسی ایک جگہ پر تماشائی کی توجہ مرکوز کر دی جاتی ہے یعنی کوئی چیز جسے نمایاں کرنا مقصود ہو ایک چھوٹے سے حلقے میں اس طرح دکھائی جاتی ہے کہ وہ ہماری توجہ جذب کر لیتی ہے پھر کبھی ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان مختلف طریقوں کو فلم سازی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ چنداں محتاج بیان نہیں۔

اب تدوین یعنی "ایڈیٹنگ" کو لیجئے جسے فلم سازی کا آخری مرحلہ کہنا چاہئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب سارے سلسلے کو فلم بند کر لیا جاتا ہے تو [illegible] کر کے شاٹ الگ الگ کر دیے جاتے ہیں پھر ہر شاٹ میں کسی قدر قطع و برید ہوتی ہے اور آخر کار سب شاٹ مناسب ترتیب و تسلسل سے جوڑ دیے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ میں آج کل ایڈیٹر کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ فلم کے [illegible] ہو جاتا ہے تو [illegible]

جیسی تھی ادا کس کے کام کو فلم سازی کے دوسرے مرحلوں کے مقابلے میں رکھا جائے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کو نیا مواد تخلیق نہیں کرنا پڑتا۔ وہ مشین کی طرح ایک بند ذخیرے سے بندھا ہوا ہے۔ وہ تو صرف مواد پر چلتا ہے یعنی مختلف شاٹ جمع ہو جاتے ہیں تو انہیں کاٹ کر جوڑ دیا جاتا ہے لیکن پڈوکن اور جیسے ڈائریکٹر تو تدوین کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اسے تدوین کی بجائے تعمیر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تدوین ہی حقیقت کی پکڑ اور تخلیقی قوت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ میں بھی اس مضمون کے اغراض کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تدوین کو محدود نہ سمجھا جائے اور اس لیے اسے وسیع معنی میں لیا جائے۔ بعض باتوں کے لیے مجھے الگ عنوان قائم کرنے پڑیں گے۔ ایک ترتیب سے کیا جاتا تمام فنون لطیفہ میں دو چیزیں ضروری ہیں ایک اصل مواد اور اس کی ترتیب کا اسلوب۔ یہ ضروری ہے کہ مواد کو اس فن سے خاص مناسبت ہو۔ مصور کا مواد مختلف رنگ ہیں جنہیں وہ کینوس کی سطح پر ترتیب دیتا ہے۔ مغنی کے نزدیک آوازیں مواد ہیں جنہیں وہ نغمے کے مطابق مرتب کرتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فلم ساز کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس کی ترتیب کا طریقہ کیا ہے۔ پڈوکن کے نزدیک فلم کا مواد اس کے اجزا یعنی مختلف شاٹ ہیں اور ان کی ترتیب کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں ایک خاص تسلسل سے جوڑا جائے جس سے ذہن کی تخلیقی قوت معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ آپ بتاتے ہیں کہ عام لوگوں کے نزدیک فلم سازی کا فن ایکٹروں کی حرکات و سکنات سے شروع ہو کر شاٹ پر ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ سارے مراحل تو ابتدائی مراحل ہیں۔ فلم ساز کا اصل کام تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب ڈائریکٹر فلم کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنے لگتا ہے کیونکہ انہیں جیسے جوڑا جائے ویسے ہی معنی پیدا ہوتے ہیں۔

فلم ایڈیٹر کے سامنے دو باتیں ہوتی ہیں ایک تو اس امر کا فیصلہ کہ شاٹ کتنا لمبا ہو، دوسرے یہ بات کہ شاٹ کس ترتیب سے جوڑے جائیں۔ ان دونوں باتوں میں سے ترتیب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ فلم کے معنی کا انحصار اجزا کے سیاق و سباق اور ان کے باہمی ربط پر ہے۔ جس طرح ایک جملے کے معنی کا انحصار الفاظ کی ترتیب پر ہے اسی طرح فلم کے معنی بھی اجزا کی ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو جملے لیجئے: "کتے نے آدمی کو مار ڈالا، آدمی نے کتے کو مار ڈالا۔" دیکھئے لفظوں کی ترتیب میں تھوڑے سے الٹ پھیر نے سارے جملے کے معنی بدل ڈالے۔ یہ مثال فلم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ ایک متبسم چہرے کا شاٹ لیجئے۔ دوسرا شاٹ ایک پستول ہو جو کھلونے سے کھیل رہا ہو اور تیسرا شاٹ اسی چہرے کا لیکن اب تبسم کی بجائے تیوری پر بل پڑے ہوئے ہوں۔ اگر یہ تینوں شاٹ اسی ترتیب سے دکھائے جائیں تو آپ ان کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ یہ شخص بچے کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔ اب ساری ترتیب الٹ دیجئے۔ یعنی آخری شاٹ پہلے آ جائے اس کے بعد بچہ کھیلتا نظر آئے پھر متبسم چہرہ دکھائی دے تو اس کے معنی بالکل بدل جائیں گے۔ اسی مثال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو شخص فلم کے اجزا کو ترتیب دیتا ہے (اسے ڈائریکٹر کہیے یا ایڈیٹر کے نام سے پکاریے) بہرحال وہی فلم کا جز دانتا ہے۔ فلم کی کامیابی میں ایکٹر کی ہنرمندی کو کوئی دخل نہیں۔

بعض روسی ڈائریکٹروں نے تدوین کی قدرت کے اس حد تک قائل ہیں کہ ان میں سے ایک نے تدوین کی رنگا رنگیوں کو واضح کرنے کے لیے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے۔ اس نے کسی فلم سے مشہور روسی ایکٹر موس یوخین کے کئی "کلوز اپ" یعنی قریبی شاٹ لیے۔ اس نے کلوز اپ بھی ایسے منتخب کیے جن میں ایکٹر کے چہرے پر کسی جذبے کے اثرات نظر نہیں آتے ہیں۔ پھر اس نے اپنی فلم کے دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ تین مختلف طریقوں پر شاٹ جوڑ دیا۔ ایک کلوز اپ کے ساتھ ایک شاٹ جوڑا۔ جس میں میز پر شوربے کی ایک پلیٹ پڑی دکھائی گئی تھی۔ ان دونوں کے ملانے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موس یوخین شوربے کی جانب دیکھ رہا ہے۔ دوسری مرتبہ اس نے اسی کلوز اپ کے ساتھ ایک اور شاٹ جوڑا جس میں ایک مردہ عورت کا تابوت دکھایا گیا تھا۔ تیسری مرتبہ اس نے ایک لڑکی کا شاٹ لیا جو کھلونوں سے کھیل رہی ہے۔ اور اسے موس یوخین کے کلوز اپ سے جوڑ دیا۔ اس ڈائریکٹر نے انسانی

کی علم موسنانی نے سلسلہ اس کے نتائج کی دلچسپ داستان ان الفاظ میں بیان کی تھی۔

جب یہ تینوں تصویریں دیکھے لوگوں کو دکھائی گئیں جو اس راز سے واقف نہ تھے تو ان پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ ایکٹر کے کمال فن کی تعریفیں کرنے لگے تھے۔ انہیں پہلی تصویر میں ایکٹر کے چہرے پر فکر اور سوچ کے آثار نظر آئے۔ ان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ شوربے کی پلیٹ کو بھول چکا ہے اور اس کی طرف اب گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ دوسری تصویر پر انہیں ایکٹر کے چہرے پر رنج و ملال کی کیفیات نظر آئیں گویا مردہ عورت کا تابوت دیکھ کر اسے بہت قلق ہوا ہے۔ تیسری تصویر میں ہنسی ایکٹر کے ہونٹوں پر پھیلا رہا۔ تبسم دکھائی دیا گویا وہ بچی کو کھیلتے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ تینوں تصویروں میں ایک ہی چہرہ ہے جس سے اصلاً کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ فلم سازی میں جتنے لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت ایڈیٹر کو حاصل ہے۔ بڑا ایکٹر لے کر یہ بیان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو ایکٹر کو اتنا بے حقیقت نہیں سمجھتے۔ تاہم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ تاثر کا انحصار اس کے سیاق و سباق پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فلم کے اجزا کی ترتیب میں ایکٹر کا مطلق کوئی دخل نہیں۔

لیکن فلم کے مختلف اجزا کو مرتب کر دینا ہی کافی نہیں۔ ایڈیٹر میں یہ سمجھ بوجھ بھی ہونی چاہیے کہ اجزا کی لمبائی کتنی ہو کیونکہ جس طرح موسیقی میں نہ صرف سروں کا اتار چڑھاؤ بلکہ ان کی کمی بیشی بھی ایک اثر پیدا کرتی ہے اسی طرح فلم میں بھی شاٹوں کی کمی بیشی سے خاص خاص تناسب اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان سے دیکھنے والوں پر مختلف قسم کے اثرات طاری ہوتے ہیں۔ یہ آہنگ و تناسب کا سوال ذرا پیچیدہ سا ہے اور اس قابل ہے کہ اس سے شغف رکھنے والے لوگ جن کا مطالعہ مجھ سے زیادہ وسیع ہے اس جانب توجہ کریں۔ میں صرف چند ضروری باتیں بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میں اس جگہ صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ یہ مثالیں پڈوفکن نے یہ ظاہر کرنے کے لیے پیش کی ہیں کہ مختلف مقاصد کے لیے آہنگ میں کیا تبدیلی ہوتی ہے یعنی شاٹ کس طرح اور کس رفتار سے آتے ہیں اور رفتار کس طرح بدلتی رہتی ہے۔ ان سے شاید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مناظر کو فلم بند کرنے میں موضوع و محل کے اعتبار سے کیا کیا خاص طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

عنوان

• مزدوروں کی بغاوت فرو کر دی گئی:

۱۔ تصویر آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ زمین پر خالی کارتوس اور بندوقیں پڑی نظر آتی ہیں۔

۲۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور لینز کے سامنے سے ایک لمبا پشتہ گزرتا ہے۔ جس پر مزدوروں کی لاشیں پڑی ہیں۔

۳۔ ان میں ایک عورت بھی ہے جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے ایک ٹوٹے ہوئے کھمبے کے ساتھ ایک پھٹا ہوا جھنڈا لٹکا ہوا ہے یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۴۔ قریب سے شاٹ لیا جاتا ہے۔ عورت جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ لینز کی طرف گھور گھور کر دیکھتی ہے۔ یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۵۔ پھٹا ہوا جھنڈا ہوا میں لہرا رہا ہوتا ہے۔

یہ تو ایک ابتدائی واقعہ کی مثال ہے جس میں سکون بلکہ سکوت اور غم پایا جاتا ہے۔ ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں اس لیے تحلیل ہو جاتا ہے کہ ناظر کے سامنے آہستہ آہستہ آئے۔ اور اس سکوت و سکون کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور تصویر کے آہستہ

اہمیت نہ ہو بلکہ انتخاب ہونے سے ہی یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ فلم کا یہ مختصر سا حصہ بجائے خود ایک واقعہ کی سی اہمیت رکھتا ہے اب ایک تیز شدہ، ہنگامہ خیز واقعہ کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ ایک گوشے سے مزدوروں کا ہجوم نظر آتا ہے وہ تیزی کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں سب کے سب یکے بعد دیگرے سین کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔

۲۔ ایک مزدور ایک آہنی سلاخ پر سے گرتا ہے اور بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے پھر یک بیک ٹھہر جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

عنوان :۔

"سب سے پہلی دکان کو بچاؤ"

۳۔ ایک مزدور کرین پر چڑھ جاتا ہے۔

۴۔ دھواں ہوا میں بلند ہوتا ہے بھاپ کی سیٹی بجتی ہے۔

۵۔ مزدور جو کرین پر چڑھا ہے نیچے جھک کر دیکھتا ہے۔

۶۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں (یہ شاٹ اوپر سے لیا گیا ہے)

۷۔ مزدور جو کرین پر ہے پوری قوت سے چلاتا ہے

"پہلی دکان کو بچاؤ"

۸۔ اوپر سے شاٹ لیا گیا ہے۔ بھاگتے ہوئے مزدور ٹھہر جاتے ہیں تھوڑی دیر توقف کرتے ہیں اور پھر بھاگ نکلتے ہیں۔

۹۔ ایک عورت ان سے ٹکرا کر گر پڑتی ہے۔

۱۰۔ کلوز اپ دکھایا جاتا ہے عورت گر کر پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی ہے۔

۱۱۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی شاٹ پردہ پر اپنے اصلی وقت سے آدھ سیکنڈ زیادہ دکھایا جائے تو سارا تناسب خاک میں مل جائے گا اور جو اثر پیدا کرنا مقصود ہے پیدا نہیں ہوگا۔

اب اس سے بھی زیادہ آسان مثال لیجئے۔ یہ مثال بھی پڈوکن نے ہی پیش کی ہے اور کسی بازار کے حادثے کے متعلق ہے حادثہ اس طرح دکھایا گیا ہے۔

۱۔ ایک بازار دکھائی دیتا ہے جس میں گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ایک راہگیر بازار کو عبور کرتا ہے اس کی پشت کیمرے کی جانب ہے پاس سے ایک موٹر کار گذرتی ہے جو اس کے اور کیمرے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ موٹر ڈرائیور کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے وہ بریک پر قدم رکھتا ہے اور گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔

۳۔ جو بدنصیب حادثے کا شکار ہوتا ہے اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آتی ہے اس نے چیخ مارنے کے لئے منہ کھول دیا ہے۔

۴۔ یہ شاٹ موٹر ڈرائیور کی نشست سے لیا گیا ہے۔

گھسٹتے ہوئے پہیئے کے قریب ٹانگیں نظر آتی ہیں۔

وہ مڑ کے پیچھے گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔
۲۔ کلائی ڈھیلی ہے اور اس کے پاس لاش پڑی ہے۔
اس واقعہ میں گرنے والے حصہ، دیکھنے کے بجائے ایک منٹ تک ملا دکھایا جاتا تو سارا اثر زائل ہو جاتا۔
یہ آخری تدوین کی مثالیں ہیں۔ یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تدوین کے اس اہم شعبہ پر بھی اچٹتی ہوئی نظر ڈال جائے۔
جسے اصطلاح میں "تخلیقی تدوین" کہتے ہیں۔ جس میں ایڈیٹر کے ذہن کے واسطے عجیب عجیب راستے نظر آتے ہیں۔

میں گذشتہ اسباق میں "دی واسٹ پرنٹ فیس" نامی ایک فلم کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ چند اشخاص تھیٹر میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں اور ایک پیشہ ور ماہر مسمریزم ان پر عمل کر رہا ہے اب اس عمل کا اثر فلم کے ذریعے دکھانا مقصود ہے اور فلم کے لیے حقیقتاً یہ موضوع بہت مشکل ہے۔ صحیح عمل پیدا کرنے کے لیے پچھلے عامل کے چہرے کا قریبی شاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں چند اشخاص کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ اور وہ انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر اس طرح دکھائی گئی کہ دونوں تصویریں ایک دوسرے کے بیچ میں تحلیل نظر آتی گئیں اس دوسری تصویر میں بلب جلتے اسپنج سالمات جیسے نقشے میں جلتے دکھائے گئے ہیں۔ یہ شاٹ دوسرے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے اور جس میں وہ تماشائی نظر آتے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے جب عامل کا چہرہ آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے اور وہ منظر کے سے تماشائیوں کے چہرے ابھرتے نظر آتے ہیں اور پھر کیمرہ قریب آ جاتا ہے یہ تمام شاٹ خاص آہنگ و تناسب سے یکے بعد دیگرے دکھائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں اس طرح پردے پر ایک ننگ شکلیں نظر آتی ہیں۔ کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے کوئی پیچھے ہٹتی ہے کوئی آگے بڑھتی ہے اور کوئی جھوم رہی ہے چنانچہ اس کا نتیجہ حد حیرت انگیز ہوا ـــــ ایڈیٹر تماشائیوں پر اس قسم کے جو اثرات طاری کر دیتا ہے اس کا تجزیہ آسان نہیں چنانچہ اس کے کمال فن کی مثالیں مہیا کرنا مشکل ہے۔ پڈوکن نے اپنی فلم "دی اینڈ آف سینٹ پیٹرز برگ" سے ایک مثال پیش کی ہے جسے اسی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ کہتا ہے کہ جنگ کے مناظر کا کام میں میں ایک ہولناک دھماکہ دکھانا چاہتا تھا اور کہ یہ دھماکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ فلم کے پردے پر نمودار ہو جائے۔ میں نے بہت سا ڈائنامیٹ زمین میں دفن کیا پھر اسے اڑایا اور اس کا شاٹ لیا۔ اس سے بڑا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن یہ فلم کے کسی کام کا نہ تھا پردے پر محض ایک بے جان سی حرکت دکھائی دی جس سے تجربات کے بعد آخر کار میں فلم کے پردے پر دھماکہ ہونا اور اس کے تمام اثرات دکھانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بھی یوں کہ ڈائنامیٹ کے دھماکے کا جو شاٹ لیا اس کا کوئی ٹکڑا استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی میں نے ایک شعلہ سے دھوئیں کے بادل پیدا کئے اور شورش و تصادم کا اثر پیدا کرنے کے لیے مجسم شیشہ سے کام لیا اس شاٹ کے درمیان میں نے ایک دھماکا شاٹ بھی داخل کر دیا جو میں نے اس سے پہلے کسی زمانہ میں لیا تھا اس طرح پردے پر وہ مرئی شکل بنتی جسے میں پیدا کرنا چاہتا تھا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن اس غرض کے لئے کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی گئی جو حقیقتاً دھماکہ پیدا کرنے کیلئے استعمال کی جاتی ہو

میں اس مثال کی روشنی میں آپ پر ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کمال تدوین کا فلم کو جنم دیتی ہے وقت محض خام مواد مہیا کرتی ہے جس سے ایڈیٹر اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے جس کا حقیقت اور عالم میں یہی تعلق ہے ـــــ فلم کے مضمون کی ہی انتہا پر ختم کر دینا چاہیے میرا یہ مضمون سینما کے مبادیات سے متعلق معلوم ہے ہندوستان میں جو لوگ سینما کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں خوش قسمتی سے لاہور میں دنیا کے بعض بہترین فلم دکھائے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے لاہور کی خوش قسمتی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کیلئے بھی قابل رشک ہو سکتی ہے لیکن افسوس کہ سینما کے مذہب پرست ناقدوں اور قدامت پسند سنسر کے نزدیک بھی ابھی تک اکثر ایسے فلم موجود ہیں جنہیں انسانی ذہن و عقل کا عظیم ترین وسیلہ کہنا چاہیے اور جن کا دیکھنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔
امید ہے جب آپ اس نوع کی تجربوں کو میری دوسری کاوشوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ مضمون غنیمت معلوم ہوگا۔ (نیرنگ خیال)

انگلستان کا جدید تھیٹر

پطرس

چونکہ مجھے تھیٹر اور اس کے فن سے خاص دلچسپی ہے اس لیے سفرِ یورپ کے دوران میں، میں نے اپنی فرصت کا بیشتر حصہ اسی کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اس سے میرا مقصود صرف اپنی پیاس بجھانا تھا۔ یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ ہندوستان واپس آ کر اس کے متعلق کوئی تبلیغ کروں گا۔ یا کسی رسالے یا اخبار میں کوئی سلسلۂ مضامین شروع کروں گا۔ میرے احباب میں سے سید امتیاز علی تاج کا تجربہ ہندوستانی ناٹک کے متعلق بہت وسیع ہے اور یورپ کے تھیٹروں کے متعلق بھی ان کی معلومات کا ذخیرہ حیرت انگیز ہے وہ اور میں اپنے پرانے کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر گورودت سوندھی کے زیر قیادت ایک کلب بنا کر برسوں سے ناٹک کے شوق کو پورا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر گاہے گاہے امتیاز صاحب کو خط لکھتا رہا۔ اور واپسی پر بھی انہیں سے اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ باقی رہے پروفیسر سوندھی، سو میرا انہیں کچھ بتانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ان حالات میں ہرگز اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ یورپ کے تھیٹروں کے متعلق کوئی مضمون لکھتا اور حق تو یہ ہے کہ اگر امتیاز صاحب کی یہ خواہش نہ ہوتی کہ میرے بعض بعض مشاہدات قارئین نیرنگِ خیال کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں تو یہ مضمون کبھی ظہور میں نہ آتا۔

ایک تو ہندوستان کا تھیٹر یورپ کے مقابلے میں اس قدر حقیر ہے کہ یورپ کے تھیٹر کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا بے معنی بات ہے اور ایک ہندوستانی رسالے میں اس کا کماحقہٗ بیان کرنا بے حد مشکل ہے دوسرے موضوع اس قدر وسیع ہے کہ میں کسی طرح بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اگر آپ اس تحریر سے کسی طرح بھی مستفید یا لطف اندوز نہ ہوں تو کم از کم میرے اس تامّل کے شاہد تو ضرور رہیں جس کا اظہار میں شروع ہی میں کر رہا ہوں۔

اس وقت میں صرف ایک تھیٹر کا ذکر کروں گا۔ جس کا نام فیسٹیول تھیٹر (FESTIVAL THEATRE) ہے اور جو کیمبرج (انگلستان) ہی میں ہے۔ حسنِ نسبت سے اس تھیٹر کا افتتاح عین اس وقت ہوا جب میں کیمبرج پہنچا۔ لیکن اس کے لیے تیاریاں مدت سے ہو رہی تھیں۔ اور اس کے شروع ہونے سے پہلے جو جو بیانات وقتاً فوقتاً اس کے متعلق اخباروں میں شائع ہوتے رہے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ کم از کم انگلستان میں اس تھیٹر کی نظیر نہ ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ میں نے لندن سے کیمبرج کا سفر کیا تو سفر کے دوران میں ٹائمز کے کالموں میں اس تھیٹر کے آئندہ پروگرام کا حال بہت انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ یونیورسٹی کے کھلتے ہی پہلا کھیل دکھایا گیا۔ اور اس دن سے لے کر آج تک میں نے سب کھیل دیکھے ہیں اور آج کل جہاں یورپ کی اور باتیں یاد آ رہی ہیں وہاں فیسٹیول تھیٹر کا فراق کچھ کم افسوسناک نہیں۔

شروع ہی میں اس تھیٹر کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کیے گئے تھے:—

> "فیسٹیول تھیٹر کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر زمانے سے عظیم الشان ڈرامے سٹیج پر پیش کرے۔ اس بات کا مطلق خیال نہ رکھے کہ لوگوں کو کس چیز کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ وہ لوگ جو محض کاروبار کے لئے لکھتے ہیں اور جو ڈراموں کو بحیثیت تصانیف کے مطالعہ کرتے ہیں، ورنہ ناٹک کے فن کے نقطۂ نظر سے ان پر غور نہیں کرتے۔ ان کے دماغ میں ڈراموں کا تصور کیا ہے۔ دنیا کے سب سے دلچسپ ڈراموں سے بیان کا خلاصہ بھی نہ کے موجودہ زمانے میں جو تھیٹر محض تجارتی اغراض سے منسلک ہوتے ہیں ان میں ایسے ڈرامے تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ ان تھیٹروں کا انحصار ایسی ساہوکار کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کے نزدیک ڈرامے کا فن کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اور وہ لوگ جو اس فن کے دلدادہ ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں، پرانے ڈراموں کو نئے طریقے سے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ عام تھیٹروں کی عمارت کی ساخت اور سٹیج کا سامان کئی صدی سے چلا آتا ہے اور جدید ترین طرز کا اختیار نہیں ہو سکتا۔"

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو یہ کہ عام تجارتی تھیٹر اہل فن سے محض بے خبر ہے اور صرف عامۃ الناس کی اسفل خواہشات کو پورا کرنا ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے کیونکہ روپیہ کمانے کا یہی ایک ڈھنگ ہے دوسری بات یہ کہ تھیٹروں کا طرز تعمیر اور سٹیج کی مشینری وغیرہ خود انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی فرسودہ اور بے کار ہے۔ یہ دونوں باتیں بہت حد تک تفصیل طلب ہیں لیکن مضمون کو اس قدر طول دینا کہ ہر تفصیل سلجھ جائے میری طاقت اور نیرنگ خیال کی ضخامت سے افزوں ہے۔

انگلستان کے عام تھیٹروں میں سے ہر ایک میں ایک ہی کھیل ہر رات نہیں بلکہ بعض اوقات برسوں ہوتا رہتا ہے دیکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے اس لئے ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کھیل بہت ہی مقبول ہو تو سال ڈیڑھ سال دو سال تک آمدنی کا ذریعہ بنا رہتا ہے اور کوئی برا کھیل نہیں ہونے پاتا تو دو مہینے ہی میں فیل ہو جاتا ہے۔ جب ایک کھیل ختم ہو جائے تو پھر دوسرا کھیل تیار کیا جاتا ہے اور وہ بھی اسی طرح اپنی مقبولیت کی حد تک دکھایا جاتا ہے برخلاف اس کے فیسٹیول تھیٹر میں ہر ایک کھیل صرف ہفتہ بھر تک ہوتا رہتا ہے جب یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوں تو تھیٹر بھی بند ہو جاتا ہے حق تو یہ ہے کہ یہ تھیٹر یونیورسٹی ہی کے سر پر قائم ہے۔ کیونکہ یہاں کھیلوں کا جو معیار ہے اس کے مطابق دیکھنے والے بھی ایسے ہی تربیت یافتہ آدمی ہونے چاہئیں جو یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں اسی لئے اس تھیٹر کا قیام لندن یا کسی بڑے شہر کی بجائے کیمبرج ہی میں مناسب سمجھا گیا۔

کھیلوں کے انتخاب میں بہت ہی وسعت نظر سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو جدید سے جدید کھیل جو عام تھیٹروں کے مالک اس ڈر کے مارے قبول نہیں کرتے کہ کہیں ان کی جدت عامۃ الناس کے ناپسند نہ ہو اور کاروبار میں نقصان نہ اٹھانا پڑے پیش کئے جاتے ہیں (بشرطیکہ ان میں فن کے اعتبار سے کوئی خاص خوبی ہو) اور دوسری طرف قدیم سے قدیم یونانی کھیلوں کے دکھانے میں اس تھیٹر کمال فن کا ثبوت دیتے ہیں اور ان دونوں کے مابین ڈرامے کے ہر مشہور دور کا ایک نہ ایک نمونہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور اس میں ملک و قوم کی کوئی قید نہیں۔ چنانچہ یہاں میں نے جرمن اور فرانسیسی اور امریکن اور ہسپانوی آسٹرین اور ناروجین سبھی مصنفوں کے کھیل دیکھے ہیں البتہ ہوتے سب انگریزی زبان ہی میں ہیں۔ اور پھر اس کے علاوہ ٹریجڈی کامیڈی فارس وغیرہ سب اصناف ڈرامہ شامل کئے جاتے ہیں۔

یہاں کی سٹیج کا حال خاص طور پر بیان کرنا ضروری ہے کہ یہی چیز ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ افسوس کہ ہمارے پاس کوئی ایسی تصویر نہیں جس سے خالی سٹیج کا منظر پیش کر سکوں۔ یہ کام تصویر ۲ سے نکالنا پڑے گا (اس تصویر میں سٹیج پر جو سین دکھایا جا رہا ہے وہ ایک قدیم یونانی کھیل کا ایک سین ہے۔ سٹیج کا بہت سا حصہ سیڑھیوں کی وجہ سے رُک گیا ہے۔ تاہم جو حصہ نظر آتا ہے وہ سٹیج کی حالت بیان کرنے کو کافی ہے)

پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ سٹیج اور حاضرین کے درمیان بڑی بڑی سیڑھیاں ہیں جو تصویر میں سب سے نمایاں نظر آ رہی ہیں (سٹیج کے اوپر جو سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں وہ سین کا حصہ ہیں۔ لیکن جن سیڑھیوں کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں وہ تھیٹر سٹیج کا مستقل حصہ ہیں) اگر آپ تماشائیوں کی پہلی قطار میں بیٹھے ہوں۔ تو سٹیج آپ کے پاس سے بتدریج اٹھنی شروع ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ سٹیج کی سب سے بڑی سطح پر پہنچ جائیں اس سطح کا کچھ حصہ سٹیج کی سیڑھیوں اور سین کی سیڑھیوں کے درمیان دکھائی دے رہا ہے۔ اس حصے پر آپ غور سے دیکھیں تو حلقے کی شکل میں ایک خط سا کھنچا ہوا ہے۔ یہ ایک دائرہ ہے جس کا کچھ حصہ پچھلی سیڑھیوں کے نیچے آ کر چھپ گیا ہے۔ اس دائرے کے اندر جس قدر حصہ سٹیج کا ہے وہ باقی سٹیج سے علیحدہ ہے اور بوقتِ ضرورت اس حصے کو گھمایا جا سکتا ہے۔

سٹیج ساری کی ساری ایک ہی ہموار سطح نہیں بلکہ اس کا پچھلا نصف حصہ اور بھی ایک درجہ اوپر کو اٹھا ہوا ہے۔

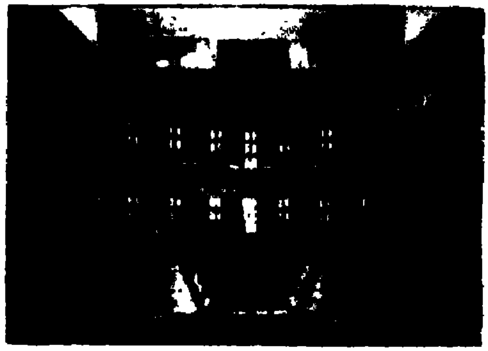
اسی تصویر میں سب سے پیچھے جو ایک سفید سا پردہ نظر آتا ہے وہ دراصل ایک سفید دیوار ہے جو سیدھی نہیں بلکہ گول ہے جیسے جلتی ہوئی شمع کو ہوا کے جھونکے سے بچانے کے لئے ہاتھ کو خم کر کے شمع کے پیچھے رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ دیوار کھوکھلی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے تاکہ ایکٹروں کی آواز اس سے بخوبی منعکس ہو سکے اور اس پر بہت ہی پختہ سفید رنگ کا پلستر ہے جس پر کسی چیز کی رگڑ سے خراش وغیرہ آنا بہت محال ہے۔ اس دیوار کو اصطلاح میں سائیکلوراما (Cyclorama) کہتے ہیں اور یورپ کے جدید تھیٹروں میں اس کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

تھیٹر کا وہ حصہ جہاں تماشائی بیٹھتے ہیں۔ تصویر ۳ میں دکھایا گیا ہے (یہ گویا وہ منظر ہے جو ایکٹر کو سٹیج پر سے دکھائی دیتا ہے) اس سے آپ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ تھیٹر کی لمبائی بہت کم ہے۔ ایکٹروں کو خواہ مخواہ چلانا نہیں پڑتا۔ ورنہ تقریر کی وہ تمام خوبیاں جو آواز کے نیچے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہیں ضائع ہو جائیں۔ تھیٹر کے اس حصے کی شکل گھوڑے کے نعل کی مانند ہے۔ دو تین اوپر کی منزلیں ہیں اور فرش کی نشستیں بتدریج اوپر کو اٹھتی جاتی ہیں۔ گویا فرش نہیں فرش کی بجائے بہت سی سیڑھیاں ہیں اور ہر سیڑھی پر کرسیوں کی ایک قطار رکھی ہے صرف دو راستے آمد و رفت کے لئے خالی چھوڑ دئے ہیں۔

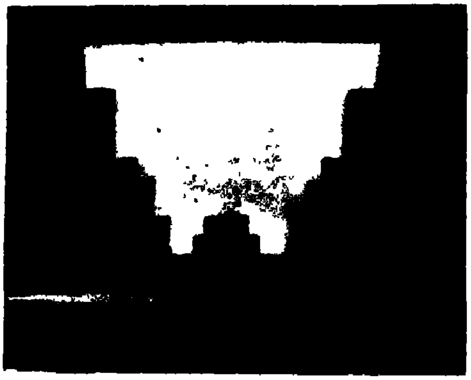
یہ تو عمارت کا حال تھا لیکن اس تھیٹر کا سب سے ضروری جزو جس کی وجہ سے اس کو انگلستان کے باقی تمام تھیٹروں پر تفوق حاصل ہے اور جو اس کے لئے خاص طور پر باعثِ ناز ہے وہ یہاں کی روشنی کا انتظام ہے۔ فٹ لائٹس یعنی وہ لیمپ جو سٹیج کے کنارے پر ایکٹروں کے قدموں میں لگے ہوتے ہیں اور جن کا رخ ایکٹروں کی طرف ہوتا ہے۔ وہ قطعاً مفقود ہیں سامنے سے روشنی ڈالنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے سب سے اوپر کی گیلری میں چار بڑے بڑے لیمپ لگے ہیں (تصویر ۳) جن کا رخ سٹیج کی طرف ہے اور جو زاویۂ قائمہ کے ساتھ ایسے زاویے پر لگائے گئے ہیں کہ ان کی روشنی سٹیج یا ایکٹروں پر تو پڑتی ہے لیکن سائیکلوراما پر نہیں پڑتی۔ اور نہ ایکٹروں کے سائے سائیکلوراما پر پڑ سکیں۔

سٹیج کے اوپر ایک پل سا بنا ہے (اس کے طول و عرض کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس پر سے کوئی چیز گرائی جائے تو سٹیج کے عین وسط میں آ گرتی ہے) اس پر لیمپوں کی قطاریں لگی ہیں بعض کا رُخ تو بالکل نیچے کی طرف ہے لیکن چند لیمپ ایسے ہیں جن کی روشنی سائیکلوراما پر پڑتی ہے اور یہ سات سات لیمپوں کی ایک ایک قطار ہے۔ ان سات لیمپوں کے سامنے قوس قزح کے سات مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہیں۔

١



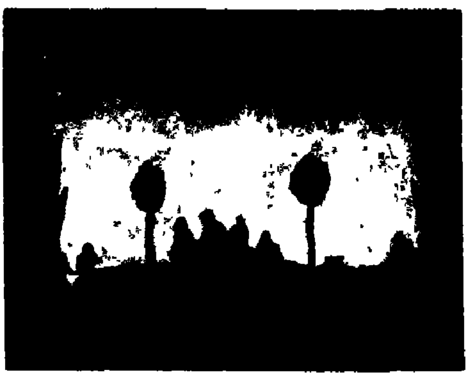
٢



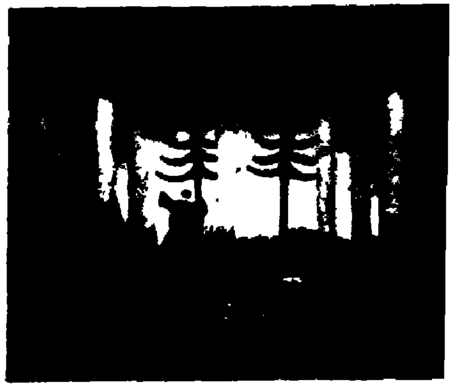
٣



٤



٥



٦



٧



٨



اور چونکہ انھی سات رنگوں میں سے مختلف رنگ انتخاب کرکے ان کو مختلف تناسب میں ملا کر نیا سے نیا رنگ بنایا جا سکتا ہے اس لئے اس سائیکلوراما پر جس قسم کے رنگ کی روشنی ڈالنی مطلوب ہو ڈالی جا سکتی ہے۔

ان لیمپوں کے علاوہ اور بھی لیمپ ہیں جو مختلف موقعوں پر لگتے ہیں لیکن ان کا بیان ضروری نہیں۔

سائیکلوراما کے لیمپوں کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اگر ان کے سامنے عام قسم کے شیشے لگائے جائیں تو یا تو حرارت کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں یا ان کا رنگ مدھم پڑ جاتا ہے اس لئے ان میں ایک خاص قسم کا شیشہ استعمال کیا جاتا ہے جو جرمنی میں بنتا ہے اور جو بہت مہنگا ہوتا ہے

صرف ایک اور بات کا ذکر باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سٹیج کے گرد [illegible] رکھے رہتے ہیں۔ ہر ایک لیمپ کے جلانے کا انجن علیحدہ ہے نہ صرف یہ بلکہ اس انجن کے ساتھ ایسا انتظام بھی ہے کہ لیمپ کی روشنی نہایت آہستہ آہستہ بالکل بے معلوم طور پر مدھم یا تیز کی جا سکتی ہے تمام لیمپوں کے تار ایک خاص کمرے میں جاتے ہیں۔ جہاں انجنوں کی قطاروں کی قطاریں لگی ہیں۔ اور جہاں سے ایک ماہر روشنی کا انتظام کرتا ہے۔ اس ماہر کو اپنی نشست پر سے سٹیج بالکل نظر نہیں آتی۔ لیکن مسٹر رچرڈ ہوگ جو آج کل وہاں یہ کام کر رہے ہیں ان کے تجربے کا یہ عالم ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مختلف انجنوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ سائیکلوراما پر کس رنگ اور کس شدت کی روشنی پڑ رہی ہوگی۔ اگر کسی رنگ کا کپڑا دکھا دیجئے تو وہ بجلی کے انجنوں کو اوپر نیچے سرکا کر آپ سے کہہ دیں گے کہ اس وقت سائیکلوراما پر جو رنگ ہے اس میں اور اس کپڑے کے رنگ میں سر مو تفاوت نہیں اور وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ ریہرسل کے دوران میں جب ڈائریکٹر مختلف رنگ آزماتا رہتا ہے تو وہاں اور بجلی کے کمرے کے درمیان ٹیلیفون لگا دیتے ہیں ڈائریکٹر تماشائیوں کی نشست پر بیٹھا ہوتا ہے۔ ماہر روشنی اپنے کمرے میں ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر ہدایات دیتا رہتا ہے کہ مثلاً سرخی مائل گہرا نیلا رنگ مطلوب ہے۔ ماہر روشنی اپنی جگہ سے محض انجنوں کو اوپر نیچے سرکا کر اس کی تعمیل کر دیتا ہے حالانکہ سائیکلوراما اس کو خود سے نظر نہیں آتا۔

تصویر نمبر ۲ میں سائیکلوراما کو دیکھئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کی گہرائیاں دور تک پھیلی جا رہی ہیں۔ جب تک مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ دیوار ہے مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

یہ تمام وہ سامان ہے جس کی مدد سے وہاں کے خداوندانِ تھیٹر دنیا کے اعلیٰ ترین ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ سینری کے متعلق ان کے بعض خیالات اگلے میں پردے پر پینٹ کی ہوئی سینری تو خیر ذیل سے ذیل تھیٹر بھی وہاں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ فیسٹی وال تھیٹر کا رجحان زیادہ تر ایسی سینری کی طرف ہے جس میں انتہا درجے کی سادگی سے بڑے سے بڑا کام نکل سکے۔ تصویر نمبر ۱ کا سین محض لکڑی کے کندوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے لیکن سیڑھیوں اور ستونوں کے تناسب سے پاکیزگی اور رفعت ٹپکتی ہے۔ سائیکلوراما کا رنگ اس سین میں آسمانی ہے۔

تصویر نمبر ۳ ایک محل کا منظر ہے کالے پردوں میں سے سائیکلوراما دکھائی دے رہا ہے۔ یہ ایک ڈرامے کا آخری سین ہے کھیل اس واقعے پر ختم ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی سلطنت چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ ادا یوں کیا گیا کہ بادشاہ سٹیج پر آگے کو بڑھتا بڑھتا سیڑھیوں پر سے اتر کر تماشائیوں میں سے ہوتا ہوا تھیٹر سے باہر نکل گیا۔ فیسٹی وال کی یہ خاص جدت ہے کہ اکثر اوقات ایکٹر تماشائیوں میں سے ہو کر سٹیج پر آتے ہیں اور اسی طرح باہر نکل جاتے ہیں البتہ یہ صرف وہیں کیا جاتا ہے جہاں موزوں معلوم ہو۔

تصویر نمبر ۴ ان کی سینری کی سادگی کا ایک اور نمونہ ہے یہ منظر ایک خوشنما باغ ہے آسمان (یعنی سائیکلوراما) کا رنگ شہابی ہے جو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ درخت بہت ہی نفاست اور سادگی سے پیش کئے گئے ہیں۔

تصویر نمبر ۵ کے منظر میں بہت ہی گھنا جنگل دکھانا مقصود تھا۔ اس سین پر صرف تین طرف سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک تو سائیکلوراما روشن ہے۔ اس کے علاوہ دائیں بائیں دو پیچھے ہونے لیمپوں سے روشنی کی شعاعیں ستونوں پر پڑ رہی ہیں (بے شمار ستونوں میں دو تین درختوں کو کھڑا کر دیا) یہ ستون اور بھی کئی ڈراموں میں استعمال ہوں گے۔ اس لیے درخت گو صرف تین ہیں لیکن جو اثر پیدا کرنا مطلوب تھا وہ ہو گیا۔

ایک خلائی فیکٹری دکھانے کے لیے جو جو انتظامات کرنے پڑے، ان کو سوچتے ہوئے دماغ گھبراتا ہے لیکن اس تھیٹر نے اس مشکل کو یوں حل کیا۔ اسٹیج کے اوپر کے پل پر جو لیمپوں کی قطاریں لگی تھیں ان کا سایہ سائیکلوراما پر ڈال دیا یعنی ان تمام لیمپوں کو ان کے پیچھے ایک اور لیمپ روشن کر دیا۔ نتیجہ تصویر نمبر ۶ سے ظاہر ہے۔

تصویر نمبر ۷ میں ایک ڈرامے کا آخری منظر ہے۔ ڈرامے کی کہانی مصر کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ دو لاشوں کی میاں [illegible] رہے ہیں۔ صرف سائیکلوراما روشن ہے باقی سب تاریکی ہے لیکن چونکہ آخری سین ہے لوگ کیریکٹروں سے کب کے آشنا ہو چکے ہیں اس لیے اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ البتہ روشنی کی اس ترتیب سے سین میں ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

سائیکلوراما پر روشنی کی بجائے سائے ڈالنے کی مثال اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ اس کی ایک اور مثال بھی ملاحظہ کیجیے جو میرے خیال میں بے حد کامیاب تھی۔ (تصویر نمبر ۸) شیکسپیئر کے رچرڈ سوم کا وہ سین ہے جہاں رچرڈ سو رہا ہوتا ہے۔ اور طرح طرح کے پریشان خواب دیکھ رہا ہے۔ ہیبت ناک صورتیں دکھائی دے رہی ہیں۔ اسٹیج پر ایک لیمپ کسی چیز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ سے جو سائے سائیکلوراما پر پڑ رہے ہیں ان سے ہیبت اور وحشت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اور بہت سے مناظر پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن امید نہیں کہ نیرنگ خیال میں ان سب کے متعلق تصاویر چھاپنے کی گنجائش ہو اور تصاویر کے بغیر صرف بیان کر دینا بے معنی ہوگا۔ اس لیے اس قصے کو یہیں ختم کیے دیتا ہوں، اس امید پر کہ ان چند مثالوں سے قارئین کو اس تھیٹر کے طرز عمل کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا۔

صرف ایک کھیل کے دو سین تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو تصنیف ہی بالکل نرالے طرز کی ہے اور اس کے علاوہ جس طریقے سے یہ ڈرامہ پیش کیا گیا وہ بھی اسٹیج کے فن کی بعض بہت طرازیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کھیل کا نام (THE ADDING MACHINE) یعنی جمع کرنے والی مشین ہے۔ اس کھیل میں جو پیغام مضمر ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس سے کم درجے پر انگلستان اور یورپ کے بعض اور ممالک میں حیرت انگیز مادی ترقی ہوئی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہزارہا افراد (مثلاً کلرک اور مزدور) ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی زندگی بالکل ایک مشین کی طرح چلتی ہے گویا روح اور احساس کی تمام لطافتیں مر چکی ہیں۔ زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کام میں کوئی لطف نہیں۔ برسوں تک ایک ہی دفتر میں ایک بے رونق سی مصروفیت میں مبتلا ہیں۔ ہر صبح اسی وقت پر اٹھنا۔ اسی وقت پر کام کو جانا۔ اسی کرسی پر بیٹھنا۔ وہی ہندسے جمع کرتے رہنا۔ ہر شام اسی گھر کو واپس آ جانا۔ کوئی تفریح نہیں۔ کوئی اونچے خیالات نہیں۔ کوئی ترقی کی امید نہیں۔ اس کاروباری دنیا میں انفرادیت بالکل مفقود ہے۔ بے رنگ یکسانیت چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک کلرک اور دوسرے کلرک یا ایک مزدور یا دوسرے مزدور میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سب کے سب جانوروں کی طرح ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ سب ایک ہی جیسی باتیں کرتے ہیں ایک ہی جیسے خیالات رکھتے ہیں غرضیکہ کولہو کے بیل کی طرح پیدائش سے مرگ تک ایک ہی نقطے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔

ڈرامے میں جس کلرک کی زندگی پیش کی گئی ہے اس کا نام مسٹر زیرو یعنی صفر ہے۔ ڈرامے کے بیشتر افراد کے ناموں کی بجائے اسی طرح نمبر ہے

رہنے والے ہیں یعنی کسی میں کوئی انفرادیت نہیں۔ کسی کی کوئی خاص شخصیت نہیں، گویا یہ ذی روح اشخاص نہیں، جاندار مشین ہے۔ ایک بالکل دوسرے جیسا۔ ان میں تمیز کرنا ہو تو بجز اس کے کہ ہر ایک پر ایک ایک لیبل لگا دیا جائے اور کوئی طریقہ نہیں۔ اسی لئے افراد کو ہندسوں سے تعبیر کیا گیا ہے صرف چونکہ کھیل کے ہیرو یعنی بحیثیت انسان تماشیوں کے ایک خاص مشین کو باقی مشینوں سے تمیز کرتا ہے اس کا نام زیرو رکھ دیا۔

کھیل کا پلاٹ۔ وہ اسی طرح سٹیج پر دکھانے کا ڈھنگ دونوں ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا۔ (میں صرف اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں، تفصیلات میں کمی بیشی ممکن ہے مگر اتنی نہیں کہ اس سے کوئی خاص فرق پڑے) پہلا سین مسٹر صفر کی خواب گاہ کا ہے۔ میاں بیوی دونوں بستر پر ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ بیوی بدمزاج ہے اور ہر وقت میاں کو ذاتی ذہنی دق کرتی رہتی ہے۔ گویا نہ صرف یہ کہ اس کلرک بے چارے کی زندگی دفتر میں بے نتیجہ ہے بلکہ گھر پر بھی اس کو کوئی آرام کوئی خوشی نصیب نہیں۔ ایک سین میں بیوی نہایت غصے میں بلند آواز کے ساتھ بول رہی ہے اور میاں کو طرح طرح کی باتوں پر ملامت کر رہی ہے میاں سامنے سے کچھ نہیں بولتا۔ چنانچہ اس تمام سین میں میاں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ صرف کبھی کبھی جب کہ بولتے بولتے بیوی آرام لینے کے لئے ٹھہر جاتی ہے تو اس وقفہ میں مسٹر صفر کے دماغ میں اپنے محدود سے خیالات گونجتے رہتے ہیں۔ اس کو یوں ادا کیا گیا کہ جہاں بیوی چپ ہوئی تب پردے کے پیچھے سے پانچ ایکٹر بھاری اور نسوانی اور نہایت ہی مدھم آواز میں ہندسوں کا ایک بے معنی سا سلسلہ دہرانے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ پھر خاموشی چھا جاتی اور بیوی پھر بولنے لگ جاتی۔ اس دوران میں مسٹر صفر لب تک نہ ہلاتا تھا۔ صرف بے قراری سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور پھر جیسے خیال میں ڈوب جاتا تھا۔ جو ایکٹر پردے کے پیچھے سے بولتے تھے ان کی آوازیں ایک بجلی کے آلے کے ذریعے سے تمام ہال میں گونجتی تھیں۔ گویا پانچ چھ آوازوں والا عجیب دیو سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ہندسوں کے دہرانے سے مطلب یہ تھا کہ مسٹر صفر کی روح روزمرہ کی بے رنگ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے اتنی مردہ ہو چکی ہے اور اس نے خیالات کے پیدا ہونے کی طاقت اس حد تک کھو چکی ہے کہ دفتر کے دن بھر کے کام کے علاوہ سے اور کچھ نہیں سوچتا۔ دل و دماغ پر اس مشین کی طرح طرز زندگی نے اس قدر قابو پا لیا ہے۔

دوسرا سین دفتر کا ہے۔ پیچھے سیاہ رنگ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ سٹیج کے عین وسط میں ایک بہت اونچا سا ڈبل ڈیسک ہے دونوں طرف دو اونچے سٹول ہیں۔ جن پر بیٹھنے سے آدمی کے پاؤں زمین سے تین فٹ کے قریب اونچے رہتے ہیں۔ ایک طرف مسٹر صفر بیٹھا ہے دوسری طرف ایک کام کرنے والی عورت بیٹھی ہے۔ ڈیسک کے عین اوپر ایک لیمپ لٹک رہا ہے۔ لیمپ تو دکھائی نہیں دیتا لیکن اس میں سے جو پیلی پیلی تیز روشنی کا ایک مخروطی مینار سا نیچے ڈیسک پر پڑ رہا ہے وہ اردگرد کی تاریک فضا میں نمایاں نظر آتا ہے یہ سب سامان سٹیج کے اس حصہ پر ہے جو گھمایا جا سکتا ہے۔ مسٹر صفر اور لڑکی دونوں نے آنکھوں پر سبز رنگ کے چھجے لگا رکھے ہیں۔ لڑکی کے سامنے بل فارموں کا ایک ڈھیر ہے ایک بل کو اٹھاتی ہے۔ رقم بلند آواز سے بول کر اس کو فائل میں لگا دیتی ہے پھر دوسرے بل کو اٹھاتی ہے اس کو بھی یونہی پڑھتی ہے غرضیکہ متواتر یہی کئے جاتی ہے۔ مسٹر صفر ہر رقم کو دہراتا ہے اور سامنے جو رقموں کی فہرست رکھی ہے اس پر نشان لگاتا جاتا ہے۔ یہ رقمیں جس لہجے میں بولی اور دہرائی جاتی ہیں اس سے تھکن اور بے رونقی جھلکتی ہے بیچ بیچ میں کہیں کہیں ٹھہر جاتے ہیں ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوتے مگر بغیر نظر اٹھائے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی زندگی کی مردہ ہوسوں اور شکست خوردہ امنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ مسٹر صفر کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو یہاں شاید برسوں سے اسی لڑکی کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے لیکن کبھی جی بھر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ دل میں یہ امید ہے کہ آج ضرور میری ترقی ہوگی۔ آخر اتنے سالوں سے کام کر رہا ہوں۔ مالک کمپنی سے آج تک صرف ایک مرتبہ گفتگو کا موقع ملا وہ یوں کہ ایک دفعہ میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور اس نے کہا کہ "نوازش" لیکن کیا ہوا اگر کبھی اس کو خیال آئے گا کہ یہ شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

لندن میں دفتر کی سیٹی بجتی ہے۔ دن کا کام ختم ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ سٹول پر سے اٹھتے ہیں۔ دونوں کی حرکات میں اس درجہ مماثلت پیدا کرنے سے صرف یہی بتانا مقصود تھا کہ ان کی زندگیاں بالکل مشین کی مانند ہو گئی ہیں۔ لڑکی باہر چلی جاتی ہے مسٹر صفر جانے کو ہوتے ہیں کہ مالک کمپنی اندر داخل ہوتا ہے۔ بڑے تحکم کے انداز میں پوچھتا ہے تم کو یہاں ملازم ہوئے کتنے سال ہو گئے؟ تم کیا کام کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں مسٹر صفر سے کہتا ہے کہ جو کام تم یہاں کرتے ہو یعنی رقمیں جمع کرنے کا اس کے لئے ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو تم سے کہیں تیز کام کرتی ہے وہ مشین میں نے منگا لی ہے اس لئے تم کل سے برخواست کئے جاتے ہو۔ یہ سب کچھ بہت تیز تیز بولتا ہے مسٹر صفر کچھ احتجاج کرتا ہے وہ نہیں سنتا۔ اس بحث کے درمیان میں دونوں کی آوازیں بلند تر ہو جاتی ہیں۔ سٹیج گھومنے لگتی ہے یعنی مسٹر صفر اور مالک کمپنی دونوں اس طرح چلتے ہیں کہ گویا سٹیج گھوم رہی ہے لیکن وہ دونوں اپنی جگہ پر قائم ہیں آوازیں اور بھی بلند ہوتی جاتی ہیں گفتگو اور بھی تیز ہو رہی ہے سٹیج پر سرخ اور سفید رنگ کی روشنی کبھی جلتی کبھی بجھتی ہے پردے کے پیچھے ایکٹر ڈرامائی سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ مہیب تر ہوتی جاتی ہیں۔ الفاظ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ کہیں ایک گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے تمام قسم کے شور سنائی دیتے ہیں مسٹر صفر میز پر سے قلم اٹھا کر اس کے نوک دار حصے سے مالک پر حملہ کرنے کو جھپٹتا ہے آوازیں اور شور اور روشنی کی چمک اور سٹیج کا گھومنا سب کچھ بہت تیز ہو گیا ہے تماشائیوں کے دل دہل گئے ہیں مسٹر صفر دفعتاً اپنا قلم اوپر کو اٹھاتا ہے یک لخت ایک دھماکا سا سنائی دیتا ہے (یہ آواز سٹیج کے ایک تختے کو زور سے زمین پر مار کر پیدا کی گئی تھی) اور تمام چراغ گل ہو جانے میں مکمل خاموشی اور تاریکی چھا جاتی ہے اور پھر جو دوبارہ لیمپ روشن ہوتے ہیں تو پردہ گر چکا ہوتا ہے تماشائیوں کے دل کی دھڑکن درست ہوتی ہے تو زور سے داد دیتے ہیں۔

یہ اس حیرت فزا ڈرامے کی ایک جھلک ہے مکمل ڈرامے کو اس تفصیل سے بیان کرنے کی ہمت اور فرصت کہاں!

(نیرنگ خیال)

یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں

نیاز مندانِ لاہور

متنازعہ تنقیدیں اور جھنجھوڑ [illegible] سب [illegible]
[illegible] اس قدر [illegible] جاؤ کے [illegible]

"کاروان" کا یہ دوسرا نمبر [illegible] پنجاب کے چند نوجوانوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے پچھلے سال جناب چغتائی اور جناب تاثیر کے زیر ہدایت اور اس سال جناب چغتائی اور جناب مجید ملک کے زیر ہدایت، اس بات کی کوشش کی ہے کہ [illegible] کے ذریعے حسن کا ظہور [illegible] پنجاب یا پنجابی [illegible] ہندوستان کے موجودہ اہل فن کے [illegible] سے تعلیم یافتہ حضرات کو روشناس کرایا جائے [illegible] کسی صوبہ کی قید نہیں [illegible] فہرست مضامین سے ظاہر ہوگا کہ اس مبارک دریوزہ گری کے لئے ہندوستان کے سب صوبوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنے بعض احباب کے نام فہرست میں نظر نہ آئیں تو اس کو رسالے کے استغنا پر نہیں، اس کی نامرادی پر محمول کیجئے۔

ادب و انشا کے نمونے پیش کرنے کے لئے زبان اردو کو منتخب کیا گیا ہے۔ نہ اس لئے کہ اردو ہماری زبان ہے اور نہ اس لئے کہ پنجاب میں صرف یہی ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ اس لئے کہ پنجاب کے نوجوانوں کا وہ طبقہ جسے کاروان سے وابستگی کا فخر حاصل ہے، اپنی علمی و تہذیبی تربیت اور اپنے جذبات عقیدت و الفت کی وجہ سے اردو کو اپنے لئے بہترین ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ مبصرین سے پوشیدہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اردو کے تین مرکز ہیں۔ یوپی، حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔ لیکن اہل بینش بھی یہ بات اکثر بھول جاتے ہیں کہ یوپی میں یہ زبان خودرو ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والیٔ ملک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک علاقہ ہے جہاں اس کی نشوونما محض خون عشاق کی مرہون منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خودرو ہے وہاں خودبین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کھنچ کے رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے جو ہمہ تن جوش، مانتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم گذشتہ پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے صحت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے یعنی یہ کہ سوائے گرمیٔ حیات کے اور کسی بیرونی قوت کا احساس نہیں لیکن قوت نامیہ خود ہی رستہ ڈھونڈ لیتی ہے جو بجائے مستقیم کھلی روشنی اور تازہ ہوا کی طرف جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ پنجاب نے یوپی سے کسب فیض نہیں کیا یا یہ کہ پنجاب یوپی کی روایات سے یک قلم متاثر ہونے پر تیار ہو رہا ہے، کذب اور مبالغہ ہوگا۔ یوپی کے اساتذۂ قدیم میں سے کون سا ایسا ہوگا جسے پنجاب نے ایک بار، سو بار، ہزار بار نہیں پڑھا۔ وہ کون سا ایسا دیوان ہے جس کی ورق گردانی نہیں کی۔ وہ کون سا ایسا شاہکار ہے جسے حرزِ جان بنا کر نہیں رکھا۔ لیکن یوپی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لئے اب وہاں جانا بے سود ہے۔ اب

پنجاب کی رہبری بجز اس کے کہ ان میں قوت نامیہ ہے کوئی چیز نہیں رکھتی۔ یوپی میں اب اردو کا ایک مسلمہ معیار ہے جو کبھی کبھی ایک نعمت سی معلوم ہوتا ہے اور نہیں۔ اب یوپی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اور نہیں جانتا کہ اس کا چلن کیا ہے۔ اس کا معیار انداز، اس کی غلط تنقید بہ سبب مخالفت کی قباحتیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یوں ایک خود بینی سی تو اس کے اخلاق کی فہرست تیار کرنی ہے لیکن یہ بے معنی ایک تشریح ہے کہ ہے اس پر عمل کی اور کا خیال کرنا فضول ہے۔

اس لحاظ سے دیکھئے کہ اس ملک میں کوئی بھی ایسی تنقید اخلاق کے دیکھئے جو کسی پنجاب کے مرتب کئے ہوئے رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید رسالے پر ہے تو اس کے حصوں سے کچھ بحث نہیں۔ معانی کی ترتیب سے کچھ سروکار نہیں۔ سخن کی موزونیت سے کچھ تعلق نہیں اگر نظم پر ہے تو شاعر کی نفسیت و فصاحت نہیں۔ اس کی جدت زیر غور نہیں۔ اس کی ذہنی کشمکش پر نظر نہیں۔ اگر افسانہ ہے تو توازن کا ذکر نہیں۔ فضا کا احساس نہیں۔ مطلب کا شعور نہیں۔ اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترتیب پر توجہ نہیں اصل سے مقابلہ کا حوصلہ نہیں۔ اجتہاد کر کے لکھنے کی استعداد نہیں۔ صرف زبان کے اقتباسات پر زور ہے۔ اس محاورے پر، اس لفظ پر، اس حرف پر، اس نقطے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ جنبش نہیں کہ کسی اور چیز کو جانچ سکیں۔ یا اصل معانی کے متعلق پہلے سے وہ لفظ بھی کچھ کی تفتیش پیدا کر سکیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کاروان اردو کئی منزلیں طے کر گیا۔ لیکن حضرات یوپی ہنوز "تم" اور "تک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اردو کو شوق کا ایک مکتب سمجھتے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنؤ میں نصب ہے اور جس کا تتبع ان پر بھی ضروری ہے جو جمادات کی منزل سے تو نکل چکے ہوں۔

گزشتہ سال کے کاروان پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کئے تھے لیکن ہر ہفتے اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یوپی کے حضرات کو اس شغل سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس اخلاص کے زمانے میں اب یوپی کے پاس یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے کہ جو چھوٹے بچوں کا یہ عالم ہے کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا ہنر اب یہی رہ گیا ہے کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے نقص کو بڑی سے بڑی ذہنیت کے ساتھ پرکھیں۔ اہل قلم کی ہر قوت کو محض تذکیر و تانیث کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرست اغلاط" مرتب کر کے فن تنقید کی گرہ بندی مان دیں۔ مطالب یا حسن بیان کی طرف ذوق کے مارے صرف کنکھیوں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنی بے چارگی کو "اچھا ہے" یا "خوب ہے" جیسے بے معنی فقروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مائگی کو فہرست اغلاط کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں یا اگر کسی ریویو لکھنے والے سے کسی انگریز لال بجھکڑ کی کوئی ادنیٰ کتاب مبادیات انشا کے متعلق دستیاب ہو جائے تو اس کے فرسودہ خیالات کے بھوسے دل سے اپنی تھوڑی بہت ستر پوشی کر کے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشۂ چشم سے کیمیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔

اگر یوپی کے سب رسالے اسی جبل سے مرتب ہوتے تو اس مضمون کا لکھنا محض بے سود تھا۔ لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوش گوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہل نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم، اپنے ذوق اور اپنی متانت طبع کے یوپی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت ان کی طرف ہے اور ان میں سے دو رسالے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے۔ اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابل احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیب جدید کے سائے تلے میں پریشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لئے روح پرور تصور کرتا ہے وہ علی گڑھ کے نام کو اسم اعظم اور علی گڑھ کی مطبوعات

ابتدائی ایڈیٹوریل میں جب ... پر تنقید لکھے جیسا کہ ... مضمون ... کی ... خلاف ... سطروں کا ایک پیراگراف لکھا ہے وہ بھی ایسا ہے ... متانت ... تعاون ... الفاظ ... سب کی سب ... اور دلاویز ہیں۔ یہ الفاظ نہایت محفوظ ہیں لیکن ... اس قدر کہ ... سے تنقید ... جب ... بڑے ... سے کہہ دیا کہ ... موزوں ہے ... نہیں۔ اس کا جواب ... صاحب ... ہیں ... ترقی کی ... بڑھے گی کہ ... کو ... مضمون کو پڑھے۔ اگر ... اچھا ہے ورنہ اس پر ... ضرورت ہے ... اس قسم کے ... ہوتے ہیں ... کرنے سے کیا حاصل؟ اس غلطی کو آپ نظر انداز کر دیتے تو ... آپ کی تنقید ... ہماری ... کا منشا ... سے کیا مطلب ہے۔

کسی دن ... سال ... آرزو ... یہی
وہ ... نہیں ... مشق ... ستم کا

شعر معمولی ہے لیکن جذبہ نہایت صحیح ہے اور عجب نہیں کہ آپ اس سے متاثر ہوں۔

مندرجہ بالا تنقید خود ایڈیٹر صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے علاوہ ازیں اشاعت میں ... سے "آغاز داستان" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کے تقریباً ہر صفحے پر اس سے بدتر لغزشیں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں: ــــ

"سالنامہ کی خصوصیات اس کی دلچسپیاں اور دلفریبیاں ہم سے کہلوائیے" ــــــــ
(خصوصیات کے لیے "دلچسپیاں" اور "دلفریبیاں" ... خصوصیات کہلوانا تو ایک محاورہ ہے کیا کہیے۔)

"چھوٹے بڑوں سے ملتا" (پنجاب اس مطلب کو یوں ادا کرتا تو آپ ہی مربیانہ تبسم سے فرماتے کہ یہاں "بچھڑے ہوؤں" چاہیے۔)

سب سے زیادہ موجب مسرت خبر کابل اردو ادبی درسگاہ کا قیام ہے۔" (جناب اہلِ زبان صاحب! کابل اردو درسگاہ ابھی قائم نہیں ہوئی۔ جب قائم ہو جائے گی تو جو آپ کا دل چاہے لکھیے گا۔ فی الحال تو جس خبر سے آپ کو مسرت ہوئی ہے وہ قیام کی تجویز ہے)

"پہلے سے جو مضامین کی آخری تاریخ مقرر کی جاتی ہے ..." (مضمون کی تاریخ نہیں ہوتی۔ مضمون بھیجنے یا پہنچنے کی تاریخ ہوتی ہے)

"تمام ضروری خبریں اور اہم اجتماعوں کے متعلق پچھلے نمبروں میں لکھا جا چکا ہے" (اس ایک فقرے میں صرف و نحو اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں کہ ان میں سے دو ایک تو خود ہی آپ کو سوجھنی چاہئیں)

معلوم ہوتا ہے آپ ہماری اصلاح میں اس قدر وقت ضائع کر دیتے ہیں کہ خود کچھ سیکھنے سکھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن پنجاب کا ایک رسالہ بھی ایسا نہیں جو آپ پر نکتہ چینی کرنے کو اپنے لیے باعثِ فخر و ناز سمجھے۔ ہم بیٹھے بیٹھے خود نیرنگِ خیال کے سالنامہ میں سے زبان، صرف و نحو اور انشا کی غلطیوں کی ایک طویل فہرست اہلِ بصیرت کی عبرت کے لیے مرتب کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے اب تک یہ پیشہ اختیار نہیں کیا۔ اور سچ پوچھیے تو ہمیں اس کی فرصت بھی نہیں۔ یہ شغل آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم آپ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں کیونکہ ہم ذوقِ خواندگی وجہ مسرت اور ذریعۂ اتحاد سمجھتے ہیں۔ آپ ہمارے نقائص کریدتے رہتے ہیں۔ آپ نے زبان کو اپنے لیے مرد تسمہ پا بنا لیا ہے جو غنیمت ہے کہ جس نے آپ کا ٹینٹوا دبا رکھا ہے۔

"جامعہ" کی حالت اس سے بھی زیادہ قابلِ افسوس ہے کیونکہ "جامعہ" کے حلقے میں بعض ایسی شاندار ہستیاں بھی شامل ہیں جن کی

تو اب یہ کرنا بھی بہت مناسب ہے ان کا جواب بھی اسی انداز کا ہو جو انہوں نے ہر ہیچ میرزوں کی تعریف و توصیف سے بالا تر ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں، کہ یہ باتیں کا تینوں ان کی صلاحیت تسلیم کر لی ہیں ہوتا۔ لیکن اردو کی تنقیص کے نقطے سے بے لوث ہو کر نظر و تحقیق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس زبان دانی کا مظاہرہ بھی عبرت سی ہے۔ ساکر "جامعہ" نے فہرست اغلاط میں "منزل کا" جیسے الفاظ کو بھی شامل کر لیا اور کہہ دیا کہ "یہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی"۔ یہی وہ ادعا اور تنقید ہے جس کی ایک مثال سی ترا پی کے اکثر ناقدوں کے ہاں بھی ملتی ہے۔ کاش کہ فاضل تنقید نگار صاحب اپنے ہی تحریر سا سلسلہ بند کر کے مقصد تامل پیدا کر لیتے۔ اے کاش اب بھی کبھی کبھار اپنے انداز قالب مقلدانہ بنا لیا کریں اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں۔

کس نمانست کہ منزل گہ مقصود کجاست   ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

یہاں سے پڑھ کر بھی وحشت یہی کہیں گے کہ "ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی"۔

جامعہ کے جس نمبر میں کارواں پر تنقید چھپی ہے اسی نمبر میں زبان کی کئی دلچسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سوء ادب سمجھتے ہیں لیکن ارباب جامعہ کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔

جامعہ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے اور "عمل پیہم" اور "آدمی سیرت" اور "اصلاح" اور نظارہ "اور" ہمیں خوشی ہے "اور" ہمیں امید ہے "اور اسی قسم کی آیات سے فالاً بسورۃ من مثلہ پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے، اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں تاہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا "وزن مخصوص" بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا بجز اس احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل دردمند رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لاریب دونوں جہان میں امت مرحومہ کے لئے "بھلائی" کا موجب ہوگا۔

"پنجابی محاورے" خاص طور پر قابل بحث ہیں۔ مل کر دو میگزین اور جامعہ دونوں نے ان کا ذکر کیا ہے اور کنایۃً بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے ٹھیٹھ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے مثلاً پنجاب کے لوگ "مجھے جانا ہے" کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور "میری سمجھ میں نہ آتا تھا" کی بجائے "مجھے سمجھ میں نہ آتا تھا" بولتے ہیں لیکن یہ دونوں رسالے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنایا ہے تو اس قسم کے تصرفات لابد ہیں اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی ایسے تصرفات کی تعداد بجائے کم ہونے کے اور بڑھے گی۔ اس کے ثبوت اور چند دوسری مثالوں کے لئے کسی زبان کی تاریخ ارتقاء کا مطالعہ کیجئے اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشو و نما نصیب ہوئی ہے تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں بلکہ انہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ اردو ایک اکتسابی زبان کے درجے سے ایک فطری زبان کے رتبے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے جب کہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ اور دہلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کر لیں۔ چہ جائیکہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چلی ہے کہ جہاں کوئی محاورہ بازی "مجھے جانا ہے" کہتا ہے، پڑھے لکھے لوگ اسے ملامت کرتے ہیں کہ یہ کیا چپڑقناتیوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا "پنجابی ڈھنگ" کی طرح باتیں کرو، دیکھتے مت بولو۔ کارواں کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے کہ

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے

ان سے کہا گیا "تو نے ...... کرنی ہے" کی بجائے "تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہے" لکھ دیجئے۔ انہوں نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ "تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے" میں ترنم زیادہ ہے۔ میں مصدر کے ساتھ "نے" استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ مصرعے کے ترنم کے مطابق جہاں

پنجابی محاورہ مجھے مفید مطلب نظر آتا ہے۔ وہاں میں بحیثیت پنجابی اردو خوان کے اسے استعمال کرنا جائز سمجھتا ہوں۔ یوپی کے حضرات اس حق سے محروم تھے۔ وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی اور جامعہ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علم بردار اور آئینہ دار ہیں۔ جس فضا میں یہ دو رسالے ترتیب پاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی بہترین علمی فضا ہے اور ان کے مدیر و معاون حضرات اہل پنجاب کے نزدیک واجب المحبت و مستحق ہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے۔ اور خدا گواہ ہے کہ ان کا حسن اخلاق اور ان کی وسعت نظری ہمارے نزدیک مسلّم۔ ان کی صحبت کی یاد ہر چند کہ وہ صحبت بہت مختصر تھی، بالیدگی روح کا موجب ہے۔ لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دو رسالے ہندوستان بھر میں تنقیدی رہنمائی کریں گے۔ ادب و انشا کے مقابلے میں نئے معیار قائم کریں گے جو کم از کم نصف صدی تک اس قسم کے مشعل ہدایت کا کام دیں۔ صوبجاتی اور علاقائی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کریں گے اور اپنے رویے سے ایسے ایسے اصولوں کی نگہبانی کریں گے جن کی تائید ہمیشہ فرہنگ آصفیہ سے ہو سکتی ہو۔ بلکہ جن کی بدولت خود فرہنگ آصفیہ رفتہ رفتہ بیکار ہو کر رہ جائے گی۔ تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ رہی اور پھول رہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچنے کو تیار ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس سے دور رہیں گے جیسے کہ ہمارا خون نہیں ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ ہڈیوں کو سراہا جائے جو مدت ہوئی بے مغز ہو چکیں۔ ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں رہزنی کو آپ کی شان کے شایان نہیں سمجھتے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہم نیازمندوں کو ترفع کی جانب کشش کریں گے تاکہ ہم دلی عقیدت اور جذبۂ نیاز سے بزم اردو کی زینت کو بڑھائیں گے نہ یہ کہ قلعۂ معلیٰ کے کھنڈروں پر منت سے تالے ڈالتے چلے جائیں گے۔

بقلم پطرس

ہمارے زمانے کا اُردو ادب

ترجمہ
مظفر علی سید

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای این کے سالانہ جلسہ منعقدہ جے پور میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے اردو ادب کے جدید دور، یعنی اقبال کے فوراً بعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں اس پر روشنی ڈالی تھی۔ اس مضمون کی اصل خوبی تو اُن کی انگریزی انشا پردازی ہے جس کا اُردو ترجمہ وہ خود ہی کرسکتے تو کرتے۔ زیرِ نظر ترجمہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں، اُن کے اندازِ نظر اور جدید اردو ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ خیال سے واقف ہو جائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دوگونہ تھا۔ نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے، اس لئے اس مقالے کی معروضیت اور بے لاگ مطالعہ شاید عجیب معلوم ہو۔ پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پہ چڑھ کے دیکھنے کی کوشش کی ہے (یہ الگ بات کہ دو ایک عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں) اور ان پر ہلکی ہلکی کنکریاں بھی پھینکی ہیں۔

ممکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک ٹکڑے اس میں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔

گیارہ سال پہلے، جب اقبال اپنے اسلاف سے عالمِ بالا میں جا کر ملے تو دور و نزدیک کے زمانوں سے کئی ایک دوست ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ غالب اور میر، حالی، شبلی اور گرامی، حتیٰ کہ نظیری، رومی اور حافظ بھی۔ چنانچہ گفتگو روانی سے ہونے لگی۔ کچھ لمحے گومگو کی حالت میں بھی گزرے۔ مثلاً جب خودی کے مسئلے پر ایک عالمانہ بحث رومی اور اقبال کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ اونگھنے لگے اور جب 'ریائم' پر اقبال کی تنہا کلامی کے دوران میں تو غالب کے خراٹے بھی سنائی دیئے۔ مگر مجموعی طور پر یہ صحبت بے حد سازگار رہی۔ جانے پہچانے اقتباسات، کتابوں سے یا حافظے سے، بآوازِ بلند پڑھے گئے اور شب و روز کی بے پایاں لہروں پر حکمت اور ظرافت کا ملاپ ہوتا رہا۔ بہت سے قضیے سامنے آئے اور اُن میں سے کئی ایک حل نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود

فہم و بصیرت کے تازہ اور فرحت بخش نقوش نمایاں ہوتے ہوئے۔ اقبال تک دائرہ یہی ہے۔ تبھی ہم تماشا دیکھتے نہیں ہوتے تھے بس ذرا سنبھلنے کا موقع ہی پورے ملتے تھے۔

آج کا نوجوان اردو ادیب، اگر اس کو اس مغربی وقت سے پہلے واسطہ ہوتا ہے، اس محل پر لا بسے گا، مجھے یقین ہے کہ اس کا استقبال عزت اور شفقت سے کیا جائے گا مگر یہ ضرور بھی ہے کہ وہ ذرا کھویا کھویا سا لگے گا۔ قدماء سے اظہار خیال اس کے لئے آسان نہیں ہوگا۔ غالب سے قربت اور ان کے پیشروؤں سے دوری، ان میں ایک بہت بڑی خلیج حائل پائے گا جسے پاٹنے کے لئے اس کو کتب خانہ فردوس کی طویل مسافتوں کا پورا گیان بنانا پڑے گا۔ وہ حالات کی مجبوری سے اپنے اجداد کا سارا ورثہ وصول نہیں کر سکا۔ الا ماشاء اللہ۔ [illegible] جوش اور حفیظ ماضی کے [illegible] اچھے ہیں اگرچہ [illegible] سے سخت فرق کے ساتھ اپنے آپ کو حال یا مستقبل کے ساتھ وابستہ رکھا ہے۔ [illegible] سے تعلق رکھتے ہیں اور سلف کی [illegible] جو خانے [illegible] پیدا ہو۔ [illegible] سے لکھنے والوں کی اکثریت اپنے آپ روایت سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ مولوی نذیر احمد جو آج سے پچاس برس پہلے کے ناول نگار تھے، انبیا کے اقوال کو احترام کے ساتھ اور شعراء کے اقوال کو کراہت کے ساتھ نقل کرتے تھے۔ ان کا ولی انبیاء کو کراہت اور شعراء کو لذت کے ساتھ نقل کرتا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ مصنف اور اس کے کردار دونوں میں حوالہ دینے کی اہلیت تھی۔ دونوں نے ادب کی ایک مشترک دولت ورثے میں پائی تھی جو اس دور کے ذہنوں میں صاف مذہب کے ساتھ موجود تھی۔ آج کے ناول نگار میں اور اس کے ہیرو میں کوئی بات مشترک ہے تو یہ کہ دونوں کوئی قول نقل نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہ وہ [illegible] خوش قسم کا عاری ہے مگر ولایتی ناشروں کی چھاپی ہوئی [illegible] مسلسل کے ساتھ چلے آتے ہیں کہ نہ کھینچنا اور چھاپنے کی فرصت رہ جاتی ہے نہ کسی چیز کو دوبارہ پڑھنے کی۔ [illegible] کا نصاب بھی [illegible] اور پیچھے مڑ کے دیکھنے کی تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے کے اردو ادیب کا مستقبل ہو تو ہو، ماضی کوئی نہیں۔

اس قطع تعلق کی وجوہات گوناگوں اور پیچیدہ ہیں۔ اوپری نظر سے دیکھیں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب جس نظام تعلیم کے تحت نشوونما پاتے ہیں، یہ سب اسی کا قصور ہے۔ نئی تعلیم پچھلے پچاس ایک سال میں شرافت اور تقدس کے اس قدیم تصور سے دور ہٹ گئی ہے جو طالب علم کو اس دنیا اور اس دنیا کے لئے انبیاء و شعراء کی مناسب مقدار کی مدد سے تیار کرتا تھا۔ پرانے مسلمات غائب ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ انبیاء و شعراء بھی۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو ہمارے نظام تعلیم نے سر انجام دیا ہے۔ باقی اس عرصے میں ہماری تعلیم ایک نئے تصور کی تلاش میں جو پرانے تصور کی جگہ لے سکے، تجربوں یا ٹامک ٹوئیوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہ ٹامک ٹوئیاں اب بھی جاری ہیں۔

مگر یہ خیال پوری طرح صحیح نہیں۔ بنیادی وجوہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ دنیا بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اور لکھنے والا بھی نئی نسل کی طرح اس بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو محسوس کرتا ہے۔ اس نصف صدی میں بہت سے بند اور پشتے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ روایتی اقدار جو معاشرے کو بقا اور استحکام بخشتی تھیں، اسی وقت تک کارآمد تھیں جب تک معاشرے کا تانا [illegible] نقشہ درست تھا۔ [illegible] نقشہ پھیل پھیل کر [illegible] ہو گیا ہے۔ جیسے پانی کی سطح پر تیل کے لہریے۔ قدیم معاشرے سے اس کا کوئی ربط نہیں کیونکہ قدیم

معاشرہ باقی نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لئے لازم ہے۔ اگر وہ بالکل ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا۔ وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے کہ پچھلی نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا۔ نئی دنیا میں کوئی مناسب مقام اس کو حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس لئے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے، رسم و رواج کے خلاف، قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف۔ وہ قدیم انبیاء اور شعراء دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اُس چیز سے جو اُسے ماضی کی یاد دلائے۔ یہ جنگ کبھی کبھار دھندلی اور غیر واضح سی ہو جاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر خیر ایسا تو ہر جنگ میں ہوتا ہے۔

اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کر کے کم سے کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ بیک جنبش قلم الفاظ، تلمیحات اور کلیات علامات کے ذخیرے سے، جو فن کار مصنف کو نازک اور کارآمد ترین آلات اظہار بخشتا ہے، محروم ہو گیا ہے۔ لفظ محض چند آوازوں اور لکیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعد پھر پیدا کی جا سکیں۔ ان میں ہمارے پیشروؤں کی جذباتی واردات اور نفسیاتی مشاہدات مضمر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسانی تجربے کے طیف میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے۔ اگر طیف کا ایک خط گم ہو جائے تو ہم اُس کی جگہ دوسرا خط نہیں کھینچ سکتے۔ اُس پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا۔ آج کے لکھنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے ہیں۔ اُسے اُن چیزوں کو جو پہلے معلوم و محسوس تھیں پھر سے جاننا اور پہچاننا ہے۔ ماضی سے دست بردار ہو کر اُس نے اپنی تخلیقی شخصیت پر ایک بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دوچند ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ، واضح اور دھندلا، گو مگو میں گرفتار اور ہزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ نقاد جن سے اُس نے پہلو تہی برتی تھی سارے اس سے پہلو چراتے ہیں۔ سر، ڈینی سن روس نے، جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تلمیحات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر و تقریر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں، چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا۔ ادبی حوالوں کے زیر عنوان انھوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا، شیکسپیر کا اور بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور "انگریزی روایت" کے تحت قومی تہوار، معروف شخصیتوں کے القاب و خطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے۔ حتیٰ کہ ایک جز "گھسے پٹے جملوں" پر بھی لکھا تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے اسی انداز سے، اُردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہو سکتا تھا! اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی ایک مشکل درپیش نہیں۔ وہ دو زبانیں پڑھتا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو اور انگریزی کا سا وسیع اختلاف رکھتی ہوں تو یہ خوبی کتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ علماء اور ماہرین تعلیم تاریخ اور تجربے کی مدد سے کئی ایک ناقابل تردید دلائل پیش کر کے ارشاد کریں گے کہ دو زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے۔ بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ یہ بیرونی زبان دوگونہ رحمت ہے، اس ملک کے لئے جس کی وہ زبان ہے اور اس کے لئے بھی جس نے اُسے اختیار کیا۔ ان کا ارشاد بجا ہے کیونکہ ہر نئی زبان ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ انسانوں کی اکثریت کے لئے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر افسوس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا، کچھ کام بھی کرنا ہے۔ اظہار خیال

ان کا فرض ہے اور اس بیطرہ میں کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے قریب ہے۔ جیسے جیسے مختلف زبانوں سے اس کے ذہنی فاصلے کی چوڑائی تو اس کے پاس ایک ہی ہے۔ ایک دریچہ ہے تو دوسرا شرق کا دریچہ ہے۔ دونوں کے درمیان سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ [illegible] آیات تیسرے [illegible] اختیار کر لیتے ہیں جو [illegible] کے پاس ذرا زیادہ سبز ہے اور دوسرے کے پاس ذرا زیادہ سرخ۔ مگر نہ تو کوئی پوری طرح سبز ہے اور نہ پوری طرح سرخ۔ یہ لطیف ادھورا پن اور روشنی اس کے لئے باعث نشاط بھی ہو سکتی ہے اور باعث فخر بھی۔ مگر اس کی جبلی روشنی کو سبز یا سرخ علاقوں سے اپنے اصلی رنگ میں گزارنا کتنا مشکل ہوگا۔ بات کا مطلب یہ کتنا درست ہے کہ دو زبانی ادیب اپنے دل کی بات سیدھے نہیں کہہ سکتا جب تک کہ دونوں زبانیں استعمال نہ کرے۔ گویا اس صورت میں بھی ایک رنگ ہے۔ اس کا ذہن کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ذہن کی دو لہریں یکے بعد دیگرے ابھرتی ڈوبتی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر اس کو ایک زبان کا پابند کر دیا جائے اور پوری بات کہنے کی مجبوری بھی ہو تو تحریر واضح اور بے ربط [illegible] قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی۔ اس کی تحریر کی بناوٹ میں آپ کو عجیب قسم کے ٹیڑھے ترچھے نظر آئیں گے اور ابہام اور الجھاؤ کی کئی صورتیں ملیں گی اور سب سے بڑھ کر انگریزی ساخت کے جملے جو بظاہر اردو میں دکھائی دیں گے جن کو دونوں زبانوں کے ماہرین ہی سمجھ سکیں گے۔ زبان ایک نازک اور لطیف ذریعہ اظہار ہے جسے فن کار بڑی مہارت سے برتتا ہے۔ مگر یہ دوغلی زبان معنی کے گرد طواف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور کہنے والے اشاروں سے زیادہ تابع فرمان نہیں ہوتی۔ لفظ اپنے معنوں کو ساتھ لے کے نہیں چلتے بلکہ محض دور سے ان کی طرف اشارہ کئے رہ جاتے ہیں۔ جب احساس شکست قوی ہو جاتا ہے تو دو زبانی ادیب اردو کو چھوڑ کے انگریزی میں لکھنے لگ جاتا ہے مگر علاقہ سبز ہو یا سرخ، مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب اپنے آپ کو ایک نئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ معاشرہ اس کے فہم و بصیرت کی حدوں سے بڑھ کر وسیع اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ اس نے اسلاف کے تجربے [illegible] اور اسی وسیع و عریض حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنی ہے تاکہ تکمیل اور استحکام حاصل ہو۔ جب تک یہ موافقت پوری نہیں ہوتی وہ بڑے پرجوش اضطراب کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کی محفل بنا کے بیٹھ جائے۔ اسی اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب کسی نہ کسی انجمن یا حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں۔ آج سے پہلے شاید ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے، محفلیں، انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یہ ادارے کتنی ہی سنجیدگی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں، معاشرہ سازی کی جبلی اور مصنوعانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ادیب کو ان کا دائرہ [illegible] اور ریاضتوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کے "کل" کو پا لے اور چونکہ بیرون خانہ سے اس کا رابطہ قائم نہیں ہوا۔ اس کو درون خانہ میں تلاش و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کام ادبار ملتوی ہوتا رہتا ہے اور جب تک کوئی زرخیز زمین ملے، زندگی کا رس خشک ہو جاتا ہے۔

پی۔ای۔این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے آرتھر کیسلر نے بتایا تھا کہ ٹورگینف کیسے لکھتا تھا۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوئے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ یہ گرم پانی کی بالٹی، کیسلر کے نزدیک الہام یا تخلیقی سرچشمے سے عبارت تھی اور کھلی کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی جو فن کار کے لئے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ کیسلر نے

یہ بھی کہ نقاد کو ماہرین دنیا اور چینیوں کے دل میں بیک وقت دو متضاد خواہش کو جنم دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ کھڑکی بند کر کے جڑ جائے اور اپنے تخیلی سمجھے چھپا کر رکھا کرے مگر اس کے علاوہ بھی ایک خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ ماہر کی بجائے اس کا ماہر کو کھینچ سکتی ہے تا کہ وہ گرم پانی سے اپنے پیر نکال کر کھڑکی پر چھلانگ لگا جائے۔

ہمارے اردو ادیب کو بازار کے واقعات دیکھنے کی مسابقت اور مرکزیت بہ الفاظ دیگر [illegible] کوئی پرواہ نہیں۔ بیشتر کھڑکی بند کر کے گرم پانی میں پیر ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اس نے سامنے کا منظر دیکھا تو اسے کوئی پیچھے چلنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ وہ کھڑکی کی سیر سے واپس نہیں آتا اور گرم پانی پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نئی دنیا ابھرتی ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لیے بے شمار چیزیں ہیں اور محسوس کرنے کے لیے بہت سا مسالا ہے۔ اس حالت میں اس سے عظیم فن پاروں کی توقع بے جا ہے اور یہ امید بھی عبث ہے کہ وہ اپنے پیر گرم پانی میں ڈالے رکھے گا اور کھڑکی یا بازاروں سے بچ کر [illegible] شامل نہیں ہوگا۔ البتہ ملک اور ساتھیوں کو اس کے بیان، مقصد کی سنجیدگی ملے گی اور آنے والے دور کو دیکھنے اور مستقبل کو روشن کرنے کی ہمت ملے گی۔ اصلاح کی دعائیں اس کے ساتھ ہوں، اس کی تیز نظری، انقلاب، نکتہ چینی اور بے حکمی، تنگ نظریوں پر [illegible] اور مجموعے پانے سے اس کو بے نیازی یا انکار ہے۔ ہم اس سے بڑا خراج تحسین اس کو نہیں دے سکتے کہ اس کی مشکلات، مجبوریاں، تکلیفوں اور تحریروں کو سمجھیں تاکہ اس کی جدوجہد اور اس کے کارنامے کی بیش از بیش قدر کر سکیں۔ میں نے اس جگہ یہی کرنے کی کوشش کی ہے۔

کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں

عصمت چغتائی کے افسانہ میں ایک لڑکی دوسری کے متعلق کہتی ہے کہ "حمیدہ موٹی تھی تو کیا، مگر وہ تو حد سے زیادہ تھی بے چاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں۔ جنس دیکھتے ہی کیا ہر وقت خراب رہتا ہے؟" جب میں نے عصمت کی کلیاں اور چوٹیں دوران مجھے ختم کر لئے اور جو چند دیباچے اور مضامین ان کے مداحین اور معترضین نے ان پر ازرہ تنقید و تعارف لکھے ہیں ان سے سرسری طور پر گزر چکا تو استعارے کے رنگ میں یہ فقرہ پھر یاد آیا۔ "لوگ کیا سمجھتے ہیں۔ جنس دیکھتے ہی کیا ہر وقت خراب رہتا ہے؟"

اس فقرے کے معانی کو کھینچ تان کر پھیلا لیجئے اور اس پر تھوڑا سا فلسفیانہ رنگ چڑھا دیجئے۔ تو عصمت کے بعض کمالات اور نقادوں کی بعض کوتاہیوں کو بیان کرنے کا اچھا خاصا سبب ہاتھ آجاتا ہے جو حال ذہنی کا ہے وہی حال کئی اور معروف اور متداول ہیبتوں کا ہے جو مستقل الفاظ اور عادات مستمرہ کی شکل میں قسم قسم کی شیاء پر چپکے نظر آتے ہیں ذہنی کثافت اور خوف ہراس دل کے مارے ہم اکثر مختلف ہیبتوں پر کچھ اصرار کر دیتے ہیں مان سے آگے کل کر اصل چیز کو جانچنے اور پرکھنے کی ہمت ہی آپ میں نہیں پاتے۔ مثلاً عشق پر دل گدازی کا لیبل مدت سے لگا ہوا ہے اس لئے جہاں ان کا ذکر کئے بغیر سننے والے دونوں ایسے عشق، ساکب پاکیزہ رقت کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو بیٹھتے ہیں۔ جنسی مشغل تحقیق کر ستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہو کر ابت یا اخلاقی تنبیلئے ہو لوگ برہم ہو جاتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا سایہ رہانا چاہئے۔ کہ پاک محبت کا سب سے اونچا درجہ ہے لیکن بہن بھائی کے درمیان جذبہ عالیہ کے سوا تعلق کی گنجائش ناممکن یا کم از کم نامناسب ضرور سمجھی جاتی ہے۔ عصمت چغتائی کے رہنما بھی اندھا دھند ایسے ہی لیبل ہوتے تو ادب ان کی بہترین انشا سے محروم رہ جاتا لیکن ان کی بصیرت اس سے کہیں زیادہ دور رس ہے۔ وہ لیبلوں کے فریب میں نہیں آتیں اور جسم اور دل اور دماغ کی کئی کیفیتیں سیپ جن سے وہ دیکھتی ہیں دوچار ہوتے نہیں گھبراتیں ایسے انشاپرداز کا بغیر حوصلہ مشاہدہ، وقت نظر اور جرأت بیان کے گزارہ نہیں۔ اور یہ ادب کی خوش قسمتی ہے کہ عصمت کو یہ تینوں نعمتیں میسر ہیں۔

برخلاف اس کے احساس ہمدردی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جرأت اور وقت نظر میں سے عصمت کے نقادوں کو حصہ وافر نہیں ملا۔ ان کا حال ان کا ذکر جانے دیجئے جن کو عصمت کی تحریروں میں اپنے اخلاق اور ادب دونوں کی تباہی نظر آتی ہے وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیبل گوند سے چپکے ہوئے نہیں میخوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ذہنوں میں ایک موٹی موٹی لکیریں والی جدول بنا رکھی ہے کہ ان چیزوں کا ذکر حلال ہے ان کا حرام ہے۔ نامحرم کا ذکر ہم مقررکچھے میں کر لیں ہے۔ محرم کا ذکر معاملہ جدی ہے یعنی جائز ہے۔ حرام کا کچھ فوت کا منظور ہے تو بھائے، ہاں ادب کو منظور نہیں۔ اور یہ نوبت کا مطالعہ ؟ محض ایک ڈھونگ! آؤ دوسرا جل کا خندہ آوارگی! بہی بچپن میں مطالعہ پر کوئی مجبور کر سکا آپ کسی کی

کیا حال ہے؟ ہم جب بھی کھلونوں سے دل بہلاتے تھے اب بھی کھلونوں سے دل بہلائیں گے ... ایسے لوگوں سے اس وقت بحث نہیں کیونکہ ۔

وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی
کچھ ان کی خبر نہیں آتی

شکایت ان سے ہے ــــ اور اپنوں کی شکایت ہے، بیگانوں کی سی نہیں ــــ جو عصمت چغتائی کے تذکرے اور مدح میں، ان کے مضامین کو پڑھ کر روح میں ایک بالیدگی محسوس کرتے ہیں جس سے دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ فلسفہ کردہ گی پھر کر بیلوں نہ کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ افسوس کہ عصمت پر ان کی تنقید اور افسوس کہ لیبلوں میں سے سب سے بڑا اور گمراہ کن لیبل عورت ہے۔ مرد حضرات کے قرون کے خرابوں اور محرومیوں سے چھپا ہوا۔ عورت دلفریب ہے، مکار ہے، صنف نازک ہے، ایک معمہ ہے، کمزور ہے، کم عقل ہے، مجموعہ اضداد ہے ... جہاں آپ نے عورت کا نام لیا، ان میں سے دو چار گھسے پٹے معنی ذہن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اسی فریب میں آکر ایک صاحب اور یہ دیباچہ نویس فرماتے ہیں:۔

"عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پُر پیچ اور شوخ گداز، نظر آتے ہیں میں شاعری نہیں کرتا اور اگر اس بات میں شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو بھی بات میں دخل ہوتا ہے مجھے یہ افسانے اس جوہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے۔ اس کے باطن میں ہے۔"

اب یہ معلوم اس نوجوان نقاد کے تصور نے عورت کا لیبل کس قسم کی چیزوں پر لگا رکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو وہ جوہر بھی کھلتا جو بقول ان کے عصمت کے افسانوں میں ہے لیکن ان کے رنگین تصورات و مفروضات کے خلوت کدہ میں ہمیں کیونکر باریابی ہو سکتی ہے اور کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں جس میں عورت کے وہ معنی مل جائیں جو اس تنقید کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ دیباچے کا مقطع ہے:۔

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

لیجئے۔ عورت کے ایک دوسرے تصور سے پھر ہمارے عزیز کی ناقدانہ نظر بہک گئی۔ دکھانے تو چلے تھے عصمت کے افسانوں کا جوہر لیکن آخر میں کہہ گئے کہ یہ عورت ناقص العقل جانور ہے ڈاکٹر جانسن کے کتے کی طرح کہ دو ٹانگوں کے بل کھڑا ہو جائے تو تعجب و تحسین ہی کا نہیں بلکہ ہم انسانوں (یعنی مردوں) کے لئے شرم و ندامت کا موجب ہے۔

ایک اور مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس نے بھی معلوم ہوتا ہے انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اپنی جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانہ میں انگریزی ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا۔" گویا ادب بھی کوئی ٹینس کا ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلم لیکن لیبل اس کا نام لے دینے تک ہی ملا اور بچوں کو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے ــــ خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں، بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی۔ جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ بھی ہو، بہرحال اس قسم کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنا پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ مرتبوں میں کھڑا کر دیا جائے۔

اسی طرح جہاں کسی نسوانی نوجوان کو بار بار ... یا کسی منفی جذبے نے کس قدر ... تو ذرا ہوشیار اور ... مند دل رکھنے والے نقادوں نے عصمت کا ... جلیں یا نہیں کہ سماج کی تبدیلی ہو رہی ہے۔ اب ہم سے دیکھئے تو ... عصمت کے اچھے افسانوں میں ماحول محض اس لئے شامل نہیں ہے کہ ... بغیر ... کردار ... گئے ... کا ... کوئی گوشت پوست ... پھر اس کے بغیر کچھ چارہ نہیں ... ماحول ایک ... معروف طبقہ کا ماحول ... پیش نظر کہانی پڑھنے کے بعد اس کا مطلب تو نہیں کہ یہ ماحول جن معاشی اصولوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا وہ ... ختم ہو چکے ہیں۔

عصمت نے بعض ... ہیں جن ... سوچ ... دیکھتے ہیں۔ ... جہاں بھی سماج کو اپنا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے ... سچ تو یہ ہے کہ سماج کی جن باتوں سے عصمت کا ... عصمت نے ... لیکن کچھ کام ... انہوں نے ... اور ... عصمت ... پیٹ میں ... خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ عصمت کی حقیقت شخصی سماج ... شخصیتوں ... سے ... ان کی کڑواہٹ اور ... ان کی باہمی کشمکش اور عادات اور ... غرض ان تمام کیفیتوں سے ... ہوتی ہیں۔ تو جسم پر ... اور دوران خون تیز ہو جاتا ہے ... اعصاب میں ... نفسیات میں ... پیدا ہوتا ہے اگر عصمت اور سماج کا ... کیا جائے کہ ان کی ... انشا ... خاص ... سماجی کشمکش کی پیداوار ہیں ... نہیں مگر توجیہہ ہی ہوگی ... عصمت جیسے ... اس صدی کے ... ہیں ... لوگوں کے ... اور اس کی ... جب ... تو یقینا خیال ... ہوگا لیکن ... ہے ... حالات ... مختلف چیزیں ہیں۔ اس بات کا مطالعہ کرنا ہو کہ بعض سماجی حالات سے نبوکر عصمت جیسی انشا پرداز کو پیدا کیا ... تو ... کی بنا پر عصمت نے ... دیکھئے ... سبب ... ہے تو یقیناً کشش عقل کی ... ہے ... نہیں رکھا جا سکتا۔ ... سبب سمجھنے میں ... اس کی ... ہوتی ہے۔

عصمت کے دونوں مجموعوں میں ڈرامے، افسانے اور اسکیچ تینوں قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ ان میں ڈرامے سب سے کمزور ہیں۔ ... کی وجہ میں اوّل تو یہ کہ ڈرامے کی ٹیکنیک عصمت کے قابو میں نہیں آئی۔ یا یوں کہئے کہ ابھی تک ... پر قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ پلاٹ کو منظر بہ منظر تقسیم کرنا ... تو ان کو ... سے نہیں ... یونہی ... سے ... چنانچہ ... دکھائی دیتے ہیں ... کوئی سین جب پھیلتا ہے تو ... بغیر ہی ختم ہو جاتا ہے جیسے گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان کہیں بھی رک جائے۔ خیر اس ... سے کیا حاصل؟ ... تو کیا مضائقہ ہے۔ ڈرامے کو ڈرامہ نہ سمجھئے، کہانی سمجھ کر پڑھئے اور فرض کر لیجئے کہ کہانی نے ڈرامے کا لباس کسی ضرورت سے نہیں بلکہ محض تنوع کی خاطر پہن رکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ ... سے بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ کہانی کو ڈرامے کی شکل دی جائے تو ایک ... ضرور کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ کہ قصہ اوّل سے آخر تک مع اپنے نشیب و فراز کے تمام تر افرادِ قصہ ہی کے اقوال و افعال کے ذریعے بیان کرنا پڑتا ہے۔ مصنف سے یہ آزادی چھن جاتی ہے کہ ساتھ کرداروں کے جذبات و خیالات کو اپنی زبان سے واضح کرتا جائے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پابندی عصمت کے بس کا روگ نہیں۔ افسانہ ہو تو عصمت کو کسی ... کے واضح کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ انہیں افسانہ نویس کے اس حق سے فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے کہ جب چاہا کرداروں کے

کچھ کھلونا سا جب چاہا توڑ پھوڑ کر پھینک دیا لیکن جب یہی زمانہ ختم ہو اور سب کھیل ایک جگہ یعنی ڈراموں میں اکٹھا ہو تو عصمت ناکام رہ جاتی ہیں۔ دراصل ڈراموں میں گھر کر ان کا مطلب اثر قائم ہوتا ہے یہی نہیں چند ڈراموں میں جیسے وہ بستے ہیں اور ان میں اس کردار کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔ جو ان کے افسانوں کے مکالموں میں اکثر پایا جاتا ہے۔ ڈرامے کے پیچھے میں کس قدر خلوص اور وہ تیکھا پن ہے) بعض اوقات تو مکالمہ کچھ ایسا بے جوڑ ہوجاتا ہے کہ یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ واقعہ کیا پیش کیا جارہا ہے۔ ان کا ڈرامہ "انتخاب" سے "دو مذاق" پیشتر اس سے کہ یہ ڈرامے سب کچھ وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہ نقص ان کے افسانوں میں بھی ... گیا ہے، ڈرامہ نویس اگر ... نہیں کہ وہ ایسے منہ سے بات کرے۔ باقی رہے کیریکٹر سو وہ آپس میں ابھی گفتگو کرنے بیٹھے ہیں۔ ڈرامہ ... گو ... سے کچھ نہیں پڑتے دیتے۔ ڈرامہ نویس ہم تعارف پر مجبور ہے اور کیریکٹروں کو تعارف کا سلیقہ نہیں۔ ان ڈرامہ ... ہیں کہ تیرا حشر؟ بہرحال ... میری سمجھ میں نہ آئے ہیں عصمت کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ چند اشخاص نہیں چند ٹائپ پیش کریں یعنی ہر شخص ایک طبقہ کا نمائندہ بن کر سامنے آئے۔ مگر اس سلسلے میں اشخاص کا ادراک نہیں کروا کا احساس ہوتا ہے۔ اور عصمت دو ڈراموں میں ایسے اشخاص نہیں جو اشخاص میں سے ہیں تو پھر نہ معلوم انہوں نے یہ ہیئت کیوں مول لی!

علاوہ ان سب باتوں کے ان ڈراموں کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں عصمت نے جس قسم کے لوگوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان سے وہ طبعاً تعلق نہیں رکھتیں۔ یعنی کھوکھلے فرد اور ان لوگوں کو جو تعلیم یافتہ ہیں مگر جن کی ترکیب میں تعلیم کم اور دیانت زیادہ ہوتی ہے۔ جو خوش حالی، بے حسی، انحطاط اور پیشہ ورانہ رقص کے بل پر اپنے مشاغل اور اپنی فکر میں بے فکر ہیں اور حجب پیدا کرلیتے ہیں جن کی بدولت وہ "سوسائٹی" کہلاتے ہیں۔ وہ کم نصیب لوگ کچھ ان سے نفرت کچھ ان پر رشک کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس طبقے کی بعض خصوصیات عصمت کو کچھ زیادہ چبھتی ہیں۔ وہ کس کی عشق بازی پر تقریباً رشک بھی ہے وہ خود کبھی نہیں جانتیں لیکن یہ بالکل صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس طبقے کو انہوں نے دور ہی سے دیکھا ہے۔ قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا کہ اس کے نقوش اور خد و خال واضح دکھائی دیتے اور اس کے خوب وزشت اور ظاہر و باطن کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا۔ چنانچہ جب عصمت اس قسم کے کیریکٹر یا ان کے ماحول کی تصویر کھینچتی ہیں تو ان کی جھلک کبھی درست نہیں ہوتی۔ "پھوڑی" "کلمنشی" "ارغوان" (یعنی پیو) "ٹینس" "ڈرائنگ روم" "ریسٹ" ... اسی قسم کی اصل اور خیالی چیزیں جمع کر کے ایک کردار فسانہ بناتی ہیں۔ مگر ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس ساز و سامان سے ایک ... خاکہ بنا لیا جائے اور پھر اس یقین کے ساتھ بیاض چھپی جاتی ہیں کہ ان کی سادگی پر رشک آتا ہے۔

کیریکٹروں کی گفتگو اور حرکتیں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں کہ جب مصنف ہنسانے پر ارادہ کرتا ہے، اور دوسرے تو ہنسی آتی ہے۔ ایک تصنع تو ان میں وہ ہے جس کا مصنف کو علم ہے لیکن ایک تصنع ان میں ایسا بھی آجاتا ہے جس سے مصنف خود بے خبر ہے۔ اور جو در اصل اس کے اپنے تصنع کا عکس ہے یعنی کیریکٹروں کی سطحیت کو بے نقاب کرتا ہی تھا اپنی سطحیت بھی ساتھ بے نقاب ہو رہی ہے۔ ایکٹروں سے پہلے کیریکٹر خود ایکٹ کرتے ہیں۔ بات بات پر اپنی زندگی میں تھیٹر کی سی سچوایشن (SITUATION) پیدا کر لیتے ہیں اور پھر اسی طرح بنتے ہیں کہ ان کے کردار خود ڈرامہ نویس کے حسن مذاق پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ "سانپ" میں عصمت نے چند ایسی عورتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو بزعم مصنف "شکاری عورتیں" ہیں یعنی وہ رنگین تریا چلتر مردوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے لیکن ان کی تھکی ہوئی باتیں سنئے اور ان کی اکتا دینے والی خوش فعلیوں کا تماشا کیجئے۔ تو اس نتیجے پر پہنچئے گا کہ کسی چوہے کا شکار تو یہ شاید کرلیں لیکن اس سے زیادہ کی ... بے چاریوں سے قاصر ہے معلوم ہوتا ہے چند کم عقل چھوکریاں ہیں۔ جنہوں نے کوئی ارزاں قسم کا خوش پوش امریکن فلم دیکھ لیا ہے۔ اور گھر میں دو ایک جگہ صوفے اور کرسیاں بچھا کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہی

میں قیاس ہے کہ ... [illegible] نہیں کرتا۔ وہ طرح عصمت نے بھی دیکھا ہو۔ [illegible] ہوا ہو۔ ایک مکالمہ تو اس ڈرامے میں ایسا ہے کہ بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے [illegible] ... [illegible] سے بوچھتا ہے کہ جب وہ اس سے نہیں غفار سے شادی کرے گی۔ غفار کا اس ماٹو جاننا ہو تو ملاحظہ ہو۔

رفیعہ۔ نہیں میں تمہاری زندگی برباد نہیں کروں گی۔

غفار۔ (جوش سے) برباد نہیں۔ تم میری زندگی بنا دو گی۔

رفیعہ۔ نہیں میں تمہیں کچھ بھی نہ دے سکوں گی۔ سوائے [illegible]

غفار۔ رشتہ تو ... [illegible] ... مجھے تمہاری ... [illegible]

سے ہی راحت ہو گی۔

خالدہ۔ (رفیعہ سے) ... مگر اب تو رفیعہ نے ... [illegible]

غفار۔ [illegible] ... کیا فیصلہ کیا ہے؟

خالدہ۔ [illegible] ... تمہیں ... [illegible]

رفیعہ۔ ہاں اب آپ کی طرف کر سکوں گی ...

(غفار پریشان ہو کر مسکراتا ہے۔)

غفار۔ (خوش ہو کر) ... تمہارا یہ مطلب ہے کہ ... مجھے [illegible] رہی ہو۔

رفیعہ۔ کیونکہ اب تم نے بھی شاعری شروع کر دی

غفار۔ (پریشان ہو کر انگلیاں چٹخا کر) اور عصمت ... [illegible] دیتے رہے۔

خالدہ۔ غفار، کیا تم ... [illegible] ... پر ... [illegible]

گئے۔ تم دیکھنا میری دوات بناؤ گی کہ ... [illegible]

غفار۔ کاش میری بھی دوات بن جاتی۔

خالدہ۔ مگر غفار سوچو تو ..

غفار۔ ایک عرصہ ہوا ہمارے بزرگوں نے یہ بات طے کر دی تھی

خالدہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ آبائی حق تو تمہارا ہے پر یہاں تو رفیعہ کا معاملہ آن پڑا ہے۔ وہ ایک ضدی ہے!

غفار۔ (اندوہگیں ہو کر) میں ـــ جا رہا ہوں (نہایت اداسی سے) رفیعہ! خدا کرے تم خوش رہو۔

عصمت اس سین کو ایک سین سمجھ کر لکھتیں تو شاید ڈرامہ نویسوں میں ان کا نام رہ جاتا۔ لیکن افسوس کہ ان کے ہونٹوں پر مجھے مسکراہٹ نظر نہیں آتی۔ اور جب مصنف ہنسانے والی باتیں لکھے اور خود اسے ہنسی کی کوئی بات نظر نہ آئے تو افسوس ہوتا ہے۔

کچھ ایسی ہی بے تکلفی ڈراموں کے علاوہ ان افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں عصمت نے ان جدید نما چمکیلے رنگوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں نہ پلاٹ کی چولیں ٹھیک بیٹھتی ہیں نہ کیرکٹر کا ناک نقشہ ہی درست ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میگزینوں میں سے کہانیوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوڑ لئے ہیں۔ اور پیشہ ور ناول نویسوں کی طرح رنگین رومان کا رنگ دے کر جھٹ موٹ ایک بات بنالی ہے۔ "پنکچر" اور "شادی" پڑھ کر دل پر یہی اثر ہوتا ہے۔ "دو ہاتھ" میں تو بنا و ٹ کے آرمزاینڈدی مین کے پچھلے سین پر کچھ اس طرح سے ہاتھ صاف کیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں۔

"بسیلیا ارپیل اینڈ ورفنسن" اور "پرنٹوں کی دنیا" عصمت کی دنیا نہیں۔ اس میں وہ عجیب اجنبی ہیں اس کی تہ کو وہ جب پہنچیں گی تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال ان کی دنیا وہی ہے جو ان کے بہترین افسانوں یعنی جوانی، ڈائن، ہیرا، بھول بھلیاں، ساس، بیمار اور تل میں پائی جاتی ہے، یہ وہ دنیا ہے جس میں عورتیں پردے کے پیچھے سے نقرے چست کرتی ہیں جس میں زینوں پر اور دیواروں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے جس میں مرد کی پلنگ پر چارپائیاں رکھی ہیں۔ مجبور انیوں کی جوانی بے وقت کر لیا کرتی ہیں۔ لڑکیاں گو بیٹی پھرتی ہیں۔ وہ تکیا میں ڈبکیاں لگاتی ہیں جس میں کلکلے بچے ماں کے پیٹ سے چپکی کی طرح چپکے ہوئے چپڑ چپڑ منہ مارتے ہیں اس کے گرد جیبیں ہیں وہ اس سب تعلقی اور احساس ہم آہنگی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں۔ کہ اسی کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں چنانچہ وہ کس سہولت کے ساتھ دو تین بیار خط کھینچ کر اس دنیا کو کاغذ پر لے آتی ہیں عصمت کے بہترین افسانوں میں آپ کو نقشہ اور ماحول کے لمبے لمبے پرتکلف ڈسکرپشن (DESCRIPTION) کہیں نہیں ملیں گے۔ یہیں جو بات ہے وہ ایسے چپکے کہی ہے کہ اختصار سے تشنگی اور خلا کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ "ساس" کے شروع کے فقرے ہیں :-

"سورج کچھ ایسے زاویے پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر
بڑھیا کے کھرپے ہی روشنی پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رُخ سے
گھسیٹی اور اسے اوچھی پیل پر دھوپ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم نقشوں کی
آواز چھت پر سے آئی۔ خدا غارت کرے پیاری بیٹیوں کو۔ ساس نے بے حیا بہو کو
کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی۔ دنیا میں
ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جیئے۔ اسے تو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر۔ ذرا
ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آ پہنچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپا سکے۔"

اتنے مختصر سے الفاظ میں اس سے زیادہ کوئی کیا رنگ بھرے گا اور رنگ بھی ایسے کہ نہ ضرورت سے زیادہ شوخ نہ ضرورت سے زیادہ مدھم۔ یہی حال "ہیرا" میں کے ایک ٹکڑے کا ہے :-

چھوٹے تال سے گذر کر پیاپے ہوتے ہوئے دونوں ننھے منے بیوپاری شہر کی سڑک پر
چلنے لگے۔ یہ کم بخت جاڑا آفتاب کے ایسا مانت میں کرکے پڑا تھا کہ زم ہونے کا نام ہی
نہ لیتا تھا۔ گرمی تو جیسے تیسے کٹ جاتی ہے۔ چاہو جتنا نہاؤ، پیاؤ پر سے ٹھنڈا پانی جتنا
چاہو پی لو۔ نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ۔ رتو کو تو دھوتی کا بھی مرہون منت نہ ہونا پڑتا تھا۔
یا سوت کا ڈورا جو اس کے کچری جیسے پیٹ پر سے پھسل کر کولہے کی ہڈیوں پر مرتے

بے شک جاتا تھا مروت سے زیادہ تھا وہ نے سے تلے میں ڈبکی لگائی، کناروں پر کراہ ان
بیٹھ گئے اور اُس کے چھپاکوں سے سو گئے۔

اور اس سے بھی مختصر یہ کہ:—

> ۔ ذہری سنسان راتیں بیت بیتے کٹتی گئیں۔ بیوائی و دنیاں اندر، بھی مٹھا حاصل کرنے کے لئے
> سارے گھر کا دن بھر تیسرے کھیت میں بھٹکتے گزر جاتی۔ بیزار گھاس چھیل لاتی۔ بھینسوں
> کو بھی دن سے اور دودھ چرانا شروع کر دیا گیا۔ جتنا جانتا کا بھی ہاؤس میں ہی ایک تھنبا
> ہو گئی۔ دوسری بیاہنے کا نام بھی نہ لیتی تھی۔ جیسے جب بڑی ہو جاتی ہے تو پتہ ہی
> نہیں چلتا۔ نہ اس کی کمر جھکے نہ بال چھوٹی ہوں۔

ان اقتباسات میں پانچ پانچ چھ چھ فقرے ایک سا نمونہ پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو یہاں نقل بھی کر دیا ورنہ اسی قسم کا ایک ایک دو فقروں سے کئی سوکھی جگہ ہیں۔

یہ دنیا بیشتر مفلسوں اور انکڑوں کی دنیا ہے۔ بہرحال امیروں، نفاست پسندوں اور تماشبین لوگوں کی دنیا نہیں۔ اس میں فلسفے بھی غلطیں ہیں (اور غلط قتوں کا حال عصمت کتنی برہم ہو کر اور بے کے پردے سے کر بیان کرتی ہیں) جہالتیں ہیں، بدنامیاں ہیں، ناکامیاں ہیں، بیماریاں ہیں، ڈھیروں بچے ہیں، لیکن پھر بھی ان میں زندگی کا ایک خلا ہے جو دبائے نہیں دبتا، امنگیں ابھرتی ہیں، جوانی اپنے نشے دکھاتی ہے، ذہن میں شرارتیں چٹکیاں لیتی ہیں۔ اور نفسِ انسانی کا ہیولیٰ دور آزمائی کرتا ہے جن افسانوں کو میں نے بحث کے لئے منتخب کیا ہے ان میں آپ کو بہت بڑی بلندی یا بہت پرستی تہ رانی نظر آئے گی۔ عیش امن، خواہش آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہ ملے گی۔ نہ وہ حزن و ملال ہی ملے گا جو کہرے کی طرح دل پر چھا جاتا ہے۔ اس میں ٹریجیڈی کی کوشش ہے نہ کامیڈی کی۔ لیکن انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ اس طرح دوڑتا ہے جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے، لپالپ اور اچھلتا ہوا اور ٹکراتا ہوا اور رستہ چیرتا ہوا۔

ان افسانوں کا موضوع کیا ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگ ان افسانوں کو (اگر ایسے افسانے انہیں ہاتھ آتے تو) عشقیہ افسانے یا "عشقیہ افسانے" ہی سمجھ لیتے۔ لیکن عشق کے معنی اس قدر پھیل چکے ہیں کہ عشقیہ سے یہاں کام نہ چلے گا۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، صوفیوں کا عشق، غزلوں کا عشق، فلموں کا عشق، اور پرستاروں کا عشق۔ سبھی طرح کے عشق ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج جدا ہے۔ اس لئے عشق کے لفظ سے نہ جانے کہنے والے کا مفہوم کیا ہو، اور سننے والے کیا سمجھ بیٹھیں۔ "جنسی بھوک" پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں، لیکن محض اس سے بھی بات نہیں بنتی۔ کیونکہ جنسی بھوک تو دانتے ہی ایڈس سے لے کر کتے بلیاں تک سبھی کو لگتی ہے۔ عصمت کے افسانوں میں جو جذبہ مرد عورت کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے اس کی کسی قدر اور تخصیص کرنی چاہئے۔ ایک بات تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اس جذبے میں شاعرانہ لطافتوں کی رنگینی نہیں پائی جاتی۔ اس کا رومان سے کوئی تعلق نہیں۔ عصمت کے کسی افسانے میں مرد یا عورت کے حسن کا کبھی ذکر نہیں آتا۔ کیونکہ جو جذبہ ان کے پیش نظر ہے اس کی تحریک کے لئے حسن کی ضرورت نہیں۔ یہ محض خون کی تاریک حرارت اور جسم کی جھلسا دینے والی گرمی سے پیدا ہوتا ہے اور جب انسان کے جسم میں یہ آگ لگتی ہے تو وہ کبھی اس کو بجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ اس آگ سے کوئی پیچیدہ نفسیاتی مسئلے پیدا نہیں ہوتے۔ صرف تند و تیز شراب کا سا نشہ [illegible] رگ رگ میں

سرایت کر جاتا ہے۔ طلعت کے پتلے جسم پر سے رنگ چڑھاتی ہیں۔" اور کب یا نکھن بھی غیب ہوتی تھی۔ اس کا ظہور تو اس سے کہ تکمیل جسم کی ۔ ستلے پہ صورت ہی کے غصے میں کہ " شہر کے تندرست لڑکوں کا گوشت پوست کسی چسپرت ... سے جڑا ہوتا ہے۔" اور جب تک بدن چست ہے اور گال پیکتے ہیں سب اچھے، اور پھر کچھ نہیں۔" اور پھر " دوبارہ تو آ گیا دل آزردہ سا تھا کہ اس میں بیوی کا کیا قصور۔ وہ نوجوان تھی، اور گال میں خون، قدم تھا۔ مگر دل بھی جھٹ موٹے گوشت کی نس سے کچھ کہتا تو وہ سنتی جاتی ..." مطلب یہ کہ جسم ہی ہو ہے۔ یہاں دل کی زندگی سے کام نہیں چلتا۔ عصمت کا شعور عصمت کے افسانوں میں اس قدر شدید ہے کہ پڑھنے والا جسم کے متعلق ... خود عصمت کی طرح بہت زیادہ ... ہو جاتا ہے۔ صاف ... بتا ... کا مریض تھا۔ اور پھر جب جوانی آئی تو عورتوں کی عادت سے اس کا چہرہ ... ذرا موٹا ... سر کے زرد ... سخت ... مضبوط شاخوں کی طرح نکلے ہوئے۔ ان سے ڈھک گئے ... بہنوئی کے اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ اور پنڈلیاں سفید ... ... بڑا کا گٹھا ہوا مضبوط جسم، ننگی ہری بھری چھوٹی سی توند اور بڑے بڑے پٹھے جو ہمیشہ گرمی میں ڈوبے رہتے ہیں ... پیار کا موٹا بڑا ... ... سڈول مضبوط گھٹنوں والا جس کے تہ سے موٹا ہو جاتا ہے۔ اور جس کے جبڑے چکی کی طرح چلتے ہیں۔ ... ... چکنے چکنے ... شہرات سے سینے پھٹکتے ... گھٹے گھٹے پسینے میں ڈوبے ہوئے۔ اور ... ہوئے ڈوروں ... کی چھدری ... آتی تھیں۔ اور دوسرا کی چھوٹی ... ہو گئیں اور چکنی جیسی ہونٹ نکلیں ... بھاری بڑے بڑے ... دادا ہاتھ اور ... کالا ... جنوی کھونٹے جیسی ... غرض عصمت کہیں جھٹکا نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کے جانے والے جسم یا ... جسم لپٹے تناسب ہیں۔ ... یا پاکیزگی اور نفاست سے۔ مطلب ... نہیں، بلکہ محض جسم ... گرمی سے ... اور ... کی حرارت سے ... جسم بھی ایک آفت ہے۔ یہ ہم ... ان کے ساتھ ... کی طرح یا بقول عصمت کے جوان جوانی کی طرح سوار ... جب خواہش ... جسم جسم کو پکارتا ہے تو ان انسانوں کے ... نہیں ... سوچ نہیں سکتے، بلکہ ... اس پیاسے ... کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اور وہ ... بھٹکے ... چل دیتے ہیں ... بے ... ہیں ... ... سے جاتے ہیں ... ان کے قدم ... عصمت کے الفاظ میں یوں کہئے کہ جوانی ... ٹوٹ پڑتی ہے۔ ... کیا ... خواب تو کوئی روک نہ سکا ... اور ... نہیں ... آیا ... روک ... ہی گیا ... اور یہاں عزت اور رشتوں کی جگہ کچھ ہی ... نہیں رکتے۔

اور جب اس جسم میں طوفان آ اٹھتے" اور ... پر ... سے ... لگتے ہیں۔" اور دل دو ماغ پابندی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور عجیب عجیب پابندی ... جسم اپنا بدلہ جسم ہی سے لیتا ہے چنانچہ اس کشمکش کے زیر اثر ... اور ملامت نہیں پیدا ہوتی ... تخیل کے ریشم میں لپٹ کر ... نہیں ہو جاتے بلکہ ان میں ... قسم کا اظہار ... درشت قسم کی ... بیدار ہو جاتی ہیں وہ ایک دوسرے کو ... ہیں ... کلائیاں ... کو ... دیتے ہیں۔ ... جسم پر ... ڈال دیتے ہیں۔ ... چٹکیوں سے مسل دیتے ہیں۔ ... بال ... کر ... دیتے ہیں۔ دم نہیں مارتے ... کس کر ... ہیں۔ ... پچھاڑتے ہیں۔ یعنی دل ... جسم کی گرفت کبھی ڈھیلی ہونے نہیں پاتی۔ اور یہ جذبہ ... اپنے ... اور بدویت کی شان کو نہیں چھوڑتا۔

تو پھر عصمت کے افسانوں کا موضوع جسم ہے؟ نہیں یہ کہنا تو درست نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ افسانے بلاشبہ ادب کے دائرے میں شامل ہیں۔ اور ادب (یا کسی بھی آرٹ) کا موضوع جسم نہیں ہو سکتا۔ یعنی وہ جسم جو علم الاعضا کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ نہ جسم نہ ... آرٹ کو تو ذہنی کیفیات سے سروکار ہے کیونکہ آرٹ کا منصب ذہنی ارادات کا بیان اور بالآخر ان کیفیات کی تربیت ہے یہ سب چیزیں ذہنی محرکات

ہیں۔ ان میں سے بھی دوسری کہانی۔ اس سے گذر جانے کے بعد [illegible] دیکھئے [illegible] ہے۔ [illegible] کیفیات کا دخل نہ ہو تو عصمت کا [illegible] ایک ادیب ہے۔ ادیب ادیب سے نقل نہیں ہے۔ [illegible] کا تاریخ ساتھ [illegible] تو ان کے [illegible] نہیں کر سکتا۔

مجھے پہلا اور بیان کرنا ہے اس کا مقصد [illegible] عصمت [illegible] حیثیت کا صحیح [illegible] اور یہ بھی دیا جائے کہ اس سے لوگ ان [illegible] مطالعہ کیا ہے۔ [illegible] حیثیت [illegible] دیکھنے سے [illegible] جو ہیں پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کو [illegible] سطح پیدا ہوتا ہے [illegible] کہ [illegible] ہے وہ [illegible] ان کا کیا مقام ہے ان سوالوں کا جواب میں مجلا اور پیمانہ [illegible] سے چاہتا ہوں [illegible] میرا ان [illegible] تک جو سکے وقت سے فلسفی اور [illegible] کے سپرد کر دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن ایک بات عام ہے [illegible] عصمت کی طرح [illegible] کوئی [illegible] ہے وہ [illegible] ہے۔ چنانچہ [illegible] کے مشہور افسانہ [illegible] میں سمجھتا ہوں [illegible] میں [illegible] کرنے میں جنس کی محسوسات کا ذکر ہے [illegible] ادب کی [illegible] سے ایک [illegible] سے عاری ہیں۔ [illegible] احساسات کی [illegible] ہو سکتی ہیں۔ [illegible] ہو سکتی ہے [illegible] ادب کے [illegible] میں شامل ہے۔ [illegible] سے [illegible] ان کی [illegible] قارئین سے [illegible] دیا ہے اس سے اس پر [illegible] ہونے کی ضرورت [illegible] انہوں نے [illegible] کیا [illegible] قیمت [illegible] ہوتی ہے۔ کہ اس کا مرکز [illegible] عسکری صاحب کی اصطلاح میں [illegible] ایک حیوانی حرکت ہے۔ شاید یہ خیال جو ہے کہ بیگم جان کی نفسیات سب [illegible] پھر سید [illegible] جذبات [illegible] ہوئی میاں ان دونوں سے ہٹ کر کہانی [illegible] ایک ادبی صحت [illegible] ہے۔ [illegible] چنانچہ پڑھنے والے چاہے اپنے آپ [illegible] اس قسم کے [illegible] کے لئے [illegible] بیٹھ جاتے ہیں۔

عصمت نے کچھ تو اسے بیچ بھی لکھے ہیں جن میں سے اب بھی دلچسپی وقت [illegible] عصمت کی خصوصیت [illegible] سے خالی نہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں کوئی [illegible] نہیں پہنچ۔ اور بیج تو یہ ہے [illegible] اس اسلوب [illegible] مثال نہیں ملتی۔ جو عصمت نے [illegible] میں اختیار کیا ہے۔ ان چند صفحات میں عصمت کچھ اس طرح [illegible] کو پھیلا کر ٹی ہیں۔ [illegible] دیکھئے اپنے [illegible] مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔ میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں عورت بن کر ..... میں بہن ہوں نہیں [illegible] بن کر کھتی ہوں [illegible] اس [illegible] کی ضرورت بھی [illegible] آئی کہ [illegible] دیانت پر تو ایمان [illegible] پڑھنے والوں کی دیانت پر ایمان [illegible] لیکن چند ہی [illegible] میں وہ اپنے خلوص [illegible] جرات سے پڑھنے والوں کی ہمت بلند کر دیتی ہیں۔ [illegible] کسی کا بھائی نہیں ہوتا کسی کی بہن نہیں ہوتی۔ احساسات [illegible] کی دنیا میں [illegible] محض اتفاقات کا نام ہیں۔ چند نسل جو نہ معلوم کن چیزوں پر بیٹھے ہوئے ہیں [illegible] ہٹا کر دیکھئے تو [illegible] اور [illegible] کا امتحان ہوگا۔ [illegible] چلا جائے گا۔ عصمت نے کس خود اعتمادی کے ساتھ [illegible] کو ہٹا کر پھینک دیا ہے اور جو زندگی میں کبھی [illegible] تھا اس کی لاش کو بھی زندہ کر دکھایا ہے؟

مضمون ختم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں عصمت کی زبان کے متعلق بھی لکھنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے معنوی مذاق میں بھی ہمارے لئے ایک ہدایت ہے۔ عصمت کی انشا پر فارسی اور عربی کا اثر بہ نسبت اور ادیبوں کے بہت کم غالب ہونے پایا ہے۔ اور یہ بے نیازی الفاظ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ترکیبوں، اور فقروں کی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی تحریر بڑی حد تک ان عامیانہ سی نقالی کے انگریزی تراکیب اور انگریزی اسالیب خیال سے بھی پاک ہے۔ اس زمانے کے اکثر انشا پردازوں کو بہ وجہ اپنی تعلیم یا ماحول کے بس سے مفر نہیں کہ ان کے کلام میں وقتاً فوقتاً انگریزی کے شرکھی سنائی دے جائیں۔ اردو میں مغربی تلمیحات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام مضمونوں میں بھی اور کچھ نہیں تو ترجمہ شدہ ترکیبوں کی گٹھلیاں تو کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ عصمت انگریزی کے غیر واضح دروں سے مبرا ہیں۔ یہ تو بتانا ناممکن ہے کہ وہ کیا لطف ہے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور جو محض اسی کی وجہ سے پیدا نہ ہوتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی بدولت ٹھیٹھ اردو کے بہت سے ایسے الفاظ کام میں لے آئی ہیں جو آج تک پردے سے باہر نہ نکلے تھے۔ اور جن کو اب انہوں نے نئے نئے مطالب کے اظہار کے قابل بنا دیا ہے۔ گویا ہمارے انشا کو ایک نئی آب و تاب نصیب ہوئی۔ اور پھر ہر فاضل نشین الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت اور روانی ہے اور جملوں کا زیروبم بعض وقت کا سا تھرتھراتا زیر و بم ہے۔ اس لئے ان کے فقروں کا سانس کبھی نہیں پھولتا۔ اور ان میں ثقیلانہ ثقالت اور تکلف نہیں آنے پاتے۔ مختصر یہ کہ الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی ساخت ان دونوں رستوں سے وہ انشا کی زبان کو زندگی کے قریب تر لے آئی ہیں۔ جس کے لئے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہئے۔ اس نیک کام میں عصمت کے علاوہ چند اور قابل قدر اہل زبان انشا پرداز بھی شریک ہیں۔ (اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کام اہل زبان کے سوا کسی دوسرے کے لئے کچھ ایسا آسان بھی نہیں) لیکن عصمت کے احسان کا بوجھ کچھ اس وجہ سے ہلکا نہیں ہو جاتا۔

عصمت کوئی قدآور ادیب نہیں۔ اردو ادب میں جو امتیاز ان کو حاصل ہے۔ اس سے منکر ہوتا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔ اور یہ مضمون بذات خود اس امتیاز کا اعتراف ہے۔ لیکن بھول نہ جانا چاہئے کہ ہمارا افسانہ ابھی سن رشد یا سن بلوغ کو نہیں پہنچا۔ آج کل جبکہ نظروں کو وسعت نصیب ہو رہی ہے۔ اور دنیا بھر کا ادب کتاب کی طرح ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ اردو ادب کے قدردانوں میں یہ حوصلہ پیدا ہونا چاہئے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ادب کا دنیا کے بہترین ادب سے مقابلہ کرتے رہیں۔ تاکہ تناسب کا احساس کند نہ ہونے پائے۔ مقامی تعصبات کی حقیقت واضح ہوتی رہے اور دل میں امنگ پیدا ہو۔ ہمارے ادب جدید کے پات نئے نئے چکنے چکنے ہیں۔ لیکن اس میں ابھی بڑے بڑے پھول نہیں لگے۔ ماتمی حدبندی کر لینے کے بعد ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اس کارنامے کے لئے اردو خوانوں ہی کو نہیں بلکہ اردو کے ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہئے۔

(ساقی دہلی فروری ۱۹۴۵)

ہیبت ناک افسانے

"ہیبت ناک افسانے" کا پیکٹ جب یہاں پہنچا میں گھر پر موجود نہ تھا۔ میری عدم موجودگی میں چند انگریز احباب نے جو کتابوں کے اسشیائے خوردنی کے معاملے میں ہر قسم کی بے تکلفی کو جائز سمجھتے ہیں۔ پیکٹ کھول لیا۔ یہ دوست اردو بالکل نہیں جانتے۔ بجز چند ایسے کلموں کے جو غصے یا رحم کی حالت میں وقتاً فوقتاً میری زبان سے نکل جاتے ہیں اور جو بار بار سننے کی وجہ سے انہیں یاد ہو گئے ہیں اور تقریر میں ان کی قابلیت یہیں تک محدود ہے۔ تحریر میں اخبار "انقلاب" کا نام پہچان لیتے ہیں۔ وہ بھی اگر خط طغریٰ میں لکھا گیا ہو۔ چنانچہ جب واپس پہنچا تو ہر ایک نے محض کتاب کی وضع قطع دیکھ کر اپنی اپنی رائے قائم کر رکھی تھی۔ سرورق پر جو کھوپڑی کی تصویر بنی ہوئی ہے اس سے ایک صاحب نے یہ اندازہ لگایا کہ کتاب

میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

سے متعلق ہے۔ ایشیا کے ادیب (عمر خیام۔ گوتم بدھ وغیرہ) اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب سمجھے کہ فن جراحی کے متعلق کوئی تصنیف ہے۔ ایک بوڑھے جادو کی کتاب معلوم ہوتی ہے (ہندوستان کے مداریوں کا بیان بڑا مشہور ہے) ایک خاتون نے کتاب کی سرخ رنگت دیکھ کر بالشویکی شبہات قائم کر لئے۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ گو یہ سب کی سب کہانیاں میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں۔ اور ان میں سے اکثر ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے خود امتیاز سے سن چکا ہوں۔ وہ مختلف قسم کی دلچسپیاں جو مجھے کبھی کسی تصنیف کو مسلسل پڑھنے پر مجبور کر سکتی ہیں سب کی سب یہاں یکجا تھیں۔ کتابت ایسی شگفتہ کہ نظر کو ذرا الجھن نہ ہو۔ تحریر میں وہ سلاست اور روانی کہ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ اور پھر امتیاز کے نام میں وہ جادو جس سے ہندوستان یا انگلستان میں کہیں بھی مفر نہ ہو۔

یہ کتاب تیرہ ہیبتناک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے مصنف کا مدعا یہ تھا کہ پڑھنے والوں کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور ہر افسانے میں درد و کرب خوف و دہشت یا پھر مرگ و ابتلاء کی ایسی خونیں تصویر کھینچی جائے کہ بدن پر ایک سنسنی سی طاری ہو جائے۔ ایڈگر ایلن پو کے پڑھنے والے ایسے افسانوں سے بخوبی آشنا ہوں گے۔ حق تو یہ ہے کہ پو اس فن کا استاد تھا اور یہ جو آجکل اس صنف ادب کی کثرت فرانس میں نظر آتی ہے عجب نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ پو ہی کی بدولت ہو۔ کیونکہ فرانس کی ادبیات پر پو کا اثر

مسلّم ہے اور ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو۔ جس میں کسی نہ کسی صورت میں اس نے اپنا رنگ نہ بکھیرا ہو۔ پیرس میں ایک خاص تھیٹر اسی بات کے لئے وقف ہے کہ اس میں دہشت انگیز کھیل دکھائے جائیں۔ اس کمپنی نے اس قسم کے ڈراموں کا اچھا خاصا مجموعہ جمع کر رکھا ہے۔ تھیٹر کی ڈیوڑھی میں چیدہ چیدہ ڈراموں کے مشہور مناظر کی تصاویر آویزاں ہیں۔ کہیں کوئی بدنصیب موت کی آخری انگڑائی لے رہا ہے۔ چہرہ تنا ہوا ہے اور آنکھیں باہر کو نکلی پڑتی ہیں۔ کہیں کوئی سفاک کسی حسینہ کی آنکھیں نکال رہا ہے۔ بائیں ہاتھ سے گردن دبوچے ہوئے ہے۔ دائیں ہاتھ میں خون آلود چھری ہے اور لڑکی کی آنکھوں سے لہو کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ کھیل کو ہیبت ناک بنانے کے لئے جو تدبیر بھی ذہن میں آسکتی ہیں ان سب پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایکٹر اپنی شکل، ہیبت اپنی آواز اور اپنی حرکات کے ذریعے ایک خوف سے کانپتی ہوئی فضا پیدا کر لیتے ہیں۔ پردہ اٹھنے سے پہلے ہی گھنٹی نہیں بجائی جاتی بلکہ چراغ گل کر کے لکڑی کے تختے پر دستک دی جاتی ہے۔ اس سے ہیبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس بات میں بحث کی گنجائش نہیں کہ درد و کرب یا خوف و دہشت کے مناظر یا افسانوں سے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فقرہ بظاہر خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو درد کہا جائے اس سے خوشی کیسے حاصل ہو گی۔ لیکن یہ ہمارے متداول الفاظ کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے۔ اصل خیال کو جو اس فقرہ سے ظاہر کیا گیا ہے الفاظ کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی وجہ سے بعض ماہرینِ نفسیات دکھ، درد، کرب وغیرہ اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے مجتنب رہتے ہیں کیونکہ وہ کب کے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بہت سی ایسی کیفیات جن کو ہم عام زبان میں دکھ، درد وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ بسا اوقات اس قدر تسکین بخش ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ اور ان میں اپنی مسرت ڈھونڈتے ہیں۔ یقیناً آپ کے پڑوس میں کئی ایسی عورتیں ہوں گی جو اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر سن پائیں اور بین اور واویلا میں شامل ہو کر آنسو بہا بہا کر اپنی تمنا پوری کریں۔ جرائم اور اموات کی گھناؤنی سے گھناؤنی تفصیلات کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے کئی اخبارات کی مقبولیت کا باعث ہے۔ لوگوں کو ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ یا میں بعض دہشت ناک افسانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے محض اس وجہ سے متامل نہ ہونا چاہیئے کہ کہیں لوگ اس کو ہماری طینت کے کسی نقص پر محمول نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قدیم زمانے میں رومن قوم کے ہجوم اپنے اکھاڑوں میں پہلوانوں کی لڑائیاں اسی جذبے کے تحت دیکھنے آتے تھے۔ ہر کشتی ایک نہ ایک حریف کی موت پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اور کشت و خون کا یہ نظارہ ہزارہا لوگوں کو خوشی کے مارے دیوانہ بنا دیا کرتا تھا۔ ہماری تہذیب اس تجاوز کی متحمل نہیں۔ لیکن افسانوں اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونا اب بھی ہمارے بس میں ہے۔ اور اگر ہم اس جذبے کو فن کی کیمیا سے کشید کر کے لمحہ بھر کو اپنے اعصاب میں ایک کیف انگیز تھرتھراہٹ پیدا کر لیتے ہیں تو کم از کم میں تو کسی طرح بھی نادم نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹٹول لیجئے۔

اعصاب میں ایک تھرتھراہٹ! بس یہی ان افسانوں کا مقصد ہے۔ اور جس کامیابی، جس خوبی اور جس فن کے ساتھ اس کتاب کے مصنف نے اس مقصد کی تکمیل چاہی ہے۔ اس کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ امتیاز جیسے ذی مطالعہ اہلِ قلم کو اس کے ترجمے کی خواہش ہوئی۔ ان لوگوں کے سامنے جو اردو ادب کے مشاہیر سے واقف ہیں اس سے زیادہ قابلِ وثوق ضمانت نہیں پیش کی جا سکتی۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی اردو مترجم نے کتاب کے دیباچے میں واضح کر دی ہے۔

> "موسیو لیول بے انتہا سلیس عبارت استعمال کرتے ہیں، جس کی پختگی اور روانی پڑھنے میں نظم کا سا لطف دیتی ہے۔ ایک فقرہ یا لفظ بھی ضرورت سے زیادہ یا کم نہیں ہوتا۔ مختلف چیزوں کے بیان میں تناسب کی حد بے حد تیز ہے۔ چنانچہ ان کی ہر مکمل کہانی ایک نفیس اور صاف ستھرے ترشے ترشائے ہیرے کی طرح دل کش معلوم ہوتی ہے۔"

یہ اختصار وحشت انگیز افسانوں کی ایک ضروری صفت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان میں وہ تندی وہ تیزی نہیں رہتی جس سے سنسنی پیدا کی جا سکے اور پھر یہ اختصار ہر رنگ میں شامل حال رہتا ہے ورنہ افسانے یا ڈرامے کی کامیابی میں نمایاں طور پر فرق پڑ جاتا ہے۔ اس کی وجہ میں کبھی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اس کی حقیقت کے متعلق میرے دل میں کوئی شبہ نہیں۔ پیرس کے جس تھیٹر کا میں نے ذکر کیا ہے وہاں اکثر کھیل صرف ایک ایکٹ کے ہوتے ہیں اور خود تھیٹر بھی بہت چھوٹا سا ہے۔ چند دن ہوئے میں نے لندن میں ایک ایسی قسم کا کھیل دیکھا جو موریس لیول کے ایک ناول سے مرتب کیا گیا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کھیل کے لئے بھی لندن کا ایک بہت چھوٹا سا تھیٹر منتخب کیا گیا۔ اس تھیٹر کا نام "لٹل تھیٹر" یا "چھوٹا تھیٹر" ہے۔

باقی رہا امتیاز کا ترجمہ۔ میں حیران ہوں کہ اس مختصر سے تبصرے میں اس موضوع کے متعلق کیا کہوں اور کیا کسی اور وقت پر اٹھا رکھوں۔ آج کل اردو میں تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحب فہم ان کے متعلق ایک بسیط تنقیدی مضمون سپرد قلم کر دیں تاکہ "چترا" اور "ٹائمیس" اور "مذہب اور سائنس" اور "عذرا" اور "لیلےٰ" ایسی تصانیف کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لئے ایک معیار مقرر ہو جائے۔ میں ایسی بحث سے گریز کرتا ہوں، خصوصاً اس وقت جبکہ میرے زیر نظر صرف "ہیبت ناک افسانے" ہے اور میرا قلم صرف اس کی خدمت میں مصروف ہے۔

یہ کہنا کہ امتیاز صاحب انگریزی جانتے ہیں اس وقت تک بے معنی فقرہ ہے جب تک کہ میں اس کی مزید تشریح نہ کر دوں۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ "گدھا" کس کو کہتے ہیں۔ کسی انگریز کے لئے اس لفظ کے معنی سیکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ جانور کی تصویر دکھا دیجئے اور نام بتا دیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس لفظ کے ساتھ "ارے گدھے" سے لے کر "خر عیسےٰ" تک جو شعر و ادب، فلسفہ و مذہب، رسم و عادات، محاورہ اور روزمرہ کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ اسکو منتقل کرنے کے لئے ایک عمر چاہیئے اور پھر اس کے لئے بصیرت، ذہانت، مذاق اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ امتیاز کو خدا نے یہ سب خوبیاں عطا کی ہیں اور یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اپنی ان قوتوں کو مطالعہ السنہ اور علم و ادب کی تحصیل کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ہاں وہ انگریزی جانتے ہیں۔ اسی لئے جب کبھی ان کا کوئی دلدادہ اپنی عقیدت کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ بی اے لکھ دیتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔

ان کی اردو پرکھنے کے لئے ہندوستان میں مجھ سے بدرجہا بہتر نقاد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں امتیاز کے نیاز مندوں میں سے ہوں مجھے سنبھل کر قلم اٹھانا چاہیئے۔ مبادا قارئین میرے جذبات کی تو تعریف کریں لیکن میری تنقید کو محض احمد نیاز مندی سمجھ کر پس پشت ڈال دیں۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ اس کتاب کے ایک دو صفحے آپ اور میں مل کر پڑھیں۔

"شام ہو رہی تھی۔ فقیر سڑک کے کنارے خندق کے پاس کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھدرا نظر آئے تو وہاں پڑ کر رات بسر کرے۔ اور کوٹ بچھو لیا جو کچھ تو ایک بوریا سا اس کے پاس تھا اسی میں گھس گیا لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھڑی سی

ادھر کر کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔ تکیے کی جگہ اسے سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ ہر کا تھا۔ پڑا پڑا وہ نیلے آسمان پہ تاروں کو ایک ایک کر کے ابھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگل بیابان پڑا تھا۔ پیڑوں پر چڑیاں نیند میں چپ چاپ تھیں۔ وہ بہت فاصلے پہ گاؤں ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور سناٹے میں لیٹے لیٹے غریب بڈھے کا دل بھر آیا۔

اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے ماں باپ کون تھے۔ والدین کو ثواب کمانے کے لئے کسی زمیندار نے لے لیا تھا۔ اسی کے ہاں پروان چڑھا تھا۔ بچہ ہی سا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگا۔ ادھر ادھر اس فکر میں پھرنے لگا کہ کہیں کچھ کام مل جائے جس سے روٹی کا سہارا ہو سکے۔ بڑی کٹھن زندگی گذر رہی تھی۔ ٹکڑوں کے سوا جینے کا کوئی ذریعہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جاڑوں کی لمبی لمبی راتیں چھپروں کی دیواروں تلے پڑ کر کاٹ دی تھیں۔ سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اٹھائی تھی۔ چاہتا تھا کہ مر جائے۔ ایسی نیند سوئے کہ پھر کبھی آنکھ نہ کھل سکے۔ جتنے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا بے درد تھے۔ شقی تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ہر ایک اس سے متنفر ہے۔ بچے دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے۔ کتے اس کو چیتھڑوں میں دیکھ کر بھونکنے لگتے۔

"پھر بھی کبھی کسی کا برا نہ چاہا تھا۔ سیدھی سادی اور نیک طبیعت پائی تھی۔ جیسے مصیبتوں نے مردہ بنا دیا تھا۔"

یہ وہ زبان ہے جو قلعے میں پیدا ہوئی اور جو برسوں تک "اہل زبان" کے لئے باعث فخر و ناز رہی۔ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو یہ زبان رتن ناتھ سرشار۔ داغ اور امیر۔ نذیر احمد اور محمد حسین آزاد سے ورثے میں ملی۔ اور اسی خزانے کے سکوں سے جنہیں خود اہل زبان محض سکوں کی طرح اپنے ہاتھوں ہی میں مل مل کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اب لاہور کا ادیب فرانس اور انگلستان کا سامان ادب خرید خرید کر ہندوستان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس قدیم دولت سے ادب جدید کے بازار میں اپنی ساکھ قائم رکھنا صرف امتیاز ہی کا کام تھا اب ایک اور صفحے کو پڑھیے۔ جو دہلی اور لکھنؤ دونوں سے بے نیاز ہے بلکہ جو اکثر پرانی وضع کے بزرگوں کو اپنی جدت سے برہم کر دے گا۔

"اس روز میں بہت دیر تک کام کرتا رہا تھا۔ اتنی دیر تک کہ تھک گیا۔ جب میں نے میز پر سے نظریں اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شفق شام سے میرا مطالعہ کا کمرہ لالہ زار بن رہا ہے۔ ذرا دیر تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ دماغ پر کسل کی وہ کیفیت طاری تھی جو کسی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بے تعلق نظروں سے ادھر ادھر تکتا رہا۔ مدھم روشنی میں ہر چیز دھندلی دھندلی اور بے وضع نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ روشنی تھی تو ان جگہوں پر جہاں غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں میز کے شیشے اور تصویر پر سے منعکس ہو کر روشنی کے دھبے ڈال رہی تھیں۔ کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپری رکھی تھی۔ اس پر شعاعیں ضرور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی کہ گال کی ہڈی سے لے کر جبڑے کے زبردست نادے تک ہر حصہ بخوبی واضح تھا۔ شام کا دھندلکا بڑی سرعت سے گہرا ہوتا جا رہا تھا اور ہر چیز کو جیسے نگلے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ غیر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چنگاری چمک اٹھی ہے۔ وہ گوشت پوست سے ڈھک گیا ہے۔ دانتوں پر ہونٹ سرک آئے ہیں۔ حلقوں میں آنکھیں جڑ گئی ہیں۔ بہت جلد کسی اڑ کے سحر سے مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ میرے سامنے تاریکی میں گویا ایک سر معلق ہے اور میری طرف تک رہا ہے۔

وہ سر بھی بری نظروں سے مجھے گھور رہا تھا اور اس کے چہرے پہ استہزا کا ایک تبسم تھا۔ یہ کوئی اہتمام کا گڑ یا تصور نہ تھا جو

انسان کا تخیل پیدا کر لیا کرتا ہے۔ یہ چہرہ ایسی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ تو میں بے قرار ہو گیا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لوں لیکن یکلخت خمار جیسے تحلیل ہو کر رہ گئے۔ حلقے خالی ہو گئے۔ ایک ہلکی سی گھرگھراہٹ نے اسے منقوش کر لیا ..... اور پھر مجھے عام کھوپڑیوں کی طرح ایک کھوپڑی نظر آنے لگی!

یہ ہر دو نمونے نادر میں پیدا ہوئے گھر میں۔ اس نمونہ لشکر میں ہر دو مشہور پہلو نہ تھے ہیں۔ بلکہ یہ صرف ملک کے بہترین دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ نئی تہذیب کی ہر بات کے لئے ایجاد کیا اور لطافت اور حسن مذاقی نے اسے دلفریب صورت بخشی۔ اس بات میں ہمارا ادب سجاد حیدر۔ ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر اقبال اور ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کا ممنون ہے۔ جنہوں نے بعض ایسے دروازے کھول دیئے کہ ترقی کے کئی راستے آنکھوں کے سامنے پھیلتے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ دو مختلف نمونے میں نے امتیاز کی قادر الکلامی کو ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بجا ہو گا کہ ایک ہی تصنیف میں اتنے متباین ڈھنگ یک رنگی کے منافی ہیں۔ اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ جب آپ کسی ایک ایسی کتاب کو جو ایک غیر ملکی تہذیب میں ڈوبی ہوئی ہو۔ محض اردو جاننے والے ہندوستانیوں کی ضیافت طبع کے لئے کسی دیسی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ تو یقین مانئے انشا پردازی کا کوئی ایسا فن نہ ہوگا جس سے آپ بے نیازی برت سکیں۔ اس کے لئے قلم نہیں بلکہ دسوں انگلیاں دس چراغ ہونی چاہئیں۔

پطرس از کیمبرج

(مخزن مئی ۱۹۲۵ء)

وارفتگیِ جذبات

بھائی...... تمہیں کیا کہوں طبیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا درد رہتا ہے جس کو تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں۔ میں فطرتاً ہوس ناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ اس لیے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زمانے کی طرح مجھی برہم کر دیتا ہے۔ یہ شاعری نہ سمجھنا، یہ حقیقت ہے۔ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی محنت اور تھکان کے بعد خواب راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری، اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی درد ناک گیت کی فراق زدہ لے، رباب کی سادہ موسیقی، رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تار، دل میں ایک میٹھے سے درد کا نشتر چبھو دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں۔ مضطرب روح سوز کو ہتا(؟) کرتا ہوں کہ وحشت عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک جیالا، غیور اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر رکھ دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تفنن سے مترنم فقروں میں اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے۔ جس کی آغوش کوہ کی پروردہ حسینہ کے خوب صورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک محبت آ گئی ہے یا ایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے۔ اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدل کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے۔ رعب حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصہ میں آ کر اس نے اپنی گھاس کی گٹھڑی اور درانتی کو سر پر رکھ لیا ہے۔ اور ندی کے بیچ میں سے گذر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک کشمکش سنائی دیتی ہے۔ غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پر کھڑا اور گرد کی چوٹیوں کو، پتھریلے ٹیلوں کو، بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے اور آگ ہے۔ اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور سنگلے کوہستان میں اس کے گیت کی مجبور ترین صدائیں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں، ایک جنگ جو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو۔ عشق اس میدان وغا میں آوارہ، سرگرداں پھر رہا ہے۔ اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان، مردانگی اور بہادری کے حوالے کر دے۔ غیور بنجر اور ویرانے پہاڑ محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں۔ اور موت کی طرح خاموش اور وحشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو اتنی ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب درد افتادگی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ لکیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تکان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے گویا میں صحرائی دشت اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں۔ اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے جھانک رہا ہے اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے یا تاریک سمندر ہے جس میں بات سنانے والے پر اسرار اقصا کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت سے ایک لے صد بے قراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا۔ خوف نہیں لیکن دفعتاً ایک اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابل بیان بے قراری ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بستر پر سکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل محض میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں سب سے الگ کیوں ہوں۔ بس یہی بے بسی کا احساس جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ اور تنہائی ایک قبرستان، بیداری ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔

دفعتاً رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے۔ اور گیت دھیرے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قسمت کے دل میں رحم آجائے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ نیند آہی جاتی ہے۔ مگر آہ! اس بیماری کے بعد!

(مخزن۔ جولائی ۱۹۲۱ء)

تنزل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا، جس تیز روی سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمح نظر اور میرا ادراکی افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے ماوراء تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گذرنے نہیں پائے گا جب میرے حسیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں۔ میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام و سکون میرے لئے ناممکنات سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ چارہ گر کو مجھ پر رحم آ سکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک — صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

آئینۂ دل

بچپن کے دنوں کی بات کیا ساحلِ دریا پر تھی چھوٹی سی بستی سی ریت جہاں ننھے ننھے پاؤں سیپوں کی تلاش میں ریت کی بدلیاں اور نفیس سلوٹوں کو ایک معصوم بے پروائی سے مسل دیتے ہیں جہاں کا طوفان قہقہوں، دریائی کے چھینٹوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

گویا ایک خوش نما ساز ہے بربط جس کو اب تک کسی انسانی ہاتھ نے نہیں چھوا اور جو ایک درخت کے سایے کے نیچے تنہا پڑا ہے جس کا زیر و بم لاابالیانہ تاروں اور پردوں میں کہیں بکھرا پڑا ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کو کبھی کبھی گدگدا دیتے ہیں اور اس میں سے ایک خندۂ آزاد، ایک بے ترتیب سا نغمہ یوں بے اختیار ہو کر فضا میں سے نکل جاتا ہے جیسے کسی بادرفتار پری کے پازیب کی جھنکار۔

الھڑ جوانی کا عالم مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک دریا جس کی گہرائیوں سے قطع نظر سطح سکون بے خبر سا معلوم ہوتا ہے جس کے اعماق کی تاریکیوں میں بھنور اٹھتی ہیں۔ اور سطح پر ابھر کر حباب سے ڈوب جاتی ہیں۔ جہاں ایک طلاطم پنہاں ہے، ایک محشر زدائی۔

جیسے بربط ایک ہنرمند مغنی کے ہاتھوں میں ہے۔ ہر ایک تار ایک شدید انتظار سے آمادہ معلوم ہوتا ہے۔ نغمے اپنی ہنسی روکے ہوئے منتظر کھڑے ہیں اور مضراب کو نافہم نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت کی حالت سنو جب عشق کا بے پناہ طوفان موجوں سے دریا اور تموّج دریا کو ایک کر دیتا ہے۔ جب خوفناکی کی سرکشی اور ہر تیراک کو پستی سے بلندی اور بلندی سے پھر پستی تک یوں دھکیل کر لے جاتی ہے جیسے قہر خداوندی، جہاں ہر ایک بھنور طاقت ور سے طاقت ور انسان کو اپنی طرف یوں کھینچ لیتا ہے جیسے قسمت کی مجبوری۔

ہر بربط ہستی کے تار تار میں تھرتھراہٹ کا ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ دل خراش نغمے بگولوں کی طرح چکر کھاتے ہوئے اٹھتے ہیں اور ہستی سر چکرا دینے والی تیزی میں زیر و بم آتشوں کی طرح پیچھے سے جاتے ہیں۔ ہوش و حواس ان کے ہجوم میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک دل چیرنے والے درد ایک تیکھے شور کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

آہ! اگر جب دریا اپنے کناروں کی حدود کو توڑ کر اپنے جوش مستی میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کی لہریں ایک بے معنی تلاش میں کوسوں تک نکل پڑتی ہیں۔ تو اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے بے رحم زمین قطرہ قطرہ کرکے اس کو چوس لیتی ہے۔ اس کا طوفان الٹا ہو جاتا ہے پھر اس کی روانی تنگ رہ جاتی ہے اور آخرکار اس کا پانی سوکھ جاتا ہے پھر وہاں موجود ریگ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بحر جب بحر نہیں رہتا تو بیاباں ہو جاتا ہے اور ایک ویران سنسان، ایک بھیانک وحشت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

محبت کی دردناکی سے جب تاروں میں ایک بے قراری ایک وجد کی کیفیت پیدا کرتی ہے جب سرائی جان سے جھنکار ہو کر بے ساختہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سرشار ہوتے ہیں۔ جب ہر بربط کی جان نازک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں بشکل نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے پھر وہ بربط بربط نہیں رہتا بلکہ فنا کا ایک خاموش زمزمہ ماتم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے عشق کی نامرادی"

(مخزن۔ نومبر و دسمبر ۱۹۲۱ء)

آسمان

مجھے یاد ہے کہ بچپن کے زمانے میں میں آئینہ کو ہاتھوں میں لے کر اس میں آسمان کا عکس دیکھا کرتا تھا۔ وسعتِ فلک کا اندازہ میں صرف آسمان کو یوں اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ آسمان کی بلندی سے ناآشنا فطرتِ انسانی کو اس کی عظمت کا احساس صرف اسی طرح ہو سکتا تھا کہ میں اس بلندی کو گہرائی بنا کر دیکھتا۔ پھر جب میں آئینے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنی نظر کو اعماقِ فلک میں پھیلے ہوئے چینے کی کوشش کرتا تو ہر ایک قدم ایک عجیب انجماد کے کنارے پر ہوتا اور ہر ایک لغزش گویا مجھے غرقابی کی گود تک لے جاتی اور پھر سلامتی تک یوں واپس پہنچاتی کہ میرا دل دھڑک رہا ہوتا اور میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ عقل نے تاہم ہاتھوں سے اس فریب و طلسم کو توڑ دیا۔ اب میں آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھ بھی سکتا ہوں۔ اب اس کی حقیقت کے متعلق ہر قسم کی سرگوشی بھی کر سکتا ہوں۔ اب میں اس کو کئی دفعہ اپنے آپ سے لاتعلق بھی سمجھتا ہوں گویا اس کی ہستی ہی نہیں۔

مگر ایک رات ایسی بھی آتی ہے جب ایک بے نام بے چینی مجھے نیند سے نا آشنا کر دیتی ہے۔ دل ایک خاموش اور بے نوا اضطراب بیداری بن کر آنکھوں میں بھر آتا ہے۔ کسی تنہا، آہستہ خرام رہگیر کی سریلی تان رات کی گہری تاریکی میں سے چھن چھن کر مجھ تک ایک رقیق سی بے قراری اور ایک خفیف سی لرزش ہو کر پہنچتی ہے۔ درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ قدرت کے عالی شکوہ گنبد میں کسی سانپ کے پھن کا کیسا پُراسرار گونج معلوم ہوتی ہے گویا فطرت کی آہِ سرد ہے یا الہام کی سرگوشی جو ایک عظیم الشان کائنات کے خاموش اندھیرے اور تاریک سمندروں کے راز سے مجھے غرقِ تحیر کر رہی ہے۔ ستاروں میں ایک ابدی درخشنی جھلکتی نظر آتی ہے۔ کالے آسمان کی عجیب سیاہی ایک لازوال اور ہمہ گیر غم کی طرح دنیا و مافیہا پر چھائی ہوتی ہے اور ستارے اس غیر محدود بلندی پر آگ کے قطروں کی طرح معلق و لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت میں اس دور دراز بلند اور پر ہیبت عظمت کے نیچے ایک ذرۂ حقیر اور ایک روحِ بے مایہ کی طرح گم ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک ستارہ رات کا ایک خاموش اور بے بہا آنسو ہے، جو صبح کے وقت زمین کے کسی پھول کی پتیوں پر سورج کی کرنوں میں مسکرا رہا ہوگا۔ آسمان ایک بھیانک غم کی طرح ہر ایک طرف طاری دکھائی دیتا ہے اور میں اپنے آپ کو اس میں گھرا ہوا پاتا ہوں۔ جب کوئی ٹوٹتا ہوا تارا ایک دم تیز سرعت کے ساتھ آسمان کی وسعت و پنہائی پر ایک افق سے لے کر دوسرے افق تک ایک طویل خطِ آتشیں کھینچتا ہوا تاریکی میں کہیں فنا ہو جاتا ہے تو میں آسمانی زلزلے سے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

اس وقت میں قدرت سے رحم کا طلبگار ہوتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی تمام زندگی میں سے آنسوؤں کے سوا اور کوئی چیز آسمان کے حضور میں پیش نہیں کر سکتا۔ میرے ہونٹوں پر ایک مہرِ سکوت ہوتی ہے اور میری روح ایک حیرت بن کر رہ جاتی ہے۔ اس وقت میں آسمان کی سیاہ وسعت اور رفعت کو دیکھ کر بھول جاتا ہوں کہ ازل اور ابد میں کیا فرق ہے؟

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

ایک رات

رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آدھ گھنٹہ ہوا میں مطالعہ سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اردگرد تمام کوٹھی میں مکمل خاموشی اور سکون ہے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے باہر کا تاریک منظر دکھائی دے رہا ہے جس پر اس قدر سکوت طاری ہے کہ کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر دفعتاً ایک عجیب سی خنکی پیدا کر دیتا ہے۔ تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کہیں دور ایک کتا بھونک رہا ہے جس کی آواز عمیق خاموشی میں ایک دھیمی سی ہیبت ہو کر رہ گئی ہے جب یہ آواز ایک لمحے کے لیے میرے کان تک نہ پہنچے تو اس چپ چاپ میں وحشت کی سی سرسراہٹ سنائی دینے لگتی ہے اور میرا دل ایک لمحے کے لیے زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سکوت کی بے زبان اور ڈراؤنی آوازوں سے اپنے دل کو ہٹاتا ہوں تو لیمپ کی خاموش روشنی اور گھڑی کی ٹک ٹک اور بھی گھبرا دیتی ہے۔ میز پر رکھی ہوئی تصویروں کا سکون اور ان کی بے حس و حرکت روحوں کو دیکھ کر کسی قبرستان کا بھیانک منظر تصور میں آ کر ڈراتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمرے کی تمام چیزیں اس وقت سو رہی ہیں اور میں اس وقت سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن میں اس آواز سے خوف کھاتا ہوں جو دیا سلائی جلاتے وقت اس سنسان کے مخفی نفوس کو اپنی درشتی سے پریشان کر دے گی سب سے مجھے اس بل کھاتی ہوئی دھوئیں کی باریک دھار سے ڈر لگتا ہے جو جلتے ہوئے سگریٹ سے ایک نازک اور پراسرار ناگن کی طرح نکل کر میرے سامنے کمرے کی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔ میں دروازے میں سے چمن کی کالی کالی جھاڑیوں کو کچھ دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ باہر کی تاریکی ایک مہیب خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے اور میرے لیمپ کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ سے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے بھیڑ کے بند کر دوں۔ لیکن میں ڈراؤنی کالی رات سے ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہیں میرے حواس اس کی ہوشربائی کے بے حد طلسم سے مسحور ہو کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں اور میں اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر غائب نہ ہو جاؤں۔ مجھے صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گھنے سیاہ لہروں والے بال دکھائی دے رہے ہیں اس حسین کے جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی میری آنکھوں میں چھا رہی ہے حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہے اور خیال میں ایک کانپتی ہوئی امید کی طرح ڈر ڈر کر جھلک رہا ہے۔ ہوا کے کمزور سے جھونکے میرے بدن میں خون کی سی ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میرے ماتھے کے لمبے بال گر کر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں تو مجھ پر ایک تھرتھرانے والا ڈر طاری ہو جاتا ہے۔ آنکھیں ان کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں۔ اور ہاتھ ان کو ہٹاتے ہوئے کانپتا ہے۔ فرش پر میرا سیاہ کمبل اس سکون سے پڑا ہے گویا رات نے اس پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیر کر ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہلکے سے اپنی خاموشی کا وحشیانہ طلسم پھونک دیا ہے۔ میں اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے سہم جاتا ہوں گویا پُراسرار چپ چپ دنیا کا کوئی بھیانک سا منظر پلٹ کے اپنی وحشت دکھلائے گا۔ اور میں ہیبت ناک چیخ مارنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے منہ سے نہ نکلے گی۔ میرا گلا ان تصورات سے خشک ہو رہا ہے۔

میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوں۔ لیکن وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کسی چیز کو دیکھوں اور رات کی خاموشی اور گہرے سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن میں اپنے آپ کو کسی جادو میں جکڑے ہوئے پاتا ہوں۔ جو میری آنکھوں کو سامنے کھولے ہوئے ہے۔ جو میرے سینے کو دبا رہا ہے اور جو مجھے سانس نہیں لینے دیتا۔ گھڑی کی سوئیاں جو ہیں میں نے کوئی حرکت نہیں دیکھی اب کسی اور جگہ میں رات کے ساتھ ساتھ وہ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے چلتی رہی ہیں۔ کیا کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ تنگ ہو کر مجھے بھینچنے کیلئے میری طرف آ رہی ہے۔ اور کیا خاموشی اور تاریکی کے جادو نے مجھے اس تنہا بچھونے تک مدت کے لئے یہاں باندھ رکھا ہے۔

باہر سڑک پر ایک تانگا گزر رہا ہے۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے۔ یہ پہیوں کی۔ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید تھیٹر سے واپس آئے ہوں گے۔ آج تھیٹر میں خدا جانے کونسا کھیل تھا۔ سگریٹ میں نے کہاں رکھے ہیں؟ دیا سلائی کی ڈبیا تو اس جیب میں ہے۔

میں اب سگرٹ پی رہا ہوں۔ اور رات اب میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سوائے اس کے کہ میں اب سو جاؤں اور صبح پھر اٹھوں۔

(نیرنگ خیال)

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۹ پاکستانی اور ۳۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکی) اکابر و مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصے کے پہلے مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب الفبائی ہے ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغزشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مجموعے کا خیال ایڈورڈ آر مرو (EDWARD. R. MURROW) کی ایک تالیف دِس آئی بلیور THIS I BELIEVE سے پیدا ہوا۔ مرو صاحب امریکی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاہیر میں سے ہیں کولمبیا براڈکاسٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ حالات حاضرہ صحافت رہی اور بین الاقوامی معاملات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے۔ تعلیمی مسائل سے بھی ان کو بہت دلچسپی ہے لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دیئے گئے پروگرام غور سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

مرو صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگ عظیم میں اہل انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی اور باوجود بے سروسامانی کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور یہی نہیں کہ تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں کی پابندی میں بھی کہیں خم نہیں کھایا۔ چنانچہ حب وطن عدل و انصاف جمہوریت وغیرہ کا خیال جب بھی ان کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے سچ مچ اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی۔ اور شدید خطرے کے زمانے میں بھی جب کہ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی بات میں بہت مین میخ نہ نکالی جائے اپنی روایات کو پس پشت نہ ڈالا۔ اس سے مرو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور وہی کسی بحران کے زمانے میں بروئے کار آتے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکیوں کے عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں پہلے ایک اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا ـــ دونوں کتابیں غور سے پڑھی گئیں۔ چند مضامین ان میں کے اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ اور امید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرینکلن نے ایسا ہی سوال میری وساطت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن مہربانوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

پاکستانی اور امریکی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے۔ دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے ایک امیر ملک، ایک غریب ملک ـــ ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آزادی سے بالکل ہی نیا ـــ ایک بیشتر مسیحیوں کا ملک، دوسرا مسلمانوں

کا ۔۔ ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ دوسرے کا ماضی یورپ کی مخالفت سے لبریز ۔۔ ایک یورپی ڈھانچے کا ملک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں ترقی پسند ہیں، دونوں قدامت سے دست بردار، دونوں اجتماعیت کے قائل، عہد جدید کے قائل، عزم و خدمت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشرتی خدمت بہترین عبادات میں سے ہے۔ البتہ امریکہ میں ان خیالات کو بہت کچھ سہولتیں اور گنجائشیں عمل کی نصیب ہو چکی ہیں۔ اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ جزو مستقبل میں ہے۔ لیکن فخر و مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ برسرِ کار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصہ لینا لازم ہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو بہت عرصے تک سربرآوردہ نمایاں قوم مہیا کرتا رہے گا۔ ان کے خیالات اولوالعزمانہ ہیں۔ وہ بلندی کے خواہاں ہیں قوت کا احساس رکھتے ہیں۔ معاشرتی خدمت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ ایمان کو پاکیزہ زندگی کا جزو عظیم سمجھتے ہیں۔ وہ منزل سے دور سہی لیکن ترقی کی سمت انہیں باوجود اپنی پس ماندگی کے ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی ہے جیسے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو۔۔۔

جب میں اس مجموعے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اگر میری قوم بالاتفاق عمومی طور پر ان خیالات کی علم بردار ہے جو فرداً فرداً مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کئے ہیں۔ تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم گھبرا جائیں آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھئے۔ تو دلچسپی کا باعث ہوگی۔

(بشکریہ مکتبہ فرینکلن)

چمپا اور دوسرے افسانے

دیباچہ

(مولانا عبدالمجید خاں) سالک (رہنما) کے ہاتھ تو بہت کوششیں ہی بند ہیں اور صحیفہ تو اس کی سحر نگاری سے محروم۔ لیکن چہرہ شرافت کے جو نقش اس کی قلم طرازی کے ممنون احسان ہیں وہ ہمیشہ چشم تماشائی کی پتلی بنے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہ جب تک زمانہ کی چادر ابدی سالک کو اہل نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدائی اس کے نقش دل کی ضیا پاشی سے محروم نہ رہیں۔ مگر وہ "گمنام" گمنامی کا شیدا۔ وہ عزلت نشین محشر۔ وہ انجمن خلوت، اس وقت حاست زندہ ہوتا تو یقین نہیں کہ وہ اپنی "گمنامی" کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہ انتخاب بڑی بیباک اور نکتہ چیں ثابت ہوتی ـــ ایک وقت اور صرف ایک وقت ـــ جب وہ اپنی بیش بہا تصنیفات کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادب لطیف کے خیاباں سے منہ موڑ کر صحافت کی سنگلاخ زمین اور سیاسیات کے خارزار میں گامزن ہوا۔ جذبۂ وفا کو ہمیشہ سینے میں لئے پھرا۔ گلزار گل گشت میں بھی رنگ دار تھا بادیۂ دشت میں آج بھی اس کی آبلہ پائی ہے اس سے اہل مذاق برسوں لطف اندوز ہوتے رہے اور اس سے اہل درد کئی اشک ریز و غمزدہ ہیں۔

افسانہ نگاری میں وفا کو وہ ہمیشہ "عشق کی دلہن" سمجھتا رہا۔ اور عورت کے دل کو "خواہ وہ "فلورا پارکنسن" ہی کیوں نہ ہو" اس کا محلِ خودی۔ اس کی "چمپا" نے اپنے سوامی کے قدموں میں جان دی۔ اس کی "عذرا" کی وفا صدا رشک کو پامال کر گئی۔ "بیمولا" کی آہ و زاری نے دیوتاؤں کے دل ہلا دیئے۔ اور "موہنی" کے عشق کا شعلہ اب تک رات کی ہیبت اور تاریکی میں پہاڑ کی برفانی چوٹیوں پر روشن نظر آتا ہے۔

ہمارے شعر و سخن کے آئینے میں عشق کا اپنا چہرہ اکثر دیوانوں کا سا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ عشق جنوں کو اپنا ایک دوسرا نام سمجھتا ہے "سدا بہار ٹاپو کا ہندی" میں عکس اور معکوس۔ اسم اور مسمی دونوں سامنے کھڑے ہیں۔ اور جو نظر فریب نظارہ ہمارے پیش نظر ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ماتھے پر تیوری چڑھائے ایک نقادانہ اور مربیانہ انداز میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کریں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے حواس کو محویت میں گم کر دیں اور کتاب کو اپنے بے جان ہاتھ سے گر پڑنے دیں۔

سالک کی تحریر سازِ دل میں مزید کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے۔ جو نغمے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھر تھراتا رہتا ہے۔ اور بارہا میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسے تار بھی ہیں جن کو مضراب نے نہیں چھوا۔ پھر بھی ہم آہنگ ہیں اور کانپ رہے ہیں۔ "بیمولا" ایک چھوٹا سا افسانہ ہے لیکن "بیمولا" کو جیسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ سالک نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ لیکن مجھے اس وفا شعار ہندو دوشیزہ اس عصمت و عفت کی دیوی کے ہاتھ

پھڑک اٹھتا نظر آتا ہے: ”مشاورت کی کشتی“ دیکھئے یہ دیکھئے نیلے افق میں غائب ہو گئی ہے لیکن اس کے پیچھے پرستش کی دل دوز وحشت اب تک نہیں دبی ہے۔

سالک کو انتہائے جذبات کا بہت شوق ہے۔ تہذیب و تمدن کے دائرے کے اندر، لاہور اور بمبئی کے خوشنما محلوں میں اس نے جذبات کو پامال دیکھا تو انہیں ”سدا بہار تارا“ میں دلدلوں اور سرکشی کے جنگلوں کے بیچ میں لے کر ان کی عریانی، مستی اور پاکیزگی کو آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مرد مرد اور عورت عورت، محبت موت ہوتی ہے جہاں کے طوفان سخت بلاخیز ہیں اور درندے سخت خونخوار۔

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے ناآشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار چھپے ہوئے درد اور چبھتی ہوئی کسکیں اٹھتی ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والا جوانمرد اس شورش کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے۔ ”جان جیدی“ جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی اور اس کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوتی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بارہا ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشا پردازوں کے لمبے لمبے فقرے ناکام رہتے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو صحت کو معنی سے زیادہ دلآویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے نئے سالک کی ”چترا“ کا ذکر کرنا پڑے گا اور وہ سن ادب سحر طراز انشا، شاعر شیریں مقال، اس آئینہ دار فکر کے ذوق سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ بیان تحریری سالک کی کافرما جسرائی کے ہمراہ ہے۔ اس سے میں محسوس کرتا ہوں کہ حیات ابدی کا دامن میرے ہاتھوں میں ہے مجھے اس کی کبھی جرات نہ ہوتی اگر مجھے یہ فخر حاصل نہ ہوتا کہ میرے نیاز مندانہ تبسم حوصلہ افزائی اکثر سالک کے لبوں پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکرا رہا ہے۔ نیاز مند انہیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

”پطرس“ ۱۹۲۲ء

نغمہ زار

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصے سے لاہور کے شاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مسحور کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں، تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں، اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا جامہ پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رُت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید، اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مست کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے، جب اس کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے، جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اسے سُروں میں لاتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا "سن، من، تن" کے قافیے، سب خامیاں نظر آئیں گی، اہلِ ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک والہانہ عاشق مزاج عشق کے آگاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر ہے جس کے قدم پامال راستے سے اِدھر اُدھر جا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں، ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ لکھتے میں جو، کیف میں سرشار، جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور دیر تک بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جو گاتا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر تھرکتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترکِ شیرازی پرست ہیں۔ ایک ایسی شراب سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکہ نہ دے سکے؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے لیکن ابھی وہ ترکِ شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

"پطرس" — سنہ ۱۹۲۵ء

جھولنے

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی کتاب کا دیباچہ

ایسی ہی پہلی کتاب پر جو چھوٹے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے دیباچہ کا بوجھ پڑنا نہ چاہیے تھا لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی اور انسان نے استاد کی پخ بھی لگا رکھی ہے۔ صوفی تبسم کو جو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ والد بھی ہیں اور استاد بھی، یہ گوارا نہ ہوا کہ بچوں کو تو بہلایا جائے اور والدین اور استادوں کی پروا نہ کی جائے۔ اس لیے قرار پایا کہ وہ بچوں کو نظمیں سنائیں اور میں والدین وغیرہ کو باتوں میں لگائے رکھوں۔

بچوں کا بہلانا سہل ہے۔ بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ "چیچوں چیچوں چاچا، گھڑی پہ چوہا ناچا" اور خوش ہو گئے۔ بڑے کہیں گے، چیچوں ہم نے تو کسی لغت میں دیکھا نہیں۔ اور اگر چاچا سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں۔ اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہرحال اس تک بندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟

یہ سب سوال نہایت ہی ذمہ دارانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے سوال ہیں جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں۔ یا جو یہ تہیہ کیے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں گی۔ تک بندی طفلانہ فاسد بات ہے، بر جعوں مارنا چاہیے۔

خدا کا شکر ہے، صوفی تبسم کو ایک ایسی دانائی عطا ہوئی ہے کہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے۔ وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب و غریب دنیا ہے جس میں پیڑوں پر ناگ ناچتے ہیں اور بلیاں پیر کھاتی ہیں اور ٹرٹر موڑ، چھم چھم، ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔

اس لیے قابل رشک ہیں صوفی تبسم کہ بلاتکلف اس رنگین دنیا میں چہچہا رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک خوش فکر سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں اور جذبہ اور ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی شاعری میں آوارہ کا دن ہے اور یوں آوارہ رہنے میں انھوں نے بڑے بڑے اساتذہ کا تتبع کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھیے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھے ہیں اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی نزاکتوں پر قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لیے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی کے شواہد اہل بصیرت کو جا بجا نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ سہل ممتنع کا درجہ ہے۔ جیسے سہل ممتنع سہل نہیں ہوتا اسی طرح سہل ممتنع بھی سہل نہیں ہوتا۔ دعا ہے کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدردان ہمیشہ انھیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ "چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاج تو از حال طفلی نگشت"۔ پطرس

دہلی ۵ جولائی ۱۹۳۹ء

ایران میں اجنبی

ن۔م۔ راشد کی نظموں کے دوسرے مجموعہ کی تمہید

راشد صاحب! یہ مجموعہ جب چھپ جائے گا تو آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے۔ بلکہ اس پر میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے۔ اور میں فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا۔ اور اسے بلا وجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا۔ کہ میرا ایک شاگرد ہمارے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہوا اور میری اس کمزوری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پر اپنا حق جتا رہا ہوں ہنسیں گے بھی اور اسے ضعف الدماغی سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے لیکن یہ تو آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دے دئے آپ کو معلوم ہے کہ میں انہیں کس شوق سے ساتھ لیے اپنی غلام گردشوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ ؎

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ایران کو بیچ میں لا کر دزدیدہ تفات میں آپ سے کیسی مزے مزے کی بحثیں ان کے لیے ٹھیرائی ہوئی ہیں۔ اور ہم آپ نے آپ کی شاعری کو سمجھانے سمجھنے کے سلسلے سے اوروں سے کتنی عشق بازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک مکتوب بھی اس عاشقی میں لکھ ڈالوں اور آپ سے یہ وجہت ہے اس کا عیب پوشی رنگین پردہ اپنی بے سود نقادی پر ڈال لوں۔ تاکہ کوئی بات میرے پاس سمجھنے کے قابل نہ ہو تو لوگ سننے کے قابل ضرور کہیں۔ ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

راشد صاحب! وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم "اتفاقات" شائع ہوئی تھی اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی جدید شعراء پر طعن طعن برابر ہو رہی تھی۔ اور ان کی قافیہ آزادی اور عروض کی بے راہ روی پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتاتے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ غزل بھی جب تک نئے شباب، نئی نظر اور نئے اسلوب کی حامل نہ ہو بزم میں توقیر نہیں پاتی۔

اس انقلاب میں کئی قوتوں کا ہاتھ ہے جسے مورخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعراء نے آپ اور فیض اور آپ ہی جیسے معدودے چند باغیوں سے ہدایت پائی ہے ورنہ نہ معلوم ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیسا کہ آپ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل تھا جس سے متقدمین بے بہرہ تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت آپ کو ایک نئی بینش نصیب ہوئی۔ اور آپ لوگوں نے وہ افق دیکھے۔

جہاں سے قبل نظموں سے واضح ہو چکے تھے کہ آپ کی شاعری ایک نیا انداز فکر اور نئی زبان بلکہ نیا لہجہ (بقول آپ کے نئی ہیئت) اپنے ساتھ لاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی تخیل کے تو غیر شاعروں کی بہت بڑی جماعت کے اسلوب بیان میں آ گئی ایسا نشہ ہے کہ ان کے بعض معتقدین کچھ دیا؟ ہی پی گئے۔ یہ جاذبیت بلکہ جادو فیض میں بھی ہے۔ لیکن فیض کی کسی ادبی شعر سے نظم میں ظاہر کر جاتی ہیں ہر چیز اور ہر پہلو میں نظر نہیں آتی۔ اس کے مقابلے میں آپ کا پہلا نوجوان شاعر کو بہت جلد پتا چلتا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ شمع پہلے کس کے سامنے رکھی جائے۔ اس قسم کا سابقہ ہی مقصود تھا اس سے تو محض یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے بڑے شعراء جو اثر پذیر ہوئے تو ان کے اور آپ کے تصرف نظر کے اپنے اپنے علاقے تھے۔

ایران میں اجنبی کا عنوان ایک دلچسپ فریب ہے۔ میں نے آپ خود بھی شکار ہوئے۔ اس عنوان کے تحت میں جو تیرہ نظمیں آپ نے یکجا کر دی ہیں۔ ان میں احساس جذبے کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ جسے عزیز لکھنوی نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے ۔

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

(داخل ایران ہونا؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق واضح ہے تاہم جس ذہنی اور جمالیاتی دنیا میں آپ کی شاعری بالا ہوئی ہے وہ ایران سے دور نہیں بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور تر ہوگی۔ سعدی اور حافظ اور خیام اور رومی اور نظیری کی دنیا میں آپ اجنبی کیوں کر ہوتے؟ ایران تو ہمارے شعراء کا روحانی وطن ہے۔ ہندوستان میں جو پردیسیوں کی سی اداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ نئے ایران اور عربستان کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے۔ آپ کے تعصبات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں بلکہ یک نئی یگانگت کا احساس ہوا من و سلوے؟ میں تو آپ ایران سے در پردہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں، اجنبی ہوں نہیں ۔

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور یہ زبان بھی آپ کے روحانی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں ـــــ

خدائے برتر
یہ داریوش بزرگ کی سرزمیں
یہ نوشیروان عادل کی داد گاہیں
تصوف و حکمت و ادب کے نگار خانے

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ میں ایک بچھڑا ہوا اور بھائی ہوں سے ملنے آیا ہوں۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریزی وردی پہن کر ایران پہنچے تو ماحول نے پھر اس طرح آپ کا دامن کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک دی کہ آپ ہندوستان اور انگریزوں کو بھول گئے اور آپ کے سیاہ فام "مسیح ہی ایشیائی" روح بیدار ہوئی۔ وہ احساس مظلومیت جس سے کم ہی کوئی ہندی نا آشنا تھا۔ اس میں ایک نئی کسک پیدا ہوئی اور فرنگ کے بے پناہ بپھرے ہوئے ستم نے ایک نئے انداز سے آپ کو پچھاڑا۔
ایشیائی کہ آپ نے دیکھا کہ ـــــ

قدیم و حوش ـــ راؤں کی اک نژاد کامل ہیں
اور یہی جن کی راہوں پر تیز گامی سے جا رہے ہیں

تو آپ سے بہتر رہ گزر نکلا ہے ـ ـ ـ

ان دمکتے درخشندہ شہروں کی
ریت فصیلوں کو مضبوط کر لو!
ہر اک برج و بارہ پر اپنے نگہبان چڑھا دو۔
گھروں میں ہوا کے سوا
سب مناروں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے پیچھے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن

ایسے چونکا دینے والے اشعار آپ کے مجموعے میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے اہل وطن شاعر بھی ہیں اور قومی شاعر بھی، اخلاقی بھی، اور اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے اشاریاتی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں راشد صاحب نے سیاسیات کا رخ کیا؟ کیا آپ کی اس نوع کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ تو اہل کتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار "سیاسی شاعروں" میں کرنا کور ذوقی معلوم ہوتا ہے کسی نازک مزاج کی اس سے تشفی ہرگز نہ ہوگی کیوں کہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاست کے زبان پکڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن آپ کی نظر اور جذبات پر پڑ رہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی نظر آتی ہیں۔ جو محض سیاسیات کی تہ سے بہت تر ہیں۔ مثال کے طور پر "کیمیاگر" کو لیجیے جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا طرز واضح اور سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ بپارہ نظم کی عبارت بڑھتی جاتی ہے بات آمریت الامر سے شروع ہوئی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خود بینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے، اور جس کی گرفت جنون کی سی گرفت ہے ـــ

مگر وہ تیری حد سے گزری ہوئی رازداری
کہ جس نے تجھے
اپنے افکار کے قید خانے میں
محصور سا کر دیا تھا
وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر تا ہی
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو
جہاں ہر نقیب ـــ گزر
سپید الہام کے شیشہ گر دیں دیکھتا ہے

جہاں ایک چھوٹا سا مندر بھی بنایا نہ تھا
جس میں حق سے اتفاق کی اک کرن کا گنبد ہو
اسی کا تصور کر اک روز
کچھ لوگ بھی بہت تھیں
گو ملنے والے کہیں بھی نہ تھے
اور تھے بھی تو کہ جو گئے تھے

اس نظم کو سیاسی کہہ کے ٹال دینا محض کم بینائی ہے۔ یہ ایک مرثیہ ہے جو آپ نے خود پسندانہ فن پر لکھا ہے جو خود ہی اپنے زمانے میں جھلتے ہیں۔ اس ہول کا نقشہ بڑی انتہائی قوت کی انتہائی سزا ہے۔

آپ کے نیاز مند پہلے بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے۔ اور اب تو اس مجموعے نے دوبارہ اس کی تصدیق کر دی۔ کہ آپ کا مزاج شاعری بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے۔ ایک کو الفاظ پر محمول کیجئے دوسری کو جذبات پر۔ گو الفاظ اور جذبات کی یہ تمیز محض بحث کی سہولت ہے اس پر بہت بوجھ ڈالنا نہ چاہئے۔ پہلے شوکت کو لیجئے۔ ان اساتذہ کو چھوڑ کر جو ٹھیٹھ زبان کے ماہر بھی تھے۔ اور شعر میں اس سے گریز بھی نہ کرتے تھے۔ (بلکہ بعض اوقات اسی کو شاعری کے لئے کافی سمجھتے تھے) ہمارے بیشتر شعراء خصوصاً پنجاب کے اردو شعراء کے ہاں سنگین و دو گز جیسے الفاظ ملتے ہیں۔ وہ شعر کچھ نہیں سمجھنے دیتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اکثر اپنے حسنت کو بیان و طرز بیان کا جبہ و دستار پہنا دیتے ہیں۔ ہر چھوٹی بات بھی ہو تو اسے "سرنگوں" کہہ کر کسی میں گرد و غبار پیدا کر لیتے ہیں۔ سالہا سال میں ہر شعر صوبہ مجموعہ کے پڑھتا رہا ہے

کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مگر مصنف تو ہمارا اس میں عجز و ندامت کہاں ہے۔ رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ جو جتنا بھی تھا اس سے حقیقت کا منظر کہیں بڑھ کر ہے الفاظ ایسے دل کش ہیں کہ سنی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ہمارے جدید شعراء اس بارے میں اکثر قناعت پسند ہیں۔ حسنت میں کوئی جدت دکھاتے بھی ہیں تو بس اتنی کہ ولایت یا ایران سے چند اور الفاظ بطور سوغات کے لے آتے ہیں یا اگلے سال کے فارسی الفاظ کو نئی ترکیب سے شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ الفاظ کے بارے میں وہ ابھی تک غالب کے قائل ہیں کہ جو شودر ہوا وہ کبھی برہمن کی برابری نہیں کر سکتا اور جس لفظ کی قسمت میں نثر کی خدمت لکھا ہے اس کی رسائی آستان شعر تک کبھی نہ ہوگی۔ اس سے ہماری شاعری پر کئی راہیں مسدود ہو گئی ہیں جنہیں کھولنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم فارسی اور عربی کتب کی ہماری شاعری کو اپنے شکنجے سے کب چھٹکارا ملے گی اور وہ دن کب آئے گا جب ہمارے شعراء اپنی زبان کو لوٹا دیں گے۔ اور قیام پاکستان کے بعد کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اگر پاکستان میں ہیں تو اقلیت میں ہیں۔ اور اگر ہندوستان میں ہیں تو ان سے رشتہ ٹوٹ چکا۔ نہ معلوم ہماری ادبی زبان آئندہ کیا شکل اختیار کرے گی۔ خیر میں ایک آپ ہی کا کلام لیجئے اس عالم میں ہم بھی نکلے ہیں۔ حقیقت بلاشک ہے کہ آپ پڑھنے والوں کو بعض اجنبی آہٹیں سناتے ہیں جہاں بے اعتنائی بھی کرتے ہیں وہاں بھی گوارا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے آپ کے "دریچے" اور "ولاک" اور "لباس کی بوری" اور "ملبستان" اور "کردار" وغیرہ سب گوارا ہیں۔ بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے بڑے کر وہ الفاظ کو بھی ایسا بٹھا لیا ہے کہ غلط نہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ جب بھی آئیں جائیں ماہر ہو جاتے ہیں اور ہر رنگ بدلتے ہیں ـــــ

شہر اور قصبے کے متعفن دالان
جو ہندوستاں میں انسانی گلوں کے
اس سے کم امید ہے کہ شفی جذباتیوں کی بدولت آپ ایسے بھی عطا کر سکتے ہیں ——

سنو کہ ہیں کا ظلم سہتے ہوئے برہمن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے
ہے وزر شب ہندوستاں
وہ سوچتے ہیں
کہیں یہ ممکن ہے
بچا لے گا
ہم کو بردہ فروشی کا ننگ
اب اسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پرانے سینے سے
آج بھی لہو رکھ رہے ہیں ہم سب
جواب بھی چاہئے
تو روک لے ہم سے لہو فشاں

ایسے شعروں سے محروم رہ جانا کسے منظور ہوگا۔

باقی رہی شدت تو اس کی رمق آپ میں آغاز ہی سے پائی جاتی ہے اس کے لئے ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں تھا۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے کبھی اسے جوش کہہ دیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن مجھے تلاش ایسے لفظ کی ہے جس میں جوش اور جذبہ کے علاوہ کچھ وحشت بھی پائی جائے جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو جب شدت اس حد تک پہنچے تو مزا کچھ تلخ ہو جاتا ہے شاعر اپنی ہی کیاریوں کو روندتا لگتا ہے جیسے بچے ضد میں آکر چیزیں توڑ ڈالتے۔ شروع شروع میں یہ بہت زوری غالباً آپ کے شباب کا تقاضا تھی اور چونکہ ہمارے بیشتر جدید شعراء جوان ہیں یا جوانی کے دنوں میں انہیں سے کام لیا گیا۔ اور علاوہ بریں آزادی (سیاسی یا معاشی یا فنی) کی پیاس سے ہیجان پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے اس لئے اس معاملے میں آپ تنہا نہیں مگر آپ کی محبوب نظمیں وہی ہیں جن میں اس شدت پر شاعری غالب آئی اور اسے اپنے پہلے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں کہتا ہوں کہ جہت میں آپ اس شدت پر پورا قابو پا سکے جن کا "درویش" اور "تیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجہ تک جا پہنچی ہے۔ جہاں وحشت سے آپ کا قلم آشنا ہوا جاتا ہے۔ "درویش" اور "سوداگر" جیسی نظمیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی۔ کیونکہ کنایہ جو شاعری کی جان ہے ان نظموں میں باوجود جوش اور جذبہ کی شدت کے ہاتھوں کند ہونے نہیں پایا۔

میرے ہاتھ میں ہاتھ سے دو
میرے ہاتھ میں ہاتھ سے دو

کہ دیکھی ہیں میں نے بارہا زندگی چوٹیوں پر شعاعیں

یہ حسین اور رنگین تصویریں ہیں جنہیں شاعر نے بے حد بے ساختگی کے ساتھ رنگین مصرعوں میں پیش کر دیا ہے اور "مدیش" کا یہ پارہ بھی آپ کو یاد ہوگا ـــ

یہ درویش
جن کے حساب و جد
وہ صحرا کے دیوانوں کی ریت پر
تھک کے رہ جانے والے
اسی کی طرح تھے
تہی دست، درماندہ و تیرہ بخت و غلطاں
جو تسلیم کے بے نیازی بنا کر
ہمیشہ کی محرومیوں ہی کو اپنے لئے
بال و پر جانتے تھے
جنہیں تھی فروغ گدائی کی خاطر
جلال شہی کی بقا بھی گوارا
جو ناشروں میں چلتے تھے
کہتے تھے ناشروں سے
"سوتے رہو
صبح فردا کہیں بھی نہیں ہے"
وہ جن کے لئے حریت کی نہایت یہی تھی
کہ شاہوں کا اظہار شہنشہی حد سے بڑھنے نہ پائے
بھلا ان کی کس کو خبر ہے؟

"ناشروں" کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ پھر بپھرنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی کریں گے لیکن ضبط تھا کہ نہ چھوٹا اور آخری جملے نے اپنی ملائمت سے وہ اثر پیدا کیا جو شدت سے نہ ہو سکتا۔ اس مجموعے میں "درویش" کیا بہ اعتبار صنعت اور کیا بہ اعتبار واردات قلب اور مزاج شاعری کے کامل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ "بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانہ ہیں جن میں زیادہ زور کسی تصویر کشی پر ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا اشارے کی سی ہے بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں" یہ ہر گری بھی جدید شاعری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے اس نئے اسلوب کو جن کے آپ باغیوں میں ہیں ہر طرح آزمایا ہے جس کی مثالیں اس مجموعہ میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ آپ نے واقعے کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی کوئی نئی چیز نہیں

اور جہاں داستان یا افسانہ اپنا راہ سے آسانی سے مفر نہیں۔ لیکن قدماء کے سلسلے الف سے لام تک سب ...... کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر لا کھڑا چلے جاتے تھے —

یک زمانی تھا رقی تھی وہاں
اس لڑکی تھی عرض لیلا احوال

قصہ ختم تھا لیکن جدید شاعری میں معاملہ ایک پیچدار سا ہے جہاں متکلم کے جذبات کے ساتھ ساتھ نشیب و فراز، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس میں الجھن سب کو ایک ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ آپ کو اس مجموعے میں جا بجا پیش آئی۔ اور آپ نے اسے جا بجا چابک دستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعت مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر نہ بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے —

زمستاں کے دن تھے
لگاتار چلتی رہی تھی سرِ شام سے برف باری
دریچے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگ گئے تھے
مگر برف کا رقص پیہم تھا جاری

......

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بے کراں خامشی چھا گئی
خیاباں کے دو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ
برف کے گالے پرندوں سے بن کر ٹھٹھرے سے تھے
زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پر سے
کنارِ ساحل سا بنتی چلی جا رہی تھی

ہماری شاعری —

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی!

سے کتنی دور نکل گئی ہے۔

آپ نے یاد دلایا کہ آپ کی نظمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں تو رابرٹ براؤننگ یاد آیا۔ اس کی نظموں میں بھی افسانے، اسکیچ، خود کلامی، مکالمے کہانیاں غرضیکہ ایک فراوانی پائی جاتی ہے۔ اسے بھی وہی مشکلات پیش آئی تھیں جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی۔ اس کے کلام کو بھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا کہ معنی کا سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس کی قوتِ تخلیق بھی ایسی تھی کہ بہتے چشمے کے پانی کی طرح ہر قسم کے پتھر کو ہٹاتی ہوئی چلی جاتی تھی۔

"پطرس"

نیو یارک
۱۹۵۰ء]illegible[

چھپے چوری

ہاجرہ مسرور کی کتاب "چھپے چوری" کا دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی اور ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چمکنے لگے تو بعض ایسے نقادوں کو جن میں خواتین بھی شامل تھیں اس سوال نے گدگدایا کہ کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدا ہوتا ہے؟

انسان ہمیشہ سے یہی پوچھتا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا اس سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس سے تجسس اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔

عورت مرد نہیں بن سکی۔ مرد عورت نہیں ہو سکا۔ آدھی دنیا آدھی دنیا سے اجنبی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوتی اور ٹٹولتی چلی آتی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہوا کیونکہ ادب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا مخبر اور غماز کوئی نہیں۔ یہ تو پوچھنے سے بھی زیادہ پردہ در ہے۔ پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی۔ گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روایتی مسلک پر واسطے کے ساتھ ہو لیں۔ جہاں سب ہم سفروں کا بس ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا۔ لیکن جب خود اعتمادی بڑھی اور کچی پکی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی ہیروئن کہتی ہے "میں ایک عورت ہوں۔ میری زندگی کیا ہے، ایک لمبی محدود سی رسی جو کئی شخصی اور مقامی رشتوں کے دھاگوں سے بٹی ہوئی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" عورتوں کے ادب کو اس نظر سے دیکھئے تو یہ قول کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے۔ جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے یا انسانی رشتوں کو تڑا کر منہ زور گھوڑے کی طرح سب کچھ پھلانگ جانا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو کچھ افسانہ اور ناول میں حاصل کیا ہے کسی اور صنفِ ادب میں نہیں کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے فطرتِ نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھی رہتی ہے اور یہ جال سب سے زیادہ دلجمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بنا جا سکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں۔ اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا رہے گا۔ فطرتِ نسوانی نے پنہائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔

یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک۔ آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملے گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں۔ بلکہ خلوص اور دیانت داری سے نبھتی ہے۔ سچ پوچھئے تو اس معاملے میں ان کا تاثر اعمال مردوں سے زیادہ دلکش ہے ہمارے ہاں ادیب عورتوں

کی تعداد بہت زیادہ نہیں بلکہ شخصی، ازدواجی رشتوں کی روداد جس جرأت، بے ساختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے موجودہ ادب کا بھی یا کاری کے کلچر نکلے پڑھتے ہیں اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ "تیسری منزل" کا ایک اور مجموعہ ہے۔ پچھلے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نبھایا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نبھا رہی ہیں۔ ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے۔ لیکن شخصی اور ازدواجی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بن رہی ہیں۔ ان کے ادھ پُراسرار ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ ان میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں، اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں۔ اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہار کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خار پشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی ہو، ٹھٹھرنے لگتے ہیں، تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں۔ اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو بھی تعجب "آپ ہی کی دنیا ذرکے کو..." میں نظر نہیں آتا؟ اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک قرب — ایک پیار اور ایک کشش ہے جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے بے وجہ جھگڑوں کو اس بے تکلفی سے جمع کرتی چلی گئی ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد منافرت کے اس بیٹھے ہوئے سایہ سے ڈر لگنے لگتا ہے جس فریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں، وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا قائل ہو جائے۔ کہانی کا انجام خواہ کچھ بھی ہو) ہاجرہ کو اس پر برہم نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اسے بھی قدرداں ہی سمجھنا چاہیے۔

"کال کوٹھڑی" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور تسلیم کے جذبے پلتے جاتے ہیں اور اگر فریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ظاہر کرنا آتا بھی تو نہیں۔ اس الجھاؤ کو میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لے گا کبھی بیوی کی خاموشی سے اکتا جائے گا۔ بیوی کبھی ہنس دے گی۔ کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے اور ان دو ہم بستر اجنبیوں کی عمریں یوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائیں گی۔

"ایک بچی" کو آپ محروم ممتا کا افسانہ کہنا چاہیں تو نہ افسانہ کو اس سے انکار ہو گا نہ افسانہ نگار کو، لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی الجھنیں ہیں جن کا حال ناہید (ہاجرہ کے پیچھے نیز) ہیں سناتی چلی جاتی ہے:

"مجھے جانے کیوں دبی دبی کیفیتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے . . . . گلی کے اس مکان میں
رہ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض
ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا. . . . . میرے اندر کی اندر کوئی الجھ کر گھٹنے لگا . . . .
میری جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر گلی
میں کر دوں . . . . . . گلی میں جیسے کوئی نشہ میں بہکتا ہوا گزرا، مست اور بے پروا، اور
مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں، پانی بھرتے بھرتے نہیں، بیٹھے
پڑے بے کار پڑے پڑے، پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر اٹھاتے اٹھاتے۔"

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تکلفی سے بُن لیتی ہیں۔ تار تار کر کے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی گتھیاں پڑتیں اس جال میں اور

معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے انہیں اپنے دماغ میں کیوں کر سمویا ہوگا۔ اور دھاگوں کے سب پیچ کیوں کر یاد رہے ہوں گے۔ اس حقیقت کی اصلی قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے جو آپ کو بتائے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت سے اپنے لئے کتنا سہل بنا لیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ——— "سرگوشیاں" اور "لا علاج" ——— ایسی ہیں جن پر ہاجرہ جیسا ادیب کیا ان پر فخر کرنا چاہیے۔ دونوں کا رنگ ایک دوسرے سے جدا ہے۔ "سرگوشیاں" ایک کردار کی مسلسل خود کلامی ہے جو اپنا تیز رفتاری میں ماضی کی باتیں بہا بہا کر ہمارے سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔ بخار کی سی تیز رفتاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ جو ہر پیراگراف کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع میں کھٹکتا ہے۔ جیسے کوئی شیر آیا شیر آیا پکار کر ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن جب کہانی کی گذشتہ زندگی کے اوراق ایک ایک کر کے الٹنے لگتے ہیں۔ تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ بے اتفاقات دشت کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ خطابت کا انداز خطرات سے پُر ہے لیکن ہاجرہ نے باوجود ڈرامائی طمطراق کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ "لا علاج" میں ایک سادگی ہے ایک پرتی ——— دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ نے یہ کہانی پرتی کو سامنے بٹھا کر لکھی ہے لیکن مجھے تو پرتی بھی سادگی ہی کی طویل الجھی ہوئی زندگی میں ایک الجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے بکھرے ہوئے زندگی کے ٹکڑوں کو ہاجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسن انتخاب سے سمیٹا ہے کہ اس کی مثال اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اگر اردو میں کوئی کہانی اپنی تکمیل، اصلیت اور احساس کے اعتبار سے اس رتبے کو پہنچتی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری۔ اس افسانے میں بڑھیا، جن کی بجائیں بجائیں کرتی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک اور ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کرینی کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہی رشتے ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے۔

> "اس کی روح ایسی ویران اور اجاڑ تھی کہ اس ویرانی کے مقابلے میں بیرونی ماحول کی کوئی حقیقت ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں اپنے پنجے گاڑ دئے اور ایسے معلوم ہوا جیسے برس ہا برس کی ایک منہ زور ندی بہے چلی جاتی ہے اور اس کی سطح پر چڑھتے اکھڑے ہوئے درخت کی مانند ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ بڑا اکھڑ چلی اور زندگی کو زندہ جلنے کس وقت کوئی پھونک مار کر بجھا دے۔ کچھ کہ زندہ ہے لیکن ایک طوفانی سطح پر بے اختیار بہے چلی جاتی ہے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاڑتی ہوئی لہریں اسے نگل جائیں......"

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک بین ہیں ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اس لئے ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ ادا بھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے حال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں جب کوئی انسانی الجھاؤ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو ان کا ذہن ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی کی ہی ایک الٹ کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ الجھے ہوئے دھاگوں کے سرے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں انسانی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے میٹھے پھل لگ سکتے ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو اسے بوئے گا وہ کیا کاٹے گا۔ اس کی جڑیں دل اور دماغ اور اعصاب اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا، نئی

سے تو بچ نکلتی ہیں۔ ہاجرہ مسرور نے کرداروں کا جنسی شعور جہاں خدیجہ سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ہاجرہ کے احساس میں بھی کافی گہرائی اور حسیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگینی بھی زیادہ لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔

ہماری عورتیں اپنی فطرت شعاری کی وجہ سے صاف اور معنوی "ادبی" زبان سے بہت حد تک اجنبی رہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا تو بیٹھے جاگتے الفاظ کے سوا ان کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان بھی جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف پہنچتی ہے ادھر ادھر یا اپنی طرف دیکھتی نہیں رہتی اور اس الھڑپن کی وجہ سے بے تکان وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو معنوی ادبی زبان کے خشیانے گلے میں اٹک کر رہ جاتی یا بڑے تکلف سے ادا ہوتیں۔

لیکن الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہرحال ان گنت ہوتی ہیں اور لفظ اکثر بار بار کر جاتے ہیں اسی لئے ادیبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بحیثیت مجموعی ان کی قدرت نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے چلتا ہے۔ مجھے تو ہاجرہ کی تشبیہوں پر ایک نظر ڈالنا ہے:

"کوئی ساتھ دینے والا ہو تو اپنے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں رہ سکتے۔"

"لگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے؟ جا من چاہے کہیں بھی چھپا کر کھائی جائے کم بخت منہ کی اور ہونٹ چغلی کھا دیتی ہے۔"

"آپا کی آنکھیں کیا تھیں۔ بس ڈگڈگی تھیں کہ سب بندر کی طرح اس کے گرد ناچتے۔"

"سبھی لفظ مطلب کے نہیں ہوتے۔ قلم روشنائی میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو، روشنائی نب پر زور سے رکھو تو کبھی کتنے ہی بے معنی نقطے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں۔"

"محبت مکڑی کا ایک ایسا جالا ہے جو اگر کونوں کھدروں میں گھسنے پر جسم سے لپٹ جائے تو چھڑانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ جاتا ہے۔"

"تم کہنا چاہتی تھیں کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفہ میں بغیر دستے کی کٹار پکڑا دی جائے۔"

"تم تو ایسی ٹھنڈی لگ رہی ہو جیسے کسی بنگالی کا تھا زردہ کا چولھا۔"

"اس کے احسانات پر جیسے سڑا ہوا آم بچکا پڑا تھا۔ گھناؤنا اور کڑوا بس ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی لیکن اس کے ذہن کے سیال زہر کا کھولاؤ بہر ڈھلتے ہوئے فقرے کر کچھ میں پڑی ہوئی سیپ کی طرح بکھرا آتا۔۔۔"

"یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے فساد ہوتے ہیں وہی چند روز بعد ایسی معقول ہو جاتی ہیں جیسے نارنگی کا چھلکا۔۔۔"

"بکتی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا۔ لیکن انھوں نے ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا۔۔۔"

"مگر وہ دونوں اس سے محظوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو۔۔۔"

"وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو ایسا بے بس اور دور تک محسوس کرنے لگی۔ جیسے میٹھا دریا کوہ میں ریت کے پہلوؤں میں دبی ہوئی گنگا۔۔۔"

"شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا جیسے کوئی ننھی چڑیا پھدکتے چہکتے ایک درخت سے دوسرے پر جا بیٹھے۔"

"جتنی لمبی عمر ہو، اتنی ہی لمبی الجھنیں۔ سوئی میں دھاگا ڈال کر سینے بیٹھو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔"

ماننا پڑے گا کہ اس جزو کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اور عجیب ہیں؛ خیال کے ساتھ ہی بے تکلف ان کے ذہن میں چلی آتی ہیں۔ جب ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیتی ہوئی بات کہنی ہو تو اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے نہیں چل سکتا ہے، اور جو گھڑی گھڑائی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں وہ اپنے دل کی بات کیونکر کہہ پاتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اس کی جگہ بھی ہاجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے جبر کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی۔ ان کی طبیعت کا اصل جوہر جیسا کہ ان کے تین مجموعوں میں چمکا ہے، انہیں خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چین نہ آئے گا۔

جب تک ان کا چوتھا مجموعہ نہ چھپے، ہمیں بھی چین نہ آئے گا۔

"پطرس"

سفرِ انگلستان

(خطوں کے پیرائے میں)

۱۰ ستمبر [illegible] دس بجے دوپہر

عنایت بھائی! یہ خط اپنے آخری ایک ایسے مقام سے لکھ رہا ہوں جو عدن سے ۵۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم اندازہ لگا رہے ہیں اس وقت بھی ہے۔ دو تین ہزار میل کے فاصلے پر ہوں جو پشاور سے ڈیڑھ ہزار میل دور ہے اور ابھی منزل مقصود کا پتہ ہی نہیں۔ [illegible] سفر [illegible] دوسرے [illegible] کا سفر اس کے مقابلے میں پہلی قدمی سا معلوم ہوتا ہے۔

تیرا بھائی: سفر کی ابتدا سے شروع کروں۔ بمبئی پہنچے تو کمپنی والوں کی طرف سے نوٹس ملا کہ [illegible] ستمبر کو جہاز پر پہنچ جائیں۔ وہاں ڈاکٹری معائنہ ہوگا۔ ہمارا شوفر [illegible] آگے ہی ڈانواڈول ہو رہا تھا دعائیں مانگتا گیا۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ معائنہ ہے جو جہازوں کے قوانین کے مطابق ہر جہاز کی روانگی سے پیشتر ہونا ضروری ہے۔ اس معائنے کی کیفیت میں یونہی بیان کر سکتا ہوں کہ جس کی نبض چلتی ہے اسے تو جانے دیتے ہیں۔ جس کی نبض بند ہو اسے بمبئی میں ہی روک لیتے ہیں۔

جہاز پر سوار ہوئے تو بھانت بھانت کے جانور دکھائی دیئے۔ ہندوستانیوں کی تعداد میری توقعات سے بہت زیادہ تھی۔ بنگال، مدراس، پنجاب، یوپی، بمبئی سبھی صوبوں کے لوگ تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر ایک صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے سب سے بڑے چغدوں کو چن کر بھیجا ہے۔ کیسے ایک نرالی صورت کا آدمی ہے ان میں سے ہر ایک اپنی وضع کی انگریزی بولتا ہے۔ بعض انسان نما حیوان ہیں کہ عزیزوں سے جدا ہوتے چلے آ رہے ہیں اور رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اپنے آپ کو بہت [illegible] ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس اظہار کے لئے کبھی کبھی ادھر سے ادھر اور کبھی ادھر سے ادھر تیز تیز قدم اٹھاتے نکل جاتے ہیں جیسے جہاز کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوں۔

[illegible] جہاز روانہ ہوا اور جہاز پر سے بھی اور ساحل پر سے بھی رومال ہلنے شروع ہوئے۔ کئی دیسی شرفا معلوم ہوتا تھا برسوں سے رومال ہلانے کے منتظر بیٹھے تھے دل کھول کر رومال ہلائے۔ ان میں سے ان کا اضطراب دیکھنے کے قابل تھا جو اپنی سب جیبوں کو ٹٹول رہے ہیں اور رومال نہیں ملتا۔ اور جب کسی حضرت کا رومال ہاتھ سے چھوٹ کے سمندر میں گر جاتا تو ان کی خفت قابل دید ہوتی۔ جب ساحل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو یہ طوفان بدتمیزی تھما۔ اب جہاز کی کیفیت یہ ہے کہ ہر فرد بشر کرسی بچھائے جہاز پر بیٹھا ہے اور سمندر کو دیکھ رہا ہے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل میں کہہ رہے ہیں۔ "اچھا تو گویا یہ سمندر ہے۔ [illegible] اب ہم سمندر میں ہیں۔ بھئی بہت اچھے!" ہندوستانیوں میں وہ ساتھ [illegible]

بیٹھے ہیں اور ایک حصے میں لندن اور ایڈنبرا کے متعلق نہایت عالمانہ انداز اور بے پروائی کے لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک کونے میں ایک ہندوستانی بیٹھا سمندر کو دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم ساحل سے بہت دور نکل گئے۔ ہوا تیز ہونے لگی اور سمندر یوں معلوم ہونے لگا جیسے کسی گھٹیا سے مصور نے کوئی تصویر کھینچی ہے۔ بھوک کے مارے انتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں اور سب بے صبری سے کھانے کا انتظار کرنے لگے۔ میں دوسرا فقرہ سوچنے نظر وہاں سے ہٹا۔ یکایک کمبخت معلوم ہوا جیسے افق کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا ہے جیسے ترازو کی ڈنڈی ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ دوسری طرف کو جھک گئے۔ ایک دو منٹ نہ گزرے تھے کہ ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے دفعتاً گھٹنوں اور گھٹنوں کے پیچ ڈھیلے کر دیئے ہوں۔ معدے میں ایک برف کا گولا بہت زور سے نیچے کو گرا۔ انتڑیوں نے اچھل کر پھیپھڑوں کے ایک کونے کا ملا اور کلیجے کے اندر سینے نے آہستہ آہستہ پنڈولم کی طرح جھولنا شروع کر دیا۔ اور پھر تے۔

یہ ابتدائے عشق تھی۔ ہم بھاگے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے اور بستر پر چت لیٹ کر اس شخص کے خاندان بھر کو کوسنے لگے جس نے ہمیں ولایت آنے کا مشورہ دیا تھا۔ بس اعجاز! کچھ پوچھو مت۔ دنیا میں ایسی تکلیف دہ بیماری کوئی نہ ہو گی۔ بہت بھی خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ مجھے کمرے میں پہنچے ہوئے چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ نزدیک و دور کے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور تھوڑی دیر میں ہر طرف سے قے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے توپ خانہ داغ جا رہا ہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو تمام جہاز چپ پڑا تھا۔ "کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی"!

پانچ دن رات میں بستر پر پڑا رہا۔ دوسرے دن شام کو ڈاکٹر کو بلایا۔ ٹیڑھی ترچھی سی ٹوپی سلیٹی۔ شکل سے بہت لڈ فانڈ سے بہت ملتی ہے۔ انھوں نے آتے ہی بے تحاشا ریخ شروع کر دی اور متواتر بیس منٹ تک بکتے چلے گئے۔ اتنا سمجھ میں آیا کہ انجکشن کریں گے۔ چنانچہ کیا اس سے قے تو بند ہو گئی لیکن دماغ برابر چکرا چکرا چول رہا تھا۔ سمندر میں بہت بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں اور جہاز پر جیسے وجد کی کیفیت طاری ہے۔ ہر لحظہ طوفان بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ چھٹے دن کچھ افاقہ ہوا۔ الہم ہمت کر کے تختۂ جہاز پر پہنچے۔ اور ایک کرسی پر لیٹ گئے۔ ہماری طرح اور بھی کئی کشتگان ناز باہر نکل رہے تھے۔ شکلیں چوہوں کی سی بنی ہوئی۔ چال ایسی جیسے ہوا میں تنکا اڑتا ہوا جا رہا ہو۔ جہاں بیٹھتے تھے بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ لیکن طوفان کے تھمتے ہی طبیعت فوراً ٹھیک ہو گئی اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی اس قدر زور کی بھوک لگے لگی کہ عمر بھر نہ لگی تھی۔ جہاز پر دن میں پانچ دفعہ کھانے پر بلائے جاتے ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کسی وقت بھی کھانے کے کمرے میں بے تکلفانہ داخل نہ ہوا ہوں۔

کھانے کے کمرے کی دنیا ہی نرالی ہے۔ ہندوستانی بھائیوں کے لئے اس کمرے کے اندر طرح طرح کی مایوسیوں بے توجہی اور مشقتوں کے سامان موجود ہیں۔ کچھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اتنے عرصے سے ولایت آنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ چھری کانٹے کے استعمال کی مشق کیوں نہیں کر لیتے اور انگریزی کھانے کے آداب دو چار دن کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ دیسی حضرات کے لئے اور بھی مصیبت ہے۔ ہر طرف چھریوں میں ایسا گوشت کہ ذرا کوئی آمیزش نہیں، اس میں کچھ تو نہیں ڈالتے۔ چربی میں پکا ہے یا گھی میں یہ ہم شکر میں اس شے تو نہیں پہچانتے۔ شفو اور ذرا سے ... کھانے سے تو ہیں لیکن ان سے چاولوں کے لئے ایک دو پیالی ترکاری سے زیادہ نہیں ہوتا۔ بیچاروں کی طرح سے چھری اور کانٹے دونوں کو کیا تھامے رہتے ہیں اور دائیں ہاتھ کے ساتھ پیچھے سے کھانے

جاتے ہیں۔ آئس کریم کے بعد چمچے کو ٹنک کلیمیا ہی مثال دیتے ہیں اور پھر ٹنک کے ڈبے سے آئس کریم کھانے لگ جاتے ہیں۔ پھر کھانے کا ہر وقت مجرم نظروں سے دائیں بائیں جھانکتے رہتے ہیں۔ کسی کو دائیں ہاتھ میں چھری پکڑے دیکھا تو خود بھی دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر جو کسی کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے تو بائیں ہاتھ میں منتقل کر لی۔ سور کا گوشت ہر روز کھانے میں ہوتا ہے لیکن بھائی اب تک ہم نے کھایا نہیں۔ آگے بھی خدا حافظ و نگہبان ہے۔

عدن پہنچے تو ساحل پر گئے۔ ہم چار آدمیوں نے مل کر ایک ٹیکسی کرایہ پر لی جس پر سوار ہو کر ہم عدن کے گرد و نواح ۲۵ میل گھومے۔ اس کا کرایہ کوئی ایک پونڈ کے قریب۔ عدن کے غوطہ لگانے والے لڑکے جن کا بہت چرچا سنا تھا کہیں نظر نہ آئے۔ خدا جانے متمدن ہو گئے ہیں یا اب ان کی نسل ہی ناپید ہو گئی ہے۔ عدن ہندوستان کے عام شہروں کی نسبت بہت ستھرا شہر ہے بلکہ بہت بے رونق سا مقام ہے۔ پارسیوں کی دکانیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ عدن میں پہنچ کر ٹکٹ وغیرہ خریدے اور خط پوسٹ کئے۔ تمہیں ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس پر ہمارے جہاز کی تصویر تھی۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔

یہاں سے ۶ ستمبر کو دن کے ۱۲ بجے روانہ ہوئے اور بحیرۂ احمر میں داخل ہوئے جہاں کی گرمی کا قصہ بہت ہی سنا ہے البتہ رات کو کمرے کے اندر نہیں سویا جاتا۔ دن بھر سب سے اوپر کے تختے پر کرسی بچھائے بیٹھے رہتے ہیں اور رات کو وہیں بستر بچھا کر سوتا ہوں۔ طلوع اور غروب کے نظارے لب اوقات بہت ہی شاندار ہوتے ہیں۔ وسیع سمندر، وسیع آسمان اور آفتاب کا بہت بڑا آتشیں گولا جب صبح ہوتی ہے یا شام پڑتی ہے تو سمندر جیسے پگھلنے لگ جاتا ہے۔

ایک دن رات کو جزیرہ پیرم کے پاس سے گزرے۔ جزیرے کے ایک سرے پر لائٹ ہاؤس ہے جس کی روشنی ایک ایک منٹ کے وقفے کے بعد چمکتی ہے اور جزیرے سے لے کر جہاز تک ایک چمکتا ہوا شاہراہ سا بچھا دیتی ہے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جزیرے کے لیمپوں کی مدھم سی قطار دکھائی دیتی تھی۔ یہ تمام نظارہ کچھ ایسا پُراسرار معلوم ہوتا تھا کہ مجھے جھرجھری ہونے لگی۔

جب سے سمندر کا طوفان بند ہوا ہے ہر روز رات کو سنیما کا تماشا اور ناچ ہوتا ہے۔ کھانے پر بھی دعوتیں معقول جا بجا ہے۔ ایک پروگرام میں تمہیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تماشا جہاز کے تختے پر ہوتا ہے نہ کہ بند کمرے میں۔ اور مفت ہوتا ہے۔ کچھ خاصا لطف رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا گراموفون بینڈ کے بجتا ہے۔ سوائے ایک فلم کے (THE BACK BITER) باقی کی سب میرے لئے نئی تھیں۔ اس پروگرام کی فلم مسٹر ہیرلڈ لائڈ کا مسکا تھا۔ دل بہلاوے کو کافی سامان ہے۔ باقاعدہ سنیما نہ سمجھو۔

اب ہم بحیرۂ احمر میں ہیں۔ مکے اور مدینے کے عرض البلد سے اوپر گزر چکے ہیں۔ شروع شروع میں ساحل عرب کے پاس اکثر جزیرے نظر آتے تھے۔ اب کوئی ساحل نظر نہیں آتا۔ کل دوپہر کو سویز پہنچنے کی توقع ہے۔ پرسوں پورٹ سعید۔ جہاں یہ خط پوسٹ کروں گا۔ ہوا بہت خوشگوار اور فرحت افزا ہے۔ سمندر کا رنگ بالکل سلیٹ کا سا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں افق تک جا بجا سفید جھاگ کے گالے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاز تھوڑا سا ڈگمگانے لگ گیا ہے جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے شاید یاد ہوگا میں نے اس کمپنی کے پراسپکٹس وغیرہ منگائے تھے۔ ان میں لکھا تھا کہ جہاز پر انگریزی بولی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مسافر تو انگریزی بولتے ہیں اور کچھ بھی لیتے ہیں مگر جہاز کے افسر اور ملازم ہسپانوی ہیں۔

بہت سی باتیں کہنے کو ہیں۔ خطوں کے بس کا روگ نہیں۔ واپس انشاء اللہ پہنچوں گا تو سناؤں گا۔ ہزارہا لطیفے ہیں جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔ قبلہ مولوی صاحب۔ حمید علی صاحب۔ سالک صاحب۔ چغتائی صاحب۔ فضلی صاحب۔ اختر صاحب۔ حفیظ صاحب سب کو میرا نیازمندانہ سلام، بہت یاد آتے ہیں۔ کیا کروں۔

خاکسار
بخاری

(۲)

لندن ۲۲ ستمبر سنہ ۲۵ء

امتیاز بھائی! میں تم کو ضرور یورپ کے کسی اور مقام سے خط لکھتا لیکن اس لئے نہ لکھا کہ یورپ کا سفر ایک ہنگامہ تھا جس میں ہندوستان کو تقریباً بھول ہی گیا اور دوسرے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں ہندوستانی ڈاک کا کچھ ایسا انتظام ہے کہ وہاں کا لکھا ہوا خط تم کو اس خط سے جلدی نہ ملتا۔ پہلا خط میں نے آپ کو سویز سے لکھا تھا اور پورٹ سعید میں پوسٹ کیا تھا۔ پورٹ سعید میں ہمارا جہاز دن کے دس بجے پہنچا۔ کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل پر گئے۔ پورٹ سعید کی عمارتیں بہت خوش وضع اور خوبصورت ہیں۔ حفظان صحت کے اصول کے مطابق مغرب کی تقلید کی ہے لیکن ازلی طرز تعمیر کا رنگ غالب ہے۔ بازار صاف ستھرے اور کشادہ ہیں۔ دکانیں خوش رنگ ہیں۔ تعجب ہمیں اس بات پر ہوا کہ قہوہ خانوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے اور دن کے دس بجے بھی ان میں اس قدر بھیڑ تھی کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ بالکل بے کار ہیں۔ انگریزی سوٹ، سر پر ترکی یا انگریزی وضع کی پھوس کی ٹوپیاں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیٹھے کافی پی رہے ہیں۔ حقے کے کش لگا رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں۔ دوکاندار بہت خوشامد اور چاپلوسی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ بے نیازی سے آگے چل دیں تو فحش گالیاں سناتے ہیں۔ بے شمار گائیڈ بازار میں چلنا مشکل کر دیتے ہیں اور از حد بے حیائی کے مشاغل کے متعلق نہایت بے باکانہ گفتگو کرتے ہیں۔ آپ جس قدر بھی ہو ان سے کنارہ کریں تو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں۔

بارہ بجے ہمارا جہاز وہاں سے روانہ ہوا اور ہم بحیرۂ روم میں داخل ہوئے۔ سب نے گرم کپڑے پہن لئے گو موسم کچھ اتنا سرد نہ تھا تاہم یورپ کی تعظیم لازم تھی۔ تین دن کے بعد ہم برنڈزی (BRINDISI) پہنچے۔ وہاں بھی ساحل پر اتر کر شہر کا ایک چکر لگایا۔ برنڈزی میں فروٹ بہت ہی سستا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک بہت بڑا ٹوکرا کوئی دس آنے میں خرید لیا اور پیٹ بھر کے کھایا۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ اطالوی فوج اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا۔ فوجی سپاہی کی وضع سابق ہندسے ملتی جلتی ہے۔ سر پر دیسی سی ٹوپی اور اس میں ایک پر جس کا مدعا یہ بانکپن کی شان دکھانا ہے۔ پولیس کے افسر بڑے بھیجے ڈیوک آف ولنگٹن کی سی ٹوپیاں پہنے سرخ اور نیلی وردی پہنے کھڑے تھے جس پر پیتل کی آرائش عجب بہار دکھا رہی تھی۔ سفید دستانے اور چمکدار تلوار۔ جب بازار میں کھٹ کھٹ کرتے گزرتے تھے تو آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔

ایک دن کے لئے شام کے وقت ہم وینس پہنچے اور وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وینس ایک معجزہ ہے۔ ایک طلسم ہے ایک ایوان گہر خواب ہے۔ اطالوی آتشیں شراب کے نشے کی ایک ترنگ ہے جو مجھے عمر بھر نہ بھولے گی۔ اس شہر کی شہزادی کے متعلق آپ نے جو کچھ حافظ شیرازی سے سنا ہے سب سچ ہے تصویریں اس کے حسن کی داد نہیں دے سکتیں اور دنیا بھر کا لٹریچر یہاں کی دلکشی کا ساماں نہیں کر سکتا تھا

نہایت حسین، خوش مذاق، خوش سلیقہ، مہذب اور خوش اخلاق۔ خوبصورت اور بنے ٹھنے رہتے ہیں۔ جب باہر نکلتے ہیں اور ان کو دیکھ کر میرے جیسے سفید بالوں والے بھی رنگ برنگ اور طرح طرح کے سر پر لگے پھرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ ان کے بالوں کی خوبصورتی کو دیکھنے سے نظر تو خیرہ ہو ہی جاتی ہے۔ خلق کا یہ حال ہے کہ سارا دن آپ کے کانوں میں پیرمیسیاں پرمیسیاں (PERMISSION) کی آواز آتی رہے گی۔ جو انگریزی کے EXCUSE ME کے مترادف ہے۔ لیکن جس لہجے، جس روپ اور جس تبسم کے ساتھ کہا جاتا ہے وہ تو انگلستان میں نصیب نہیں ہو سکتا۔ رات کو وینس ایک دلہن ہے جس کا سنگھار کوئی ایسی زبان بیان کر سکتی ہے جس میں بجائے حروف کے VIOLIN اور BONJO اور QUITAR وینس کی نہریں خوبصورت، نازک، ہلکے ہلکے گنڈولے، بعض رنگ کی روشنی، حسین لوگ جن کی زندگی ایک دائم محبت کا ایک نغمہ معلوم ہوتی ہے۔ امتیاز! خدا کی قسم یہیں مرنے کو دل چاہتا تھا۔ ہائے میں کیا کروں ہندوستان میں کوئی بھی تو ایسی جگہ نہیں جس کا نام لے کر میں تم سے یہ کہوں کہ وینس اس سے دس ہزار گنا ہو، مگر ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا دنیا بھر میں کوئی ایسا مقام نہیں۔ میں دن بھر (Piazza San Marco) وینس کا ایک بہت مشہور چوک ہے) میں کھڑا اپنی آنکھوں کی سیر کیا کرتا تھا۔ رات کو گرینڈ کنال (Grand Canal) کے کنارے جیسے نشے میں مدہوش رہتا تھا۔ ایک دن ہم سینٹ مارک کا گرجا (Ducal Palace) اور ڈیوک کا محل دیکھنے گئے۔ ان کے حالات ان شاء اللہ مفصل بیان کروں گا ورنہ یہ خط کبھی ختم نہ ہوگا۔

وینس کا شیشہ تو آپ جانتے ہیں دنیا بھر میں مشہور ہے لیکن وہ عجائبات دیکھے کہ ان کے نقشے سے آنکھیں اب تک خیرہ ہیں۔ دل کو کڑا کر کے وینس کو خیرباد کہا اور میلان (MILAN) گئے۔ یہاں کی چند عمارتوں کے علاوہ کوئی بات قابل بیان نہیں اور ان کے ذکر سے میں اپنے خط کو خشک بنانا نہیں چاہتا۔ اور پھر اس کے بعد ان کی کوہستانی دل نوازی اور سوئٹزرلینڈ کی دلفریب فضا۔ سب قصے دلی اسلم ہوٹل میں بیٹھ کے سنوں گا۔ فرانس میں داخل ہوتے تو پیرمیسیاں کی جگہ پاردان مسیو (PARDON MONSIEUR) اور پاردان مادام (PARDON-MADAME) نے لے لی۔ فرانس میں یہ قاعدہ ہے کہ جب دو آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہیں تو دونوں یہی فقرہ دہراتے ہیں۔

یورپ کی ٹرین (CORRIDOR TRAIN) ہوتی ہے۔ سفر بہت لمبا تھا اس لئے کوریڈور ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتے جاتے رہتے تھے۔ یا محض شوقیہ ادھر سے ادھر تک چکر لگاتا تھا بس ہر طرف چہرے پہ مسکراہٹ، پاردان مسیو، پاردان مادام، پاردان مسیو، پاردان مادام کہتا ہوا نکل جاتا تھا۔ عجب لطف تھا۔ فرانس کے لوگ ٹرین میں ہم سفر ہوں تو گو آپ ان کی زبان سے ناواقف ہوں اور انہیں اس بات کا علم بھی ہو تاہم مرد ہو یا عورت، آپ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں گے اور کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیں گے۔ میرے ساتھ ایک مادام تھیں وہ فرانسیسی بولتی جاتی تھیں اور مسکراتی جاتی تھیں۔ میں انگریزی بولتا جاتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔ نہ میں ان کی بات سمجھتا تھا نہ وہ میری بات سمجھتی تھیں۔ تاہم ایک رشتہ سا قائم ہو گیا تھا جو بہر طور بہت خوشگوار تھا۔

اسی ٹرین میں انگریزی آداب معاشرت کا مظاہرہ ہو جاتا تھا۔ جب میں ٹہلتے ٹہلتے ٹرین کے ایک کمرے میں بیٹھا۔ ایک کونے میں ایک بوڑھی [illegible] ناول کا مطالعہ کر رہی ہے۔ آپ نے کسی موقع پر (Excuse me) کہا تو انہوں نے اپنی بھنویں تان دیں [illegible]

گو ملاقات کے بعد ہی معلوم ہوتا تھا دونوں انگریز ہیں۔ ملے ہیں دو نیوزی لینڈ کے باشندے (میاں بیوی) جو سوئٹزرلینڈ کی سیاحت سے واپس آ رہے تھے اور جا رہے (Honeymoon) پر سب دنیا کا چکر لگا رہے تھے۔ ان سے دوستی ہو گئی۔ وہ بھی آج کل لندن ہی میں ہیں۔ یہ لندن کی اچھی موٹر کار ہے۔ آج شام کو انہوں نے مجھے کھانے اور سیر کی دعوت دی ہے۔ اغلب تیسرے جائیں گے، ازاں بعد سیلون، چین اور امریکہ دیکھ چکے ہیں۔ ہندوستان جانا ضروری سمجھتے ہیں۔ فی الحال یورپ کی سیاحت کر رہے ہیں۔

خیر یہ داستان تو ختم کروں۔ ہوتے ہوتے لندن پہنچا۔ لندن کی وسعت اور عظمت کی کہانیاں تم بھی سن چکے ہو لیکن جو دیکھے بغیر آدمی کو وہ نہیں سمجھ سکتا۔ بھلا جہاں بازاروں میں لاکھوں موٹریں اور ٹرامیں، اور بس گاڑیاں اور جانے کیا کیا بے تحاشا بھاگی جا رہی ہوں وہاں دماغ کو فرصت نہیں ملتی۔ اور دل بے چارا کس شمار میں ہے۔ دل پہ ہو کچھ تو جب انھیں جب دیکھیں ہوش رہے نہ دیکھیں کی کیا بات ہے!

یہاں آتے ہی ضروریات سے فارغ ہو کر تھیٹروں کے اشتہار دیکھے۔ کل ہی EVERY MANS THEATRE میں Arms of the man پڑھا ہے۔ کمبخت دلچسپ ہے۔ لیکن بھلا ہم دیکھنے کیوں باز رہتے Old wine میں KING JOHN ہو رہا ہے وہ بھی دیکھوں گا۔ (PHILHORMOUR) میں Light of Asia ہو رہا ہے۔ وہ ابھی دیکھ آیا ہوں۔ فلم بہت شان سے شروع ہوتی ہے اور دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ ایکٹنگ تو غیر معمولی ہے (سب یورپین ہیں)؛ لیکن Atmosphere بہت زبردست پیدا کی گئی ہے۔ فلم تو آپ لاہور میں ضرور دیکھیں گے لیکن افسوس ہے کہ جو موسیقی یہاں ساتھ تھی وہ وہاں کیا ہو۔ گوتم کی پیدائش میں، انھوں نے یسوع مسیح کی پیدائش کا سا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس دوران میں جو موسیقی بج رہی تھی اس میں بیچ بیچ میں ستار کی سی صاف سنائی دیتی تھیں۔ اس میں آپ ذرا بھی مبالغہ نہ سمجھیں اور یوں بھی آرکسٹرا کے سارے پروگرام میں ہندوستانی راگوں کا رنگ نمایاں تھا۔ ایک مقام پر گوتم کا باپ ایک خواب دیکھتا ہے۔ وہاں پر باقی آرکسٹرا تو بالکل خاموش تھا صرف CELLO (جو تنبورے کی مانند بہت بڑا سا وائلن VIOLIN ہوتا ہے) صرف اس کے تار کمان سے نہیں ہاتھ سے بجا رہے تھے جس طرح ستار بجاتے ہیں تو کا تجربہ تو ہر آئی ہوئی ستار بہت ہی موزوں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک مقام پر کچھ بنگالہ سا تھا۔ یہاں سب آرکسٹرا بجانے والے اپنے گلے سے بھی سُر ہی نکالتے تھے۔ الفاظ نہ تھے محض الاپتے تھے۔ یہ تقریریں جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ تماشے کے بعد مفت ملتی ہیں۔ ملی کیا معنی وہاں ایک طاق میں رکھی ہیں جو چاہے جتنی چاہے اٹھا کر لے جائے۔ باقی سینما، تھیٹروں وغیرہ کے متعلق جو سوالات آپ کے دل میں اٹھیں وہ یا تو مجھ سے پوچھئے یا میرے آنے تک ملتوی رکھئے۔ میں فی الحال لندن میں مقیم ہوں۔ چند دن کے بعد کیمبرج جاؤں گا۔

لندن میں ہندوستانی طلبا کی انجمن میں بھی گیا حب وطن کی خاطر؛ وہاں کا ممبر بھی بن گیا۔ لیکن وہاں کی فضا میرے لئے ناموافق ہے۔ بھلا جہاں طرح طرح کا لٹریچر اپنی جیبی بد تمیزیوں پر ایک ہلکا سا انگریزی اخلاق کا غلاف چڑھائے فرعون بے سامان بنا پھرتا ہو وہاں بخاری کے پیٹ میں درد ہو یا نہ ہو؟ غیر دیسی بھائیوں کا ذکر ہی جانے دیجئے۔

مرا از روز قیامت غم است اینست
که روئے مردم عالم دوباره باید دید*

مدت اللہ چشت صحیح میں بہت سا اسلامی دور لے بیٹھے داخل ہوتا تھا اور حال یہ ہوا کہ محض اپنی شرافت کی وجہ سے ابھی تک مسلمان ہوں

دہ اسلام نعوذ باللہ ننگ معلوم ہوتے ہے (سالک صاحب کو یہ فقرہ سنا دیجئے)

میرا یہ خط احباب کو سنا دیتا۔ جگل سے کہئے کہ فلم تو دیکھی نہیں ہے مگر جو اسنذر کی اسپیچ جو چھاپی ہے پہلے صدر سالک کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنا (محاورہ کیا ہے؟ پیار لینا؟ لیکن "سالک کو پیار لینا" مجھے حق سا معلوم ہوتا ہے۔ سالک سے پیار لینا کچھ کاروباری معاہدہ معلوم ہوتا ہے خیر)

میرے ذمے منشی صاحب کے کچھ روپے نکلتے ہیں۔ تین یا شاید چار۔ آتی دفعہ ان کے لئے چاکلیٹ کا ایک ڈبہ خرید لاؤں گا اور کیا کر سکتا ہوں۔ حفیظ صاحب کی نظمیں وغیرہ یہ بہت یاد آئیں۔ مثلاً کشتی میں سوار ہو کر میں "گنگنا رہا ہے سلمیٰ" گنگنایا۔

قبلہ مولوی صاحب اور برادر مکرم حمید علی صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیجئے۔ گوجرانوالہ بابو، تاثیر صاحب، اختر صاحب.... اور منشی رشید الدین کو نیاز۔

حکیم یوسف حسن سے کہیئے نیرنگ خیال خدا کے لئے بھجوا دیجئے۔ معلوم ابھی تک تہذیب کیوں نہیں چھپا۔ حکیم احمد شجاع کو میرا سلام پہنچا دیجئے اور کہیئے کہ یہاں لندن میں ایک ہندوستانی تھیٹر کی سخت ضرورت ہے۔ کچھ اس کے متعلق بھی غور فرمائیں۔

تاثیر صاحب کو سلام۔ باقی جو نعمت خیر ہے، اس سے کہیئے تمہارے لئے تمہیں سلام بھیجا ہے۔ آئندہ میں ایک نہر سے نہانے کا کوچہ چھوڑتا ہوں۔ اس کی ہزار دو ہزار کاپیاں چھپواؤں گا۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(۳)

امتیاز بھائی! غالباً میں نے تمہیں آخری خط لندن سے لکھا تھا۔ بجز اس ایک کاروباری خط کے جو کیمبرج سے اس کے بعد بھیجا اس وقت دل کی کیفیت یہ تھی کہ انگلستان میں نو وارد تھا۔ ہر ایک چیز کو بظاہر متانت سے دیکھتا تھا لیکن اندر ہی اندر گنواروں کی مانند متحیر اور بھونچکا سا ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کئے دیتی تھیں اور لباس، اخلاق، انگریزوں کی اور خصوصاً کیمبرج کی روزمرہ مجھ میں نہ آتی تھی سیکھنے کا بے حد مشتاق تھا لیکن کوئی سکھانے والا نہ ملتا تھا۔ سوائے ان چند ہندوستانیوں کے جو پرانے واقف تھے اور جن کو انگلستان میں آئے ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن ان کے رویے میں ایک تصنع، ایک رعونت، ایک سطحی پن، ایک "گھر کھلاہٹ" پائی جاتی تھی جس سے میں گویا بھاگتا ہوں۔

اب یہ حالت ہے کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں کی زندگی اختیار کی ہے اس پر میں خود حیران ہوں۔ ہندوستانیوں سے رفتہ رفتہ قطع تعلق ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج کسی ہندوستانی سے بات کئے چند مہینے ہو گئے ہیں۔ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور گزر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جا رہا ہے۔ دل و دماغ نے اپنے لئے ایک معیار اختیار کر لیا ہے اور ہر سرگرمی اس معیار پر پورا اترنے کے لئے وقف ہے۔

جب میں کیمبرج میں پہنچا تو تمام کالج بند تھے۔ بازار بے رونق اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں میں نے چھوٹی چھوٹی ضروریات بہم پہنچائیں اور کیمبرج کے گرد و نواح سے خوب اچھی طرح واقف ہو گیا۔ جب کالج کھلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دائیں بائیں اور ہر طرف بند دروازے یکلخت کھل گئے۔ جن میں سے ہجوم کے ہجوم کالے کالے گاؤن پہنے تمام شہر پر چھا گئے۔ اور دوڑتے گاؤن، ہنستا ہوا چہرہ، پہلا نے گاگس گاؤن کیا کالے، چیتھڑے، بے پروائی۔ چہرے پر ایک تیزی۔ استادہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دھن

بیٹھے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی نے سانس کیا لیا ایک چھینک سی دی جس سے کیمبرج بھر میں ایک لرزہ سا آ گیا جیسے کسی گھڑی ساز کی دکان میں سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں۔ اس بھونچال میں میں بھی ایک طرف کو دبے دبے چلا جا رہا تھا۔ سینے میں ایک عجب متحرک دھڑکن تھی اور دل پہ ایک ایسی حیرانی چھائی تھی یا الٰہی اب کیا ہوگا۔ یہ تو دنیا ہی نرالی ہے اور میں بے یار و مددگار، نہ ہم سخن نہ ہم نوا، گھر سے کوسوں دور، بجز اپنے دل کی تقویت کے کوئی سہارا نہیں۔ ہفتے کے ہفتے گھر سے خط آتا تو اپنی تنہائی کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے لگ جاتا۔

جب لیکچر شروع ہوئے تو اس مایوسی نے کشمکش کی صورت اختیار کر لی وہ یوں کہ بعض لیکچروں میں تو قویٰ میں ایک حرکت اور خیالات میں پرواز محسوس ہونے لگی۔ اور بعض لیکچروں میں یہ حالت تھی کہ ٹکٹکی لگائے بیٹھا ہوں، پنسل ہاتھ میں ہے۔ آنکھیں لیکچرار کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ ماتھے پر تیوری ہے۔ ہمہ تن گوش ہوں۔ ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا ہوں اور ہر فقرے کو دل میں دہراتا ہوں لیکن وقت گزر جاتا ہے اور دماغ کسی چیز پر قابو نہیں پاتا۔ کچھ لکھنے لگتا ہوں لیکن نہیں لکھ سکتا۔ خیالات میں ایک گتھی سی ہے جس میں کچھ معنی نہیں ڈال سکتا۔ ایسے لیکچر کے خاتمے پر مجھ سا دل شکستہ، بیکار انسان کیمبرج بھر میں نہ ہوتا ہوگا۔ اپنی کم مائیگی پر بے انتہا نادم، زندگی کے جو سال ہندوستان میں ضائع کئے ان کا پچھتاوا، دل میں غضبناک سے نئے ارادے، نخوتِ علم کو شدید صدمہ۔ غصہ اور رنج، خطا اور ننگ، سر جھکا ہوا، ایک نیم مردہ، مایوس انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھائے لائبریری کی طرف جا رہا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو ہندوستان جنت نشان میں انگریزی کا ماہر، منطق و عربی میں لامحدود قابلیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ دھوکا، امتیاز سب دھوکا، اسے میرے بچپن کے رفیق سے لے کر تا ہم عصر سب نے دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک تپسوی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اپنے آپ کو یونیورسٹی لائبریری کے ایک کونے میں گم کر دیا۔ اس فقرے کے صحیح معنی جب تمہاری سمجھ میں آئیں گے جب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ لندن کے عجائب خانہ کی لائبریری کی طرح یہاں کی لائبریری کی بھی روایت ہے جو کتاب چھپے اس کی ایک کاپی کی حقدار ہے۔ اس کتب خانے میں وہاں ہاتھ پاؤں مارے جیسے کوئی رودبار انگلستان کو تیر کر عبور کرنے کی کوشش کرے۔ غرضیکہ ایک تلاطم مچا ہوا تھا۔ ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ چاہتا تھا کہ چاسر سے لے کر ٹامس ہارڈی تک شعر و سخن کی تمام دنیا پر ایک بجلی سی چمکے اور روشن تصویر پوری کی پوری ایک لمحے کے اندر میرے دل پر نقش ہو جائے لیکن یہ کیونکر ممکن تھا۔ چنانچہ دیوانگی نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ کیمبرج کے طوفان نے میرے قدم کہیں بھی نہ جمنے دیئے اور علوم و فنون کے اس سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

اس کے بعد مجھے کیا پیش آیا؟ اس کے متعلق مجھے یہاں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا پڑے گا۔

یہاں کے کالجوں کی تعداد چودہ پندرہ کے قریب ہے۔ ہر کالج کا انگریزی لیکچرار لٹریچر کے ایک خاص موضوع پر لیکچر دیتا ہے اکثر ہفتے میں ایک دفعہ اور بعض اوقات ہفتے میں دو دفعہ۔

بعض کالجوں میں انگریزی کے دو تین لیکچرار ہیں اور بعض لیکچرار ایک سے زیادہ موضوع پر لیکچر دیتے ہیں۔ اس طرح انگریزی لٹریچر یونیورسٹی بھر میں ایک ہفتے کے اندر تیس پینتیس لیکچر ہوتے ہیں۔ ہر کالج میں ایک لیکچرار انگریزی کا انچارج ہوتا ہے جس کو ڈائرکٹر یا اوورسیر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

نورمحل ——— ۴۰ ——— پرانی قبر

جب کہ سفر ختم ہونے والا تھا ایک بار طالب علم اپنے کالج کے اندر میرے پاس آئے جب ہماری ملاقات [illegible]
کے اندر میرے کمرے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ڈ[illegible] کے مطالعے میں مشغول تھے۔ کتب خانے میں تم [illegible] کہا کہ [illegible]
کہ تم آپ کی کتابوں کی الماریوں میں گھرا ہوا پایا ایک ادیب پروفیسر بینیٹ (BENNET) صاحب مسٹر جیمز شیکسپیر کے ماہر ہیں اور
جاسوس کے ناول پبلک قال [illegible] تصنیف (THE PASTORSBEE) کے [illegible] کے بعد انہوں نے [illegible]
شروع کر دی گفتگو بہت جلد قسم قسم کے موضوعات پر اور زیادہ تر ہندوستان، اردو شعر، مشرقی ادب، ہندو پارسی، غالب، قرۃ العین، جگر
[illegible] اقبال، ٹیگور، برنارڈ شا، کپلنگ اور جدید ادب کے متعلق ان کا علم کہیں زیادہ تھا جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہوتا تھا۔
بہرحال ان کی باتوں سے تو ہم نے بھی دل کھول کر مزے لیے اور اب اوقات داستان کو زینت دینے کے سبب سے ذرا اعتراف
کر کیا محض حسب دستور [illegible] لیکن عام لوگ [illegible] حق پرست انسان کا اعتقاد ہے اور اپنی قوم کی کمزوریوں سے بھی طرح
واقف ہے جو باوجود قوم انگلش کے گوناگوں احسانات سے باخبر ہونے کے انہیں ایشیائی تہذیب کے لئے کچھ مفید سمجھتا ہے اور جب
تحصیل علم کی خاطر یہاں کے مشاہیر کے قدموں میں بیٹھے کی بات سے مدد خود تصور کرتا ہے۔
جناب کچھ مسکرائے۔ ایشیائی تہذیب اور تاریخ اسلام سے بہت دلچسپی ظاہر کی۔ میرے انگریزی ادب کی بہت عادتوں کی تعریف
[illegible] کرتے رہے جیسے میں الف لیلہ کا کوئی اکیر کردار ہوں لیکن افسوس کہ تھوڑی ہی دیر بعد گفتگو نے انگریزی ادب کی طرف رخ کیا جب میں نے اپنے
عجز اور کم مائیگی کا اعتراف کیا۔ اپنی نالائقی کو کوسا۔ اپنی جہالت کے متعلق ایک بلیغ تقریر کی اور جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا علاج
کیا ہے؟
جو کچھ انہوں نے جواب میں کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ تم بالکل چند روز اگر تم یہ توقع کرتے ہو کہ تمہیں ہر چیز کچھ ہی آ جائے تو
تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر جیمس ر [illegible] کے مجموعوں کے متعلق ترتیب کی ہو وہ کیمبرج میں کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتے اور کوئی بھی اس قدر گدھا
نہیں ہوتا کہ چاسر سے لے کر ہارڈی تک سب انگریزی لٹریچر کی ایک گولی بنا کر نگل جانا چاہے۔ جو مصنف تمہیں پسند ہیں صرف انہی کی تصنیف
تمہارے دل و دماغ میں ایک خوشگوار ہیجان پیدا کرتی ہیں صرف وہی پڑھو صرف انہی کے متعلق مجموعوں میں جاؤ باقی بالکل چھوڑ دو۔
چنانچہ یہ رہی مجموعوں کی فہرست فلاں فلاں مجموعوں میں جاؤ۔ ان کے متعلق اس قدر معروف ہو دو کتابیں پڑھو اگلے ہفتے اس کے بعد
ہر ہفتے مجھ سے اسی وقت ملو۔ جو وقت تمہیں پسند ہو بالکل وہی اوقات ہیں کسی وقت مجھ سے مل کر بیان کرو۔ یہ کتابیں مجھ سے مستعار لے
جاؤ۔ ہاں اگر میرے ساتھ چلو تو میری بیوی تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ رہتے کہاں ہو؟ کسی وقت اگر مجھ سے ملنا ہو جب لندن میں
جاکر پروفیسر [illegible] تو بعد میں مجھے اگر ملاقات کے متعلق حال سنانا۔ کوئی تکلیف کیسے ہو؟ نہیں کوئی [illegible] قیام کوئی ملا؟ خوب کبھی ہمیں بھی
[illegible] سنانا۔ تمہارے [illegible] کا وقت قریب آ رہا ہے میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں اور حیران ہوں کہ تم لوگ ہندوستان میں رہ کر اتنی انگریزی
کیسے سیکھ لیتے ہو۔ ہندوستانی کہاں ہیں؟ راستہ تو نہیں بھول جاؤ گے؟ میں تمہارے ساتھ چلوں؟ نہیں۔ اچھا خدا حافظ خوش رہو اور
جب کبھی کسی قسم کی تکلیف ہو فوراً میرے پاس آ جایا کرو۔
میں نے اطمینان کا سانس لیا اور واپسی پر تمام راستے مسکراتا آیا۔
پھر تو بارہ ہفتے [illegible] اور جیسے ہی دن گزرتے گئے زندگی خوشگوار ہوتی گئی۔ آخر [illegible]

ملک صاحب دل ... واقفیت سے دوستی اور دوستی سے بے تکلفی کی نوبت آئی۔ آپ آدھ غفرت سے مجسمہ طور و صحبے کی علامت بنے گئے ہیں ۔ —

لیکن وہ ہندوستانیوں کی صحبتیں کہاں، وہ خوش گفتاری، وہ شعر بازی، وہ بیتیں، وہ دعوتیں، وہ سنانا، وقت بے وقت گھر آنا، لطیفے اور محفلیں، وہ پٹیل کی مجلسیں، وہ دارالاشاعت کے جلسے۔ ہنسنے ہنسانے کے ایک ایک ... اشتی ہے پطرس بخاری کی خوش طبعیاں، ... کی چلبلی، میرے سالک کی مذہبی لن ترانیاں (اللہ ان دونوں بزرگوں ... کو ... رکھے) وہ حفیظ کی شعر خوانی ... کی ...)

خیر ان باتوں کو دو سال کے لیے بھلانا پڑے گا۔ اب تو زندگی کا یہ ڈھنگ ہے کہ کالج کے ہاسٹل میں دو کمرے ملے ہوئے ہیں۔ ایک بیٹھنے کو، ایک سونے کو۔ دن کو جگہوں میں مرغن ماکولات کا کھانا اکٹھا کھایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاسٹل میں یہ دستور ہے کہ ہاسٹل کے رہنے والے طالب علموں کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔ ناشتہ اور لنچ کامن روم میں منگا کے کھاتے ہیں اور شام کا کھانا سب کالج کے طلبا اور اساتذہ کے ساتھ کالج کے ہال میں ہوتا ہے۔ جانے کا اکثر یہ حال ہے کہ یہاں کہیں مدعو ہوں یا کوئی میرے ہاں آیا ہو۔

صبح کے وقت ڈریسنگ گاؤن، پاجامہ، سلیپر اور تولیے غسل خانے سے آتے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غسل خانے کے اندر سب ننگے ہو کر بغیر کسی شرم و حیا کے ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں۔ پھر کامن روم میں حاضری۔ نو بجے کے بعد سب گاؤن پہنے ہوئے پیدل اور بائیسکلوں پر بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ ایک ٹوکری لگی ہوتی ہے جس میں کتابیں وغیرہ ڈال لیتے ہیں۔ نو بجے سے ایک بجے تک لیکچروں کے اوقات ہوتے ہیں۔ اس دوران میں کیمبرج کا نظارہ تین عناصر سے مرکب ہوتا ہے۔ (۱) گاؤن (۲) نوٹ بک (۳) جلدی۔ دس بجے ایک لیکچر اس کالج میں ختم ہوا۔ اور دس بجے دوسرا لیکچر دوسرے کالج میں شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ اب اوقات بازاروں میں سب بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانا پڑتا ہے۔ لیکچرار ہر قسم کے ہیں۔ ایک مسٹر ہیٹ ہیں۔ ... جوانی میں بہت ہی خوبصورت ہوں گے۔ شیکسپیئر اور زمانہ وسطیٰ کے لٹریچر پر لیکچر دیتے ہیں۔ اس انہماک، اس جوش، اس فصاحت، اس بلاغت کے ساتھ کہ اکثر کلاس دو دو منٹ تک تالیاں دیتی رہتی ہے (جس کا طریقہ یہ ہے کہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے ہیں) ایک مسٹر ٹل یارڈ (TILL YARD) ہیں جو ملٹن پڑھاتے ہیں اور اس کے علاوہ تاریخ تنقید پر بھی لیکچر دیتے ہیں۔ لیکن جس موضوع پر بولتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی ... ایک مسٹر لوکس (LUCAS) ہیں۔ لیکچر کیا ہیں فقرے، اعلیٰ درجے کا تفنن، غضب کی تشبیہیں۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان پر ختم ہے۔ مطلب کی بات بہت کم کہتے ہیں ... لیکن مجھے ان کے مضمون کا ذوق نہیں ... ایک ڈاکٹر لیوس (LEWIS) ہیں۔ نوجوان لیکن L. L. D کی ڈگری کے مالک۔ اور جدید ادب ان کا خاص مضمون ہے۔ تنقید کی بنیاد دقیق نفسیات پر رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے موجودہ مصنفوں کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔ (ان میں بے چارے ... بھی شامل ہے) لیکن اپنے موضوع میں اس قدر منہمک ہو گئے ہیں کہ جنسی مذاق کی بات ان کے ہونٹوں پر آتی ہی نہیں۔ جو شخص ان کے لیکچر میں دو فقرے بھی اچھی طرح سمجھ لے یقین ہے کہ دو تین سال کے بعد انگلستان کے بہترین نقادوں میں شمار ہوگا۔ لیکچر ہے کہ دو فقرے!

... ان کے پاس بھی بیٹھتے ہیں۔ وہ خود اپنا جواب مضمون دکھلانے جیسا ... بے چارے ... کے ساتھ بہت بحث کرتے ... ہیں اور جس ... پر ... ہوا ... کہ ... شاید کبھی ... ہو سکے

میں انگلستان آ کر قطعی نا ممکن ہے۔ لہٰذا گاؤں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔ بہت کچھ۔ لیکن ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ اتنا قیمتی احساس بہت سا
اٹھا جاؤں؟ بہت دیر تک جم کر پڑا رہتا ہے۔

اور ان سب سے بڑھ کر پروفیسر آرتھر کوئلر کوچ (ARTHUR QUILLER COUCH) ان کے علاوہ تو تم واقف ہو گے
اگر نہیں تو تمہاری جہالت کی انتہا نہیں ہے۔ کیمبرج میں ہر کوئی ان کو Q کے نام سے جانتا ہے۔ نزلہ کی خرابی کی وجہ سے باہر کم نکلتے ہیں
اور باقاعدہ لیکچر بھی نہیں دیتے۔ صرف ہفتے میں ایک بار کلاس لیتے ہیں۔ بدھ کے دن شام کے ساڑھے آٹھ بجے ان کی کلاس ہوتی ہے
جس میں ہم پچاس ساٹھ آدمیوں کو ارسطو کی POETICS پڑھاتے ہیں۔ کلاس کا حال سنو۔ ایک بڑا سا کمرہ ہے جس کو ... سمجھ لو
ہو۔ بیس پچیس کرسیاں، آتشدان میں آگ خوب جل رہی ہے۔ بیچ میں ایک بڑی میز ہے جس پر پچاس ساٹھ پرچ پیالے پڑے ہیں۔ ساڑھے آٹھ
بجے سے لوگ آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو پہلے آتے ہیں وہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ باقی فرش پر آتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ساڑھے آٹھ بجے دروازہ کھلتا ہے اور آپ داخل ہوتے ہیں۔ سر اور مختصری مونچھوں کے بال سفید، خمیدہ قامت، ہاتھ میں
لئے ہنستے چہرہ پر مسکراہٹ۔ مسکراہٹ بھی شرابیوں کی سی اور آنکھیں بھی بہت ہیں۔ سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل کھول کر باتیں
بیگموں میں کمرے ہوئے کا ... نہیں۔ Q کے پیچھے پیچھے ایک ملازم طشت میں کافی لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ سب لوگ میز کے گرد جمع
ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک کافی کا پیالہ اٹھا کر اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے اور سگریٹ یا پائپ سلگا لیتا ہے۔ پروفیسر صاحب کسی طالب علم کو
پڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ وہ ایک آدھ پیراگراف پڑھتا ہے اور پھر Q صاحب اس پر بحث کرتے ہیں۔ جس میں دنیا جہان کی باتیں بیان کر
جاتے ہیں۔ شیلی وغیرہ خوب نقادوں کی بحث بھی ہوتی ہے۔ کلاس کیا ہے مذاق اور دوست نت۔ علم و عمل کی ایک نعمت ہے جس
سے دل کبھی سیر نہیں ہوتا۔ خود پروفیسر Q کی شخصیت کا میں تمہیں اس سے بہتر اندازہ نہیں دے سکتا کہ ان کو ایک طبیعت کا نمونہ ان
الفاظ میں لکھوں کہ شبلی، غالب، حالی، آزاد اور ... کو ملا کر اگر انگریزی بنا دو اور پھر سے ضرب دے دو۔ انگریزی پڑھانے والوں میں سے
لٹریچر کے شعبے میں صرف یہی ایک بزرگ ہیں جو پروفیسر کے لقب سے ملقب ہیں۔ لہٰذا تم ان کے تبحر کا اندازہ خود ہی لگا لو۔

دوپہر کے ایک بجے لیکچر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دو بجے تک لنچ اور دو بجے سے چار بجے تک۔ تمام طلبہ ملک ... ایک
کھیل کھیلنے جاتے ہیں۔ چار بجے شام ہو جاتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ آگ جلائی جاتی ہے اور
اس پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا جاتا ہے۔ چائے کے بعد ... یہاں کی اصطلاح میں اہل شام کے کرنے کو کہتے ہیں چاہو تو ایک
آدھ گھنٹہ مطالعہ کرو، چاہو تو کسی کا وقت ضائع کر آؤ۔ اس کے بعد کافی کے لئے آگ پر پانی رکھ دو اور جب تک دل چاہے پڑھتے رہو۔ جاڑے
بے شک کالج سے باہر نکل دو اور اگر بہت ہی بد تمیز دوستوں سے واسطہ پڑا ہے تو دروازہ کو اندر سے تالا لگا کر بیٹھو رہو ... کو ...
غلط فہمیوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے دوستوں کو اس کے صحیح معنی سمجھنے کی عادت ڈالو۔)

یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں یہ سب کالج راہب خانے تھے چنانچہ یہاں کی زندگی پر مذہبی رنگ بہت نمایاں ہے
ہر کالج سے متعلق ایک گرجا ہے اور اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بہت سے گرجے ہیں جن کے گھنٹے یہاں کی فضا کو ہر وقت سمیعت میں
بسائے رکھتے ہیں۔ سب سے زیادہ کالج کسی نہ کسی گرجے میں ایک نہ ایک مشہور پادری یا واعظ ہیں۔ کنگز کالج کا گرجا ہے کیمبرج کا شہر
بہت چھوٹا سا ہے۔ اور یہاں کی آبادی خاص طور پر دو حصوں میں منقسم ہو تی ہے۔ ایک تو وہ لوگ جو یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور دوسرے ...

کا شروع ہوتے ہی یک لخت غائب ہو جاتے ہیں ان کو GOWN MAN کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر شہر کے اصلی باشندے ہیں وہ سب کے سب دوکاندار پیشہ یا مزدور پیشہ ہیں۔ ان کو TOWNS MAN اور طلباء کی اصطلاح میں ناؤنی کہا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ نچلے طبقے کے ہوتے ہیں۔ کیمبرج میں کالج کی حدود کے باہر شرفا مفقود ہیں۔

انڈر گریجویٹ UNDER GRADE لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگرچہ یوں پانی میں رہتے ہیں خصوصاً ٹوپی پہننا گناہ سمجھتے ہیں۔ ٹیل کوٹ اور ملاحوں کی پتلون یہاں کا لباس ہے۔ پتلون پر بڑے بڑے رنگ سیاہی کے داغ۔ گون کی بے حرمتی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جان بوجھ کر اس میں جابجا سوراخ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ پرانے معلوم ہوں۔ ان کے مشاغل کی کثرت کا کچھ نہ پوچھو۔ قسم قسم کے جنون ہیں۔ پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی ایک کلب بنا لیتے ہیں جس میں جغرافیہ تک ہوتا ہے۔ مچھلیاں پکڑتے، گولف کھیلتے ہیں۔ کشتیاں چلاتے ہیں۔ طرح طرح کے ساز بجاتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ گرجاؤں میں۔ جلدوں کا کام سیکھتے ہیں۔ تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض روسا بہت اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہنتے ہیں۔ بعض کسی سیاسی کلب کے ممبر ہیں جہاں ہمیشہ کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کے لیکچر ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ایک پیانو کرایہ پر لے آتے ہیں۔ بعض نے دو موٹر کاریں رکھی ہوئی ہیں اور کسی موٹر کار کلب کے ممبر ہیں جس کے نمائندے دنیا کی ہر بڑی سڑک پر مل جاتے ہیں۔ بعض کی زندگی گھوڑ دوڑ کے لئے وقف ہے۔ بعض صبح سے شام تک لیبارٹری میں بجار جھونکتے ہیں۔ ڈرامیٹک کلبیں بے شمار ہیں۔ بعض صرف اوپیرا اور میوزیکل کامیڈی کرتے ہیں۔ بعض صرف یونانی کھیل۔ بعض سیدھی سادی کامیڈی۔ سینری، ڈریس وغیرہ سب خود بناتے ہیں۔ یا کم از کم وضع کرتے ہیں۔ غرضیکہ ایک تعلیمی میلہ ہے جس میں جو کام ہوتا ہے آئین کے ساتھ۔ انہماک و انضباط، یہاں کے دو بڑے اصول ہیں۔ اور ان سب کی تہہ میں وہ حیرت انگیز طاقت کارکردہی ہے جس کو TRADITION کہتے ہیں۔ ہفتہ بھر پسینہ بہا دینے والی مصروفیت میں گزرتا ہے۔ دن کو بھاگتی ہوئی ٹانگیں۔ رات کو بند کمرے، روشن چراغ اور کھلی ہوئی کتابیں۔ اتوار کے دن کیمبرج کی سب آبادی، سب مصروفیت، سب چہل پہل خدا جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ اتوار یہاں کی ایک معجزہ ہے۔ دن کے گیارہ بجے میلوں گھوم جاؤ۔ ایک درجن سے زیادہ آدمی نہ پاؤ گے۔ وہ بھی سیاہ پوش سست رفتار، سوائے گرجاؤں کے گھنٹوں کے اور زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ بازاروں کو دیکھو تو ہو کا عالم۔ آہیں بھرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ شام کے وقت دن کی کسر پوری کر دی جاتی ہے اور مردوں کے جوڑے ہزاروں کی تعداد میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکثر قبل ازدواج کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور یہ وہ شغل ہے جو انگلستان میں شادی سے پہلے بھی جائز ہے اور شادی کے بعد بھی۔ شادی کا ارادہ نہ ہو جب بھی۔ حق تو یہ ہے کہ اسے شادی سے کچھ چنداں تعلق نہیں اور چونکہ کیمبرج کے لوگ تمام تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے قبیح ترین پہلو بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

کیمبرج آکسفورڈ کی بہ نسبت بہت زیادہ قدامت پرست ہے۔ چنانچہ گو یہاں لڑکیوں کے دو کالج ہیں لیکن وہاں کی طالبات نہ تو یونیورسٹی کی ممبر شمار کی جاتی ہیں نہ کسی ڈگری کی حقدار۔ البتہ لیکچروں میں آتی ہیں اور امتحانوں میں بیٹھ سکتی ہیں لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو ڈگری نہیں ملتی۔ باوجود اس کے انگریزی کی کلاس میں پچاس ساٹھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اگر اتفاق سے لیکچر میں کوئی ساتھ بیٹھ جائے تو شامت آ جاتی ہے۔ ہم لوگ ایک نوٹ بک کھول کر نوٹ لینا شروع کر دیتے ہیں اور

زیادہ سے زیادہ میز کا ایک مربع فٹ استعمال کرتے ہیں۔ وہ پہلے تو گلے سے اونی گلوبند کھول کر میز پر رکھتے ہیں۔ پھر دستانے اتار کر رکھتے ہیں۔ پھر کوٹ اتار کر ہیٹ کی پشت پر پھیلاتے ہیں۔ دستانوں کے پاس ٹوپی اتار کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے پنسل اور رومال نکالتے ہیں۔ رومال سے ناک پونچھتے ہیں۔ ہینڈ بیگ کے بھر نے سے ۲ بجے تک اپنے چہرے کا جائزہ لیا ایک چھوٹے سے آئینے میں۔ کنگھی سنوارتے ہیں۔ پھر کچھ جھک کر کمپنی کو پڑوسی کی ناک میں سے کر بہت خوبصورتی کے ساتھ نوٹ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ دس منٹ کے بعد ان کے قلم میں سیاہی ختم ہو جاتی ہے۔ فرماتے کہ آپ اپنا قلم یا پنسل پیش کیجئے اور خود گھنٹہ بھر مکھیاں مارتے رہیئے۔ ایک ایسے تلخ تجربے کے بعد اب میں ایک فالتو پنسل ضرور رکھتا ہوں۔

یہ حقیقت کیمبرج یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا ہر ذرہ پتھر تاریخ انگلیس کی ایک خاموش نسل ہے۔ یہ وہ جا معہ ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ جس نے امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی، آلیورکرام ویل CROM WALL، سٹرن STERENE کورج کیمونیل۔ بنزا بیکن۔ جیمی سن۔ تھیکرے، میکالے۔ نیوٹن۔ بل ورمیش۔ پیٹے۔ ورڈزورتھ۔ وارا ولیم پٹ۔ گرے اور ملٹن کسب فیض کر چکے ہیں۔ اور جہاں انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر اس وقت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس چمنستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا بے رنگ پھول کیا حقیقت رکھتا ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا، ایک غلام قوم کا فرد، انیس اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا، فن ناز ادا کا دلدادہ۔ جلسے اور سازکی شوقین۔ "زمیندار اور گلستان" کا خریدار۔ ایشیا کے عشق و افسانوں میں رچا ہوا عظیم عیش و عشرت کا خواہشمند۔ اتحاد اسلامی کے خواب دیکھنے والا۔ میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں۔ خدا ابد سے رکھے اور ابد سے وطن کو واپس لے جائے۔ آپ میرے لئے بھی دعا کیجئے۔

دو سال کے بعد "میرے مولا بلا لے مدینے مجھے" (دعا کرو)

اس دوران میں ایک دو دفعہ لندن بھی گیا۔ گلیڈسٹن کیئر اور جیرالڈ . . . . کو ایکٹ کرتے دیکھا۔ لیکن تھیٹروں کے متعلق پھر کسی خط میں لکھوں گا۔ ایک دن پورا ڈیڑھ گھنٹہ کے ساتھ گذار اسلامی کی حیثیت میں پروفیسر جونز اور یونیورسٹی کالج کے ساتھ سے دن بھر اور دو پشتو اور پنجابی کی اصوات کے متعلق نہایت تپاک سے ملا۔ انھوں نے میرے حروف تہجی کو سراہا میں نے ان کی قرأت کو سراہا۔ بعض اصوات کے متعلق کچھ تیز بحث ہوئی کہ حلق کے کون کون سے کونے میں سے نکلتی ہیں بہت بحث ہاتھا پائی کی نوبت آنے لگی لیکن آخر میں صلح صفائی ہو گئی۔

ایک دن لندن سے ہاشمی کا خط آیا۔ "ارے تم! ارے میں! افوہ" اس قسم کے جذبات کے اظہار کے بعد جناب نے دریافت کیا تھا کہ کسی دن شام کے سات بجے کے بعد فلاں پتہ پر مہربانی کر کے حضرت یہ کچھ بیٹھے تو کرنے لندن میں دن خط میں سے قرب کا موقع بھیجا تھا۔ ہم نے انھیں جواب میں لکھا۔ "بے شک بہت ہم جیسے نہ تو کہ لندن سے گیا واسطہ۔ ارے تم کیمبرج آؤ یہاں کیمبرج میں بیٹھا ہے۔ ہم سے پوچھا چنانچہ ایک دن شام کے تین بجے کے قریب آپ وارد ہوتے۔ "ارے یار بخاری" "ارے ہاشمی"

دونوں کھلکھلا کر بغلگیر ہوئے اور شام تک بغیر ایک دوسرے کی بات سننے کے دونوں ایک ساتھ بکتے چلے گئے کبھی ہم الگ جاتے، کبھی شعر پڑھنے لگ جاتے، غرضیکہ عجب ہنگامہ تھا۔ عجب عجب قصے دہرائے گئے۔ ہندوستان کی حالت زار پر بہت افسوس کیا گیا۔ اور آپ سب لوگوں کے انگلستان آنے پر محرومی، لعنت و نفرین کے ووٹ پاس کئے گئے۔ شام کی گاڑی سے وہ لندن چلے گئے اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئے ہیں۔ تم پوچھو گے ہاشمی کا کیا حال ہے؟ پطرس بالکل وہی چیز ہے بالکل وہی۔

اس ہفتے کی ڈاک میں تمہارا خط، ہر لیفٹیں کا خط، زبیدہ کا خط، بچوں کی تصویریں سب ایک ساتھ ملیں۔ یعنی ہندوستان سے جو کچھ مجھے عزیز ہیں اور عزیز ترین ہے وہ یک لخت چھپٹ چھپاڑ کر میرے سر پر آ گرا۔ جگل کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ ان کی غزل نے مجھے ممنون و مسرور کیا۔ جگل میرے بھائی اور حفیظ میرے بھائی اور امتیاز میرے بھائی اور سالک میرے بھائی خط ضرور لکھتے رہا کرو۔ تم سب لوگ باری باری بھی خط لکھو تو ہر ہفتے مجھے اپنے احباب کی ایک جیتی جاگتی تصویر مل جایا کرے اور تم میں سے ہر ایک کو مہینے میں ایک دفعہ خط لکھنا پڑے۔ اور میرے بھائیو تم خود ہی سوچو کہ مجھے ہر ہفتے ایک خط والد کو۔ ایک خط ڈپٹی صاحب کو، ایک خط اپنی رفیق حیات کو، ایک رفعت صاحبہ کو لکھنا ہوتا ہے۔ اے میرے بھائیو! میں تم سے ہر ایک کو ہر ہفتے کیسے خط لکھ سکتا ہوں (میری آمدنی اس وقت بگڑی ہوئی ہے) لہٰذا اے میرے بھائیو! اسلامی اخوت کا ثبوت دو اور خط لکھو۔

میں نے اس اپیل کو بہت رقت انگیز بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ دفتر اشاعت میں اس کی ہنسی اڑائی جائے گی۔ اور میرے جذبات کو فاتحانہ مجروح کرنے کی از حد سعی کی جائے گی۔ فلک حقہ باز کو کیا کہوں؟

سالک صاحب! استاذی و محبی! خدا کے لئے خط لکھو۔ جگل کے خط نے تڑپا تڑپا دیا۔ خدا اسے خوش رکھے۔

خاکسار بخاری
عمانوئیل کالج کیمبرج

۵ نومبر ۱۹۲۶ء

میکسیکو کے کوچہ و بازار

پروفیسر احمد شاہ بخاری جب ۱۹۴۷ء کی یونیسکو جنرل کانفرنس میکسیکو میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو آنریبل خواجہ شہاب الدین منسٹر داخلہ کے نام حسب ذیل خط بھیجا۔

مکرمی و مشفقی، سلام مسنون

ڈان کے ایک تازہ نمبر میں یہ خبر پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی کہ کراچی میں بازاروں اور سڑکوں کے نام مشاہیر قوم کے نام پر رکھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں میکسیکو کے بعض طور طریقے انوکھے ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان کا مختصر حال لکھ بھیجتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی بات آپ کے کام کی نکل آئے۔

جہاں تک میری سمجھ میں آیا۔ یہاں کسی بازار یا سڑک کا نام کسی زندہ شخص سے منسوب نہیں۔ ہمارے لاہور کی طرح نہیں کہ جو شخص دو تین سال کے لئے میونسپل کمشنر ہوا، وہ کسی نہ کسی سڑک کو اپنے نام سے موسوم کر گیا۔ چنانچہ لاہور میں کئی سڑکوں اور محلوں کے نام اب ایسے ہیں کہ کسی کو یاد بھی نہیں کہ کن کے نام منسوب ہوئے تھے اور اگر وہ اب تک زندہ ہیں تو سب کے سب گمنام یا بدنام ہو چکے ہیں۔ میکسیکو کی تاریخ یہ ہے۔ تین سو سال تک یہاں ہسپانوی حکومت رہی۔ اور لوگوں کا خون چوسا۔ ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ اس ملک نے بزور شمشیر آزادی حاصل کی۔ اس کے تقریباً سوا سو سال تک خانہ جنگی رہی۔ جس میں بڑے بڑے لٹیرے اور بڑے بڑے اولوالعزم محب وطن دونوں قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں ایک انقلاب عظیم ڈکٹیٹری کے خلاف برپا ہوا جو کئی سال تک رہا اور جس میں میکسیکو کے بیشتر زعما مارے گئے۔ اس سو دو سو سال کی تاریخ میں کئی محبان وطن اور مشاہیر قوم پیدا ہوئے اور اکثر قوم کی راہ میں شہید ہوئے یعنی قوم کے دشمنوں یا غداروں یا کرائے کے قاتلوں اور اہل حرص کی گولی یا تلوار کا نشانہ بنے۔ ان سب کے نام آج بازاروں کی زینت ہیں۔ محض ناموں ہی سے میکسیکو کے قومی عروج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ تین نام تو بالخصوص جا بجا ملتے ہیں۔

ایدالگو (HIDALGO) موریلاس (MORELOS) جواریز۔ ان میں سے دو مشاہیر نے ۱۸۱۰ء میں ہسپانیہ کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا۔ تیسرا انیسویں صدی کے وسط میں میکسیکو کا پریذیڈنٹ تھا۔ اس نے نیا کانسٹی ٹیوشن ۱۸۵۷ء میں بنایا تھا اور کئی اصلاحات مرتب کی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر شہید پریذیڈنٹ کا نام کسی نہ کسی بازار پر ثبت ہے۔ اس کے علاوہ ایک ادا ان کی مجھے بہت پسند آئی۔ وہ یہ کہ کئی بازاروں کے نام اس قوم کی اہم تاریخوں سے منسوب ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا پیرس میں بھی ایک مشہور بازار کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ یہاں یہ رسم عام ہے۔ ہر بڑے شہر میں ایک نہ ایک بازار کا نام "۵ مئی" ضرور ہوگا۔ اس تاریخ کو میکسیکو کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ ایدالگو (HIDALGO) نے آزادی کا اعلان ۱۶ ستمبر ۱۸۱۰ء کو کیا تھا چنانچہ ایک بازار کا نام "۱۶ ستمبر" ہے۔ اسی طرح ایک اور بازار کا نام "۲۰ نومبر" ہے۔ کوئی اجنبی یا سیاح جب میکسیکو آتا ہے تو پہلا ایک دو

ایک دن ان بازاروں کی اہمیت دریافت کرتا ہے گویا وہ محاذ میکسیکو کی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ خود قوم پر بھی اس کا تربیت اچھا پڑتا ہے۔ بچے بچے کو اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

صرف مشاہیر اسی تاریخ ہی پر کفایت نہیں۔ ایک بازار کا نام آرٹیکل ۱۲۳ (123 ــ ARTICLE) ہے یعنی میکسیکو کے کانسٹی ٹیوشن کی طرف اشارہ ہے جو کانگرس نے ۱۹۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانسٹی ٹیوشن کی دفعہ ۱۲۳ میں مزدوروں کے حقوق بالوضاحت محفوظ کر دیئے گئے ہیں اس بازار کا نام گویا اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ میکسیکو کی کانسٹی ٹیوشن مزدوروں کی دوست اور خیر خواہ ہے۔

میکسیکو کا شہر اچھا خاصا وسیع ہے آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے چنانچہ سینکڑوں بڑے اور چھوٹے بازار ہیں۔ ناموں کی تلاش میں یہاں کے ارباب اقتدار نے بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں اپنے مشاہیر کے ناموں اور اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے پورا پورا فائدہ اٹھا چکے تو دنیا کی تاریخ اور دنیا کے جغرافیہ کی طرف رجوع کیا۔ یورپ کا کوئی مشہور دارالخلافہ یا شہر ایسا نہیں جس کے نام پر کسی نہ کسی بازار کا نام نہ ہو۔ ایک بازار کا نام پیرس ہے، ایک کا نام مارسیلز، ایک کا نام لندن، وینس وغیرہ۔ لیکن ایسے بازار سب کے سب ایک دوسرے سے متصل اور ایک ہی علاقے میں واقع ہیں۔ چنانچہ آپ سے اگر کوئی بازار پیرس کا ذکر کرے تو آپ کو نام سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر کے کس حصے میں واقع ہے۔ علیٰ ہذا ایک اور علاقہ ایسا ہے کہ اس میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً نیل، ڈینیوب، دجلہ، فرات، رائن وغیرہ۔

شہر کے ایک اور علاقے میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور اہل فن اور اہل علم کے ناموں پر رکھے گئے ہیں مثلاً شیکسپیئر، ڈارون، ریکارڈو، کوپرنیکس وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور علاقہ میں سب بازاروں کے نام جنوبی امریکہ کے نام پر رکھے گئے ہیں مثلاً برازیل، ارجنٹائن، کیوبا، اگوائے وغیرہ۔

لیکن جہاں کسی بازار کا نام پہلے ہی کوئی خاص تاریخی یا اسی قسم کی کوئی اور اہمیت رکھتا ہو اسے بالکل نہیں بدلتے، خواہ یہ تاریخی اہمیت قومی ہو یا محض مقامی اور خواہ کوئی ادبی یا کوئی اور اہمیت ہو۔ اس کی مثال لاہور میں یہ ہے کہ انارکلی بازار، چوک وزیر خان ہی انداز کی گلی۔ ایسے نام نہ بدلے جائیں کیوں کہ ان میں مقامی تاریخ کے کئی دلچسپ پہلو نکلتے ہیں۔ یہاں ہر شہر کی مقامی تاریخ میں خاص طور پر دلچسپی پیدا کی جاتی ہے ہر شہر کا اپنا ایک عجائب خانہ ہے جس میں مقامی تاریخ، تصاویر یا نقشے یا دیگر یادگاریں اور علاوہ بریں مقامی صنعت و حرفت کے نمونے خاص طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ سیاح فوراً اس شہر کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہو جائے اور اہل شہر خود بھی جان لیں کہ ان کے شہر کی تاریخ میکسیکو اور میکسیکو کی قومی زندگی میں باعتبار صنعت و حرفت اور فن اور کاریگری کے کیا اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ اسلام بے شمار مشاہیر کے ناموں سے پُر ہے اور عالم اسلام میں بہت سے شہر مثلاً مکہ، مدینہ، بغداد، قرطبہ، غرناطہ ایسے شہر ہیں جو قوم کے ذہن میں محکم ہو جائیں تو اساس قومی کو تقویت پہنچے گی۔ علیٰ ہذا تہذیب اسلامی اکثر مشہور معمار اور ادیبوں کی ممنون احسان ہے۔ مثلاً جلال الدین رومی، خواجہ معین الدین چشتی، یا شعرا میں حافظ، عمر خیام اور ہمارے اپنے شعرا میں غالب، ذوق، محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔ مزید غور کیا جائے تو ہماری تاریخ اور تہذیب کے کئی اور پہلو ایسے نکلیں گے جن سے ہماری قوم کو آگاہ ہونا چاہیے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نقطۂ نظر سے تجویز اور مشورہ کے طور پر ناموں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور اس فہرست کو پاکستان کے تمام صوبوں اور صوبوں کی معرفت میونسپل کمیٹیوں کے پاس بھیجا جائے اور ان کی توجہ بالوضاحت اس مقصد کی طرف مبذول کرائی جائے جس کی تہ میں ہے اور اس غرض کے لئے ہر جگہ ہوشیار لوگوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں جو شہر کے تمام بازاروں کے ناموں پر غور کریں۔ میری ناقص رائے میں یہ ایک کام پاکستان کی وزارت داخلہ بہ احسن انجام دے سکتی ہے۔ اسی لئے یہ مشورہ آپ کے گوش گزار کرنے کی جرأت کی علاوہ بریں انگریزی الفاظ مثلاً روڈ، اسٹریٹ وغیرہ کی لعنت سے بھی نجات حاصل کرانی چاہیے۔ مغلوں کی دلی میں ہر سڑک اور بازار کا نام موجود تھا لیکن

فقط ـــــ ۸۰م ـــــ پوری نسبد

(۵) اس سرمایہ استعمال کرنے کی فہرست پیش نہ آتی تھی۔ بازار، چاک، چاول، تمام، پہنچ گئی [illegible] وغیرہ۔ کئی [illegible] کے لیے کیا استعمال کر سکتے ہیں؟
سکتے ہیں جو رقم سرمایہ وغیرہ کا کام دیں۔

ہمیشہ آپ کی خیریت اور عنایت کا طالب
بخاری

خطوط

بنام عبدالمجید سالک :—

نیویارک۔ ۱۳ر اگست ۵۱ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ لاہور کا نقشہ واقعی بدل گیا ہوگا۔ آپ کی (دو؟) شہر آشوب پڑھ کر افسوس ہوا۔ آپ کو خط لکھنا مبارک ہوا کیونکہ اسی دوران میں ن۔ م۔ راشد کا خط بھی ملا جس میں حفیظ (ہوشیارپوری) کی تازہ تاریخ گوئی کا لطیفہ شگفتگی کا باعث ہوا۔ سنا ہو تو سنا دوں۔ راشد نے غالباً شعر پر ایک مضمون لکھا جس کے بعض فقرے حفیظ صاحب (جالندھری) کو گراں گذرے۔ انہوں نے تاؤ کھا کر یہ شعر لکھ بھیجا ؎

خبث دروں دکھا دیا ہر دہن غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مسکرا دیا

اس پر حفیظ (ہوشیارپوری) نے اس واقعہ کی تاریخ کہی۔ "خبث دروں" (۱۳۶۳ھ) راشد نے چند اردو کی کتابیں بھیج دی ہیں۔ جن سے شب و روز میں کچھ رنگینی پیدا ہوگئی ہے۔ آپ کو خط لکھنے سے طبیعت کا "یخ ٹوٹا" تو سالک صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا۔ اگر انہیں جواب کی توفیق ہوئی تو دل میں ہوک ایک اور بلند ہونے لگے گی۔ بہرحال محض انہیں مخاطب کر کے ہی بدیع ملاقات کا مزا تو آ ہی گیا۔ اگلے دن ایک کتب فروش کے ہاں ملک راج آنند کی ایک تازہ تصنیف انڈین تھیٹر نظر آئی۔ کتاب مختصر ہے وہیں کھڑے کھڑے پڑھ لی۔ بڑے طمطراق اور شان و شکوہ سے چھپی ہے۔ لیکن جہل اور تعصب کا عجیب و غریب مرقع ہے۔ آندھرا تھیٹر اور بنگالی تھیٹر کو بہت سراہا ہے لیکن ہندوستانی تھیٹر کے عنوان کے تحت میں بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ خواجہ احمد عباس اور پرتھوی راج کپور کو تھیٹر کا امام قرار دیا ہے آغا حشر کے متعلق کہا ہے کہ "A HACK WRITER CALLED AGHA HASHR ....." "A THIRDRATE POETASTER" اسی قسم کی اور خرافات بک کر آغا حشر کو ختم کر دیا۔ سطروں میں زہر گھولا ہے۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سالہا سال سے احباب سے التجا کرتا چلا آیا ہوں کہ آؤ ہم تم مل کر اردو تھیٹر پر ایک کتاب لکھیں اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ ہمارے انتقال کے بعد کوئی یہ کام نہ کر پائے گا۔ جو مسالہ ہمارے پاس موجود ہے اور جتنی جوانی ہم نے تھیٹر پر چھڑکی ہے کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی لیکن انہوں نے توجہ نہ کی فلم سازی انہیں ایسی چمٹی ہے کہ ان کی علم دوستی خواب اور افسانہ ہو کر رہ گئی ہے ان کے بغیر یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں۔ ذخیرہ سب ان کے پاس ہے اور وہ متعدد کھیلوں سے واقف ہیں جن کا مجھے صرف نام معلوم ہے۔ آپ کو یہ داستان درد اس لئے سنا رہا ہوں کہ اگر ان کی طبیعت میں اکساہٹ پہلے سے نہ پیدا ہو سکے تو آپ اس کام کا بیڑا کیوں نہیں اٹھاتے۔ مانا کہ آپ کراچی میں ہیں اور میں نیویارک میں اور نہ معلوم یہ بُعد کب تک رہے گا تاہم یہ مشکل ایسی نہیں کہ اسے پھاند نہ سکیں جب تک ہم لوگ زندہ ہیں یہ امر محال نہیں۔ موت سمجھتے ہیں حائل ہو گئی تو کوئی اسے نہ پھاند

سکا کا لیکن "مایا ناظلا" تو "پھینک" سکتے ہیں۔

ہندوستان سے جو تناؤ ہے اس کی خبر محض سرکاری ذرائع سے ہم تک پہونچی ہے۔ تفصیلات سے تشنہ رہتے ہیں جس سے طبیعت متفکر رہتی ہے۔ نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ شاید آئندہ الیکشن کی مہم نے عمل و فکر میں کجی پیدا کر دی ہے۔ اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لندن میں افغان سفارت کے ذہن و رکھتا ہے۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان کی قسمت اور پاکستان کے لیڈروں کی دانائی اور مدبری کے ہاتھ ہے۔ سب لوگ قائل ہیں اور میں بھی۔ ہمیش کار زنیں ان کے معترف بنتے چلے جاتے ہیں۔ چین خدا کا بندہ ہندوستان کے ہاں کیسی مردِ میدان۔ سب اپنا اپنا کر سکتے ہیں۔

مجید لاہوری صاحب کا سلام پہونچا۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ ان سے ملاقات افسوس کہ بہت مختصر ہوئی ہے۔ ہم یار زندہ صحبت باقی۔ انہیں میرا سلام شوق بھی پہونچا دیجیے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

نیویارک، ۱۹ ستمبر ۵۱ء

برادر محترم سلام مسنون۔ امید ہے آپ صحیح الخیر لاہور پہنچ گئے ہوں گے۔ انقلاب کے معطل ہو جانے کے بعد آپ اغلباً مسلم ٹاؤن ہی میں خانہ نشین ہو گئے تاہم جب کبھی شہر جانا ہو اور دوستوں سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام کہئے۔ چند دن ہوئے میں نے امتیاز کو خط لکھا تھا جواب سے حسب معمول محروم ہوں اور شاید محروم رہوں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہونچا دیجئے کہ عشق کے کاروبار میں اس سے بھی بسا اوقات فائدہ پہنچتا ہے۔ کیا صوفی صاحب بدستور نیو ہاسٹل میں حکمران ہیں یا کچہری، وڈلی سرکاری کوٹھیوں میں سے کسی کوٹھی میں پہنچ گئے ہیں۔ نہ معلوم پرنسپل کون ہیں۔ آخری اطلاع ڈاکٹر صادق کے متعلق تھی، اور کیا شریف صاحب کراچی ہی میں ہیں یا لاہور واپس آ گئے؟ ان سوالات سے مکمل معلومات کر لینا مطلوب نہیں محض احباب کے مستقر و احوال کا نقشہ ذہن میں جمانا چاہتا ہوں اسی طرح کے سوالات ہاشمی صاحب اور عابد علی صاحب کے متعلق بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ عابد صاحب نے زندگی میں چند در چند ڈرامے پیدا کئے ہیں۔ میں ابتدائی مناظر سے بھی بے خبر ہوں۔ اس لئے تکمیل کا فائدہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ خلیفہ حکیم کے متعلق آخری اطلاع تھی کہ وہ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ کیا یہ اکیڈمی پنپ رہی ہے اور لاہور میں ہے؟ میں نے خلیفہ صاحب سے اسلامی کلچر پر یہاں کے ایک مقتدر مؤلف کے لئے ایک مضمون لکھوایا تھا وہ عنقریب اور فلسفیانہ عالم کے رشحات قلم کی معیت میں کتابی شکل میں شائع ہوگا اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ اسلام پر کسی پاکستانی کا مدلل مضمون اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ چھپے۔ یہاں کی ایک یونیورسٹی میں مذاہب قدیم اور حقوق انسانی کے مضمون پر دسمبر میں ایک مناظرہ ہوگا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے خلیفہ حکیم صاحب کے لئے بے حد سعی کی کہ اسلام کی نمائندگی وہ کریں۔ آخر اس میں کامیاب ہوا۔ خلیفہ صاحب کا کرایہ وغیرہ یونیورسٹی دے گی۔ کینیڈا کی McGill یونیورسٹی فیصلہ کر چکی ہے کہ اسلامیات کے طلباء اور فارغ التحصیل بزرگوں کو سال دو سال کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے عنقریب وہاں سے کچھ حضرات منتخب

انگلش کے لئے پاکستان کا دورہ کریں گے میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ آپ سے بھی ملیں۔ مسٹر سمتھ پہلے بھی ہمارے ملک کی سیاحت کر چکے ہیں ـــــ " MODERN ISLAM IN INDIA " کے مصنف ہیں۔ آغا بیدوغیرہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ چودھری ظفر اللہ خان صاحب آج کل یہاں ہیں۔ مباحثۂ کشمیر کے آنے والے سیشن کے لئے پیچ تیار کر رہے ہیں اور سب انتظامات میں معروف ہیں۔ خدا کرے ہم اس قضیے سے عزت کے ساتھ اور بوجہ احسن عہدہ برآ ہوں۔ ایک اور یونیورسٹی [illegible] آپ [illegible] پروفیسر کرنا چاہتی ہے لیکن کسی ایشیائی یونیورسٹی کے ساتھ مل کر۔ بیروت اور پنجاب دونوں زیر غور ہیں۔ میں پنجاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں [illegible] پنجاب یونیورسٹی کے [illegible] کا منتظر ہوں کہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر لوکس (سابق پرنسپل فارمن کالج) میرے ممد ہیں اور خوب زور لگا رہے ہیں۔

آپ کے لاہور سے کچھ بیاجان ہونے کا خیال آتا ہے تو [illegible] ہو جاتی ہیں تاہم جب تک آپ کراچی میں تھے آپ کی موجودگی سے زبیدہ اور ان کے تعلق سے مجھے ایک اطمینان تھا۔ سب لوگ کراچی کی سمت ہجرت کر رہے ہیں لاہور کا (بقول [illegible]) "اب کیا بنے گا؟"

مہر صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انہیں اب بھی اپنی پیری کی [illegible] سانپ مارنے کے لئے جنگل میں گشت لگاتے ہوں گے انہیں بھی میرا اسلام کہئے گا۔

آج [illegible] کا دن ہے۔ [illegible] یہ مشغلہ ہر ملک اور ہر زمانے میں [illegible] چلا آیا ہے۔ اگلے ہفتے سے پریس کے سفر کے سلسلے میں [illegible] شروع کر دوں گا۔ پہلے نیچے سب کے سب [illegible] بوجھتے ہیں۔ کل شام [illegible] ہوئی۔ کچھ شعر کچھ جاپانی عہد نامہ کچھ کوریا۔ وقس علیٰ ہٰذا ـــ غرضیکہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ـــ الخ

خاکسار

بخاری

---

(۳)

12 E 65th STREET NEWYORK

۲۲ر مارچ ۵۲ء

برادرم تبسم سلام مسنون۔ نہ معلوم آپ کا کیا حال ہے عرصے سے آپ کا خط نہیں آیا۔ یہ آپ کا شیوہ نہیں۔ اس لئے آپ کے متعلق تشویش ہے۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ چند دن سے بیماری کی بیماری سننے میں آئی ہے۔ سلمان بے چارے کو نمونیا ہو گیا۔ انور کا خط آیا تھا کہ اب بہتر ہیں۔ اس سے بھی ایک دو ہفتے گذر گئے۔ نہ معلوم اب ان کا کیا حال ہے۔ میں پیرس سے یہاں [illegible] فروری کو پہنچا۔ بالکل چور۔ پہلے انفلوئنزا ہو گیا اس سے صحت پائی تو خون کا دباؤ یک لخت گر گیا۔ سر میں چکر آنے لگے اور صاحب فراش ہونا پڑا۔ اب بالکل تندرست ہوں۔ زبیدہ کو عرصے سے [illegible] کی شکایت ہے۔ وہ آج کل پنجاب میں ہیں امید ہے آپ سے ملاقات ہوئی ہوگی (بشرطیکہ آپ کراچی نہ اٹھ گئے ہوں) آج کل کام میں گھرا ہوا ہوں۔ سیکورٹی کونسل اور ڈس آرمامنٹ کمیشن میں ہونے کی وجہ سے معروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کے کئی لوگ آئے ہوئے ہیں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کوئی [illegible] پڑ جائے۔ احمد صاحب بحیثیت وزیر کے میرے معاون مقرر ہو سکے۔ جنوری کی بجائے مارچ میں یہاں پہنچے۔ وزیر خارجہ

انہیں اپنے ساتھ بلادِ اسلامیہ کے دورے پر لے گئے تھے۔ جب کراچی واپس پہنچے تو کسی ریڈیو پر رہ رہے تھے۔ وہ چھٹیاں لے کر گئیں اور ان کے …
استعفیٰ منظور۔ تو منیکر بوجوہ پریشان رہا۔ اب زندگی کا نقشہ پھر بدلنے لگا ہے۔

چوہدری خورشید احمد تھی لی۔ کہ ہاشمی صاحب ہر جگہ آئیں گے۔ … بتایا۔ اسے بھی کبھی بیٹھے چلے گئے۔ مزید اطلاع نہ آئی۔ صوفی …
کا ایک نادر رسالہ حمید الدین (بن مولوی صدر الدین مرحوم) کی وساطت سے پہنچا۔ حمید میاں … یونیورسٹی میں نفسیات پڑھتے ہیں۔ عنقریب واپس
جائیں گے۔ … بی بی سی سے … کوشش کر رہا ہوں۔ … تربیت کی … عبدالحکیم یہاں اپنی لیکچر بازی ختم کر چکے ہیں
اب واشنگٹن میں سستا رہے ہیں۔ اگلے ہفتے نیویارک آئیں گے اور دو چار دن کے بعد کراچی کا عزم کریں گے۔

اخبار و اطلاعات تو ختم ہوئیں۔ اب تو … یہاں برف پڑ رہی تھی۔ یہ مارچ کا آخر ہے … کے
سے بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ عنقریب … وہ بڑی بھری بھری … یاد آتی ہے۔ … طالب علم
تھے تو مارچ کے مہینے میں امتحان کے خیال سے رعشہ طاری تھا۔ معلوم ہوتے تو مارچ میں تعطیلات کا انتظار رہتا تھا۔ بہار کی ہوائیں یوں بھی چلتی تھیں …
بھی۔ اور کاروبارِ عشق بہ … جاری رہتا تھا۔ کیا اب بھی راوی کے اُس پار مقبرہ جہانگیر کے باغ میں کوئل کی صدا سنائی دیتی ہے؟ کیا اب بھی …
کا موسم قریب آیا ہے؟ جب بیماری کے … کل فضل الدین تھا تو شباب کا سرمایہ … شب کے کئی … تھوڑی دیر کر دماغ … پر
جاگ اٹھے تھے۔ … کی بزمِ … دلی منزل میں … کا ہجوم۔ … مرحوم۔ فرزند علی … پان کی وجہ سے …
رہتے تھے۔ منشی نعمت علی کی … حکیم احمد شجاع کا مکان … تاثیر کی … حسرت …
کی قسم وہ یہیں ہیں) ڈیگ پر … گورنمنٹ کالج لاہور … پنجابی غزلیں۔ شب دیگ کی تقریبیں …
اے کاش کوئی از سرِ نو ان اوراقِ پریشاں کا شیرازہ باندھ دے۔

دوش بیادِ حریفاں بخرابات شدم — خمِ مے دیدم خوں در دل و پا در گل بود
بس بگشتم کہ بپرسم سببِ دردِ فراق — مفتیِ عقل دریں مسئلہ لا یعقل بود

آپ کی خیریت کا طالب ہوں اور آپ کے خط کا منتظر۔

ہر کہ جانبِ اہلِ وفا نگہ دارد — خدایش در ہمہ حال از بلا نگہ دارد

خاکسار
بخاری

---

(۴)

نیویارک، ۲۰ر اپریل …

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ … اوائل اپریل شرفِ صدور لایا۔ آپ خفا تو نہیں؟ … ایک ہی
مکتوب سے آپ خبروں کا ایسا … کر دیتے ہیں … جب سے … آیا۔ … میں مستغرق رہا۔ …

باعث میں نے بیاں مرخرو کیا کہ شاعری کا کوئی بھی حیثیت باقی نہیں۔ امریکہ کے اخباروں نے دو مجھے بھی ۔ قیامت یعنی یوں یہی کی ترتیب ہوا ہے ابھی تک تو یہی خطبا کا آنا تانتا ہوا ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے ہر وقت تعاقب میں رہتے ہیں۔ یہاں تک ہ ایک بہت تاں اخبار نے (نام ابھی نہیں لوں گا) مجھ پر ایک آرٹیکل لکھنے کا تہیہ کیا ہے اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے فرنٹ کا ۔۔ ایک نامہ نگار میرے ساتھ متعین کر دیا ہے جو رات دن میرے ساتھ پھرتا ہے اور بے شمار سوالات پوچھ پوچھ کر نوٹ لیتا رہتا ہے۔ پندرہ دن یہ شغل رہے گا اس کے بعد وہ دو صفحے کا آرٹیکل لکھے گا۔ یہاں کے صحافت باز لوگ بھی عجیب والہانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں پر ایک آرٹیکل لکھنے کی نذر چھپنے ان کے ساتھ ایک ۔۔ یہ دا ۔ کر دیتے ہیں۔ سنا ہے میرے والے آرٹیکل پر ۔۔ کا بس ہزار ڈالر خرچ کرنے کو ۔۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ۔۔ نے پاکستان کی اس خدمت کے لئے مجھے منتخب کیا اور پاکستان کی طفیل مجھ پر بھی اپنی رحمت برسائی۔ تفصیل تو کسی روز خود زبانی میں لاؤں گا۔ ۔۔ پہلے ۔۔ گا ۔۔ گیا تاشے ہونے ۔۔ یہ داستان ایک ذرا مسے کم نہیں۔ عند الملاقات انشاء اللہ کبھی عرض کروں گا۔ آپ جانتے ہیں یہ تقریر بغیر نوٹ کے کرتا ہوں ۔۔ تقریر کے ابتدائی فقروں کے دوران میں ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوتی تھی۔ مجلس امن ۔۔ ریڈیو وغیرہ ملاکر روز دو دو دو تین ۔۔ نہیں ہوتے اور پھر دائیں بائیں بھی ۔۔ اور جبادری قسم ۔۔ لیکن دو سالت رہا کہ کیا عرض کروں۔

پاکستان آنے کے لئے بے قرار ہوں۔ کتوبر ۔۔ جنوری تک جنرل اسمبلی کی وجہ سے میرا نیویارک میں رہنا ضروری ہے آیا تو یا ۔۔ اکتوبر سے پہلے یا جنوری فروری میں۔ تاریخ کے تعین میں توقف یوں ہے کہ ۔۔ میاں چاہتے ہیں میں ان کی شادی کے موقعے پر بھی ضرور موجود ہوں۔ شادی کی تاریخ ابھی انہوں نے مقرر نہیں کی۔ خان بہادر میاں عبدالعزیز مرحوم کی صاحبزادی سے پیغام ہوا ہے۔ خاتون کا نام روشن ہے۔ ہر شخص سے اس بچی کی تعریف سنی ہے۔ زبیدہ یقیناً آپ سے بات کریں گی ۔۔ آپ اپنے برادرانہ مشورے سے ۔۔ مجھے اور اروں کو محروم نہ رکھیں گے۔ کبھی فرصت سے آزاد النقد سے عام معاملات پر بھی تبادلہ خیالات کیجئے۔ اس کا اثر ۔۔ میں تو متوکل انسان ہوں البتہ زبیدہ کو جو مذاق ایک جیتی کی عادی ہے دکھ ہوتا ہے۔ زبیدہ کی صبر شکر سے کام لیتی ہے ۔۔ کا ان پہ سپا ہے اس بدمزگی سے میں اکثر پریشان رہتا ہوں۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔ تاہم عجب نہیں کہ ۔۔ میں آپ کا کلام ۔۔ کے دل میں جاگزیں ہو جائے۔ اور اس کی کدورتیں ۔۔ واللہ اعلم کیا کدورتیں ہیں ۔۔ دور ہو جائیں۔

آپ بھی اب کراچی ہو گئے۔ خدا کرے آپ کو مکان خاطر خواہ مل جائے۔ مسلم ٹاؤن کی کوٹھی کے بعد کہاں ۔۔ چاری کر ہوٹل میں زندگی کا کیا لطف آئے گا۔ آپ کے کراچی آنے سے میں خوش ہوں۔ کراچی میں لاہور کا سا رس نہیں لیکن جب حلقہ احباب کے باقیات الصالحات سب کراچی میں آن موجود ہوں تو ۔۔ کم از کم آشنا صورتیں تو نظر آئیں گی۔ شریف (محکمہ تعلیم) آج کل امریکہ میں ہیں ڈاکٹر حمید بھی (حقوق انسانی کے کمیشن کے سلسلے میں) یہاں ہیں۔ خلیفہ حکیم اس وقت جاوا سماٹرا میں مزار مولانا روم پر فاتحہ پڑھ رہے ہوں گے۔ یا غضنفر کے ہاں پلاؤ کھا رہے ہوں گے عنقریب کراچی پہنچیں گے۔ مجید ملک اور آمنہ کی کبھی کوئی خبر نہیں آتی۔ فلیمنگ روڈ کے ایام کے میدان سے مخل بالطبع ہونے کے مترادف کہلے ہیں (کچھ ۔۔ ارادت جنگ اور دہلی میں) سلمان یقیناً صحت مند ہوں گے کیونکہ نو سے ان کا خط نہیں آیا سنا ہے امتیاز کراچی آئے تھے چند محفلیں روشن کرکے پھر لاہور چلے گئے۔ ان کی جانب سے تو کبھی خط آتا ہی نہیں۔ سنا ہے دوست ماشاء اللہ اہل قلم سے بڑھ کر اہل القلم ہیں۔

خط لکھتے رہا کیجئے اور ۔ چوہدری حبیب نشینی ۔۔۔۔ الخ

خاکسار

بخاری

(۵)

نیو یارک ۔ ۳۱ اگست ۱۹۴۹ء

برادر محترم۔ سلام مسنون یہ بھی بڑھاپے و پیرانہ سالی کی ایک مثال ہے کہ جب آپ کا خط ملا۔ میں ایک کانفرنس میں تھا کھول کر مدت سے نکھیر میز پر کہیں اور یہ جیب میں رکھ لیا کہ فرصت میں پڑھوں گا۔ اب نہ معلوم وہ کون سی جیب کس کوٹ کی تھی۔ تین دن سے تلاش کر رہا ہوں آخر ارادہ کیا کہ منہ زبانی ہی جواب لکھ ڈالوں۔ اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ آپ میری خاموشی سے شاکی ہیں اور خط کا خاتمہ اس پر معنی فقرے پر ہوا تھا کہ آپ محض ریڈیو سٹیشن رہتے ہیں محض بیانی نہیں!

جولائی اگست کے مہینے یہاں مشکل سے کٹتے ہیں۔ گرمی اور رطوبت یعنی بالکل کلکتہ۔ ورنہ کلکتے سے ملاس۔ اس دوران میں کام برابر جاری رہا۔ کشمیر کے مسئلے کو یو این او سے بیشتر جانے کی توقع ہے اور ریمنڈ کمیشن اور سیکیورٹی کونسل کے۔ جلاس تو اتر ہونے لگے۔ ۱۴ اکتوبر کو جنرل اسمبلی ہے اس کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں معاونین سے جو توقع تھی کہ آپ کی رپورٹ اس کے دو ترجمے موجود ہوں۔ ہم بھی سمجھے تھے کہ سب مبارک۔ اسد عمر خوار رجال ورود منہ آیا۔ لیکن انہیں فرصت کشاکش فہمیہاں ہی سے نہ ملی۔ یہ مرتبہ تو ان کے دوسرے بزرگ ہوگیا اور ہفتہ بھر تو بستر میں لیٹے لیٹے کتابیں پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ پر کیا کریں کہ دل کی مدد سے فارغ کا ۔ بہرحال اب دسمبر تک تو یہی بار برداری کرنی پڑے گی۔ اس کے بعد چھٹی لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ ہے۔ چھٹی ایک سے دو مہینے تک کی ہے مگر ستمبر کی دل چاہتا ہے لیکن تو دیکھی رہے سے قبضہ اور پاکستان رہوں۔ تاکہ سنا ہے الاؤنس مجھ جانتا ہے خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو آزادی پہ پہنچنے کے نقشے دماغ میں ڈھل رہے ہیں

اس دوران میں غضنفر یہاں آئے تھے۔ یہ بادشاد کے مہمان تھے چنانچہ اس غاط سے ہے کہ ہماری میزبانی کے متوقع بھی ہے اور سے بے نیاز بھی۔ جب وقت ملا۔ بہت خوش خوش شامل کئے۔ غلام محمد چند دن سے یہاں ہیں ایک دو مرتبہ ماحضر تناول فرمایا اور وطن کے حالات سنے۔ اصل مجھی موجود رہتے۔ وطن کے حالات سے یہاں بیٹھے بے خبر رہتا ہوں۔ بس اتنا ہی علم ہے آئے جو سرکاری اطلاعات کے ذریعے پہنچتا ہے۔ ڈان پڑھنے کی کبھی فرصت ملتی ہے کبھی نہیں ملتی۔ جو یہاں یہاں آتے ہیں وہ کسی نہ کسی افسر کی بیماری کا حال سناتا ہے۔ غلام محمد بیمار رہتے۔ کچھ محمد علی بیمار ہو گئے اب سنا ہے عبدالقادر صاحب خراش ہیں۔ نروج کی آب و ہوا کچھ بدل ڈالنے کا تہیہ کر لینا چاہئے۔ سلمان نے قران سے کچھ کہا ان کی جانب سے ایک مسودہ موصول ہوا ہے۔ جس میں نیاز کی صاحب یا اور کسی داستان یوسین کی آپس میں تو تو میں میں کا نہایت مفصل تذکرہ تھا۔ پھر ایک اور مسودہ شرف صدور لایا جو خود ان کی ایک ریڈیو ٹاک کا مسودہ تھا۔ حاشیہ پر چند کپڑے کمرڑے "نقرنی" نقوش تھے اسی لئے ان کا گرامی نامہ سمجھ کر خوش ہو گیا۔ لیکن اس سے اتنی الکساہٹ پیدا نہ ہوئی کہ "لائیو تو قلم ان" کہہ اٹھتا۔ بہرحال انہیں عنقریب سنئے سازو سامان کے ساتھ خط لکھوں گا۔

ہارون کی شادی دسمبر کے آخر میں ہوگی۔ میں وسط دسمبر سے کسی صورت پہلے نہیں پہنچ سکوں گا۔ نہ معلوم ایسی تقریبوں پر کیا کیا انتظامات پیش از وقت کرنے پڑتے ہیں۔ امید ہے آپ زبیدہ کو اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً رہنمائی کرتے رہیں گے۔ آپ اور دیگر احباب اگر اس کام میں بقدر فرصت حصہ لیں تو بتقاضائے نیازمندی بے حد ممنون ہوں گا۔ ہارون منصور ماشاء اللہ جوان ہیں لیکن ناتجربہ کار ہیں۔ آپ کی ہدایت کی انہیں بے حد ضرورت ہوگی۔ سلمان کی خدمت میں بھی میری طرف سے یہ درخواست پہنچا دیجئے۔ ذوالفقار کو بھی خط لکھوں گا لیکن نہ معلوم وہ کس حد تک توجہ کریں

آپ دو ملتان پر بھیجے ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔
امریکہ سے کچھ منگوانا ہو تو ابھی سے لکھ بھیجئے۔ یہاں کا شاپنگ از حد صبر آزما ہوتا ہے۔

خاکسار
بخاری

---

(۶)

نیویارک۔ ۹ر فروری ۱۹۵۱ء

برادر محترم سلام مسنون۔ جب نیویارک پہنچا تو جہاز سے بیمار اترا۔ بے آرامی میں ایک قیمتی اوورکوٹ بھی جہاز ہی میں رہ گیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ سخت نزلہ اور بخار۔ سیدھا ہسپتال لے گئے۔ اب افاقہ ہے۔ لندن میں چوبیس گھنٹے ٹھہرنا پڑا۔ جہاز والوں نے ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا جو مضافات میں واقع تھا۔ بڑی سی عمارت جیسے کسی انگریز رئیس کا محل ہو۔ ارد گرد وسیع باغ۔ دن بھر ہوٹل ہی کے آفتاب خانے میں بیمار پڑا رہا۔ دوست آشنا سے جو لندن میں رہتے ہیں ملاقات یا ٹیلیفون کی کوشش نہ کی۔ موسم سخت تھا خیال تھا نزلے میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ لیکن نہ ہوئی۔ قاہرہ میں کسی کو گذرنے کی اطلاع نہ دی تھی البتہ روم کے ایئرپورٹ پر اسلم ملک اور اس کی بیوی ملنے آئے۔ گھنٹہ بھر کا وقفہ ان کی صحبت میں گذرا۔ کراچی سے میرے ہی جہاز میں طیب حسین واپس قاہرہ جا رہے تھے۔ قاہرہ کے ایئرپورٹ پر ان کی بیگم صاحبہ (مرزا محمد سعید کی صاحبزادی) انہیں لینے آئی ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ گپ رہی۔ نیویارک ابھی خالی خالی ہے ابھی تک کسی دوست سے تجدید مراسم کی ہمت نہیں کی۔ چودھری ظفر اللہ خاں یہاں سے جنیوا پہنچے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ دفتر گیا۔ جاتے ہی کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مجبوراً اور کچھ دل بہلانے کے لئے۔ ضعف و نقاہت و تفکرات ہوتی ہے۔ آج زہرہ کا خط آیا ہے کہ میں شادی مارچ کے آخر میں کرنا چاہتا ہوں۔ سو میں نے لکھا ہے کہ زبیدہ اور منصور کے ساتھ مشورہ کر کے خرچ کا تخمینہ لکھ بھیجئے۔ منصور کی شادی کے اخراجات کا نقشہ اسے میں نے یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اس سے مدد ملے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ شادی بجائے اپریل کے مارچ ہی کے مہینے میں مناسب ہو گی۔ خدا کرے اس وقت تک میں کچھ پونجی جمع کر سکوں۔ سر دست تو تجوری بجائیں بجائیں کر رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ گھر کے لوگ اس وقت سب منتشر ہوں گے اور زبیدہ اکیلی ہوں گی۔ خیریت دریافت کرتے رہیے گا۔ جب میں کراچی سے روانہ ہوا تھا، تو اسے بھی بخار اور زکام تھا۔ شادی کی بھاگ دوڑ نے کان تھکا دیا۔ منصور اور زرینہ غالباً تعطیل منانے دلی چلے گئے ہوں گے۔ ہارون لاہور میں ہے غالباً آج کل دورے پر ہے وہ ۲۲ر فروری تک دورے پر رہے گا۔ ذوالفقار کے اوقات جیسے مصروف ہیں وہ آپ جانتے ہیں۔

کراچی آنے کا وہ لطف نہ آیا جس کی امید تھی لوگ پژمردہ اور ان کی گفتگو اکثر متفکر تھی۔ علاوہ بریں شادی کے تفکرات بیشتر دماغ پر حاوی رہے۔ دو مرتبہ لاہور تو گیا لیکن لاہور سے محظوظ ہونے کی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ سب احباب سے (بجز ایک عابد علی کے جو [illegible] میں بھی شامل نہ ہوئے) ملاقات تو ہو گئی۔ اب دیکھئے اگلے دو ایک سال میں زمانہ ہر ایک سے کیا سلوک کرتا ہے۔ آپ کی صحبت بدستور فیض کا سرچشمہ تھی۔ جو قہقہے نصیب ہوئے وہ آپ ہی کی بدولت نصیب ہوئے اور شادی کے انصرام میں بھی آپ ہی کی ذات سے بہت کچھ ڈھارس بندھی رہی ورنہ میں بالکل ہی بوکھلا گیا ہوتا۔ خدا آپ کو سلامت اور شاداں رکھے۔ مجید لاہوری کی صحبت بھی حاصل رہی تھی۔ ان سے میری

جانب سے حضرت کو دیکھے گا کہ وہ خدا حافظ کہنے آئے تو میں گھر پر موجود نہ تھا۔ ان کی طبیعت رنجیدہ بھی اور سب سے بڑھ کر ان کے خلوص اور ان کی الفت کی یاد سے طبیعت آبدیدہ ہو گئی۔ خدا ان کے دماغ کو اور جلا دے۔ ان پر سلام۔ یونیورسٹی کے صاحب پر بھی جن کی کتاب پڑھی۔ جو آپ کو انہوں نے تحفۃً دی تھی) وہ میرے گھر پر ہے آپ وہاں سے وصول کر لیجئے گا۔

شاہد سہروردی نیویارک میں آ کر مقیم ہو گئے ہیں کولمبیا یونیورسٹی میں ان کا منصب آرٹ لیکچرار کا ہے ابھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پرسوں، یہاں کے سب سے بڑے عجائب خانے میں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہے۔ ڈائریکٹر اور اس کی بیوی نے مجھے نمائش سے پہلے کھانے پر بلایا ہے۔ ارادہ ہے شاہد کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ انہیں وہاں بہت سے ہم فن اور ہم مزاج مل جائیں گے۔ سلیم ان پر اخلاط آ گیا ہے اور ان کا دل بڑھ رہا ہے۔ آخری عمر میں تنہائی کا عالم اور تلاش معاش میں وطن سے اس قدر دور۔ ان پر ترس آتا ہے۔ طبیعت بھی ان کی حساس ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی سی خوش دلی ان میں نہیں، وابستہ وہ فرہنگ داں اس کا ذوق کی ذریں سپہر ا۔ یہ صحن نیویارک پہنچنے کا خیال ہے اس سے اختصار منظور ہے باقی آئندہ!

ترجمے کے لیے اردو کے مختصر افسانوں کا انتخاب۔ عباس کو یاددہانی کرا دیجئے گا۔ حسرت کو سلام۔ پڑھا انہوں نے کہ ایران میں بھی مکتب بیدار ہو رہا ہے؟

خاکسار

بخاری —

---

(۷)

نیویارک

۱۹ فروری ۱۹۵۳ء

برادر محترم۔ بہاولپورت آپ نے بھیجا تھا اس کے مطابق آپ کا ۱۵ فروری کا لکھا ہوا گرامی نامہ آج ۱۹ فروری کو مل گیا۔ اگر یہاں پہنچ گیا ہوا یہ خط آپ کے خط کا جواب نہیں بلکہ بجز خط ہے اور ایک درخواست ہے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ "بھنگیوں کی توپ" کے مکمل حالات مطلوب ہیں کس نے بنائی؟ کہاں بنائی؟ کیا توپ ساز کا نام اور کوائف معلوم ہیں؟ توپ کا اصل مالک کون تھا؟ توپ کی عمر کتنی ہے؟ ہوتے ہوتے لاہور کے عجائب خانے کے سامنے کیسے پہنچ گئی؟

اس ریسرچ کا محتاج یوں ہوا کہ ایک جرنیل کی اعانت کرنی ہے۔ ان حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی کسی چیز کا مطلقاً کوئی علم نہیں بجز بھنگیوں کی توپ کے۔ اور اس توپ کے بارے میں ایسا شغف ہے کہ عشق و جنون کی حد تک۔ کپلنگ کی کتاب "کم" KIM میں اس کا حال انہوں نے پڑھ رکھا ہے (اسے کہتے بھی "کم کی توپ" ہیں) اس کے مفصل حالات ان تک پہنچا سکا تو وہ پھولے نہ سمائیں گے بلکہ شاید انہیں مطلقاً وہ بلا کا فخر محسوس کریں گے اپنی امیری کی چشم زار لکھوا دیں۔ پہلے خیال آیا کہ لاہور کے عجائب خانے کے مہتمم صاحب کو لکھوں۔ اور جواب جلد دینا انہیں گوارا ہوگا یا میرا خط کہاں کہاں ٹیبلوں ہی میں کہیں پڑا رہے گا۔

اول تو مفصل حالات آپ کو خود ہی معلوم ہوں گے۔ آپ کا دماغ اور حافظہ تو عجائب کی زنبیل سے کم نہیں، اور نہ معلوم ہوئے تو آپ کالج میں کسی ماہر

سے حاصل کر لیں گے۔ جواب خواجہ کو بھیجئے
القاب الاحمدی کی ترجمہ خوب رہا۔
دیکھو کہ آج کا کام کیا گیا ہے

میں موہن کے ہے اشارہ اور لیا گیا۔ "کل کا کام" کی داد دیجیے۔ تشا الاحمدی کی ترجمہ "کام" اور اردو کے بعد کا سند "تحقیق" ابتدا شاء اللہ "آج کا کام" ہوا۔ یہ ترجمہ روز مرہ میں بھی مفید ہو سکتا ہے۔ مثلاً کہا جائے کہ "آج کل کام طرح میں کل کا کام نہیں تھا" مگر یہ آخر میں بھی "پیدا کیوں ماتر دو جو نہیں آتی" میں بحر دیا سمجھ کیوں؟ یا کون سی استعمال ہوتی ہے "اپریل میں شادی" پر بات سننے کے لئے تمہارا ہے۔ غریب فاضل کسی کی ہو۔ وہ اس سے بڑھ کر شوق بجا اس پر معلوم ہو گا کہ میں نے سے جواب بھیجا ہے کہ مجھے اعتراض نہیں۔ البتہ زبیدہ سے مشورہ کر لے اس کی رضامندی حاصل کرے۔ روپیہ کا جو تقاضا ہو کرے جو اس کے محتاج سے بیس سے لے کر چاہے یا آخر اپریل وغیرہ بارہ میں لہٰذا اس کے متعلق تشویش نہ ہونی چاہئے۔ ہر شخص کی خیال سے پرچ کو روانہ کرنا چاہئے۔ روپیہ کا انتظام انشاء اللہ ہو جائے گا۔ باقی حالات آپ برادر زبیدہ پر چھوڑتا ہوں۔ (ان کے نزدیک شادی اپریل تک ملتوی اس کے ذہنی حالات ہیں) سے خوش کن نہیں۔ بلکہ تشویش پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اس کے خط سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپریل پر خواہ مخواہ اصرار نہ کرنا چاہئے البتہ کوئی دیگر حالات مانع ہوں تو اور بات ہے۔ ان کا مجھے علم نہیں۔ اگر تیاری میں کوئی کوتاہی رہ گئی تو اس کا الزام ہم پر آئے گا۔ لہٰذا اس بارے میں زبیدہ کو کوئی جرأت اپنے او پر طاری نہ کرنی چاہئے۔ وہاں کا خط پچھلے دنوں آیا تھا۔ جس کے متن سے مزاج ہو تا کی مشکلات نہ سمجھا۔ صحیح حالات آپ کو ان سے معلوم ہوں گے جب وہ کراچی واپس آئے گا۔

احباب کی یاد بھی تازہ ہے۔ زبیدہ ، امور حق اور دیگر عزیز فرحانہ کو سلام پہنچئے۔

فوت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ دلکشی   جو دلکشی کہ شام سے ذوق میں تھی :

شام سے مراد وہ شام ہے جو آپ کے ہاں کٹتی تھی۔ اور ۔۔۔ پہنچنے کا سبب وہ شبہ ہے۔

بخاری

---

(۸)

نیویارک ۱۰ اپریل ۵۳ء

برادرِ محترم سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ مسودہ بھی کتاب کے ساتھ ہی مل گیا تھا۔ خیال تھا کہ اس کے متعلق علیحدہ خط لکھوں گا لیکن فرصت نہ ملی۔ مجید صاحب کو بہرحال میرا دلی شکریہ پہنچا دیجئے۔ ان کی وجہ سے کئی دن اور شامیں دلکش ہو گئیں۔ اور بہت سیاہ سرخی کا مزا آ گیا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ فسیم کا لیا جیو نا کبھی کبھار وطن سے آ جائے تو میں کتنی دیر تک یہاں مست رہتا ہوں۔

تنخواہ میں جو تخفیف ہوئی ہے وہ پندرہ سو روپے ماہوار کے برابر ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تخفیف کی ضرورت اس حد تک محسوس ہو گی میں سمجھتا تھا یہ عہدہ اتنا اہم ہے اور یہاں ہم نے رستم کی گرپر دولت ماری ہے کہ ہم مانوس ہیں گے۔ بہرحال ساری خوش فہمی صحیح کیوں ثابت ہوتی؟ یہ بھی خیال تھا کہ جو لوگ خود فضائی سروس سے متعلق نہ ہوں اور باوجود اس کے سفیر وغیرہ مقرر ہوں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کبھی ساٹھ برس کی عمر تک پہنچ جاتی ہے۔ نتائج مقررین ہی

خدا کا شکر ہے بحمد اللہ خیر و عافیت ہے۔ غنیمت ہے کہ کس طرح سیاسی زندگی سے سبکدوش ہو کر آیا ہوں۔ یہ پرکن ساتھ نہ ملے گا؟ ہم بھی اس فکر میں ہیں سب تو علم
ایا کہ تم سے تو بہت سی ... سوال سب ختم کر دیئے جائیں گے۔ وہ عرض ... کہ یہ پاکستان سروس والوں کا واپس لایا جائے تو پھر آپ خدمت
انجام فرمائیے۔ ضابطے کا جواب ابھی تک نہیں لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ پرپوزل کچھ ... ہوگی اور یہ ایک سال کی ... بھی ... مل جائے گی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو تاکہ کچھ مہلت مل جائے اور اپنا مستقبل قدرے سہولت کے ساتھ ... سے کچھ سوچوں۔

ساتھ ہی ساتھ تلاش معاش جاری ہے اور ادھر ادھر ہاتھ مار رہا ہوں ... قدرے امید افزا ہیں۔ سرکاری ملازمت پر اب ... معلوم ہے
کب تک ... میری موجودہ حیثیت برقرار رہے گا۔ ضابطے کا ... ہے، جیسا کہ بابا اپنے آپ کو ... کی ... مل ہے۔ معاش کی تلاش
... میں ترقی پر ... وطن میں بجز سرکاری ملازمت کے کیا ہے جس کے ... قابل ہوں اور ... خدمت سے ... آبادی کیا
... سیاست کے ساتھ ہی ساتھ ... بھی ... ہو جاتی۔ ... بستر پر پڑا رہتا ... کیا ہے؟ ... کر ...
بہتر ... بیچارہ کیا کرے ... کا بڑھاپا ... کا بڑھاپا ہے۔

زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ہارون کی شادی ستائیس اپریل کو ہو گی۔ اور آپ سب اس میں شریک ہوں گے۔ جزاک اللہ۔ آپ کی ... زبیدہ اور
بچوں کا حاصل ہو گی تو آپ پریشان کیوں ہوں ... رہے گا۔ ... آتا لیکن جو کچھ ... تھا وہ منصور کی شادی پر خرچ کر دیا۔ ... باقی تھی
اسے ... کر کے ہارون کے لئے بھیج دیا۔ ... محض ... معاش کا بھی ابھی کچھ یقین نہیں۔ ... جو کچھ لکھا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ لیکن نہ معلوم
کہاں چلا گیا؟ کسی ... فرصت سے اس پر غور کروں گا ... میں نے کہیں ... رکھا ہوا ہو یا بھول گیا ہوں۔ ... آپ کا خط ملا۔ خیال تھا کہ
آپ شاید مرزا غالب کے سلسلے میں سفر پر ہوں۔ خبریں یہاں دیر سے پہنچتی ہیں ... ان کا ... طرح کچھ میں نہیں آتا ... بہرحال
کچھ ... نہیں۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند

آپ کی بہبود کا طالب

خاکسار

بخاری

---

(۹)

نیویارک ۵ مئی ۱۹۵۳ء

برادر محترم۔ آپ کا ... تاریخ خط آج ملا۔ اس سے پیشتر دو خط بھی موصول ہوئے تھے جن میں عزیزی اعجاز کے کوائف شامل (مشمول) تھے۔ اعجاز
صاحب کے سلسلے میں میں نے سب سے پہلے بالواسطہ تحقیقات کی کہ ایسے گریڈوں میں کمپنی کی کیا کیا گنجائشیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ابھی تک ہمیں ان سے سابقہ
نہ پڑا تھا (آپ نے لکھا ہے کہ ان کا ایک ساتھی حال ہی میں مقرر ہو کر امریکہ جا چکا ہے۔ معلوم نہ ہوا کہ وہ کون ہے؟ تفصیل مل جائے تو اس سے ہمیں اپنی
مساعی میں مدد ملتی) جو حالات سرسری طور پر معلوم ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ بجز اپنے گریڈوں میں ہمیں اپنے ... حاصل ہے ... کلرک ...
طور پر ... میں ... کا ... کیا جاتا ہے گویا ... یا ان لوگوں کو ... لیکن یہاں

[illegible] مغرب میں یہ کام عورتیں کرتی ہیں۔ مشرقی ذہنیت کے لئے ایسے کام پر کسی مرد کو مامور کرنا ایسے ہی ہے جیسے ہم اپنے ذہن میں چپراسی کے منصب پر کسی عورت کو متمکن کرتے ہیں۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ کام وہ بھی کر سکتی ہے۔ یہ تو محض معمولی سی باتیں ہیں۔ اب میں خود کسی با اختیار افسر سے [illegible] طور پر پوچھوں گا کہ باوجود ان سب مشکلات کے کیا پھر بھی کوئی گنجائش موجود ہے اور آپ کو بالآخر اس سے مطلع کروں گا۔

تنخواہ ترجیح اپریل سے کم ہو گئی۔ توسیع کے متعلق بھی کوئی بات بظاہر موصول نہیں ہوئی۔ [illegible] نے توسیع کی سفارش کی ہے اور [illegible] لیکن وہ [illegible] معلوم اب صورت حال کیا ہے۔ افسوس آپ شادی پر نہ جا سکے [illegible] سے زیادہ افسوس اس بات کا کہ [illegible] کی طبیعت اچھی نہیں۔ میں نے آپ سے کراچی میں بھی عرض کیا تھا [illegible] تو مجھے لکھ بھیجئے۔ خدا کرے ان کی صحت اب سنبھل گئی ہو۔ شادی کے بعد زبیدہ کا خط نہیں آیا۔ اس لئے تفصیلات سے بے خبر ہوں۔ [illegible] ایک تار آیا تھا کہ کام بخوبی سرانجام پا گیا۔ زبیدہ کے خط کا انتظار ہے۔ [illegible] لیکن جو کام ہوا اس کے لئے یقیناً مسرت کا باعث ہوگا۔ افسوس کہ زمانہ اب وہ نہیں کہ شادیاں بطرز قدیم چار چھ مہینوں سے کی جائیں۔ [illegible] مجھے اکثر اس بات کا شدید احساس رہتا ہے کہ زبیدہ کو کس قدر ذہنی [illegible] کا سامنا ہوتا ہے۔ آج [illegible] کا خط آیا۔ [illegible] پشاور کے رئیس خان [illegible] کے [illegible] فضل سے ہو گئی ہے۔ [illegible] خدا کرے اس بچی کی زندگی کامران ہو۔ [illegible] سے بہت خوشی ہوئی۔

سلام کہنا [illegible] مبارک [illegible] تو میرا پیغام تہنیت پہنچ چکا ہوگا۔ [illegible] نے پہلے [illegible] صفحات پر بھی [illegible] دوستوں سے مل لیا۔ [illegible] صاحب کے ساتھ [illegible] لیا۔ مجید صاحب کو [illegible] کا جو نسخہ بتایا ہے وہ [illegible] اور دماغ کی [illegible] کے لئے بہترین نسخہ ہے [illegible] میرا سلام شوق کہئے گا۔ یقین [illegible] پانچ چھ [illegible] پڑھے [illegible] حالت میں تو [illegible] ہو گیا ہوں۔

سرفراز کا پنجاب چلے جانا حیرت کا باعث ہوا۔ میں سمجھتا تھا ان کا [illegible] بہت ہی [illegible] تھا لیکن شاید وہاں تنخواہ زیادہ ہو [illegible] خدمت کی گنجائش زیادہ ہو [illegible] معلوم [illegible] کیا کرتے ہیں [illegible] صاحب کو بھی سلام کہئے گا [illegible] شغل میں مصروف ہیں؟ ان کی کبھی کوئی خبر نہیں آئی [illegible] تو وہ مزید [illegible] کر رہے ہوں گے۔ خدا یا ان کا [illegible]

بخاری

---

(۱۰)

نیویارک ۳ جون [illegible]

برادر محترم۔ سلام مسنون! توسیع کے متعلق آپ کو اطلاع مل چکی ہوگی۔ [illegible] دونوں نے ازحد محبت اور اخلاق کے خط لکھے۔ ایک سال کی توسیع منظور ہو گئی ہے۔ اب کاش کسی کو اس سے پہلے ایسے [illegible] خط لکھنے کی توفیق ہوتی۔ اکثر لوگ ضابطے کا خط لکھتے ہیں۔ تو یہ ترتیب کر کے لکھتے ہیں کہ اس میں مکتوب الیہ کو اچھی طرح رگید جائے چنانچہ [illegible] اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ آدمی کو [illegible] میسر نہیں [illegible] ہوتا۔

معاش کی [illegible] دو صورتیں ہیں۔ تعلیمی ادارے اور [illegible] دونوں میں [illegible] لوگوں کے کان میں بھنک پڑی ہے کہ میں قومی خدمت

سے پبلیکیشن پر لکھا جاتا ہوں۔ وہ اب بھی لوگوں نے وہ شک نہیں ہے۔ رسالہ ماہِ نو قدرے بہتر ہے۔ بیانیہ سے شاعری پر بھی لکھ رہا ہے۔ بحث لیکن تحقیق نشانہ بنایا ہے تعلیمی اداروں لاہور اور قیصر تصوّف سے بیش نصیب اور تنقید کی بحث کوششیں اس پر نکلتی ہیں۔ بہتر تو وہ نشانہ ہے۔ جب یقین ہے وہ حق تنقید کی تحقیق سے پہلا پڑھے گا۔ آج کل اس کو ترجیح ہے۔ رجحان تعلیمی اہم کی طرف ہے۔ تصنیف کی جڑ عربی ہے۔ کچھ حالات زمانہ اور حیثیت اپنی فرصت کی حیثیت کی بدولت وہ جو کبھی نقش اپنی بدن نہ جڑ خدا کرے۔ مغربی ینفسری ہو کر تعلیمی کام کیا جائے جب خدا سے دعا ہے۔ کبھی نیکی کی جانب تعلیمی جانب کی تو وہ اس سے پہلے سے رکھی ہے اور دل وہ داغ ہوا مستقیم سے حیثیت گھوم رہے ہیں۔ جب ان کو کہتے ہیں۔ کر فدا ہو کر زندگی میں کچھ بھی اسے کچھ نہ چاہیے ادب کا امکان ہو۔ یہاں تحقیق اس لئے دے۔ بہت نہیں۔ بلکہ تاب۔ ہم کہتے ہیں ترجمہ شدہ سے اور ہم لیتے ہیں لیکن پتی کو ہندوں میں پائی ہیں۔ اس نے دور سے کچھ کہا۔ جا چکے تو پاکر۔

غیر ملکی بنیاد تو ہو گا سب سے بڑا۔ ایسی تصنیفات پر بہت کچھ فرق ہے۔ اس دوران میں تصنیف کی طرف دھیان دینا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے یہیں مشورہ دیا ہے۔ وہ کتابیں تم نے انگریزی میں) ایک مرکزی نے دی۔ اور لکھنے کی کتاب۔ وہ سب مرکز کے لئے ایک مختصر تاریخ ادب اردو۔ ان کتابوں کو چھپے وصول ہوں گے۔ وہ آئندہ بہتر کتابیں لکھنے کے کام میں گے۔ اب آپ کے ذمے یہ ہے کہ پاکستان سے ان کے لئے مسالہ بھیجئے۔ تاریخِ ادب کے لئے جتنی کتابیں جمع کر سکیں گے۔ منہ پیچھے انہوں نے کتاب کا مسالہ بھیجئے۔ اور وہ مسالہ یہ ہے۔ عبدالحق کی قواعد اردو۔ اور وہ پانچ چھ کتابیں جو کسی زمانے میں صاحب لوگ کے لئے لکھی گئی تھیں۔ ذرا مستند قسم کی حاجت۔ قرآن اس کے بعد ہوں گے۔ اس سلسلے میں مجھے مزید بار خیالات کا ہو آنا ہے۔ پہلے جو کتابیں ہاتھ آئیں وہ بھجوا دیجئے۔ ضرورت میں ادا کروں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ترتیب سے فہرست کتب مرتب کرنا شروع کر دیجئے۔

یہ کام بہتر ہو تو مجھ کا۔ اور کس سے کہوں؟ قیام کا بار بار خیال آتا ہے۔ لیکن وہ پیسے کاموں کے لئے مدت سے بیکار ہو چکے۔ دوستی نے کہا تو انہوں نے ادیب نے اس کو یہ رنگ دیا۔ یہ ایک نہایت معقول کتاب آج سے دس پندرہ سال پہلے لکھی تھی۔ عباس صاحب اکرام فرمائی کرتے ہیں لیکن وہ کچھ اپنے منصوبوں میں ایسے گرفتار ہیں کہ پہلی سی چہل پہل ان میں نہیں رہی۔

باقی آئندہ۔

خاکسار،

بخاری

۱۱

۱۱ جولائی ۱۹۵۳ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ آپ کا یکم جولائی کا خط چند دن ہوئے ملا۔ کتابوں کا پارسل بھی مل گیا۔ بے حد شکریہ۔ جانتا تھا کہ کراچی میں کتابوں کا جمع کرنا جوئے شیر ہے۔ تاہم آپ کو تکلیف دینے سے باز نہ آیا۔ وہ کیا کرتا؟ شید (ریڈیو والے) سے یہاں کئی صحبتیں ہوئیں۔ ان سے کتابوں کے بارے میں میں نے اپنی مشکلات بیان کیں۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے لئے کراچی میں ایک ایجنسی قائم کریں گے۔ جو آپ کے حسبِ ضرورت آپ کو اردو کی کتابیں بھیجا کرے تاکہ اگر آپ نیویارک میں بیٹھے تصنیف و تالیف کا شوق کرنا چاہیں تو بے کتابی سد راہ نہ ہو۔ میں نے کہا اس ایجنسی کا منتظم کون ہوگا یعنی میں یہاں سے خط کسے لکھوں؟ انہوں نے نیا نام

پیش کیا۔ بمبئی میں انہیں شعروں کا اور دو احباب کو بیکار میں پکڑ کر جیسا میں سے جو سال تک میں حاصل کر سکے ہیں بجز دیا کریں گے۔ ان دو صفحوں کے جو پیچ میں ہیں
کبھی اخباروں کا لیکن وہ بھی آخر آپ کی طرف رجوع کریں گے۔ اور ان کی توجہ کبھی ادھر مبذول ہو تو میں آپ کی بلا ہی تو ہوگا۔ ان سے ملاقات ضرور کیجئے۔ یہاں آکر ان
کا بیشتر میں چند شعر سنے پھر سنے تھے اور ان کے ذہن کو ایسی جلا ہوئی جس کی انہیں سالہا سال سے ضرورت تھی۔ داد ینے یا کچھ پسند ہوتی تھی تو میں کہہ نہیں سکتا
آپ کی چوں تکی کا اثر ذکر۔ ۔ اگر زنت بر کی نے غلط پرست ۔ نہ مخوسیج کرد بیسو ماشہ ۔ شیہ ۔ میں ۔ استیانہ وغیرہ۔ چند شعروں کی طرز روش ہو رہے لیکن کچھ
عجب ہماؤں کا مستانہ مرکز شغلے ۔ یا وہ دہواں ان کی قسمت میں تھا فقد ان کی فکر کی کا سامان یہی نظر آیا۔ چنانچہ سالہا سال سے جس سلسلے میں ہیں۔ آپ کو جن
شعروں نے سیراب کیا ہے ان کی تازگی کبھی کم ہونے پائی۔ اس پر بھی انہوں نے شیہ گستخوں باتیں کرتے ہے آخر آپ کو ہزاروں دعائیں دے کر آپ سے محبت پھر
ملاقات کیا۔ میں نے بھی ہیں نے بھی۔ پہلے رشید اور میری زندگی کے بہترین لمحات سے قبل آغوش کر دت فراموش کردی۔

کتابوں کا شکریہ۔ تاریخ ادب کی بیسی کتابوں میں سے صرف آب حیات میرے پاس ہے۔ باقی جب میسر ہوں بھجوا دیجئے۔ پہلے ایک مہربان فاکہ نیلا
ہی نے مطالعی کتابوں کی ضرورت بھی پیش کی تھی۔ سب ۔ ان سے لے کر اندر کی تک مکن ہیں مطابی اوہ ہے۔ ابھی تو پہلے چند قدم تول رہا ہوں

اب کے آپ نے طویل خاموشی کے بعد خط لکھا۔ خط لکھنے کے معاملے میں آپ نے کچھ مرشدوں کا سا رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ دو چار دن سے زیادہ دیر
ادھر نہیں ہوتے۔ اس لئے یاداں کرم میں غیر معمولی تاخیر ہو تو ہم مرجھانے لگتے ہیں۔ آج کل آپ کے کام کاج کا کیا حال ہے کیا اب بھی آپ کا وہی منصب ہے جو
سابق وزارت کے زمانے میں تھا؟

مجیدہ ملوری۔ رشید اختر ندوی، اور حسرت اور دیگر احباب کو سلام پہنچے۔ امید ہے بھابی کا مزاج اب بہتر ہوگا اور تشویش کی کوئی وجہ باقی نہ ہوگی۔
انہیں میرا مودبانہ سلام کہیے۔

خاکسار

بخاری

---

(۱۲)

نیویارک۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء

برادر محترم سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ بیماری میں آپ اکثر یاد آئے۔ جہاں گردی سیر و سیاحت کے لئے خوب ہے۔ لیکن قدرت کو کوئی ایسا انتظام ضرور کرنا چاہیے کہ انسان بیمار
ہو تو اپنے ہی وطن میں۔ اور دفن ہو تو اپنی ہی مٹی میں۔ علاج تو یہاں سے بہتر دنیا میں نہیں، لیکن روح کے زخم بھرنے نہیں پاتے۔ روح کی مسیحائی احباب ہی سے ہو
سکتی ہے۔ آپ خط جلدی لکھتے تو اچھا ہوتا۔ میں جواب نہ دے سکتا لیکن آپ کی آواز تو سن لیتا۔ بہرحال اب بھی آپ کا خط برکت کا موجب ہوا۔ یہ آپ نے خوب
پوچھا کہ علالت کیا تھی۔ جو ہم جیسے اہل دل ہیں وہ کب تک دل کو سنبھالے رہیں گے اس سے پہلے تو کوئی آثار نہ تھے لیکن یہ پچھلا سال مجھ پر بہت گراں گزرا۔ پاکستان
کا سفر اتنا مختصر تھا کہ اس سے جسم کو کچھ آرام نہ ملا اخراجات بہت زیادہ ہوئے واپس پہنچا تو مستقبل بزرگوں کی تنگ نظری سے جو خطرے لاحق تھے وہ سب صحیح ثابت
ہوئے۔ پھر تنخواہ کم ہوئی۔ پھر ریٹائرمنٹ کا نوٹس ملا .... جب مجھ سے مایوس ہوئے تو امریکیوں نے اپنا ایک آدمی کھڑا کیا اور اسے منتخب کرا لیا

پچھلے ہفتے پاکستان سے ایک سال کی رخصت ملی۔ اس میں تلاش معاش شروع کی۔ کچھ تدبیریں کامیاب ہوتی نظر آنے لگیں تو بیمار پڑ گیا۔ اب اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے پھر کوشش شروع کروں گا۔

لاہور سے کوئی خاص خبر نہیں۔ آپ [illegible] عزیز [illegible] جانتے ہیں آپ کے [illegible] کا علاقہ [illegible] مستقل اس شہر [illegible] اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم آپ کے بعد سے [illegible] ہونے کا [illegible]۔ حمید نظامی [illegible] ایک خط کی [illegible] سے [illegible] کی توقع کر رہا تھا [illegible] سکے گا۔ لیکن [illegible]۔ بالا [illegible] خود [illegible] ہے۔ [illegible] ہاشمی کا ایک خط [illegible] مجھے) البتہ چند دن ہوئے آیا تھا۔

پچھلے دنوں ایک ادارہ آپ سے رابطہ کرنے کا خیال آیا۔ ایک پبلشر نے مجھ سے ایک چھوٹی کہانی مانگی ہے (تحفتاً ایک [illegible]) یہ ایک مجموعہ میں شامل کی جائے گی جس میں سب دیگر [illegible] بچوں کی کہانیاں بھی شامل ہوں گی۔ مجھے ہی کہانی ایسی ہو جو قدیم [illegible] LORE پر مبنی ہو۔ دس بارہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے موزوں ہو اور [illegible] تو ایسی ہو کہ اس سے [illegible] نہ قتال و جدال [illegible]۔ [illegible] کہانی کا انتخاب [illegible] پہلے خیال آیا [illegible] سے پوچھوں لیکن ان سے جلد جواب کی توقع نہیں اس لئے آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عباس بھی آج کل کراچی ہی میں ہیں۔ آپ دونوں مل کر ایسی کہانی کا انتخاب [illegible] اور کون کرے گا۔ کہانی اردو میں بھیج دیجئے، میں اس کا ترجمہ یہاں [illegible] ترجمہ بھی جاری ہے [illegible]۔ اب پھر [illegible] امین الدین کے انتقال کی خبر آپ کے خط سے ملی۔ زبیدہ نے میری بیوی [illegible] پوشیدہ رکھا۔ حسرت کاشمیری اور حمید لاہوری [illegible] کاشمیری [illegible] ہم تینوں کی قسمت ایک ہی [illegible]۔ جس دیار کو فخریہ [illegible] اپنایا اسی سے اخراج ہوا۔

خاکسار

بخاری

عنقریب ایک اور خط لکھوں گا پیاس نہیں بجھی۔

---

(۱۴)

نیویارک ۱۰ نومبر ۵۳ء

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ [illegible] نومبر کا لکھا ہوا ملا۔ مختصر لیکن بہرحال مکتوب محبوب۔ [illegible] آنکھیں [illegible] ہوئیں۔ اس اثنا میں بشیر ہاشمی کا خط بھی ملا جن دنوں آپ لاہور میں تھے، [illegible] آپ کے اعزاز میں ہو رہی تھیں۔ ان دنوں وہ بے چارہ [illegible] مبتلا تھا اور ماتم کر رہا تھا کہ آپ کی صحبت سے محروم رہا۔ ان کے میرے درمیان خط و کتابت نے حال ہی میں ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ بھی بیمار ہیں میں بھی بیمار۔ وہ بھی بر لب پنشن میں بھی بر لب پنشن۔ دونوں کے خط ایک ہی زمین میں ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے کلام میں سوز مجھ سے زیادہ ہوتا ہے اور نزاکت طبع بھی مجھ سے وافر۔ چغتائی کے خط بھی حال میں مسلسل آئے۔ وہ اپنے گنبد [illegible] میں میری بیماری سے بے خبر ہے چنانچہ ان کے خطوں کا لہجہ بے حد تندرست ہے اور اکثر [illegible] ثابت ہوا

ہے۔ ایک کہانی انہوں نے اس دوران میں لکھ ڈالی ہے (یہ بات بصیغۂ راز ہے۔ آپ کسی سے ذکر نہ کیجئے۔ بات باہر نکل گئی تو وہ برہم ہو جائیں گے) کسی نظرِ کرم ہی کو یہ افسانہ بخشنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ صورت سوجھی ہے کہ اس کا پہلے انگریزی میں ترجمہ کروں اور پھر وہ سب سے اتفاق کر لیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو اور ان کی سب توقعات پوری ہو جائیں لیکن میں بے اختیار ہو کر ہر قسم کا اندازہ لگانے میں عاجزی دکھاتا ہوں۔ وہ ریسرچ کا کام تجویز کروا لائے ہیں کہ روسی اس قسم کے افسانے کو سمجھ سکے گا۔ ورنہ آپ کو تو پتہ ہی ہے جیسے ہوتے ہیں۔ لکھنے کا سلسلہ رواں... ... وغیرہ وغیرہ

آپ کا ارسال کا شکریہ۔ پطرس کی کہانی جس کی بابت تعارف ہے محض فرانسیسی نام ہے یہ ... لیکن اُدھر کی عورتوں نے ایک مضمون کا انگریزی ترجمہ بنایا ہے۔ اس سے پہلے مختلف تراجم کے خاتونوں کے ترکیبی نسخے شائع کر چکی ہیں۔ اب کہانیوں کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ یہ ... ہی ہیں۔ اور تصنیف کتابوں پر زور کرا لیتے ہیں ... چاہتی ہیں۔ نیاز کیا ہو گیا ہو گا کبھی خط لکھنے کا عام سہی تھے۔ کئی مرتبہ میں نے سوچا لیکن ہر مرتبہ تھک کر بیٹھ گیا۔ کچھ چند ... اور احباب کی وساطت سے ان کو ... شوق بھیجتا رہا۔ وہ بھی قبول نہ ہوا تو اسے بھی ترک کر دیا۔ سنا ہے آپ جا رہے ہیں پر کچھ عجیب کیفیت سی چھا گئی۔ سٹوڈیو اور گھر کے آنگن سے باہر نہیں نکلتا۔ زبیدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ... اور یاسمین ... والد کا ... ہوا ... لیکن کیا کروں۔ نیاز ... نیاز نے سب سے بے مزہ معلوم ہوتے ہیں کبھی آپ سے عشق۔ ملنا ہو تو میرا سلام کہئے گا

دو تین دن ہوئے تمیز (یعنی ڈاکٹر حمید الدین مرحوم) امریکہ وارد ہوئے۔ ان سے لاہور کا ذکر دیر تک رہا۔ صوفی کی بے عنایتیوں سے ملول تھے۔ کچھ تو اس میں حمید الدین کی اپنی تنگ نظری شامل تھی لیکن اس سے قطع نظر کچھ حقیقت بھی ان کے بیان میں ضرور تھی۔ حمید کی نظر میں لاہور بے حد خراب ہو گیا ہے۔ گیا وجہ کہ جو محنت تنگ کرتے ہیں اور ہر راہ پر دکان ... سمجھتے ہیں۔ کچھ حال عابد علی کا بھی بیان کیا۔ اس کی زندگی بھی سدا فرحت رہتی ہے لیکن اکر نام تھے ... معلوم ہوتے ہیں۔

چاہتا ہوں کوئی پبلشر ہم سے ٹیکسٹ بک لکھوائے۔ عمر بھر یہ کام نہیں کیا لیکن اب یہ گناہ کرنے کو بھی دل چاہتا ہے کسی کوشش کر کے آزما دیکھئے۔ میں نے ہاشمی سے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ آپ لوگ خیال رکھیں تو ممکن ہے کوئی سبیل نکل آئے۔ مانا کہ اس عمر میں جب کہ یونیورسٹی وغیرہ میں میری قیمت گر گئی ہو گی تاہم کوئی عقل کا اندھا سہی کا نفع کا پورا ہو جائے تو عجب نہیں۔ عمر بھر میں ... کرتا رہا اب "ہاں" کہنے کو تیار ہوں۔ صرف ایک آدھ کی بات ہے۔

اور باتیں بھی کہنے کی ہیں۔ لیکن آئندہ خط میں ان کا ذکر کروں گا۔ آپ کو جب بھی خط لکھنے بیٹھتا ہوں جی اُسے ختم کرتا ہوں۔ ورنہ عاشق کی داستان سے محبوب ختم سب ہوتی ہے۔ حسرت، عبدالمجید لاہوری اور عباس اور اختر ندوی اور دیگر احباب کو میرا نام اور شوق یاد دلا دیجئے گا۔ تازہ تازہ خبر آئی ہے کہ ڈان پر عتاب نازل ہوا۔ ڈان اور حکومت کے باہمی عشق کے رموز آج تک سمجھ میں نہیں آئے۔ حالی کا شعر یاد آیا کہ

عشقِ کامل کے دونوں ہیں مرغوب
سحرِ وصل و شامِ تنہائی

خط لکھتے رہیے۔

خاکسار
بخاری

(۱۴)

نیویارک ۱۰ نومبر ۱۹۵۰ء

برادرِ محترم سلام مسنون۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں ایک کتاب ایڈٹ کروں جس کا عارضی نام ابھی "A STUDY OF PAKISTAN" قرار پایا ہے۔ پندرہ ابواب ہوں گے۔ ہر باب میں پاکستان کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی۔ مصنف ایک نہیں بلکہ کئی ہوں گے۔ چیدہ چیدہ لوگوں سے لکھوایا جائے گا اور امریکن ناشر ہوگا۔ تصاویر، نقشے وغیرہ بھی کتاب میں شامل ہوں گے۔ سیاست کا باب خواجہ ناظم الدین صاحب لکھیں گے۔ بعض تاریخی موضوعات پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کو دعوت دی گئی ہے۔ چند ابواب راقم الحروف لکھے گا۔ ایک باب پاکستان کے جرنلزم پر ہے۔ وہ میں آپ سے لکھوانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ سے زیادہ موزوں کوئی شخص نہ ہوگا۔ آپ اردو میں لکھ دیں۔ انگریزی میں ترجمہ یہاں ہو جائے گا۔ غرض یہ ظاہر ہے کہ شاید خاصے کی صحت کی نقل آپ نے ابھی کبھی نہیں سنی کتاب بہرحال دنیا بھر میں مشہور ہوگی۔

مضمون عالمانہ ہونا چاہیے اور آپ کے قلم سے تو یہ توقع بھی ہے کہ قارئین کے دلچسپ نظر ہیں اول پاکستان کے جرنلزم سے متعلق بے خبر ہوں گے دوم وہ خود جرنلزم کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ مجھے سلسلۂ کلام اس قسم کا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم سے پہلے ہمارے ان اخبارات کی کیا حالت تھی، تعداد کیا تھی، اشاعت کیا، نکلنے والے ایڈیٹر اور مالک کون، اخبارات کی چال ڈھال کیا تھی، سیاست کے کن سے پہلو ایڈیٹروں کو مرغوب تھے، تقسیم کے بعد جرنلزم میں کیا انقلاب آیا، پریس کی کیا حالت ہوئی، انقلاب کے بعد توازن کہاں کہاں آن کر ٹھہرا۔ اردو کے کتنے اخبار ہیں، انگریزی کے کتنے، بنگالی کے کتنے، اشاعت کیا ہیں، موضوعات کیا ہیں، اس پانچ چھ سال کے عرصے میں سب سے زیادہ بحثیں اخباروں میں کن موضوعات پر ہوئیں اور کس قسم کے خیالات کا اظہار ہوا۔ اخبارات کی تیاری کیونکر ہوتی ہے (مثلاً ٹائپ وغیرہ) اشاعت کیا ہے، حلیہ اور نقشہ کیا ہے۔ روزنامہ، ہفتہ وار، ایڈیشن، ادبی مضمون، شعر، مجید لاہوری وغیرہ وغیرہ، پریس کے قانون کس قسم کے ہیں، کیا اکثر اخبار ان کی زد میں آتے ہیں یا اکا دکا (ایسی باتیں احتیاط سے لکھنی پڑیں گی لیکن دس قدر کہ بالکل ہی بے ذوق ہو جائیں)۔ اسی لئے آپ کا خیال آیا کہ آپ میانہ رو مضمون اعلیٰ درجے کا لکھ سکتے ہیں)۔ مضمون بہرحال معلومات سے پُر ہونا چاہیے اور یہ آپ کے لئے مشکل نہیں۔ آپ کے مختصر سوانح میں خود لکھوں گا۔ کہیے کیا خیال ہے؟ خدا کرے آپ کا جواب اثبات میں ہو۔ مضمون کے لئے آپ کو کتنی مہلت درکار ہوگی۔ اوروں کو ایک یا دو مہینے کی مہلت دی گئی ہے۔ یہ کم نہیں اور امید ہے کہ آپ کو بھی منظور ہوگی۔ جواب سے سرفراز کیجیے۔

ایک باب ادبی رجحانات پر ہے وہ خود لکھنے کا ارادہ ہے لیکن سامان اور مسالہ یہاں ناپید ہے (ایک طرف یہاں مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ رسالے کون کون سے اور کتنے نکلتے ہیں، باقی آپ یہ مضمون کے لئے جو معلومات درکار ہیں اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ عباس صاحب کو بیگار میں پکڑیے وہاں سے مجھے میری مدد کریں۔

جرنلزم کے سلسلے میں خیال آیا کہ اگر کوئی مزے دار اخباری نظمیں پیش نظر ہوں تو ان کا ترجمہ بھی نمونۃً شامل مضمون کیا جا سکتا ہے۔ اس پہلو کا لحاظ بھی کیجیے گا۔

ذوالفقار سے ریڈیو پر گفتگو ہوئی تھی لیکن ذوالفقار کے بعد وہ آج کل سیدہ کی شادی کے انتظامات میں منہمک ہوگا۔ شادی ۲۰ دسمبر کو ہے کیونکہ ذوالفقار کا خط آیا ہے آج ہی کا تھا (ہمی کا خط بھی آیا۔ کسی کتابوں کا بازار مندا معلوم ہوتا ہے۔ بقول ہاشمی کے ہزاروں لاکھوں کا نقصان ہوا۔ سب کو رائی دوتی ہزار

یہ پہلا کالج ہے جسے یونیورسٹی ... لیکن اس نے ... کا ارادہ کیا ہے۔ ایک کتاب "PUNJAB PRELUDE" نامی میرے پاس ریویو کے لیے آئی ہے۔ مصنفہ کا نام مس RIEU ہے جو کہ مرحوم خواجہ ... کالج میں پڑھاتی تھیں۔ ... اب بھی پڑھاتی ہوں۔ پاکستان، پنجاب ... اور ہندوستان کے ... بار بار ثابت کرتی ہیں کہ پنجابی اور انگریز دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک باب ہاشمی صاحب کے خاندان پر (... تحریر شدہ) ہے اور چار سے تھا کر ... کے حالات سے بھی واقف ہیں۔ ایک حصہ "بیسٹ اینڈ گرل ڈبل" کے متعلق ہے "ضمیمہ" اور "اینڈ بوسٹ ٹربل" کا حال بھی بیان کیا ہے۔

خاکسار

بخاری

آج یہاں کے اخبار میں خبر چھپی ہے کہ کابینہ میں ردو بدل ہونے والا ہے جو ... کے افسروں میں ہونے والی ہے۔ اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر قسم کی آفات سے بچائے۔ ہم یہاں پاکستان کی بہبود اور پاکستانیوں خصوصاً اپنے احباب اور اقربا کی بہبود اور سلامتی کے لیے دست بدعا رہتے ہیں۔

---

(۱۵)

ادا مرتبت ...

برادر محترم سلام مسنون۔ گرامی نامہ مورخہ ... کو ملا۔ یہ آپ کے مفصل تر خطوں میں تھا لہٰذا بہت لطف آیا۔ اور ذہن نے لمبی چوڑی مسافت مرے لیے کر لی۔ مضمون کے متعلق عرض یہ ہے کہ قبل پاکستان کے ان اخباروں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو موجودہ پاکستانی علاقہ سے شائع ہوتے تھے تاکہ اس علاقے کی صحافتی درجہ بدرجہ کچھ حال معلوم ہو نیز ان اخباروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا جو پاکستانی علاقے سے شائع تو نہ ہوتے تھے لیکن جن کا پاکستانی تحریک سے گہرا تعلق تھا مثلاً ڈان۔ تنا لکھنے کے بعد یہ بھی کہنا لازم ہے کہ میرا یہ مشورہ کچھ فضول سا ہے۔ دراصل پاکستانی صحافت کا حال بیان کرنا ہے۔ اب اس کا پس منظر بیان کرنے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے یہ آپ کے حسن مذاق اور احساس ربط پر چھوڑتا ہوں۔ ان سے بڑھ کر کسوٹی بھی کوئی نہیں۔ البتہ یہ خیال رہے کہ قارئین انگریز اور امریکی ہوں گے۔ اور جس نیچ سے یہ باب کتاب میں شامل ہوگا اس سے پاکستانی معاشرت پر روشنی ڈالنا مقصود ہوگا۔ غیر ملکوں کے لوگ ایشیائی ممالک کے بارے میں اکثر بالکل بے خبر ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیا کے لوگ کس قسم کے لوگ ہیں کیا کر رہے ہیں کیا سوچ رہے ہیں کس رخ جا رہے ہیں قوت کس کے ہاتھ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان خیالات کے زیر عنوان صحافت کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس آلۂ جمہور کا ایشیا میں استعمال کیا ہے کون کر رہا ہے؟ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی باتیں کہ کتنے لوگ اخبار خریدتے ہیں اور ہر اخبار کی اشاعت کتنی ہے۔ کتنے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ کس طبقے کے ہیں۔ کس قسم کی خبریں سب سے زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہیں۔ کس قسم کی خبریں نادر یا مفقود۔ کون سے طبقے اخبار کے اثر سے بالکل ہی بے نیاز یا محروم ہیں۔ اس طرح کی باتیں یہاں لوگوں کے لیے ازحد دلچسپ ہوں گی۔ لوگوں کو یہاں کرید رہتی ہے کہ ایشیائی ممالک جنہوں نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ اپنی آزادی کو کیا لباس پہنا رہے ہیں۔ اس کے تحت میں آپ جانتے ہیں صحافت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لوگ اکثر اس کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے ہیں مثال کے طور پر جب میں کراچی میں تھا تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آئین کے متعلق اچھی بری تنقید بھی بیٹھک ہوتی ہیں اور مطالبات کے کالموں ہی میں ہوتی ہیں۔ اور علاوہ ازیں اس کے ... جتنی سیاسی جماعتیں ... ہیں ... بھی شکایت آمیز کا اظہار کیا جاتا؟

لیکن یہ سوال ایسا نہیں [illegible] کے متعلق [illegible] کی وضاحت [illegible]
[illegible] یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس قسم کی باتیں آپ کے [illegible]
[illegible]

۔۔ ادبی رجحانات کے متعلق عرض کیا تھا کہ میری جانب سے عباس سے استفادہ کیجئے، اس کے متعلق آپ نے کچھ [illegible] آپ اس سے براہِ راست خط و کتابت کریں۔ شاید آپ کو اس میں سہولت ہو۔ [illegible] کے متعلق آپ کی [illegible] کا شکریہ۔ [illegible] کا انتظار کر رہا ہوں

ہاشمی کہتا ہے کہ کتابوں والی بات یہ ہے کہ حالات [illegible] ہیں۔ پہلے عرض کر چکا ہوں ... [illegible] صاحب کراچی کے [illegible] پبلشرز کو [illegible] ہوگا۔ چنانچہ ہاشمی صاحب کا ارشاد آپ نے [illegible] کر رہا ہوں۔

اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ عنقریب ایک اور خط [illegible] لکھوں گا۔ [illegible] صحت بہت خراب ہے۔ [illegible] یہاں سے رخصت ہونے [illegible] کراچی پہنچیں گے۔ [illegible] ہوگا۔

خاکسار

بخاری

خط کے [illegible] میرا نام [illegible] نہیں [illegible] استعمال کرنا پڑا۔ اس سے [illegible]

[illegible]

---

(۱۶)

جانِ برادر کئی دن سے آپ کا خط نہیں آیا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ آپ کا آخری خط [illegible] آپ نے [illegible] کے تاریخی حالات لکھ بھیجے تھے۔ اس کا میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا [illegible] معلومات [illegible] اور اس کی بدولت [illegible] تاریخ [illegible] ترجمہ کیا [illegible] ہے۔ اسی لئے تو احباب سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ ترجمے کے لئے [illegible] عباس نے اس سلسلے میں دستگیری کا ارادہ کیا تھا۔ ایک خط میں اس مضمون کا انہوں نے لکھا تھا پھر خاموش ہو گئے۔ [illegible] آج کل کچھ پژمردہ رہتا ہوں۔ [illegible] آ گیا ہوں۔ تجربے [illegible] اس [illegible] سے سفر [illegible] لیکن احباب [illegible] اتنا اہم [illegible] کیا کہ [illegible] یہاں سے [illegible] حالات آپ جانتے ہیں۔ [illegible] سرطان کا خطرہ [illegible] اس کی وجہ سے میں یہاں سے [illegible] منظور کر لیا۔ [illegible] اب معلوم نہیں کب تک ہے۔ اکتوبر میں اپنی مستقل ملازمت سے [illegible] وقت گزر گیا [illegible] سال [illegible] تعلیم [illegible] آج تک [illegible] اکتوبر کے [illegible] قرآن [illegible] اس عرصے میں ہم نے [illegible] ملازمت [illegible] ہے اور [illegible]

سے ہو سکے تو [illegible] اور میری بیوی کو میرا سلام کہئے۔ بہرحال تقریر اور بلاسٹ کے شب و روز کی یاد تازہ ہو گئی یہاں سے گزرے۔ دو شامیں ان کی صحبت میں بسر ہوئیں۔ زندہ دل انسان ہیں۔ اس بارے میں کا شکریہ۔ بعض مقامات اس میں نہایت دلچسپ ہیں۔ بعض غلطیاں بھی ہیں۔ ان کو ٹھیک اپنی اپنی جگہ۔ آپ بعض بیٹھے اس میں نشان دے دیتے ہیں۔ شاید مطالعہ بعض حاشیہ نشین جنہیں میرے گزشت کی چاٹ پڑ گئی ہے: جیسے کہ اس ذہن میں آتے وہ اشعار کی طرف مائل تھے لیکن دوبارہ تحریر کیا۔ اصل میں روشن ہونے کے آخری باب میں جو زبانی گیت شامل کئے ہیں ان میں سے بعض کئی روز دماغ میں لپٹتے رہے۔ میری گھڑی کسی نے دیکھی تو شاید دل بجھ جاتا۔ آگ بال کے دھوئیں سے اور دوال [illegible] سینہ بہ سینہ چلے سے پرے رنگ دل پاش پاش۔ تے بیاں نے دل ڈال دیئے۔ کتنا خط ہو بے ساختہ بولوں میں بندہے پنجاب کے [illegible] تھے معلوم ہوا۔ آزادی کے متوازن ہے جیسے یہ بھی صفحات میں شائع ہوا۔ اس خط کی رسید فوراً بھیج دیجئے گا۔ خدا سے معلوم ہوتا ہے کہ اب پاکستان میں ہر طرح امن و امان ہے۔ خدا ہم سب کا نگہبان ہو۔

بخاری

---

(۱۷)

برادر محترم اس ڈاک میں دو خط ملے۔ ایک آپ کا ایک والد کا۔ دونوں کے جذبات ایک سے تھے تو مضمون مختلف تھے۔ والد کا ارشاد ہے کہ میں سال ہوا انفلوئنزا میں مبتلا ہوں۔ تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر کے مفصل معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس جسم فانی میں کئی اور نقائص پیدا ہو چکے ہیں۔ جن کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ قلب کی حرکت، خون کا دباؤ، جگر، معدے کی حالت ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔ بہرحال اب یہ توقع تو ہی بھی نہ تھی کہ زندگی ابدی ہے نہ اس بات سے لاعلم تھے کہ جوانی آنی جانی چیز ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ کشاکش غم پنہاں نے وقت سے پہلے بیمار کر دیا۔ بہرحال بقول ایلا ویلر ولکاکس کی اس نظم کے جس کا ترجمہ آپ کسی زمانے میں مشاعروں میں زور و شور کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ رونا تنہائی پسند ہے۔ اس لئے اب کیا آپ کی سمع خراشی کروں۔ بہتر ہے کہ چپ رہوں۔

آمدم برسر مطلب۔ حالات وہی ہیں جو آپ نے بیان کئے ہیں۔ پالان اور طوق زریں کے متعلق جو نظریہ آپ نے بیان کیا ہے۔ وہ بھی حرف بحرف صحیح ہے۔ میری صرف اتنی درخواست تھی کہ آپ کو میرے خلوص یا مستعدی پر کبھی شبہ نہ ہونا چاہئے۔ میرے خط کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ اعتذار لب تک کر یں آہ نہ یاں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا جس طرح بن پڑا۔ جب بن پڑا۔ میں دریغ نہ رکھوں گا۔ اس میں کوتاہی ہو تو اسے اپنی رسوائی سمجھوں گا۔ کہنا صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں اس وقت بری طرح بندھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میری بے بسی کو میری کاہلی یا محرومی سمجھئے۔ اسے بے اعتنائی پر محمول نہ کیجئے۔ لیکن امکان آتا ہے کہ لاہور میں جو صاحب اختیار ہیں۔ ان سے کسی وقت ملئے۔ اتفاقاً کسی صحبت میں ملنا ہو تو اور بھی بہتر ہو گا۔ وہ ایک دن میں انہیں بھی پیغام بھیجوں گا۔ اور جو ترکیب میرے ذہن میں آئی۔ وہ انہیں سمجھاؤں گا۔ ملتے وقت میرا نام بھی لے دیجئے اور کہئے کہ میں اس کے دیباچے مل رہا ہوں۔ برادر محترم ان کشمکشوں میں کئی معرکے اور مرحلے پیش آتے ہیں۔ لامحالہ مسلسل کوشش اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ قسمت یاور ہو تو کامیابی جلد نصیب ہو جاتی ہے ورنہ بعض اوقات شکیب آزما صبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو آپ کہیں اور میں سنوں۔ برعکس اس کے میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں میں مجبور ہوں معذور نہ ہوتا تو آپ کو اس معاملے میں ذرا بھی تشویش نہ ہونے دیتا لیکن کیا کروں ؎

پیکر قد و تقدیر من نہ بدست ما ہم چو من گر دہام من طینے نہ کند من ور تا گر

یہ اس خط کا جواب ہے جو غلبہ جذبات میں پریشانی کے عالم میں لکھا ہو۔ کم از کم اپنی پریشانی میں مجھے بھی شریک کر لیا کیجئے۔

آپ کی محبت، شفقت، علوئے فطرت کی بدولت باوقعت یہ تقریب نصیب ہوئی ہے۔ جب آپ پریشان ہوں لیکن گھبرائیں نہیں کہ کسی کو پریشان اور [illegible] آپ کے پاس بھی [illegible] ماسٹر نذیر کو [illegible] بھیج دیتا۔

میرے ہوش کا [illegible] احوال [illegible] اور بہت [illegible] سے گزرا ہے۔ کبھی فرصت ہوا تو [illegible] شاید مطلب [illegible] کا محتاج ہوں۔ مجھ میں سب اتنی ہمت نہیں کہ سی [illegible] بھی کچھ [illegible] کر رہا ہوں۔ لیکن [illegible] کے ساتھ [illegible] ہے۔ آپ کی [illegible] سلام بھی ہیں۔ آپ کو بھی اور گھر کے لوگوں کو بھی۔

خاکسار

بخاری

---

(۱۸)

۳ تغلق روڈ

نئی دہلی ۱۰ دسمبر

برادر محترم سلام مسنون۔ فی الحال خبر رساں ایجنسیاں غیر انگریزی اخبارات کو بھی خبریں انگریزی ہی میں بھیجتی ہیں۔ یہ اخبارات خود اپنے مترجموں سے ان کا ترجمہ کرا لیتے ہیں۔ اس سسٹم کے نقائص یہ ہیں:—

(۱) خبر رساں ایجنسیوں کو خبریں جمع کرنے کے لیے ایسے کارسپانڈنٹ رکھنے پڑتے ہیں جو انگریزی سے کما حقہ واقف ہوں۔ بعض دیسی زبانیں جاننے والے کارسپانڈنٹ خواہ انہیں اپنی زبان میں کتنی ہی مہارت حاصل ہو اچھے کارسپانڈنٹ نہیں بن سکتے۔

(۲) تمام واقعات کی خبریں انگریزی ہی میں جمع کی جاتی ہیں حالانکہ مضافات میں کئی ایسے دلچسپ واقعات پیش آتے ہیں جو دیسی زبانوں ہی میں بخوبی ادا ہو سکتے ہیں۔

(۳) ہر غیر انگریزی اخبار کو ایک دو تین مترجم رکھنے پڑتے ہیں۔ بعض اوقات کم جو مترجم مختصر اور کم استعداد ہوتے ہیں۔ اور خبروں کی حیثیت ناقص ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ترجمے میں وقت صرف ہوتا ہے۔

ان نقائص کو رفع کرنے کے لیے نیز دیسی زبانوں کی روز افزوں اہمیت کے پیش نظر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خبر رساں ایجنسیاں اپنے کارسپانڈنٹوں سے خبریں دیسی زبانوں ہی میں منگوائیں۔ اور انہی زبانوں میں اخبارات کو بھیج دیں۔ یعنی ایسوسی ایٹڈ پریس کا نامہ نگار (مثلاً [illegible]) اپنے ہیڈ آفس کو خبر اردو میں بھیجے اور خبر رساں ایجنسی کا ہیڈ آفس آپ تک وہ خبر اردو ہی میں پہنچا دے جو آپ بعینہٖ یا انتخاب و اختصار کے بعد بغیر ترجمہ کی زحمت پیش آنے کے اخبار میں چھاپ سکیں۔

اب اگر اس میں آپ کو کوئی خاص فائدہ یا سہولت نظر آتی ہے تو پھر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ ایسی خبریں ٹیلی پرنٹر پر کیونکر بھیجی جائیں گی۔ اس کا جواب سوائے رومن رسم الخط کے اور کچھ نہیں۔ رومن حروف اور دیسی زبانوں کے حروف کی آپس میں پوری پوری تطبیق ممکن نہیں لیکن اس کی شاید ضرورت بھی نہیں۔ دیسی زبانیں بھی [illegible] آسانی کے ساتھ رومن حروف میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ شاید کہیں کہیں ابہام رہ جائے لیکن سیاق و سباق اکثر ابہام کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔ جہاں اس سے بھی کام نہ چلے وہاں شاید دقت ہو۔ لیکن ابہامات کا خطرہ تو موجودہ سسٹم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ بعض تراجم اصل سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

اس سلسلے میں آپ کی واقفیت سے مستفید ہونے کا ارادہ ہے کہ تو پھر بھی نہ خلیفہ کا نام اور پتہ ہے ... اخبار کس حد تک اس وقت باعث کا تذکرہ مقدم ہوں گے۔ ممکن ہے یہ سلسلہ پہلے ہی آپ کے زیر غور رہ چکا ہو اور آپ اس کے نشیب و فراز پر دماغ سوزی کر چکے ہوں۔ ہے اس پی تعلق کے بہت سے معاملات نظر آئے ہیں۔ اس لئے آپ کی توجہ اور حوصلہ افزائی کہ آپ کی رائے دریافت کروں۔ جواب کا منتظر

بندۂ خاکسار

بخاری

---

(۱۹)

برادر محترم۔ گرامی نامے کا شکریہ۔

میاں صاحب کی معاملہ فہمی اور آپ کی معاملہ فہمی کی بدولت خدا خدا کر کے فیصلہ ہو گیا۔ ان کے بعد چیز ہی کا خط پہنچا۔ کہ پرنسپل کا عہدہ یکم مارچ سے خالی ہوگا مناسب ہے بوقت سبکدوش کر دیا جائے۔ چیزی کے ایک بھی خط اور میاں صاحب کے ٹیلیفون سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر یکم مارچ سے رخصت لے گا۔

میرا ارادہ ہے کہ جنوری فروری دو مہینے کی چھٹی لے لوں۔ بہرحال دسمبر کے آخر تک قطعی طور پر اس عہدے سے فارغ ہو جاؤں گا۔

آپ کی تنگ روزگار کا شکریہ۔ درست وہ ہے جو کہ . . . اگر اس مصرعے کے مطابق پڑھا جائے تو جو معنے نکلتے ہیں۔ ان کے مطابق دیکھنے کے کیا معنی ہوئے؟ اور پھر دھڑکا کس کو کہتے ہیں۔ ایک نسخہ تمنا یہ ہے کہ درست وہ ہے جو کہ دھڑکے سے درست کرے۔

سلیقہ۔ انگریزی روزمرہ میں رخصت کے وقت ٹاٹا کہتے ہیں۔ جس کے معنی گڈ بائی کے ہیں۔ بعض لوگوں نے تجویز کیا ہے کہ چونکہ دلی کے ارباب اقتدار پراگ لال کے سرمایہ دار بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے دلی میں جس طرح السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ٹاٹا کے جواب میں اس کے بجائے برلا دو بولا جائے۔ جو لوگ دیندار ہندو ہیں اور جے رام جی کی وغیرہ کہتے ہیں۔ انہیں چاہئے۔ اب سری رام (یعنی سر شری رام مالک دلی کلاتھ مل) کہا کریں۔ غصے کے اظہار کے لئے موزوں ترین لفظ ڈالمیا ہے اور اسے "آ گیا" ڈالمیا کہنا چاہئے۔ جانے کا اندیشہ۔

نومبر کے تیسرے ہفتے میں لاہور سے ... جانے کا ارادہ ہے۔ ملاقات ضرور ہوگی۔ سنتا ہے امتیاز لاہور واپس آگیا ہے۔ نہ خط لکھتا ہے نہ ملتا ہے دلی سے شمال جنوب کر کے گزر جاتا ہے اور ہم سے نہیں ملتا۔ جیسے صحت بچے کے پورا ہونے تو ڈھونڈوں گا۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۰)

برادر محترم۔ گرامی نامہ ملا۔ آپ نے جو زحمت اٹھائی اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ ملاقات سے ۲۲ ہی ہوئی ہے۔ میاں صاحب کے دلی تشریف لانے کا علم نہ

[illegible] بھی چھوٹی سی چیز یہاں وقت ہوگی۔ ممکن ہے وہ ادھر میاں صاحب دونوں کا [illegible] ایک دوسرے سے ملنے کا شوق ہو۔ بہرحال میں میاں صاحب سے مل لوں گا۔ اور آپ کو ان کی طرف سے مطلع رکھوں گا۔

زبیدہ نے آپ کا خط پڑھا۔ آپ دیہ جو کتاب کے بچوں کو دلا دیں ... مجھے تو [illegible] صاحب نے اس طرح [illegible] نہیں کیا۔ میں نے کیا بیانفظا باطل ادا داری تھا۔ اس کا دیا کی جواب ضروری تھا۔ باقی صاحب دوست اس دو دل۔ بہرحال [illegible] آنے کے خیال سے زندگی میں یکی سے تھوڑی تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ جانتا ہوں کہ اس سال کا وہ اپنی طبیعت میں اور اوقات میں کئی ایسی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں جس سے وہ پہلے [illegible]۔ یہاں بہرکیف مرتبہ اور کئی موقعوں پر دل کو شغل کر دیکھ لیا ہے۔ وہ سب نشیب و فراز دیکھے۔ لیکن تعلیاں [illegible] کے بعد بار بار اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ... دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است ... صراحی مئے ناب و سفینۂ غزل است۔ [illegible] بات ہے [illegible] اب تک ہے۔ امتیاز علی تاج کی کئی داستانیں سنتا ہوں۔ لیکن ایک سالک ہے جس کا حسن [illegible] کی طرح بقول شکسپیر کے مرور زمانہ سے [illegible] نہیں ہوتا۔

[illegible] اگر کسی شخص کا ... آپ پر یہ سوچ کر کہ ایک بار پھر آپ کی طویل صحبتیں نصیب ہوں گی۔ اور [illegible] طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہوتا ہے بہت تھک گیا ہوں اس سال سے کوئی چھٹی نصیب نہ ہوئی۔ آپ جب آئیں گے ... خوشی ہے [illegible] دنیا میں کسی کو نصیب نہیں۔ تو بہرحال اس کے قریب ترین کیفیت جو نصیب ہو سکتی ہے وہ [illegible] ہوگی۔ [illegible] باقی کی باتیں [illegible] ان باتوں پر میں نے بہت کچھ [illegible] اور بات کا [illegible] مطلع کر سکے گا۔

والسلام

بخاری

۱۰ اکتوبر

---

(۲۱)

مسز حیدری

[illegible] میں نے ایک خط آپ کو لکھا تھا۔ اس خط کو اس [illegible] رات میرے یہاں ایک [illegible] میں [illegible] علاوہ آغا حمید، حفیظ، فیض، راشد، حسرت، عباس، [illegible] سب موجود تھے۔ میں نے سب کو ایک ایک مصرع دے رکھا تھا [illegible] شروع ہی کر دیا۔ چند شعر اس طرح پر [illegible] چنانچہ سب نے مشق کی۔ میں نے اور [illegible] بھی طبع آزمائی کی۔ جب اس طرح شیاطین جمع ہوں [illegible] دیا۔ اور دونوں استادوں میں خوب خوب شعر ہوئے۔ اس طرحی مشاعرے کے بعد [illegible] شروع ہوئے۔ [illegible] حفیظ اور فیض نے اپنا [illegible] [illegible] ساڑھے چار بجے خود گھر پہنچا۔

[illegible] سب لوگ جمع ہوں اور آپ کا [illegible] مرتبہ نہیں ہوا ... جیسے [illegible] آپ ... مسز حیدری کے [illegible] آپ ... شعر [illegible] آپ کے [illegible] ایک ایسا مشاعرہ ہو۔ طرح [illegible] جہاں آسماں نہیں (قافیہ جہاں، آسماں) اور [illegible] [illegible] آپ کے [illegible]

تک تاثیر نہیں ہوں گے۔ ذرا افکار [illegible] اور فیض [illegible] بھی آ رہے ہیں لیکن [illegible] ہے وہ بھی اس وقت تک [illegible]

اس طرح پر آپ کو [illegible] فرصت [illegible] ہوگی۔ وہ سب [illegible] ہوگی۔ اور بل کو نظر انداز کیجئے۔ [illegible] کے علاوہ [illegible] ہوگا۔ آپ کو فرصت ممکن ہے کم ہو لیکن یہاں بھی ایک تاثیر کو چھوڑ کر باقی سب عدیم الفرصت ہیں آپ ہی ہیں کیا [illegible] پڑا ہے۔

[illegible] ریڈیو فوراً [illegible] ایک [illegible] دن کا قیام [illegible] میں آپ آئیں [illegible] زحمت گوارا فرمائیے۔ [illegible] اپنی [illegible] نہیں [illegible] بھی تو اس طرح [illegible] کر [illegible] نصیب [illegible] کے [illegible] جب [illegible] شام [illegible] آپ کے [illegible] کے قریب گاڑی جاتی ہے۔ مکان اسٹیشن سے ۳ میل ہے۔ [illegible] آپ روانہ [illegible] شاعر کو ہمارے حساب میں شمار نہ کیجئے۔ خاکسار

بخاری

۱۳ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۰ جنوری

---

(۲۲)

۲۰ جنوری

برادر محترم، سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ معاہدے [illegible] متعلق [illegible] ابھی تک جاری ہیں۔ [illegible] بہت کچھ [illegible] ہے۔ اگر [illegible] سے کام لیا [illegible] کا اظہار کیا تو ممکن ہے [illegible] کیونکہ یہاں [illegible] ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا [illegible] سے کچھ [illegible] اخلاق کا اظہار [illegible] ہماری طرف سے اور [illegible] ان کی طرف سے [illegible] کچھ [illegible] ہیں۔ اس لئے ابھی [illegible] صاف نہیں ہوا [illegible] کے متعلق اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ تاخیر ہو رہی ہے لیکن بہرحال اپنی تیاری مکمل کر لینی چاہئے۔ [illegible] کے متعلق کچھ [illegible] یہاں [illegible] اور دوسرے بھی چند [illegible] مشورے ہوئے ہیں۔ اگر [illegible] معاملہ [illegible] تو [illegible] علاوہ یہاں کام کرنے کے [illegible] اور اپنی صحت کو [illegible] سے آگاہ کریں گے۔ اور [illegible] کے متعلق مشورہ دیں گے اس پر [illegible] تیار کر لیا گیا ہے۔

میرے [illegible] میں [illegible] سے ایک [illegible] تھا۔ بڑھتے بڑھتے [illegible] کے قریب ہو گیا اور اس کی [illegible] کے برابر ہو گئی۔ [illegible] سے [illegible] کی وجہ سے تکلیف دینے لگا تھا۔ [illegible] نے [illegible] نہ دی۔ اب [illegible] ہے آپ [illegible] پاک [illegible] کے [illegible] لگانے پڑے اس لئے [illegible] میں چلا گیا۔ وہاں پانچ چھ دن [illegible] میں فرصت [illegible] کے گذرے۔ پھر واپس آ گیا [illegible] کی بات نہیں۔ [illegible] اس کا معائنہ کرا [illegible] شبہ ہے کہ [illegible] نہ ہو۔ [illegible] اس نتیجے پر پہنچتے ہیں لیکن [illegible] اس لئے احتیاط کر رہا ہوں۔

[illegible] کے بارے میں [illegible] سے [illegible] پڑے ہوئے تھے۔ ان کو [illegible] کی کوشش کر رہا ہوں اب [illegible] ہے کہ اس دن [illegible]

[illegible]

یہ چٹھی طلاق مضامین ادھر ادھر ہوئے ہیں۔ تمہاری غفلت بری ہے۔ ساتھ ساتھ ... کا شوق بھی ... ہے۔ آپ کا ... کے جلسے میں ... مضامین بھی لکھے گئے ہیں۔
اور لوگوں کی کوشش بھی ... ہے۔ ... کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اور ... سے ... بہت پیچ کیا ہے۔ شعرا ... بھی ... منظور ... ہو گا
خلاصہ یہ ہے کہ ایک ... پر ... اور ... کی ... ہے۔ دوستوں کی محبت سے پھر ... احباب کے ... ہوں گے۔ ... بھی

والسلام

خاکسار

بخاری

۲۰ جنوری

---

(۲۳)

۱۹ اکتوبر

برادر مکرم بسم اللہ ...

یہ تقرری کی میعاد پانچ سال تھی۔ جو اپریل ۱۹۵۴ء کو ختم ہوگی۔ اقوام متحدہ کے شعبے نے فیصلہ کیا ہے کہ مزید پانچ سال کے لئے بڑھا دی جائے۔
یہ پنجاب گورنمنٹ سے پوچھا جائے گا۔ ایک آدھ ہفتے کے اندر یہاں سے خط روانہ ہوگا۔ ٹھیک کس تاریخ کو اور عنقریب ہی کب ہوگا۔ یہ ابھی مجھے معلوم نہیں۔ جب
معلوم ہوا تو آپ کو ذرا اطلاع دوں گا۔ بہرحال ممکن ہے کہ کوئی علم نہ ہو اور خط روانہ ہو جائے۔ پنجاب کے ارباب حل و عقد کا سنبھالنا اب آپ کے سپرد کرتا ہوں
گو یقین نہیں وہ معترض ہوں۔ میرے واپس آنے سے کئی اصحاب کو ترقی معکوس لے گی۔ اس لئے افسروں میں سے کون ایسا ہوگا جو مجھے دور نہ رکھنا چاہے۔

دو ایک نکتے قابل غور ہیں۔ اول تو یہ کہ جیسے پہلے معاہدے میں میعاد کا مقرر کرنا محض ایک اخلاقی اور ... بات ہوتی ہے یہ ... نہیں۔
مستقل سرکاری ملازم ہوں۔ نہ آئی سی ایس وغیرہ کا رکن ہوں جن کا صوبوں سے مرکز اور ایک سے دوسرے صوبوں میں منتقل ہونا خاص قواعد و ضوابط سے منضبط کر دیا گیا ہے۔
میں خواہ پانچ سال کے لئے صوبوں سے باہر کام کروں۔ خواہ دس سال کے لئے۔ بہرحال اور ہر وقت پنجاب ... LIEN قائم رہتا ہے یعنی مرکز
صوبہ اور میں خود ہر تینوں میں جو جس وقت چاہے میری واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تقرری کی میعاد کا معین کرنا دراصل کچھ معنی
نہیں رکھتا۔ بجز اس کے کہ اس سے سب متعلقہ لوگوں کے ذہن میں ایک اندازہ سا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب میں میرا LIEN SUSPENDED
ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے میری آسامی پر حکومت پنجاب کو کسی اور شخص کے مستقل کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ مجھے مزید پانچ سال
کا دفتر حکومت پنجاب سے پوچھنے کے بعد کیا جائے گا۔

آپ اس معاملے میں کس طرح سے زبانی گفتگو کریں گے۔ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ وہ نہ ہو کہ آپ کی کسی بات سے لوگ یہ اندازہ لگائیں کہ کوئی بہت اہم بات ہے
جس پر کھینچا تانی کا امکان ہے حالانکہ دراصل یہ صورت نہیں۔ اگر ہمیں تذکرہ یہ بات ہو جائے اور لوگ اس پر دلچسپی کے دامان میں نگاہ رکھیں تو مفید ہوگا۔

میں آج P.E.N کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے پیرس جا رہا ہوں۔ وہاں "THE URDU WRITERS OF OUR TIMES"
پر ایک پیپر پڑھ رہا ہوں۔ دو تین دن ہوئے بمبئی سے واپس آیا ہوں۔ وہاں امتیاز صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ امتیاز کو سوائے قلم کے اور کسی چیز کا شوق
معلوم ہوتا ہے نہیں رہا۔ اس سے مجھے رنج ہوا۔ وہاں یہ خیال آیا کہ آپ کو بھی ... کی غرض سے کہیں جانا چاہیے۔ وہاں آج کل ... آپ کا

پیام یقیناً ان کے پاس ہوگا۔ مرنے سے پہلے ایک دفعہ سمندر تو دیکھ لینا چاہیے کہ آپ ابھی سو دو سو سال زندہ رہ سکتے۔ تاہم

خاکسار

بخاری

۱۹ اکتوبر

---

(۴۴)

۳ جولائی

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ میں بمبئی میں تھا۔ آپ کا خط دہلی میں میرا انتظار کرتا رہا۔ اسی لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

انتخاب افکار و حوادث کے بارے میں میں محجوب و نادم ہوں۔ کچھ کسالت، کچھ مصروفیت اور پریشانی علاوہ برآں ہیں۔ نئے یہ کام توقع سے زیادہ محنت طلب اور وقت طلب پایا۔ آپ کی برہمی اور بے قراری حق بجانب۔ ۱۵ جولائی کی صبح کو لاہور آ رہا ہوں۔ تین چار دن ٹھہروں گا۔ تمام نوٹس بعد از تکمیل کار ساتھ لیتا آؤں گا۔ یہ وعدہ بھی وفا نہ ہوا تو آپ مجھے حلقۂ دوستاں سے خارج قرار دیں گے اور ڈانٹیں گے۔ وہ میرے سر آنکھوں پر۔ کام تو یہ مجھے ہی کرنا ہے اور مزدوری کروں گا لیکن مذاق برطرف۔ اس مہینے میں یہ کام ضرور ختم ہو جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دو بکریاں جو آپ نے پال رکھی ہیں ان کے حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ میں انشاءاللہ ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔

... صاحب اپنے بارے میں غیر شعوری طور پر مبالغہ کرتے ہیں۔ جب عہدہ ہی عارضی ہے تو جو اس عہدے پر مقرر ہے وہ کیونکر مستقل ہو سکتا ہے اور عہدہ عارضی یوں ہے کہ ابھی اس کام کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ممکن ہے یہ کام رہے نہ رہے۔ اب کس قسم کے اہل علم کی ضرورت ہو یا کسی اور قسم کے آدمی کے سپرد یہ کام کیا جائے یہ تمام معاملے فیصلے کے محتاج ہیں۔ اور اس فیصلے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اس دوران میں ... صاحب کا کام اکثر کمزور پایا گیا۔ اس میں کسی کی شرارت مضمر نہیں۔ کیونکہ ان کی کوتاہیوں کا علم خود براہ راست مجھ کو ہے تاہم ان کو ہم گھسیٹے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ استدلال ان کا عجیب و غریب ہے۔ کیونکہ مجھے برخاست نہیں کیا اس لئے میں مستقل ہونے کا حق دار ہوں۔ اگر چپڑاسی دی ہے تو وہ ہونی چاہیئے یا وہ خواہ مخواہ ایذا طلبی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تو سیکھتے ہی نہیں۔ سفارش اور دستگیری کے عادی ہو چکے ہیں۔ دوسروں کو ظالم اور بے انصاف اور اپنے آپ کو مظلوم اور ہمدردی کا مستحق سمجھتے رہتے ہیں۔ لہٰذا القرآن کی بصیرت کام نہیں دیتی۔ کبھی خدا کا شکر نہیں کرتے بلکہ گوشہ شاکی ہی رہتے ہیں۔ ایسے شخص کا مطمئن کرنا یا اس میں ہمت پیدا کرنا مشکل ہے کیونکہ ایسا شخص ہر وقت مدد کا طالب ہوتا ہے۔ اور جب تک زندگی اس کے لئے وقف نہ کی جائے وہ خوش نہیں ہوتا۔

باقی عند الملاقات۔ کیا آپ کو دہلی بلایا جائے؟ سب خیریت؟

خاکسار

بخاری

---

(۲۵)

ستاروں پھولوں کا نقشہ کریں۔

۔۔ ابھی تو ہم نے محفل کا ستان محفل آرائی   کہ ان کی خانہ بربادیاں رونق ہیں صحرا کی

آپ محفل اور گردشت سپاکر دینا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وحشی [illegible] نہ تھے۔ اب برباد ہو چکے لیکن محفل آرائی ان کی فطرت میں ہے اس لئے باوجود خانہ برباد ہونے کے وہ محفل آرا ہیں۔ اصلاح یوں کہ برباد ہونے کے صحرا کی رونق بن بیٹھے۔ دشت پہلے معنی بدل جائیں گے۔ لیکن آپ کو اس تبدیلی کی وجہ سے پیش آئی [illegible] سمجھے ہوئے ہوں گے۔ [illegible] اشارے سے [illegible] معنی صاف ہو جائیں [illegible] دشت یا [illegible] شعر کا مطلب [illegible] رہے گا۔

(۲) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چشم گل کی [illegible]

آپ فرماتے ہیں یہ شعر وضاحت طلب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اصلاح طلب نہیں۔ لہٰذا منظور۔

(۳) [illegible] ـــــ منظور

(۴) [illegible] چشم ساقی میں ہے میاں کی

میں نے [illegible] میخانہ [illegible] ساقی کی میاں کی۔ آپ فرماتے ہیں ایک سے کمی ہے۔ آپ کی اصلاح مجھے منظور ہے گو میں اس بات کا ابھی قائل نہیں ہوا کہ ایک [illegible] ذہن میں آتے ہیں۔ جہاں [illegible] ہوتی ہے اور [illegible] استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال اصلاح منظور۔

مختصر یہ کہ کلی اتفاق۔ اور بہتر بھی یہی ہے۔ [illegible] آپ کی اصلاح [illegible] جب بھی [illegible] کے اعتراض سے ایسا [illegible] اتفاق کئے بغیر چارہ نہیں رہتا (جس کو حسن اتفاق کہتے ہیں) بہرحال [illegible] کا بہت شکریہ!

۔۔ جون سے (تاریخ یاد ہے) میں [illegible] نئی دہلی جا رہا ہوں۔ انگریزی میں اس کو 9 Asoka Road لکھتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ [illegible] چند دن کے لئے آ جائیں۔ برسات شروع ہو رہی ہے۔

[illegible] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔ [illegible] کا معاملہ [illegible] کر کیا محترم صاحب اور میاں صاحب کی گفتگو میرے مسئلے کے متعلق بھی ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی [illegible] ہے۔ اس موضوع پر [illegible] سے آپ نے [illegible] ۔

خاکسار

بخاری

(۲۶)

[illegible] نئی دہلی

مکرمی،

محترم بھائی گورنمنٹ کا اس سال کے بجٹ میں کچھ اضافہ نظر آتا ہے۔ اس سے خالی آپ بیبیوں کی بحرز یک قلم زک گئی ہے۔ وہ معلوم نہیں کہ کب تک ملی رہے گی۔ اس سلسلہ میں کلام میں تاخیر ہو گئی ہے۔ یہ جواب ہے آپ کے اس خط کا جو وسط ماہ آپ نے لکھا تھا۔ اور جس کے جواب سے آپ مایوس ہو گئے ہوں گے۔ پچھلے دنوں ابوالکلام سے ہم کلامی کا فخر حاصل ہوا۔ بڑی محبتیں گرم جوشی۔ آپ کا ذکر اور خیر بار بار آیا۔ اور مولانا صاحب مرحوم کا ذکر بھی آیا اور امتیاز کا ذکر بھی کیا۔ اور حمید علی صاحب کا ذکر بھی آیا۔ دیرینہ شائق یہ تنبیہ خواجہ حسن نظامی سے ہے۔ شیخ قلم ادب و تاریخ پر ندروں کی بحثیں رہیں۔ شعر خوب سنیاں ہوئیں۔ بذلہ سنجی ہوئی۔ علامہ اقبال کی یاد تازہ ہوئی۔ کیونکہ بجز اقبال اور ابوالکلام کے ایسا کوئی شخص یہاں نہ تھا۔ جو عالم اسلام اور اس کی خوش فہمیوں اور رنگ آمیزیوں کا آئینہ دار ہو۔ یہ نسل ہی اب ختم ہوتی جاتی ہے۔

اس خط کے دیکھتے ہی رائے بہادر منوہن صاحب سے ملیے، وہاں سے پوچھیے کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ اگر ہو تو اس کا مداوا کیجیے۔ تفصیلات انہیں سے معلوم ہوں گی۔ ضرورت ہو تو حمید علی صاحب کو بھی شامل کر لیجیے۔

اب کے کرسمس میں پھر ایک چکر ہے۔ بشیر ہاشمی غالباً وسعت پرستی کے سلسلے میں دہلی آئیں گے۔ ممکن ہے امتیاز کی حیثیت ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کی ہو جائے۔ آپ ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے دوست کی حیثیت سے آ جائیے۔

زبیدہ سلام کہتی ہے۔ خاکسار،

بخاری

بھئی انقلاب بھیج کر کے واقعی بہت احسان کرتے ہو۔ جس روز انقلاب نہ پہنچے دن خالی معلوم ہوتا ہے کل یہ عنوان نظر آیا

لاہور میں گرانی کی اکثریت

یہ اکثریت کی بھی ایک ہی کہی۔ مگر اس کے لیے سند موجود ہے۔ "قلیت مال و اکثریت عیال" مشہور فقرہ ہے

ابوالکلام نے شاد عظیم آبادی کا ایک شعر سنایا تھا آپ بھی سن لیجیے۔ خوب ہے۔

جہاں پہ دم ہے تڑپتے ہیں دردمند ترے

وہ اور کوئی نہیں عاشقان چند ترے

بخاری

---

(۲۷)

۲۳؍ دسمبر

برادر محترم۔ یاد آوری کا شکریہ۔ خط کے مضمون سے آگاہ ہوا اور اس کو ذہن میں محفوظ کیا۔ کلام کی کثرت اور تنوع کی وجہ سے اکثر فرد ہی خواہش تحریر کے پیچھے پڑ کر رہ گئی ہیں۔ اور جیسا کہ تقاضا ہے ان میں حتی الامکان دخل نہیں دیتا۔ تاہم کوئی اہم نکتہ اس میں پوشیدہ نہ ہو۔ آپ نے جس امر کا ذکر کیا وہ بھی اپنی جگہ درست ہے

یہ شاید بہت تعارف سے قابل نہ ہوں گے۔ [illegible] جو اقتباسات [illegible] نقل نہ کیجئے گا۔ [illegible]

بشیر [illegible] کے متعلق جو آپ نے [illegible] کی تھی پھر معلوم ہو [illegible] لبنان تک پہنچے۔ یا کہاں تک گئے

ایک [illegible] ہے۔ [illegible] ایک [illegible]

بالشاید۔

میں آج صبح [illegible] ہوں۔ [illegible] معلوم ہوا ہے [illegible] کا نام آ گیا ہے۔ حبیب اور میر صاحب پہنچے۔ اور بالخصوص [illegible] صاحب [illegible] صاحب [illegible] آپ [illegible] سلام کہتی ہیں۔

یہاں میرے بچے [illegible] اور حبیب و بہت جمع ہیں۔ لیکن دلی شہر نہیں ہوا ہے۔ فاصلہ بہت ہے [illegible] دلی کی [illegible] ایسی ہے [illegible] اردو مجلس کے احیا کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھئے۔

جعفری

---

(۲۸)

HOTEL MARIACRISTINA

MAXICO D.F.

۱۰ جنوری

برادرم۔ نوازش نامہ ملا۔ آپ کے سوالوں کے [illegible] خط [illegible] تک نہیں آیا [illegible] سب [illegible] اور

وہاں کے [illegible] آتے رہتے ہیں۔ ان سے [illegible] احباب کا حال بھی معلوم ہوتا رہتا ہے۔ ادھر کے حالات سے تو باقاعدہ [illegible] رہتا ہوں۔ [illegible] بالکل ہی [illegible]

رہ جاتا۔ سیاسی حالات سے باخبر ہیں۔ [illegible] کراچی سے جو خط آتے ہیں ان سے [illegible] باتیں معلوم ہوئیں۔ ادبی دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ نہ معلوم کون

سے رسالے [illegible] کس کس شاعر نے غالب کے [illegible] آپ نے انقلاب کا ایک ورق بھیج

کر [illegible] بہت بہت مبارک [illegible] اجتماع کا ایک [illegible]

دوستوں سے [illegible] انقلاب کے [illegible] معلوم ہو گیا [illegible]

[illegible] لیکن آپ نے [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible] ہے۔ بہرحال آپ [illegible]

قلندری [illegible]

کانفرنس [illegible] معلوم ہو گیا کہ [illegible] سیاسی [illegible] ہے۔ چھوٹی [illegible] اور

[illegible] (۱۰۰۰) ہے۔ [illegible]

[illegible]

وہاں سے معاملہ یہاں منتقل ہو کر اور بھی جز رسی سے کیا اور نہ ہو سکا" چلئے صدر بلانے بیٹھے ہیں۔ یہ اندر سے یہ تسلیم کیوں کرو۔ سات دن لوگ اصول اصول پکارتے رہے۔ اور اس پر اصرار ہوا کہ نظم کی الیں جتنا پیار، اور مجال ہے کہ کسی کو کچھ بھی معلوم ہو کہ اصولوں کی کیا تعبیر بجز بہر ہے۔ ہر ملک اپنے اپنے مطلب کے اصول وضع کر لیتا ہے، فیصلہ ہوا کہ جو کچھ اصول ہیں ان پر سب کا یا اکثریت کا اتفاق ہو۔ وضع نہیں ہو سکتے۔ ووٹ ہوا۔ اس کے بعد امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ والے بجائے خود ایک مصیبت تھے، ان کے PLAN ترتیب دیتے تو تاشقند آئے۔ مکسیکو والے اپنے PLAN میں اپنے حواریوں کو گلیاں بھر بھر کر ہر گفتگو دیتے۔ امریکہ نے لاطینی امریکن (یعنی جنوبی امریکہ کی ریاستوں) کو بڑی بڑی رعایتیں دیں۔ بالخصوص امریکہ نے اپنا سیاسی اثر بڑھانے کی کوشش کی۔ جس مرحلے پر کانفرنس اس وقت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں حد سے بڑھ گئے۔

غریب پاکستان کی ہوتی پر کس سے سودا کرے۔ سوچا کہ ہمارے پاس بجز شخصیت کے اس میدان میں کچھ نہیں۔ خدا کا نام لے کر شروع ہی سے اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن اس طرح کہ اصل بحث میں بھی پیش پیش رہے۔ جب یہاں آئے تو کوئی نہیں جانتا تھا بلکہ لوگ پاکستان سے بھی بے خبر تھے۔ خدا کی مہربانی سے پہلے ہی ہفتے کے اندر دو تین زوردار تقریروں کا موقع مل گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے ہسپانوی بھی سیکھنی شروع کر دی۔ کچھ بحث بازی میں کرتب دکھانے کے موقع پا کر بعض تقریروں کے زور سے ایک دن انگریزوں کو وہ شکست دی کہ بس۔ یہ بات جتنے زیادہ دوست ہوں اتنے ہی ہوئے۔ چنانچہ لوگوں کو خبر ہے کہ بحث و تمحیص میں پاکستان کی دوستی مفید ہے۔ بہرحال اس کی دشمنی مضر ہو سکتی ہے۔ … سے لطیفہ بازی سے بھی کام لیا۔ ایک مزاحیہ نظم انگریزی میں کانفرنس کے بارے میں لکھی جو یا شیول کے رستے سے کانفرنس کے روزانہ سرکاری اخبار میں چھپ گئی۔ وہ لوگوں نے پاکستانیوں سے ہو توقع … مسکرا کر مصافحے کرنا شروع کر دیئے۔ ہندوستان والوں نے اپنا وفد محض انجینئروں سے مرتب کیا ہے۔ وہ لوگ انجینئر تو اچھے ہیں لیکن بات صورت نہ شکل … بلکہ انگریزی مداسی لہجے میں بولتے ہیں۔ جس پر ترجمان ہنستے ہیں۔ اور خود بھی غصے ہیں … اب ہسپانوی بلاتکلف بول لیتا ہوں۔ روزانہ اخبار وغیرہ پڑھنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ارادہ ہے کہ آخری تقریر ہسپانوی میں کروں گا۔ میری اس لسانی دوستی پر جنوبی امریکہ اور میکسیکو کے لوگ بہت خوش ہیں۔ بالخصوص سب … استعمال کر رہا ہوں۔ … اگر انسان پہلے سے بھی زیادہ پاکستانی ہو جائے یہی کیفیت ہماری ہے۔ اب … آخری مرحلوں میں ہمیں کامیابی نصیب ہو۔ اور دو تین مہینے کی محنت کہیں ٹھکانے لگے۔ کانفرنس کا کام توقع سے بہت زیادہ نکلا۔ اجلاس صبح دس بجے سے شام سات بجے تک اور بعض اوقات رات کے دس بجے تک رہتے ہیں۔ ایک دن تو صبح کے دو بج گئے۔ سوائے سنیچر کے آدھے دن، اور اتوار کے کوئی تعطیل نہیں ہوتی اور یہ اوقات … سات کی ساعتیں بازشوں اور مشوروں میں صرف ہو جاتی ہیں۔ کانفرنس کی دستاویزات کا بھی باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور ان کی تعداد اس وقت تک چھ سات ہزار صفحوں تک پہنچ چکی ہے۔ انجینئر بازی … مسئلے بھی کھنے پڑتے ہیں۔ ریڈیو کی تعلیم جو دس سال میں حاصل کی ہے وہ ایسے وقت میں کام آتی ہے۔ تاہم بعض باتیں بچوں کی طرح بیٹھ کر سمجھنی پڑتی ہیں۔ آپ خوش ہوں گے کہ میں کئی مرتبہ بہ اتفاق رائے صدر منتخب ہو چکا ہوں۔ اور چند طبقوں کے مشوروں میں مجھے ہمیشہ خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔

میکسیکو مجھے بے حد پسند آیا۔ پہاڑی ملک ہے آب و ہوا خوش گوار ہے۔ لوگ رنگین طبع، بااخلاق، رنگین پوش ہیں۔ پابندی اوقات کو رذیلوں کا شیوہ سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور ناچ اور سواری کے بے حد شوقین ہیں۔ … کانفرنس کا افتتاح … ہماری گفتگو میں آپ، جناب، حضور وغیرہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ راہ میں سے رذیل آدمی آپ کا شکریہ شاعرانہ انداز سے ادا نہ کرے۔ اور آپ شکریہ ادا کریں تو انکسار کے دو تین فقرے جواب میں نہ کہے۔ یہاں اکثریت اصل باشندوں کی ہے۔ ان سے کم دوغلے لوگ ہیں۔ اور اصل خالص ہسپانوی نژاد لوگ اقلیت میں ہیں۔ پچاس سال سے یہاں ایک نئی نیشنلزم پرورش پا رہی ہے۔ جو اپنے آپ کو ہسپانیہ سے وابستہ کرتی ہے۔ … ہسپانیہ کو حبت سے … ہے۔ چنانچہ ہسپانوی اقتدار کی دو تین صدیاں جو میکسیکو پر گذری تھیں انہیں تذبذب سے … کیا جاتا ہے اور موجودہ دور کا سلسلہ قبل از ہسپانوی دور سے ملایا جاتا ہے جب یہاں کے اصل باشندے برسر اقتدار تھے اور ان کی ایک

خیالات میں مطابقت اور تہذیب کی۔ اور سیاسی پیشروؤں نے کارکن کو جس جس زاویے سے دیکھا تھا، اس کی تقریباً سب وہ کسی نہ کسی حد تک نظر سے گزر چکی ہو۔
شہر ہے لیکن ابھی تک اس میں کئی عجیب باتیں نظر آتی ہیں۔ پچھلے ہفتے یہاں تین سال تک رہا۔ جس میں یہ سلسلہ ملک کا سلسلہ میری زندگی میں ہے۔ اب
یہاں REPUBLIC ہے۔ دیہاتی اور شہری تعلیم کا بہت شوق ہے۔ اور سلسلے سے خاندانی ترقی کے لیے ہی جتا ہوا ہے اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔
وزیرِ تعلیم پاکستان نے بھی یہ بات کہی تھی کہ اس پر ایک رپورٹ لکھتا۔ میں نے بہت کچھ سال اس پر غور کیا اور اس سے اس قسم کے تجربے کی پہلی طور پر ایک کتاب
خواہ انگریزی کی ہو اور خواہ دونوں زبانوں میں، پاکستان کی خاطر لکھنے کا عزم ارادہ کر لیا لیکن [illegible] کانفرنس کی مصروفیت سے فرصت ہی نہیں ملی۔ وزیرِ تعلیم اور
اس کے افسروں سے تبادلۂ خیالات کے لیے کئی مرتبہ وقت مقرر کیا اور اکثر وعدہ ایفا نہ کر سکا۔

دنیا بھر میں یہ کوئی دلچسپ خط تھا۔ اگر دوستوں کے خط اس کے محرک ہوتے ہیں تو [illegible] کوشش کرتا۔ وہ نصیب نہ ہوئی۔ تو
سہیل انکاری غائب آتی۔ فرصت بھی بہت کم ملتی ہے۔ تاہم آپ لکھتے رہتے تو لکھنے کو یہاں کے حالات کے بارے میں لکھ دیتا۔

دوستوں کو میرا سلام دیجیے گا۔

خاکسار

بخاری

---

(۲۹)

HOTEL MARIA CRISTINA,

MEXICO. D F.

یکم اپریل

برادرِ محترم، سلام مسنون۔ آپ کا تیسرا خط ملا یعنی جس خط کے متعلق آپ کو شبہ تھا وہ بھی مل گیا تھا۔ جواب نہ لکھنے کا وہم ہی عذر ہے کہ فرصت ہی نہ ملی۔ یہ فرصت
کے جو چند لمحے ملتے ہیں، اس میں دس خط لکھنے پڑتے ہیں کہ سب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ نہ لفافہ، نہ پتہ، سرکار پاکستان منیجر تاثیر صاحب کو خط لکھے، کسی
کو صرف ایک اور کسی کو مثلاً سرکار پاکستان کو ہر ہفتے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔ یہاں رت بدل گئی ہے۔ اپریل میں وہ حال ہے جو ہمارے ہاں مارچ کے اوائل
میں ہوتا ہے۔ آنکھیں دھوپ سے گریز کرنے لگی ہیں۔ اور کوٹ پہننے کو دل نہیں چاہتا۔ کانفرنس آخری مرحلے پر ہے۔ لوگ تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ اس لیے جب
میں یا تو چڑچڑا پن دکھاتے ہیں یا بے تحاشا ملال دیتے ہیں، لیکن جو آدمی جیلی ہیں، وہ اب بھی نرم نہیں آنے دیتے۔ اور آٹھ تک نہیں چھوٹتی۔ ہمارا کام خدا کے فضل سے
بہت ہی ٹھیک رہا ہے۔ دو تین دن ہوئے یہ طے پایا کہ یہاں کی کانفرنس آخر تک ختم کر دی جائے کیونکہ اصول وغیرہ طے ہو چکے ہیں۔ باقی ڈیل چال سازی کا
کام ہے، تفصیل کا ہے اور جس میں کم از کم دو مہینے اور لگیں گے۔ ایک مختصر سی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جو ہوانا کو پرسوں میں مجتمع ہو جب چار پانچ ہفتے میں وہ
پہلا کام ختم کر لے تو کانفرنس پھر مجتمع ہو لیکن چند دن کے لیے۔ اور چلن کمیٹی کے کام پر نظر ڈال کر معاہدے پر دستخط کر دیے جائیں۔ اس چال کمیٹی میں شامل ہونے
کے لیے ہر ملک نے اظہار [illegible] جدید یاں ہوئیں۔ [illegible] تقریریں ہوئیں، آنکھیں دکھائی گئیں۔ ہمارا [illegible] ٹھیک
سیاست کے سب حربے استعمال ہوئے۔ خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ جب سترہ ملکوں میں سے صرف چند ملکوں کی ایک کمیٹی بنی تو اس میں پاکستان کو شامل کیا گیا۔

فیصلہ ایک ہی ہفتہ کے اندر لڑائیوں کی گرما گرم بحث اور تقریباً ۷ دن کے بعد ہوا۔ جب فیصلہ ہو چکا تو میں گھر واپس آیا۔ قریب قریب اطمینان اور مسرت کی کیفیت تھی پاناما کی خوشی اور جولائی کے یہ ہفتہ ہوں کی آپ کے ساگری آواز سنائی دیتی تھی جب ۲۰ جولائی کو ہم یہاں پہنچے تھے تو کوئی بھی جانتا تھا پاکستان کے نام سے بھی لوگ واقف تھے۔ سترہ ملکوں میں سے سب سے نئی قوم۔ سترہ ملکوں میں سب سے نئے تجربہ کار ملک۔ ڈوانسیٹر یا سب سے کم سن سال کا تجربہ۔ ویڈیو کی صف میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ لیکن پانچ ہفتے کے اندر ہی پاکستان کا فیصلہ یہ بات دی کہ۔ یہ ہم کچھ نہیں اور ہم شروع میں اس کی حیثیت صرف ایک صدی کی مزدوری تھی۔ اسباب جب کانفرنس نے دنیا بھر کی ایک مختصر کمیٹی بنائی ہے تو اس میں بھی پاکستان کی شمولیت سے وہ چاہیے کہ کسی کو اس کے حق شمولیت پر شبہ کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ وزارت تعلیم پاکستان کا ارشاد ہے کہ کانفرنس کے بعد کچھ وقت یہیں چلاؤں اور میکسیکو کے نظام تعلیم کا مطالعہ کر کے اس پر ایک رپورٹ لکھوں۔ یہاں کے لوگ بھی بہت ہی طرح ناواقف اور اس میں پڑھتے تھے میکسیکو کی انقلابی جماعت نے برسر اقتدار آتے ہی تعلیم کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا کہ تمام دنیا انگشت بدنداں ہو گئی۔ اس لئے یہاں کا مطالعہ ہمارے لئے بہت مفید ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے اس کام کے لئے سرکار کتنی میعاد مقرر کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اب کچھ تاخیر ہوگی۔ بہر حال سالوں کی تاخیر نہیں۔ جینیوں کی ۰۰ بھی ابھی پوری طرح سے نہیں ہوا۔ دیکھئے۔ پہلے لوگ پاکستان کو ہندوستان کا شاگرد اور برخوردار سمجھتے تھے اور جب بھی انتخاب کی نوبت آتی لوگ سمجھتے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں سے صرف ایک کا ہونا کافی ہے رفتہ رفتہ لوگوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ہندوستان کا چھوٹا بھائی نہیں۔ تمام مسلم ممالک کا بڑا بھائی ہے۔ پھر اس کے بعد یہاں تک نوبت آئی کہ لوگ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کا ہونا از حد ضروری سمجھنے لگے اب آئندہ خدا کے فضل سے کم از کم یونیسکو کے بین الاقوامی میدان میں پاکستان لوگوں کی ہمیشہ صف اول میں ملا کرے گی۔ ہم پاکستانیوں نے اس پر ایکٹیشن منظور کیا اور سب آبدیدہ ہو گئے۔

خاکسار

بخاری

۴۰

یکم جولائی ۱۹۵۱ء

برادر محترم۔ آپ کے خط سے بڑی ندامت ہوئی۔ جب آپ کا خیال آتا تھا تو شرم کے مارے لرز کر ہاتھ پاؤں سرد ہو جاتے تھے لیکن یقین مانیے کہ اپنی خاموشی کی سزا بھی سب سے زیادہ مجھ ہی کو ملتی رہی۔ احباب بعید تر ہوتے گئے اور میری تنہائی بڑھتی گئی۔ مہینوں کی غفلت کے بعد کسی کو خط لکھا بھی تو جواب نہ آیا کیونکہ وہاں تو جواب کا چشمہ اس عرصہ میں خشک ہو چکا تھا۔ یہ ندامت اور آپ کا صدمہ بھی نہ ملا لیکن سالک کی وفا شعاری ہمیشہ استحقاق سے تجاوز کر جاتی ہے خدا آپ کو زندہ و سلامت اور خوش و خرم رکھے۔ اپنی دوستی آپ ہی کے دم سے زندہ ہے۔ بعض دائیں بائیں انفیں مر رہی ہیں اور جو نہیں چکیں وہ زندہ درگور ہیں ـــ

جولائی ۱۹۵۰ء میں یہاں پہنچا تو یاسمین کا شکر اپنے ساتھ لایا۔ کئی ہفتہ روزانہ پیشاب کا معائنہ کرتا رہا۔ اور زندگی کے باقی اوراق سب ہی لکھ دئے کہ شفائے شافی ہوئے۔ تو زندگی کا دعا ہو کہ خیلے سے بہنے لگے لا۔ لیکن جب تک اس میں شکر شامل ہے باقی شیرینیاں حرام ہیں۔ میٹھے کی پیکاریاں اور قلم پر خیالیاں۔ دن رات اسی فکر کے "شیشہ ساعت" کی نذر ہو گئے۔ اس عرصے میں علاج کی کوشش رہی۔ بڑے جیسے دیکھے سو دعا پار شکست ہو لے۔ دوا نے مجھے یقین ہو گیا کہ پلہ شکست میں زندہ ہم ہی ہی پہنا کے لئے ممکن ہوگا۔ ایک پیارا سی حالت اس پر جنون ہے۔ کوئی مجھ سے کوئی پوچھے

جو بیابہ جنگل اور پہاڑ ۔ ایک ہفتہ میں چودھویں منزل پر جاتا تھا کئی مرتبہ یہاں بیٹھا ۔ ۱۰ منٹ بلکہ بعد میں [illegible] منظر [illegible] دیکھا تو پہلے کا لکھنا [illegible] منزل تک چڑھنا پڑتا ہے اور اب سیڑھی کا [illegible] جاتے وقت سے ان کی تیزی بھی کام سے نہیں دیا تھا اب سفر ٹھیک [illegible] ۔ [illegible] پر بھی باہر نہیں [illegible] تھا اس خیال سے کہ [illegible] ہوئی تھی ۔ [illegible] کو [illegible] آنکھ بھی [illegible] زمین کے قریب جانے پر کچھ [illegible] ہوتا ۔ [illegible] کی آنکھ چھپتے تھا ۔ جب یہ [illegible] زیر [illegible] چاروں طرف تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ۔ یہاں آنے سے معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کی زندگی حالات کی کتنی عادی ہے ۔ اس کا [illegible] بھی [illegible] تھا ۔ ہمیشہ باہر کھانا کھاتا صبح کے ناشتہ کے ۔ چنانچہ تلنے پکانے میں مہارت حاصل کرلی لیکن وہ جو باہر [illegible] سے ان سو [illegible] کے [illegible] اٹھا کر گھر جانے پڑتے تھے اس میں کبھی مہارت حاصل نہ ہوئی ۔ ہمیشہ پہلے آپ پر ترس آتا تھا کہ انشاء اللہ [illegible] دن کی بات ہے ۔ [illegible] وغیرہ چنانچہ زندگی استخراج اور احتراز کا مجموعہ تھی ۔

ستمبر سنہ [illegible] میں مکان کرایہ پہ لے لیا ۔ ایک جشن کا عزم کر لیا لیکن ساتھ ہی جنرل اسمبلی کا زمانہ آگیا ۔ [illegible] کا قافلہ پاکستان سے کل پہنچا ۔ رات تو شہر میں گذرنی بھی لیکن صبح نو بجے سے شام کے سات آٹھ بجے تک [illegible] میں رہتے تھے ۔ جو یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر ہے دن کو [illegible] وقت سے شروع ہوتا تھا کیونکہ ظفر اللہ خاں صاحب جو یہاں سے اور بھی تیس میل دور رہتے تھے باوجود اس فاصلے کے صبح نو بجے سب سے پہلے آن پہنچتے تھے ہر شب زندہ دار ہے کچھ نہ پوچھئے کہ دنیا و عاقبت دونوں میں سرفرازی حاصل کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے ۔ چنانچہ ہمارا یہ حال تھا کہ رات بھی زمزم پیئے اور [illegible] دھوئے رہتے جا کر آرام ہے کے ۔ اسمبلی ختم ہوئی تو کشمیر کا شعلہ پھر بھڑکنے لگا ۔ اسمبلی نے [illegible] اسمبلی ختم ہونے کے بعد اور موٹروں اور [illegible] کا سوا چلانے کے بعد پاکستان لوٹنے ۔ تو محمد علی اور ان کا قافلہ آ پہنچا ۔ وہ گئے تو ڈاکٹر گراہم کا تصفیہ لٹکا چھوڑ گئے ۔ خدا خدا کر کے پچھلے ہفتے گراہم یہاں سے روانہ ہوئے تو پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا ۔ لیکن یہ بھی کب تک ۔ رات دن چکر میں ہیں سات آسماں ۔

رفتہ رفتہ زندگی کا عادی ہو گیا ہوں جب میں یہاں پہنچا تو نو فرکر (اپنے معیار کے مطابق) مردہ پایا ۔ اس سے ختنہ میں کی گستاخی یا مذمت مقصود نہیں ۔ ہر طبیعت کا تقاضا الگ ہوتا ہے میری طبیعت ایسی ہے کہ بے حسی سے کام کر ہی نہیں سکتا ۔ [illegible] بجا رنج و حوصلہ ہے تو کہتا ہوں کہ حرارت غریزی سے محروم ہوں ۔ اور مجبورا فارغ ہو رہا ہے یہاں حالت یہ تھی کہ یہ ۔ این کا فیصلہ کراچی پہنچا دیا ۔ کراچی کے [illegible] پر ووٹ دے دیا ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔ [illegible] مشق ایک ٹائپ کا نہ بن کر رہ گیا ہے ۔ کار ما خاص " بجز ہر کارے کے کچھ نہ تھا ۔ کام پھیلایا ۔ تو خود اس کا بوجھ میرے کندھوں پر پڑا ۔ اپنی وقت پسندی کی شکایت کس سے کروں ۔ یہاں کا کام وقت بہت زیادہ مانگتا ہے ۔ ساٹھ ملکوں کے ساٹھ وفد ۔ ہر ایک کا ووٹ کسی نہ کسی موقعے پر اہم بن جاتا ہے ۔ سفارتی گفت و شنید بے ساختہ رفتار ہوتی ہے ۔ ساٹھ وفدوں میں سے ہر ایک کو سلام کیجئے ۔ مناسب موقعے کے بعد خیریت دریافت کیجئے ۔ بیوی بچوں کا حال پوچھئے کھانے کی دعوت دیجئے ۔ موسم کا ذکر با تفصیل کیجئے ۔ حرف مطلب زبان پر لیں نہ لائیے کہ بار بار ہو پھر منتوں جواب کا انتظار کیجئے ۔ اس دوران میں مسکراتے رہئے ۔ اور نگاہ رکھئے کہ پینے کو جل رہے ہیں یا کہیں ٹک سگنے تک گئے ہیں تو روغن قاز آتش سیال یا قطرہ تیزاب ۔ جیسا حکیم بتائے کام میں لائیے ۔ کاک ٹیل پارٹیوں میں حاضری دیجئے ۔ یہ کاک ٹیل پارٹیاں بھی خدا جانے کس موذی نے ایجاد کی تھیں ۔ جب [illegible] شخصی ہوا کرتی تھیں ۔ تو کئی باتیں دستر خوان پر پوری ہو جاتی تھیں ۔ بادشاہ ایسی دعوت دے کر کا دشاہ کا دل [illegible] جاتا تو یہ ہوتی سیاست ۔ لیکن یہاں تو کوئی بغیر اپنی حکومت کے اشارے کے آنکھ بھی نہیں ہلاتا ۔ پھر بھی کہ کم بخت جنیا توں پر وقت اور روپیہ ضائع کرتے رہتے ہیں ۔ شراب کا میں کبھی عادی [illegible] تھا لیکن [illegible] بچانے کے لئے ایک گلاس مزید کا لائم [illegible] پی لیتا ہے ۔ [illegible] کے بعد کوئی ذکر [illegible] آپ سے [illegible] ہوگئے ۔ اور آپ جواب دیتے دیتے اور دامن بچانے کے بعد [illegible] پھر تجزیہ [illegible]

زیادہ ہوتی ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے (روزیہ تصادم محض کھوان تک ہی محدود نہیں ہوتا) وقت ایسا ہوتا ہے کہ اب شاید کھانا اس سے پہلے کھا سکتے ہیں نہ بعد میں۔ لیکن جو لوگ سفیر یا وزیر بن جاتے ہیں۔ ان کی قسمت میں یہی ہوتا ہے کہ ہفتے میں چھ مرتبہ یہ سزا اور بھگتیں۔ میں کاک ٹیل کا ایسا متنفر رہتا ہوں۔ جیسے کوئی کسی اپریشن کا منتظر ہو کہ تکلیف بھی ہوگی لیکن اس سے چارہ بھی نہیں۔ جس دن کاک ٹیل پارٹی ہو، میری تمام حالت مرجاتی ہے۔ دو گھنٹے مسکرا مسکرا کے کلّے درد کرجاتے ہیں۔

خوش قسمتی سے مجھے مکان ایسا مل گیا ہے کہ طبیعت اس میں خوش رہتی ہے۔ مکان سرکاری ہے لیکن سازوسامان کا خرچ خود برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ رتبہ بڑا ہے اور تنخواہ تھوڑی۔ اس لئے تنخواہ کے مطابق مکان لیجئے تو پاکستان کی توہین ہوتی ہے اور رتبے کے مطابق ٹھاٹھ رکھئے تو جیب ساتھ نہیں دیتی۔ چند دنوں اسی کش مکش میں گذرے آخر میرا مکان مل گیا۔ جس میں [illegible] پاکستان کے [illegible] تنخواہ چھ سو روپے ماہوار ہے۔ اس کی خوراک اور رہائش الگ [illegible] آتے جاتے جہازوں کے نظارے سے تنہائی کا احساس کم رہتا ہے۔ ایک مینار کے قریب رہتا ہوں [illegible] چہرے مجسمے چغتائی کی تین تصویریں، ایک اونٹ کی اوجھڑی کا لیمپ، دو تین پاکستانی پھلکاریاں۔ ایک تانبے کا [illegible] سینی۔ یہ سب ساتھ لایا تھا [illegible] دل میں لہو کی ایک بوند سی آتی رہتی ہے۔

میرے شغل تین قسم کے ہیں۔ ایک تو سیاسی یعنی شطرنج اور ملاقاتیں۔ [illegible] اور گفت وشنید [illegible] اور کراچی کے ساتھ تلغرافت بازی اور تعمیل احکام۔ دوسرے پبلسٹی یعنی مسلسل تقریریں۔ بیشتر کشمیر پر، بعض پاکستان کے عام حالات پر، چند ادب اور دیگر کلچرل معاملات پر۔ میری مانگ بہ نسبت اور علاقوں کے کالجوں، اسکولوں، یونیورسٹیوں اور گرجاؤں میں زیادہ ہے اور روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اب تک کوئی سو دو سو لیکچر دے چکا ہوں اور اس سلسلے میں اکثر سفر میں رہتا ہوں۔ دنیا میں ہمارا دشمن بجز ہندوستان کے اور کوئی نہیں ہے لیکن ہندوستان کا نام پرانا ہے [illegible] اور ساتھی اور [illegible] سب اسی کے حصے میں آئے ہیں۔ پاکستان سے لوگ کم واقف ہیں۔ کماحقہ پبلسٹی کے لئے کروڑوں روپیہ چاہیئے۔ اس لئے جو موقعے مل جاتے ہیں۔ ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اکثر لوگ صاف دل لیکن ہندوستان سے بے حد مرعوب ملتے ہیں۔ تاہم معقول بات کیجئے تو اثر پذیر ضرور ہوتے ہیں۔ ایک گرجے میں لوگ پاکستان کے حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لیکچر کے بعد سب نے زانوؤں کے بل کھڑے ہو کر پاکستان کی بہبود کے لئے دعا مانگی اور ایک مذہبی [illegible] میں پادری صاحب کے تصنیف کردہ دعا پاکستان کے متعلق شامل کرلی۔ کالجوں اور سکولوں کے بیشتر طالب علم میرے گھر کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ اور پاکستان کے ٹکٹ اور تصویریں اور پمفلٹ مجھ سے لے جاتے ہیں۔ ان دو شغلوں سے فراغت ملے تو ادبی ذوق کی آبیاری کرتا ہوں۔ یہاں پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہیں، سمجھدار کم دیکھنے میں آتے ہیں مقررین اس قدر [illegible] ہیں کہ گھنٹوں ہم زبانی کے بعد بھی ہم خیالی کم نصیب ہوتی ہے۔ بیچاروں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب امریکہ کے پاس سب کچھ موجود ہے تو یہ لوگ اپنے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ پھول دنیا میں سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ بجز حسن مذاق کے۔ چنانچہ حسن کو لپ اسٹک اور ہوائی جہازوں میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ روپیہ اور سامان کی بہتات ہے جتنا کھا سکتے ہیں اس سے دگنا پھینک دیتے ہیں۔ دکانیں ٹھاٹھ سامان سے بھری رہتی ہیں اشتہاروں کی وہ بھرمار ہے کہ سورج چاند نظر نہیں آتے۔ ایک اخبار کے ایک سنڈے ایڈیشن میں اتنا کاغذ لگتا ہے کہ پاکستان کے سب اخبار دس سال تک اس پر چھپ سکتے ہیں۔ تاہم خوش نہیں رہتے۔ کسی چیز پر قانع نہیں ہوتے۔ اور ایک بے قراری سی ہر وقت ان پر مسلط رہتی ہے۔ جب موقع ملے ایک آدھ دن ہارورڈ یونیورسٹی میں جاکر گزارتا ہوں۔ وہاں رچرڈز صاحب انگریزی کے پروفیسر ہیں کیمبرج میں میرے استاد تھے۔ ان کی مروت کی وجہ سے وقت وہاں اچھا کٹ جاتا ہے۔ انہی کی بدولت میرے وہاں چند ایک انگریزی اور امریکن اساتذہ سے تعلق ہوئے۔ نیویارک میں دوست مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ذہنی

جو مادی دونوں فلسفے زیادہ ہیں۔ دوستوں کا حلقہ جس کے ہم لوگ عادی ہیں۔ وہ یہاں میسر نہیں ہو سکتا کہ ایک پہلی ملاقات ہی سے کچھ لیکن یہ سب لوگ صرف سیاست دانوں کے لیے وقف کر رکھے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جو کچھ تھوڑا سا وقت بچتا ہے اس میں جتنا کر سکتا ہوں ان پڑھے دو تین مضمون اور ایک آدھ تقریر کے جواب میں وقت سے ملاقات ہے ان کی بدولت کبھی کبھار شام رنگین ہو جاتی ہے مگر آپ جانتے ہیں۔ دوستی کے رشتے جو شباب میں قائم ہو جائیں۔ ان کا بدل باقی تمام عمر میں نصیب نہیں ہوتا۔ اس سے ترستا رہتا ہوں۔ اب کچھ معقول کتابیں بھی فراغت میں پڑھ جیسے مودودی کی صحبت سے محروم رہا ہوں کے علاوہ زبان بالکل چھٹ گئی۔

صحت کے متعلق پریشانی نہیں ہے ڈاکٹروں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ خدا حکومت پاکستان کا بھلا کرے کہ علاج معالجہ کے اخراجات برداشت کرتی ہے۔ ورنہ یہاں کی فیس ایسی ہیں کہ جو ادا کرنی پڑتی تو روپے ہی خراب ہوتا۔ ذیابیطس مجھے نہیں تاہم احتیاط ضرور کرنی پڑتی ہے۔ جو کچھ سرطان سے عود کا شبہ تھا۔ پھر جگر میں خرابی پیدا ہوئی چنانچہ ہر ہفتے ایک نہ ایک ٹیسٹ ہوتا رہتا ہے۔ ناک میں دم آگیا ہے۔ (ان باتوں کا ذکر بیدہ سے ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا وہ بے چاری ناحق پریشان ہوں گی)

احباب سے کس بے خبر ہوں۔ تاثیر کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ آغا حمید کی شادی ہوئی مبارک باد کا ایک تار دیا جواب نہ آیا۔ حسرت صاحب ہی نہیں عابد کسی نے بھی خط نہیں لکھا۔ ذوالفقار کو بھی کبھی کبھی (ذوالفقار بخاری) کے علاوہ کسی کو اس کی توفیق نہیں۔ یہاں سے کچھ تحائف بھیجے۔ اسے بھی ایک دو خط لکھے لیکن کسی چیز کا جواب نہ آیا۔ جو پاکستانی یہاں آتے ہیں ان سے داستانیں سنتا رہتا ہوں لیکن وہ اپنی دنیا کا حال بیان کرتے ہیں۔ میری دنیا کی بات کوئی نہیں کرتا۔ یا شاید ایک برس سے نہیں سنا۔ بار بار شعر گنگناتا رہتا ہوں جو عہد رنگین میں فردوس گوش ہوئے تھے۔ مجھ کو نیم ساقہ نایاب تھا کبھی کبھی اس پہ قوالی گاتا ہوں۔ پاکستانیوں میں سے محمد علی۔ آفتاب۔ عبدالقیوم۔ زیلدار خاں۔ عبدالقادر (فنانس) غلام محمد وغیرہم یہاں آتے جاتے رہتے ہیں ان سے چند مجلسیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن جانوروں کو اس سے کیا تسکین ہو سکتی ہے۔

بڑھاپا بھی آرہا ہے۔ اس کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ہوا لیکن آثار تو سامنے کبھی دکھائی دے رہے ہیں۔ وزیر اعظم کے ساتھ جو دورہ کیا تھا اس سے صحت پر سخت چوٹ پڑی کسی دن دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سویا اور عظیم ذمہ داری کی وجہ سے اعصاب پر بھی بہت اثر پڑا۔ اس کے بعد آج تک تعطیل نصیب نہ ہوئی۔ اکتوبر کے مہینے میں تین مہینے کے لئے پیرس جانا ہوگا کیونکہ جنرل اسمبلی اس سال وہاں ہوگی ما مابین کرسمس کے لگ بھگ دو تین ہفتوں کے لئے کراچی کا چکر لگاؤں۔ لیکن دیکھئے حالات کیا کروٹ لیتے ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی انقلاب کی وفات سے انقلاب آگیا ہوگا۔ خدا کرے آپ کی ہمت میں خم نہ آئے اپنے حالات سے مجھے مطلع رکھئے گا انشاء اللہ میں اب خط و کتابت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ خط ضرور لکھئے۔ کوئی شعر مل جائیں تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ کوئی کتاب کام کی ہو تو وہ بھی۔ منصور سے کہئے فارن آفس کی معرفت ڈپلومیٹک بیگ میں بھجوا دے گا۔

خاکسار

بخاری

اس خط پر نظر ثانی کی تو احساس ہوا کہ رونا رو دیا ہے۔ اور پژمردگی کے سوا کم کسی چیز کا ذکر کیا ہے۔ اسے مکمل تصویر نہ سمجھئے۔ پہلا خط ہے۔ اس لئے ذرا کھٹا سا معلوم ہوتا ہے۔

(نوٹ) یہ خط نقوش مکاتیب نمبر میں اور خط نمبر ۲۱ ، ۲۰ اور نقوش کے سالنامہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

بنام مولانا غلام رسول مہر

یہ مکاتیب مختصر سی تمہید کے متقاضی ہیں ۔

۱۔ یہ اس زمانے میں جب بخاری صاحب کی خدمات آل انڈیا ریڈیو نے مستعار لی تھیں، حکومت پنجاب کے مدبران کے گریڈ کا معاملہ پیش ہوا تو یہ اعتراض اٹھا کہ جن اصحاب کی خدمات دوسرے محکموں میں منتقل ہو جاتی ہیں وہ اپنی سابقہ تنخواہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ نئے محکمے میں ترقی کے زیادہ مواقع ہوں تو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ادھر سابقہ محکموں میں نہ صرف اپنی ملازمتوں کا رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ گریڈ سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں جس طرح اصل محکمے میں رہتے ہوئے مستفید ہوتے۔ ان حالات میں اس وقت کی حکومت پنجاب کا رجحان یہ تھا کہ کسی ایسے شخص کو گریڈ سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا جائے جو اصل محکمہ میں برسرِ کار نہ ہو۔

۲۔ اس وقت سردار سکندر حیات خاں مرحوم نے وزارت قائم کر رکھی تھی۔ میاں عبدالحئی مرحوم وزیر تعلیمات تھے۔ میں نے میاں صاحب اور سردار صاحب دونوں سے عرض کیا تھا کہ اول جس شخص کی خدمات سے کوئی دوسرا محکمہ فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہو جائے لازماً وہ وسیع صلاحیتوں کا مالک ہوگا اور اسے ان خوبیوں کی سزا نہ دینی چاہیے۔ دوسرے بخاری صاحب کی غیر معمولی شخصیت پیش کی تھی اور کہا تھا کہ ان کے معاملے کو مستثنیٰ سمجھا جائے۔ دونوں نے میری یہ استدعا منظور کر لی اور بخاری صاحب کو گریڈ مل گیا۔

۳۔ مسٹر من موہن ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات تھے اور جن اصحاب کو ان سے ملنے کا موقع میسر آیا وہ اعتراف میں متفق ہیں کہ موصوف بلند قابلیت اور بلند اخلاق کے انسان تھے۔ آج یہ حقیقت عرض کر دینا غالباً غیر مناسب نہ ہوگا کہ مسٹر من موہن کے خلاف سب سے زیادہ شکایات جنوبی و مشرقی پنجاب کے جاٹ ممبروں نے پیش کی تھیں جو اتحاد پارٹی کا ایک اہم عنصر تھے اور چودھری چھوٹو رام کا اصرار تھا کہ مسٹر من موہن کو ڈپٹی ڈائریکٹری سے ہٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ چودھری چھوٹو رام کی خدمت میں بھی تمام تفصیلات عرض کر کے انہیں راضی کیا گیا کہ مسٹر من موہن وقت کے لحاظ سے بہترین شخص ہیں۔ مسٹر من موہن بخاری صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کے عزیز دوست تھے۔ ان سب نے اس دورِ ابتلا میں موصوف کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ بخاری صاحب نے ان کے معاملے کو اپنے معاملہ پر بھی مقدم رکھا۔ اس کا نتیجہ بھی حسبِ مراد نکلا یعنی مسٹر من موہن اپنے عہدہ پر برقرار رہے۔

۴۔ دھرم پور میں ملاقات نہ ہو سکنے کا معاملہ یہ ہے کہ بخاری صاحب اپنے حقوق کے سلسلے میں ڈائریکٹر صاحب تعلیمات نیز وزیر تعلیمات و وزیر اعظم سے ملنے کے لیے شملہ گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کے پاس سناور میں ٹھہرا ہوا تھا جو دھرم پور (کوہستان شملہ) سے قریب ہے۔ فون کے ذریعے سے طے ہو چکا تھا کہ بخاری صاحب موٹر میں واپس ہوں گے تو میں دھرم پور پہنچ کر ان سے مل لوں گا۔ بخاری صاحب کو شملہ سے آنے میں دیر ہو گئی اور کسی قدر

دھیرا ہو گیا۔ میں دھرم پور اسٹیشن پر بیٹھا رہا جب کوئی موٹر آتی کسی آدمی کو بھیج کر دریافت کر لیتا۔ بخاری صاحب اسٹیشن سے آگے نکل کر اس سڑک پر میرا انتظار کرتے رہے جو کسولی و سناور کی طرف جاتی ہے میں مایوس ہو کر شملہ چلا گیا۔ وہ مایوس ہو کر کالکا پہنچے اور وہاں سے سناور ٹیلی فون کرتے رہے تو میں دھرم پور میں تھا اس سے فون پر گفتگو ہو سکی شام پیچھے پر ان کے فون کا علم ہوا تو وہ کالکا سے ٹرین میں سوار ہو کر دہلی روانہ ہو چکے تھے۔

بخاری صاحب نے ایک مکتوب کے آخر میں لکھا ہے کہ اول اس کی رسید بھیج دیجئے دوسرے اسے پڑھنے کے بعد چاک کر دیا جائے۔

اس آخری ارشاد کا مدعا یہ تھا کہ خط کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے کہ اس کی اشاعت سراسر خلاف مصلحت تھی میں نے اسے چاک نہ کیا اور یہ اچھا ہوا نہیں بلکہ اتفاقیہ محفوظ رہ گیا اب اس کی اشاعت کسی بھی مصلحت کے خلاف نہیں۔ اور یہ ہمارے عزیز دوست کی نگارشات کا ایک مرقع ہے جس کی ہر تحریر اس وقت ایک بیش قیمت تحفہ کی حیثیت حاصل ہے

---

(۱)

۳۰ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

بروز اتوار

مشفق محترم! نہ معلوم کیا بات ہوئی دھرم پور میں آپ دکھائی نہ دیئے۔ سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر میں آدھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ کالکا پہنچ کر آپ کو سناور ٹیلی فون کیا اور ساڑھے نو بجے تک تین مرتبہ ٹیلی فون کیا لیکن آپ سناور میں تشریف فرما نہ تھے اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ ضرور دھرم پور تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور وہاں میرے منتظر ہوں گے۔ مجھے یہ خیال کر کے کہ آپ کو بے انتہا کوفت ہوئی ہوگی جس کے لئے میں بہت نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے میری بصارت نے مجھے دھوکا دیا۔ آپ ضرور سڑک پر ہوں گے لیکن مجھے نظر نہ آئے۔

بہرحال شملے کی داستان سن لیجئے۔ ڈائریکٹر صاحب سے ملا پھر میاں صاحب قبلہ سے ملا دونوں نے حامی بھر لی کہ تمہیں سلیکشن گریڈ دے دیا جائے گا اس مسئلے پر کہ میں پنجاب میں واپس آؤں یا نہ آؤں یا آؤں تو کب آؤں بحث ہی نہ ہوئی۔ بلکہ اس بات کا ذکر تک نہ آیا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت میں نے واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میاں صاحب کو گوناگوں دقتیں پیش آئیں گی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس وقت مشکلات میں مبتلا کیا جائے جب انہوں نے مجھے بغیر واپس بلانے کے سلیکشن گریڈ دینے کا وعدہ کر لیا تو اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ میاں صاحب کا رویہ از حد مشفقانہ اور ان کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ خدا ان کو خوش رکھے انہوں نے ہر طرح سے میری تسلی کر دی۔ وزیر اعظم صاحب سے بھی ملا انہوں نے بھی امداد کا وعدہ کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ کو شملہ جانے کی تکلیف دی جائے یا نہ۔ بظاہر تو اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن فی الحقیقت اس کی ضرورت ابھی تک موجود ہے۔ جانے سے فائدہ نہ ہو لیکن نہ جانے سے اغلباً نقصان ہوگا۔ اس لئے مجھ پر اتنا کرم کیجئے کہ ایک دن کے لئے شملہ چلے جائیے میاں

صاحب سے مل کر اپنے کنکشن کے لیے متعلق انہوں نے کیا فیصلہ کیا اور میرے پنجاب واپس آنے کا تذکرہ نہایت سرسری۔ وہ بھی اگر ضرورت پڑے تو لیجیے، ورنہ خیر۔ میاں صاحب سے ملنے سے پہلے من موہن صاحب سے ضرور مل لیجیے۔

اس کے علاوہ ایک اور کام ہے اور وہ شاید میرے کام سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض شریر لوگ اور بعض نیک مگر غلط فہمی میں مبتلا لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ من موہن کو موجودہ عہدے سے ہٹا دیا جائے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب ان کے کام سے خوش ہیں، میاں صاحب تو فطرت سے خوش اور مطمئن ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ من موہن صاحب پر کلنک کا ٹیکہ لگایا جائے؟ لیکن اہلِ غرض کا دباؤ دور تک پہنچ چکا ہے۔ جب میں شملے سے روانہ ہوا حالات تشویش ناک تھے۔ آپ سے ملاقات ہو جاتی تو بیشتر وقت میں اسی بات پر صرف کرتا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو خواہ ہندوؤں کی، ہندو افسروں کا وجود تو ضروری ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسے ہندوؤں کی حمایت نہ کی جائے جو لائق، فہیم اور بے تعصب ہیں اور خدا گواہ ہے کہ من موہن سے بہتر آدمی اس وقت کسی مذہب میں بھی نہیں مل سکتا۔ ان کا کردار خفیف سے خفیف شبہے سے بھی پاک ہے اور ان کی دیانت اور صداقت رائے مسلم ہے۔ اور پھر کوئی ایسا مسلمان افسر بھی موجود نہیں جو ان کی جگہ مقرر کیا جا سکے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جائے۔ وہ اس قدر دلگیر ہیں کہ استعفیٰ تک دینے پر آمادہ ہیں۔ ذرا ان سے مل لیجیے اور اس کام کو میرے کام سے بھی ضروری سمجھ کر ان کی مدد کیجیے۔ میں آپ کی عنایتوں کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ نے میرے لیے بہت زحمت برداشت کی اور آپ کا احسان میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔ آخر میں دو ضروری باتیں عرض کرتا ہوں۔ ایک تو اس خط کی رسید ضرور بھیجیے، دوسرا اسے پڑھ کر چاک کر دیجیے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

۲۰، پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

۵ جون

محترم دوست۔ سلام مسنون۔ میں ایک معافی کی عرضی پہلے آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ اب گرامی نامہ ملنے پر دوبارہ لکھ رہا ہوں۔ یقین مانیے میں از حد شرمندہ ہوں کہ آپ کو اس قدر زحمت ہوئی۔ واللہ اس میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ دھرم پور میں آپ کو تلاش کیا۔ ستارہ کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر طویل انتظار کیا۔ کالکا پہنچ کر دو تین مرتبہ آپ کے نام سے آپ کو پرسنل ٹیلی فون کیا اور ایک تو نہ ملنے کا اور دوسرے آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا، ان دونوں باتوں کا انتہائی افسوس دل میں لے کر گیا۔ للہ مجھے معاف کر دیجیے۔ میں از حد نادم ہوں کہ آپ جیسے مشفق کرم فرما کو اس قدر رنج پہنچایا اور وہ بھی اس حالت میں کہ آپ میرے کام کے لیے اس قدر تکلیف اٹھا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی اور ہر پیش قدمی کی لیکن میری بدقسمتی اور انتہائی بدقسمتی کہ پیشتر اس کے کہ آپ کا شکریہ خود اپنی زبان سے آپ کی خدمت میں ادا کر سکتا، الٹا آپ کو پریشان کیا۔

میں کل ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ اب اپنے کسی کام یا غرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ کس منہ سے آپ کو کہوں کہ آپ مجھے درخورِ اعتنا سمجھیے۔ بہرحال اگر آپ جو گستاخی یا غفلت میری طرف سے سرزد ہوئی ہے اس کے لیے مجھے معاف کر دیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت

سمجھیں گا۔

دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ میں انعام اور معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا قصور میری بد قسمتی سے سوا کچھ نہیں۔ اور آپ کی پریشانی کی کوئی قیمت میں ادا نہیں کر سکتا۔ سوائے اپنے عجز و انکسار کے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خط ہمیشہ ملتان کے پتہ پر لکھا کیجیے۔

خاکسار

بخاری

---

(۲)

پرتھوی راج روڈ۔ نئی دہلی

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ پے در پے آپ کو دق کر رہا ہوں۔ لیکن آج گرامی نامہ مورخہ ۵ جون ملا۔ اس میں ایک فقرہ آیا ہے کہ

"بہرحال اس معاملے میں آپ کی طرف سے جواب کا انتظار ہوگا"

بمقتضا اس فقرے کے آج پھر آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہوں۔ واپسی کا مسئلہ اس وقت چھیڑنا اس لئے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ

(۱) گریڈ اور واپسی بیک وقت دونوں کے سامنے آ جانے سے صاحب موصوف کو پریشانی ہوگی اور ایک کے پیچھے دوسرا کچھ معرض خطر میں پڑ جائے گا

(۲) اگر میں واپس نہ آؤں اور سینیئر گریڈ مل جائے تو اس گریڈ میں وہاں کوئی اور قائم مقام ہوگا چنانچہ ایک کی بجائے دو آدمیوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اغلباً صاحب موصوف کو یہ شکل زیادہ مرغوب ہوگی۔

(۳) بعض کوائف یہاں ایسے ہیں کہ اگر میں فی الحال کچھ عرصے یہاں اور ٹھہر جاؤں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

(۴) واپسی کا مسئلہ ہر وقت چھیڑا جا سکتا ہے بلکہ واپسی کا حق میرے پاس ہے جب چاہوں واپس آ سکتا ہوں کوئی مجھے روک نہیں سکتا اور کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ جب واپسی کا موقعہ آئے گا تو اس وقت اس مسئلے کو بھی چھیڑا جا سکتا ہے کہ کس عہدے پر واپس آؤں۔

(۵) گریڈ کا مسئلہ جولائی کے شروع میں ختم ہو جانا چاہئے اس کے بعد اگر اکتوبر تک بھی واپسی کا سامان ہو گیا تو جو مصالح آپ کے پیش نظر ہیں ان کو گزند پہنچے گا۔

(۶) فی الحال میری واپسی کی وجہ سے صاحب موصوف کو یقیناً بعض دقتیں پیش آئیں گی جن کی وجہ سے وہ پریشان ہوں گے اور ان کی قوت فیصلہ متذبذب ہو جائے گی کچھ عرصہ بعد حالات میں زیادہ سہولت کی گنجائش ہوگی۔

ان سب باتوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فی الحال باقی سب باتوں سے قطع نظر کر کے گریڈ کے معاملے کو پختہ اور بہت پختہ کر لینا چاہئے اصل چیز یہی ہے واپسی کا مسئلہ ایسا ہے ــــــ کہ اسے ہر وقت اٹھایا جا سکتا ہے اور اسی زور سے اٹھایا جا سکتا ہے جتنا کہ آج۔ البتہ آج اٹھانے سے گریڈ کے معاملے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی اور ممکن ہے خلط مبحث کی رو میں اصل مقصد ہی بہہ جائے

[illegible] آپ اپنی جانب سے [illegible] واپسی کے متعلق [illegible] پڑھ چکا ہوں۔ [illegible] اس پر
[illegible] یا [illegible] بات [illegible]
جلسوں سے بچا جائے۔

جن مصالح کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ درست ہیں [illegible] کی حیثیت [illegible] کی
خیال ہی [illegible] لیکن میں نے اس سلسلے سے جب [illegible] مشورہ [illegible]
[illegible] صاحب موصوف سے آپ [illegible]
[illegible] بہرحال جب
آپ [illegible]
[illegible] دیکھ سکے۔

ز خود [illegible] خویش [illegible]
[illegible] سرمۂ چشم عاشقاں را

بندۂ خاکسار
بخاری

---

(۴)

۹ راشو کا روڈ، نیو دہلی
۱۵ نومبر

برادرم محترم، سلام مسنون و تہنیت عید

گرامی نامہ ملا جس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ جس فیصلے کا اظہار آپ نے کیا غیر معمولی بات نہیں۔ جب خدمات مستعار لی جائیں۔ تو لوٹانی بھی ہوتی ہے لیکن سوچتا ہوں کہ یہ ہو گیا تو بہرحال مستقبل کیا ہے بہت کچھ سوچنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ واپسی پر کالج میں تقرر ہونا چاہیے اور پرنسپل کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیے۔ لیکن جو پوزیشن اب آپ نے بیان کی ہے اس سے تو مستقبل کے سب دروازے اغلباً بند ہو جائیں گے۔ نہ معلوم آپ نے اس پہلو پر غور کیا یا نہیں۔ اس لئے قدرے تامل ہے لیکن تامل کرتے ہوئے بھی متامل ہوتا ہوں کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ تامل ارباب نظر کے لئے تکلف کا باعث ہوگا اس تقرر نے کچھ خائف کر دیا اس کی تفصیل اگر

(۱) آپ کر سکیں تو سوچنے میں آسانی ہوگی اس لئے آپ کے مزید خط کا منتظر ہوں۔

(۲) کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ واپسی پر [illegible] مشکل نظر آ رہا ہے (بجز اس کے کہ اداروں کو منتقل کیا جائے) اس لئے یہ تجویز پیش

[illegible] ہے

دو حصہ روانہ ہو رہا ہے۔ تم سینلسی گزیٹ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ میں کا انتظار ہے ملاقات ایڈیٹر کی مدد تک پہنچ جائے اس سلسلہ میں پہلے وہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں

ان تینوں امور پر آپ روشنی ڈال سکیں تو میں پھر اسے بھی دیکھ سکوں اور ضرورت ہو تو خود بھی آ جاؤں گا ہفتہ عشرہ سے پہلے تو مشکل ہوگا

میں نے پتہ حسب خلاف پیشانی پر لکھ دیا ہے اسی پتے سے خط بھیجئے تاکہ دیر نہ ہو۔ سلام شوق۔

خاکسار

بخاری

---

(۵)

ترے وعدے پر جیے ہم ..... الخ

۱۔ سالک صاحب مہر کو آتے دیکھا[1] میری مشکل یہ تھی کہ آپ کا گھر رستے میں حائل تھا۔[2]

بخاری

(۲) آپ خط کا جواب ہمیشہ کسی ایسے کاغذ پر دیتے ہیں جو انگریز لوگ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں استعمال کرتے ہیں[3]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ قدیم دوستی کی وجہ سے بیت الخلاء میں بھی خط لکھنے بیٹھتے ہیں لہٰذا ایک سادہ کاغذ بھی ارسال خدمت ہے۔

---

[1] مراد یہ ہے کہ سالک آئے تھے۔ مہر ساتھ نہ تھا دوسرے معنی ظاہر ہیں۔

[2] بخاری صاحب اس زمانے میں بیڈن روڈ پر اس مکان میں رہتے تھے جو شاہ ابوالمعالی والے چوک اور میکلیگن روڈ والے چوک کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں اس کے قریب رمضان بلڈنگ میں موجودہ قومی دواخانے کی بالائی منزل میں تھا سالک صاحب میکلوڈ روڈ پر مقیم تھے بخاری صاحب اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے دور سے دیکھا کہ سالک صاحب آ رہے ہیں لیکن وہ راستے میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔

[3] جو کچھ لکھنا ہوتا تھا پنسل سے مضمون لکھنے کی سلپوں پر لکھ دیتا تھا بخاری صاحب کے نزدیک وہ کاغذ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں استعمال ہوتا ہے تاکہ جواب اس پر لکھوں

عاشق بٹالوی

بنام عبدالرحمن چغتائی

①

مکرم بندہ جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون

[illegible] ایک [illegible] آپ سے درخواست کروں۔ کیا آپ [illegible] کی ایک جلد بہت جلد بھجوا سکتے ہیں۔

خاکسار

بخاری

اور اگر ناگوار نہ ہو تو مرقعِ چغتائی کی بھی ایک جلد [illegible] بھیج دیجئے [illegible]

---

②

[illegible] نئی دہلی

۱۱ر اکتوبر

شفیق و مکرمی جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون۔ افسوس کہ لاہور میں آپ کی ملاقات سے محروم رہا۔ معلوم ہوا آپ شملہ کو تشریف لے گئے تھے۔

واپسی پر ایک خط ملا جو بجنسہٖ ارسالِ خدمت ہے۔ خط کے دو صفحے ہیں۔ ایک آپ کے نام، ایک میرے نام۔ دونوں بھیج رہا ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی ان کے پڑھنے سے ظاہر ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ خط لکھنے والے یعنی EVELY WOOD صاحب آج کل والٹر تھامپسن کمپنی میں ملازم ہیں جو ADVERTISING کمپنی ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے اپنی پبلسٹی کو ہر وقت دلکش بنانے کے درپے رہتی ہے۔ WOOD صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لٹریچر اور مصوری دونوں کے مشہور طالب علم اور نقاد ہیں۔ اور آپ کے معترف اور مداح معلوم ہوتے ہیں۔ آج کل کلکتے میں ہیں لیکن اس سے پہلے سالہا سال بمبئی میں رہے۔ یہی ان کا روزگار تھا۔ علاوہ بریں بمبئی کے اہلِ فن میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور اکثر تصویروں کی نمائشوں میں [illegible] یا اسی قسم کے لوگوں کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ جو جواب آپ ان کو بھیجنا چاہیں وہ خواہ براہِ راست ان کو بھیج دیں خواہ میری معرفت۔

بندۂ خاکسار

بخاری

۳

۴ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۹ اکتوبر

سلام مسنون۔ گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کے خط آنے سے پہلے میں نے وڈ صاحب کو لکھ دیا ہے۔ مزید گفت و شنید وہ غالباً براہِ راست آپ سے کریں گے۔ کوئی خدمت میرے لائق ہوئی تو بہر خیر خواہ ور یہ تو ہی نہ کرے گا۔ ایچنگ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے نقش سکے جو مجھے سب نشیۂ اب تک میرے مکان جدید میری زندگی کی زینت ہیں اور میں ان کا ذکر ہمیشہ فخریہ کرتا ہوں۔ وہ آپ کو یاد دیتا ہوں علم و فضل کا معاملہ میں نے خاصا بہت پڑھا اور وقت طلب ہے ملاقات ہوئی تو تفصیلاً عرض کروں گا۔

خاکسار

بخاری

۴

۷۰ جمیل روڈ

۱۰ اگست (۱۹۵۳ء)

مشفق من جناب چغتائی صاحب سلام مسنون! بیگم سراج الدین صاحبہ کا جواب آگیا ہے ان کے خط کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

"آپ کے خط کا شکریہ۔ یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ مجھ پر اس قدر اعتماد رکھتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں ان کی بھی بہت ممنون ہوں کہ وہ باوجود اس امر کے کہ فن کے متعلق میرا علم بہت محدود ہے۔ اپنی کتاب کی تمہید مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں اسے آپ کو بہت ممنون سمجھتی ہوں اور کوشش کروں گی کہ ان کے کمال فن کا خاطر خواہ تحسین دے سکوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ مجھے کتنے دن کی مہلت دی جائے گی علاوہ بریں مجھے "مرقع" کی ایک جلد بھی دیجئے کیونکہ میرا نسخہ میرے پاس موجود نہیں۔"

آپ ان کو مرقع کی نئی ایڈیشن (یعنی جس شکل میں اب آپ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں) بھجوا دیجئے۔ عبدالرحیم صاحب وہ مجلد میرے پاس لائے تھے جس میں سوا نامے وغیرہ کے لئے خالی صفحے ہوتے تھے وہ بیگم سراج الدین صاحبہ کو بھجوا دیجئے۔ اس کے علاوہ میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلی ایڈیشن کے دیباچے یعنی کزنز صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے مقدمے بھی انہیں بھیج دیجئے تا کہ وہ ان کے پیش نظر رہیں کہ پہلے کیا کچھ کہا جا چکا ہے۔ اگر اس دوران میں آپ کے مرقع پر اخبارات یا رسائل میں کہیں کوئی ریویو چھپا ہو اور اس کی نقل آپ کے پاس موجود ہو تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ ایسی چیزوں سے علاوہ

[illegible]

[illegible] صاحب آپ ... [illegible] ... تار ملنے [illegible]
افسوس [illegible] ... [illegible] ... چغتائی
کے [illegible] ... [illegible] ... [illegible]
آپ کے [illegible] ... [illegible] ... [illegible]
[illegible] ... صاحب [illegible] صاحب [illegible] صاحب [illegible] صاحب
[illegible] صاحب [illegible] ... [illegible]
نیاز مندی [illegible] ... کیجئے۔

آپ کا [illegible] ... [illegible] ... [illegible]
چغتائی صاحب نے فن کی قدر کرنا سکھایا [illegible] ... [illegible]

خاکسار
بخاری

---

(۵)

پاکستان ہاؤس
۸ ایسٹ ۶۵ سٹریٹ۔ نیویارک (یو ایس اے)
۲۵ اپریل ۱۹۵۳ء
مشفقی جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ بھائی آپ اپنے ساعت پہنچنے کی فرصت ہی کہاں پیش آئی۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ یہ سمجھئے کہ گویا آپ خود یہاں ہیں جو خدمت میرے لائق ہو بلا تامل فرمایا کیجئے۔ مسودہ ضرور بھیجئے۔ کم از کم دیکھ تو لوں۔ اس ملک میں کسی بھی مسودے کو خواہ وہ کتاب کا ہو یا فلم کا یا ریڈیو کا یا ٹیلی ویژن کا۔ منزل مقصود تک پہنچانا شاذ و نادر [illegible] کے انتظامات سے کم نہیں ہوتا۔ ہزاروں MIDDLE MEN شامل ہوتے رہتے ہیں جہاں کروڑوں کا ہیر پھیر ہو اور ہر منزل میں لاکھوں چھوٹے بڑے [illegible] زور آزمائی کرتے ہوں وہاں علم و فن۔ علم و فن نہیں محض بزنس بن جاتا ہے اور بزنس ہی کے اصول پر چلتا ہے تاہم آپ کی تجویز سے دماغ کو گدگدی ہوئی۔ فلم کا مرکز نیویارک نہیں، کیلیفورنیا (ہالی ووڈ) ہے لیکن آپ مسودہ تو بھیجئے۔ آنکھیں تو اس سے روشن ہوں۔ اس کے بعد کاری گروں سے مشورہ کروں گا اور نشیب و فراز سے آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔

لاہور کا قیام از حد مختصر تھا جہاں برسوں تک شباب رنگین کیا ہو اور بڑھاپے کو بھی شباب بنایا ہو۔ وہاں دل کی تشنگی ہفتے عشرے میں کیا

مجھے بھی قسمت پر ناز ہے کہ ان مہربان احباب کی صحبت میں مسرت بھرے نشے کی چند گھڑیاں (آ) بسر ہوئیں۔ میں آپ سے سالہا سال ملنے کا مشتاق رہا ہوں۔ آپ کی محبت کے خلوص بھرے الفاظ سے زندگی کا سہارا تو ہیں ہی۔ مختصر یہ کہ آپ سے مل لیا اور آپ کی محبت حاصل ہوئی۔ اب پھر دوبارہ فیض یاب ہوا۔ واپسی پر ان دنوں صاحب سے ملاقات ... کا تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد پنجاب میں فسادات ہو گئے تو سلسلہ قریب قریب رک گیا۔ میں تو انہیں یہ معلوم ہے مجھے ... صاحب کا بھی ایک بہت محبت بھرا خط ملا۔ ابھی انہیں جواب نہیں دے سکا۔ انہیں بھی میرا سلام پہنچا دیجئے گا اور کس کس کا ذکر کروں۔ یوسف ظفر اور حسرت ... کا پیغام پہنچا ہو تو کہاں تک ایک ایک پھول کا نام لوں۔ سب سے ملنے کو جی ... معلوم ہوتا ہے۔

تو یہ اس خط کی پیشانی پر لکھا ہے اسے نوٹ کر لیجئے تاکہ میں آئندہ لکھنا بھول جاؤں تو آپ کو تشویش نہ ہو۔

بندہ خاکسار

بخاری

---

(۶)

نیو یارک

۱۴ جنوری ۱۹۵۳ء

بھائی آپ کی شکایت بجا ہے مجھ سے سہو ہوا ہے میں نے مسودہ کی رسید آپ کو فوراً نہ بھیجی۔ آپ کو یقیناً تشویش رہی ہوگی۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں آخر اگست میں سخت بیمار پڑ گیا۔ دو ہفتہ مسلسل بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں رہا۔ تین ہفتے ہسپتال میں اور اس کے بعد دو مہینے گھر پر صاحب فراش رہا۔ نقاہت کے عالم میں بھی کام سے قطعی نہ چھوٹی۔ لیکن مصروفیت کو ضروریات تک محدود رکھا۔ اس عرصے میں آپ کا مسودہ پہنچا۔ معلوم تو مجھ سکتے ہیں بہت کچھ نصیب ہو۔ کوشش کر رہا ہوں کہ ہو سکے تو فروری مارچ میں تھوڑی سی پاکستان کا ایک چکر لگاؤں۔ اس شدید بیماری کے بعد اہل و عیال مجھ سے اور میں ان سے ملنے کو بے قرار ہوں۔ موت زیست کا کسی کو علم نہیں۔ اگر آنا نصیب میں ہوا۔ تو سب باتیں ہوں گی۔

آپ کے فسانے میں کئی جدتیں ہیں جنہیں پڑھ کر بہت لطف آیا اور آپ کو داد دینے کو جی چاہا لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں یہ جدتیں ہی رکاوٹ نہ بن جائیں۔ میں نے ایک دو فلم ساز دوستوں سے ذکر کیا اور اس کے چند حصے بھی ان کو سنائے۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی EXPERIMENTAL GROUP ہو تو اسے فلمائے تو بہتر ہو۔ ورنہ تجارتی کمپنیوں کے بس کا تو یہ روگ معلوم نہیں ہوتا۔ آج کل فلم کمپنیاں عجب مشکل میں ہیں۔ آمدنی سرعت سے کم ہو رہی ہے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اکثر ایکٹر انہوں نے چھوڑ دیے اور ٹیلی ویژن میں ملازم ہو رہے ہیں۔ مزید سعی کروں گا اور آپ کو اس سے مطلع کرتا رہوں گا۔ اس دوران میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ سیناریو کو بعینہٖ اسی طرح کسی اردو ادبی رسالے میں چھپوا دیں؟ میں نے اکثر سیناریو انگریزی رسالوں میں چھپتے دیکھے ہیں اور لوگ انہیں شوق سے پڑھتے ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے یہ ایک نئی چیز ہوگی۔ اور اس کا سہرا آپ کے سر رہے گا۔ خدا جانے کاپی رائٹ کی صورت کیا ہو جائے گی۔ کہئے کیا خیال ہے؟

خاکسار

ا۔ش۔ب

(ب)

[illegible]

مشفقی جناب [illegible] صاحب سلام مسنون۔ آپ کا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میری یاد میں بھی [illegible] خیریت [illegible]

ہو کر پہنچے ہیں۔ خدا آپ سب کو خوش رکھے [illegible]

خاکسار

بخاری

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام

(۱)

نیویارک

عزیزی و محبی، سلام مسنون۔ ابھی ابھی الیس کا خط ملا، جس سے آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال کا علم ہوا۔ عین معروفیت کا زمانہ ہے کبھی

کا اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ اجلاس گاہ ۵۰ میل دور ہے۔ صبح جاتے ہیں رات کے ساڑھے سات بجے لوٹتے ہیں۔ یک لخت اطلاع کیا کہ آپ کا تار ملا کسی زمانے میں تو مستعدی اور جذبہ زندگی کی علامت تھا۔ اب دو سال سے میں جانتا ہوں کہ ان کی حقیقت کھل گئی ہے اور تار والی اور تمام محبت کی ایک ترکیب معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس لئے اتوار (یعنی آج) کا انتظار کیا تاکہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ جو صدمہ آپ کو پہنچا ہے اس کے متعلق میں کیا بات ایسی کہہ سکتا ہوں جو پامال اور بے معنی نہ ہو گئی ہو لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ آپ کے گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ کی سیدھی سادی، آپ کی بیٹیاں تھیں، آپ کی بہنیں انہیں کی ہنسی تھیں۔ نہ معلوم اب آپ پر کیا گزرے گی یقیناً آپ کو بار بار ایک ویرانی کا احساس ہوتا ہوگا۔ جس کو اب آپ کسی طرح پر نہیں کر سکتے۔ میری ہمدردی بے کار ہے تاہم اگر اس سے آپ کا غم ذرہ برابر بھی کم ہو جائے تو مجھے اطمینان ہوگا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے اور خدا آپ کی زندگی کا انتظام آپ پر آسان کر دے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں زندوں کا خیال نہیں کرتے۔

سنیے جو جا میں نے مستعدی سے ایک ناول لوگوں میں امتیاز کو ایک طویل خط لکھا تھا۔ خیال تھا دوستوں کے دل کو اس سے رشک ہوگی۔ امتیاز سے کہا بھی تھا کہ خط ادب لطیف میں نشر کر دینا اگر وہ آپ کی نظر سے گزرا ہے تو میری زندگی کا نقشہ آپ کو معلوم ہوگا۔ نئے ملک میں گھر بار کرنا خصوصاً اس عمر میں جب کہ عادتیں راسخ ہو چکی ہوں اور دل کا اور طبیعت تنزل پر ہو ایک مہم ہے۔ بہرحال کچھ صحت سہولت کی پیدا ہو گئی ہے۔ صحت کے متعلق تشویش رہی اور تشویش سے زیادہ مصروفیت۔ یا انسان ڈاکٹروں کا ہو رہے یا زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ دونوں باتیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی گود میں بیٹھ رہنا زندگی نہیں۔

حمید الدین سے ایک مفصل ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن یہ اب دو مہینے پرانی بات ہے۔ زمانہ اسمبلی کا ختم ہوا تو پھر ان سے ان کا حال سنوں گا۔

آپ کو خطوں کی اتنی ضرورت نہ ہوگی جتنی مجھے ہے۔ سالک کو میرا پیار اور سلام کہئے گا۔ انہیں بھی خط لکھتا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے ان کی خیریت سے آگاہ کیجئے۔ عابد، ہاشمی، تاثیر اور دیگر احباب آج کل کس بحر میں شعر کہتے ہیں؟

خاکسار بخاری

(یہ خط سالنامہ نقوش ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے)

۲

صوفی میرے بھائی۔ ایلس فیض کی معرفت آپ کو شاید میرا پیغام پہنچا ہو کہ مجھے یہاں اس سال کے دوران، ایک یونیورسٹی میں اردو زبان اور اردو ادب کی تاریخ و ارتقا پر چند لیکچر دینے ہیں۔ چاہتا ہوں اس کے لئے مکمل تیاری کر لوں۔ آپ کی خدمت میں بوسیلہ ایلس یہ درخواست کی تھی کہ ایسی کتابوں کی فہرست (تیس یا چالیس) بھیج دیجئے جنہیں پڑھ لینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کلیات اساتذہ اور تنقید کی کتابیں (اردو اور انگریزی) سب شامل ہوں گی۔ چنانچہ آپ بھی فہرست مرتب کرتے وقت اس بات پر نگاہ رکھئے۔ جب یہ فہرست میرے پاس پہنچ جائے گی تو دیکھوں گا کہ ان میں سے کون کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ باقی پاکستان سے منگواؤں گا۔ فی الحال صرف فہرست کتب مطلوب ہے جو آپ کو

بہتر کی ترتیب نہیں کر سکتا کہ عکس اس مضمون کے باہر کی چیز ہو جائے۔ وہ سب جو ادھر سے درست کی ہیں۔ البتہ لمبی عبارتیں آپ کے گل پر قالب آئی گی۔ آپ کے مضمون میں اصل بیان بے دست و پا ہے۔

لہٰذا گزارش یہ ہے کہ اس میں قطع یا تاخیر کیجیے بہتر ہوگا۔ آپ نے چند ایام ایک خواب میں گزارے میں شیں آئندہ الحمدللہ یہ دن نصیب ہوئے اور دوستوں کو اپنے بچے دیکھنے دیا۔ صاحب کو رحم کیجے۔

مدت کو میرا سلام کہیے گا۔ دیکھیے کام ہوتا کس دن ہے اور کہاں خاکی کا جواب آئے گا۔ وہ جنوں سے مجھے اپنے خلوص سے نوازا۔

میرا پتہ یہ ہے، UNITED NATIONS, NEW YORK, U.S.A میرا نام

خاکسار

بخاری

۱۵ اپریل ۱۹۵۰ء

---

(۳)

برادر عزیز۔ قلم میں وہ اثر کہاں سے لاؤں جو آپ کے دل کو پگھلا دے۔ باوجود کاہے منت سماجت کے آپ کے خط سے محروم ہوں۔ نہ معلوم آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

سکینہ کی تاریخ ادب اردو اور مرزا عسکری کی ۔ کی معنوں کی کتاب کی اشد ضرورت ہے لینن گراڈ کے ملکوں سب سے زیادہ بھروسا آپ پر تھا۔ لیکن آپ نے وہ چپ سادھی ہے کہ میں بے بس ہو گیا ہوں

نیویارک — خاکسار

۱۱ اکتوبر ۱۹۵۰ء — بخاری

بنام سید ہاشم رضا

(۱)

یونائیٹڈ نیشنز۔ لگزمبرگ (پیرس)

مشفقی و مکرمی۔ سلام مسنون! روما سے وینس اور وینس سے پیرس پہنچ گیا۔ یہاں سے لندن جاؤں گا اور وہاں سے ہفتہ عشرہ کے

انشاء اللہ نیویارک۔

وطن کا رخ ہمیشہ مبارک ہوتا ہے خواہ حالات تلخ یا باعث تشویش ہی کیوں نہ ہوں۔ پہلے بھی یہی عالم تھا جب سے مل کر ایسا اطمینان ہو کہ بادوش کی طرح اسے کوہان پہ برس دو برس اٹھائے پھروں گا اور تشنگی اس سے پردیس کے صحراؤں میں بجھاتا پھروں گا۔ اس مرتبہ آپ سے بھی ملاقات ہوگئی اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔ ندے اپنی محرومی کا ماتم بھی کیا کہ اس سے پہلے آپ سے نیاز کیوں حاصل نہ ہوا تھا آپ جس لطافت اور محبت سے پیش آئے۔ اس کی دل کشی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ دو حرف شکریے کے اور سلام یوں قبول کیجیے۔

ع تمت تو خوش کرد وقت ما خوش کردی

مجھے اپنا خادم سمجھیے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بلا تامل ارشاد کیجیے۔ بڑی بیگم صاحبہ سے بھی میرا سلام کہیے گا۔

بندۂ خاکسار

احمد شاہ بخاری

۲۳ نومبر ۱۹۵۴ء

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام

(۱)

نیویارک

۱۵ ستمبر ۵۱ء

عزیزہ بہن۔ وہ جسے فراغت سمجھتے تھے نہ معلوم وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ یا دلوں پر زنگ چھا گئی یا بڑھاپے نے سب کو آن لیا۔ بہر حال کچھ نہ کچھ انقلاب ضرور آ گیا ہے۔ دفتری خط اور تار دھڑا دھڑ آتے ہیں کسی دوست کا خط نہیں آتا۔ حال میں ریاض احمد صاحب (ریڈیو انجینئر) آئے تھے ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مجید صاحب بہت عرصہ صاحب فراش رہے۔ زمانے کا رنگ بدل نہ گیا ہوتا تو میں اتنا عرصہ ایک عزیز دوست کی علالت سے بے خبر نہ رہتا۔ آپ ہی مجھے لکھ بھیجتیں کہ مجید صاحب بیمار ہیں دعا کیجیے۔ گنہگار کی دعا پر آپ کو کیا تکیہ کرتیں لیکن دوستوں بھائیوں اور عقیدت مندوں کو اپنے دکھ میں شریک کرنے کا ایک بہانہ ہوتا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک شناسا سے سرسری سنا تھا کہ مجید صاحب کو دل کی تکلیف ہے میں نے سن کر حسب معمول ہنسی میں اڑا دیا دل کا یہ وہم یاران سرپل کے حلقہ میں مدت سے ایک لطیفہ بن چکا ہے۔ جنھوں نے خبر سنائی وہ کچھ تفصیل بھی نہ بتا سکے لیکن جب ریاض صاحب سے مفصل حال معلوم ہوا تو بہت تشویش ہوئی اور میں از حد اداس ہو گیا۔ مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آ سکتے ہیں۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا لیکن یہ نقشہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بستر پر دراز ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو اور خدا انہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون و مصئون رکھے انہیں میرا بہت بہت پیار دیجیے۔ اے کاش میں ان کے پاس ہوتا۔ ادھر ان کا دل بہلا سکتا۔ ہو سکے تو ان کی خیریت کے متعلق دو حرف لکھ بھیجیے تاکہ مجھے کم از کم اس قدر بعد کا احساس نہ ہو اور میں آپ کی تشویش میں آپ کا ان کا شریک ہو سکوں۔

میں کام کرتے کرتے تھک گیا۔ خیال تھا کہ جس زمانے میں ڈاکٹر گراہم کشمیر کی الجھن سلجھانے میں مصروف ہوں گے میں چپکے سے ایک مہینہ تعطیل

کاش گوشۂ عافیت میں گمنامی سے پڑا رہوں گا اور صحت پھر لوٹ آئے گی۔ لیکن کام کے پہنچتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میں کام سے ہل نہ سکا۔ اب نومبر میں پیرس پہنچا ہے۔ وہاں آسمانی تین چار مہینے رہوں گا۔ وہ میاں میں کرسمس اور نئے سال کا ہوگا۔ لیکن نہیں معلوم کتنا طویل یا کتنا مختصر۔ نہ معلوم پاکستان کب آنا نصیب ہو۔ دل بہت اداس ہے۔

احباب کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کان تک پہنچ جاتا ہے تو طبیعت دن بھر کو رنگین ہو جاتی ہے۔ صفدر اکثر یہ کیفیت رہتی ہے کہ ماں میرے بھیا کو بیکاری کر سامان آیا۔

ہم نے دہلی میں بزرگوں کے نقش سے ایسے ہیں کہ کہتے ہیں تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر اعظم جانا گیا ہے لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ میں ایک کتاب "انشائے خط و کتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اس کتاب کی بدولت پروان چڑھے اور سرخرو ہوئے وہ کتاب بھی اب نایاب ہے

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

نہ معلوم خلیفہ حکیم صاحب کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہیں میں نے امریکہ میں کئی مرتبہ ان کا ذکر کیا یا اس کی خبر ان تک بھی پہنچی ہوگی لیکن ان کی جانب سے تا حال تک کچھ نہ سنا۔ بیگم شاہد حامد صاحبہ (مسز قدوس صاحب) سے ان کا نام لے دیا تھا) کو میرا سلام پہنچے۔ خدا کرے میرے خط پہنچنے تک آپ کی تشویش مجید صاحب کے بارے میں دور ہو چکی ہو۔ اور آپ اطمینان سے مجھے ان کا اور اپنا اور احباب و اقربا کا حال بتا سکیں۔

آپ کا خاکسار بھائی

بخاری

بیگم فیض کے نام

(۱)

لندن

۱۸ر اپریل ۵۰ء

پیاری ایلس

سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف "بخاری"، لکھتی ہو، نہ مسٹر، نہ صاحب، نہ پروفیسر، تم کو تو ہم مرد لوگ کے بار بار کب سے جو تی ہیں جو یہ بے تکلفی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں سے ہمسر کب سے ہو گئے۔ الب سے .... لیکن خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مستشرقانہ کا قائل ہوں جو شفقت اور قرینے سے چلائی جائے اس کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ تم ایک سے اپنے کئے پر نادم اور آئندہ کے لئے مودب اور حقکار بننے کا عہد کر چکی ہو۔

تمہاری چٹھی تمہارے خط سے بہت مسرت ہوئی۔ روحی (ROHI) سے جو خط لکھا ہے میں ان میں کا ترجمہ بھی شامل ہے تمہارے پیار کو بہت ہے تو میں بالفعل کو میرے سبزکانی (دیبیگ) ... سکتا ہو اپنی تشویش کی جانب ... اور لکھا ہے ہے تو اس کی پڑی میں بہت وقت نہیں گزرے ہی ہو، بہرصورت اہل بنگال کے لئے تمہاری محبت کا شکر گزار ہوں۔ تب سے اگر احسان مندی سے یاد کیا جائے گا تو بہت سے ... آشنائی ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ تم نے یاد کیا میں چاہتا تھا کہ کہیں سے لیکن کراچی کی طرف سے اور میں جانتا تھا کہ وہ خود آ کبھی سکا نہیں۔ شاعر ہے جا پہنچا کہیں، کہیں سے سنا تھا کہ اسے جیل بھیج رہے ہیں جہاں سادہ پانی اور نان جویں ہے اس کی تو منع ہے اب گئے پھر سنا کہ وہ اپنی بات سے پھر گئے ہیں اور میزبانی کی پیشکش واپس لے لی ہے ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کس بات پر زیادہ ہنسی آتی۔ میں پڑھ رہا ہوں بنگلہ ... ہیں پاس پڑ کر تعبیر کر رہے ہیں۔ دوسری بات پر یہ کہ مجھ گرچہ تو شاید معلوم ہو کہ یہ کام آنا زیادہ پسند کرتا لیکن میں اور تم (کرم ... ہیں) غالباً یہ ہی چاہیں گے کہ وہ بار سے پاس ہی رہے اس کے بجائے کہ اسے دیکھنے کے لئے ہم قدم بڑھا کے پھریں۔ دیکھو وہ تو تمہارے پاس ہے نا؟ میرا مطلب ہے پہلے سے زیادہ۔ اب میں جو وہاں نہیں ہوں، امید تو یہی ہے۔ اور ایسا نہیں تو پھر؟

یہاں موسم مستقل خوشگوار ہے کیو (KEW) باغ، یہ پھلنا پھولنا، میگنولیا اور چیری کے شگوفے سے تنگ سی لگی۔ یہی سبب لیکن پیارا کہنے تمہارا دل بہت ترسنے لگے تو یہ بھی سن لو کہ یہاں زندگی واقعی کٹھن ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جن گھر والا بل آدمی آٹھ دس پونڈ ہفتہ سے زائد نہیں وہ بسر کیسے کرتے ہیں کھانے پینے کی چیزیں کیا سب ہی، اور ہم یہ انہیں پالنے کی قیمت کر دیتے ہیں۔ لوگ لاپرواہ ہو گئے ہیں میرے سامنے سامنے چیزیں یوں لا کے رکھتے ہیں کہ میاں اگر چاہے تو اٹھا کے چلا جائے۔

آج کل لندن میں ستاشار (CORONATION) والا کا ہجوم ہے شاید شہزادے کی شادی کی تقریب ... کے جلوس ... کیسی پیاری لگ رہی تھی؟ گذشتہ ہفتے گروز نیور سکوائر میں ... کے ... کا قصہ تھا (مجھ اچھا ہے) تو اپنی چلتا ہے لندن شہر — آج کل تھیٹر کے دن نہیں لیکن پھر بھی جون تون شیکسپیئر، برنارڈ شا، گورکی اور ... کے کچھ کھیل دیکھ لئے اور کچھ نہایت ہی عمدہ اطالوی، جرمن اور فرانسیسی فلمیں کہ لندن میں دیکھیں کچھ آلا دمی اور سینڈویچ وغیرہ ہیں، تمہیں تو معلوم ہے کہاں کہاں۔ اگلے دن میں آڈن (AUDEN) سے ان کی نظمیں سننے گیا تھا۔ روئی میکنیس (MACNEICE) نے اہتمام کیا تھا۔ ... کنگسلے مارٹن سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی کل شام ایک تقریب میں ان کا انتظار رہا لیکن وہ دکھائی نہیں دیے۔ ہمارا کام ابھی شروع نہیں ہوا۔ ہندوستانی وفد ابھی نہیں پہنچا تاخیر کی کوئی وجہ تو کسی نے بتائی نہیں یہ باور کرنے کی توقع کی جاتی ہے کہ کسو پہنچنے میں ہی ہوگی یا ایسی ہی معصوم اور قدرتی وجہ کوئی اور ہوگی چنانچہ فی الحال متفرق کام کاج کر رہا ہوں۔

بچیوں (اچھا بھئی سلیمہ بھی) اگر یاد آتی ہے تو ہر ایک کو میرا پیار پہنچا دینا میرا مطلب ہے واقعی پہنچا دینا اور تمہارے دونوں بچوں کو بھی یا شاید ایک ہی بچہ ہے یاد نہیں رہتا کیسا ——— سیا ہے کوئی چھوٹی موٹی چیز تمہیں چاہئے تو لیتا آؤں، کچھ ہو تو لکھ دینا

محبت سے

اسمائیل [illegible]

(انگریزی سے ترجمہ)

۱۔ ... گذشتہ ... جہاں اس زمانے میں بخاری صاحب مقیم تھے۔

۲۔ بیگم بخاری

۳۔ بخاری صاحب ... لندن ... گئے تھے۔

منیزہ فیض کے نام

۲۰۔ رونڈیو پیئرس۔ نیویارک

۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء

پیاری منیزہ۔ کافی عرصہ ہوا تمہارا ۲۶ اگست کا خط ملا تھا۔ تم میری خاموشی کے باعث جواب سے مایوس ہو گئی ہو تو حق بجانب ہوگی۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دنوں میری صحت اچھی نہیں رہی۔ اس کے باوجود مجھے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے خط و کتابت کا سلسلہ رکا رہا۔ اب میں تندرست ہوں اور تمہارا خط سامنے رکھ کر جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میں تمہیں خط اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں جو اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی عمارت میں ۳۰ ویں منزل پر واقع ہے۔ یہ عمارت ۳۸ منزلہ ہے۔ ایک مستطیل سا مینارہ ہے۔ دور سے دیکھو تو ایسی لگتی ہے جیسے دیا سلائی کی ڈبیہ کناروں پر کھڑی ہو۔ مطلع آج اتفاقاً نہایت صاف ہے۔ سورج کی روشنی کھڑکی میں سے اندر آ رہی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی جانب کھلتی ہیں جو اوپر سے صاف نظر آتا ہے۔ یہ دریا ہڈسن کی ایک شاخ ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر سمندر میں مل جاتا ہے۔ اسے یہاں دریائے ایسٹ کہتے ہیں۔ اس وقت جب میں لکھ رہا ہوں تو بڑی بڑی کشتیاں اور تیل کے بڑے جہاز تیرتے پھرتے ہیں۔ پانی دھوپ میں چمک رہا ہے۔ دور نیچے کی طرف مجھے ان پلوں میں سے ایک پل نظر آ رہا ہے جو دریائے ایسٹ پر باندھے گئے ہیں۔ اس پل کا نام بروکلن برج ہے۔ یہ غالباً سب میں مشہور پل ہے اور پرانا ہے۔ یہ اتنا ہی مشہور ہے جتنا ہڈسن کی مغربی شاخ پر جارج واشنگٹن پل ہے۔ جس کی تصویر تم نے ضرور دیکھی ہوگی۔

موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ ابھی سردی بہت ہلکی ہے۔ نیویارک شہر میں برف بہت نہیں پڑتی۔ کہیں دسمبر کے آخر اور جنوری فروری میں پڑتی ہے۔ یہاں خزاں کا موسم سب سے دلکش ہوتا ہے۔ امریکی لوگ اسے "FALL" کہتے ہیں۔ یہ ستمبر میں ہوتا ہے۔ اس موسم میں درختوں کے پتے پہلے زرد اور پھر تانبے کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ جہاں کہیں درخت اکٹھے ہوتے ہیں وہ جگہ بس رنگ برنگی کا ایک ہجوم ہو جاتا ہے، جیسے کسی نے پیارے پیارے دھانوں میں رنگ برسانے کے لیے پھیلا دیے ہوں۔ بڑی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک قدرتی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ سڑک پر کار میں چلنے میں بڑا لطف آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر تالابوں اور جھیلوں میں پڑتے ہوئے آتشیں رنگ کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔ اس سال بھی فصل خزاں خوب رہی۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہا۔ کئی روز تک لگاتار جنگلوں میں گھوما جا سکتا تھا اور سیر کی جا سکتی تھی۔

جب تم نے مجھے خط لکھا تو تمہاری امی ولایت سے واپس آ چکی تھیں اور ابا ابھی وہیں تھے۔ اب تک تو وہ بھی لوٹ آئے ہوں گے۔ انہیں میرا سلام کہنا اور سلیمہ کو پیار دینا۔ مجھے یہ بھی بتانا کہ تم نے اب تک تیرنا سیکھ لیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کی مشق کرتی رہو۔ یہ ایک ایسی تفریح ہے جو حاصل کی جائے تو زندگی میں ایک طرار سا محسوس ہوتا ہے۔ تمہارا بیڈمنٹن تو خوب ہی چلتا ہوگا۔

جب جی چاہے مجھے خط لکھنا۔ ضرور لکھنا ضرور۔

اور دیکھو سب کو میری جانب سے ایک بار پھر پیار دینا۔ [illegible]۔

تمہارا پیارا

اے۔ ایس۔ بخاری

۱؎ یہ خط فیض احمد فیض کی بچی کے نام ہے۔

پہنچتے پہنچتے۔ میں نے اس خط کی پیشانی پر جو پتہ لکھا ہے مہربانی کر کے اسے نوٹ کر لینا اور آئندہ یہی لکھنا۔ اس سے پہلے جو پتہ لکھتے رہے ہو وہ میرے گھر کا پتہ ہے۔ میں ایک آدھ ماہ میں یہ اپنی چھوڑ رہا ہوں اور یہاں کی ایک اپارٹمنٹ میں قیام کروں گا اس لئے تمہیں میرے دفتر ہی کے پتہ پر ہی خط لکھنا۔

(انگریزی سے ترجمہ)

سید امتیاز علی تاج کے نام

(۱)

ڈیر امتیاز۔ دسمبر کے آخر میں دو مہینے کی رخصت لوں گا جو بیشتر دلی میں اور باقی کسی پہاڑی مقام پر گزاروں گا۔ یکم مارچ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج کا چارج لینا ہے۔

جوں جوں واپسی کے دن قریب آتے جاتے ہیں دل میں عجیب امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں کے اتنے سال تم سے وابستہ رہ کر گزرے ہیں نہ مرا ان کے ساتھ تم آپ ہی آپ دل میں چلے آتے ہو۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ نہ معلوم اس درمیانی عرصے میں طبیعتوں کی آب و ہوا کس قدر بدل گئی ہو۔ لیکن یہ سوچتا ہوں کہ جوانی کے علاقے اور رشتے کبھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں کبھی تن جاتے ہیں لیکن موت سے پہلے ٹوٹتے نہیں۔ اور الحمد للہ کہ تم اور میں دونوں ابھی موت سے بہت دور ہیں۔ اس امید کی بنا پر لاہور آنے کے خیال سے بجز مسرت کے اطمینان کے کوئی جذبہ دل میں نہیں اٹھتا۔ تابستان کی طویل دوپہریں اور زمستان کی طویل راتیں اور احباب کی طویل مرنجاں مرنج گپیں پھر یاد آتی ہیں۔

بہت تھک گیا ہوں۔ گیارہ سال بجز بیماری کے ایک دن کی بھی رخصت نہیں لی۔ موسم گرما کی تین مہینے کی چھٹیاں اور دوستوں کی گرم صحبتیں پھر جاری ہیں۔ زبیدہ واپس جانے پر اتنی خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ حجاب کو ہم دونوں کا سلام تسلیم اور یاسمین کو پیار۔ کل حمید صاحب اور تاثیر سے ملاقات ہوئی خاکسار کی زندگی کو کامران بنانے کی بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن اب ان کے لئے کئی موقعے نصیب ہوں گے۔ ۲۰ نومبر کو چند دن کے لئے شاید دورے پر بھی لاہور آجاؤں۔ کیا تم اس خط کے جواب میں خط لکھو گے؟

۲ ـ نومبر

خاکسار

بخاری

---

(۲)

یکم جون

یادش بخیر۔ وحسینا۔ ۲ جون منیر کو دلی سے جا رہا ہے۔ رنیم پر اور رشید خود پارٹ کر رہے ہیں۔ اس لئے عین آخری وقت میں انہوں نے پروڈکشن میرے حوالے کر دی ہے۔ وقت تھوڑا ہے۔ مصروفیت زیادہ۔ اس لئے وہ وقت کاری نہ دے سکوں گا اس کا افسوس رہے گا تاہم ایک آدھ بات آپ ایسی ضرور پائیں گے کہ دل پژمردہ نہ ہوگا۔ فرصت ہو تو سن لیجئے گا اور مجھے اپنی رائے سے مطلع کیجئے گا۔ فرصت نہ ہو تو Reception. ہو تو

ترک کیجئے۔ تاکہ آپ کو دیدار ڈپو ہو جائیں۔ اور آپ کسی وقت لاہور اسٹوڈیو میں جا کر اسے سن لیں۔ مدت سے موسیقی کے سلسلے میں آپ سے کچھ تعلق قائم ہوا۔ گو اس کی حقیقت تو صرف پیغام صبح ہے۔ تاہم پرانی یاد تازہ ہوئی اور دل کچھ دیر کے لئے مشغول رہا۔ برسات ہے دلی آؤ گے؟ سالک اور تم دونوں آسنے کا پروگرام بناؤ اور یہاں آ کر آرام سے شاہی باغیچے کے کنارے کرو۔

بخاری

---

(۳)

گورنمنٹ کالج لاہور

۱۰ جولائی

ڈیئر اسٹیٹس! نیویارک میں میں نے چار ۱ جون تک وقت لیا تھا۔ خیال تھا کہ اس کے بعد مہینے دو مہینے کے لئے لاہور آؤں گا۔ لیکن مہلت صرف پندرہ دن کی ملی۔ اس میں سے بھی پانچ چھ دن کراچی میں ضائع ہو گئے۔ کہتے ہیں بیمار پڑ گیا۔ بالآخر ۵ جولائی کو لاہور پہنچا۔ اب پرسوں کراچی واپس چلا جاؤں گا۔ اور پندرہ جولائی کو وہاں سے انشاء اللہ نیویارک۔ یہ معلوم کب رخصت ہو گی۔ اب سب بیک ہو چکا ہے۔ بچے کراچی جا رہے ہیں۔ وہاں مکان کا انتظام ہو گیا ہے۔ مصطفیٰ وہاں رہے گا۔ اور زبیدہ تین چار دن یہیں رہیں گی۔ وہ بھی بچے کے ساتھ کراچی چلی جائیں گی۔

احباب سے فرداً فرداً رخصت ہو لیا۔ آپ سے تاثیر صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں یہاں پہنچا تو تاثیر صاحب انگلستان روانہ ہو گئے تھے۔ اب آپ سے اور احباب سے نہ ملنے کا بہت افسوس رہے گا۔ نہ معلوم پھر کب ملاقات ہو۔ میں تو امتیاز علی تاج کے ساتھ جا رہا ہوں۔ جانے سے پہلے آپ سے کئی باتیں کرنی تھیں۔ کراچی کیا جائے تو کیا ہو اور کیا جائے تو کیا خیال ہے۔ جانتا نہیں لاہور سے پھر کچھ تجدید عہد کرتا جاؤں۔ بڑے رنگین دن اور راتیں اس شہر میں اور یہاں کے لوگوں میں گزاری ہیں۔ لاہور چھوڑنے کا کچھ قلق سا ہے۔ تشفی کا پہلو صرف یہ ہے کہ دو سال کی مہمان گردی کے بعد لاہور میں تو قیام ہو گا۔ میں سفر سے تنگ آ گیا ہوں۔ ٹکٹ، پاسپورٹ، سوٹ کیس کا خیال آتے ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ لاہور میں جم کر بیٹھنا نصیب ہوا تو زندگی کا آخری حصہ خوشگوار ہو گا۔ یہ اخبار والے یہاں اس طرح گذر رہے ہیں کہ کچھ آپ ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ آپ کا سالک باقی دنیائے عشق میں گرفتار ہیں کہاں تک۔ نہیں کوئی ہمراز نہیں، کون انہیں بتائے کہ دلی میں ہوٹل کتاب زندگی میں کس مضمون کا حق تھا۔ رحمت علی خان کا تحفہ دنیا و دوم خیر گزشتہ صحبت تھا۔ کچھ کے تسلیم کا مولانا عبدالمجید خان سالک کی روح پر کیا اثر پڑتا تھا۔ وہیں صاحب کون سے ہم تو پائیں میں کے کیا معنی؟ ایک دور تھا جو گذر گیا۔ اس کے کچھ دانے بس سالک، سلطان، آپ اور میں ہی باقی ہیں۔ حکیم احمد شجاع خشک ہو گئے۔ حفیظ جالندھری مناکرہ بیچتے بھی خدا کہنے سے واصل ہو گئے۔ یوں بھی مدت سے ان کا دین اور ان کی دنیا ہم سے الگ ہے۔ ”دو پرسنٹ آئی“ کا زمانہ یاد کیجئے اور پھر الحمرا میں ان کا شاہنامہ بھر درات بھر انہیں پڑھنا۔ یہ اس کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ باقی کون رہ گئے؟ آپ کے ظلم کا حال سنا۔ آپ ہوتے تو اس میں سلطان شیر کے دخل دیتا۔ میں تری میرا پرانا پیشہ ہے۔ آپ میرے پرانے گاہک ہیں۔ یہ کاروبار عادت ہو گیا ہے۔ اب معلوم زندگیوں کا پورا ہو گا۔ خلیفہ عبدالحکیم سے بھی خدا حافظ کہنے گیا۔ معلوم ہوا وہ مری چلے گئے ہیں۔ ان کا پتہ مجھے معلوم نہیں۔ ان کو میرا سلام اور پیار کہیے گا۔ بلکہ تعریف کر کے ان سے بالخصوص مل لیجئے گا۔ (تعریف کی تعریف سیری سیر) بعض لوگوں نے یہاں میرے متعلق مجھ سے بدگمانی کا اظہار کیا۔ سند میں خلیفہ عبدالحکیم کا نام لیا کہ ان کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ نہ معلوم خلیفہ صاحب نے کیا خبر تھا کہ باتیں میرے متعلق کم فہم آدمیوں کے حلقے میں کی ہیں۔ خلیفہ صاحب کو ذرا متنبہ کر دیجئے۔ ان

کی وجہ سے یہ بھی پختہ یقین ہے کہ ... مردم شناسی پر مرکوز ہے۔ وہ خود بھی کچھ ہیں اور ان کی قوت اُن کی بدولت خاصی کا انتشار رہے گا۔ میری طرف سے ان کے لئے دعا کون سے مجھے کہ ... اب تم جاتے ہو گئے ہو اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است۔ بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است۔ لوگ آج کل شعر و ادب ... فاصلے میں بلا سے فاق ہیں۔ بات پہ یاں زبان کٹتی ہے۔

یونیورسٹی وغیرہ کے حالات جس قدر جلد سنبھل جائیں کم ہو رہی ہیں۔ بہر حال اب امید ہے اصلاح ہو۔ ستے اُن کو سوجھیں گے۔

خط لکھنے کا شوق آپ کی صحت سے کم ہو رہا ہے۔ مجھے ابھی باقی ہے لیکن تحریک ہونی چاہیے۔ مالک اس معاملے میں دو فاکش میں خط لکھتے بیٹھے ہیں جن سے یہاں کی محفلوں کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ انہیں جواب میں ہر دو خط لکھتا ہوں۔ اگر آپ بھی کبھی کبھی کرم فرمائی کریں تو مجھے دور افتادگی کا احساس کم ہوگا۔ بہرحال آپ کی خیریت کی خبر ہمیشہ طمانیت کا باعث ہوگی۔ حجاب سے میرا سلام کہئے اور یاسمین کو میری جانب سے پیار۔ میرا پتہ نیویارک میں مختصراً یہ ہے ——— PAKISTAN HOUSE, NEWYARK, U.S.A.

ہوائی ڈاک سے خط بھیجنا مہنگا پڑتا ہے لیکن نہ اتنا کہ خط و کتابت کے مانع ہو۔ والسلام

آپ کا مری کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ لاہور کے پتے پر خط بھیج رہا ہوں۔ سنا ہے آپ عنقریب آنے والے ہیں۔

خاکسار

بخاری

---

(۴)

نیویارک۔ ۲۵ اگست ۵۸ء

عزیزی امتیاز۔ تمہارا خط ملا۔ تمہاری پریشانیوں کا حال پڑھ کر دل کو بہت صدمہ ہوا۔ یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم جیسا انسان جس نے عمر بھر زندگی کے لطیف اور مرنجان مرنج پہلو ہی سے سروکار رکھا اور خاندان میں اپنے فرائض کو تندہی سے سرانجام دیا زمانے کے ہاتھوں یوں تکلیف اٹھائے۔ مجھ جیسا آدمی تو معلوم ہوتا ہے اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وقتاً فوقتاً کسی کی مخاصمت یا ایذا رسانی کا ہدف بنے۔ لیکن تمہارے حسن طبیعت اور حسن اخلاق کا صلہ یہ ہرگز نہیں کہ لوگ تمہاری مخالفت پر آمادہ ہوں یا تم سے انصاف کرنے میں متامل ہوں۔ . . .

..... یہ دور ایسا ہے کہ اس میں دوستیوں اور رفاقتوں کے خون ہوتے ہی رہیں گے۔ شاید لوگ اس زمانے میں کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے حرص و آز اور بے مروتی سب باتوں پر غالب ہے۔ خدا تمہیں تقویت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے علو طبیعت اور اپنی بیوی اور بچی کی محبت اور رفاقت کی بدولت اپنی پریشانیوں پر غلبہ پاؤ گے۔ میں تمہارا ایک حقیر دوست ہوں اور بے بس اور دور افتادہ۔ لیکن اگر میری محبت تمہارے کسی کام آ سکتی ہے تو یقین جانو کہ وہ تم سے کبھی دریغ رکھی ہے نہ رکھ سکتا ہوں۔ میں ایسا شخص نہیں جسے بآسانی سلیم الطبع کہا جا سکے۔ میری لغزشیاں تم پر اور سب دوستوں پر واضح ہیں۔ کیونکہ تم سب کو ان سے پالا پڑ چکا ہے اور تم سب نے وقتاً فوقتاً بلکہ اکثر انہیں درگذر کیا ہے لیکن میرا عمر بھر کا تجربہ اور خود میرا رجحان طبیعت یہ کہتا ہے کہ دنیا میں دوستی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ اسی لئے کوئی دوست چھن جائے یا دور ہو جائے تو میں کئی راتیں اور کئی دن اس کا ماتم کرتا ہوں۔ افسوس کہ سچے دوست اب کم رہ گئے ہیں۔ تقریباً ہر ایک تعلقات یا ہوس کی گرداب میں الجھا ہے اور نکل نہیں سکتا تاہم سالک جیسے لوگ مغتنمات روزگار میں سے ہیں۔ وہ تمہارے پاس نہ آئیں تو تم ہی چلے جایا کرو۔ اس سے غم غلط ہوگا اور جو مصائب پہاڑ سے نظر آتے ہیں وہ اتنے مہیب معلوم نہ ہوں گے۔ فیض [illegible]

ماہیے پہنچ چکے ہوں گے۔ مختار اگست میں امتحان کی محنت بھی برم کا کام ہوگی سب سے بڑھ کر خدا نے تمہیں نیک طینت اور فطانت فہم بیوی عطا کی ہے اور ایک بچی جو یقیناً تمہاری بہترین امیدوں کا مجسم ہوگی ان کی صحبت میں تفکرات کو بھول جاؤ۔ اگر میں تم کے بے نہیں تو کم از کم ہر روز چند گھنٹوں ہی کے لئے سہی جو لوگ تمہیں اطمینان سے محروم کر رہے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو ان کو خود تم سے آدھا اطمینان بھی نصیب نہیں۔

کتابیں میں نے کتب فروش کی دکان پر منتخب کی تھیں۔ اور ان ہی سے کہا تھا کہ پارسل بنا کر تمہارے پتہ پر بھیج دیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تمہیں کوئی خط یا پرزہ نہ ملا۔ بلیوں کی کتاب میں نے اس خیال سے بھیجی تھی کہ شاید اس کا اردو میں ترجمہ ہو سکے۔ ان بلیوں کے علاوہ تم نے جو بلیاں پالی ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خود جناب ہی سب سے پہلے اس کی قدردان ہوں گی۔

اس سال کے آخر تک یو این او سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی نے پروفیسری کا وعدہ کر لیا ہے اس کے علاوہ ایک آدھ سیل کچھ اور کرنی پڑے گی ورنہ آمدنی میں جو کمی واقع ہوگی اس کا سہارا ناممکن ہوگا۔ وہ بچیاں جو پڑھتے ہیں ایک یہاں ایک زبیدہ سے 2 کراچی میں۔ پچھلے اکتوبر کی تنہا کبھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں کے ڈاکٹر قابل سہی لیکن دنیا بھر سے زیادہ مہنگے ہیں۔ مالک صاحب کا خط آیا انہوں نے اطمینان قلب کے لئے ترجمہ کی راہ نکال لی ہے۔ وہ غزلوں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اردو میں غنیمت ہے۔ ترجموں کے علاوہ موت کا خوف ان پر غزلوں سے زیادہ طاری رہتا ہے شاید انہیں یہ احساس ہے کہ زندگی سے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ نہ ہوا۔ حالانکہ کم از کم ان کو یہ شکایت نہ ہونی چاہئے۔ آپ اور وہ دونوں ہمیشہ دوستوں اور سب لوگوں کے منظور نظر رہے ہیں۔ یہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ ہمیشہ عزت اور آبرو سے رکھے۔ کولمبیا میں مجھے اردو زبان پر بھی لیکچر دینے ہیں۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی کتاب یہاں نہیں۔ مزید مشکل پیش آئی کہ کسی خدا ترس دوست کی معرفت ایسی کتابیں بلا معاوضہ جمع کروں۔ تاکہ دسمبر جنوری تک کچھ تیار کر سکوں۔ صوفی تبسم ذہن میں آئے۔ انہوں نے فہرست تو مرتب کی لیکن کتابیں بھجوانے کا کام مستعدی سے سرانجام نہ دے سکے چنانچہ معاملہ کہیں ان کے اور پبلشر کے مابین لٹک رہا ہے آپ مدد کر سکیں اور اس کے لئے فرصت نکال سکیں تو کیا کہنے۔ میں نے تو دانستہ آپ کو تکلیف نہ دی تھی کہ آپ اپنے قضیوں میں گرفتار ہوں گے۔ اردو افسانوں کا ترجمہ میں پھر بھی کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ میری زندگی کی بہت بڑی آرزو ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب . . . . سے امید نہیں کہ وہ میری مدد کریں گے۔ آپ اور فیض صاحب خود ہی افسانوں کا انتخاب کر لیجئے۔ جناب کو میرا سلام اور یاسمین کو میرا پیار پہنچے۔ خط ضرور لکھتے رہا کیجئے۔

آپ کا خادم

بخاری

۵ اگست

---

(۵)

۱۱ مئی ۵۰ء نیویارک

ڈیر امتیاز۔ واپس پہنچنے کے چند دن بعد آپ کو ایک خط لکھا تھا جو ہر چند کہ جواب طلب نہ تھا تاہم بتقاضائے عشق جواب کا منتظر رہا۔ لیکن اب تک آپ کے خط سے محروم ہوں۔ خیال تھا آپ اپنے ادبی عزائم کے متعلق مزید کچھ بتائیں گے۔ کیا ادھر کیا بنا۔ وہ ایک کتابیں بھی آپ کو بھجائی تھیں۔ بہت اچھی دکھتیں لیکن میری خاکساری کا ثبوت مزید ان سے ظاہر ہوگا۔ افسوس کہ کتابیں جیسی سمندر کی ڈاک سے بھجوانی پڑتی ہیں۔ ہوائی ڈاک سے بھجواتے تو پانچ ڈالر کی کتاب پر کم و بیش اتنا ہی خرچ آتا۔ جیب اجازت دے تو عقل اجازت نہیں دیتی۔ میتھ (Myth) کے آغاز کے بارے میں میں نے اپنے ماہر دوستوں سے اظہار کیا تھا ماننے کو وہ۔ وہ مزید مت سے زیادہ ماہر نکلے۔ سب کہتے ہیں کہ اس کے متعلق کافی نظریے ہیں۔ میں فلاں کا قائل ہوں۔ اور فلاں تو اس

بالسیٹی بد صورت آدمی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آخر شیفلڈ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر فروری پرگسیٹ (اور ن ۴۔) نے عجب کتاب کی ایک کتاب (ادبی جنسیات) انشاء اللہ بھجواؤں گا۔ حال ہی میں نکلی ہے اس کا نام ہے "نظر بد" یعنی " EVIL EYE "۔ ایک سابقہ چشم ڈاکٹر نے لکھی ہے جس میں آنکھ اور نظر کے متعلق جو جو توہمات دنیا میں مروج ہیں انہیں یکجا کر دیا ہے۔ نظر بد بھی ان میں سے ایک ہے اور اس کی تاریخ بھی مختصر طور پر دی گئی ہے۔ باتیں نقد و نظر سے مفید اور دلچسپ ہیں۔ شعر و قصیدہ کا خیال ہے کہ بہت پڑھنے سے یا ایک کہانی پڑھنے سے نظر پر زد پڑتا ہے اور آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔ مصنف نے صاف صاف بیان کیا ہے کہ دراصل اس وہم کا انگریزی میں کوئی جواز نہیں تھا۔ کتاب کا اصل عنوان ہے " STUDIES IN THE FOLK-LORE OF VISION ". میرا خیال ہے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ یا خلاصہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ باقی کتاب پہنچنے پر آپ خود اندازہ لگا لیجے۔

مجھے اس سال موسم خزاں میں ایک یونیورسٹی میں چند ہفتے اردو زبان و ادب کی تاریخ پڑھانی ہے۔ صوفی تبسم سے بوساطت بشیر فیض (کیونکہ خود صوفی صاحب آج کل موقع کے انسان ہیں) مناسب مفید کتابوں کی (اردو انگریزی دونوں) فہرست منگوائی ہے وہ آنے پر دیکھوں گا کہ کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ جو نہ ہوں گی وہ پاکستان سے منگواؤں گا۔ اور غالباً اس میں آپ کی دستگیری کی ضرورت بھی ہوگی۔ امید ہے مدد کریں گے۔ مجھے وہ افسانوں کے ترجموں کا منصوبہ جو آپ کے مکان پر بعد طعام باندھا گیا تھا اور جس میں حفیظ، اقبال کو شامل اور آپ کو صرف [illegible] کی تھی۔ اس کا کیا ہوا؟ اسلم سے چلایا تو اس کے مسودے برخاست۔ کچھ اس پر بھی روشنی ڈالئے۔ میں بے چینی سے اس کا منتظر ہوں۔

چند ہفتوں کی بات ہے میں ایک لیکچر کے موقع پر برسر عام یک لخت بے ہوش ہو گیا اس کے بعد ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ بیچارے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ خواہ مخواہ علاج جاری ہے۔ لیکن کچھ ٹھیک تشخیص نہیں ہو سکی۔ کیونکہ دل وغیرہ بالکل درست ہیں۔ عام طور سے غفلت کی کثرت کا جرم [illegible] لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہیملٹ کی بے ہوشی کے اسباب مفسرین میں متنازعہ فیہ ہیں ہماری بے ہوشی بھی آنے والی نسلوں کے لئے مبہم رہے گی۔ لیکن صدمہ تو یہ ہے میں سمجھتا تھا کہ "غش کھانا" وغیرہ داستانوں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ معلوم ہوا اس رسم کے زندہ رکھنے والے ابھی باقی ہیں۔

سالک، فیض، صوفی ان تینوں کو جب میں میرا سلام کہئے گا۔ چغتائی صاحب کے ہم کلام ہونے کا موقع نکلے تو ان سے کہئے وہ مجھے ذرا خط لکھیں کہ ان کے یہاں آنے میں کیا رکاوٹ پیش آئی۔ خلیفہ صاحب میں تو [illegible] ی کر دیجئے گا۔

ہاں بھائی، آغا بشیر اور رفیع پیرزادہ کو بھی میرا سلام کہیئے گا۔

حجاب یاسمین کو میرا سلام و پیار۔

خاکسار

بخاری

---

(۶)

پاکستان ہاؤس۔ نیویارک

۱۲ اگست

ڈیر امتیاز۔ چھٹیوں میں آپ کو لکھ رہا ہوں۔ افسوس ایک سال کے عرصے میں کئی تنہائیاں مجھ پر گزریں لیکن پے در پے مصروفیتوں اور بیماریوں نے کئی شکستہ ارادوں کو پژمردہ کر دیا۔ کبھی خط لکھنے کی نیت باندھی تو شروع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ حال ہی میں سالک صاحب کے دو تین خط آئے۔ ان میں [illegible] سے

نے مجھے ادبی لطیفے لکھ بھیجا اور اردو کتابوں کا ایک تھیلا بھیجے تو رہیں وہ خرافات سے طبیعت کو ایک گونہ سرور ملا۔ اب شدت سے یاد آتے ہیں۔ ایک لطیفہ دمشق کے ہاں مل پشاوری کو رہا تھا۔ ملک راج آنند کی کتاب اور تصنیف " اقبال " پر خیر سطر تو نے لکھ کر ہندوستان و پاکستان سے چھپی ہے۔ لیکن صاحب کتاب ہے ہی کمزور کے جوش بڑھائی، جہل اور تعصب کا منہ بولتا ہے، اور مصنف اور اقبال کا بیجا ثابت کرنا چاہتے ہیں، ہندوستانی نقادوں نے کتنی ہی بحث چھیڑ رکھی ہے۔ خواجہ صاحب عباس اور پرکاش ماتھر گیور وغیرہ کا نام لیا ہوا ہے۔ آغا حشر کے بارے میں زور دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ اقبال کا ذکر یوں کیا ہے کہ " a hack - writer called Agha Hashr, a third rate poetaster " ایسی باتیں اور خرافات پڑھ کر انہیں تین چار سطروں میں ٹھکانے لگا دیا ہے۔ پڑھ کر تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسے کاش آپ اور وہ صاحب پر بھی ایک کتاب لکھ ڈالیں۔ جو مسالا آپ کے پاس ہے اور تحقیق جو آپ نے تخیلہ پر چھوڑی ہے وہ اور کسی کو میسر نہیں۔ کتاب اردو انگریزی دونوں میں چھپنی چاہیے۔ نیویارک میں جو جیب ہے وہ معلوم کب تک بیچے گا۔ مجھے اس کام میں شریک کرنے کا ارادہ ہو تو لیجیے، چاہو سے جب تک زندگی ہے کوئی کام محال نہیں۔ اس مہم میں حائل ہوگی تو اسے کوئی نہ پہچانے گا لیکن اگر شرکت کا کام مشکل معلوم ہو تو کم از کم آپ خود ہی اپنے نام سے اردو کی کتاب لکھ ڈالئے۔ آپ کا وسیع تجربہ اور علم تو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ تحقیق کا یہ دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا، ایسے آثار بھی باقی نہیں رہیں گے کہ ہزار برس کے بعد موئن جو داڑو کی شکل میں دریافت ہو سکیں۔

لاہور کے حالات سے بالکل بے خبر ہوں البتہ سالک صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ دلی گئے تھے۔ معلوم سالک صاحب ہجرت کے بعد لاہور سے بے تعلق ہو گئے ہیں یا مرور زمانہ نے رنگینی کو ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ بہرحال لاہور ہم سب کا معشوق ہے اور مرتے دم تک معشوق رہے گا۔ ہماری جوانی اس سے تھی اور کبھی کبھی شباب کے عرصے میں یہ بھی گمان ہوتا تھا کہ اس کی جوانی ہم سے ہے۔ دیار محبوب کی ہر خبر طبیعت میں ایک تلاطم پیدا کر دیتی ہے اور کوئی خبر نہ آئے تو زندگی ایک مسلسل فرق معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان سے جو تماشے اس کی اطلاع ہیں محض سرکاری ذرائع سے پہنچتی ہے۔ تفصیلات کے لیے طبیعت تشنہ رہتی ہے اور اکثر متفکر، نہ معلوم نہرو صاحب کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ حق ناحق میں انہیں تمیز باقی نہیں رہی۔ شاید آئندہ الیکشن کی مہم نے عمل و فکر میں کچھ کجی پیدا کر دی ہے۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹنڈن نے ان کے ذہن کو ٹکڑے کر رکھا ہے۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ یہاں کے کام تو میں اور سیاست دان سبھی اکثر پاکستان کی ہمت اور حق بینی کے معترف ہوتے جاتے ہیں اور پاکستان کے لیڈروں کے تدبر اور تحمل کے قائل۔ لیکن کوئی صورت ہندوستان کے کان نہیں مروڑتا۔ سب اپنا افسوس ظاہر کرتے ہیں۔

بڑے بڑے فلم دیکھنے میں آئے۔ اور اکثر غائبانہ آپ کو تھیٹر اور سینما میں اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آپ سے تبادلہ خیالات کرتا رہا لیکن طبیعت کو اس سے کیا تسکین ہوتی۔ ہندوستان کے متعلق ایک بڑے کمال کا فلم " THE RIVER " ستمبر میں یہاں آنے والا ہے۔ " JEAN RENOIR " نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں بنا ہے اور ایکٹر امریکن، انگریز اور ہندوستانی ہیں۔ زوروں کی پبلسٹی ہو رہی ہے پاکستان کے "دستاویزی" فلم بہت کم آتے ہیں۔ اور اچھے نہیں۔ اس بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن پھر کبھی لکھوں گا۔ قلم تنگ آ رہا ہے۔ آپ کی جانب سے کوئی خط آئے تو طبیعت پھر شگفتہ ہو جائے گی۔ حجاب کو میرا سلام شوق۔ یاسمین کو پیار۔

خیریت و بہبود کا طالب

خاکسار

بخاری

بنام آلِ احمد سرور

کولمبیا، نیویارک

۱۰ ستمبر ۱۹۵۹ء

محترم —

آپ کے خط سے طبیعت بہت بہلی لیکن تشنگی بھی رہی۔ رسالوں کا جو حال آپ نے بیان کیا ہے وہ کم و بیش وہی معلوم ہوتا ہے جو ہماری اردو کی ہر جوانی نسل کے زمانے میں تھا لیکن ادب دوستی کرنے والے وہ لوگ تھے جو کہ باوجود آنکھ بند کئے کے رگوں میں دوڑنے پھرنے سے باز نہیں آتا۔ آپ نے شاعر کا ذکر کیا، کہیں کہیں جگہ میں بھی پھول اگتے ہیں۔ جب شاعری زندگی کا دارو مدار ایک جاہل اور جابر سلطان پر تھا جب بھی اس لئے ایسے جیالے تلاش کر لیے گئے۔ ح کے علاوہ کوئی راہیں نہ کھلی تھیں۔ سب سے زیادہ کش مکش تو امریکہ جیسے ملکوں میں ہے جہاں منادی کے بغیر کوئی چیز بک ہی نہیں سکتی۔ یہاں کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کامیاب شاعر یا افسانہ نگار ہیں یا ناکامیاب تو مطلب صرف یہی ہوتا ہے کہ آپ نے پیسے کمائے یا نہیں۔ نہ یہ کہ آپ کو حسنِ فروغِ شمعِ سخن نصیب ہوا یا نہیں۔

یہاں تک تو آپ کے ساتھ ہوں لیکن مضمون سے جو گریز آپ نے کیا ہے اس سے مطلب پر کچھ نہیں آنے دیا۔ لیکن میں سمجھتا تھا آپ کے خط سے احباب کا حال معلوم ہوگا۔ ندیم صاحب اور خدیجہ اور آپ کے شب و روز کا کوئی نقشہ آپ کے خط میں نظر آئے گا۔ جو ملاقات کا کام دے۔ کچھ آپ کے خط سے لاہور کی سیر ہوگی اور اس عزیز شہر کی خیریت معلوم ہوگی۔ کیا اس کے باغوں میں اب بھی سفیدے کے اونچے اونچے درخت خوشبو سے لدے کھڑے ہیں۔ کیا اب بھی راوی صفتوں کی یاد میں مسکراتا رہتا ہے۔ کیا امرتیلی کی گہری اور تاریک سبزی اب بھی شمالی بادلوں کے ساتھ آتی ہے اور برسات میں ملاتی ہے؟ آنکھیں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈتی رہیں لیکن ناکام رہیں۔ یا شاید بے نظر ہو چکی ہیں اور ہمیں معلوم بھی نہیں۔ پھر خط لکھئے کام تو تھم ہو تو ان محفلوں کا حال مزید بیان کیجئے جن کی یادوں سے کبھی جو نہیں ہوتی تو معلوم ہو کہ قریب کا حشر کیا ہوگا۔ دنیا کے ہر کونے میں دل کا ایک پارہ کسی نہ کسی گلی میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ یہ سب ٹکڑے کب یکجا ہوں گے۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو؟

میں چند دن کے لیے یہاں (جینوا) کام کے بہانے سے آگیا ہوں۔ مضافات میں تنگ تنگ گلیاں ہیں۔ انگوروں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی۔ دن بھر کوہ بلانک کی برف پوش چوٹی جھلک سی دھوپ میں چمکتی رہتی ہے۔ دن ڈھلے کی فضا میں اور جھیل پر ایک پُراسرار نیلاہٹ چھا جاتی ہے۔ یہاں روح کو وسعت نصیب ہوتی ہے۔ کئی پیچ و تاب تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سال میں دو تین مرتبہ یہاں ضرور آ جاتا ہوں۔ ہفتے عشرے تک نیویارک واپس چلا جاؤں گا۔

خاکسار

کناری

احمد ندیم قاسمی کے نام

ہوٹل مدیا کرسٹیا

میکسیکو۔ ۱۰ فروری ۱۹۴۹ء

مکرمی ندیم صاحب! آپ کا خط مل گیا تھا [illegible]

مجھے کم ہے کہ کوئی کتاب، کوئی رسالہ، کوئی نظم، کوئی اشارہ، کوئی حرف جو مجھ تک پہنچتا رہے گا۔ سعید دعوے لیلیٰ رفتار ہوا کہ اردو تحریر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ نکیلو کو طلاقت، ارتفع، دل کش اور رنگین پایا اور کانفرنس کی وجہ سے مصروفیت اس قدر رہی کہ اپنی دور افتادگی پر آہ بھرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ تاہم کسی گیتار بجانے والے کی تان کبھی رات کی خاموشی میں تیرتی ہوئی دل کے پاس سے گزر جاتی ہے یا ہسپانوی وضع کے مکانوں کی رومانی کھڑکیوں اور چھجوں اور سرو کے درختوں پر بہار سے پہلے کی سی شوخ دھوپ چمکتی ہے اور ٹھنڈے ٹھنڈے سایے گھاس پر لیٹ جاتے ہیں یا کونوں میں چھپ کر جا بیٹھتے ہیں تو لاہور اور راوی کا ساحل یاد آتا ہے۔ سالک صاحب کے انقلاب کا جوبلی نمبر دیکھا تو اس میں آپ کی نظم سے آنکھیں سیراب ہوئیں۔ اب معلوم ہوا کہ نقوش پھر آزاد ہو گیا ہے تو دل چاہا کہ آپ کو مبارک باد کا خط لکھوں۔ ہاجرہ کی کتاب غالباً چھپ گئی ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو انہیں بھی میری طرف سے مبارک ہو اور ہاجرہ اور خدیجہ دونوں کو میرا سلام پہنچے۔ نہیں معلوم کہ کب واپس آؤں گا۔ دل چاہتا ہے جنوبی امریکہ میں کچھ آوارہ گردی کروں۔ اور نیویارک، واشنگٹن وغیرہ کا حلیہ تو بہرحال رہے گا۔ ابھی جنتری پر نگاہ ڈالنے کا موقع نہیں۔

خاکسار

بخاری

(نوٹ: یہ خط سالنامہ نقوش لاہور ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے)

بنام حکیم یوسف حسن

محترم بندہ جناب حکیم صاحب!

آپ کا خط ملا۔ گویا آدری سلام روستائی کے سلسلے میں کہی تھی لیکن پھر بھی ممنون ہوں۔ ڈاکٹر اقبال کی ذرہ افزائی سے یہ حوصلہ تو بہت بڑھا لیکن منہ اتنا کہ مضمون کا وعدہ کر سکوں۔ جون کو میرا پہلا امتحان ہے اور موسم اس قدر خوش گوار ہو رہا ہے کہ دریا کے کنارے اس جھیل کے پاس جہاں بائرن کے تخیل کو پرواز نصیب ہوئی تھی، کسی پھول سے لدے ہوئے سبزہ زار میں گھسنے اور بلند درختوں کے درمیان زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے اس دوگونہ عذاب کا نتیجہ یہ ہے کہ استیانہ جیسے عزیز دوست کی فرمائشوں کی تعمیل سے بھی معذور ہوں اور سالک جیسے مقتدر شفیق کے خط کی رسید تک بھیجنے سے قاصر۔ سراسیمگی رہا ہوں، عرصہ ہوا، دوستوں سے خط لکھنا بند کر دیا۔

سوچتا ہوں تعطیلات شروع ہو لیں، وہ خط لکھوں گا کہ دوستوں میں کھلبلی مچ جائے۔ اس ہیجان کے دوران میں جو سکا تو نیرنگ خیال کی خدمت بھی کروں گا۔

رسالہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں پھر بھی میری کج بیں طبیعت کو اصلاح کی گنجائش نظر آئی لیکن اس کا الزام آپ کو نہیں دیتا۔ ہندوستان کی بدنصیبی ہے اور کیا کہوں۔ مجھے رسالہ لاہور واپس آنے پر دیجیے۔

خاکسار

بخاری، عمانویل کالج کیمبرج

(نیرنگ خیال ستمبر ۱۹۲۷ء)

بنام کلیم الرحمن

نیویارک، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء

عزیزی و شفیقی، سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ کام دل چسپ معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ابھی فرصت نہیں۔ لہٰذا ابھی سے کوئی پکا وعدہ نہیں کر سکتا۔ " BELIEVE I " یا اسی قسم کے عنوان سے بے شمار کتابیں اور مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں آپ کے پیش نظر ان سی کتب اس قسم کی ہیں۔ اس لیے آپ کے نیویارک کے دفتر سے کتابیں پہنچیں گی تو پورا حال معلوم ہوگا۔

آپ کا نام عجب؛ زبان پر آتا ہے تو آپ کے والد مرحوم (شیخ خلیل الرحمٰن) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ میں ان کا خادم اور معتقد اعلیٰ کے درجے تک علم و دانش کا خوشہ چین تھا۔ آپ نے جس خاندان میں تربیت پائی ہے وہ آپ کے حسن اخلاق اور عادات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کفیل ہے اور اس کے علاوہ آپ جو بھی استاد اللہ دتہ، مرزا، اور تاشقی کا نمونہ ہیں۔ اس لیے محمود صاحب یا کسی اور صاحب کے ساتھ آپ سے اپنا یت جتا کر لکھنے میں فخر ہے۔ خدا آپ کی زندگی ہر طرح کامران کرے۔

آپ کی بہبود کا طالب

خاکسار بخاری

بنام حامد علی خاں

(۱)

مشفقی حامد علی خاں صاحب، سلام مسنون

مجھے معلوم ہوا کہ میں نے آپ کے خطوط نیز مسودوں کی رسید آپ کو نہ بھیجی۔ مسودے بمطابق فہرست مجھے مل چکے ہیں اور ان سب پر میں نے نظر ثانی کی ہے۔ کسی مضمون کو مختصر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ گو ایک آدھ مضمون پیمانے سے ذرا طویل ہے لیکن نہ اتنا کہ قینچی استعمال کیے بغیر چارہ نہ ہو۔ البتہ ترجموں میں بہت سی جگہ ثقالت تھی جو اکثر ترجموں میں پائی جاتی ہے۔ اسے میں نے دور کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ بسا اوقات تو مطلب ہی فوت ہو جاتا تھا۔

تمہید تقریباً تیار ہے۔ صرف انتظار اس بات کا ہے کہ آپ نے جو تجزیہ مسالہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے اسے بھی دیکھ لوں۔ ترتیب کے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلا حصہ پاکستانی، دوسرا امریکن ہونا چاہیے۔ پاکستانی حصے میں پہلا مضمون قائد اعظم کا اور امریکن حصے میں پہلا مضمون آئزن ہاور کا۔ باقی مضامین کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے۔ تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو کہ مجھ سے پہلے میرے سامنے کیوں آئی۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟

ایک بات اور ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں (خواہ امریکن حصے میں خواہ پاکستانی حصے میں) مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے، وہاں مضمون کے آخر میں قوسین کے اندر مختصراً لکھ دیا جائے (انگریزی سے ترجمہ) تاکہ لوگ طرز تحریر کی اجنبیت کو خود صاحب مضمون کی اختراع نہ سمجھیں۔

مضامین نگار میں خود شامل ہونا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میرے لیے تمہید نگار رہنا ہی مناسب ہے اور بس۔ جواب کا منتظر، خاکسار بخاری

کیا استبدادِ مضامین ابھی بغیر مزید مسالے کے انتظار کے بیچ دوں تاکہ کتابت شروع ہو جائے؟

---

(۲)

مشفقی، سلام مسنون!

ابھی ابھی آپ کا رجسٹری خط مورخہ ۵ ستمبر مع بقیہ مسودات کے ملا۔

مضامین کی ترتیب کے متعلق میں حال ہی میں آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں لہٰذا اس کے متعلق جو میرا مشورہ ہے اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ امید ہے آپ اس سے متفق ہوں گے۔

اب اگلی ڈاک سے انشاء اللہ دیباچہ ارسال خدمت کروں گا اور مسودات بھی واپس بھیج دوں گا۔

نیویارک۔ ۹ ستمبر ۱۹۵۰ء

خاکسار

بخاری

---

(۳)

مشفقی جناب حامد علی خاں صاحب، سلام مسنون!

آج ہی ایک علیحدہ پیکٹ بصیغہ رجسٹری آپ کے نام روانہ کر دیا ہے۔ جس میں ۲۹ پاکستانیوں کے مسودے اور ۳۰ غیر پاکستانیوں کے شامل ہیں نیز ۹ مضمونوں کی اصل انگریزی بھی اسی پیکٹ میں بھیج دی ہے۔ حسنِ ترتیب رسید سے ضرور مطلع فرمائیے۔ میں منتظر رہوں گا۔ دیباچے کا مسودہ منسلک ہذا ہے۔

ترجموں پر نیز دیگر مضامین پر میں نے حتی الامکان بڑے غور سے نظرِ ثانی کی ہے مترجمین نے بعض حصے تو اپنی بساط سے بڑھ کر پائے بعض جگہ ذرا گھاس کاٹی۔ مضامین یوں بھی ABSTRACT ہیں۔ اگر ان میں روانی اور سلاست بھی نہ ہو تو ان کا پڑھنا اعمال سے لطف اندوز ہونا بالکل ہی مشکل ہو جاتا ہے بہرحال اب جس حالت میں مسودات آپ تک پہنچ رہے ہیں امید ہے آپ انہیں خاطر خواہ پائیں گے۔

تاخیر کے لئے میں آپ سے نادم ہوں اوّل تو اسمبلی کی وجہ سے اور کچھ بیماری کے لگاؤ کی وجہ سے فرصت کم رہی۔ پھر ایک طویل دیباچہ لکھا تھا، جسے حالات کے تغیر و تبدل نے بے کار بنا دیا۔ دوسری مرتبہ لکھا تو پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آخر تنگ آکر میں نے ایک مختصر سے دیباچے ہی پر اکتفا کی ہے۔ آپ پڑھیں گے تو یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ میرے دیباچے کس وضع کے اور کس موضوع پر تھے۔ اب ان کا موقع نہیں۔

مضامین کو ابجد کے لحاظ سے آپ خود ترتیب دے لیجئے۔ اور اپنے نظم و نسق کے مطابق کتابت موقع پر شروع کرا دیجئے۔ اب تو سب مرحلے طے ہو چکے اب زیادہ تاخیر کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

جب میں نے سنا کہ مکتبہ فرینکلن سے کرتا دھرتا آپ ہیں تو بے حد مسرت ہوئی۔ آپ یقیناً اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں، میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ہرگز مجھ سے دریغ نہ رکھیں بلکہ خادم دیرینہ سمجھیں۔

خاکسار بخاری

(نوٹ: یہ خط ۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کو ملا۔ اس روز لاہور پہنچا جس شام پطرس کی وفات کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی۔ یہ خط اسی کتاب سے متعلق ہے جس کا غیر مطبوعہ دیباچہ اس رسالے میں درج ہے اور یہ کتاب مکتبہ جدید نے چھاپ دی ہے۔)

بنام عبدالقدیر رشک

عزیزی رشک سلّمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون! آپ جانتے ہیں کہ اردو ادب سے بے حد لگاؤ رہا ہے۔ خیال تھا کہ اس دفعہ کی سیاحت میں کچھ نئی لیکن شعر و ادب کی نئی اردو کتابیں دیکھنے کو ترس گیا ہوں۔ اول تو کتابیں ملتی ہی نہیں، مل جائیں تو فرصت کہاں!

یہاں آدمیوں کی طرح صبح سویرے اٹھتے ہیں، جلدی جلدی کھانا کھایا اور کسی موٹر پر نکل گئے، شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ شام کا وقت ... یا کبھی کا سہارا، طبیعت کچھ ہوتی ہو یا افسردہ، ہم ہیں کہ دانستہ فرض کی خاطر نہایت شگفتہ لہجے اور خندہ پیشانی سے باتیں کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت اس شہر میں ہزاروں لوگ ہوں گے جو دنیا بھر سے ... ہوں گے لیکن ہم کچھ ایسے ... معلوم ہوتے ہیں کہ ... دوسرے کاموں میں ... سیاست کا علم ہوتا ہے کہ بعض باتیں سمجھ جاؤ۔ ایسے حال میں اردو ادب کے متعلق کیا کہوں ؎

بات بڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے

... صاحب کی جو کتابیں نظر سے گزری ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے تک کا اردو ادب فرسودہ اور تقلیدی عناصر سے بری طرح الجھا ہوا تھا، جس میں زندگی کے فرسودہ خیالات تھے ... صلاحیتوں کی ترجمانی جو تخیل کی آغوش میں نہیں، واقعات کی دنیا میں پرورش پاتی ہیں۔ ان میں کئی اشعار نشتر ... ہوں گے۔ ... لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں حیات کے نشیب و فراز، زندگی کی آغوش و ... اور انسانی ... کی امید افزا ... نہیں ہو سکتیں۔

جوں جوں زندگی کے تقاضے بدلتے گئے، ہمارے یہاں کے اکثر ادیبوں نے ... زندگی کو اپنایا۔ انہوں نے ... زبان کے ذریعے ... ادب کو ... سے روشناس کیا۔ ... پاکستان ... اردو ادب کی نشو و نما ہوئی، تمدنی اور سیاسی اعتبار سے ایک ایسے ... کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

رومانیت کا دور گزر چکا۔ اب اردو ادب زندگی کے تمام حقائق اور شعوری محرکات کا ادراک رکھتا ہے۔ ... انسانی عظمت اور انسانی کارناموں کے اظہار سے ... ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں صحت مند ادب جب تک زندہ رہے گا اس کا اہم ترین موضوع انسان ہی ہوگا۔

سماجی زندگی میں ادیب کی حیثیت ... کی سی ہوتی ہے۔ معاشرہ کی مرتبی اور انسانی بہبود کے لیے ... انسانی ... میں زیادہ ... ادیبوں نے اردو ادب میں زندگی کو اپنایا ہے ... دانش ور ... ان کی خدمات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔

ہم ... کے ... ادب کی ... کو دہرانا چاہتے ہیں اور ... ادب کی پشت پناہی کر سکتے ہیں جو انسانی ... کے لیے زیادہ ... ہو۔

کاش میرے پاس وقت ہوتا اور میں زیادہ کچھ آپ کو بتا سکتا لیکن ... کے ... مجبور ہوں۔

بخاری

پطرس کے مضامین

یعنی مضامین

اے ۔ ایس ۔ بخاری

بی ۔ اے (کینٹب) ایم ۔ اے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

سابق ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ

فہرست مضامین

اظہارِ عقیدت

میں اپنے استادِ محترم پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا۔

میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی اُن سے فیضِ تلمذ حاصل ہے۔

پطرس

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے۔ تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے۔ تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں۔ حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی۔ ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔ آپ تو اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں۔ جنہوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں۔ وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کریں۔

"پطرس"

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔ اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی ہوسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا۔ کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس لئے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً ان رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے فخر و مباہات کا باعث بن گیا۔ اور "مرکزی رشتہ داروں" نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب کہہ کر منتظموں کی شرافت و نجابت کو بے حد سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لئے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور بااختیار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹوگرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالا نشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تھوڑے سے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے ملنے والوں میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس لئے بدرجۂ مجبوری ہم سے رائے طلب نہ کی گئی۔ اور ہمارے والد اور ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مفاسد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک۔ تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان۔ اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانے میں ہزارہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی۔ کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور۔ مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک۔ مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے۔ تو کسی نہ کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لئے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا۔ وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا۔ یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ

ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی، سیر کو بھی چلے جاتے تھے، ہنس بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہیے۔ وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا۔ کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم موافق ہے۔ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا۔ والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں ہم دلی کو واپس گئے تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل سے واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی ہی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی۔ لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیے تھا۔

انہی ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں۔ اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک اور ہی ڈھنگ اختیار کیا۔ اور سال بھر تعلیم پانے کے بعد

ہمارے حیاۃ سے بیں نکل ہی آئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حماست میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں۔ وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کہ ہم نے اس موضوع پر ایک نیا پہلو دیا۔ کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم رہا اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی۔ تو بڑا وقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جو طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی۔ کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ جانتا ہے کہ "والدین: عزامن" کے لئے واقعات کو ایک نئے انداز کے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر بیٹے ان کے نام منی آرڈر پہ منی آرڈر چلا آتا ہے ؎

بنازاں آں چناں روزی رساند

کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ تو ایک دن والد نے پوچھا۔

"تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے ؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا: "دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے۔ وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ——— نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے ——— لیکن پھر بھی اگر ہو بھی ——— گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ——— ٹھہریے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی۔ جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں کہنا چاہئے۔ شخصیت ایک بے ڈھنگا سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے ٹھیک ٹھیک پتہ ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے "کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور ؟"

میں نے کہا: "چال چلن ہی کہہ لیجئے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہئے۔"

میں نے کہا: "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟"

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا: "جی ہاں"۔

"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ سچ زیادہ بولتے ہیں۔ نیک زیادہ ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا: "جی ہاں"۔

کہنے لگے: "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت فصاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اے کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب "شخصیت اور سیرت" والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لئے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں۔ تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے۔ کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا۔ تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی ہوا۔ تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا۔ لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت باقی نہ رہی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ

میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔ اے میں کیوں فیل ہوا۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔ اے۔ امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا۔ اس لئے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہو گئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا۔ لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ بعض ریفرنس منٹ، اپنے ہمراہی مسافروں کے ساتھ گاڑی میں سفر کر رہے ہوں۔ نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)

اب جب ہم بی۔ اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔ اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لئے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا۔ کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی۔ اے میں ہمارے مضمون انگریزی تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورت حالات پیدا ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہو گئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے۔ تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دے دیتا۔ آپ یقین مانئے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا۔ اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا۔ بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر کماحقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا۔ لیکن بی۔ اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچئے کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا۔ وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا۔ بلکہ اس کی بجائے ـــــ مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے لا انتہا حیرت کا موجب ہوا۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے۔ اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہئے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو۔ مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے۔ لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہے:۔

(۱) انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

(۲) انگریزی۔ تاریخ۔

(۳) انگریزی۔ فارسی

(۴) تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا۔

(۵) تاریخ میں فیل۔

(۶) انگریزی میں فیل۔

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہرچند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہو گا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے، پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار در اصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا۔ بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی۔ اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا۔ تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں پرچوں پر کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اکثر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن ادھر ادھر کے لوگ "کہیے میاں صاحب؟" "ابھی کیا کہہ سکتے ہیں" آئیے

بھی کوئی بات ہے کہ ایسے نمبروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہر حال اب کے ہم گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ والد کو تسلی دی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ بھی شروع کر دینا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو نوکری کے ڈربے میں۔ اور جب نوکری کے ڈربے سے نکلے تو اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال۔ صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری معاملات بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہمسری کا فخر حاصل تھا۔ ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہو سکا۔ کہنے لگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو۔ وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے۔ جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں۔ کامن روم میں۔ غسل خانوں میں۔ برآمدوں میں۔ ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے۔ وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ ....

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی۔ جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی۔ اور انھیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہاسٹل میں آ رہے ہیں۔ جس سے ہم طلبا کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادرِ مہربان کی سی سوچ لی جس کے اردگرد ناتجربہ کار طلبا مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے۔ تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے۔ اور فلاں فلاں .

تو اسے اپنے آپ پر مسلط کر لیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔
اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ جب سمجھ نکلا۔ زعم پیدا ہو گئے۔
ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے بر سبیلِ تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں۔ ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں۔۔۔

"اچھا!۔۔۔۔۔۔ اچھا!۔۔۔۔۔۔ تھینک یو!۔۔۔۔۔۔ جاگ گیا ہوں۔۔۔۔۔۔ بہت اچھا! نوازش ہے!" آپ جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں! اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا، نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے! یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لیمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا آج پتہ چلائیں گے یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبحِ کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں، ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی "لالہ جی!۔۔۔۔۔۔ لالہ جی!"

جواب آیا "ہوں!"

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"

کہنے لگے: "تو اللہ کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے گا؟"

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟"

کہنے لگے: "تین...... تو...... نہیں...... کچھ سات...... ساڑھے سات...... منٹ اوپر تین ہیں۔"

میں نے کہا: "ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا۔ کہ صبح جگا دینا۔ یا یہ کہا تھا۔ کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت والد صاحب کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و تشدد کو خیرباد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوش شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی: "مسٹر!"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا۔ "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)

میں نے کہا: "اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمائیے؟"

بولے "ذرا...... وہ میں...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا: "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں؟" صاحب، خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لئے۔ نکٹائی کھول دی۔ آستینیں چڑھا لیں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد، سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو

جواب آیا۔ کیوں انقلاب کی کیا مجال جو جیب سے پرے ظاہر ہونے پائے۔ وہاں ہم کو تھوڑا سا پچھتاوا ہوا کہ سات بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو دیا اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغویات ہے، البتہ پانچ، چھ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی۔ اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں ۱۰ بجے کے چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوتِ ارادی کافی زبردست ہے جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انھوں نے پتھر کھینچ مارا: "یس!"

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی۔ صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں۔۔۔۔۔"

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا: "جب چھ بج چکیں تو۔۔۔۔۔ سنا آپ نے؟" چُپ۔

"لالہ جی!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا: "سن لیا، سن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس تھرا لفا پلس۔۔۔۔۔"

ہم نے کہا: "ب۔ ب۔ ب۔ بہت اچھا۔ یہ بات ہے۔"

توبہ۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی بہت شریف آدمی ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اسی شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب ہیں۔ اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا پتہ نہیں۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ۔ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب، شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے

آپ کو دوستانہ نگاہ لالہ جی سے بیش بیش رہتی ہے۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو بعد میں بھی کچھ ممنونیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے ہم نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ ورنہ اوروں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ "لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے، جو پڑھو خود بخود یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کی بجائے صبح، صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹتا"

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد نہ دی اور آپ پوچھنے لگے۔

"تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں، واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بے شک۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے دو تین کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب سرکا لیا، اوورکوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیت الکرسی پڑھی۔ اور دل میں نہایت ہی نیک نیتیں باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو "گڈ مارننگ" کیا۔ اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا "دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔" دل نے کہا "اور کیا! تمہارے تو یونہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔" ہم نے کہا "سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں۔ تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور خندہ جبینی سے جاگ اٹھے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔" ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا۔ اور پھر سوچنے لگے۔ "خوب۔ تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارہ یہی کہتا کہتا مر گیا۔ لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی ....(لحاف کانوں پر سرک آیا) ...."تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں .... بہت ہی پہلے یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے .... کیا بات ہے۔ خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے ....

........."(لحاف سر پر)" .... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے .... "(آنکھیں بند)" .... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کونسی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں

شیکسپیئر بہتر ہو گا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ دو گھڑی جذبات کے محشرستان سے فرار کرنا ٹھیک۔ فلسفہ نہیں۔ ورڈزورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کا سکون و اطمینان میسر ہو گا۔ اور دل اور دماغ فطرت کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے .... لیکن شیکسپیئر .... نہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک رہے گا .... شیکسپیئر .... ہیملٹ .... لیکن ورڈزورتھ .... ٹنٹرن ایبے .... دیوانگی .... سبزہ زار .... سبز سبز .... بادِ بہاری .... [illegible] .... کشمیر .... میں آفت کا پرکالہ ہوں ....؟

یہ مسئلہ اب مابعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو میں نے لحاف سے سر باہر نکالا۔ اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تو دس بج رہے تھے۔ اس میں نامعلوم کیا بھید ہے!

کالج جاتے ہوئے لالہ جی ملے کہنے لگے "میں نے صبح آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا؟"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "او ہو! لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بعد میں .... اس کے بعد .... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں؟"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تحقیق میں رہے پھر یکایک ایک گونہ بشاشت اور مشفقانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اس وقت ..... اُ سے ..... اسے ..... نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیئے۔ اور ہم اپنے زہد و اتقا کی تسکین میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روز مرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دل مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرقِ ناز محوِ بالشِ کم خواب ہو۔ اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُرپیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار

ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت "سانوری صورت توری من کو بھائی" کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔

تعجب یہ ہے کہ پہلے "سنہ 1 سنہ 2" کی آواز اور دروازے کی دھاڑ سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کلاک کا گھڑیال وہاں کے رہتے رہتے ہیں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں کرسیوں کے گر پڑنے ——— بچھونوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کتابوں اور برتنوں کے گرنے، کھنکنے اور کھڑکنے کی آوازیں تو گویا ایک الگ ہی جہان ہیں۔ اندازہ کر لیجئے کہ ان سازوں میں سُر تال کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے!
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

———

کتے

علم حیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا، خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے۔ گائے کو لیجیے، دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجیے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے - تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا۔ لیکن کبھی ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں کوئی ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجیے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی۔ اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں۔ بےتالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کیے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجیے۔ جو ایسے موقع پر

ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافع بلیات ہے۔ لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ اسے اگر دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے، ایسے موقع پر کبھی گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں۔ اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں۔ اور نومشقی کا عالم بھی ہے۔ اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بےسرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو، آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بےآواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں۔ سمجھ لیجیے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں۔ بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے۔ تو ہم بھی چاروناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔ (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ، سہ روزہ، دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے۔ اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو۔ تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کرے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟

ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ اُن کا شور، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب)، بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری)، اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا؟ بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے کہ عالی جناب، سڑک بند ہے۔ تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کئے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔ تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے۔ اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا، وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی، تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دُم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا، انھوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی "بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے، نظر نہیں آتا، ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔" بس اس فقیر کی بد دعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں، کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے ؎

عُرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے"۔ یہ بجا سہی، لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

———

اُردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے۔ اور پیار سے حسبِ ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

(۲) بڑا آدمی کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

(۳) دولہا کب بنے گا۔ اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم کب بڈھے ہوں گے؟

(۵) تو کب کما کے لائے گا؟

(۶) آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے۔ تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو افیم کھلا کر اس میں ڈال دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے)۔ جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے۔ اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کبھی نیند میں رونے لگتا ہے تو بےچاری مامتا کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک اور ابال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے کہ چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ واہ۔

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا۔ بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے وہ ہر چیز کو قرینے سے رکھتی ہے دھوئے دھائے

بیوی تو صندوق پر بیٹھی ہیں۔ [illegible] ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا کسی میں چوہے۔ چھلنی اور پانی کا لوٹا [illegible] تاکہ جب چاہے ساگ چڑھا لے۔ جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گوندھا رکھا ہے۔ چاول پکے ہوئے نیچے اندر رکھے ہیں۔ دال چولہے پر پک رہی ہے۔ غرضیکہ سب کام ہو چکا ہے۔ لیکن بیوی پھر بھی وہیں بیٹھی ہے۔ میاں جب آتا ہے تو کھانا نکال کر سامنے رکھتی ہے۔ پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھانا کھا چکتا ہے تو [illegible] تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ کھانے پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے۔ کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو [illegible] کی بدولت بیماری پاس نہیں آتی۔ آپ ... سے علاج کروانا پڑے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے!

بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے۔ دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی بیل پر لادی لاتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر۔ تاکہ کپڑوں والے کبھی پہنچ نہ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے۔ گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے۔ صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ اب تک پانی میں کھڑا ہے۔ اسے ضرور سرسام ہو جائے گا۔ درخت کے نیچے بیل بندھا ہے۔ جگالی کر رہا ہے۔ پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے بیچ ایک کشتی دوڑ رہی ہے۔ دھوبی انہیں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔

دیکھو دھوبن روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑا پتھر پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے۔ اب دھوبن گانا گائے گی۔ دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب عادت کی وجہ سے اور پھر یہ تو ہمارا چوکیدار ہے۔ دیکھئے! امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں۔ کیا مجال کوئی پاس تو آ جائے۔ جو لوگ ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لے جا سکتے۔ میاں دھوبی! تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک صاف کرتے ہو۔ ننگا پھرتے ہو۔

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لئے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجئے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے۔ ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل۔ کوے۔ گدھ۔ شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ

کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے۔ اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا۔ نہیں۔ تم ہی باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر کمبل ڈال کر ایک کونے کی چوکی پر چپ چاپ منہ میں سگار دبائے میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا۔ بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد! ہم نے کہا۔ کچھ نہیں۔ کہنے لگے۔ اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب ہمارے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچ کر مذاق کچھ کہ اس لئے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن کچھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:

"مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب اپنے چہیتی سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے۔ اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے۔ لیکن ابھی کھٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل۔ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لئے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کا آمادہ ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری بیوی کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو کہ گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں۔ تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا۔ کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری۔۔۔۔۔" اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھا لی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لئے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی۔ تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بے شک دوست آئیں۔ بے شک اودھم مچائیں۔ میں بے شک گاؤں۔ بے شک جب چاہوں اٹھوں۔ بے شک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:

"روشن آرا جلدی کرو ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی۔ خط ضرور لکھتے رہئے؟ میں نے کہا۔ "ہر روز اور تم بھی؟"

کھانا وقت پر کھا لیا کیجیے۔ اور دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا۔ اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں سٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو یا وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں۔ تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگایا۔ ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں۔ اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سن لیا نا! کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان۔ آدمی کا نام و نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی۔ شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔

"تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا "تھیٹر؟"

کہنے لگے "بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا!"

باہر کے کمرے میں ایک لچکیلی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی۔ جمائی پہ جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا "ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا مردود کہیں کا۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لئے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا۔ تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرخ رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہترا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ "میں بہت اداس ہوں تم فوراً آ جاؤ!"

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لئے تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے

پھر دیکھا کہ حقے میں گڑ نہ ملا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور یہاں اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مزے ہی اپنی طرح کہہ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا۔ بہت متین طریقے سے قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یاروں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا لیا۔ اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی لطیفے کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا سین تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے!" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آجائے گی۔" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ویسا کھیل ہے سلطنتوں کے، ملے ہیں سلطنت تو کے؟"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے۔" کوئی کہے "نہیں حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔" دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے۔ "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا "تو ہوا کیا! آج ہم ہیں۔ کل کسی اور کی باری آجائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا سے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے۔ اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ اٹھایا تو روشن آرا!

دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا۔ کہ تم فوراً آجاؤ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے۔ سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی۔ اور پھر کہنے لگی ۔۔۔۔ لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود از حد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکئے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

منطبہ!
"جی ہاں!"
"تم سے جاؤ، چلے جاؤ!"
"قانون تماشہ دو!"
"بھاگ جاؤ!"
میں اس سے زیادہ کیا عرض کروں تو آپ دیکھئے تو سہی!

مریدپور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ وہاں کہیں ملازم تھا۔ غبن کا الزام لگا۔ ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آ جاتا ہے۔ میں نے شائستہ سے شائستہ والدین کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں میں موجود تھا وہیں کانگرس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں اور اب بھی ببانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکین نخوت کے لئے کانگرس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدظنی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ ہاں ایک مرتبہ بعض عقیدتمندوں کو بھی دعوت دی ہے۔ لیکن کانگرس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ میں اس سے زیادہ اس موضوع پر کچھ نہ لکھوں گا۔

جب کانگرس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متنفس ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے۔ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا۔ چنانچہ میں نے شغل بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آ کر

اس مدعی کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے مذکور ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے۔ بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باوضو ہو لیا کرتے۔ خط کو خود پڑھتے۔ پھر دوستوں کو سناتے۔ پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے۔ پھر مقامی اخبار کے بے حد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام مریدپور گزٹ ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔

رنگ گندمی۔ ناک نقشہ معمولی۔ شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مریدپور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں۔ اور عنداللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہو گی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل بوتے پر ایک کانگریس نمبر بھی نکالا تھا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مریدپور کے بچے بچے نے میری قابلیت۔ انشاپردازی وسیع الدماغی اور جوشِ قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مریدپور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں۔ جو وقتاً فوقتاً مریدپور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں بھی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے۔ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازاروں سے گزر جاتا ہے مریدپور میں پوجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگریس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مریدپور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی یہ تذکرہ ہی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہرحال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے جہاں کسی کو ایک میز ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مریدپور کی انجمن نوجوانانِ ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا۔ کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ و مہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ سارا ملک اگرچہ آپ کی ذات بابرکات کا از حد ضرورت مند ہے۔ لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے کیونکہ ع

خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

اسی طرح کی تین چار براہین قاطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔ خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا۔ تو رفتہ رفتہ باشندگان مریدپور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک گمنام انسان ہوں۔ اور یہ لیڈری کا نشہ ایک گھڑی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہلِ وطن کی بے حسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا۔ کہ ان بیچاروں کی بہبودی اور بھلائی کا ذمہ دار تو ہی ہے تجھے خدا نے تدبّر کی قوت بخشی ہے۔ ہزارہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اٹھ! سینکڑوں لوگ تیرے سامنے ہاتھ لئے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں جواب دیا کہ اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں؟"

"ہندو و مسلم شیر و شکر ہیں؟"

"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں؟"

"جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا۔ وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں "سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا" والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا۔ کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی۔ جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑ دو۔ وہ توڑ نہیں سکتے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو مجھے اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی۔ کہ

"پیارے ہم وطنو!

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلم بند کئے تھے۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس کے یہ الم ناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے...... وغیرہ وغیرہ

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس۔ غربت۔ بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا۔ جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت۔

آخر میں مغربی تہذیب۔ لیکن ان سب کو بڑی بڑی غلط قرار دوں گا اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصل وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ بعد میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا۔ کہ

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اسی طرح غور کرنے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا۔ اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا تاکہ جلسے میں اُسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

۱۔ تمہید۔ اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو)
۲۔ ہندوستان کی موجودہ حالت۔
(الف)۔ افلاس
(ب) جہل
(ج) قومی رہنماؤں کی خود غرضی۔
۳۔ اس کی وجہ۔
کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں
کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں
کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں
تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ جس کے دوران میں مسکراتے رہو، تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو۔)
(۴) پھر بتاؤ۔ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے (نعروں کے لئے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔
(اس کے بعد شاید چند نعرے بلند ہوں۔ ان کے لئے ذرا ٹھہر جاؤ)
(۵) خاتمہ۔ عام نصائح خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)
(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد۔ جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا۔ اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکۃ الآرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ مسکرانے کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب طرف پہنچ سکے۔ اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک فقرہ سن لیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ راستے میں سالا کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انجمن نوجوانان ہند کے بعض پرجوش ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہار پہنائے۔ اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیے۔ سالا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی

مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو سٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے انھوں نے کہا "سر باہر تشریف لے چلئے، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں" میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے۔ ایک گلدستہ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سرخ سرخ جھنڈوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ مثلاً "ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے" "مرید پور کے فرزند خوش آمدید" "ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے"
مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:-

"حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لئے بلایا گیا ہے......"

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یکلخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سمجھایا کہ ٹھہرو ابھی اور کئی جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

"مرید پور کا شہر ان پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوع انسان کے لئے......"

خدایا اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا۔ جاہل کہنا چاہیئے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ غیر مہذب۔

"...... ان کی اعلیٰ سیاست دانی، ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں۔ لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے......"

ہاں وہ تقریر کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں۔ لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے...."

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا۔

مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے، اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیرِ اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا۔ لیکن پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا۔ میں بیہوشی سے ذرا بچا ہوا تھا۔ اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح مسلسل دے رہی تھیں جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی۔ یہ بگلے اور لومڑی کی کہانی؟ نہیں ٹھیک ہے وہ بیل.....

سنتے ہی ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لئے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھول لیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بصد مشکل میں نے یہ کہا کہ: ۔

"پیارے ہم وطنو!"

آواز خلافِ توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا۔ تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا: ۔

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد دم لیا اور پھر کہا: ۔

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ سینکڑوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں۔ لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی سے ہال گونج گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے۔ کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں...... مجھے آپ! (وقفہ......) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔ کچھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے۔" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

مثلاً آپ لڑکیوں کے ایک گھٹنے کو لیجیے۔ لڑکیاں اکثر ضعیف ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ غریب ہیں۔ اس لئے گویا لڑکیوں کا گھٹنا یعنی آپ دیکھئے نا کہ اگر؟

(بلند اور طویل قہقہہ)

حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ تجارت منڈلا رہی ہے (قہقہے اور شور و غوغا...... ایسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے)

شیخ سعدی نے کہا ہے کہ

چو از قومے یکے بے دانشی کرد

(آواز آئی کیا بکتا ہے) خیر اس بات کو جانے دیجئے۔ بہرحال اس بات پر تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ: ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے رہے سہے جنون کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا۔

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی زندگیاں لوگوں کے لئے شاہراہ ہیں۔ اور ان کی حکومتیں چار دانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے دو تمام نتیجے ......"

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگرٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد سٹیج پر آ گریں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے!

تم ذلیل ہو......"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی۔ تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رخ کیا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ اُن کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھس گیا۔ ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس دن کے بعد آج تک نہ مریدپور نے مجھے مدعو کیا ہے۔ نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

انجام بخیر

(منظر)

ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لنڈورا بداندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔
زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپیئر، ٹالسٹائی، ورڈز ورتھ وغیرہ مشاہیر کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔
باہر مینہ پانی کے جھونکے آ رہے ہیں۔ قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ اس کے بینڈ کی آواز سنائی دے رہی ہے جس کے بجانے والے دق، دمہ، کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

پیٹرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے لیکن چہرے پر گزشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پیٹرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پیٹرس: حضرات اندر تشریف لے آئیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت چھوٹا خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو۔ اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔

(کمرے میں ایک پُراسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

طالب علم: (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے، اے ہمارے محترم استاد! ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔

(کتابوں کو چھوڑ کر اُن پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس: - کہو اے میرے دوستوں کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم: - اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ دینے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم: - اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم: - اے ہمارے مہربان! ہم تیری محنتوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس: - یہ نہ کہو، یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا۔ اس کا معاوضہ مجھے اس وقت وصول ہو گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے مجھ پر ظاہر کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم: - (سرو قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پرچیں اور سوال درس کے امتحانات کی آزمائش کرتی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اجالا ہو گیا۔ مقتدر معلم! تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اظہار تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں، اُسے قبول کر کہ ہماری احسان مندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس: - تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بیقراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر بینڈ یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے)

پہلا طالب علم: - (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان مجھ حقیر کی نذر قبول کر (بڑے ادب و احترام کے ساتھ اٹھنی پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم: - (آگے بڑھ کر) اے فرشتے میرے ہدیے کو شرفِ قبولیت بخش (اٹھنی پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم: - (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان مجھ ناچیز انسان کو مفتخر فرما (اٹھنی پیش کرتا ہے)

پطرس: - (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادت مندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے (تینوں اٹھنیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)

طالب علم: - (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لئے بیتاب ہوں گے۔

پطرس: - خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں)

•

پطرس:۔ (تنہائی میں سربسجود ہو کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے بدلے بہت رزق عطا کیا ہی زیادہ، تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن ہماری ہوس اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے دینے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھ ہی کو بنا رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پراسرار سی روشنی چھا جاتی ہے اور درختوں کے پتوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے اٹھتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے)

پطرس:۔ اے خدا کے برگزیدہ اور مخلص بندے! ذرا یہاں تو آئیو!

ملازم:۔ (باہر سے) اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا۔ کہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے کچھ لمبے ہو گئے ہیں)

پطرس:۔ آہ، انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے بینڈ کی دھن کے ساتھ مل رہی ہے۔

(پھر سربسجود ہو جاتا ہے)

(پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اٹھنیوں پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو فوراً ایک کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے)

پطرس:۔ آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو!

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس:۔ اے مرد، رہینۂ انسان! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ شمعِ علم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ ہم خداوند تعالیٰ کے دربار میں تم ہم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آ گیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر۔ اور باقی ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے۔ اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)

پطرس:۔ خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ۔ اور اس نئے طبقے کے لوگوں کا سا غرور ہم سے دور رکھ!

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

(باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آ رہی ہے .... ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ بینڈ بدستور بج رہا ہے۔
یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آ کر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے)

پطرس:۔ (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے؟

ایک آواز: ۔(باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور با ادب دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں۔ اور عرض حال کروں۔

پطرس: ۔(دل میں) میں اس آواز سے نا آشنا ہوں۔ لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے (بلند آواز سے) اندر آجائیے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ گو چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے۔ لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)

پطرس: ۔آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت ہی ہیچ خیال ہے علم بڑی نعمت ہے۔ لہذا اے محترم اجنبی! اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کیجیے اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔

اجنبی: ۔ اے برگزیدہ شخص! میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس: ۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی: ۔ اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبۂ تعلیم کا افسر اعلیٰ ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کردو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)

پطرس: ۔ اے خدا! کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟

اجنبی: ۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو۔ کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر یقین کرو۔ میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں۔ اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہیں۔ اے شریف اور رحم دل انسان یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کر لو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی زور سے چیختا ہے)

پطرس: ۔ ہاں اب مجھے کچھ کچھ یقین آگیا۔ لیکن حضور والا۔ آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لئے اس قدر باعث فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی: ۔ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گزشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس: ۔ (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی: ۔ میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے۔ اگر آپ منظور کریں تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس :- آپ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ یہ عالم بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چند خدام بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا کر چلے جاتے ہیں)

اجنبی :- (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ سمرقند شاہزادہ ولیعہد۔ مانسر لے ہندا وہ کا تذکرہ بحیثیت ان چاندی کے ایک پر یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدر دانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (میری آنکھوں سے)۔ ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے۔ ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس :- (صندوقوں کو دیکھ کر) سونا! اشرفیاں! جواہرات! مجھے یقین نہیں آتا (آبدیدہ ہو کر رونے لگتا ہے)

اجنبی :- ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)

کاتا۔ آج موری انکھیاں نہ لائیں۔

پطرس :- اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں۔ اور تو نیوں کا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو ہمارے تیرے آرام سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کر ہمارے مطالعے کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں ہمارا پانسو روحوں کو خواب جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی :- (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس :- خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پُراسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے)۔

سینما کا عشق

"سینما کا عشق" عنوان تو عجب ہوس خیز ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں۔ یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو رومان انگیزی ہے۔ میں اس کا قائل نہیں۔ میں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا مورد عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سینما گویا میری ایک دکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سن پاتا ہوں۔ بعض درد انگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی تلخ سی بن گئی ہے۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے۔ ان کی دوستی سے جو جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضۂ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما کا ارادہ ہو۔ ہفتہ بھر پہلے سے انہیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں۔ اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں ہرج واقع نہ ہو۔ لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں:۔

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروتی بھی برتی ہے۔ کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں۔ اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں:۔

"بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات سمجھانے کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

"کیوں بھئی سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں: "بھئی ہمیں معلوم نہیں!"

"میرا خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے؟"

"اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں۔"

"نہیں مجھے یقین ہے۔ چھ بجے شروع ہوتا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟"

اس کے بعد آپ ہی کہئے میں کیا بولوں؟

خیر جناب جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں۔ ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں۔ لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آکر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگرٹ سلگا لیتا ہوں۔ اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہُو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آجاتا ہوں۔ اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں یا نہا رہے تھے۔ تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں۔ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آجاتی ہے۔ آخرکار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں:-

"کیوں حضرت! آپ اندر ہی تھے؟"

"ہاں اندر ہی تھا۔"

"میری آواز آپ نے نہیں سنی؟"

"اچھا یہ تم تھے! میں سمجھا کوئی اور ہے۔"

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں۔ اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں۔ اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں:-

"تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟"

"وہ کہاں؟"

"ارے بندۂ خدا آج سینما نہیں جانا؟"

"ہاں سینما۔ سینما۔ (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے سینما۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آتی۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔"

"تو چلو پھر اب چلیں"

"ہاں وہ تو چلیں ہی گے۔ میں سوچ رہا تھا۔ آج ذرا کپڑے بدل لیتے۔ خدا جانے دھوبی کم بخت کپڑے لایا ہے یا نہیں۔ یار ان دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔"

اگر قتلِ انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہو جاتا ہوں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ

"مرزا جی! للہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سینما چلنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار ٹھیک ساڑھے چھ بج چکے ہیں۔ اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"

مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمہاری طفلانہ خواہشات آخر پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انہیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے پر پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آ جاتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کرید رہے ہوتے ہیں۔

"ارے بھئی چلو۔"

"چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟"

"اور یہ تم کر کیا رہے ہو؟"

"پان کے لئے ذرا تمباکو لے رہا تھا۔"

تمام رستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آ ملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں۔ پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تیز رفتار سے ہوں۔ لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اِدھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ "یہ دروازہ بند کر دو جی!" یا اللہ اب جاؤں کہاں۔ رستہ، کرسی، دیوار، آدمی۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں۔ تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لئے دیوار پر لٹکی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے پاؤں کو پھاند، اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا، خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا، آخرکار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں۔ اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں "میں نہ کہتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کروا دیا۔ کم بخت کہیں کا!" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں۔ اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب قصے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کونسا ہے، اس کی کہانی کیا ہے اور کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ عیاں ہو۔ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک وسیع و فراخ انگڑائی لیتے ہیں۔ جس کے دوران میں کم از کم دو تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے۔ جب انگڑائی کو ختم کر چکتے ہیں۔ تو اپنا سر کھجانا شروع کرتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے۔ بلکہ بازو کو ویسے ہی خمیدہ رکھتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے ان کے بازو اور ان کے سر کے بیچ میں سے اپنی نگاہ کے لئے راستہ نکال لیتا ہوں۔ اور اپنے بیٹھنے کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے میں ٹکٹ خرید کے بغیر اندر گھس آیا ہوں۔ اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا پسو محسوس ہوتا ہے چنانچہ وہ دائیں طرف ذرا اوپر ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں غرضیکہ یہ عمل یونہی جاری رہتا ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں۔ وہ بائیں تو میں دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے "یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو۔"

اس کے بعد غصے میں آکر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اور قتل عمد، خودکشی، زہر خورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا۔ اور اگر آیا بھی تو اس کم بخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آجاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا کودتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوور کوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہرحال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کم بخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی لیکن ہم دونوں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔ اس لئے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ کئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا، میں بھی ہمہ دانی کا دعویدار۔ اکثر گیلریوں یا کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر کوئی نئی کتاب یا نیا مصنف "دریافت" کرتا تو دوسرے کو ضرور اس سے آگاہ کر دیتا، اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویے میں ہم کبھی کبھی اس کی تکذیب کر دیتے تھے۔ بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایات کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنف ضعیف ہی کے ایک فرد کو ملنی چاہئیں۔ اور بعض اوقات میں تحکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا، جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض یہی ہے۔ خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ قلق دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو سخت صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا اور دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیونکر نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی اور ہفتہ بھر کے بعد انہیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انہیں پڑھ چکی ہوں، تم بھی پڑھ چکو گے تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اول تو میرے لئے ایک ہفتے میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا، لیکن فرض کیجئے مردوں کی لاج رکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے مجھے کافی عرصہ درکار ہوتا۔ چنانچہ ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ نہایت

حالانکہ اندر وہی بیوی اوپر کو چڑھا جو ما کرتی کرتی۔ جب میں اس کے لئے دروازہ کھولتا یا اس کے سگرٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا، اپنی نشست پیش کرتا یا وہ آتی اور میں کرسی اس کے لئے خالی کر دیتا۔ تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

جیل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی۔ جاہل یا عالم کا بننا سہل ہے۔ لیکن نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور ناجائز ذرائع کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھئے لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب جیل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نہ پڑھی تھیں۔ ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی لیکن بچ بچا کر اور سنبھل سنبھل کر گفتگو کرتا تھا۔ تصنیف کے متعلق کوئی بات منسوب کرنے سے انکار تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کس ناول کے متعلق جیل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لا ابالی پن سے کہا۔

"ہاں اچھی ہے لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دور جدید کا نقطہ نظر کچھ نبھ نہ سکا۔ لیکن پھر بھی بعض ٹکڑے نہایت عمدہ ہیں۔ بڑی حد تک۔ بہت ہی نہیں۔"

کنکھیوں سے جیل کی طرف دیکھتا گیا۔ لیکن اسے میری چالاکی بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا۔

"ہاں پڑھا تو ہے لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی جیل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا۔

"اس نقاد پر اٹھارھویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یونہی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے۔ بہت دلچسپ۔ بہت دلچسپ!"

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں جیل سے نہ دبتا تھا۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف وعدوں کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی۔ اب میں اس کے لئے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں تو نہ سراہیں۔ لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دوہری دوہری لعنتیں بھیجیں گی۔ کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ ان کی تسلی کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیے کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا مجھ کو ابھی

مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھنے ہی کے حیثیت جتاتا رہتا ہوں۔ میبل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے۔ تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے نا کہ وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی، میرے اپنے نزدیک تو مسلم ہے۔ اس خیال سے اطمینانِ قلب پھر مفقود ہو جاتا اور میں اپنے آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا۔ پہلے تو میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا اب وہ اپنے مقابلے میں پاکیزگی اور راست بازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ ہولناک نہ تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا تاہم گزشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی۔ دوا پلائی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) "میبل مجھے خدا کے لئے معاف کر دو۔" اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کر دی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی خامہ فرسا تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا: "میبل پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں۔ ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا؟"

کہنے لگی: "نہیں تو۔"

میں نے کہا: "مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیرکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بکتا رہا۔ وہ سب من گھڑت تھا۔"

کہنے لگی: "کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا: "پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا؟"

کہنے لگی: "ہاں! پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔"

اس کے بعد میری گزشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی: "تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"

میں نے کہا: "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا لیکن اب میں انہیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہیں یہیں رہنے دو، تم تو انہیں پڑھ چکی ہو۔"

کہنے لگی: "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انہیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں۔ مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی، اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا۔

”مرزا۔ ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟“

مرزا صاحب بولے ”بھئی کچھ ہوگا ہی نا آخر؟“

میں نے کہا ”میں بتاؤں تمہیں؟“

کہنے لگے ”بولو۔“

میں نے کہا ”کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں .... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم میں میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں۔ تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کی دم ہوتی ہے۔ تمہاری دم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں، میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔

میں تمام عمر سے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں، دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگرٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں۔ یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت بھینچ لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا۔ لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا

مرزا بولے "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں!"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگرٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگرٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں!"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے۔ تاکہ مجھے معلوم ہو کہ کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں!"

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے سکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی سکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا تم جلتے ہو مرزا۔ اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو خیر ہو جائے گا۔ لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے: "کون کون سے شغل؟"

میں نے کہا: "ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔"

مرزا بولے کہ "بہت اچھا، یعنی آپ نے تو یہ ہو سکے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائیگا۔"

اس کے بعد ہم دونوں پر یہ معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے رک گیا ہے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش بیٹھا رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے: "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو۔"

میں نے کہا: "وہ روپیہ دو گے تو پھر چوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے: "مفت!"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "مفت! وہ کیسے؟"

کہنے لگے: "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے۔"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، ابلتے ہوئے فواروں کی موسیقی، اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا: "یہ ہے کس کی؟"

مرزا بولے: "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ تم لے لو۔"

میں نے کہا: "پھر کہنا۔ پھر کہنا!"

کہنے لگے: "بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے۔ جب میری ہے تو تمہاری ہے۔ تم لے لو۔"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا: "مرزا! سب سے پہلے میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا، لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے۔ جیسے میں سوار ہوا، ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا "مرزا مفت میں نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم حساب ماننے والے ہو کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا "خیر کچھ بھی سہی تم مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے "نہیں، ایسی پرانی بھی کیا ہوگی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں۔ جنہیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے۔ میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا لیکن ...."

میں نے کہا "نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو۔ میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا۔ ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں۔ یہ تو کچھ دکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے "بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔ تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو۔ لیکن مفت میں کیسے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے۔ اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیئے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا لیکن اگر ایک

مطلب یہ تھا کہ حجت کرنا منظور کرنا نہیں اپنی ترجیح صورت ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا:

مرزا! چلتے چلتے تو میں نے پھر کہا کہ مرزا ضرور صبح ہی بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا "کل بالکل آٹھ بجے تک پہنچ جائے ورنہ .... خدا حافظ ...... اور دیکھو مرزا میرے قصور معاف کر دینا ہی زیادہ کہا .... خدا حافظ .... اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو کچھ برا نہ ماننا .... کل صبح آٹھ بجے تک ...... ضرور .... خدا حافظ!"

مرزا کہنے لگے "ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا۔ اور تیل وغیرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی تو میں خود ہی ڈلوا دوں گا۔ ورنہ تم خود ڈلوا لینا۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ تم کل ضرور بھیج دینا۔ اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات بجے تک پہنچ جائے۔ اچھا .... خدا حافظ!"

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر ارد گرد کی تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالوں گا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں جو ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا۔ صبح صبح بہت اندھیرے منہ اٹھا کروں گا۔ تڑکے تڑکے ٹھنڈی سڑک پر چلا اور تیر کی سی تیزی کو نکلیں گے۔ میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھ وقت کی ایک لپیٹ کی مانند گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیسکل جگمگا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بارہا دل چاہا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے لگاؤں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔

صبح اٹھا تو اٹھنے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور وہ بائیسکل آ گئی ہے۔

میں نے کہا: "اتنی سویرے؟"

نوکر نے کہا: "وہ تو رات ہی کو آ گئی تھی۔ آپ سو گئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔"

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں۔ روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیسے روک رکھتے۔

نوکر سے کہا: "دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ۔ اور دیکھو۔ بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو۔ اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے۔ اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ۔ اور دیکھو! ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا۔ اور بائیسکلوں والے سے کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دے دے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اور بائیسکل باہر نکال کر رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں اور ذرا صاف کر دینا اور بہت زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔"

جلدی جلدی چائے پی۔ غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ "چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے۔ اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی۔ وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا!" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور قدیم ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا۔ جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخرکار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلی ہی بار پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے کہ چلتے ہی کچھ تھوڑی سی ناراضگی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ گھنٹی اس انداز سے بجتی رکی زمین پر بیٹھا ہے۔ اور سائیکل کے مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چوں چوں چرچراہٹ قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھٹ کھڑکھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر چر چٹ چٹ قسم کی آوازیں زنجیر اور پیڈل سے نکلتی تھیں۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا۔ زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی۔ اور چٹ چٹ بولنے لگتی تھی۔ اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ ...... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک عجیب کہرام سا آیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی۔ لیکن چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ۔ چچوں پھٹ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کروں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرایا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے رنچ نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے۔ اور برابر ہچکولے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کا تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لئے میری مصیبت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی۔ اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے

کہتے "دیکھو جی ذرا بلیا کر رہے ہیں" یا اس بلیا کے نزدیک ہی کوئی لڑکا آ کر ٹھہر جاتا۔ پھر دونوں پیڈل ادھر ادھر کو ڈگمگا جاتے۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک دو ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ مگر جس کے دوران میں میرے پاؤں اور میرا جسم برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں۔ بہت ہی کم ہوتے۔ اس دوران میں بھی یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پیچھے بیٹھ کر پاؤں کو پیڈل پر رکھوں، چنانچہ ذرا ہٹ کر بیٹھتا۔ بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن پاس سے پیڈل پہچانا جب ہو جاتا کہ وہ تیار ہو جاتا۔

جب دو میل کا سفر کٹ گیا اور بائیسکل کی آواز مختلف نے ایک حد تک بار بار مدد کی اختیار کر لی تو بعض جگہ کسی مستری سے ٹھیک کروا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے۔ سب نے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا "ذرا اس کی مرمت کر دیجئے۔"

ایک مستری آگے بڑھے۔ تو جب کی پہلی سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹٹول ٹٹول کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر مجھ سے پوچھنے لگا "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا "بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کر دو اور کے کسا ہوا ہے بس اور کیا؟ اور کچھ باقی کو فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا "اگر باقی چیزیں بھی کس دی جائیں تو اچھا ہو؟"

میں نے کہا "اچھا کر دو۔"

بولا "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے لو گے؟"

کہنے لگا "بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔"

ہم نے کہا "بس جی۔ جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا "میں نے کس تو دیا ہے لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "بے ہودہ کہیں کا۔ تو دو آنے پیسے مفت میں لے لئے؟"

بولا "جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ .... للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں۔ لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا: "واہ، مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے۔ اور ان کو کالج چھوڑے صرف دو سال ہی ہوئے ہیں۔"
مستری نے کہا: "ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے۔ تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی!"
میری طبیعت یہ سن کر کچھ مُردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس سے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاتا۔ اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کُل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں پر بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کوئی چیز بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے۔"

دکاندار کہنے لگا "پھر؟"

میں نے کہا: "لو گے؟"

کہنے لگا: "کیا مطلب؟"

میں نے کہا: "بیچتے ہیں ہم۔"

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخرکار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے۔ ان کا مصرف کیا ہو گا؟"

کہنے لگا: "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا: "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا: "اچھا چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا: "پھر کیا؟ پھر چلائے اور کیا؟"

دکاندار بولا: "اچھا؟ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا۔ انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔
اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ

بیچنا چاہ رہے ہیں؟

میں نے کہا "تو اور کیا، محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا؟"

کہنے لگا "تو کیا لیں گے آپ؟"

میں نے کہا "یہ تمہیں بتاؤ"

کہنے لگا "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "ہاں"

پھر کہنے لگا "سچ سچ بتاؤں؟"

میں نے کہا "اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے؟"

کہنے لگا "تین روپے دوں گا اس کے"

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا:-

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان! مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں۔ لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے، اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا" یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا۔ اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے میں قدم ہی چلا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور ادھر ادھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں۔ گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ ارد گرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی سائیکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا۔ اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما۔ اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ حاشا و کلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی۔ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دو پہیے کاہے کو لیے جا رہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں انہیں ہنسنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی "بس حضرت غصہ تھوک ڈالیے"۔ ایک دوسرے صاحب بولے "بہت ہی بائیسکل۔ گھر پہنچ کے تجھے سے چمکاؤں گا؟" ایک والد اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "دیکھا بیٹا یہ

مرگھٹ کی بابت مسئلہ یہ ہے کہ تیرے مُردوں پہ ہی آگے آگ ہوتے ہیں!

لیکن میں جب سنبھلا تو تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عجیب سی روانی پائی جاتی تھی۔ یہ وہی چیز تھی جو کبھی کلفٹن سے ایک کشمکش میرے پیچ و تاب کا موجب تھا۔ اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں ہنستا گیا چلتا گیا۔ حتیٰ کہ میں جا پہنچا پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں جیبوں کو ایک ایک کر کے الٹا۔ جب پیدا ہونے کے ساتھ ہی دنیا میں پھینک دیا جیسے کوئی لے کر کچھ چیز چھوڑ جاتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے "اندر آ جاؤ"

میں نے کہا: "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں!"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ دو ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے جب دیکھا تو صفحہ صفحہ نہ ہو بہت [illegible]

ادا کیا۔

"مرزا صاحب آپ بھی اس افادہ سے شروع فرمائیے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

گھر پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایسے ہی پڑھی تھی۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید ۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کُرّے کو دائیں سے بائیں گھمائیے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آکر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقامِ انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں یہ نام کرے پر مرقوم ہو وہی لاہور کا محلِ وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ مگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا۔ تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع ۔ ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے۔ وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یو۔پی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں ـــــ اور اس میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدودِ اربعہ ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے۔ لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا ۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانیٔ آب کے لیے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ سکیم نظام سقّے کے وقت سے چلی آتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقّے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں سخت وقت پیش آ رہی ہے اس لیے ممکن ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے عرصے میں ہر محلے میں چھوٹا سا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی۔ اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی۔ جو انتخاب کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقّے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے۔ کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا نل لگا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں۔ اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو ہک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختے پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں۔ تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو۔ اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انھی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار تارے سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے اور

اس خبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک بے جا اعتدال پیدا کر لے تاکہ سڑک کا ہر تاریک گوشہ اور تنگ گلی کا ہر موڑ اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ ایک بالائی منزل پر جا بیٹھے

قابل دید مقامات ۔ لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اشتہاروں کو پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً "آپ کا ہونہار شدہ بیٹا" "اچھا اور سستا مال"۔ اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً "کریجویٹ ورکنگ ہاؤس یا سٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع" یا "کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا"۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اور کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتلا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا اور لوٹتے وقت وہاں اہالیان لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہاں بحروف جلی محمد علی دندان ساز لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "ناقص کمی کی شفائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ ڈگشن بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت ۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبروں میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے۔ اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے۔ جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار ۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں کی

تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں۔ بعد ازاں دھوبی اور حجام کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گردو نواح میں سے

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں   اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

شمعیں نئی ہوتی ہیں۔ لیکن سب کی تصویریں ایک سنہرے فریم میں جڑ کر اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ لاہور کی خوراک انہیں راس نہیں آتی۔ اس لئے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر روپ اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں۔ لیکن اکثر بےسُرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خاموش طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اسی قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر لاہور پہنچے تھے۔ اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے۔ اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے۔ لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی اتاں کے ساتھ زنانے ڈبے میں سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات:۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

۱۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔
۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کیلئے سزا بھی تجویز کرو۔
۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

یہ مضامین بروقت نہ ملنے کی وجہ سے ترتیب سے بچھڑ گئے ہیں۔ اس لیے بہ مجبوری یہاں درج کیے جاتے ہیں

غنچۂ تبسم کے دیباچوں پر ایک نظر

نیاز مندان لاہور

حال ہی میں تمکین کاظمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسومہ بہ "غنچۂ تبسم" حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ کتاب کے شروع میں پانچ دیباچے ہیں۔ ایک دیباچہ کاظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے، باقی چار دیباچے چار دیگر مشاہیر روزگار کے لکھے ہوئے ہیں۔

کچھ عرصے سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ کوئی کتاب شائع کیجیے تو اس پر دیباچہ لکھا ہے، خدا نے توفیق دی ہے تو کسی اور سے اس کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ ناظرین کرام کو اطلاع دی جائے۔ تحقیق سے تو غیب کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں ابھی تک جہالت کی کثرت ہے اور ہمارے ہاں تعلیم اتنی قلیل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک ایک مصنف کے نکات اہل پسند کا دوسرا مصنف مجبوراً اشاعت لوگوں کے سامنے لا کے ذکر کرے بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے۔ لیکن "غنچۂ تبسم" کے لکھنے کے بعد دیباچہ مملکت زبان کا ہر چہ تیب رسائل کے ذریعے کے منہ میں اڑ سکے یا بس ہے۔ تمکین کاظمی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے لیکن ان کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ جب تک چار آدمی انہیں کندھا نہ دیں وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے۔

اور پھر دیباچے بھی ایسے کہ ان سے نہ تو تمکین صاحب کی شان سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ دیباچہ نویسوں کی شہرت سخن فہمی کی داد ہوتی ہے البتہ نوبت یہاں تک آئی کہ ہم اصول پرورش کی ضرورت پڑتی ہے کہ "دوستان نکتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد"۔ یہ شعر شروع میں شیخ سعدی کی آڑ میں نے اس سلسلے کی کہ ہم بہرحال ناظرین و قارئین کے کثیر التعداد گروہ کے چند غیر معروف فرد ہیں اور دیباچہ نویس حضرات بہرحال اہل قلم ہیں اور ان کے بعض برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اور ترجمانی اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ زور اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں

پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے بقلم خود لکھا ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا۔ "سرآغاز" کا لقب عطا فرمایا ہے۔ دوسرے دیباچے کا نام "الکلام"، تیسرے کا نام "تاثر"، چوتھے کا نام "تعارف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے۔ (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس طرح کا مقفیٰ نام نہ مل سکا ہوگا) یہ تکلفات الفاظ کتاب میں جابجا پائی جاتی ہے۔ فہرست مضامین کو "فہرست مندرجات" لکھا گیا ہے کتاب کا تفسیری عنوان "مجموعہ نگارشات" فرمایا ہے۔ کچھ میں نہیں آتا کہ جدت کے پیچھے یوں ہی ہاتھ دھو کے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرۂ قرطاس" اور "صفحے کے پتے" کی بجائے "سبیل باسطہ اصول" اور "قیمت" کی بجائے "نذر" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی دہشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قاموس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے اعداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے

تزئینی سہرے

اس تو یہ تمکین صاحب کے سرآغاز کا اقرار ہے ستم چار دیباچوں میں اپنی تعریف کرانے کے بعد تمکین صاحب کی تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے خود قلم اٹھایا۔ شروع میں آٹھ صفحے بنام خداوند کرشانہ کر دیئے ہیں "لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا اور تین صفحوں تک لا اُتوں پر لکھتے چلے گئے جا بجا تاریخوں کا حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانہ آئندہ کے مورخ کو کوئی دقت پیش نہ آئے ۱۹۲۸ء میں میں نے یہ کیا ۱۹۲۹ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں مصروف زیادہ رہنا پڑا اور اولی اللہ" دیباں پر رسائل نے مضامین لکھنے کے بہانے تمکین کے نام میں دم کر دیا" آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے، جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ بیجا کوشش کے نقشہ پر ہم نے خط خود اس لئے کھینچ دئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوب صورتی سے کوشش کی ہے سادگی جبلہ غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب، کسی طرح کی پشیمانی اردو لکھنے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی مشورہ دیں گے کہ "تو ملک دکن دو کھینچ ہل" لیکن تمکین صاحب کی انانیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی گل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں۔

"میری مادری زبان اردو ہے" اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے"

نہ صرف یہ بلکہ کہتے ہیں،

"میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کر سکتا تھا"

اس تبحر علمی اور اس قادر الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں اتنی کوششیں بلکہ کاوشیں کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پیش آئی؟ تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں کئی دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں،

"بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے مگر میں اس بدذوقی کا قائل نہیں جنہیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لیں گے یا مجھ سے دریافت کرلیں گے۔"

الحمد للہ کہ آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال آیا لیکن حضرت ایک کتاب کے چار چار دیباچے بدمذاقی نہیں؟ ہر دیباچہ میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ذاتی کی شکل چھپوا دینا بدمذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرنا بدمذاقی نہیں؟ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بدمذاقی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ایسا دوست نہ ملا جو یہ کام بھی کر دیتا جہاں اتنے گرتا گرین در قلمرو عنوان قائم کئے گئے تھے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سو اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے کاتب کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ خوش نویس ہیں مگر،

"وہ بد خط نویس اور بے انتہا غیر پابند بنایت کم سواد ہیں جنھوں نے پہلے کی غلطیوں کے علاوہ بہت سے جملے چھوڑ دیے ہیں"

دل یکی بجاؤ اس کبھی نالانی تھے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعوےٰ نہ فاضل ہونے کا اور ضد کے واسطے توجا لیجئے کہ یہ ایسے

کی تضحیک" جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے غلط کتابت کی یا آپ نے دکنی لفظ کے اصول کے مطابق لکھا؟ اور کاتب صاحب کی کم سوادی کا تو آپ کہاں کہاں بیان پیش کرتے پھریں گے۔ کیا ارنسٹ کے ترجمے میں "ایمیجز" کو ہر جگہ "ایگزنان" لکھنا بھی بنی کے سر تھوپئے گا؟ کم سوادی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتحپوری کے "اعلام" سے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انہوں نے اپنی کم علمی، پریشان خیالی اور غلط نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال اردو میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیباچہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"نقوشِ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ظرافت کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو ظرافت میں شامل کرتا ہوں، اس لئے میرا مقصود یہ ہے کہ دونوں رنگ کے مضامین اس مجموعے میں نظر آتے ہیں۔"

نیاز صاحب خود ہی بتائیں کہ "ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ظرافت کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں" کتنا بھونڈا فقرہ ہے۔ "سلسلے" کا لفظ جس طرح سے انہوں نے استعمال کیا ہے انشاء پردازی کی بےعزتیاں کی دلیل ہے۔ ہم اصلاح کے ذمہ دار نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ فقرہ یوں لکھنا چاہیے تھا:

"نقوشِ تبسم جناب تمکین کاظمی کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔"

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو ظرافات میں شامل کر کے ننھے ننھے بڑے بڑے جاودانے سے ہم حیوانات کے سر جوڑنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی۔ علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماما پر ناراض ہوئے۔ دل غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لئے اظہارِ ناراضگی کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے، ماما کو ڈانٹنا بھی لازم تھا چنانچہ بھنا کر بولے "تم بڑی مثلث متساوی الاضلاع ہو"۔ بے چاری بھک کر رہ گئی۔

یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انہوں نے نہایت زنائے سے کہہ دیا کہ میں الف ب کو جیم میں شامل کرتا ہوں، تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے دماغ پر آنچ بھی نہ آنے دی، اور میاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا۔ خود ہی اصطلاحات گھڑیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا۔ اور جس میں جس کو جی چاہا شامل کرتے رہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرزِ تحریر (یعنی ہیومر) مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید، کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔"

(کیوں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی اسی ادب والے کے سلسلے میں کر گئے ہو؟) اگر علم کے معنی کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفہ، ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ، طبیعات، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کون سی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں؟ باقی رہی تنقید۔ نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے گویا اگر ایک بھی قابلِ قدر نقاد ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا یہ دعویٰ سراسر پوچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ "اس وقت" سے شروع ہوتا ہے اس لئے ہم صرف دورِ حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیشِ نظر رکھیں گے ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، ارجینالڈ ولف، کیتھرین منسفیلڈ، ڈاکٹر

ویسے پروفیسر گرڈ، ولسن ناٹ، وغیرہ کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاحیہ نگار ہے؟ یہ خدمت اپنی نقادوں کی تھی لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا ہلکا سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا۔ ہاں برنارڈ شا جو دنیا کے عظیم فلاسفروں میں سے ہے اور جس نے موجودہ سوسائٹی پر کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے، بعض سے ہی کبھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھتا۔ نیاز صاحب نے جو اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور ادیب اور ادیب کا شعور علم اور تنقیدی تحقیق کی تکمیل ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑادی آدھی جیل کر، اپنا مخاطب بنا رہے گئے؟ ایسی باتیں تو دوستوں کی صحبت میں کر لینی چاہئیں۔ ان کو سپرد قلم کر کے تمام ہندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا بندروں کے ہاتھ میں استرا دینا ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالعے کا حال تھا۔ اب ان کی انشا پردازی کا کمال ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:—

"جب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کا فسانہ لکھا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکشاف بھی
ہوا ہے کہ وہ اس صنف ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

یہ "پر" آپ نے خوب لگایا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر لکھتے ہیں یعنی فقرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پر لکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں)۔ فقرہ بہرحال مہمل ہے یعنی اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کر کے اصلاح دی جائے تو یوں ہونا چاہیے تھا

"وہ اس صنف ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

نہ یہ کہ وہ "اس صنف ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں"۔ اس صنف ادب "پر" لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ ذیل کے ہیں:—

"فسانی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیۂ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں
کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔"

دوسرے فقرے میں "دونوں" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ۔ بوقت نقل تحریر کرائیں چونکا بھی ہے۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ "جو محاورے یا اصطلاحات کبھی اس سے کانوں میں پڑے ہیں، ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آجاتی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے سماعت مشوش ہو جاتی ہے۔" ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی شیر خوارگی کے زمانے کو یاد کریں۔ پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشویش محسوس ہوتی ہے یا ہر طرح سے خیریت معلوم ہوتی ہے؟ کیا یہاں "خوبی" کی بجائے "خوبیاں" اور "ہے" کی بجائے "ہیں" نہ ہونا چاہیے؟

لیکن اس بات کو جانے دیجئے۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے۔ اس میں اُن اہل زبان ہی کو آپس میں نبٹنے دیجئے جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں۔ فقرے کے مفہوم پر غور کیجئے۔ نیاز صاحب نفسیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں۔ کس بھولے پن سے فرماتے ہیں کہ "فسانی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے۔" "کہلاتی ہے" کی بھی ایک ہی کہی۔ یہ نہ بتایا کہ کون کہتا ہے۔ بس کہہ دیا کہ کہلاتی ہے خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل الرائے کے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اب ہم ان پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں۔ تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے) افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ فسانی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انہوں نے کیسے کر لی؟ نہ انہوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل۔ اعلانات اس قدر

حد کو پھلانگ گیا۔ پہنچے چلتے فنِ تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگِ میل ہی تو نصب کرتے ہیں۔ ایسی بے سروپا بات کی تردید کوئی کس طرح کرے؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علیحدہ مضمون لکھیں اور اس میں اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ بشرطِ فرصت اس کا جواب عرض کر دیا جائے گا۔ اتنا ہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر ہڈسن کی کتاب موسومہ بہ "خندہ" یا میریڈتھ کا مضمون مزاح کسی سے پڑھ لیں کہ ان سے بہتر اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ نیاز صاحب، جیسے "مشہورِ عالم" کہلاتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ یہ ہم نے اس لئے فرض کر لیا کہ اگر انہوں نے ان دو مضمونوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے۔ ہم اور ہم جیسے کئی نومشق ابھی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ نیاز صاحب کا آفتابِ شہرت نصف النہار پر تھا لیکن [illegible] کہ اس کہنہ مشق کے مقابلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے۔ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں، ان کا دائرہ ماشاء اللہ بہت وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ان کے شوقِ انشا پردازی کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا تو کیا اچھا تھا، مگر وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرۂ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

"مآثر" مولانا احسن مارہروی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے۔ شروع میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور پیش پا افتادہ مسئلے کو (کہ لہجہ بدلنے سے معنی بھی بدل جاتے ہیں) بڑے طمطراق کے ساتھ گھما پھرا کر اور ایک دو تین چار مثالوں سے بیان کیا ہے اور سیدھی سادی بات کو اس طرح الجھایا ہے کہ شگفتہ بیانی کو ہمیشہ کے لئے احسن مارہروی کا مرادف بنا دیا ہے۔ بعض اس مسئلے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انہیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (ناظرین سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو زور سے پڑھیں)

> "غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتبِ تربیت میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اس کی تدریجی حالت
> عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر، منبری مواعظ، روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے
> جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب نوعیت کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک نوعیت خاص
> ظاہر کرتی ہے جو ہر ایک زبان میں تفننِ طبع کے لئے مزیدی اور جزوِ لاینفک ہیں۔"

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسرِ ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں تبحرِ علم، قابل، ذہین اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ مناسب ہے کہ ان میں سے کوئی صاحب اس کا فارسی زبان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں۔ کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو گنوانے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب خود ہی فرمائیں کہ کیا وہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انہوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلاست، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے؟ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان لکھتے ہوں بہرحال احسن صاحب کی پروفیسری کے سامنے اگر ہر فقرہ اس زور سے زانوئے ادب تہ کرتا ہے کہ مطلب تڑپ کر باہر نکل جاتا ہے اور لفظوں میں گھٹے پڑ جاتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک مضمون کو پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے غنچۂ تبسم تسکین کاظمی
ایسا مذاق کس میں ہے منت پذیر لازمی

جس طرح احسن صاحب پروفیسر ادبیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرت داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے نہیں گرتا ورنہ کیا دیباچہ اور کیا شعر، کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ احسن صاحب سے ہم اور کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی کو کازمی تو لکھ لیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۳ ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملا رموزی بھی تمکین صاحب کی طرح اپنے نام کے ساتھ ایم۔ اے۔ ایس۔ ایل (لندن) لکھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی علمی سند نہیں محض چندہ دینے والے کی علامت ہے یعنی اگر ہندوستان میں ٹکلاس نہ ہوتا تو پھیل۔ آج تک سب ایم۔ اے۔ ایس ایل ہو سکتے ہیں۔ اہل دانش کے نزدیک اس کی وقعت تو آر۔ ایس۔ وی۔ پی سے بھی کم ہے اور کچھ یہ لوگ ایم۔ اے۔ ایس۔ ایل کے مخفف والے معنی کے اندر لندن اس التزام سے لکھتے ہیں گویا تاریخ پیم کے دست مبارک سے سند پائی ہے ان سے ہماری درخواست ہے کہ ابو نفری کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور نئے سال سے اپنے نام کے ساتھ یہ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں ایم۔ اے۔ ایس ایل (لندن) لکھنے کو تو میٹرک (شکارپور) لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملا رموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے ربطی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا نیاز صاحب کی طرح ملا رموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری پر افکار عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ظرافت تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو،
اور ظرافت وہ جو ہنسنے سے ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظرافت
تحریر لکھ رہا ہوں۔"

ماشاء اللہ کیا حقائق بیان کئے جناب نے یعنی ظرافت تحریر وہ ہے جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔ (یہ نکتہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی کے وہم میں نہ آیا تھا کہ بیسویں صدی میں ایک ملا رموزی پیدا ہوں گے جو اسے معرض ظہور میں لائیں گے) ظرافت وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنسا رہا ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہر بچے سے بڑا بے وقوف، ہر نادان کچھ، ہر غلط سلط اردو بولنے والا انگریز ظریف ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس کبھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنسا رہے ہیں اور اگر ان کی باتیں بعینہ نقل کی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملا رموزی دراصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (بیان نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظرافت وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن اس میں ہنسانے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک حد تک صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملا رموزی خود اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ دیباچے کا پہلا ہی فقرہ پڑھئے

"اگر کوئی سے کے برابر گہری اور تہہ سے کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو ..."

اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ذرا زیادہ فقرہ سمجھ کر ایک قہقہہ لگا دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے
ملا رموزی صاحب بہت لکھنے کو انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں چنانچہ اسی سلسلے میں اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے مدح میں فرماتے ہیں۔

"ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اسی لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی
کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔"

ملا رموزی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں اس سے حضرت ضیاء الملک کی نظر انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے جب مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین من مضمون لکھ ڈالے تو وزن پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

رموزی صاحب نے اس دیباچے میں کئی جگہ بدذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ انہوں نے دیباچہ ظریفانہ رنگ میں لکھنے کی کوشش کی

ہے اس لئے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ کر ان سے درگزر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بد ذوقی ایسی ہے کہ ظرافت بھی اسے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ انہوں نے شہاب صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے وہ ہر چند قابل نفرین ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی ہنسی اڑانا اور وہ بھی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقہ میں جائز نہیں۔ یہی بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لولوں اور لنگڑوں کی بھی ہنسی اڑائیں گے۔ اور اسے ظرافت نگاری پر فخر کریں گے۔ یہ ظرافت جہلا کی ظرافت ہے۔ شرفا کے لئے اور بے شمار باتیں ہنسنے اور طنز کرنے کو موجود ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجئے۔ فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تو واقف ہونا چاہئے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لئے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم جلا کیوں پیچھے رہ جائیں۔ جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلاتے چلے گئے کہ "اس ہنسی مذاق میں کہیں آپ یہ نہ بھول جائیے کہ ملا صاحب ظرافت نگار سہی، لیکن کتاب تو بہر حال ہماری ہے۔" ملا رموزی نے کہا: "ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صلاحیت ہے یا نہیں۔" آپ نے اس پر نوٹ چڑھایا کہ "قطعاً صلاحیت نہیں ورنہ ضرور آپ کو حیدرآباد دلاتا۔" (سخن سنج نوٹ لٹ گئے۔ ہا ہا ہا)۔ ملا صاحب نے کہا: "آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً خفی قلم سے جواب دیا کہ "میں کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتا ہوں" (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا: "ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جیے"۔ آپ نے نوٹ ایزاد کیا کہ "مسلمانوں عزت حاصل کرو۔" (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا: "اللہ انہیں منصب دار بنا دے۔" آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو ہی اب بھی ہے۔ ذیر مرتبہ کمال لوگ فوراً مرعوب ہو گئے۔" (سبحان اللہ کیا اپنی پھلجڑیاں ہیں۔

تعریب کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی تمکین صاحب اور ملا رموزی کی طرح بیانگ دہل ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ہیں۔ ان میں صراحتہً انانیت باقی دیباچہ نویسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کاتب اور علمائے علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زور قلم خود نمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیا ہے تاہم ایک تمکین صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لئے وکٹر ہیوگو، ہربرٹ سپنسر، میتھو آرنلڈ، کارلائل، رسکن، لنکن اور ایمرسن کے اقوال نقل کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا اور اپنے دوست کو نہایت نیک نیتی کے ساتھ مضحکہ انگیز بنا دیا۔ اقتباسات کے نقل کرنے میں سعیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے میتھیو آرنلڈ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط سمجھے) اور لنکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط۔

حسن مارہروی صاحب کی طرح سعیدی صاحب کا مذاق شعر بھی قابل ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" تو "حسن پرستی" کو "عشق پرستی" بنا دیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینت کلام بنایا ہے پہلا شعر یہ ہے:

بتو شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں
نہ تر شکلے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ آخر پھر بھی گنگنانے کے قابل ہے لیکن پہلے مصرعے میں جیسے بیلوں سے بھرتی کی گئی ہے دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

اگر سعیدی صاحب کو اسی پائے کے اشعار یاد رکھنے اور دہرانے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کر لیں کسی اور دیباچے میں کام آئے گا۔

ابھی سفید تھے بال اور ابھی سیاہ ہوئے
اسی کو لوگ عمر انقلاب کہتے ہیں !

تیسرا شعر البتہ اچھا ہے۔ احساس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سیدی صاحب کچھ ایسے تذبذب میں پڑ گئے کہ انہوں نے اس کے نیچے بصد ثوق مین میں اقبال کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سیدی صاحب کو اس سے بری الذمہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصہ میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو صد حد قابل احترام سمجھتے ہیں۔ اور ان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا پرلے درجے کی شقاوت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر اولاد کے گناہوں کی سزا آباؤ اجداد کیوں بھگتیں۔ اور پھر یہ بات بھی بے محل کی جاسکتی ہے کہ معلوم ہوتی ہے تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں اور ان کی تحریریں ایسی ہی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لئے بے قرار ہو جائیں۔

دوسرے حصہ میں سیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر طرز ادا نیز تنقید کی ہے یا تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے سیدی صاحب کے پاس خیالات کی قیمت ہے اسی لئے بے چارے کسی کی تعریف کرتے وقت بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں ۔

(۱) اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور عمدگی سے لکھتے رہے۔

(۲) پطرس نے لائٹ ہیومر لکھا اور خوب لکھا۔

(۳) فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

(۴) امتیاز علی تاج صاحب نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے۔

اس کے بعد ہم سمجھے اس کے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن باوجود اس کم مائگی کے یا شاید اسی کم مائگی کی وجہ سے معمولی سی بات کو بھی عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں مثلاً

"اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا۔"

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لئے جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا کچھ واقف ہے "اردو ادبیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا" کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ یہ شغل سیدی صاحب ہی کو مبارک ہو۔ ایک اور جگہ حق دوستی یوں ادا کیا ہے :

"بہرحال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے۔"

ذرا تمکین صاحب کے مجموعۂ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پیغمبر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے متامل ہوں سیدی صاحب شاید کامل کے معنی نہیں جانتے انہوں نے اسے بھی "خوب" اور "عمدہ" کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے ۔ آخر میں سیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد بقول ان کے بہت کافی ہو گئی ہے۔ بہت کچھ زہر اگلا ہے چونکہ ہم ان حاسدوں کے نام تک سے واقف نہیں نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک اور حسد اور بغض رکھے۔ آخر کیوں۔ اس لئے ہمیں سیدی صاحب کے زوردار فقروں میں بجز جھوٹے پن اور سوئے ہضم کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر ہمیں سیدی صاحب سے ملنا اتفاق ہے تو وہ تمکین صاحب سے رشک

کرتے ہیں ان کی دماغی حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

خاتمے پر ہم نہایت واضح طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان پانچ حضرات سے معاذاللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہمیں تو افسوس ہے کہ ہمیں ملاقات تک کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن جب یہ پانچوں صاحب ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں اور باوجود ہیچ رنگ خوردہ نقادوں اور تیسرے درجہ سازو ساماں کے بیچ خوش سخنوں کے ساتھ رواجِ ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوتِ مبارزت دیتے ہیں تو ہر عاقل و بالغ کا فرض ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ انشا پردازوں کی تصنیفات کے متعلق یہ ہے کہ یہ کبھی کبھی اچھا بھی لکھتے ہیں۔ جب ہندوستان میں ادب و انشا کی یہ حالت ہے کہ ہر لکھے پڑھے کی کھپت ہو سکتی ہے تاہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ان کی محنت کے بدلے میں چپ کرنا ان پر احسان اور دو خوانوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی تو خاموشی، متانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے، صحیح آراء سے مستفید ہوتے غلط آراء کو نظرانداز کر دیتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ از کرِ اخلاق ہی اکثر پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے لیکن انہوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا جلوس نکالا ہے۔ ایک صاحبِ ذوق انشا پرداز کو اس قسم کی سوقیانہ حرکات سے گریز واجب ہے۔ دیباچہ نویسوں کی خدمت میں ہماری مؤدبانہ عرض ہے کہ شکر مقدار ملحوظ رکھیں۔ حلوہ بھر پانی میں گر بہر زنجیل پڑے۔ ظلم دیکھیے کہ جس کا انداز عمر بھر طالبِ اصلاح رہے بڑے بڑے دعوے کرتا اور ایک دفعہ قلم سے جو نکل جائے اسے نظرثانی تک کا محتاج نہ سمجھا جائے۔ جیسا لنکن کا قول ہے۔

"تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصہ کے لئے دھوکا دے سکتے ہو، لیکن
سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے نصحائے زیرِ بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پر غالب آگئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے۔ اگر تکلیف شرم پر غالب آئی تو حیدرآباد، گلبرگہ، بھوپال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں "لائیو قلم دان" کی آوازیں بلند ہوں گی تو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آپس باتیں شائع کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے۔ آگے آپ خود سوچ لیجیے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سر جوڑ کر کوئی جواب مرتب کر لیجیے خواہ الگ الگ جزوکاری کیجیے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو بلکہ آپ سے "حیا" اور شرم کے متوقع ہیں۔

باقی رہا "غنچۂ تبسم"۔ یہ کتاب ایک قابلِ احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے جو بلا امتیاز فحاشات سے پُر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس کوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاح نگاروں کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید لکھنا ان کے تعفن کو اور زیادہ پھیلانا ہے۔

انارکلی، مخلص صاحب اور ہم نیاز مند

نیاز مندانِ لاہور

دسمبر ۱۹۳۵ء کے رسالہ ساقی میں "انارکلی پر ایک نوٹ" کے عنوان سے "ایک مخلص کے قلم سے" ایک مضمون چھپا ہے جو ہر وجہ سے دلچسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار "سائبریا کی آبادی" سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہر سطر میں لٹھ لے کر بجو اچھلے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعت طاقت چیونٹی بھر سے بھی زیادہ نہیں، اور جو کچھ کیا ہے جس میں وہ خود باوجود اپنی سبک خیالی کے ادب مرحلے سے قاصر رہے۔

تو پہلے بدگوئی کو لیجئے۔ گو مخلص صاحب نے اپنا زورِ قلم زیادہ تر اسی صنفِ ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پڑھنے کے ساتھ ہی مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار روح سے صورتِ حالات کی گریہ آوازیں نکلتی ہیں۔ لکھتے ہیں انارکلی پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی، انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی دولت پر رونا آتا ہے۔ وہ بجائے مبارک باد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ طبیعت چاہتی ہے کہ تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ بہائیں تو بڑا احسان ہو گا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ "ٹھنڈا دم" رہیں۔ ادب سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ انارکلی کا قصہ اتنا بھی بھاری بھرکم نہیں جو چاہے بنے تو وہ کتاب معمولی قابلیت کے آدمی کو بھی بخشے یا اس پہ عجب ڈال سکے اور تاج صاحب کو نصیحت کرسکتے ہیں کہ وہ فوراً اسے دریا برد کردیں۔

جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا کہ کسی دوست کو تار بھیجیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کرکے مخلص صاحب کو ایک جلاب دے دیں تاکہ بدہضمی تو رفع ہوجائے۔ اور انہیں ہدایت کریں کہ آئندہ برس دو برس تک کے لئے اپنی ادبی غذا ذرا ہلکی رکھیں مثلاً مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظمیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامچہ بس ایسی ایسی چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب ذرا بڑے ہو جائیں گے تو کچھ عرصہ ادبیات پڑھ لیں گے تو پھر ٹریجڈی اور ٹریجڈی کی تنقید سے بھی شوق فرمالیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الخیری کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہیے کیونکہ وہ ایسے ہی ضعیف دماغ کے لئے لکھے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہوگی اب تو ماشاء اللہ اہلِ زبان بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں، اور مذکر مونث کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کتنا سیکھ کر ہوں یوں تو "اہلِ زبان" کی پٹ جملہ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی اور زبان کہاں تک بانکتے ہیں۔ اب کی دم میں نسوہ بھی باندھ گئے لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چھنا پات نکلا ہو اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں مخلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بداخلاقی کا ثبوت

دیباچہ داں بیسیوں جگہ اپنی علمیت بھی عزرد جتائی ہے ، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ساختہ علم ان کی بے ساختہ جہالت سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے ۔ لیکن مخلص صاحب کی ان خصوصیت کا پیش کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں (۔ ۔ ۔ "بکھرے" پر ہے موتی پر نہیں ۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوچا تھا لیکن استعمال اس لئے نہیں کیا کہ "اہل زبان" کہیں گے محاورہ غلط ہو گیا) ان موتیوں کو چن کر یکجا کرنے کے لئے اس مضمون کی بھول بھلیاں میں کئی دفعہ گم ہونا پڑتا ہے کیونکہ ژولیدہ بیانی ایسے نقادوں کی خاص صنعت ہے ۔ مثلاً فرماتے ہیں ۔

"انارکلی . . . . تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سب جیکٹو) ڈراما ہے ۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی واردات سنائیں گے ۔"

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے ۔ اتنی فرصت کہاں کہ دلی جا کر مخلص صاحب کے دارالمطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور وہ جیم ہو کے سے تو پوچھیں کہ ہم اتنا پوچھیں کہ حضرت سب جیکٹو ڈراما دلی کا محاورہ ہے یا لکھنؤ کا ؟ کیونکہ الفاظ تو انگریزی ہیں لیکن انگریزی فن تنقید اس اصطلاح سے محض ناواقف ہے اس اصطلاح کی جو تصریح غیر اصطلاحی زبان میں مخلص صاحب نے ہم جاہلوں کے فائدے کے لئے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ بدیانت کیا ہے کب ہوئی اور اس کا کوئیلبس کون ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے شکارپور کے سفر کے دوران میں دہلی کے کسی بکسٹال سے ڈرامہ پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی جس سے ان کی جہالت میں اس قدر خوشگوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے ۔

غالباً اسی کتاب معنون الال کجکلا سے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ ——

"(انارکلی) ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری ، نقش اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہئے کہ اس صنف میں بھی کتاب نسبتاً ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے جسے انسان کی دکھیاری زندگی کا نمونہ عبرت ہونا چاہیئے ۔"

مطلب صرف اتنا ہے کہ انارکلی ایک ٹریجڈی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں ۔ اور اس اظہار علم کے شوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ معاذ گویا کی عزت کی باقی نہ رہی ۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بڑے مربیانہ انداز میں حضرت آزاد مرحوم کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جسے انہوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بگھار کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے ۔ خواجہ حسن نظامی کا "سی پارہ دل" کس خانے میں ڈالئے گا ۔ غالب کے "اردوئے معلیٰ" کو کیا قرار دیجئے گا ۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے یہی مثالیں کافی ہیں ۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انارکلی کا قصہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈرامہ نے سرفہرست ہی میں انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے جبکہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور متحیر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں بیرم خاں کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انارکلی کو کیونکر مروا سکتا ہے اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید ؟

برسبیل تذکرہ ۔ ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات نوٹ کر لینی چاہیئے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ کیوں بے تو نے جوانی میں بیرم خاں کو مارا تھا ؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں ۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لئے باقاعدہ اغلاط نامہ مرتب کر کے

ساتھ ملتا چلا گیا۔ فقروں کی نحوی ترکیب کرنی پڑی۔ کئی پیراگرافوں کو از سرِ نو ترتیب دینا پڑا۔ کئی فقروں کے معنی جو تشنہ تھے اپنے پاس سے [illegible] جب
یہ مطلب یہ وصول ہوا کہ مخلص صاحب کا یہ قول ان کے "نقش" تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

"... فرماتے ہیں: "اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی لکھتا ہوں (مضمون جو قبل اسی قسم کی گفتگو کا مضمون ہے)۔ "انارکلی" لکھ کر آپ نے اس کی باعظمت سیرت تباہ کی ہے۔"

اس ضمن میں مخلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دئے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ "اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصویر ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، وہ آپ کے اکبر کے کردار سے بالکل نہیں ملتی۔" جس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ مخلص صاحب کے نزدیک ڈرامے کا اکبر، تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے۔ اس کا جواب مختصراً تو یہ ہو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشا پرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے۔ اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ اس کی انشا پردازی پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشا پردازوں نے متباین اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو اس تباین سے کوئی صدمہ نہ پہنچا لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد کہیں سمجھ میں آتا ہے۔

پھر آپ فرماتے ہیں:

"ڈرامہ نگار کی تو یہی ہے کہ زندہ جیتی جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی کوئی بات ان میں خلافِ فطرت نہ ہو۔"

مخلص صاحب یہ دوسری بات لکھنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ یہ فقرہ تو کہیں سے سن پایا تھا جس کا آپ نے اپنے مضمون میں رکھ دیا لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیار پر اکبر کے کریکٹر کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کرتے کہ فلاں بات جو اکبر نے کی یا کہی وہ انسانی فطرت کے منافی ہے۔ اور کیرکٹر جذبات کی [illegible] کے ظہور میں نہیں آ سکتی۔ جب یہاں مخلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دئے تو ہم بھی ان کی جان بخشی کئے دیتے ہیں اور دنیا کو شاہد ٹھہراتے ہیں کہ ہم باوجود نوجوان ہونے کے [illegible] پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

یہ خلافِ فطرت والی بات مخلص صاحب نے محض رعب ڈالنے کو لکھ دی تھی۔ اصل مطلب ان کا وہی ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈرامے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم مخلص صاحب کی خدمت میں یہی مخلصانہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک معاشقہ انارکلی کی تلاوت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد بعض موٹے موٹے نکات ان پر واضح ہو جائیں۔ اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھنچتی کہ ایک عالی وقار، علم دوست، روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور جو ان خوابوں کی تعبیر کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان میں جو اس شان دار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پا کر اس قدر بیقرار و پریشان ہو جاتا ہے اور جہاں بانی کی اہم ذمہ داریوں کو اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پدرانہ جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مخلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھنچتی تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ اگر اب بھی مخلص صاحب کو ڈرامے کا اکبر محض ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک سال انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لئے وقف کر دے۔ خواہ ہم کو وقتی طور پر یہ تسکین اپنے ساتھ لے جانے کو "انما الاعمال بالنیات"۔ اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو صرف ڈرامہ کے متعلق کسی سرسری سی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ فلاں باندی کی زبان سے مغلِ اعظم کو صلواتیں سنوائی ہیں۔ فلاں کنیز کی زبان سلیم کی منہ چڑھی [illegible] ہے۔ صرف

یہی سمجھ کے نئے مسالے جمع کئے ہیں۔ تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات درحقیقت انتہا درجے کی ادب ناشناسی بلکہ انتہا درجے کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان ہیں اگر آپ بلا تشبیہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں تو اس میں بھی یہ ذکر ضرور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مارے فلاں نے ان سے یہ بدسلوکی کی حتیٰ کہ بعض نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا مضحکہ اڑاتے رہے۔ پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتائیے کہ آپ اس شخص کی ذہانت کے جوہر اور ایک تھپڑ رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے۔ مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھ لیجئے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس نے روکا ہے؟ لیکن اس نقادی میں بھی آپ کو کیا مزہ آئے گا کہ ہر مضمون کے بعد آپ خود ہی موضوع تنقید بن جائیں۔

ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں۔

> "میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انار کلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں۔ سوچا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلیہ شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہو گا جس میں شاہانِ سلطنت کے سفر و حضر کے حسین مناظر اس طرح دکھائے گئے ہوں گے کہ بس نت رُت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلقِ خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے ..... وہ آشیانہ منزل (دھوپ گھر) سے لگا لگا دیوان خانہ عام ہے جس کے صحن کے بیچوں بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے ..... اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا حسین بازو ہی فوج سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔ اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جشنِ نوروز کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ تک تو دکھا دیا ہوتا کہ ملک تدبر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خداداد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی .. یعنی سبھی کہ بادشاہ امرا کو سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا۔ اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی یگانگت سے مزہ بڑھے ..... بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود امرا باہم گھل مل بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ کر کے دونوں گھرانوں کو ایک کیا۔"

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے کے کس حد تک اہل ہیں۔ تاج صاحب تو ڈرامہ انار کلی کا لکھ رہے ہیں کہ اس کنیز کا حسرت ناک انجام کیونکر ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوجھ گئی چنانچہ دبی دبی زبان میں فرماتے ہیں :-

> "اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو ....."

برخوردار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آ گیا لیکن ہٹ آپ کی ویسی ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو فوج ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج۔ مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب انار کلی کا قصہ ذرا تھوڑی دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا سین دکھا دیتے جس میں اکبر امرا کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کراتے نظر آتے۔ کوئی تاج صاحب سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا دخل در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ انار کلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہرحال ثواب کا کام ہے۔ اگر ڈرامہ اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہئے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین عزیزہ کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلچر کی علمبرد

ہے۔ اگر فرق بہت ہے تو کم از کم آزاد کی بابری کا ذکر ضرور ہونا چاہیے کیونکہ بابر بہر حال اکبر کا رشتہ دار تھا اور متعلق مخلص صاحب وہ سب جو کچھ زندگی میں سے تھا۔ آخر میں ایک سین آل انڈیا مسلم کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو وہ بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ مخلص صاحب تاریخ کا ذوق تو بہت ہے لیکن ان کا مذاق [illegible] سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔

(۲) دوسرا اعتراض مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی آبِ مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"موسم بہار کی ایک دوپہر۔ ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب وقت ہو چکا ہے۔"

اور اعتراض فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا،

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے۔"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھرانے کی مصروفیات کی طرف اشارہ ہے وہ آپ نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ وہ چیز جسے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھئے۔ ڈکشنری میں دیکھئے تو شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو مخلص صاحب آپ نے دماغ کے دروازے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس فقرے کو وہ بقول خود ابھار کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے،

"ستونوں اور محرابوں کے سایے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں: "یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے تو سایے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں۔"

سایہ ڈھلنے اور سائے کے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جب ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی لمبائی سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سایے کا طویل ہونا کہتے ہیں۔ دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے وہ تو بجز بال سفید کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اول تو ایسے فقرے پر ہے کہ "تم خلیل ہو شیخو؟" "تو معاملہ کیا ہے حضور؟" وغیرہ وغیرہ۔

جو شخص "اہلِ زبان" ہو کر بھی یہ نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تیور کس حد تک بدل جاتا ہے اس کو کوئی غیر اہلِ زبان، بذریعہ تحریر تین سو میل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سکھائے اور اہلِ زبان کو یہ کس طرح بتائے کہ اہلِ زبان ہونا اور بات ہے زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو مخلص صاحب کے سامنے پڑھے اور مخلص صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جائے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے مخلص صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نفل پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں کے عادی ہو چکے ہیں وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرزِ تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں ثقیل اور بازاری معلوم ہوتی ہے۔ شیکسپیئر نے بھی جب اس طرح کی جدت کی تھی تو لوگ اس پر ایسے ہی معترض ہوئے تھے اور ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھری اور کمبل جیسے الفاظ کو ڈرامے میں استعمال نہ کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ لوگوں کو "خنجر اور ردا" اور اسی صنف کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا۔

مخلص صاحب تاریخ ادب سے واقف ہوتے۔ تو عبرت پکڑتے لیکن دامن از کجا آرد کہ جامہ ندارد۔

"پختہ حسن"، "ادھ" "پھیلا آسمان" وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرمایا کہ نئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے۔ کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی تکلیف بھی گوارا کر لی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ بجا ہے بعض یہ نئی ترکیبیں ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً پختہ حسن صرف تبدیلی کے لئے نئی ہیں۔

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے۔ آخر مخلص صاحب اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ اہل زبان کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس جلدی کی گرہ بھی "محاورے" کا تذکرہ نہ ہو جس کی بدولت یو پی کے کئی حضرات پنساری بن بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے: "دنیا کی تو انارکلی کہتے زبان خشک ہوئی جا رہی ہے۔ اور مجھے اتنی توفیق نہیں کہ چھوٹے منہ سے دو بول شکریے ہی کے کہہ دے۔"

مخلص صاحب لکھتے ہیں: "چھوٹے منہ" کا یہ محل استعمال نہیں۔ یہاں "پھوٹے منہ" چاہئے۔

اگر جناب مخلص صاحب نور اللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ چھوٹے منہ کے معنی ہیں بظاہر داری سے اور نمائش سے۔ ڈرامے کا جو فقرہ اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر رہی ہے اور مجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ ظاہر داری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکریے کے کہہ سے۔

"پھوٹے منہ" کے معنی نور اللغات میں یوں لکھے ہیں "دتحقیر سے، ع: خراب منہ سے، برے منہ بددلی کے ساتھ"۔ تو یہیں ہیں جو "تحقیر سے" لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ جس کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے، اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے تو گویا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ انارکلی کی ماں اس موقع پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہتی جس سے انارکلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے! یہ اعتراض محاورے کا اعتراض نہیں۔

دوسرا اعتراض "سیخچوں دار روزن" پر ہے۔ "سیخچہ" کے معنی نور اللغات میں یہ لکھے ہیں: "چھوٹی سیخ: لوہے کی چھوٹی سلاخ"۔ "سیخچوں دار روزن" لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے روزن کے متعلق یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا۔ اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہو تو ممکن ہے وہاں سیخچہ کی بجائے سلائی کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلائی سے تو سرمہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لئے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں۔

باقی الفاظ کے متعلق اتنا عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو دہلی کے ایک مصنف منشی فیض الدین گزرے ہیں جو لال قلعے کی زبان لکھنے کے لئے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے "بزم آخر"۔ پچھلے دنوں تو نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے شاید مل جائے گی۔ کبھی شام کو ایڈورڈ پارک سے فراغت پا کر ادھر سے گزریئے تو ایک نسخہ خریدتے جائیے اس میں آپ کو گنگا جل، کرنڈا اور گوش پیچ کی کوٹ اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پر آپ یوں جاہلانہ معترض ہوئے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابوالفضل کی آئین اکبری کا مطالعہ فرمائیے وہاں مل جائیں گے جو مغلیہ ڈرامہ لکھنے بیٹھتا ہے وہ ایسی مستند کتابوں کو ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اے کاش جو لوگ تنقید لکھنے کو کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی اتنی تکلیف گوارا کر لیا کریں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نور اللغات کو مستند مانتے ہیں نہ بزم آخر کو۔ اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہئے پہلے اہل زبان آپس میں نپٹ لیں جب خود ان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

تو درونِ در چہ کردی کہ برونِ خانہ آئی

یہ تمام بہت دلچسپ ہے اس تنقید کی قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقیدی مضمون میں انار کلی کے اصل موضوع کو مخلص صاحب نے چھوا تک نہیں محض منطقی اور نحوی باتیں ہی ہیں، البتہ یہ ضرور انار کلی کے کیریکٹر کے متعلق کچھ نہ فرمایا جو ڈرامے کی جان ہے اور جس کے ارد گرد تمام واقعات و کرداروں کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا، ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیر و بم کے بارے میں خاموش رہے اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ انار کلی کا ڈرامہ کہاں تک رہتی دنیا کے کامیاب ہے اور کہاں پر اس تنقید و کو کرتا ہوا نظر آتا ہے اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں، کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ ارشاد کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس میں انار کلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہوگا کیا تو یہ کیا کہ اکبر بہت اچھا آدمی تھا سایہ دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے ان سے کچھ نہیں نکالا ہوتا ہے اور اپنے زعم میں سمجھ رہے ہوں گے کہ ارسطو کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور جو نکہ میں اس بات کو محض کنایتہً بیان کرنا چاہتا ہوں اس لئے ڈر ہے کہ مخلص صاحب کے پلے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے انار کلی کو مس حجاب اسمٰعیل کے نام ڈیڈیکیٹ کیا چغتائی صاحب نے اپنی قلمکاری سے اس ڈرامے کی صورت کو رونق بخشی تاج صاحب اور مس حجاب اسمٰعیل یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم مخلص صاحب کو معرض بحث میں نہ لانے چاہئے تھے۔ مخلص صاحب اور مخلص صاحب کی قماش کے نقادوں کو ذہنی اعتبار سے ابھی جونیسی کے درجے سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا واسوختانہ چڑچڑا پن خود نقاد کے سفلہ پن کی دلیل ہوتا ہے خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہئے جس سے شہدے پن کی بو آئے۔ یہ مس حجاب اسمٰعیل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کی وجہ سے اس زمرہ میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً مخلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن مخلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہئے اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کے لئے ایک بہانہ نہ بنا لینا چاہئے۔

مخلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چاردانگ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے" اور یوں سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے لیکن شاہد جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہئے کہ جس بداخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا ہے اس کی اشاعت ایک دو صاحب عالیہ کے سپوت کو نہ کرنی چاہئے تھی مخلص صاحب کی نقادانہ بدتمیزیوں سے ہم شاہد صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن مخلص صاحب کا ذاتی کیچڑ شاہد صاحب کے دامن پر چند ایسے بدنما دھبے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلقی کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے۔

ہم اس مضمون کے کسی کھسیانے سے جواب کے لئے چشم براہ ہیں خواہ وہ جواب مخلص صاحب لکھیں یا شاہد صاحب یا دونوں کے دونوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گمنام یا نامدار، استاد، شاگرد یا بھتوا۔

یہ عصمت چغتائی کا وہ مضمون ہے جس کا بطرس نے انگریزی میں
ترجمہ کیا تھا۔ یہاں اصل اور ترجمہ دونوں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ہیروئن

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ اور تالی بجانے کے لیے بھی دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور عرف عام میں ان دو ہاتھوں سے ہمارا مطلب ادب کے ہیرو اور ہیروئن سے ہے یوں تو ایسا ادب بھی ہے جس میں ہیرو اور ہیروئن نہیں ہوتا اور ادب بھی لکھا گیا ہے جیسے کسی نے ایک ہاتھ اور پیٹ کے ٹکڑے کی مدد سے تالی بجا دی ہو اسی تان بیچ تو گئی مگر کتابوں کی الماریوں ہی میں گونج کر رہ گئی عوام تک اس کی رسائی نہ ہو سکی اور اگر سارے ادب میں یہ وطیرہ اختیار ہوتا تو یقیناً یہ خشک ستونوں کی دلدل میں پھنس جاتا

عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بندر بندریا کو ڈگڈگی بجا کر نچانا پڑتا ہے جب اگر ڈگڈگی لے کے کھڑے ہو جائیں یہ حالات زمانہ سامنے نہیں تو مجمع کوئی بھی نہ سنے گا۔ دیکھیے: محکمۂ تعلیم اور مسجدوں سے لوگ کتنا کترا کے نکلتے ہیں۔

مذاہب کسی کو کچھ کہنا ہوتا ہے تو بندر بندریا کے گلے میں ڈوری باندھی اور ڈگڈگی بجانا شروع کر دی ہیرو اور ہیروئن کے رسیلے کارناموں سی رنگینیاں بھر کر لوگ ڈٹ پڑے، کچھ احساسات کو پھسلایا، کچھ جذبات کو گدگدایا اور مطلب حاصل ہو گیا۔ شعبۂ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت کچھ اسباق کو حاصل ہے ہر بات ایسی صورت میں پیش کرنی چاہیے کہ بچے اس میں گم ہو کے [illegible] ہو جائیں۔ اب اگر کبھی کچھ سیکھ ہونے سے کڑوی سے کڑوی خوراک شکر میں لپیٹ کر دے دیجیے لوگ واہ واہ کر کے نگل جائیں گے۔ [illegible] کا زمانہ کیوں اب تک کل کی بات بنا ہوا ہے عظیم بیگ چغتائی نے قرآن کی مدد سے پردے کو چاک کرنا چاہا مگر سوائے مولویوں کی جوتیوں کے کچھ نہ ملا۔ لیکن شرر بیچارے نے کونین کھلا کر، دو کو نشتر سے عقلوں پر سیاہ پردہ ڈال کر حجاب کو مار بھگایا۔ علامہ راشد الخیری اور پریم چند جی اگر ہیرو ہیروئن کے کندھوں کا سہارا نہ لیتے تو آج بجائے لوگوں کے دل و دماغ کے مرثیے بوسیدہ کتب خانوں میں پڑے اونگھ رہے ہوتے۔

"ادب اور زندگی" "ادب اور سماج" "ادب اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے اگر انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دونوں مٹ جائیں گے۔ دوسرے معنوں میں اگر ادب سے زندگی یعنی ہیرو اور ہیروئن کو الگ کر دیا جائے تو ایک خلا رہ جائے گا۔

ہیرو سے زیادہ میں اس وقت ہیروئن کی حیثیت (جو ادب میں ہے) پر غور کرنا چاہتی ہوں۔ ہیروئن "جام جم" کی سی حیثیت رکھتی ہے اس پر ایک نگاہ ڈال کر ہی ہم اس کے زمانے کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً "فسانۂ آزاد" کی عورت کو دیکھ کر جو اس زمانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت جو قابل ذکر عورت تھی وہ نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور دل چسپ طوائف تھی۔ سرشار کو بھلا

شریف طبقہ کی عورت سکھ لی ہوگی۔ اور وہ بھی مسلمان خاندان کی۔ اس وقت شریف بیویاں گھر میں بیٹھی منہ پا چھے سے سرامدہی ہوں گی شوہر جن کی صورت دیکھنے کو
ترستی ہیں سے تھا کر اگر طوائفوں کی آغوش میں سکون دل و دماغ تلاش کرنے جاتے تھے۔ یہ طوائف تھی بازاری اور کاروباری قسم کی نہ تھی وہ بالکل
شریف زادیوں کی طرح رہتی تو شریف زادیوں سے زیادہ خوش مذاق اور لطیف تھی۔ ظاہر ہے کہ طوائف کی حیثیت بالکل ایک باغ عام کی سی تھی جو عوام
کے چندے سے عوام کی خوشنودی کے لئے قائم کیا جائے۔ ہر مرد کی اتنی حیثیت کہاں کہ تعلیم یافتہ باسلیقہ بیوی کی شکل میں اپنا ذاتی باغ لگا سکے جس میں پھولوں سے لدی
اور عطر میں بسی ہوئی کیاریاں ہوں۔ لہٰذا اس مسئلہ کا نہایت آسان علاج نکالا کہ گھر میں دیوی رکھی جو صرف نسل بڑھانے کے دوسرے فرض کو بھی پورا کرتی
رہی اور بازار میں طوائف جو جذبات لطیفہ کی پیاس پوری کرتی رہی۔ یہ بڑا کارآمد انتظام ثابت ہوا، مگر کچھ تلخیاں بھی۔

مگر طوائف کی سوتن گرہستن نے شرارتیں شروع کر دیں۔ اگر میاں سکون روح کے لئے طوائف کے یہاں گئے تو وہ بھی چلا کر بیوی نے
گھر مجبوراً تو جنت نہیں، باغ عام کی سیر ذرا مہنگی پڑتی تھی واپس گرہستن کی طرف لوٹ پڑے۔ سوچا گھر بیوی کی زلفوں سے توبہ، وہاں روٹی تو ہی
بستی ہے۔ عورت بھی کچھ شیر ہو گئی اس نے وہ سب کچھ سیکھنا شروع کیا جس کی تلاش میں شوہر طوائف کے پاس جاتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس نے قدم بڑھائے۔ آہستہ
کی پالیسی کے ماتحت طوائف کے دوسرے جھک رنگ، روپ اور ترکیب حاصل کرنا شروع کی۔ سرشار کی فتح مند طوائف کو شکست دے کر پریم چند کی گرہستن نے
پر کچھ کھٹ کا سبب قدم قدم پر پھر تو ہی مسئلے تھیں۔ اور بے بیٹھے لگی۔ باغ عام کے مالی نے اپنے ہی گملے میں چھوٹی موٹی کالا پھیلتے دیکھا کچھ حیرت
کچھ حسد سے آنکھ کی سینچائی کرنے لگے۔ رنڈی تو خیر تھی ہی گر بیوی میٹھی معصوم کی سب مزہ چیز کچھ ایسی پیاری معلوم ہوئی کہ طوائف کا پلّہ ہلکا ہو گیا۔ اس کی
خوبیاں عیب ہو گئیں۔ وہی تازہ ادائیں جن کی تلاش میں تاکتے۔ گھر نے جیتے تھے، رنڈی کے چھچھورپن بن گئے۔ چوہا بے کل گوگندہ کہہ کر لوگوں نے اپنے ہی گھر
میں کونپلیں کھولنا شروع کر دیں۔ گر یہ کونپلیں روز بروز گہرے ہوتے گئے یہاں تک کہ کنارے ہاتھ سے چھوٹ گئے اور ڈوبنا پڑا۔ طوائف بہت بھلا کی
بہت بگڑی گرہستن سدا ایک سے سر نہیں رہتا۔ نا عاقبت اندیش نے پھل لیتے ہی پیڑ خوب کھائے گرنی یا جنہیں کاٹی اور ادھر معصوم گھر کھٹ والی نے
نئی پود بھی لگائی اور پیازوں کو بھی سینچا۔ نتیجہ یہ کہ رنڈی کے کھنڈروں کو میٹ کر گرہستن نے دنیا بنانی شروع کر دی اور پھر اس کی کمان چسپا ہو گئی دبی
اڑی تلے کچلے والے مرد اس کی حمایت میں ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے عیب کھول کر شاہراہ پر پہنچ دیے۔ وہ خود ہر جانبدار
ہی کسی سے لڑائی نہ بھڑی۔ آپسا کی قائل مگر جیسے کہ ذمی ہی برت رکھو رکھو کر گرہستن کو دکھلائے۔ بیٹے ہیں بالکل اسی طرح جھپکی جھپکی آنکھوں سے
نقاب کے پیچھے سے جہتر پہ کرنے لگی۔ لیکن اب بھی پوری فتح حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ طوائف کے بعد فیشن ایبل میم، پارسن نے کچھ نہ کچھ حصہ میدان کا گھیر رکھا
اب کی اس قسم کی ہیروئن نے ہر کہانی اور ہر قصہ میں گھسنا شروع کیا۔ مگر وہ جس نے طوائف کو بھگایا اس میم سے کیا دبتی۔ اس نے اتنا تو معلوم کر لیا کہ
گھر میں بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ وہ مجبوراً سے گھر میں بند کر کے اکیلا باہر جاتا ہے گر وہاں وہ اکیلا رہ نہیں سکتا۔ وہ میدے ہاتھ میں چھڑی اور اپنے ہاتھ
میں محبت چاہتا ہے۔ تقویت دل و دماغ کے لئے گھر میں رکھی ہوئی ستون دفتر اور کاروبار میں بھلا کیا مدد پہنچا سکتی تھی۔ لہٰذا وقتی گزارے کے لئے اس
نے دفتر ہی میں وہ بیٹھی ہوئی ٹائپسٹ، کبھی کبھی نظر آ جانے والی نیبر کی حسین لڑکی اور ایسی ہی، ہاں کی ہیروئن ڈھونڈ کر جسم تاپنا شروع کر دیا۔ اس کے جواب
میں گھر کا اصل متن روشن بیگم نے زہرہ بیگم کی ہیروئن کو دیکھ کر بھی ماننا پڑتا ہے کہ عورت کی جنگ برابر جاری رہی اور جیت آخر میں اسی کی ہوئی۔

مگر اسے پھر بھی قرار نہ آیا ــــ اس نے تو بالکل ہی طوق گھسیٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ اور بڑھی۔ پہلے تو مرد کی چار دیواری میں رشتے کے بجائے بیٹا
ان کے دوستوں اور پاس پڑوس والوں سے آنکھ مچولی شروع کر دی۔ عظیم بیگ کی ہیروئن کے پردے اور برقعے کے تانے بانے کر اندر گھسیٹ پائی شروع
کر دی۔ موقع بے موقع سر پر چڑھ بیٹھی۔ گردن میں جھول گئی۔ سینے سے آن لگی۔ پیچھے ڈھکے جلے اور بھی زیادہ گدگدانے لگے طوائف ان کے نخرے

پردے پر یہ چند نا آشنا کی قابل مقدس چنچل سی بے وقوف اور بزدل نظر آنے لگی اس کے فیشن سے وہ نفرت ہو گئی۔ جتنا بھی وہ ناک رگڑتی گئی، اس سے نفرت ہوتی گئی۔ جہاں تو سچ پوچھئے وہ ہیروئن پر منحصر تھی جو منہ کا نوالہ اچک لے۔ بزدل کا اچھا منہ پر انحصار ہے۔ کہاں یہ کہ سہمی سہمی نظروں کے کونوں میں بہتے ہوئے تیر لے سے کام دو جہاں کی تمام لے۔ پڑھی لکھی چاہے خاک نہ ہو مگر اتنا تو آتا تھا کہ شعر اور عاشقوں سے کان سینک دے۔ تنخواہ کم گو مشکل، لیکن اگر کسی شوخ شائستہ بیوی ہو جو سارے دکھ درد چٹکیوں میں اڑا دے تو پھر کل جنت کی آمد میں مرے

مرد عورت کے ظلم سہنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے بغیر تو جنت میں بھی جینے کو تیار نہ ہو سکا۔ حضرت آدم نے بیٹھے بٹھائے پہلی چیز کر اس نقشے کو نکال ڈالا اور اپنے سر پر سوار کر لیا۔ خیر دیوی ہر یا رنڈی جو لگام پکڑے سنتے چلے جائیں گے۔ جتنے کر اسے زیادہ پڑیں گے چال میں مستی اور روانی بڑھتی جائے گی۔ مگر ہر بات کی حد ہوتی ہے دل کے ساتھ ساتھ وہ قول و فعل میں بھی جو کہا سن بیٹھی اور باغ کی باسبانی شروع کر دی۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی جو نگلی جائے نہ تھوکی جائے۔ چھتری، ٹوپی اور برساتی کوٹ کی طرح ۔ تاتنک کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ مرد بیچ تھا سب سے پہلے پطرس تھے اور ان کے بعد عظیم بیگ، اور شوکت تھانوی بھی چیخ چیخ کر ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور ہر چاچکن خفی ہی امراؤ جی اور مرزا دان جی بھی پکار اٹھے۔

"یہ زیادتی ہے بیگم! ہمیں ہنساؤ مگر اتنا کہ پیٹ میں درد نہ اٹھنے لگے"

وہ ہیروئن ڈھیلی ڈوری کھینچتی گئی۔ اس نے یہ راز بھی معلوم کر لیا کہ اگر وہ ذرا دلی ہوتی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ میاں پیسوں پر اکڑتے ہیں کیوں نہ یہ چار پیسوں کی کمان توڑ کر الگ کر دی جائے نہ احمد ونڈی کی سلائی سے شروع کر کے اقتصادی بازار کے مرکز میں پہنچنے لگی اس نئے روپ نے اس میں چار چاند لگا دئے۔ ویسے اگر عورت بھیس بدل کرنے تو خود اس کا میاں اس پر عاشق ہو جاتا ہے جب کھلنے لگی تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی شاندار سرکس شہر میں آگیا ہے۔ عورت اسکولوں میں پڑھا رہی ہے۔ ملازمت کی ہما ہمی میں یہ نئے رکھنے لگے۔ عورت ڈاکٹر بن گئی۔ حکیم تو مارے حیرت کے بغلیں جھانکنے لگے۔ عدالت میں وکیل مخالفت اور گھبراہٹ کے مارے کھانسی کا دورہ پڑ گیا "ہٹو۔ بچو! عورت آرہی ہے" لوگ گھبرا کر الٹے گرے ادھر ادھر میدان مارنے لگے۔ اقتصادیات کے میدان کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی دنیا کو کیوں نہ تاراج کرتی لہٰذا مردوں میں تباہی مچا دی۔

تو ـــــ یہ کھادیں ہیروئن جسمانی اور دماغی اعتبار سے چاق و چوبند، بالکل لیڈروں کی طرح چاروں ہاتھ مارنے لگی۔ اب تو مذاق کی حد ہو گئی، جو کبھی کھلاتی تھی تیر لگاتی تھی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ یہ تو ایک عورت کے نخرے ہوئے۔ جو یہ داری کرتی تھی۔ ذرا سی بات پر غصے سے بہلنے لگتی تھی۔ مرد بن کر وقت بے وقت سوار رہتی تھی تو کیا تھا؟ تھی تو آپ دست نگر! اپنی بی بی کبھی کبھی پنجہ مار بیٹھتی ہے مگر خوش کرکے پھر اپنا نرم نرم جسم پیروں سے رگڑا کرتا بھی تو دیتی ہے۔ فیشن بھی کرتی ہے۔ خرچ ہے تو کیا۔ ہے تو اپنی۔ ہمیں سے تو مانگ کر اترائی ہے۔ ہماری ہی جیبوں سے تو نکلا۔ کھلا کر پیسہ نکالتی ہے لیکن یہ بالکل مردانہ وار اقتصادی دنیا میں خم ٹھونک کر جو خود اپنی کمائی کے رکھ سے جاتی ہے یہ تو سر اسر ڈاکہ زنی ہے ـــ صاف دھوکہ!

نتیجہ یہ کہ بڑی جلدی یہ ہیروئن ڈائن بن گئی۔ بہت سمجھایا، صاف صاف دکھا دیا کہ ایسی خودسر اور خود مختار عورتوں کا بڑا برا انجام ہوتا ہے حرام کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عصمتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ساری دنیا جہنم میں تھوکتی ہے۔ دفتر میں کلرک بہکائے جاتے ہیں۔ ہسپتالوں میں ڈاکٹر رنگ رلیاں منا لیتے ہیں۔ اسکولوں میں ماسٹر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ادھر والدین کو شمع ہدایت دکھائی: اسکول میں ہر لڑکی کو کم از کم ایک بار ضرور نا جائز بچے کی ماں بننا پڑتا ہے پڑھنا لکھنا کچھ نہیں صرف عشق بازی سکھائی جاتی ہے۔ "شرم دلائی" بیٹیوں اور بیویوں کی کمائی کھاتے ہو۔ ڈوب نہیں مرتے۔" یہ ماسٹر دیکھئے ہیں کمائی جیسے چرغ مگر ہر ایک اپنے وقت کا مجنوں اور فرہاد ہے۔ اس وقت کی جو کہانی اٹھا کر دیکھئے بس استاد اور طالبہ کے پر سوز عشق اور عبرت ناک انجام سے پُر نظر آئے گی۔

یقیناً یہ ادب بھی اپنا اثر رکھتا تھا اور ہیروئن واپس بیچ کے چوراہے میں سرنگوں ڈھکیل دی جاتی۔ بات یہ ہوئی کہ بازار میں دیکھتے دیکھتے لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کی مانگ ہو گئی۔ اگر ایک گریجویٹ بیس روپیہ کماتا تو لڑکی ایک سو بیس لے لیتی۔ جہاں جوں تعلیم نسواں کا رواج ہوتا گیا تعلیم مردوں فضول اور بے کار ہوتی گئی۔ ہیروئن نے پر سمیٹنا جانے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب و غریب کشمکش شروع ہو گئی۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مانگ بڑی شدومد سے تو نہیں بڑھی جس تیزی سے تعداد بڑھی۔ جب ایک میٹرک پاس لڑکی لکھا کر جاتی تھی اب گلی گلی گریجویٹ لگ گئیں۔ شادی کے بازار میں بڑی افراتفری مچ گئی۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی کے کم از کم آئی سی ایس یا پی سی ایس تو ہو۔ کاش گزشتہ لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر افسروں کا قحط پڑ گیا۔ تو یہ مصیبت کیوں نازل ہوتی۔ بچے کھچے افسر تو امراء کی ڈالیوں میں زیرہ بن کر رہ گئے۔ جس نے اونچی بولی لگائی۔ وہی لے اڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گریجویٹ اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثیر تعداد محو انتظار میں لٹک گئی۔ آخیر پرسیں اور وہ میٹرنیٹی مختلف شعبوں میں لگ گئیں۔ اس سے یہ دیکھنا چاہئے کہ افسروں کی تعداد کم رہی تو کلرک بد قسمت اسکول ماسٹر ناکام اور احمق جو ڈاکٹر نہیں پیدا ہوئے وہ رو رو کر بڑی شدت سے پیدا ہوئے۔ اب ان بے چارے دلوں کے پاس رہ رہتے رہ گئے یا تو جاہل لڑکیوں سے نصیبہ پھوڑیں یا امیر اور تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تخیلی عشق کر کے زندگی ان کی یاد میں گزار دیں۔ جنہوں نے دل پر پتھر رکھ کر بھولی بھالی لڑکی جیسی بھی جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹک گئیں۔ زندگی بھر ہم خیال و ہم مذاق بیوی کا ارمان دل میں لئے کے اتنا سا اور جو زیادہ ہمت والے تھے وہ پڑوس کی کبھی کبھی مل جانے والی انپڑھ حسینہ کی آگ میں سلگنے لگے۔ غرض لڑکی تعداد میں زیادہ بڑھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں اور مرد پیدا ہوتے گئے اور دنیا میں رہتے رہے۔ ایک دوسرے کے لئے نہیں بلکہ موزوں رشتہ کے لئے۔ بالکل جیسے ایک دکان میں کپڑے کے گٹھڑ پڑے گل سڑ رہے ہوں۔ اور دوسری طرف سڑکوں پر ننگے گھوم رہے ہوں۔ ایک ہوٹل میں باسی مٹھائیوں اور کھانوں کے انبار مزبلوں میں پھینکے جا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ جوں جوں دکانیں اور ہوٹل لوازمات سے بھر جاتے ہیں سڑکوں پر ننگے اور بھوکوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پنجرے میں لڑکے اور دوسرے میں لڑکیاں بند کر کے بیچ میں چال چلن کے پہرے دار بٹھا دیئے گئے۔ لڑکیاں کنواری بیٹھی سوکھ گئیں اور لڑکے حیوان بنتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ کہ انسانیت زیادہ بھوکی اور مزاج اور غیر انسانی بنتی گئی۔ اور پھر ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو برسوں کی چھپی دھکی خواہشوں کے مواد کی طرح پھوٹ پڑا۔ اس نے جو پہلا کام کیا وہ تخریب تھا۔ بڑھتے گئے ہوئے پرانا تانا کھانے سے بغیر نیا پودا لگانا دشوار ہے پرانے مکان کو ڈھا کر ہی نئی کرتیلیں بنائی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے تو عورت اور مرد کے بیچ میں جو پاسبان بیٹھا تھا اس سے ڈبیز ہوئی۔ چونکہ بغیر عورت کے دنیا ادھوری تھی۔ گھر میں اپنی کمائی سے عورت رکھنے کی نہ ہی اقتصادی حالت نے اجازت دی اور نہ پاسبانوں نے۔ لاچار ہو کر وہ واپس طوائف کی آغوش میں جا گرا۔ گو بہت ہیروئن کے مارچ میں طوائف مٹ مٹا کر خاک ہو چکی تھی۔ ناقدری اور بے شمار رنج نے اسے صورت سے بے صورت کر دیا تھا۔ کچھ دل ایسے ہو کر نکاح کر بیٹھی تھیں۔ کچھ لمبی چوڑی دکانیں لٹا کر گندی نالیوں کے پاس خوانچہ لگا چکی تھیں۔ کچھ نے روپ بدل ڈالا تھا۔ اور جیسے طوائف ہیروئن سے مرد کو چھیننے کے لئے گرہستن نے بھی محنت اٹھائی تھی۔ آج اس نے اسی پھیلے ہوئے آنچل میں منہ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی گرہستن نے اس ہتکنڈے اور ناز و سنگار چھپنے کے تھے آج اس نے گرہستن کی بے چارگی اور بے کسی کی آڑ لی اور سوائے بالکل نچلے طبقے کے طوائف کو پہچاننا بھی دشوار ہو گیا تھا اور جب یہ باغی طبقہ طوائف کی تلاش میں نکلا تو اس کی حالت زار دیکھ کر اس کا جی دہل گیا۔ طوائف اب وہ سرشار کی چہکتی ہوئی بلبل نہیں رہی تھی بلکہ بھوکی کمینی بلی بن گئی تھی۔ سوائے فقیروں اور یکہ تانگے والوں اور مزدوروں کے کسی کو اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ رہا تھا۔ اپنا مطلب تھا تو اسی طوائف کو شعر کہیں پرو کر قصیدوں میں گوندھ کر ناولوں میں سجا کر ادب کر اس کی لونڈی بنا دیا اور پھر جو بھولے تو ایسا بھولے کروٹ کر خبر بھی نہ لی۔ گھر میں تل لگ گیا تو بیٹھے پانی کی کوئیں کو ایسا فراموش کیا کہ اندھی ہو کر سانپوں اور کنکھجوروں کا مسکن بن گئی۔ اور اب وقت پڑا تو اسی کے کنارے پیاسی زبانیں نکالے ہانپ رہے ہیں۔ یہی نہیں

بلکہ میونسپلٹی سے کہہ کر صفائی کرانے پر تلے ہوئے ہیں مگر یہ اندھا قانون دوبارہ کارآمد ہونے سے پہلے بڑی سخت مدد کا طالب تھا چنانچہ باقی طبقہ اس کی حمایت میں چیخ پڑا پکار پکار کر اس نے دنیا کے اس زخم کو دکھایا جو ناسور بن کر رِس رہا تھا۔ وہ بے فکر خوددار جوان اس طبقے کی حفاظت کو اٹھ کھڑا ہوا جس کی کمی اس کے کلام میں آ گئی تھی۔ اسے سارا حسن اور تمام لطافتیں اس گھناؤنی اور فقیری میں نظر آئیں جس میں دنیا بھر کی غلاظتیں جذب ہو چکی تھیں۔ مگر جو آ ل سکتی تھی ناقدری کی وجہ سے وہ گر گئی تھی۔ اور اسی کے کرم کی محتاج تھی۔ شریف عورت اس نوجوان کی زندگی سے دور تر ہوتی گئی۔ وہ اس کے بارے میں نہ کچھ جان سکا اور نہ اس نے جاننے کی کوشش کی۔ اس کی نظروں میں وہ محض ایک چیز تھی۔ وہ عجیب مخلوق بن کر رہ گئی جو پیار بھری نظروں کو گناہ اور عشق کو گھناؤنا سمجھتی ہے۔ جو محبت کرنا پاپ سمجھتی ہے، جو مرد کی حفاظت اپنی آبرو میں ہے۔ اس میں عام طوائف جیسی لذت اور کھلا پن جاذبیت کہاں۔ عام طوائف سے وہ طوائف مراد نہیں جو بڑے بڑے آدمیوں کی دنیا میں چمکا کرتی ہے بلکہ سڑک کی وہ ننگی بھوکی کتیا جو راہ چلتے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے جو ہر قیمت پر ہر حیثیت کے انسان کو لنگر بانٹتی ہے اس کی گندگی وہ غلاظت گھن کرنے کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کی محتاج ہے۔ اگر ہمارے مکان میں نالی سڑ رہی ہے تو یہ اس بیچاری نالی کا قصور نہیں بلکہ مکان دار کا قصور ہے۔ اسے گندہ کہہ کر منہ موڑ لینے سے گندگی دور نہیں ہو جائے گی بلکہ اور گندگی اور بیماری پھیلتی اور جھیلنا ہے تو اس کا قصور نہیں بلکہ اس نظام کا قصور ہے جو انسانیت کی یوں بے قدری کرتا ہے۔ منٹو جیسوں نے طوائفوں کا حال لکھ کر بے شک ایک متعفن پھوڑے کا منہ کھول دیا جس نے نازک مزاج لوگوں کی لطیف طبیعتوں پر بڑا اثر ڈالا مگر اس پھوڑے کا مواد نکل جانے سے دنیا کے کوڑھ سے بچت رکھ مٹ جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ طوائف کیسی بھی ذلیل ہو، ہماری دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہے سے سڑ کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ لوگ اسے عورت نہیں مانتے نہ جو دنیا کے ہر دکھیا سے کا سہارا، ہر بھوکے کا دسترخوان ہے، وہ بے شک عورت نہیں مگر اس سے بھی زیادہ کارآمد ہستی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل کا نوجوان گرستی سے زیادہ بازاری مال کی بہتری کا خواہاں ہے۔ وہ اس کی زندگی سے دور اور یہ قریب ہے سے کیا غرض جو تعلیم نسواں نہیں ہو رہی یا پردے میں بند بیبیاں سوکھ رہی ہیں یا میاں بیویوں کی ٹانگیں کاٹے ڈال رہے ہیں اس کی بلا سے دنیا بھر بیوہ ہو جائے اور عورت ستی ہو جائے۔ دیکھئے نا آپ کے محلے کی نالی خراب ہو جاتی ہے تو آپ غل مچا دیتے ہیں اور آپ پروا بھی نہیں کرتے کہ اس سال لڑائی کی وجہ سے دکن سے گلاب کے عمدہ بیج نہ پہنچ سکے اس لئے اس سال تخم گل کی بہار سے لوگ محروم رہ جائیں گے آپ کی بلا سے پھول کھلیں یا نہ کھلیں مگر نالی صاف ہونی چاہئے۔

اب خواہ دنیا موجودہ ادب کی ہیروئن کو ناپاک، عریاں، اور مکروہ کہے، زمانے نے ہیروئن کا رتبہ دے دیا۔ یہ زمانے کی نشیب و فراز کی ڈھالی ہوئی اینٹ ہے جو تعمیر میں اپنی جگہ پا گئی۔

یہ تو ہوئی ہیروئن سرشار کی ناز و ادا بھری نازنین، جسے دنیا میں سونے کھانے پینے اور عیش کرنے کے کسی بات کی فکر نہیں ——— میں نے غلط کہا۔ ایک بات کی بے انتہا فکر ہے اور وہ عشق لڑانے کی۔ یہ زمانہ ہے فراغ بالی کا۔ پھر اس کے مقابلے میں پریم چند کی مظلوم عورت، اور راشد الخیری کی کچلی ہوئی بیوہ۔ یہ زمانہ ہے اقتصادی کش مکش کا اور سدھار کا۔ پھر لیجئے مزاح نگاروں کو ——— یہ ہنس سکتے اور ہنسا گئے۔ چڑی سی سکن، نہ آگے جانا نہ پیچھے ہٹنا۔ پھر ایم اسلم کی سادہ بھولی لڑکی جسے سوائے ندی کے کنارے چلتے جانے والوں سے پریم کی پینگیں بڑھانے اور بھونروں کے ساتھ گیت گانے کے اور کوئی کام نہیں۔ مس حجاب کی بے وقوف، جاہل اور بے مصرف دوشیزہ جسے سوائے چوہوں سے ڈر کر بے ہوش ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا ——— جہاں حسن و عشق کو بناوٹ نے الو بنا رکھا ہے۔ یہ زمانہ ہے مراق اور ٹھٹھے کا۔ اور پھر کرشن کی زندہ عورت، بیدی کی کاروباری ہیروئن، منٹو کی جیتی جاگتی سب کی جانی پہچانی بے حیا رنڈی، عصمت کی بے چین منہ پھٹ اور بے شرم لڑکی، ستیارتھی کی خانہ بدوش، عسکری کی فلسفی سیم صاحب ——— یہ زمانہ ہے زندہ رہنے کے لئے لڑ مرنے کا، کچھ تعمیر کرنے کے لئے جدوجہد کا، کچھ مٹانے کے لئے اور کچھ بنانے کے

سے دین و دنیا کو تلپٹ کر دینے کا۔ جیسا کہ موجودہ فضا سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی کی ہیروئن کس شان سے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ خدا کے بعد عورت ہی کی پرستش ادب میں کی گئی ہے یا شاید اس کا نمبر پہلے آتا ہے۔ پھر دنیا کی دوسری طاقتوں کا۔ جہاں تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے آنے والی ہیروئن نہ تو ظالم ہوگی نہ مظلوم بلکہ صرف ایک عورت ہوگی۔ اہرمن و یزداں کے بجائے، ادیب اسے عورت کا رتبہ ہی بخشیں گے اور پھر تعمیر شروع ہوگی۔

(ایک بات)

custom to re-marry should live in misery, if jealous husbands should chop off their wives' noses. It would matter little to him if all respectable women were widowed or if the whole of their tribe was wiped out. It is the drain in his own neighbourhood that he wants cleaned up. Whether the flowers in other people's gardens bloom or not is a matter of complete indifference to him, for in any case he has no access to such well-kept places. The heroine of present-day fiction may be an unclean outcaste. Nonetheless she has been shaped and moulded by the vicissitudes of life itself and it is good that she has at last caught the artist's eye.

Faked Romance

Well, such is the story of our heroine. We have seen her as Sarshar's alluring courtesan, who ate and drank and was merry without a care in the world, except the worries of love-making. That was in the age of grace and good living. Next, we met her as "Prem Chand's" obedient housewife and Raashid-ul-Khairi's pathetic, downtrodden widow. That was in the age of economic stress and social reform. Next came the humorists, full of fun and laughter, complacent and static. And then the period of drowsiness, in which the sadhu's young daughter of M. M. Aslam's stories wandered dreamily on the banks of brooks, singing among the butterflies and dallying with the passers-by; and Hijab's stupid, indolent and futile maidens swooned away at the sight of a mouse and lived in a world of faked beauty and faked romance. And now, in our own day, we see our heroine as the living woman in Krishna Chandra's stories, as the business like woman in Bedi, as the lively, impudicious, common harlot in Manto, as the restless, outspoken unblushing girl in Ismet, as the nomad in Satyarthi and as the philosophising mem-sahib in Askari – all pointing to the fact that ours is the age of conflict; of the struggle to live; to shape and to build; to destroy, in order to create; an age, in which everything between heaven and earth must be evaluated anew.

In fiction, woman is invested with a power greater than all other forces of nature, second only, if at all, to the Almighty. We must wait and see what role is assigned to her in the days to come. As far as one can peep into the future, the heroine of the coming age will be neither tyrant nor martyr, neither goddess nor hell-hag. She will be just a woman and writers will proclaim her as such. When that happens, the foundation of our fiction will have been well and truly laid.

had once borrowed her allurement and charm, she now adopted the submissive ways of the homely woman. So much so that unless she was the lowest of the low, it was difficult to recognise her as the prostitute. When the rebels at last sought her out, they were shocked to find her sunk so low that only the beggars, the coolies and the tonga-drivers knew where she lived. She was no longer the sweet little songstress of Sarshar's novels, but only a mangy and mean-looking cat rummaging about in the refuse heap. In the days gone-by, when man depended on her for his moments of supreme joy, how he had extolled her in prose and poetry, how fiction had paid homage to her charm and beauty! And how man had cast her aside now! Having installed a water pump in his house, he had let the wells of sweet water fall into disuse, till they were infested with reptiles and vermin. Panting with thirst, with his tongue hanging out of his mouth, he now returned in his desperation to the same wells.

Young Crusaders

Not only did he return, but he demanded that the municipality should clean them up and keep them in good repair. For, such a lot had to be done before the prostitute could once more become useful to him. So the rebels vehemently took up her cause and exposed this festering sore to the gaze of the world. Impecunious but spirited young men crusaded for her, for she, whom no one else seemed to want, could be a great source of comfort to them. They discovered all the beauties of the world in this wretched, down-and-out, fly-blow street-walker who lived in such filth and squalor because she was about the only kind of woman they could consort with. The respectable woman had so far receded from their life that they hardly knew anything about her and cared even less To them she was just a snooty, selfish sham of a woman who was outraged at every offer of love and indignant at the suggestion of male protection She lacked the squalid fascination of the harlot—not this time the demi-mondaine who scintillated in the highest social circles, but the hungry, street-bitch who tugged at every passer-by's leg and gave herself to every one for a handful of coppers. Her squalor, they argued, was not something to be shunned but a wrong to be redressed. If she had no morals or scruples, if she was filthy and disease-ridden, the fault was not hers but of the social system which permitted human beings to sink so low. The new writers, by dwelling on this theme, did a great deal of muck-raking which offended the fastidious, but they helped, nevertheless, by their frankness to lighten the burden of human misery. However disgusting the prostitute, she is after all part of our life and one cannot ignore her simply because she is unpleasant to contemplate. Because she is the common refuge of many frustrated and hungry men, because she is there for any one to have, the world denies her the status and dignity of woman. But she is even more useful than an ordinary woman. That is why the young crusader of to-day is more solicitous about her well-being than about the welfare of the woman-in-the-home whom he finds so aloof and remote. It is of no concern to him if women's education should not make much headway, if thousands of widows forbidden by

New Problem

In time, the supply outstripped the demand. There was a time when you had to go far to find a girl who had passed her school, now you found a whole crop of women graduates jostling with each other in the marriage market. This created a new problem. How could an educated woman marry any one who was not, at least, a civil servant ? But Government unfortunately had forgotten to arrange that the number of its civil servants should keep pace with the number of educated women waiting to marry them. There was, therefore, a regular scramble for each eligible young man that appeared on the horizon and after he had been grabbed by the highest bidder, the rest of the crowd of women graduates returned to their perches and lay in wait for the next taking up various jobs in the meantime.

In the world of men, on the other hand although civil servants were few and far between, ill-paid school teachers and penniless doctors were rapidly growing in number. These unfortunate men had only two courses open to them - to marry some uncouth simpleton and be miserable for ever, or pine away, dreaming of a life of eternal bliss with this or that woman of education, refinement and charm. Some did both. They married as the fates ordained and at the same time continued to torture themselves with dreams of the ideal soul-mate. Most of them, of course, just fell in love with the chic young lady in the neighbourhood, who though utterly unapproachable was at least occasionally visible in the flesh.

So our world filled more and more with men and women whom nature had made for each other but whom the match-maker could not "suitably" pair off. It was a scene of poverty in plenty warehouses full of cloth and the streets full of naked people ; food over flowing into the gutter and people starving by the thousand, all the men imprisoned in one cage, all the women in the other and Mrs. Grundy standing guard in the middle. Young women languished and became faded old maids , young men became sex-obsessed brutes; and the pangs of hunger dehumanized both and warped their souls.

At last the pent up forces found an outlet. These stresses and strains threw up a band of rebels, who set out to destroy, to uproot the old tree and plant a new one in its place, to demolish in order to build afresh. They first crossed swords with Mrs Grundy. She would not be easily bound and gagged. But what finally defeated their efforts was the impassable economic barrier that stood between them and the women of their choice. Thwarted and frustrated, man once more returned to the courtesan's bosom.

But the great courtesan of the early days was now just a common harlot. Gone was her glamour, for during the reign of the domestic heroine, she had been robbed of all her glory, and poverty and neglect had put their hideous stamp on her face. Some had sought refuge in marriage, some still plied their trade in the gutter, others camouflaged themselves as respectable women Years ago, the woman-in-the-home had thrown aside her veil to win back her man from the courtesan. The bankrupt courtesan now picked up this discarded symbol of modesty and tried to disguise herself in it. Just as the respectable woman

Unperturbed, the woman not only kept her hold, but set about tightening it, if she could. She discovered, for example, that her economic dependence on man was a bad chink in her armour which she must close up. She started in a small way, by taking in the neighbours' needlework, but very soon was found crawling about in every corner of the career market. The novelty of this role added to her charms. Let woman but appear in a new guise and even the husband would fall in love with her. She became a school-teacher and the old mullas gaped at her in wonder. She became a doctor and ancient apothecaries could hardly believe their eyes. She pleaded in law courts and men in the profession stammered and spluttered in her presence. The advent of the career woman was like a grand circus come to town: every one leaned out to watch and stare. Men shouted: "Look out, for there comes the New Woman", and fled in confusion. She advanced steadily and conquered new fields. The more she cut into men's wages, the more she captured their hearts.

This was too much of a good thing. This wage-earning heroine, physically fit and mentally alert, waylaid man like a brigand, So long as she was just saucy and pert and boisterous, she was rather delightful. Even if she was spoiled and moddlesome and difficult to shake off and somewhat of a nuisance, as long as she depended on man for her bread and butter, she was quite acceptable. Now and then, perhaps, she put out her claws but in the end she always made up for it by rubbing her soft body against his legs and putting him into good humour again. Vain and extravagant, she was nevertheless man's property, proud to live on his charity and willing to pamper him to earn her keep. For her, now, to fight man as his equal in the economic field and to cheat him of his last superiority over her was sheer highway robbery !

In fact, she became quite a terror and writers felt called upon to point out the error of her ways. They told her that independent women always came to grief; they were ravished, had illegitimate children, were seduced by clerks and doctors and school-teachers with whom they came into contact, were shunned and despised by society. They put husbands and fathers to shame for living on the earnings of their wives and daughters. They warned parents that in the schools and colleges, their daughters would learn nothing but lovemaking and would end up as unmarried mothers, for these weedy-looking school-masters were all gay Lotharios in disguise. Every other story written during this period is at pains to show how the school-girl and her teacher succumb to temptation, have a passionate affair and come to a pitiful end.

Deterred by this type of fiction, the heroine might have returned to her husband like a penitent who had learnt her lesson, but for some reason, just about this time women began to fetch higher salaries than men, which enabled our heroine to consolidate her newly acquired position. As education paid higher and higher dividends to women, it became less and less profitable to men.

Her success at first was partial, for though the courtesan had retreated, the field was held for a while by the Occidental and the Parsee, both of whom were regarded as "fashionable" types and had worked their way into many of our stories. But she, who had vanquished the courtesan, was not likely to be daunted by these. She knew, of course that as long as she stayed at home, there were dangers abroad that she was unable to avert. Confined to the four walls of the house, how could she dispel the loneliness that man would feel away from home? For, when on his jaunts, he rather fancied a woman in one hand as much as he fancied a walking-stick in the other. She was the tonic for domestic use only; how could she sustain him during his business hours, for example? True enough, as a temporary expedient, man did cast hungry looks on the typist girl or the manager's beautiful daughter, or found others to warm his blood. But the domestic heroines of such novels of the period as *Godari ka Lall. Roushanak Begum* and *Zohra Begum* kept up the fight and very much held their own against such pirates.

The role of the docile, homely woman does not, however, seem to have satisfied her for long; for, in the next phase of her career, we find her very much bolder than she had ever been before, archly flirting with her cousins, with her cousins' friends and with the neighbours. She was now transformed into the saucy, boisterous, unabashed, self-assertive female that we find, for example, in Azim Beg's stories. The fact that she was still very much the woman-in-the-home living in purdah, added piquancy to the situation and made her sportiveness even more devastating. Beside her fetching ways, the erstwhile charms of the courtesan appeared commonplace, and "Prem Chand's" submissive and goody-goody heroines, insipid and irritatingly inane and their humility almost contemptible. The docile heroine now gave place to a much more robust and hearty female. True, she was unlettered, with no claim to grace or refinement, but she was full of crude vitality and primitive fun. She slapped and kicked and punched and played practical jokes and was up to all sorts of pranks. To the man with the modest income, such a vivacious wife was a great source of joy, brightening up his little home and lending colour to his dreary existence. Life for him had, indeed, become heavenly.

Willing Victim

The male, it is true, is ever the willing victim of the female. After all it was he, who finding even Paradise desolate without her, made her out of his rib. How gladly he hands over the reins to her, be she courtesan or wife, and follows her around. The harder he is driven and the more he is pulled about and whipped, the happier he feels. But once in a while, the limit is reached and the woman turns. It was all very well for our domestic heroine to be the queen of his heart, but when she entwined herself round him and began to bully and dominate and tantalize him and stood guard over his every word and act, man was exasperated. The first groan was at last heard in "Patras," and, later, Azim Beg and Shaukat Thanvi and many others joined the chorus. Before long, our fiction was crowded with male characters like Chacha Chhakkan, Munshiji, Mirzaji, etc, all of whom raised their voice in protest against woman's tyranny.

in those days were household drudges. They were the unappetising housewives and dowdy maids-of all-work, from whom men turned to courtesans for heartsease and pleasure. The courtesan of Sarshar's days was not just a vulgar mercenary. She lived as graciously as any blue-blooded lady, except that she was even more refined and possessed greater wit and charm and gaiety. She was the town-garden, maintained by public donations for the pleasure of the community. Not every one could afford a fine house, adorned by an accomplished and elegant wife, flower-decked and attar perfumed. So man adopted a convenient formula for smooth living—in the home, the wife to bear him children and to minister to his daily needs; in the street, the courtesan to appease the hunger of the soul. A most useful compromise indeed that could thus accommodate both the domestic ideal and the romantic urge.

Jealous of the courtesan, the woman-in-the home grew restive. When man was away from home seeking joy in the arms of the courtesan, she made eyes at the neighbours. Those husbands who had already found the public garden an expensive resort, promptly returned home, arguing that after all the little that belonged to you was better than the much that belonged to all. Having won the first round, the woman-in-the-home gained a new confidence and proceeded to fight the courtesan with her own weapons.

Woman Stoops to Conquer

She proceeded slowly and with caution. At first, she stooped to conquer and insinuated herself into man's affection by following the path of docility and self-abasement. In time, Sarshar's imperious courtesan was vanquished by "Prem Chand's" homely woman, and henceforth this soft-treading, feet-kissing, modestly-veiled, obeisant creature was found crawling shyly across the pages of fiction. Those who used to feast their senses on the riot of colour in the public park, were suddenly attracted by the modest little violet growing in their back garden. Surprised, and somewhat proud, to find it there, they began to tend it with gentle care and affection. The courtesan's sway was seriously challenged. Her blandishments were now found to be distasteful and her charms, which had once enslaved the hearts of men, were put down as mere tricks of the trade. The water-pump in the public square was contaminated, declared the male—and began to dig a well in his own courtyard. But every day, the well became deeper and deeper, till at last man lost his foot-hold and began to drown.

This stung the courtesan to exasperated fury. But her day of glory had passed. While she had been resting on her laurels, the modest, ingenuous, homely female had stolen a march over her by using weapons both old and new. On the ruins of the courtesan's world, the woman-in-the-home built her tower of victory and reigned supreme. Men who used to crush her under foot, now took up cudgels on her behalf. Chivalrously, they pilloried themselves and railed against their own kind for their past neglect of her. She watched this tournament with quiet confidence and took no sides. The docile believer in ahimsa fought no one, but just as Gandhiji exasperated the rulers by his acts of renunciation, she, with her downcast eyes and submissive ways, confounded the enemy from behind the veil.

"YOU clap with two hands, not with one." says the proverb. In literature, the two "hands" are the hero and heroine of fiction. No doubt there is a type of literature which does without them. But that is like striking your hand against the sole of your foot—you make some noise which echoes within the pages of the book, but seldom travels beyond them to the common reader. Banish the hero and the heroine and most literature would be hard to swallow and would stick in the throat like dry bran.

Make a performing monkey and his mate dance to the rattle of a dugdugi and you collect a crowd. Preach and exhort and you lack an audience. People never take kindly to the mosque and the school. So when you have something to say, you lead forth the performing monkey and his mate on a string and rattle the dugdugi. You exhibit the tactics and exploits of the hero and the heroine and collect a crowd. You tickle the senses and seduce the emotions and thus achieve your end. In short, you employ the same stratagem as the wise instructor who wins over his pupil by pretending that what he is about to teach them is just another game, like kabaddi or tip-cat. Sugar-coat the bitterest pill and people will swallow it with delight.

Literature Wedded to Life

How else should the ancient *Mahabharata* and *Ramayana* be as fresh after all these centuries as though it all happened only the other day? Azim Beg Chughtai tried to abolish the purdah by quoting from the Quran and only drew the imprecations of the maulvis on his head. But in *Sharir Biwi* and *Coal-tar* how easily was the veil rent with the help of his lively heroines! Were it not for their heroes and heroines, Rasshid-ul-Khairi and "Prem Chand" would now be rotting on the musty shelves of libraries instead of living in the hearts of men. Literature is wedded to society, to history; in other words, to life. Part them asunder and they both wilt and die. Banish the hero and the heroine from literature and you banish life, leaving a void behind.

Of the two, I wish to talk of the heroine and of the social level at which our fiction found her from time to time. For, she is like Jamshed's wine-bowl in which the whole universe and all eternity were reflected. Fix our gaze on her and the entire economic, social and political panorama of her age unfolds before our eyes.

Look, for instance, at the heroines in *Fasana-i-Azad*. They leave you in no doubt that the woman who really mattered in that age was that embodiment of refinement and charm, the courtesan. This is only to be expected, for where could Sarshar have come across a respectable woman in those days, above all a respectable Muslim woman? Respectable women

THE HEROINE IN URDU FICTION

By

ISMET CHUGHTAI

Translated by

A. S. BOKHARI

As a writer of short stories in Urdu, Ismet Chughtai is well known for her studies of middle class life, her intimate knowledge of woman's mind and her pungent prose. This is one of her critical articles appearing in her latest collection "Ek Bat".

قدیم یونانی حکما اور اُن کے خیالات

(۱)

مصنفین فلسفے کی تاریخ کو عام طور پر حکماء کے اُس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر ملیطس میں آباد تھا۔ یہ حکماء مسئلہ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ یہ دنیا عالمِ کون و فساد ہے۔ اشیاء بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہوتی رہتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وجود میں کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی۔ اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل نیست و نابود نہیں ہوتی اور نہ کبھی وہ کبھی انعدام ہی پر پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز تغیر کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو مختلف صورتوں میں آ کر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے؟ وہ کون سا مادۂ بنیادی ہے جو تغیر پذیر ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے؟ یہ ایک معمہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکماء نے اپنی کمر ہمت باندھی۔

سب سے پہلے طالیس نے پانی کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد اینکسی مینڈر آیا اور اس نے کہا کہ یہ مادۂ بنیادی ایک غیر محدود مادہ ہے جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ اینکسی مینیز نے اس کو ہوا قرار دیا جس کے اجزاء کبھی لطیف حالت میں حرارت پا کر آگ بن جاتے ہیں یا منجمد حالت میں ٹھنڈے ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرانیوں نے حملہ آور ہو کر ملیطس کو تاراج کر دیا اور حکماء کے اس گروہ کا اپنے مرکز ہی میں ہی خاتمہ ہو گیا۔ مگر انہی ایام میں ملیطس سے کچھ فاصلے پر شہر افیسس میں ایک فلسفی ہرقلیطس نامی موجود تھا جو ملیطس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہرقلیطس کو دنیا کی سب باتیں قابلِ ماتم و افسوس معلوم ہوتی تھیں۔ اسی لئے بعد میں وہ "حکیم باکی" کے نام سے مشہور ہو گیا جس طرح سے کہ دیمقراطیس کو لوگ "حکیم ضاحک" کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ اُس کے لئے زندگی کی سب باتیں ذریعہ فرحت و انبساط تھیں۔

ہرقلیطس کے نزدیک کائنات کا مادۂ بنیادی آگ ہے۔ وہ تو یہ کہتا تھا کہ ہماری قوتِ فکر بھی اسی مادی آگ کا ایک حصہ ہے جس سے سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں۔ اور شعلے کا آخر کار مردہ سا ہو جانا خیال کی اس بے ترتیبی اور بے عقلی کو ظاہر کرتا ہے جو شراب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے۔

مگر تاریخ فلسفہ میں ہرقلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ اس نے بھی اور حکما کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ جس مسئلہ پر اس نے بہت زور دیا ہے، وہ مسئلۂ تغیر ہے۔ تمام دنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے آپ سے اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا۔ دوسری دفعہ پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام علوم بے سود ہیں؟ جب اشیا کی حالت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں۔ وہ ہمارے منہ سے نکلتے ہی غلط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ چیز بذاتِ خود اس وقت تک بدل کر کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی لئے کلام کرنا ترک کر دیا تھا اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اس جملہ کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہرقلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں دو دفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم کسی دریا میں ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے ———— کیونکہ ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی دریا ایک حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ بدلا ہوا ایک دریا ہر آن ایک نیا دریا بن کر ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

ہرقلاطیس کے مسئلۂ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو قراطیس نامی ایک فلاسفر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ قراطیس ہرقلاطیس سے سو سال بعد میں ہوا ہے۔ اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے میں اسی قراطیس کا شاگرد رہا تھا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال پیشتر ہوئی۔ اُس نے اوائل عمر میں جو کچھ اپنے استاد سے اس ہمہ گیر تغیر کے متعلق سنا اس نے اسے اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ ایسی چیز ڈھونڈے جو اس گردش سے بالاتر ہو۔ جو ازل ہی سے جیسی تھی ابد تک ویسی ہی رہے اور جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ واقفیت اور وہ علم ہمیشہ کے لئے درست اور کار آمد ہو۔ یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہرقلاطیس اور اس کے پیرو مسئلۂ تغیر کا اطلاق محض محسوسات پر کرتے تھے کیونکہ محسوسات کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی حقیقت یا وجود کے قائل ہی نہ تھے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ان معنوں میں قائلین مادیات تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے محسوسات اور غیر محسوسات کے درمیان خطِ تفریق کبھی کھینچا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوتِ خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی ہے جس طرح مادہ اور مادہ بھی اپنے اندر قوتِ خیال رکھتا ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر محسوس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اور آخر میں اس نے منزل پر پہنچنے کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ایتھنز کے نامور حکیم سقراط نے اس کو بتائی۔

دنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اخلاف کے لئے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب یا تصنیف نہیں چھوڑی۔ ان کا حال ان کے ہمعصروں کی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی انہی ہستیوں میں سے ایک تھا۔ اس کے حالات زیادہ تر یا تو ارسطو فانیس نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا۔ تو پہلی دفعہ وہ ڈراما اسٹیج پر کھیلا گیا۔ اور اس کے کچھ حالات نامور جرنیل زینوفون کی اُس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں جو سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطو فانیس، زینوفون اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایتھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اُس نے وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر ڈرامے کی شکل میں اس کے اپنے اُستاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج ہیں تو اُس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج بھی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیئے جن پر وہ سقراط کے

بنائے ہوئے راستوں پر چل کر محود پہنچا تھا۔

ارسطو فانیس نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہل ایتھنز کا نمائندہ بن کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی ہنسی اڑائی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ سقراط نئے خیالات اور بے منطق بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے از حد مضر ہیں۔ برخلاف اس کے زینوفن سقراط کو ایک کامل رہنما، روحانی مددگار، پرہیزگاری اور نفس کشی کا ایک جاذب نمونہ اور ان تمام لغو اور بے ہودہ خیالات کا جو نوجوانوں کی گمراہی کا باعث ہو سکتے، دشمن بیان کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح مختلف زاویہ ہائے خیال سے ایک ہی شخصیت کو ان دو طریقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس روحانی ترقی کے زمانے میں اس زبردست ہستی کے اندر ایک ایسی روحانی تڑپ تھی جو اس کے ہم صحبتوں کے دلوں میں بجلی کی طرح سرایت کر جاتی تھی۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی لیکن اس میں وہ مقناطیسی کشش تھی جو شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اس کی طرف کھینچ لے آتی تھی جن کو اس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہوا۔

وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہی، سقراط منطقی بازی گر نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اس کو الہام ہوتا ہے۔ اور خدا نے اس کو ہدایت بنی نوع انسان کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کو ایک نئی قوت اور اس کی زبان کو ایک انوکھی بلاغت بخشتا تھا۔ اس کی آزاد زندگی ان تمام بندشوں سے خالی جن کی وجہ سے ایک دنیادار پابہ زنجیر ہوتا ہے۔ اس کی روش میں غضب کی سادگی اور اس کی عادات میں اعلیٰ درجے کا ضبط تھا۔ ارسطو فانیس جو سقراط اور اس کے معتقدوں کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔ اپنے ڈرامے میں سقراط کی زندگی کا وہ درخشاں پہلوئے حیات ہرگز نہیں بتا سکتا تھا جس پہلوئے حیات نے افلاطون، بیر افلاطون کی طرح اور سینکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ستر سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اہل حکومت نے اس پر دو الزام لگائے اول یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو مٹا دے۔ سقراط اگرچہ چاہتا تو جیسا کہ قانون اُس کو اجازت دیتا تھا۔ اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں تخفیف کرا سکتا تھا۔ اگرچہ خود نادار تھا مگر اُس کے پیروؤں میں سے اکثر ایسے متمول تھے جو اس کے لئے بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اگر وہ چاہتا تو اس کی ایک جنبش ابرو کی تعمیل میں اُس کے بے شمار دوست اُس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ اپنی باقیماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسائش میں کاٹتا۔ مگر مرتے دم تک اس کو اپنی بے گناہی کا یقین رہا۔

قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا۔ اور قید سے بھاگ جانے کا اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔ جو الزام اُس پر لگائے گئے ان میں سچائی صرف اتنی ہے کہ سقراط کا بعض ایسے گروہوں سے میل جول تھا جنھوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُس نے بذات خود مذہب کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اُس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے عقیدوں کا چنداں قائل نہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبط نفس کا مادہ پیدا ہو گیا۔ مطلق العنان زندگی کی بد اخلاقیوں اور بدعنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے لگے اور پاکیزگی اور نیکوکاری کو اپنی زندگی کا مقصد اعظم سمجھ کر اسے ہمیشہ اپنے مد نظر رکھنے لگے۔ تخریب اخلاق کا شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایام جوانی میں سقراط کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی جو بعد میں اپنی باغیانہ حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند رہا۔ اس کے مشہور جانبداروں میں افلاطون تو سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا۔ اور زینوفن ایتھنز کو چھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں شامل ہو گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

ہرقلیطس کے عقیدۂ تغیر کی وجہ سے افلاطون کا دل تذبذب کی حالت میں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر ہر ایک چیز ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اشیائے تغیر کی وجہ سے ان کا علم بھی ہر لحظہ متغیر ہونا چاہیئے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان خیالات سے اس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوئی جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم ہمیشہ کے لئے درست ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اس علم صحیح پر پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقۂ سوفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں میں "سوفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دنیا سقراط کو "سوفسطائی" کہتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس کو ان لوگوں کا دشمن خیال کرتے تھے جن کو "سوفسطائی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے کہ نیکی اور بدی میں تمیز قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی نہیں ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے۔ جس فعل کو ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے، وہی فعل بعض اور واقعات کے ماتحت "بدی" بن جاتا ہے۔ جس قدر خطرناک ایسے بیہودہ خیالات سے وابستہ مرد زندگیوں کے عقیدے سے متزلزل ہونے کو تھے۔ اور اخلاق انسانی ایسی رکیک بحثوں سے معرض خطر میں تھا۔ اس وقت سقراط آگے بڑھا اور راسخ اپنی نیک نیتی اور صحیح الدماغی سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اس نے کہا "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک حالت میں ٹھیک ہوتا ہے، کسی اور حالت میں برا ہو، اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل "نیک" یا "بد" ہے۔ مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنی اور حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کی دیانتداری بیان کریں تو ممکن ہے کہ ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے پوری طرح واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اس کی دیانتداری کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔" مگر ہم یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "ہم جانتے ہی نہ تھے کہ دیانتداری کیا چیز ہے۔" کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف تھے تو غلط یا صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے تھے۔ اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات کہا جاتا ہے، پوری طرح واقف ہوں۔ مثلاً سچائی، انصاف، بہادری وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کر کے اس کے معنوں کی توضیح کریں؟"

سقراط کے ان خیالات نے کہ انصاف، بہادری، وغیرہ وغیرہ حقائق ابدی ہیں اور ان کے معنوں کی تحلیل ان کی تعریفوں سے ہو سکتی ہے، افلاطون کو اندھیرے میں شمع ہدایت دکھائی۔ ہرقلیطس کے عقیدوں نے علم صحیح کے رخ تاباں کے آگے شک کی ایک دھندلی سی نقاب ڈال رکھی تھی، جس کو سقراط نے اپنے انوار ادراک سے تار تار کر دیا۔ یہ حقائق محسوسات کے زمرے سے باہر ہیں۔ حق، شیا کا احساس ہمیں اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ان معروضات میں سے کسی نہ کسی کی محرک ہوتی ہے، مگر اس موضوع کو بذات خود ادراک سے تعلق ہے نہ کہ حواس سے۔ سقراط ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ عالم محسوسات کے علاوہ جس میں اشیا ہمیشہ انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں اور جہاں کسی چیز کا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا، ایک اور دنیا حقائق ابدی کی بھی ہے۔ اور ان حقائق کا علم بھی انہی کی طرح ابدی ہے۔ عالم متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقت ابدی ملحق ہے اور جو رائے ہم عالم متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں، اس میں اس حقیقت ابدی کا علم مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص دیانتدار ہے" تو اس فقرے میں اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی حقیقت کا علم ہے۔

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے دائرے تک ہی محدود رکھے مگر افلاطون بہ آسانی اس سے بہت آگے چلا گیا اور اس نے ان متغیر اور ابدی حقائق کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط ا ب خط ج د کے مساوی ہے، مساوات کے علم کو تسلیم کرنا ہے تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقت ابدی ہے جس کا احساس حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا ہے۔ "مساوات" بذات خود

کل مخلوقات کا بھی ہے۔ اور کل بھی رہے گی۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہو جانے کے بعد بھی۔ ہر خطا جو دو حقیقت اس میں برابر نہیں۔

یہ مسئلہ حقائق ابدی افلاطون کی تعلیم کا ایک بنیادی ہے۔ انہوں نے ان حقائق کو اپنی زبان میں IDEAS کہا کرتا تھا۔ یہ لفظ اب تک انگریزی زبان میں موجود ہے۔ مگر اس کے معنی اب ان معنوں سے بہت مختلف ہیں۔ جن معنوں میں افلاطون نے اس کو استعمال کیا۔

(۲)

یونانیوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مقتدائے حکمت ہر ایک شخص کو تیس سے روشن کرتا رہا تھا۔ افلاطون کی نسبت بھی یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہر قلا طیس اور سقراط کے علاوہ اور بھی بہت سے قدما کی تعلیم نے اس کے دل و دماغ پر اثر کیا۔ ان قوموں کو بیدار کرنے کا خاص طور پر اس نے بہت سا انتخاب فیثاغورسیوں سے کیا جن کے مرتبہ اس نے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ فیثاغورث مسیح سے تقریباً ساڑھے پانسو سال پہلے جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ یہ جزیرہ ایشیائے کوچک کے ساحل کے ساتھ ہی واقع ہے۔ جہاں سب سے پہلے وہ یونانی علما تدریس کیا کرتے تھے جو بعد میں اٹلی کی نو آبادیوں میں جا بسے۔ اور جن کی وجہ سے جنوبی اٹلی یونان اعظم کے نام سے مشہور ہے۔

فیثاغورث نے ایک مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ جس نے کچھ عرصے کے لئے قرطاجنہ کی حکومت پر غلبہ پایا۔ ملطیہ کے حکما نے اپنے فلسفے کو زندگی سے ملا ہوا تعلق رہنے کا خیال نہیں کیا۔ دیوتاؤں سے ان کی مراد کوئی ذی شعور لائق عبادت ہستی نہ تھی بلکہ اس نقطہ سے ان کا مطلب محض نظام مادی کا ایک بڑا عنصر تھا۔ لیکن فیثاغورث مذہب کے گرچہ ایک طرف ان دقیانوسی توہمات اور رسوم کو جن سے لوگوں کے اعمال اور خیالات کش ہو چلے تھے۔ از سر نو رواج دے دیا مگر دوسری طرف اپنے تناسخ اور عقیدہ دوام روح سے عظمت فردیہ اور انسانی زندگی کی قدر و منزلت کے احساس کو لوگوں کے دلوں میں بڑھا دیا۔ اس نے یہ بات دنیا کے دل نشین کرا دی کہ انسان محض ناقابل وقعت اور لائق حرمت سے اس کو سراب یا حباب نہ سمجھنا چاہیئے۔ انسان ایک ایسی حقیقت رکھتا ہے جس کے حس آتش سوا یا چمک برق کی تمثیل کسی طرح صادق نہیں۔ ملطیہ کے حکیموں کی طرح فیثاغورث علاوہ حکیم ہونے کے عالم بھی تھا۔ اب تک اس کو ہندسے کا بانی سمجھا جاتا ہے اور موسیقی میں سُر کا موجد بھی اسی کو بتایا جاتا ہے۔ افلاطون کے زمانے میں فیثاغورسیوں کی شہرت نہ صرف بحیثیت عالی دماغ حکما کے تھی جو فلسفہ روح کے انتقالات پر غور و خوض کیا کرتے تھے بلکہ ساتھ ہی وہ جید ریاضی دان اور موسیقی کے ماہر بھی شمار کئے جاتے تھے۔

ریاضی اور مذہب دونوں میں فیثاغورسی عقائد نے افلاطون پر بہت سا اثر ڈالا۔ افلاطون خود بھی بڑا ریاضی دان تھا کہتے ہیں۔
اس کی درس گاہ کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص ہندسہ نہ جانتا ہو اس کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ علاوہ غیر مادی حقائق کے ابدی حقائق کے موجود ہونے کا مسئلہ فیثاغورسی بھی اپنے عقیدے سے یہ ظاہر کر چکے تھے کہ کائنات کی اصلی بنیاد اعداد میں پائی جاتی ہے۔ پہلے پہل فیثاغورث کو اس بات کا خیال اس وقت آیا جب اس نے یہ دریافت کیا کہ موسیقی میں نغمے کا انحصار سُروں کے تناسب پر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جب جب علم کے دائرے کے وسیع ہو جانے سے بہت سے مظاہر قدرت کو ریاضی کی پیمائشوں اور عرض و طول کے مسائل سے تطبیق دیا گیا تو اس خیال کو اور بھی تقویت مل گئی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ افلاطون کے دریافت کردہ حقائق ابدی میں علاوہ اعداد کے اور بھی کئی باتیں شامل ہیں۔ مگر افلاطون اور افلاطون سے بڑھ کر اس کے پیرووں کی یہ عادت تھی کہ وہ ان حقائق کا ذکر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا فیثاغورسیوں کی طرح ریاضی کی اصطلاحات

میں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کا تعلق افلاطون کے عقیدۂ حقائق ابدی اور فیثا غورس کے عقیدۂ اعداد میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق ان دونوں حکیموں کے عقائدِ روح میں بھی ہے۔ افلاطون کے مطابق روح ایک ایسا رشتہ ہے جو حقائق بالائی غیر فانی دنیا (جس میں کہ روح اپنی عقل اور ادراک سے سب چیزوں کو سمجھتی جانچتی ہے) اور فانی۔ تغیر پذیر۔ مادی دنیا کے درمیان قائم ہے۔ علاوہ ازیں یہی موخر الذکر دنیا کے متعلقات۔ حرکت اور انتقال سب روح کی بدولت ہیں۔ روح ہی تمام حرکت کا منبع ہے ——— ——— یہی ایک ایسی چیز ہے جو بذاتِ خود حرکت کر سکتی ہے۔ اجسام صرف اسی حالت میں حرکت کر سکتے ہیں۔ جب یا تو ان کو کوئی دوسری چیز حرکت دے۔ یا (جیسا کہ تمام جانداروں کی کیفیت ہے) خود ان کے اندر روح موجود ہو۔ جب روح کی سب سے بڑی جلوہ پردازی اس کی وہ کیفیت نفسی ہے۔ جس کی بدولت وہ ہر ایک حقیقت ابدی کو سمجھتا ہے تو افلاطون اس کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہ روح بھی ان حقائق کی طرح غیر فانی ہے۔ افرادِ کون و فساد کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے اور ان کے لئے غیر فانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر زندگی اور موت کا یہ تسلسل اور روح جو اس انتقالِ لامتناہی کا سبب ہے دونوں ابدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس ابدی روح سے افلاطون کی مراد روحِ کائنات تھی نہ زید، عمرو، بکر کی روح۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی روح تو خود اس فرد کی طرح موت اور زندگی کے سلسلے میں بندھی ہوئی ہے۔ اور نہ صرف حقائق ابدی کی فہیم ہے۔ بلکہ ان اوہام اور خواہشات کا مصدر بھی ہے۔ جو ہمارے فانی جسم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو پھر کسی ایک فرد کی روح کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ افلاطون کے دفترِ خیالات میں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ افلاطون کے نزدیک فلسفہ صرف ان نتائج کا نام ہے۔ جو غیر ہستیوں کے متعلق غور و فکر کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر فلسفہ سے کسی سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے تو صرف ایسے سوال کا جس کا تعلق ان غیر متغیر ہستیوں سے ہو اور بس۔ یوں تو تغیر پذیر حقائق کی نسبت کوئی سوال اگر کئے جائیں تو ان کا جواب کہیں نہ کہیں سے ضرور مل سکتا ہے۔ مگر فلسفہ ان جوابات کے متعلق اپنے علمِ حقائقِ ابدی کے ساتھ مقابلہ کر کے صرف یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں۔ یا غلط۔ اس لئے جہاں پر ہمیں کوئی ایسا مورخ یا پیشین گو نہ مل سکے۔ جو ہمیں کسی چیز کے ماضی یا مستقبل کے حالات سے آگاہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہمیں اپنے فہم کے موافق ایک افسانہ گھڑ لینا چاہئے جس کی کوئی بات علمِ حقائقِ ابدی کی مخالفت نہ کرتی ہو اور اس افسانے پر ہی اکتفا کرنی چاہئے۔ افلاطون کے مکالمات میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً دنیا کہاں سے پیدا ہوئی؟ تمدن کا آغاز کس طرح ہوا؟ افراد کی ارواح کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات درجۂ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ افلاطون بحیثیت ایک معمولی انسان کے ایک فرد کی روح کو بھی کسی حد تک ابدی مانتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنی اس قیاسی رائے کو فلسفے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی ریاضی کے سوال کا صحیح حل کسی کے سامنے پہلی دفعہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس حل کے صحیح ہونے کو فوراً پہچان لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ غالباً یہ بات اس شخص کو کسی پہلے جنم میں معلوم تھی۔ مگر وہ اسے بھولا ہوا تھا۔ جب اس کے سامنے وہ حل لایا گیا تو اس کی یاد تازہ ہو گئی اور اس نے فوراً صحت حل کو پہچان لیا۔ اس بات کے ممکن اور اغلب ہونے میں افلاطون کو کوئی شک نہ تھا۔ کہ ہر ایک روح جنم بدلتی رہتی ہے اور اس کے ہر ایک جنم کی نوعیت اس کے پہلے جنم کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عقیدہ، بدھ مذہب کا بھی ایک رکن ہے۔ بدھ مذہب اپنے پیروؤں کو مختلف جنموں میں نیکیاں جمع کرنے کے بعد آواگون سے رہائی اور اس زندگی کے رنج و کرب سے نجات کی امید دلاتا ہے۔ مگر افلاطون چونکہ بدھ کی طرح اس زندگی کو سراسر عذاب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے کبھی ایسی مکتی کا خیال نہیں کیا۔

فیثاغورثیوں کے علاوہ افلاطون، اپنے خیالات کے لئے ایک اور فرقے کا بھی ممنون تھا۔ اس فرقے کو فرقۂ ایلیائی کہا جاتا ہے اس کا بانی فرمانیدیس نامی ایک حکیم اٹلی کے جنوب میں شہر ایلیا کا باشندہ تھا۔ افلاطون نے اس حکیم کا ذکر اپنے ایک مکالمے میں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سقراط کی جوانی کی عمر میں اُسے ملنے کے لئے ایتھنز آیا تھا۔ ہرقلیطس کے مسئلہ تغیر کے متعلق فرمانیدیس نے خیالات ظاہر کیے وہ بالکل ہی متضاد جانب کو ہیں۔ ہرقلیطس کو اس دنیا میں ہر جگہ تغیر و حرکت کے آثار نظر آتے تھے۔ اور فرمانیدیس اس کو محض نظر کا دھوکا سمجھتا تھا۔ وہ سرے سے حرکت و تغیر کے امکان کا قائل نہ تھا۔ وہ کہتا تھا اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جب بھی کوئی چیز حرکت کرے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں وہ پہلے تھی کسی ایسے مقام میں جائے جہاں پر اس کے جانے سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقام ثانی پر اگر کوئی چیز پہلے موجود ہو تو وہ اس کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دے اور خود اس کی جگہ لے لے۔ مگر جب شروع سے کوئی خلا سرے سے موجود ہی نہیں تو حرکت کا آغاز ہی ناممکن ہے۔ فرمانیدیس کا یہ خیال تھا کہ نیستی، یعنی خلاء یا موجود فیہ یعنی نیست کے محل وقوع کی ہستی کا ذکر کرنا یہ کہنا ہے کہ نیست بھی ہست میں شامل ہے جو نتیجے کے سراسر خلاف ہے۔ نیست کا محل وقوع تصور میں آنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو تصور سے گزر ہو سکے حقیقت فرمانیدیس تسلیم نہیں کرتا۔ ان خیالات نے اس کو یہ کہنے کی جرأت دلائی کہ کسی قسم کی حرکت، انتقال یا تغیر سب ہماری آنکھوں کا فریب ہے۔ دراصل جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ ایک غیر متغیر غیر متحرک ناقابل انفعال حقیقت ہے جس کی وسعت ہر سمت اور ہر حصے میں یکساں ہے اور جس کے وجود کی سادہ ناشکستہ وحدت میں کہیں تقسیم حصص یا تفریق و تمیز ممکن نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا کا جو متلون نقشہ ہمارے حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اس یکرنگ مرقع سے بہت مختلف ہے۔ مگر ہمارے حواس جیسا کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ جو علم ہمیں ان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس کو ہمیشہ اپنے فہم و ادراک سے پرکھ لینا چاہئے۔ اور فرمانیدیس کے ادراک کا یہی فیصلہ تھا کہ حواس غلطی پر ہیں اور ہم فریب خوردہ ہیں۔

افلاطون جس کی طبیعت کی خواہشات کو یہ خیال کہ اس دنیا کو تغیر و گردش سے رہائی اور کامل سکون و استقلال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ بے دردی سے پامال کر دیتا تھا۔ قدرتی طور پر فرمانیدیس کے ساتھ ہم خیالی پر رضامند تھا اور اس کے فلسفیانہ عقائد کی رو سے ہر ایک حقیقت ابدی کو ان بے شمار محسوسات سے جن میں وہ مخلوط ہے اور جن میں گویا اس کا تکرار پایا جاتا ہے۔ وہی نسبت ہے جو فرمانیدیس کی واحد الوجود اور سالم الوجود حقیقت کو اس متلون اور سراپا فریب نظارہ سے ہے جس کی حواس ہمیں تلقین کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرمانیدیس وحدت حقیقت کا مبلغ ہے اور افلاطون کثرت حقائق کا قائل۔ یعنی افلاطون کے خیال کے مطابق عالم حقائق ابدی اور عالم محسوسات ان دونوں میں سے ہر ایک میں کثرت و تفریق ضرور ہے۔ علاوہ بریں افلاطون عالم صوری کو بالکل ہی موہوم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالم صوری ہست و نیست کے درمیان ایک برزخ ہے کیونکہ اس کا وجود نقلی ہے۔ مگر اس کی شکل وہ نہیں جو ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرمانیدیس اس کو بالکل خالی از حقیقت، عاری از وجود اور نیستِ محض خیال کرتا تھا۔

فرمانیدیس کا حرکت جیسے امر واقع سے انکار اس کے ہم عصروں کو اس کی سمجھ کا پھیر معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ عدم حرکت کو خلاف قیاس سمجھتے تھے۔

فرمانیدیس کے ایک مشہور شاگرد زینو نے اپنے آقا کے اس بظاہر خلاف قیاس نظریے کی حمایت یوں کرنی چاہی کہ جب ہم اس دعویٰ کے معترضین، "ظہور النفس حقیقت الامر" یعنی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم فرمانیدیس کے عقیدے جتنی خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم ادرۂ ثانے کا نامور جانباز اخلیس جو اپنی سرعت رفتار کے لئے مشہور تھا ایک کچھوے کے ساتھ دوڑے تو یہ کہہ دینا

بڑا ہی سادہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھوے سے آگے بڑھ جائے گا۔ فرض کرو کہ اکلیس کی رفتار کچھوے سے دس گنا ہے اور کچھوے کو شروع سے سو گز کی رعایت دی گئی ہے یعنی وہ پہلے ہی سے سو گز آگے کھڑا ہے۔ دونوں ایک ہی وقت دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ جب اکلیس وہ سو گز کا فاصلہ جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہے طے کر چکے گا تو کچھوا اتنے وقت میں دس گز آگے بڑھ جائے گا۔ اب اکلیس اور کچھوے کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہے۔ پھر جب اکلیس وہ دس گز طے کر چکا تو کچھوا اکلیس سے ایک گز آگے ہوگا۔ جب اکلیس وہ ایک گز طے کرے گا تو کچھوا ایک بٹا دس گز آگے ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس، بہرحال کچھوا اکلیس سے آگے ہی رہے گا۔ زینو کا ایک اور بھی اسی طرح کا معمہ ہے جس کو مسئلہ پروازِ تیر کہتے ہیں۔ جدید منطق کے اصولوں سے آشنا حضرات اس کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ تیر کا جب کہ وہ حالتِ پرواز میں ہو کسی خاص معین وقت پر نوٹ لیا جا سکتا ہے جس کا مطلب کہ وہ اس نقطۂ وقت پر جب کہ ہم نے اس کو دیکھا گیا ساکن تھا۔ اور چونکہ ہم جس وقت چاہیں اس کا نوٹ لے سکتے ہیں۔ اس لئے گویا وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کس وقت کرتا ہے۔ اس قسم کے معموں سے یہی ثابت کرنا مقصود ہے کہ ساحت اور مدت دونوں کو مسلسل اور ناقابلِ تجزیہ تصور کرنا چاہئے یعنی جس طرح ایک سطر نقطوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس طرح یہ منفصلوں کا مجموعہ نہیں ہوتے۔

بحث کا یہ طریقہ جس میں بحث کرنے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ فریقِ مخالف کی بات کو مان لینے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بعید از عقل ہیں، یونانیوں میں ڈائے لک ٹک (DIALECTIC ......) کے نام سے مشہور ہے۔ زینو اس کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ سقراط بھی اس فن میں پورا ماہر تھا۔ اور افلاطون تو اس کو اس قدر صحیح اور موزوں طریقۂ استدلال سمجھتا تھا کہ وہ بعض اوقات وہ ڈائے لک ٹک کے لفظ کو فلسفے کے معنوں میں بھی استعمال کر لیا کرتا تھا۔

افلاطون کے قدما میں سے انکساغورث کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکیم ملطی حکما کی طرح ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا مگر کچھ عرصے تک ایتھنز میں نامور سیاسی مدبر پرکلیس کے ساتھ بحث و صلاح کار و رفیق رہا۔ آخر کار جب وہ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ سورج اور چاند دیوتا نہیں بلکہ روحانیت سے بالکل مبرا اسی مادے کے بنے ہوئے معمولی اجسام ہیں جن کی کہ ہماری پائمال روندی ہوئی حقیر زمین تو (نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن ندارد) اس نے ایتھنز کی جمہوریت کا قہر و غضب نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اس زمانے میں (اور سقراط کے وقت میں بھی) جمہوریت حکومت کے مذہبی معاملات میں آزادیٔ خیال کو گوارا نہ کر سکتی تھی۔ بخصوص جبکہ انکساغورث اور سقراط کی آزاد خیالی کا اثر اعلیٰ طبقوں پر پڑتا تھا جہاں سے لوگوں کی حساس طبیعتوں کو ہر وقت سیاسی خرابی کا ڈر تھا۔

جیسا کہ ہم اس تحریر کے شروع شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ اولین ملطی حکما میں سے کئی ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ مگر ان کا یہ نظریہ اس عقدے کے حل کرنے میں ناکام رہا۔ کہ اشیاء کی کثرت اور ان کی خاصیات میں اس قدر تباین کیوں ہے۔

انکساغورث کا خیال تھا کہ پہلے پہل سب اقسام کی اشیاء ایک ہی غیر متفرق جمعیت کی حالت میں ہوتی ہیں، جہاں سے عقل یا نفس علیحدہ علیحدہ کر کے سب کو نظم و ترتیب دیتا ہے اور ہر ایک کو اس کی مختص جگہ پر متعین کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انکساغورث کے اس طرح نفسِ انسانی کو ایک مرتب اور ناظم کی اہمیت دینے نے سقراط کے دل پر بڑا اثر کیا۔ ترتیب نظامِ قدرت کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کو اور سب حکما کے طریقوں سے زیادہ امید دلانے والا معلوم ہوا۔ اور اس کے متذبذب دل کو اس خیال سے بہت سا اطمینان مل گیا

اس کو اس بات کی شکایت رہی کہ انکسا غورث نے اتنا کچھ کر کے یہ کیوں نہ بتایا کہ اس نظم و نسق کی تشریحات بحیثیت ہر ایک کے استعمالات کے کیونکر مقرر ہوتی ہیں۔ اس مسئلے پر اس نے خود اپنا دماغ لڑایا اور وہ ان پہلے شخصوں میں تھا جو جانداروں کے اجسام کی ترکیب اور ان کے اعضا اور قویٰ کی قابلیت کی ان کے ماحول کے ساتھ مطابقت کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے کہ یہ دنیا کسی رشحۂ عقل اور حکیم صانع کا کام ہے۔ اور یہ عالم عالم شعور ہے۔

(۳)

افلاطون کو اپنے آقا کے اس خیال کے ساتھ پورے طور پر اتفاق تھا کہ یہ دنیا عالم شعور ہے۔ اور مختلف حقائق بجائے ایک بڑے نظام کے عناصر ہیں جس میں ہر ایک حقیقت کا قیام اس فائدہ پر مبنی ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے متجسس ادراک کی تشفی صرف اسی خیال سے ہو سکتی تھی کہ تمام اشیاء ایک آسمانی ترکیب اور روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

چونکہ کسی باقاعدہ سوسائٹی کے اعمال، افعال اور اس کے افراد کے فرائض کا مناسب حل جب ہی معلوم ہو سکتا ہے جبکہ ان کا مقرر کرنے والا اس نظام عالم سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لئے افلاطون کے خیال میں کسی قوم یا جماعت کے حکام حقیقۃً فلاسفر ہونے چاہئیں۔ اپنی عظیم الشان تصنیف "جمہوریت" میں اس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطنت کے ان مدبروں کو کس قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔

افلاطون اپنی موت (۳۴۷ قبل مسیح) کے بعد ایتھنز میں اپنا بنایا ہوا ایک کالج چھوڑ گیا۔ جو بہت عرصے تک علوم اور فلسفے کا مرکز بنا رہا۔ آخر کار ۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین نے اس کا ذریعہ آمدنی ضبط کر لیا تو اس کالج کا خاتمہ ہو گیا۔ ان نوجوانوں میں سے جنہوں نے اس کالج میں خود اس کے بانی افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ایک ارسطا طالیس بھی تھا جس نے بعد میں وہ شہرت حاصل کی جو افلاطون کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص جبلی طور پر یا تو افلاطونی نقطۂ خیال کا ہوتا ہے یا ارسطا طالیسی۔ اور ان دو یونانی حکما کو بلحاظ ان کے رجحان اور طریقۂ فکر کی نوعیت کے قوت فکر کی دو متضاد اقسام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخیل کی بلند پروازی کی وجہ سے حقائق حیات کو چشم و گوش کے معلومات سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس کا توسن عقل و فہم اس میدان میں جولانی کیا کرتا تھا جو تجربے و مشاہدے اور حواس کی حدود سے باہر ہے۔ ارسطو کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی طبیعت افلاطون کی طرح آزاد نہ تھی۔ وہ عرصہ حکمت میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ اور منطق کی زبردست بندشوں اور حواس اور تجربے کی مدد سے ایسے نتائج پر پہنچتا تھا جن کا اثبات مشاہدے کی بنا پر ممکن تھا۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں کی نسبت یہ رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات فلسفے کا طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ افلاطون پکا منطقی تھا اور ارسطو اس قدر متقیہ اور محتاط نہ تھا جس قدر اس کو کہا جاتا تھا۔

ارسطو (پیدائش ۳۸۴ قبل مسیح۔ وفات ۳۲۲ برس قبل مسیح) افلاطون کے کالج کا ایک ممبر تھا۔ مگر وہاں کا طرز خیال اور طرز تعلیم اس کو پسند نہ آیا اور اس نے اس کالج کو چھوڑ کر خود ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس طرح کنارہ کش ہو گیا تھا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ بحث کو ہمیشہ ایک افلاطونی کی حیثیت سے شروع کرتا ہے اور آخر میں ان افلاطونی عقاید پر نکتہ چینی کرتا ہے جن سے اسے اتفاق نہ تھا۔ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ارسطو افلاطونی خیال کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو ان باتوں پر جس میں وہ اپنے استاد کا ہم خیال تھا بہت کم زور دیتا ہے ۔

ارسطو، افلاطون کی طرح اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ صحیح علم صرف حقائق ابدی کا علم ہے ۔ جن کی ہستی کی آگاہی ہمیں اپنے ادراک سے حاصل ہوتی ہے ۔ اور جن کو محسوس کرنے سے ہمارے حواس قاصر ہیں ۔ مگر وہ افلاطونیوں کی طرح حقائق ابدی (اعراض) کو ان اشیاء (جواہر) سے جن میں وہ "منقسم" یا "منقول" ہوتے ہیں ۔ علیحدہ نہیں سمجھتا ۔ افلاطون کو بھی ایسا اچھا طریقہ بیان نہ سوجھا جس سے وہ جواہر کی کسی ایک نوع کا تعلق اس عرض سے ظاہر کرے ۔ جو اگرچہ اس نوع کی سب اشیاء میں پایا جاتا ہے ۔ مگر پھر بھی بذاتِ خود اس نوع کے کسی ایک فرد سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے ۔ اس تعلق کو "شرکت" کا تعلق کہا جا سکتا ہے ۔ مگر اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ایک حقیقت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو مختلف اشیاء میں منقسم کیا گیا ہے ۔ بڑی چیزوں کو بڑا حصہ ملا ہے اور چھوٹی چیزوں کو چھوٹا ۔ جس طرح مختلف جسامت کے چند اشخاص ایک سائبان کے نیچے آ کھڑے ہوں تو ہر ایک کی جسامت کے مطابق سائبان کا تھوڑا یا بہت حصہ اس کے اوپر ہوگا ۔ یا دوسرے پیرائے میں ہم اس تعلق کو "نقل" کہہ سکتے ہیں ۔ مگر یہ فرض کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں ۔ اگر ہم دو اشخاص کے ایک ہی نوع کے دو افراد ہونے کو اس طرح سے تعبیر کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی نمونے کی دو نقلیں ہیں تو ان دو افراد میں سے ہر ایک کی اس مفروضہ نمونے سے ہم نوعی کی تعبیر کے لئے ایک اور نمونہ فرض کرنا پڑے گا ۔ اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا ۔ شاید یہ کہنا سب سے بہتر ہوگا کہ ہم اس تعلق سے اتنا ہی آگاہ ہیں جتنا کہ جزو کل یا اصل و نقل کے تعلق سے ہمارے اس تعلق کو بیان کرنے کی قابلیت یا ناقابلیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم اس تعلق کو زیادہ یا کم سمجھتے ہیں ۔

کئی لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حقائق مشترکہ محض زائیدہ خیال اور ہمارے وہم و گمان کی پیدائش ہیں ۔ مگر ارسطو کو اس بات سے انکار تھا ۔ وہ ان کی ہستی کا باتعلق دماغ انسانی قائل تھا ۔ ورنہ علم طبیعی جن میں اشیاء کے چند خواص مشترکہ پر بحث کی جاتی ہے موہوم باتوں کے سوا کچھ نہیں رہتے ۔ ارسطو نے مختصات کی دو قسمیں کی ہے ۔ مختصات ذاتی (مثلاً انسانیت وغیرہ) اور مختصات صفاتی (مثلاً عقلمند سفید یا عقلمندی وغیرہ) ۔ مختصات صفاتی مختصات ذاتی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں ۔ اور مختصات ذاتی صرف کلام میں افراد موضوع سے علیحدہ شمار کی جا سکتی ہیں ۔ ہر ایک فرد کی ایک مخصوص "شکل" (FORM) ہوتی ہے ۔ انسان کی شکل کو دوسرے الفاظ میں "روح" کہا جاتا ہے ۔ اس کا جسم جو تمام حرکات و افعال کے لئے روح کا محتاج ہے ۔ روح سے بالکل متضاد ہے ۔ اس کو "مادہ" کہتے ہیں ۔ جب بہت سی اشیاء ایک ہی نوع یا قسم کی ہوں تو کوئی قضیہ جو اس نوع کے ایک فرد کی نسبت قائم کیا جا سکتا ہے اور جو مستقل وقعت رکھتا ہے ایسا نہیں ہوتا جو اس نوع کے کسی اور فرد پر بھی صادق نہ آئے ۔ ایسے قضایا کو "کلیات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

ارسطو کے مطابق صرف اس دنیا میں ہی بہت سی اشیاء ایک قسم کی ہوتی ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اشیاء کی ترکیب عناصر اربعہ ۔ خاک، آب، آتش، باد سے ہے (ان چار چیزوں کو سب سے پہلے امفداقلیس نے جو چھٹی صدی میں سسلی کا ایک ذی اقتدار فلاسفر تھا ۔ عناصر قرار دیا ۔ روایات کی رو سے اس فلاسفر نے اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ اٹنا کے دہانے میں پھینک دیا تھا تاکہ اس کے اس طرح ایکا ایکی غائب ہو جانے سے وہ لوگوں میں دیوتا شمار کیا جائے ۔) یہ عناصر اربعہ جو چار خواص بنیادی ۔ حرارت ۔ برودت ۔ رطوبت ۔ یبوست سے پیدا ہوگئے ہیں ۔ مختلف تناسب میں ترکیب پا کر مختلف اجسام بن جاتے ہیں ۔ اور عناصر کے باہمی تضاد کی وجہ سے وہ اجسام ہمیشہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں ۔ یہی افراد کی تکثیر کی وجہ ہے ۔ اور تسلسل افراد سے ہی نوع (نہ کہ فرد) بقا حاصل کر سکتی ہے ۔ کائنات کے بالائی طبقوں میں ہر ایک آسمانی جسم اس مرکب مادے کا نہیں بلکہ ایک اعلیٰ عنصر خاص کا بنا ہوا ہے ۔ اس لئے وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا ۔ وہ اپنی نوع کا ایک ہی فرد ہے ۔ اس لئے اس کی بقا کے لئے اس کی

نوع کے اور افراد کا تسلسل ضروری نہیں۔

اس مختصر بحث سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ارسطو نے اپنی توجہ زیادہ تر حیوانات اور نباتات تک ہی محدود رکھا۔ اسی سے اس نے اخذ کیا اور حرکت کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ غیر ذی روح اشیا کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکت کا منبع قرار دیا تھا۔ مگر ارسطو ذی روح اشیا کی حرکت کو خود نمائی سمجھتا تھا۔ ذی روح ... ہمیشہ مادہ واقعی حرکت ہوتی ہے یہ علت تصادم سے تو نہیں مگر ان اجسام کی خواہشات کو اکسانے سے ان کی حرکت کا باعث ہوتی ہے۔ اور اس نے ضروری خیال کیا کہ وہ خود متحرک ہو کیونکہ خواہش ایسی چیز کی بھی ہو سکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے محض بے خبر ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بالآخر تمام اشیاء کی حرکت کا منبع ایک ایسا غیر متحرک محرک ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود ان کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متحرک محرک خدا ہے۔ وہ افضل خدا دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے۔ جس طرح کوئی محبوب اپنے عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیا اس کی طرف کھنچ کر رہ جاتی ہیں وہ کسی کی طرف کھنچ کر نہیں آتا۔ ایسی کامل اعلیٰ اور بے نیاز ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ شغل علم ہے اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایان ہو اس کی اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کو بنانے والا نہیں۔ دنیا ازلی اور ابدی ہے۔ نہ ہی وہ دنیا کی روح ہے۔ وہ اکمل ذات ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کوشاں ہے۔

ان اشیا کی حالت میں جو غیر ابدی ہیں اور جو ایک غیر مکمل صورت ہے۔ ایک دوسری مکمل تر صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ارسطو ان کے ارتقا کے ادنیٰ ترین مدارج کا پتہ اس انتہائی صورت سے لگاتا ہے۔ جس کی طرف ان ارتقا کا رخ ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی علت غائی بلحاظ اپنی جنس کے تکمیل حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ کہ وہ انسان کے لئے مفید ترین ثابت ہوں۔ ارسطو نے علل کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ علت مادی۔ علت صوری۔ علت فاعلی اور علت غائی۔ جو غیاث اللغات مصنفہ محمد غیاث الدین میں لکھا ہے "علت کہ آن را سبب نیز گویند بر چہار قسم است۔ سبب در مسبب داخل بود یا خارج۔ اگر داخل بود بالقوۃ۔ آن را علت مادی گویند بہ تقدیر دال چوں نسبت چوب با سریر۔ و اگر داخل بود بالفعل آن را علت صوری گویند۔ چوں صورت سریر کہ مربع باشد یا مسدس۔ و اگر خارج بود و اگر آن سبب موجد اوست۔ آن را علت فاعلی گویند چوں نجار۔ اگر ایجاد برائے آن است آن را علت غائی گویند۔ چوں جلوس بر سریر۔ پس علت غائی در ظہور مؤخر از ہمہ علت ہاست و در ذہن و تعقل از ہمہ مقدم۔ ...... علت غائی غایت و غرض و منتہائے جمیع علت ہائے اربعہ است ...... و بدانکہ اطلاق علت غائی در افعال حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ روا ندارد چرا کہ حق تعالیٰ در خلقت اشیا محتاج بغرضے نیست۔" اگر بنظر دقیق دیکھا جائے تو سوائے علت مادی کے باقی علل ثلاثہ مائل بہ انطباق معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ نجار اسی حد تک علت سریر شمار کیا جا سکتا ہے جس حد تک وہ تخت کو ایک مخصوص شکل دینے کا باعث ہو۔ اور اس کی صنعت کا استعمال (علت غائی) بھی وہی ہے جو اس شکل کی ایک لکڑی کی بنی ہوئی چیز کا ہو سکتا تھا۔ گویا علت فاعلی اور علت غائی علت صوری کے دو متشابہ پہلو ہیں۔

یہ نظام علل اربعہ پھر وہی بات ظاہر کرتا ہے کہ تمام غیر ابدی اشیا کے دو متباین پہلو ہیں۔ اول مادہ جو ایک مخصوص شکل پا کر ایک مخصوص چیز بن جاتا ہے۔ دوم صورت جس کی بدولت ہر ایک چیز اپنا جنسی یا نوعی نام پاتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اشیا جو خود ایک خاص شکل و صورت

بلکہ یہ ہیں دھات سنگ مرمر یا کسی دوسری حالت میں کسی اور چیز کا "مادہ" ہو جائیں۔ مثلاً سنگ مرمر کا بت۔ مادہ بغیر شکل و صورت کے نہیں مل سکتا۔ ایسی حالت میں اس کی ہستی ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے خدا ارسطو کے خیال میں نری شکل بغیر مادہ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ارسطو اگر کسی شغل کو خدائی شان کے شایاں سمجھتا تھا تو وہ ایک تفکر محض ہے۔ اسی لئے وہ انسان کے لئے اس کو اعلیٰ ترین اشتغال جانتا تھا۔ وہ یہی تصدیق "اخلاقیات" میں کرتا ہے کہ مخصوص طور سے ہی انسان اپنی سب سے بڑی قابلیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی بات میں اس کو دوسرے باشندگان زمین پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی مسرت ہی کا باعث ہو سکتی ہے چونکہ انسان اور ان عقل نہیں بلکہ اندر کی دو حیوانیت کا ایک مجموعہ مرکب ہے۔ اس لئے یہ مسرت علمی مشاغل اور معاشرتی فرائض کی پابندی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً ایک حیوان متمدن ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سوسائٹی میاں بیوی اور بچوں کی ہی ہو۔ مگر ارسطو جس کو سب سے اعلیٰ زندگی سمجھتا تھا وہ صرف آزاد شخصوں کے مہذب فنون میں ہی پائی جاتی ہے۔ اور اس کا اپنے علم اور تقدیر کی بنا پر یہ خیال تھا کہ صرف یونانیوں کی نسل ہی ایک ایسی زندگی کے قابل ہو سکتی ہے۔

اپنی "سیاست" میں ارسطو نے اسی قسم کی مدنیت کے آئین کا نقشہ کھینچا ہے۔ اگرچہ اس کے اپنے ہی ایک شاگرد سکندر اعظم کی بادشاہت میں یونانی خود مختار حکومتوں کے اتحاد سے ایک وسیع سلطنت کے قیام سے یونانی دنیا کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ مگر ارسطو کو کبھی اس انقلاب کا خیال نہ آیا۔ اس کے نزدیک بہترین ایک مہذب حکومت وہی ہے جو ایسے ہی کسی خود مختار دولت مشترکہ میں ہو سکتی تھی جس کی حدود ایک شہر اور اس کے مضافات کی حدود سے متجاوز نہ ہوں۔ اور جہاں تک بن پڑے چھوٹی ہو تاکہ اس کے تمام باشندے معاملات جمہوریہ میں ذاتی حصہ لے سکیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ شہریوں کو اس بات کیلئے فرصت کہاں سے ملے۔ سو اس کے لئے ارسطو کہتا تھا کہ اپنا روزمرہ کا کام غلاموں کے سپرد کر کے حکومت کیلئے وقت نکالنا چاہیئے۔ طریقہ غلامی کو ارسطو جائز اور قدرتی امر سمجھتا تھا کیونکہ بعض انسان قدرتی طور پر حکومت خود اختیاری کے ناقابل ہوتے ہیں۔ قوموں کی قومیں اپنی اس ناقابلیت کا اظہار بعض اوقات اس طرح سے کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے لئے ایک خود مختار حکمران انتخاب کر لیتی ہیں جس کی وہ غلاموں کی طرح خدمت کرتی ہیں۔ آزاد دولت مشترکہ میں سیاسی مساوات حقیقی مساوات کی بنا پر ہونی چاہیئے۔ اگر سوسائٹی کا کوئی ممبر اپنی ذہنی برتری کی وجہ سے باقی سب پر فوقیت رکھتا ہو تو سب کو چاہیئے کہ اس کو اپنا قدرتی حاکم مان لیں۔ علاوہ بریں تمول اور افلاس کی تمیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افلاطون کہتا تھا کہ ہر ایک چیز تمام افراد جمہور کی ملکیت مشترکہ ہے اور سلطنت کے "سرپرست" خواہ وہ مرد ہوں یا عورت کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاوند۔ اپنی بیوی۔ اپنا بچہ۔ اپنی ماں۔ اپنا باپ تک نہیں کہہ سکتے۔ مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ وہ عام چیزوں یا ریاست اشتراکیت کے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ دو قریبی دوست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو وہاں بدنظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ اور نہ ہی اس طرح سب کو حقوق مساوی دینے سے اتحاد و موافقت کے بڑھنے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے ارسطو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولتمند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ وہ روپیہ والداروں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ لوگ نکموں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں۔ مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بنا سکتے۔

"پطرس"

کہکشاں۔ مارچ ۱۹۱۹ء

سر محمد اقبالؒ

وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا

اقبال کی وفات سے ہندوستان ایک جلیل القدر شاعر سے کہیں زیادہ باعظمت ہستی سے محروم ہو گیا۔ وہ بلاشبہ ایک عالم تھے۔ تاریخ، فلسفہ اور مذہب کے سرگرم طالب علم کے بھی ان لوگوں کے لئے جو اپنی محدود قابلیت کے سبب اس کی علمی شاعری تک رسائی سے قاصر تھے، محض ایک شاعر کی حیثیت سے موجود تھا۔ بطور شاعر اگرچہ اس کا مقام نہایت بلند تھا لیکن ادبی اور عوامی دنیا میں افکار و فلسفہ کے لحاظ سے اس کا مقام اس سے بھی بلند تھا۔ اس کی ذات سے جہاں ہندوستان سے ایک فصیح اللسان شیریں بیان اور ایشیا کی تہذیب کا ایک بہت بڑا شارح چھین لیا گیا وہاں اردو شاعری سے خدا معلوم کتنی دیانت، ہمت اور منزل مقصود چھن گئی۔

کم و بیش چالیس سال گذرے جب اقبال کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت اردو شاعری اپنے زوال پر تھی۔ ہر کس و ناکس بس سے ملذت اندوز ہوتا تھا۔ اس کا مقصد خود زندگی نہیں بلکہ محض زندگی کے حاشیے کی زینت سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مقبول عام فن تھا لیکن محض فن کی خاطر اختیار کیا جاتا تھا۔ اس وقت شاعری کیا تھی؟ محض جذبات انگیز عیاشی، نازک اور نازک ادا، غم و حزن، خوشامد و تعریف یا مذاق۔ اس سے اس کے احیا کرنے میں سنجیدگی اور متانت سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔

لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا احساس کروٹیں لے رہا تھا اور لوگوں کی زبان پر تعمیرات ملت اور ترقی کے الفاظ آنے شروع ہو گئے تھے۔ ان میں جو زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے، انہوں نے آرٹ کو پھر ڈھونڈ نکالا کیونکہ بھی انسان کے زیادہ اہم مشاغل میں سے ایک ہے اور اس کو اعلیٰ سنجیدگی اور مقصد و مدعا سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ حالی اپنا غزل گو عہد شباب کی ہوس کاریوں سے تائب ہو کر مشہور زمانہ مسدس کا مصنف بن گیا۔ جس نے خواب غفلت کے متوالے ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ کہ کوئی ایک نظم نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسا کر سکی۔ انہی حالات میں اقبال جس نے اسی فرسودہ ڈگر پر اپنی شاعری شروع کی تھی محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل مسلمانوں کے احیا اور ان کی نئی زندگی کے خواب سے مضطرب اور بے قرار ہے۔

ہندوستان ہمارا اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی جو اس رجحان کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس کے دل و دماغ سے بے تاب دل اور اپنے وطن کے لئے جذبات محبت کا پتہ لگتا ہے۔ اس کی نظم

"سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے"

اب تک فرقہ وارانہ اتحاد کی سب سے زیادہ پُر اثر اپیل ہے۔ جو کسی محب وطن کے قلم سے نکلی ہو۔ اور اس کا مشہور ترانہ گیت "ہندوستاں ہمارا" جیسے

خیال میں بہترین قومی گیت ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور جس سے بہتر گیت کی شاید ہی ہندوستان کو کبھی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہب اسلام کے مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا اس کے افق خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور ملک کی نسبت سے قوموں کا تصور اس کی نظر میں کے خلاف تھا۔ اپنی شاعری اور اپنی گفتگو میں وہ ہمیشہ یورپ کی مثال دے کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں تقسیم کرنے کی بیہودگی ثابت کیا کرتا۔ وہ ایک ایسے تمدن نصب العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے۔ جو زندگی کو ایک مقصد و مدعا بخشے کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا با مقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت اصلی کا جزو لاینفک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور با مقصدیت انہیں نظر آئی تو اسلام میں، یا چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں جن سے وہ بے دریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا۔

مجازی خیالی دنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گزر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں تاہم اس میں ایک خاص قسم کی کیفیت موجود ہے ہم میں شاید ہی کوئی فن کار یا ادیب ایسا ہو جس کے فن میں گھر کے لئے اداسی سلطنت مرحوم کے موجود ہو۔ ہم دور دراز خیالی دنیاؤں کے آرزومند ہیں۔ اور خواہ وہ دنیائیں خیالی ہوں یا حقیقی۔ ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندر ایک بے پناہ دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پُر شوق نظر ڈالی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم و استقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلندیوں کو منزل بہ منزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے ان شرائط کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب از اسلامی تعلیمات اس کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدردان اس سے چھن گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدر اور اس کے اعتقاد کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے۔ اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو صرف اس لئے ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز نہ ہوں کہ وہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیئر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کے شاہ پرستانہ خیالات کو پسند نہیں کرتے لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو کولرج کے لفظوں میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت "انکار کو عمداً معطل کر دیتے ہیں۔" اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

فارسی اور اردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے۔ اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرار خودی کا ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے، انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کو ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظمیں اردو میں لکھیں خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑتا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا (اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا) اسی لئے اس کے یو۔ پی کے نکتہ چیں اس کو ہمیشہ یہ حقیقت ایسے لفظوں میں یاد دلاتے رہے جن میں انصاف کم اور تلخی زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو ٹکسال باہر ہونے کا طعنہ دیتے رہے۔ اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ داغ کا معنوی فرزند تھا۔ جو اردو زبان کا مسلمہ بادشاہ مانا جاتا ہے۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینوں کو جلدی خاموش کر دیا۔ اور اس کی طرز شاعری کے بے شمار پیرو ملک کے طول و عرض میں پیدا ہو گئے۔ اگر افراد کے وسیع اثرات کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اس ضمن میں تین ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو ترقی اور ممتاز صورت بخشی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زوردار اور لچکیلی زبان سے مالا مال کیا جس سے وہ پہلے قطعاً نا واقف

تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، فراوانی اور شیریں بیانی بخشی جس کا راز انہوں نے عربی زبان سے مطالعہ کرتے وقت پالیا تھا لیکن چھوٹے چھوٹے مضامین یا پُر اثر نظموں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ دیرپا اثر رکھتی ہے ورنہ شاعر زبان پر زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جدید اردو کے بنانے والوں میں اقبال (اور اسی طرح اس کا پیش رو غالب) ابھی تک سب سے نمایاں اور زبردست اثر ڈال رہا ہے۔ جو اس نے ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادانِ فن نے گھڑے یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لئے آج بھی اردو تحریر اور تقریر میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ: صوفی، یاسمین تبسم)

ولٹن صاحب اور میں

نتھیا گلی شمالی مغربی سرحدی صوبے کا ایک پہاڑی مقام ہے جو [illegible] سرسبز پہاڑیوں میں ۸ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ مری کی پہاڑیوں سے ایک نہایت معمولی سڑک [illegible] جاتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں تہذیب کی [illegible] ہوں۔ وہاں کے گھنے جنگل بہت حد تک تہذیب کی بے ہودہ تعمیر کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ قدرت کی شان و شوکت کے مظہر [illegible] آسمان بوس عظیم الشان درخت لاکھوں کی تعداد میں اپنی مہیب خاموشی میں کھڑے ہیں۔ [illegible] قدرتی [illegible] کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہاں کی آبادی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کشمکش حیات [illegible] وہاں بہت کم ہوتے ہیں۔ [illegible] نتھیا گلی [illegible] رنگ آمیزیوں نے [illegible] کو [illegible] بنا رکھا ہے۔ [illegible] کے لحاظ سے تو میں [illegible] ہے۔ اس نے مجھے [illegible] سے [illegible] ترتیب دی۔ [illegible] طبیعت کی خواہشات کے مانع ہے۔ لیکن گزشتہ برس کے موسم میں [illegible] ایک [illegible] بھی تھی جس نے مجھے نتھیا گلی جانے پر مجبور کر دیا۔

میں نے مجبور کا لفظ استعمال کیا ہے۔ گو میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جگہ مجھے کسی طرح ناگوار نہ تھی۔ ولٹن صاحب جن کو میں دوست کہنا تھوڑی سی لاف زنی اور دوست کے علاوہ کچھ اور کہنا [illegible] غلط بیانی سمجھتا ہوں۔ گزشتہ موسم گرما میں باڑہ گلی میں مقیم تھے اور انہی کے قرب کی خواہش مجھے کشاں کشاں نتھیا گلی لے گئی۔ باڑہ گلی نتھیا گلی سے پانچ [illegible] میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا پہاڑی مقام ہے جس میں ایک ہوٹل، تحصیل، [illegible] بازار، کچھ [illegible] اور ڈاک بنگلے کی موجودگی نے اسے تھوڑی سی اہمیت دے دی ہے۔ ولٹن صاحب اسی ہوٹل میں رہتے تھے اور میں نتھیا گلی میں خواجہ محمد حسین کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نتھیا گلی کا بازار بمشکل پانچ چھ دکانوں پر مشتمل ہے جو ضروریات زندگی مہیا کر سکتی ہیں۔ اور بس۔ یہ دکانیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر بلندی کی طرف واقع تھیں اور ڈاکخانہ [illegible] سے شاید اس کی عمارت [illegible] ذرا فاصلے پر تھی۔ سڑک کے دوسری طرف اسی موڑ پر ڈاکخانے اور دکانوں کے مقابل بازار سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر دس بارہ قدم چڑھنے کے بعد خواجہ محمد حسین کی کوٹھی تھی جس کی سرخ چھت اور برآمدے کے خوشنما پتھر کے ستون اپنی بلندی پر [illegible] دکانوں اور [illegible] ڈاکخانے کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ہفتے کے دن دوپہر کے قریب میں اسی برآمدے میں بیٹھا خواجہ صاحب کے دفتر سے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح سات بجے سے بارش بہت زور شور کی ہو

رہی تھی۔ اندھیرا ان کو روح افزا کیفیت عطا کر رہا تھا۔ لطیف سماں۔ پرے اور نیچے وادی میں دور تک [illegible] بارش
کے قطروں میں سے میں سامنے کی ڈھلوانوں کو دیکھ رہا تھا۔ [illegible] اس شدید بارش میں [illegible] پہنچے تھے۔ بارش کے مسلسل
ترنم سے میرے دماغ میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا اور میرے خواب بیدار ہو گئے [illegible] صفات پیدا کرتا ہے۔ وہ عیسائی ہیں
مسلمان۔ وہ انگریز ہیں ہندوستانی۔ ان کی زندگی آزاد اور خود مختار ہیں [illegible] کے بعد [illegible] کارفرما تھی۔ جو جاننے والی
دنیا میں ان کی تھی اور میں [illegible] اس قدر تفاوت کے [illegible] ہے۔ [illegible] نے بھی ایک دوسرے
سے بہت مایوس کر دیا تھا۔ ایک اپنی نسبت تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ [illegible] سے مجھے [illegible] طریقے سے [illegible]
ان کے متعلق میرے جذبات میں [illegible] جاتی ہے۔ [illegible] کی نسبت میں [illegible] کر سکتا ہوں
مجھے شرف بخشا میری کسی صفت کی بدولت ہے یا محض ان کی [illegible] ہے۔ وہ مجھ سے [illegible] سال بڑے ہیں [illegible]
سامنے اس طرح سمجھ جاتا ہوں جیسے [illegible] ستارے [illegible]۔ اور [illegible] بے تکلف ہو جاتا ہوں جیسے وہ اور میں بچپن سے برسوں کے
کھیلتے رہے ہوں۔

میرے خیالات یہاں تک پہنچے ہوں گے کہ [illegible] اور میں نے [illegible] ہاتھ میں سگریٹ بجھ گیا۔
مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی [illegible] اور سگریٹ جلاتے ہوئے میں نے [illegible] باندہ گل [illegible] طرف دیکھا۔ پکڈنڈی
پر [illegible] ایک سوار [illegible] کی طرف آ رہا تھا۔ [illegible] جب وہ [illegible] کے سیاہ
ننگے پاؤں مجھے رکابوں میں نظر آئے تو معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] میرے [illegible] اس کا [illegible]
تار کر ہاتھ میں ڈال لیا۔ اور ہماری کوٹھی کی طرف چڑھنے لگا۔ میں پہلے سے زیادہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

قریب آ کر اس نے مجھے ایک لفافہ دیا جس کا بڑا حصہ [illegible] تھا [illegible] سے کوئی پرچہ [illegible] خط ولیمز
صاحب کا تھا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ کو [illegible] ویلش صاحب [illegible] کرتے تھے [illegible]
[illegible] اور اس وقت [illegible] کر اس کا ترجمہ کر رہا ہوں۔
باندہ گل

پیارے امجد!
سواری کا لباس پہن کر فوراً یہاں آ جاؤ اور اپنے ساتھ [illegible]
چھ فالتو کارتوس، میرے کمرے کی چابی اور پانچ چھ نوٹ میرے لیتے آؤ۔

تمہارا مخلص
"ایچ۔ ڈبلیو۔ ویلش"

میں فوراً اندر گیا اور جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ٹرنک کھول کر اس میں سے چھ کارتوس نکالے۔ تکیے کے نیچے سے
اپنا بھرا ہوا پستول اٹھا کر برجس کی جیب میں ڈال لیا۔ نوٹ میرے [illegible] سے چھ [illegible] سے [illegible] جب
کمرے کی چابی اٹھائی (ویلش صاحب نے اپنے کمرے کی ایک چابی مجھے دے رکھی تھی کہ بعض اوقات جب پہاڑیوں میں پہنچے

پھر تمہ باندہ گلی کے قریب جا نکلتا، اور رشک کرتا۔ پھر کی ضرورت محسوس کرتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کا کمرہ کھول کر وہاں بیٹھ جایا کرتا۔ سب چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر احتیاطاً پھر پڑتال کی اور برساتی کوٹ پہنتا پہنتا باہر نکلا۔ نوکر کو خواجہ صاحب کے نام پر ایک رقعہ اس مضمون کا لکھ کر دیا کہ مجھے خدا جانے کس وقت واپس آؤں۔ آپ چائے اور کھانے پر میرا انتظار نہ کریں۔ یہ سب کچھ کر کے گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ باندہ گلی کو روانہ ہو گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد اس چھوٹی سی سطح مرتفع پر پہنچ گیا۔ جہاں باندہ گلی کا ایک رویہ بازار، ہوٹل، ڈاک بنگلہ وغیرہ ایک مسلسل مانصفت دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ باندہ گلی کا بنانا بالکل نتھیا گلی کا سا ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک حلوائی کی چھوٹی سی دکان، اس کے ساتھ سیٹھ فیروز جی نوتراب، تمباکو، قلم، کاغذ، پنسل وغیرہ کا سٹور، پھر اس کے ساتھ ایک کنجڑے اور پھر شاید ایک بنئے کی دکان تھی۔ باقی قطار میں کچھ فاصلے پر تحصیل، تھانہ، کچہری اور سامنے ڈاک بنگلے کی چھوٹی سی چوکور عمارت تھی۔

بائیں ہاتھ کو باندہ گلی ہوٹل بھوکے پیاسوں کے لئے اپنی آغوشِ شفقت کھولے بغیر کسی تکبر اور غرور کے کھڑا تھا۔ باندہ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ گھوڑے کو اصطبل میں سپرد کر کے سیدھا ۲۵ نمبر کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کو دھکیلا، لیکن دروازے کا تالا بند تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ویلیٹن صاحب نے کیوں مجھے چابی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ خیر دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک سفید رنگ کا کارڈ تھا۔ جو انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک پھولدان کے سہارے کھڑا تھا اور جس پر سرخ پنسل سے ویلیٹن صاحب کے ہاتھ کے دو فقرے لکھے ہوئے تھے۔

"میرا پتہ منیجر سے پوچھ لو ——— یہ کارڈ جلا دو۔"

میں نے ان دو فقروں کو شاید چھ دفعہ پڑھا۔ جیب سے دیاسلائی کا بکس نکال کر کارڈ جلا دیا۔ اور دروازے کا تالا پھر بند کر کے منیجر کے کمرے کی طرف آیا۔

میں نے جلدی سے منیجر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لیکن جس تیزی سے میں نے اسے کھولا، ہرگز اس تیزی سے اسے بند نہ کر سکا۔ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک اور منیجر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں بازو میز پر تھے اور اس کا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جان ولیم کو دو تین سال سے جانتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے ویلیٹن صاحب کو اس سے خاص انس تھا۔ جس کی بدولت مجھے جان ولیم سے ہزار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں اس سے جب ملا اسے مسکراتا ہوا پایا۔ جب اس نے مجھ سے بات کی مجھے ہنسا کر ہی گیا۔ آج اس کو اس قدر مغموم دیکھ کر مجھے بہت ترس سا آیا۔ میں نہایت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھا۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی۔ اس پر اپنی ٹوپی اور برساتی کوٹ کو پھینک دیا اور نہایت نرم آواز میں پکارا "ولیم!"

ولیم نے میز پر سے اپنا سر اٹھایا اور اگر مجھے اس کے غمزدہ ہونے میں کوئی شک تھا تو وہ سب رفع ہو گیا۔ اس کا چہرہ تبسم سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہونٹ ایک رحم طلب انداز میں ذرا نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ——

"ویلیٹن صاحب ۱۲ نمبر کمرے میں ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیے اور پوچھا:۔

"ڈیم! تم آج اس قدر فکر مند کیوں ہو؟"

کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں اپنے کاروبار کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔"

اور سر نیچا کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"ڈیم! تمہیں غمزدہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ مگر تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرو۔"

شاید میرے خلوص اور صداقت نے اس پر اثر کیا۔ ایک آدھ منٹ تک وہ کچھ نہ بولا۔ اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے کوٹ کے ایک بٹن سے غافلانہ کھیلتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہا۔

"آپ کسی سے کہیں گے نہیں؟"

"مجھ پر یقین رکھو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔"

"ہوٹل میں ایک قتل ہوا ہے۔"

"قتل! کب؟ کس کا قتل؟"

میں حیران تھا کہ آج دو بجے سے جو بات ہو رہی ہے غیر معمولی، جو واقعہ پیش آتا ہے۔ فوق العادت۔ پہلے وٹنی صاحب کا پراسرار خط پھر اس کارڈ پر وہ پراسرار تحریر اور اب یہ قتل کی خبر۔ میں نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دل میں پریشانی میری انگلیوں کی مضطربانہ حرکات سے ظاہر تھی۔ ڈیم کی آواز نے آخر کار مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

"۱۲ نمبر میں براؤن نامی ایک شخص دو مہینے سے یہاں رہتا تھا۔ کل شام کو چار بجے ہوٹل میں چائے پینے کے بعد وہ سیر کو نکلا اور کھانے کے وقت تک واپس نہ آیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ واپس کس وقت آیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے آ کر کھانا مانگا اور نہ رات کے دس بجے تک اس کے کمرے میں کسی نے لیمپ ہی جلتے دیکھا۔ جیسا کہ عام دستور ہے صبح سات بجے وہ چائے پیا کرتا تھا۔ آج صبح حسب معمول نوکر اس کے کمرے میں چائے لے کر گیا تو دیکھا کہ خواب گاہ از حد بدنظمی اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ تمام چیزیں الٹ پلٹ پڑی ہیں اور براؤن اپنے بستر پر بغیر کسی اوڑھنے کے ڈریسنگ گون پہنے بظاہر سویا پڑا ہے۔ وہ اسے جگانے کی غرض سے نزدیک گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک بڑا سا مہیب زخم ہے۔ اس کا رنگ بالکل زرد اور اس کی آنکھیں کھلی اور پتھرائی ہوئی ہیں۔ دفعتہً نوکر پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے ایک سویا ہوا آدمی نہیں بلکہ ایک مرا ہوا آدمی پڑا ہے۔ نوکر بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں براؤن کی موت کی خبر سنائی۔

میں اس کے ساتھ بارہ نمبر کمرے میں گیا اور حالات کو بعینہٖ ویسے پایا جیسے کہ اس نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ مسٹر احمد! آپ خیال فرمائیے کہ اس ناگوار واقعہ سے میری اور میرے ہوٹل کی نیک نامی پر کس قدر برا اثر پڑے گا۔ اس وقت میرے ہوٹل میں سو کے قریب آدمی رہتے ہیں مگر اس واقعہ کے مشتہر ہو جانے کے بعد آپ یقین رکھئے کہ ایک شریف آدمی بھی یہاں قدم نہ رکھے گا۔ وہ کہاں رہیں؟ اس ہوٹل میں جہاں لوگ بلا وجہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؟ جہاں مال کا نہیں جان کا خطرہ ہوتا ہے؟ میں کچھ بڑا ہی بدقسمت ہوں اور مجھے نہیں معلوم میری بدقسمتی کا خاتمہ کب تک ہوگا۔ آپ کو علم ہوگا جب میں اور میرا بھائی ہندوستان آئے تو پہلے پہل ہم نے دہلی میں مشترکہ سرمایہ سے ایک ہوٹل کھولا لیکن مقدر نے

عرصے کے بعد میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ جو میں کر سکتا ہوں کروں۔ اس کی عادت مجھے پسند نہ تھی۔ اس کی سرکشی اور ضد ان تمام باتوں کی ذمہ دار تھی جو تکلیف دہ اور مضرت رساں تھیں۔ بجائے اس کے کہ اس طرح ضد کر دینا مجھے صحت مند طریقہ معلوم ہوتا تھا اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ بہرحال ایک بہت ہی یاد گار واقعہ میں لکھنا ہوں کا متحمل نہ ہو سکا۔ ایسے پھر ایک میں نے اس جگہ ہوٹل کھلوایا۔ اب حال یہ تھا کہ جب آپ یہ ہوٹل بھی نہ جائے تو بلیک میں جگہ پر جا دوں۔

قیمتی دستاویز سے میں ابھی تک آزاد ہوا کہ باوجود اس کے بات یہ تھی کہ میں اس کے پاس سے بہت جلد چلا جاتا ہوں۔ ہزاروں طرح کے سوالات جیسے دل میں تھے کہ میں نے سب اور بات کہا۔

ہم خفا تھے۔ سعادت کے نتیجے ہو سکتا ہے وقت کو پتہ بہت جلد چل جائے گا۔ تم ذرا حوصلہ کرو۔ تم سے کہا کہ دو مینی صاحب ہیں جی!

”ہاں بیٹا آپ کا فرصت ہیں فیصلہ کرنے کے لئے جانا ہے؟“

میں ”نہیں!“ لیکن وقت ملے ”اچھا“ کہہ کر باہر نکل آیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور نیچے بڑے بادلوں میں سے نیلا نیلا آسمان کہیں کہیں سے نظر آ رہا تھا۔

دوسرے دن کی شام سات بجے کمرے میں داخل ہوا تو پہلے سونے کے کمرے میں گیا۔ بستر پر ان کی لاش ایک سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ یہاں سے جب نشست گاہ میں گیا اس وقت داخل ہوا جس وقت دلائل صاحب کو سیٹ پر سے اٹھا۔ ایک کرسی پر بیٹھے سگرٹ نکال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سگرٹ کیس میری طرف بڑھایا۔ سگرٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے ہیں سلائی جلائی گئی کہ دلائل صاحب بولے:۔

”اچھا۔ تو تم ساڑھے سات بجے سے یہاں آئے ہو؟“

”ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

وہ سگرٹ جلا چکے تو دیا سلائی کو انگیٹھی میں پھینک کر کہا:۔

”جس وقت تم گلی سے چلے تو بارش ہو رہی تھی نا؟“

”موسلا دھار“

”تو تمہارا بارانی کوٹ کہاں ہے؟“

”وہ تو . . . . . میں نیچے کمرے میں بھول آیا ہوں“

”اور تم وہاں ہر کرتے ذرا بول آتے اور تم مجھ سے فقط میرا پتہ پوچھ کر چل دیتے۔ اچھا۔ یہ دیکھو۔ سیٹھ فیروز جی اپنے بل فارم کیسا خوبصورت چھپواتا ہے“

یہ کہہ کر انہوں نے میرے ہاتھ میں فیروز جی کی دکان کا ایک بل دیا۔ بل اس قسم کا تھا جس قسم کے نقد چیز خریدنے والوں کو دیئے جاتے ہیں اور جو بطور ایک رسید کے ہوتے ہیں۔ بل پر خریدار کا نام نہ درج تھا مگر اس قدر لکھا ہوا تھا۔

ایک ڈبہ پانامہ سگار	۰	۰	۲۵
ایک چھوٹا وسکی	۰	۱	۰
	۰	۶	۲۵

فارم پر سیٹھ فیروز جی کا نام وغیرہ رنگ دار روشنائیوں میں واقعی نہایت خوبصورت چھپا ہوا تھا۔

میں مسلمان مشرب، شراب نوشی کی اصطلاحات سے ناواقف۔ میں نے پوچھا:۔

"اس چھوٹا وسکی کا کیا مطلب؟ معمولی درجہ کی؟"

"نہیں۔ ایک چھوٹا وسکی کے معنی وسکی کا ایک چھوٹا پیگ۔ اب یہ دیکھو۔ یہ ہے ہوٹل کے فارم اگرچہ ساخت میں اس سے بڑھے ہیں مگر چھپائی میں کسی قدر خراب ہیں"۔

اب کے بار انھوں نے باندرہ کی ہوٹل کا بل فارم میرے ہاتھ میں دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا وہیٹی صاحب نے مجھے محض اس لئے بلایا ہے کہ انھیں بل فارموں کی چھپائی کے سے اہم مسئلے پر میری رائے کی ضرورت تھی۔ خیر میں نے بل کو دیکھا چھپائی واقعی کچھ قابل تعریف نہ تھی۔ باقی تحریر عام بلوں کی سی تھی۔

بل بنام ٹی براؤن صاحب کمرہ نمبر ۲، بابت ماہ جولائی

	پائی	آنہ	روپیہ
خوراک وغیرہ	۰	۰	۱۱۰
کرایہ	۰	۰	۳۰
	۰	۰	۱۴۰

سیٹھ فیروز جی کا بل میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اور ہوٹل کا بل بائیں ہاتھ میں۔ میں باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ وہیٹی صاحب بولے۔

"یہ دونوں بل مجھے براؤن کے اس کوٹ کی جیب سے ملے ہیں جو وہ اس شام کو پہن کر باہر گیا تھا۔ پہلا سوال جو ان بلوں کو دیکھتے ہی میرے دل میں اٹھا وہ یہ تھا کہ میری خوراک کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار ہوتا ہے۔ براؤن کا ایک سو دس روپے کیوں تھا۔ منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ براؤن شراب بالکل نہیں پیا کرتا تھا۔ نہ کھانے پر نہ کسی اور وقت۔ اس لئے وہ شراب کے چالیس روپے جو ہوٹل والے ہم سے چارج کرتے ہیں اس سے نہیں لئے جاتے تھے"۔

(میں نے دل میں براؤن صاحب مرحوم کو آفریں کہا کہ ایک نیکی کا کام تو کرتا تھا)۔ وہیٹی صاحب نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا:۔

"اگر وہ شراب نہیں پیا کرتا تھا جیسا کہ مصدق ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے کل کیوں سیٹھ فیروز جی کی دکان سے وسکی کا ایک پیگ پیا؟"

(افسوس براؤن مرتے مرتے یہ گناہ کر ہی بیٹھا)

"اب تم دیکھو۔ یہ طاق پر پانچ چھ سگاروں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک میں تو کچھ سگار ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر سب ڈبوں پر سگاروں کا نام "سلطانہ" لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن کو "سلطانہ" سگار پینے کی عادت تھی۔ باوجود اس کے سیٹھ فیروز جی کا بل کہہ رہا ہے کہ کل اس نے "پانامہ" سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا۔ یہ کیا تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جس کی نسبت ہوٹل کے جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کی زندگی نہایت سنجیدہ و متین اور اس کی عادت نہایت سیدھی سادی اور باقاعدہ تھیں۔ اپنی موت کے دن تک

معمول سے اس قدر انحراف کرے۔ کہ شراب نہ پیتا ہو تو اس دن شراب پی لے اور سگار جو وہ غالباً برسوں سے پی رہا ہے چھوڑ کر ایک اور قسم کے نہایت قیمتی سگاروں کا ڈبہ خرید لے۔ پھر وہ ڈبہ بھی تو اس کمرے میں کہیں نہیں ملتا۔ کیا اس نے وہ کسی دوسرے شخص کے لئے خریدا تھا؟ لیکن نہیں، انگیٹھی کے پاس سے مجھے یہ دو جلے ہوئے سگاروں کے باقیماندہ حصے ملے ہیں۔ جن کا تمباکو "سلطانہ" سگار کے تمباکو سے بہت مختلف اور اعلیٰ ہے۔ غالباً پانامہ سگار ہی ہیں (چونکہ میں خود سگار نہیں پیتا۔ اس لئے میری واقفیت اس بارے میں محدود ہے)۔ تو گویا اس کمرے میں دو پانامہ سگار پئے گئے لیکن باقی کا ڈبہ غائب ہے ——— اب چلو غسلخانے کا معائنہ کریں!

یہ کہہ کر ہم دونوں غسلخانے میں گئے۔ ولیٹی صاحب نے براؤن کی لاش پر سے چادر اٹھائی۔ براؤن ستر پچھتر برس کی عمر کا ایک پتلا دبلا قریباً چھ فٹ دو انچ قد کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے بے انتہا شرافت ٹپکتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ ایسے آدمی کو کوئی کس طرح قتل کر سکتا ہے۔ اردگرد کی سب چیزیں درہم برہم تھیں جیسے کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہے ہوں۔

"گردن کے زخم کے علاوہ براؤن کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے اور یہ دونوں ضربیں معلوم ہوتا ہے کسی کند وزنی چیز سے آئی ہیں۔ اس قسم کی کند وزنی چیز دونوں کمروں میں کوئی نہیں۔ لیکن قابل غور ایک اور بات ہے۔ وہ سامنے کھونٹی پر براؤن کا وہ کوٹ لٹکا ہوا ہے جسے وہ کل پہن کر سیر کرنے گیا تھا۔ یہ کوٹ ایک جگہ بالکل تر اور پھٹا ہوا ہے۔ اب اگر یہ کوٹ اس کشمکش میں پھٹا ہے جس کشمکش کا نتیجہ براؤن کے لئے موت تھی تو کیا براؤن میں باوجود ایک مہلک زخم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے اس قدر ہمت تھی کہ وہ کوٹ اتار کر نہایت سلیقے سے کھونٹی پر لٹکاتا۔ پھر اس کی جگہ یہ ڈریسنگ گون پہنتا جس کی ڈوری کی گانٹھ تم غور کرو نہایت احتیاط سے دی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ سب کچھ براؤن کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ براؤن کے شام کے وقت پہننے کی ٹوپی جو کل شام ضرور اس کے سر پر تھی۔ یہاں کہیں نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر ولیٹی صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فی الحقیقت اس قتل کے گرد ایک ایسی تاریکی محیط تھی جس میں میرے متجسس دماغ کو کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ جب میں ولیم کے قتل کا ماجرا سن رہا تھا تو میرا دل قتل اور قاتل کی نسبت ولیم کی مصیبت کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ اور اب قتل مجھے ایسا اہم معلوم ہو رہا تھا کہ میں ولیم کی تکلیف کو بالکل بھول گیا۔

ولیٹی صاحب مجھے ساتھ لے کر غسلخانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا:

"یہ ہم چوروں کی طرح غسلخانے کے دروازے سے کیوں آتے جاتے ہیں؟"

وہ بولے۔

"ولیم نے جب تمہیں سارا حال سنایا تو اس نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ تم کسی کو نہ کہو گے؟"

"لیا تھا!"

"ہوٹل میں تین چار آدمیوں کے سوا اور کسی کو اس واقعے کا علم نہیں۔ اور حتی الوسع کوشش کی جا رہی ہے کہ جب تک تفتیش کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ جو نوکر صبح براؤن کی چائے لے کر آیا تھا۔ اور جس نے سب سے پہلے اس ہوٹل میں براؤن کو مرا ہوا دیکھا اس کو ولیم نے شاید کچھ روپے دے کر چند دن کے لئے اس معاملے پر زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ سب انسپکٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ انھوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جب تک انھیں کسی خاص شخص کے مجرم ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے۔"

"اچھا تو پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟"

"ہاں ہو۔ ولیم نے مجھ سے نہیں کہا۔ صبح سب انسپکٹر صاحب جنائی کاغذوں کا ایک دستہ اور قلم دوات لے کر یہاں آئے تھے۔ منیجر کے کمرے میں گھنٹہ بھر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرتے رہے پھر ایک نوکر کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے ہیں مگر وہ بالکل بے گناہ ہے۔"

"تو انھوں نے اسے کیوں گرفتار کیا؟"

"پولیس کی تفتیش کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب نے پہلے تو براؤن کے کمرے کا سرسری معائنہ کیا۔ اس قدر سرسری کہ اب ان سے جا کر پوچھو تو انھیں اس کمرے کی شاید ایک چیز بھی یاد نہ ہوگی۔ پھر منیجر سے پوچھا کہ کل رات یہاں کون کون آدمی ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ صرف ایک فیروز خاں بیرہ تھا جو کل مری سے ولیم کے بھائی چارلس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ چارلس تو کل شام پانچ بجے ولیم کے کمرے میں ایک چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ میرا نوکر فیروز خاں رات یہیں رہے گا۔ فیروز خاں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق رات باندہ گلی ہی میں رہا اور آج صبح گرفتار کر لیا گیا۔"

"چارلس یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اس کی بھائی کے ساتھ ناچاقی سی ہے۔"

"ناچاقی سی تھی۔ جان ولیم شریف خصلت انسان ہے۔ چارلس مغرور اور عیاش ہے۔ مگر آخر جان کا بھائی ہے۔ جان کو اس پر ترس آیا۔ اور ان میں پھر رابطۂ محبت قائم ہو گیا۔ چارلس نے مری میں ایک ہوٹل کھول رکھا ہے۔ کل وہ اسی روپیہ کے لئے آیا تھا۔"

یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مری باندہ گلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور گھوڑے پر تین گھنٹے کا راستہ ہے۔

یہ باتیں ہم ہوٹل کے ٹینس کے چمن میں کھڑے ہوئے کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم منیجر کے کمرے کی طرف گئے۔ جان ولیم نے ولیٹن صاحب کو دیکھا تو ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

"ابھی تو نہیں۔ مگر بہت جلد پہنچنے والا ہوں ...... ہم چائے ڈاک بنگلے ہی میں پئیں گے۔"

میں نے اپنا باران کوٹ منیجر کے کمرے سے اٹھایا اور ہم نے ڈاک بنگلے کی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا تو چار بجنے میں سات منٹ تھے۔

ولیٹن صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو کھانا شاید نصیب نہ ہو۔ چائے کے ساتھ ہی جو کچھ کھانا ہو کھا لو۔ مجھے دوست لوگ دسترخوان کا غاصب سمجھتے ہیں اور رات کو کھانا نہ ملنے کے ڈر سے تو خدا جانے میں نے کس قدر کھایا۔ جب میں رات کی فاقہ کشی کا خاطر خواہ انتظام کر چکا تو میں نے ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی خالی کرسی پر رکھ دیں۔ ولیٹن صاحب میرے پاس برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہے تھے۔ مجھے پیٹ کی فکر سے فراغت پاتے دیکھا تو میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

میں اکثر ان کے موزوں قد اور اعضا کے تناسب کو دیکھ کر رشک کے مارے جلا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت سواری کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے برجس کی جیب میں سے پستول نکال کر اسے کھولا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کارتوس مانگے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں چھ فالتو کارتوس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب جو انھوں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مجھے نوٹ پیپر بھی یاد آئے۔

میں کہنے کو تھا کہ وہ نوٹ پیپر بھی میرے پاس ہی ہے مگر کسی خیال سے چپ رہا۔ اور جیب سے کارتوس نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے سب کو پستول میں بھر دیا۔ پستول بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا۔ اور مسکرا کر کہنے لگے:۔

"تیرے کارتوس ختم ہو گئے تھے۔ اس لیے میں نے تمھیں لانے کو کہا تھا۔ میں تمھارا چھ کارتوسوں کا قرضدار ہوں۔"

ان کا یہ انداز بے تکلفانہ طبیعت میں بے تکلفی تھا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب کراہت سی ہوئی۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہتا لیکن انھوں نے مجھے اس کی فرصت نہ دی اور دفعتاً پوچھا:۔

"تو تمھاری براؤن کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"میں تو سب سے پہلے سیٹھ فیروز جی کے بل کا معاملہ حل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں میلوڈ کے پاس جا کر کسی ڈھنگ سے پوچھ آؤں کہ یہ پانامہ کا ڈبہ اور ایک چھوٹا وسکی کس نے خریدا تھا؟"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم اب روز بروز عقلمند ہوتے جاتے ہو۔ اور چونکہ معلوم ہوتا ہے تمھیں تفتیش جرائم میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس لیے ساتھ ہی تحصیل سے یہ بھی پوچھتے آنا کہ چارلس نے کل شام کے پانچ بجے مری جانے کے لیے گھوڑا کرایہ پر لیا تھا؟"

مجھے پھر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کھسیانا ہو کر میں ڈاک بنگلہ سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ کے بعد میں وہ دہی سے مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ ولیمز صاحب ٹہلتے ٹہلتے رک گئے اور ایک منتظرانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ "کل مورخہ ۳ اگست کو شام کے پانچ بجے چارلس ولیمز صاحب مری ہوٹل کے مالک اور منیجر نے سیٹھ فیروز جی اینڈ برادرس کی دکان سے ایک ڈبہ پانامہ سگار کا خریدا اور ایک پیگ وسکی کا پیا۔ تحصیل سے کل صبح کے سات بجے سے لے کر شام کے آٹھ بجے تک انھوں نے کوئی گھوڑا کرائے پر نہیں لیا۔ پہلی بات مجھے سیٹھ فیروز جی کی زبانی اور دوسری بات گھوڑوں کے ٹھیکیدار کی زبانی معلوم ہوئی۔ مگر اس ڈھنگ سے کہ انھیں شاید محسوس بھی نہیں ہوا کہ ان سے یہ باتیں کوئی پوچھ گیا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لیے اور نہایت بے پروائی سے دو تین قدم برآمدے کے پتھر کے فرش پر ٹہلا۔ پھر مڑ کر میں نے ولیمز صاحب سے کہا:۔

"وہ سگاروں کے جلے ہوئے ٹکڑے جو آپ نے براؤن کے کمرے میں سے اٹھائے تھے۔ وہ تو ذرا دکھائیے۔"

انھوں نے فرمانبرداری سے "ارشاد" کی تعمیل کی۔ میں نے ایک "تو" اپنے کمرے سے کھولا پھر ان چھ پانامہ سگاروں میں سے جو میں سیٹھ کی دکان پر سے خرید کر لایا تھا۔ ایک سگار لے کر اس کے تمباکو کے پتے کو کھولا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ مربیانہ لہجے میں ولیمز صاحب سے کہا:۔

"آپ کا قیاس درست تھا۔ یہ جلے ہوئے سگار بے شک پانامہ سگار ہیں۔"

انھوں نے جھک کر کہا۔ "آپ کی عین نوازش۔"

"تو اب ہم مری چلیں گے نا؟"

"جس طرح حضور حکم کریں۔"

میں بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دیئے۔ وہ پانامہ سگار سلگا کر ہم ڈاک بنگلہ سے تحصیل کی طرف آئے۔ وہ گھوڑے

لیٹ اپنے بارانی کوٹ وہاں باندھے جہاں سبکتگین نے ہرن کے بچے کو باندھا تھا۔ اور اپنے پستولوں کو جیبوں میں ٹھونس کر گھوڑوں پر سوار ہو مری کی طرف روانہ ہو گئے۔

باڑہ گلی سے آدھ میل کا کہ ہم نے گھوڑوں کو دلکی پر چھوڑ دیا۔ چپ چاپ چلتے ہوں، ہیبت عظمت بھری نظر۔ کھڈ اور بھی گھوڑ کے اونچے اونچے درخت ایک طرف پہاڑوں کی پُر شکوہ بلندی۔ دوسری طرف کھڈ کی پُر اسرار گہرائیاں تنگ پیچیدہ سڑک۔ اس پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی مسلسل آواز اور کبھی کبھی گولوں کی دردناک کوکو۔ میں تو بےخود ہو گیا۔ درختوں کے بیچ میں سے غروب آفتاب کے ہوتے ہوئے بھی نظارے کبھی چھپ کر کبھی ظاہر ہو کر بے قرار کر رہے تھے۔ آبشاروں کا سفید پانی بڑے بڑے پتھروں پر گر کر تحت الثریٰ میں ہو لیتا، بار بار ایک کھڈ میں لوٹنے لگتا۔

میرے کانوں نے ایک غیر مانوس آواز سے رنجیدہ ہو کر مجھے چونکا دیا۔ ملک صاحب جو مجھ سے دس گز آگے جا رہے تھے اپنا گھوڑا روک لیا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے رکنے پر میں نے بھی گھوڑا ٹھہرا لیا۔ وہ بولے:

"مری بائیسکوپ کا تماشا کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"شاید پونے آٹھ بجے۔"

"اور اب ...... سوا چھ بجے ہیں اور مری یہاں سے پانچ میل ہے تو گویا ہم بائیسکوپ کا تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اب ذرا سبک بڑھ نہ چلیں؟"

"میں خود یہی کہنے والا تھا۔"

ہم نے گھوڑوں کو قدم بقدم لے جانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دم ملک صاحب نے قماربازی کی اقتصادی، روحانی و اخلاقی قباحتوں پر ایک پُر زور لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس شد و مد سے کہ میں بھی اس فعل مذموم کے اختراع کا مجرم وہ مجھے سمجھتے ہیں۔ دس منٹ تک لگاتار وہ اس موضوع پر ایک پُر مغز تقریر کرتے رہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر انہوں نے دفعتاً باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ٹھہرا لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:

"مجھے شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح عادت اہلِ فرنگ میں کثرت سے ہے۔ وہ لوگ جو مہذب گھرانوں کی اولاد اور سوسائٹی کے معزز افراد شمار ہوتے ہیں، بلا تکلف شام کو کھانے کے بعد اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہم وطن ایسے ہوں جو شام کو کلب میں تاش کھیلے بغیر رہ سکیں اور سارے کلب میں تاش کی ایک بازی ایسی نہیں ہوتی جس کی ہار جیت کے ساتھ روپے کی ہار جیت وابستہ نہ ہو اور اس کو یہ لوگ شغل سمجھتے ہیں۔ اس کو روحانی انبساط کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی پھر یہ دعویٰ ہے کہ تہذیب جدید بنی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ غلط اور سراسر غلط کہتے ہیں۔ تہذیب جدید نے کئی نئی خرابیاں ایجاد کی ہیں۔ مردہ عیوب کو از سرِ نو زندہ کیا ہے اور کئی پرانی قباحتوں کو پہلے سے زیادہ مہذب و عزیز کر دیا ہے۔"

میں حیران تھا کہ اس شخص نے اپنا دماغ کس قدر قابو میں رکھا ہے۔ مجھے ہرگز اس بات کی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ چار گھنٹے برائوں کی بابت پوری تحقیق و غور و خوض کرنے کے بعد وہ یکایک اس طرح لاتعلق باتیں کرنے لگ جائیں گے جیسے وہ اس سے محض بے خبر ہوں اور پھر اس وقت جب کہ کم از کم میرا دماغ خیالات کے عدمِ اظہار کی وجہ سے بیش از بیش اسی سوچ میں مصروف تھا۔ ملک صاحب میں میں نے بڑی خاصیت دیکھی ہے

کر وہ یک لخت اپنے خیالات کو بغیر کسی تکلیف کے ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ وزیر اعظم انگلستان کے کیرکٹر پر بحث کو ختم کئے بمشکل دو منٹ نہیں گزرتے کہ وہ چین کی ریشم کی تجارت کے متعلق باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں آدمیوں کے ساتھ نہایت انہماک سے متواتر تین گھنٹے تک وہ اصلاحات ہند پر ملک کے ایک مشہور سپیکر کی دھواں دھار تقریر سنتے رہتے ہیں اور پھر ہال سے باہر نکلتے ہی سپانیہ کی آب و ہوا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اردگرد عظیم الشان پہاڑ اور اونچے اونچے درخت اس شاندار انسان کو دیکھ کر خاموش تھے۔

ولیٹ صاحب ان سے بالکل غافل، چپ چاپ گھوڑے پر چلے جا رہے تھے۔

مری ٹیلسکوپ سے ہم دس بجے نکلے۔ ولیٹ صاحب برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگرٹ کے پیہم کش لگا رہے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق اپنی گھڑی کو کوکنا شروع کیا۔ ولیٹ صاحب بولے:۔

"یہ بھی گھڑی کو کنے کا وقت ہے؟"

"میں سونے سے پہلے گھڑی کو کوک دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت اور کاموں کی وجہ سے یہ کام بھول جاتا ہوں۔ اب خدا کرے خواجہ محمد حسین وہاں میرے ٹائم پیس کو کوک رکھیں۔"

"تو تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو؟"

"اس میں کیا ہرج ہے؟ بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔"

"میرا بھی یہی قاعدہ ہے اور ——— شاید ...... ہر ایک ...... عقلمند......"

اگر میرے حواس نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو میرا خیال ہے کہ ولیٹ صاحب نے اتنا کہہ کر اگلا قدم ذرا آہستہ اٹھایا اور ایک لمحے کے لئے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی۔ لیکن پھر وہ پہلے کی طرح لاابالیانہ طریقے میں چلنے لگے۔ آدھ منٹ کے بعد ایک معمولی فقرے کی صورت میں انھوں نے مجھ پر ایک بم گرا دیا:۔

"اگر تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو، تو براؤن کل شام کے چار بجکر ۲۵ منٹ پر مرا ہے۔"

مجھے ہرگز یقین نہ آیا کہ میں نے ٹھیک سنا ہے۔ چونک کے میں نے پوچھا۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے کہا ہے کہ اگر تم دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتے ہو تو براؤن کل شام کے چار بجکر ۲۵ منٹ پر مرا ہے۔ اور چونکہ چار بجکر ۲۵ منٹ پر وہ یقیناً ہوٹل کے باہر تھا۔ اس لئے اس کی موت اس کے کمرے میں نہیں بلکہ باہر کہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد اغلباً رات کے وقت اس کی لاش اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی گئی۔ وہاں اس کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا گیا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور پھر اس کی خوابگاہ کی چیزوں کو درہم برہم کر دیا گیا۔"

میں تحیر، استعجاب، استفہام اور اسی طرح کی بیس تیس چیزوں کا معجون مرکب، ان کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ولیٹ صاحب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، سگرٹ کو منہ سے نکال کر ہوا کی تاریکی میں

کہیں اچھال دیا اور بولے :-

"جب میں نے براؤن کے کوٹ کی تلاشی لی تو اس میں سیٹھ فیروز جی کے بل ... کے علاوہ مجھے براؤن کی جیبی گھڑی بھی ملی تھی جو مجھے یاد ہے کہ چار بجکر دس منٹ پر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے کوتاہ بینی سے یہ خیال کیا کہ گھڑی اس لئے ٹھہری کہ اسے کوک دینے والا مر گیا ہے (مجھے اس وقت یہ نہ سوجھا کہ گھڑی کی چابی پھیر کر دیکھ لیں) براؤن کی نشست گاہ میں میز پر اس کا ٹائم پیس بھی تھا ... اور اس کے ٹھہر جانے کی وجہ بھی میں نے یہی خیال کی۔ لیکن اب مجھے یاد آیا ہے کہ ٹائم پیس کی سوئیاں دونوں دس بجے پر [illegible] تھیں۔ ٹائم پیس کے ساتھ تو کسی غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ تو اسی وقت ٹھہرا ہے جب [illegible] اس کی کوک ختم ہو گئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن پہلے ٹائم پیس کو ——— اور اگر دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا جاتا ہے تو دونوں گھڑیوں کو ——— قریباً نو بجے یا غالباً دس کے نو بجے کوک کرتا تھا جبکہ گھڑی جو چار بجکر دس منٹ پر ٹھہری ہے تو اس کا ٹھہر جانا [illegible] ایک نتیجہ ہے جو براؤن کی موت کے وقت [illegible] قاتل کے ہاتھ یقیناً گر کر پڑی ہو۔ گو تم اور میں جو شاید بہت باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہیں تو براؤن جیسے کی زندگی کی ہر ایک حرکت [illegible] تھی اور ہر ایک عادت باقاعدہ اور مقرر کردہ تھی۔ کیا یہ غالب بلکہ یقینی نہیں کہ وہ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتا تھا؟"

جوں جوں وہ یہ کہتے گئے براؤن کی موت کی ہر ایک تفصیل مجھ پر [illegible] ہوتی گئی۔ سب دو باتوں کے متعلق پھر بھی میرے دل میں الجھن باقی رہی۔ وہی بیٹن صاحب کے دماغ میں بھی پھر رہی تھیں۔ وہ کہنے لگے :-

"سیٹھ فیروز جی کا بل اور [illegible] سگاروں کے جلے ہوئے باقیماندہ ٹکڑے صاف بتا رہے ہیں کہ چارلس ولیم ضرور براؤن کے کمرے میں داخل ہوا ہے بلکہ وہاں کم از کم تین چار گھنٹے ٹھہرا ہے (دو سگاروں کے پینے کے لئے کچھ وقت چاہئے) سو یہ تو تم بغیر خوف تردید فرض کر لو کہ براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر لانے والا چارلس ولیم ہی تھا۔ اور براؤن کی تبدیلی لباس اور خوابگاہ کی بدنظمی کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ اب صرف دو چار حل طلب باتیں باقی ہیں :-

اول :- یہ کہ کیا چارلس ولیم صرف براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر کمرے میں لایا۔ یا کہ قتل بھی اسی نے کیا ہے؟

دوم :- یہ کہ اگر اس نے قتل نہیں کیا، تو قاتل کون ہے؟

سوم :- یہ کہ اس نے دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ غلط خیال ڈالنے کی کوشش کیوں کی کہ یہ قتل براؤن کے کمرے میں ہوا ہے؟

چہارم :- یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا بل براؤن کی جیب میں کیسے چلا آیا؟

براؤن مارا کہاں گیا ہوگا؟ اغلباً ادھر ادھر کہیں جنگلوں میں؟"

"شاید۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ مارا گیا ہو وہاں اس کی موت کی ایک یادگار باقی ہے بشرطیکہ جنگلی جانوروں نے اسے وہاں رہنے دیا ہو۔"

"وہ کیا؟"

"اس کی شام کے وقت پہننے کی ٹوپی۔"

اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے اس قدر متحیر کر دیا کہ میں گرد و نواح کی سب چیزیں بھول گیا۔ ولیفن صاحب جدھر جدھر جاتے تھے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا، آخرکار وہ ایک ہوٹل کے دروازے پر ٹھہرے اور کہنے لگے:

"یہ چارلس ولیم صاحب کا ہوٹل ہے۔ میرے خیال میں ان کی ملاقات تمہارے لئے خوشی اور مسرت کا باعث ہوگی۔"

اس وقت شاید رات کے دس بجے ہوں گے۔ سڑک کے لیمپوں کی روشنی رات کی پھیلی تاریکی کے ساتھ ایک ناکامیاب مقابلہ کر رہی تھی۔ ہوٹل کے کمرے روشن تھے، کبھی کبھی کوئی نوکر پیشخدمت نظر آتا تھا۔ ہم ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ہوٹل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ دفتر کا دروازہ کھلا تھا اور میز کے سامنے دو بابو بیٹھے حساب کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے منیجر کا پتہ پوچھا۔ تو معلوم ہوا منیجر صاحب ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ منیجر کے کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر گئے۔ چارلس ولیم ایک آرام کرسی پر بیٹھا نہایت اطمینان سے سگار پی رہا تھا۔ اور سامنے ایک چھوٹی سی میز پر ایک خوبصورت سا گلدان اور ایک گلاس، جس کی چمک پر مصنوعیت کی تراشات کو پیدا کرنے کے لئے پڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی چارلس اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کی شکل ابھی تک یاد ہے۔ اس کے خط و خال صاف بتا رہے تھے کہ وہ جان ولیم کا بھائی ہے لیکن اس کے تبسم اور جان ولیم کے تبسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جان ولیم جب مسکراتا تھا اس کے چہرے سے صاف گوئی اور ایک قسم کی پاکیزگی ٹپکتی تھی۔ برخلاف اس کے چارلس کی مسکراہٹ میں انقباض اور چہرے کے خد و خال تھے، جو اس کے تبسم کو مصنوعی اور ناقابل اعتبار بنا دیتے تھے۔

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا:

"صاحبان! میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

ولیفن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا:

"ہم یہاں صرف رات گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر تمہیں دو سونے کے کمرے مل سکیں تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

"بہت خوشی سے" یہ کہہ کر چارلس نے ایک نوکر کو بلا کر کہا "ان کو نمبر ۲۲ اور ۲۳ میں لے جاؤ" پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"آپ کو کچھ کھانا تو نہیں چاہیئے؟"

ولیفن صاحب بولے:

"نہیں صرف کافی کے دو پیالے بھیج دو۔"

ہم دونوں نمبر ۲۲ میں بیٹھے تھے کہ نوکر ایک طشت میں کافی کے دو پیالے لایا۔ ولیفن صاحب نے اس سے کہا:

"منیجر کو یہاں بھیج دو۔" یہ کہہ کر ہم دونوں کافی پینے لگے۔ میں نے پوچھا:

"آپ نے منیجر کو کیوں بلایا ہے؟"

خدا جانے مجھے خاطر خواہ جواب ملتا یا نہ کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ چارلس ولیم اندر داخل ہوا اور ہمارے سامنے آ کر ایک خالی کرسی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ولیفن صاحب نے مسکرا کر کہا:

"مسٹر چارلس ولیم! میں تمہارے ہوٹل کی کافی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم از کم باندہ گلی ہوٹل میں اور بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا انتظام کئی پہلوؤں سے ناقص ہے۔ کل ہی وہاں ایک آدمی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن میں تو ہوٹل کی بد انتظامی کی نسبت قائل

کی شرارت سے زیادہ متاثر ہو رہا ہوں کہ ایک قیدو قتل کرنے کی تکلیف اٹھائے۔ پھر نعش کو چپکے سے پہ ڈال کر مخصوص شکر میں لا کر رکھے۔ پھر اس خیال سے کہ نعش کو دیکھ کر سب ہی بہ سروی نہ لگے اسے ڈریسنگ گاؤن پہنائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سیف ڈپازٹ کی چابی ڈال دی۔ کہ آپ کا انکی جیب میں چھوڑ جائے۔ ما نہ اس کا پتہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ مسٹر چارلس ولیم! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی داد کے علاوہ آپ کی ذہانت کی داد دوں؟

میرے دل و دماغ ولبن صاحب کی باتوں پر اور میری نگاہ چارلس کے چہرے پر تھی۔ چارلس کا چہرہ اس طنز آمیز اور حقارت آمیز تقریر سے تمتما اٹھا اس نے اپنے ماتھے پر ایک پیچ و تاب کھایا۔ پھر ڈال کی منہ کو زور سے بند کر کے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ولبن صاحب کی جانب دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہ چارلس کے چہرے سے نہ ہٹائی۔ غصے سے آتا دیکھ کر میں نے جلدی سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

ولبن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کافی کے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

دفعتاً چارلس نے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ اگر میں پہلے سے اس حرکت کی توقع نہ کرتا تو کرسی پوری قوت سے ولبن صاحب کے سر پر آ پڑتی۔

چارلس نے میرے پستول کی سیاہ نالی کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور بہتر یہی سمجھا کہ اپنے ارادے کو کم از کم ملتوی کر دے۔

ولبن صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی۔

"امجد، چارلس صاحب کو اسی طرح رکھنا۔ میں ذرا کافی پی لوں۔" جب وہ کافی پی کر کرسی پر سے اٹھے اور دروازے کی طرف گئے۔ دروازے کے تالے میں چابی پڑی تھی۔ اسے پھرا کر تالا بند کر دیا۔ اور چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔

دروازہ بند کر کے وہ ہماری طرف واپس آئے اور میرے پستول کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے:

"اسے جیب میں ڈال لو۔ اب چارلس صاحب کے لڑنے کا زمانہ نہیں آیا۔"

چارلس کی طرف مخاطب ہو کر بولے:

"مسٹر چارلس ولیم! ہم تو پولیس سے پہلے پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ نہ پولیس کو اطلاع دے کر یہاں آئے ہیں۔ نہ اب تک ہمارا ارادہ پولیس کو اطلاع دینے کا ہے (تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ) تم قدرتی طور پر پوچھو گے کہ میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے۔ میرا تعلق صرف اس قدر ہے کہ جان ولیم بلند کلب ہوٹل کا مالک، تمہارا بڑا بھائی میرا دوست ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کو اس سے پہلے زندگی میں کتنے صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ کس قدر مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ تمہاری طرف اور اپنے کاروبار کی طرف سے کس قدر تکلیف اور رنج برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے بریلی میں تم نے اپنی برائیوں کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ تمہیں علیحدہ کر دے۔ اکیلا رہ جانے کی وجہ سے وہ اپنے نوکروں کی بددیانتی کا تختۂ مشق بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متواتر دو سال تک وہ ہوٹل سے نقصان اٹھاتا رہا اور اسی وجہ سے اس نے بریلی کا ہوٹل چھوڑ کر بلند گو میں اپنے سرمائے سے یہ ہوٹل خرید لیا۔ پھر اس کو معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ میں شرمناک طرح پر زندگی گزار رہے ہو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی تھا۔ اسے رنج ہوا۔ اس کا دل تمہاری ذلیل زندگی کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ لکھنؤ جا کر تمہیں وہاں سے لے آیا اور اپنے پاس سے روپیہ دے کر ترقی میں تم سے یہ ہوٹل خریدوایا اور شکر کیا کہ چلو تم نے از سر نو شریفانہ رویہ اختیار کر لیا ہے اور اب اس قتل کی وجہ سے اس کے ہوٹل کی جو بدنامی ہوگی۔ اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا نوکر فیروز خاں

قتل کے الزام میں گرفتار ہے۔ گویا تم میں تو اب انصاف اور صداقت اس درجہ مفقود ہے کہ تم ایک بے گناہ کو اپنے سامنے پھانسی پر چڑھتے دیکھ رہے ہو۔

چارلس کا چہرہ اس تقریر کے زیر اثر بتدریج بدلتا گیا اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات ظاہر ہوتے گئے۔ اشتعال، غضب، سنی، توجہ، نرم دلی، ندامت و افسوس سب باری باری اس کی آنکھوں میں سے جھانک جھانک کر چلے گئے۔ لیکن ویٹس صاحب نے اپنی تقریر اس ادا سے ختم کی جب عنقریب چارلس کے سامنے پر اور اس کے کندھوں کے پیچھے بیٹھنے میں ہمت اور مردانگی کے آثار نظر آئے۔

چارلس نے کھڑے ہو کر کہا۔

"یو ذخدا، برائے مہربانی مجھے معاف کیجئے۔ آپ اطمینان رکھئے جو کچھ میں نے کیا بہت برا کیا اور میں بادل شرم و ندامت کے ساتھ اس وقت اپنی ذلیل حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا اور خدا جانتا ہے میں کبھی قتل نہیں کر سکتا۔"

"او۔ تو میں نے اچھا کیا کہ میں تمہارے پاس آیا۔ اگر تم سارے حالات بیان کر دو تو میرے یہ دوست ساتھ ساتھ لکھتے جائیں گے۔"

ویٹس صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے جیب میں سے نوٹ بک اور پنسل (جو میں خصوصاً گلی سے ساتھ لایا تھا) نکال کر پیسنے اور ویٹس صاحب سے ان کا طرے کرو جو چارلس کہتا رہا لکھتا گیا۔

وہ تحریر تو اس وقت مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے ورنہ اس کا بیان جوں کا توں نقل کرنا ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ چارلس جمعہ کے دن باندہ گلی کی توشہ نوچ کے پینے کے بعد براؤن کی طرح وہ بھی سیر کرنے نکلا۔ پہاڑیوں میں وہ ایک چھوٹی پگڈنڈی پر جا رہا تھا کہ سامنے اس نے ایک انگریز کو آتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس انگریز کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا پگڈنڈی سے سات آٹھ گز نیچے جا پڑا۔ چارلس بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور اسے زمین پر سے اٹھایا۔ لیکن اس کا سر ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے اس کی کنپٹی کو ایک سخت ضرب آئی تھی۔ اور وہ مر چکا تھا۔ چارلس کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے۔ اس کا نام و نشان معلوم کرنے کی غرض سے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں سے باندہ گلی ہوٹل کا بل ملا جس سے چارلس کو معلوم ہوا کہ اس انگریز کا نام جی براؤن ہے۔ اور یہ باندہ گلی کے ۱۲ نمبر کمرے میں رہتا ہے۔ پہلے تو اسے خیال ہوا کہ باندہ گلی میں جا کر اس کی موت کی اطلاع دے۔ لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے دل میں ایک بہت ذلیل خیال آیا اور اس نے اپنا پہلا ارادہ ترک کر دیا۔ باندہ گلی آ کر اس نے پانامہ سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا اور وسکی کا ایک پیگ پیا۔ اور پھر ہوٹل میں آ کر بھائی کے نام چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ لیکن خود ادھر ادھر پہاڑیوں میں رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا۔ قریباً گیارہ بجے براؤن کی نعش کو اٹھا کر وہ ہوٹل کی طرف لایا۔ اور موقع پا کر نعش سمیت براؤن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں براؤن کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا اور خوابگاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ قتل اسی کمرے میں ہوا ہے۔ اور یہ سب باتیں اس نے بھائی کے حسد کے مارے کیں۔ اس کا مدعا باندہ گلی ہوٹل کو بدنام کرنے کا تھا۔ پھر وہ رات بھر براؤن کے کمرے ہی میں رہا جہاں وہ سویا بالکل نہیں اور صبح پو پھٹتے ہی پیشتر اس کے کہ باندہ گلی کا کوئی آدمی جاگے وہ پیدل ہی مری کو چل دیا۔

میں اس کا سارا بیان لکھ چکا تو ویٹس صاحب نے کاغذ مجھ سے لے کر چارلس کے آگے رکھ دیئے اور کہا "ان پر دستخط کر دو۔" کچھ دیر تو چارلس ساکن رہا۔ پھر قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد ہوٹل کے دفتر کے ایک بابو کو بلا کر اسے تحریر کا مطلب بتائے بغیر اس کے دستخط بھی بطور گواہ کے کرا لئے گئے۔ پھر ویٹس صاحب نے ان کاغذوں کو لفافے میں بند کر کے لفافے کے اوپر مجھ سے پتہ لکھوا لیا۔

سب انسپکٹر پولیس، باندہ گلی

معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس، ضلع ہزارہ، ایبٹ آباد

لفافے کو واپس دے کر چارلس سے کہا۔

"اس لفافے کو میں ابھی ڈاک میں ڈال دوں گا۔ یہاں سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے باندہ گلی یہ تین دن میں پہنچے گا۔ تب تک تم اگر چاہو تو کہیں کے کہیں پہنچ سکتے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری یہ نظر بندی فیروزہ خان کی رسوائی کے لئے کافی ہوگی۔

دوسرے دن صبح ہم باندہ گلی پہنچے۔ گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کے ۲۳ نمبر کمرے میں، میں اور ولسن صاحب آرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ولسن صاحب اخبار کا تازہ پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں سامنے بیٹھا خاموشی سے سگرٹ پی رہا تھا اور دل میں کل کے واقعات کو ایک ایک کرکے دہرا رہا تھا۔

ولسن صاحب نے اخبار کو سامنے سے ہٹایا۔ تو میں نے پوچھا:۔

"وہ سیٹھ فیروز جی کا بل براؤن کی جیب میں کس طرح آگیا؟"

"سیٹھ فیروز جی کا بل؟ وہ تو معمولی بات ہے۔ جب چارلس نے براؤن کی جیب سے ہوٹل کا بل نکالا تو اسے پڑھ کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ اس جیب میں جہاں بعد میں اس نے فیروز جی کا بل رکھا۔ مری جانے سے پہلے اس نے ہوٹل کا بل اپنی جیب سے نکال کر پھر براؤن کی جیب میں ڈال دیا اور غلطی کے ساتھ فیروز جی کا بل بھی چلا گیا۔"

"اور ہاں۔ آپ نے خاص مجھے نوٹ پیپر لانے کو کیوں کہا تھا؟"

"میرے اپنے پاس تو وہی نوٹ پیپر ہیں جن پر ہوٹل کا نام چھپا ہوا ہے۔ وہ میں نے اس لئے استعمال نہ کئے تھے کہ کوئی اگر چاہتا تو ان کے ذریعے سے میرا پتہ لگا سکتا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب میری اس حقیری خدمت کے لئے مجھ ناچیز کے شکرگزار ہوں۔ بازار سے نئے نوٹ پیپر خریدنا قرین مصلحت نہ تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔"

"مگر وہ چارلس کا بیان تو نہ صرف میرے نوٹ پیپروں پر بلکہ میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب آپ کی بجائے میرے شکرگزار ہوں تو میں کیا کروں؟"

"جو جی میں آئے کرنا۔ لیکن خدا کے لئے میرا نام نہ لینا۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس یوں تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی تحریر پہچان لیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا ایک نیم سرکاری خط میرے نام آیا:۔

ڈیر مسٹر احمد!

میرے پاس اس بات کے یقین کرنے کے لئے زبردست وجوہات ہیں کہ مسٹر براؤن ساکن باندہ گلی ہوٹل کی موت کے متعلق پولیس کو ناانصافی اور گمراہی سے بچانے میں آپ نے بہت سا حصہ لیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا

چونکہ پولیس کو اس مقدمے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں تمام محکمہ کی طرف سے آپ کی بے نظیر مساعی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کے طریقۂ تفتیش کی تفصیل حالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ اگر آپ ہمیں اس سے آگاہی بخشیں تو سب حالات کو پولیس جرنل میں شائع کر دیا جائے۔ امید ہے آپ میری اس درخواست کو قبول فرما کر مجھے ممنون کریں گے۔

آپ کا مخلص

....

میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔

جنابِ عالی۔

مسز براؤن کی موت کے متعلق میں نے سوائے چارلس ولیم کا بیان لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب انکشافات مجھ سے ایک بدرجہا اعلیٰ دماغ کے غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔"

شاید سپرنٹنڈنٹ صاحب اسے کسرِ نفسی ہی سمجھے ہوں گے میں اور کیا لکھتا۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۹ء)

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ ان کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچہ بچہ ان کی دیانت داری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قول کے سچے اور بات کے پکے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپے تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپے دے کر بھیجتے، انہوں نے نوکر کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا۔

"میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو۔ ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کے رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ ہم کو یا ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو۔ جو ہمارے پاس لائے گا ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔ راقم خواجہ علی احمد"

دکان والے نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کا دستخط دیکھا تو اسے اطمینان ہو گیا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مکر جانے والے آدمی نہیں اور پھر بات کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی۔ یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے؟ جب چاہوں گا، رقعہ جا کر دے دوں گا اور روپے لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے بغیر تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دکان دار کے پاس عبداللہ حلوائی آیا اور کہنے لگا: "میاں کریم خاں! میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلتے ہیں۔ ادا کر دو تو تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔"

کریم خاں نے کہا: "ابھی لو۔ یہ پانچ تو نقد لے لو۔ باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے لینے ہیں۔ یہ دیکھو ان کا رقعہ۔ ذرا ٹھہر جاؤ تو میں جا کے ان سے بیس روپے لے آؤں۔"

عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ قائم تھی۔ کہنے لگا: "تم یہ رقعہ مجھ کو کیوں نہ دے دو۔ میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیے جائیں گے۔"

کریم خاں نے کہا: "یونہی سہی۔" چنانچہ عبداللہ حلوائی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا۔ خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اس رقعے کو بیس روپے کی بجائے لے لینا قبول کر لیتا کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے منشی کے پاس لے جاؤں گا اور وہاں سے

بیس روپے وصول کروں گا۔

ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض میں لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص سیدھا خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ پیش کر دیا۔ منشی نے بیس روپے گن کر اس کو دے دیئے۔ اس نے روپے جا کر ڈاک خانے والوں کو دے دیئے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دیئے۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپے کا کام دیتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی دیانت داری پر سب کو بھروسہ تھا۔ اور جس کی دولت کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا ہے اور قول کا اتنا پکا ہے کہ کبھی ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا۔

اگر ایسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کر دیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرتا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے۔ اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا کہ ان کا کیا پتہ۔ آدمی نیک اور شریف اور دیانت دار سہی لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگنے جائیں اور وہاں کوڑی بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کو لے کر دیکھو تو اس پر اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ عند المطالبہ حامل ہذا کو دس روپیہ سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کر دوں گا۔" اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے۔ بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ اور کوئی قبول کیوں نہ کرے۔ لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جا کر اس کے روپے بھنا سکتے ہیں

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو ڈاک خانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پر ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دیئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لئے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا۔ اسے دس کا نوٹ ضرور لینا پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہئے کہ آسانی سے پاس رکھا جا سکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خوبی ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں۔ اسی روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں، وہاں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔ نوٹوں سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں۔ نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

باوجود ان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو۔ اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ۔ اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب روپیہ بنک میں رکھوا دے۔ بنک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے۔ روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکلوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حصے کا روپیہ دلا سکتا ہے۔ کسی اور کو اپنے حصے کا روپیہ دلانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چیک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو، عبداللہ نے بنک میں بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ بجائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے، وہ اسے دس روپے کا چیک لکھ دیتا ہے۔ چیک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بنک کو بھیج رہا ہے۔ چیک پر مفصلہ ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ . .

بنام فلاں بنک

کریم خاں کو دس روپے دے دو

راقم عبداللہ

کریم خاں کی بجائے عبداللہ اگر کسی اور کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا اسی کو روپے ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے یہ دس روپے کا چیک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بنک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہوگا۔ میں جب یہ چیک لے جاؤں گا۔ مجھے روپیہ ضرور مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چیک لے کے عبداللہ کے بنک میں گیا۔ اور کہا کہ مجھے اس چیک کا روپیہ ادا کر دو۔ بنک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چیک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہیگا لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنک والے عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں بنک میں تو عبداللہ کے تین روپے ہیں۔ مگر چلو فی الحال ہم باقی کے سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کی لاج رکھ لیتے ہیں ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے۔ لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بنک میں ہوتا ہے اس کے اندر اندر ہی چیک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقع پیش آتا ہے کہ بنک چیک ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بنک میں حساب کھول رکھا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چیک لے کر وہ خود عبداللہ کے بنک میں جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بنک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چیک بھی بھجوا دے۔ اس کے بنک والے خود ہی عبداللہ کے بنک سے اس چیک کا روپیہ وصول کر لیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کر دی جائے گی۔ اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی مد میں چڑھا دی جائے گی۔

اس طرح سے یہ سہولت ہوئی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بنک میں محفوظ پڑا ہے نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرتے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بنک جانا پڑا اور روپیہ ایک کے حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک چیک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف "کاغذی روپے" کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چیک۔ ان کے علاوہ اور بھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

(بچوں کے لئے) (خیابانِ اردو)

رونا رُلانا

یہ امریکی ادبی نقاد ایک مقام پر لکھتا ہے کہ مرد ایک منصوبہ ساز ہے اور عورت ایک سیاحی انسان ہے جو اکثر رونی شکل بنا لیتی ہے۔ بتلایئے مصنف کی خوش طبعی نے اس فقرے میں مبالغے اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لئے شاید عورتوں کو اس سے کلی اتفاق بھی نہ ہو لیکن بہر حال موضوع ایسا ہے جس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں۔ گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ کسی کی موت کی خبر سے اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں اسی خبر جب بھی نئے سرے سے سنانا شروع کرتی ہیں ایک نہ ایک تفصیل کا اضافہ کر دیتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آنسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ موت یا بیماری کسی قریبی عزیز کی ہو۔ کوئی پڑوسی ہو، ملازم ہو، ملازم کے ننھیال یا سسرال کا واقعہ ہو، گلی میں روزمرہ آنے جانے والے کسی خوانچے والے کا بچہ بیمار ہو، کوئی دلی اُڑتی خبر ہو، کوئی افواہ ہو غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے ؎

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس بارے میں بھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر ممالک میں بھی رلانے والی کہانیاں خصوصاً نچلے طبقہ کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے قلم کار مصنفین کو اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی فطرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا سرورق غمزدہ لڑکی کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لئے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ کبھی ایک بھولے بھالے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر ہی میں مار دیتے ہیں اور بستر مرگ پر توتلی باتیں کرواتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور ننگا کھڑا کر دیتے ہیں اور بھی رقت دلانی ہو تو اسے سیدھا لے جاتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگتا ہوا دکھا دیتے ہیں کہ "میری بڑھی ماں مر رہی ہے۔ دوا کے لئے پیسے نہیں خدا کے نام کچھ دیتے جاؤ" کبھی کسی ستمگر خوب صورت نیک طینت لڑکی کو چڑیل سی ساس کے حوالے کرا دیا۔ یا کسی بدقماش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا اور وہاں دل کی بھڑاس نکال لی۔ پڑھنے والیاں زار و قطار روتی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر ہچکیوں میں لپٹی ہوئی اور آنسوؤں میں تر ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں، اکثر میں نزع،

بلاتفریق بس جو کچھ ہو، زہر، ظلم، تشدد ایسی نہ ایک چیز کا سامان باندھ دیتا گویا ذہن جاتا رہا، کوئی کر دیتا یا کھانا پکانے کی مفصل کتاب ہو تو تعجبات ہے۔

تو مصیبت کیا ہے؟ ہر بات بات پر باعث ماتم بپا کیا معنی؟ بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس مرثیہ نگار نے کیا غضب کیا؟ مل کے کیا سچ لیکن بڑی بات کیا تھی!

کسی گھر پر موت واقع ہو جائے تو رونے اور مرنے والے کا مقابلہ کیجئے۔ مردوں کا ماتم تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچے کئے چپ چاپ۔ آنکھیں کچھ سرخ ہیں۔ کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں۔ کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر قلق۔ اداسی سی ہے اور قدم ذرا آہستہ اٹھتے ہیں۔ اور عورتوں کا ماتم تو دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے۔ اور جب کوئی نئی عورت ان کی ٹولی سے آ ملتی ہے تو ماتم کی جھنجھناہٹ میں از سر نو ایک ابال اٹھتا ہے جیسے بھٹی کوئی ہوائی جہاز بھرے گرتے۔ مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں لیکن عورتوں کے ہاں مہینہ بھر کا ایک کلب قائم ہو جاتا ہے۔ گھر گھر پر گھڑیاں لگائی جاتی ہیں اور چیخوں پر چیخیں ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پرسی رہ جاتی ہیں تو بیماروں وہ وہ بیماریاں نکال کے آتی ہیں جو ڈاکٹر کے وہم و گمان میں نہ تھیں۔ جتنی دیر سرہانے بیٹھی رہیں بیمار کی ہر کروٹ پر ہاتھ ملتی ہیں۔ بیچارہ کبھی کلام اشارت کرنے کو کبھی کھانسنے تو یہ سورۂ یٰسین تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگت کی زردی، بدن کی کمزوری، سانس کی بے قاعدگی، ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر چار و ناچار سخت آزار میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ جوں جوں بیمار پرس عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے موت قریب آتی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مریض کے بچ جانے پر صدمہ ہوتا ہوگا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں خوشی سے رو دیتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کی اشک باری کے لئے خود بھی سامان مہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں۔ ایک پرانے زمانے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ ساری عمر وہ بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اگر کوئی پڑوسن آ کے کہہ دے کہ اے بوا! ماشاء اللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونق برس رہی ہے تو جھنجھلا کر بول اٹھتی ہیں کہ تیرے منہ میں خاک۔ میں آدھی جاتی ہوں اور میرا جاننے والا ہی میں منہ کی نظر آتی ہوں۔ اور کوئی آ کے کہہ دے کہ اے بی بی تجھے کیا ہو گیا؟ تو دن بدن گھلتی جاتی ہے۔ نہ جانے تجھے کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً خالہ کا لقب مل جاتا تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ گھر کا کام جوں کا توں چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سناتے جاتے تھے اور چلتے وقت دو چار روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں جن کی ادائیگی کے لئے کبھی تقاضا نہ کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے۔ بہت ذلیل مرض ہے لیکن عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوشحال گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی دکھ وضع کر لیتی ہیں اور موقع موقع پر سنا کر رلا دیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو فی الواقع غمگین یا مصیبت زدہ ہیں۔ ان کی ہنسی اڑانا پرلے درجے کی شقاوت ہے۔ جو خدا مجھے نصیب نہ کرے۔ کسی کا غم ایسی بات نہیں جو دوسرے کی خوش طبعی کا موضوع بنے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا دکھ ضبط، تحمل اور ہمت سے دور ہو سکتا ہے۔ کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کرایا جائے۔ کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو شگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔ غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔ مہذب شخص کی یہی پہچان ہے۔ اپنے دکھ کے قصے کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔ خود بھی ہنسو اور اوروں کو بھی ہنساؤ۔ دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے۔ اس کو کم کرنے کی کوشش کرو۔ ہنسنا اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے۔ ظرافت نگار مصنفین کو میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص انمول ہے جو اپنی تحریر سے ہزاروں لوگوں کو خوش کر دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا جو اپنے زور قلم سے ہزاروں جوان، معصوم، خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رلاتا ہے۔ اور رلانا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور ہزار قابلِ افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کر کے بھی اپنی انشا پردازی پر ناز کرتا ہے۔

(تہذیبِ نسواں)

مینہ برس رہا ہے

مینہ موسلادھار برس رہا ہے۔ ندی نالے بڑھتے ہوئے ہیں۔ بے وقت شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ درخت ... پودے اُبلتے ہوئے دُھلی ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آرہے ہیں۔ پھول اور پرندے۔ نغمہ اور نکہت۔ رنگ اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔ اے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔

بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے موہوم دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھ کر دل میں ٹیسیں اٹھ سکتی ہیں۔ مگر جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے۔ درخت جھومتے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں۔ اُن کے پتے ہل ہل کے چھپتے اور جھک جھک کے چومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں مجھے تیرا تبسم نظر آتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تو اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ پرندے کھیتوں میں چھپ چھپ کے گاتے ہیں۔ میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں اور ترستا ہوں۔ یہ تو بارش کے اس پار کی دنیا ہے۔

بجلی چمکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس دنیا سے کوئی پیغام آیا۔ لیکن وہ تڑپ تڑپ کے ترساتی ہے اور میں ترس ترس کے تڑپتا ہوں۔ اس کو کہہ کر اپنا ایک نقرئی تیر میرے سینے تک پہنچا دے۔ اور اس کو میری حسرتوں میں بجھا کر تجھ تک لے جائے۔ لیکن اے میری حسرتوں کی امید! یا تو اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں اور نالے بہہ رہے ہیں میری ضعیف التجائے درد کو سن سکتی ہے؟

پرندے چہچہاتے ہیں۔ میں چپ بیٹھا ہوا سنتا ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک نغمہ ہے۔ ان کو کہہ کر وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گانے دیں۔ کہ میرے نغمے کی موت تیرے بالوں کی طرح کائنات کے دل میں بکھر جائے۔ میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک شراب ہے کہ جس میں ساقی قیامت کے ایک آبگینے کے ٹکڑے چھلک رہے تھے۔ میرے دل میں خواہش ہو رہی ہے کہ اس بلبل کو بھیج دے کہ آ کے رس جائے۔ اور تیرے پاس روتی ہوئی جائے۔

اے میری مغرور انتظار! تو بارش کے اس پار آ جا۔ جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے خواہشوں اور آرزوؤں کی پاکیزگیاں لئے تیری راہ تک رہی ہیں۔ اس پار آ جا۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں اور اپنی تمام آرزوؤں کو ایک درد انگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم ہو جاؤں جس طرح تو آج میرے لئے ہے۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء)

مسئلہ تونیسیہ

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی اس تقریر کا متن درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو حفاظتی کونسل میں تونیسیہ کے مسئلے پر کی۔ پروفیسر مرحوم اس اجلاس کے صدر بھی تھے۔

اس اجلاس کے مقررین کی فہرست میں اگلا نام پاکستانی وفد کا ہے۔ اگر میرے رفقا کو اعتراض نہ ہو تو میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں تقریر شروع کروں۔

فرانس کے نمائندے نے اس معاملے کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں میرے وفد نے انہیں اسی غور اور توجہ سے سنا جن کے وہ مستحق تھے۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی تھی کہ فرانسیسی نمائندے نے ایجنڈا منظور کرنے کے ضمن میں طریقِ کار کی بحث کے متعلق سب سے پہلے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تاہم جب انہوں نے اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی مخالفت کی تو میری خوشی حیرت میں بدل گئی۔ حیرت اس لئے نہیں ہوئی تھی کہ فرانسیسی وفد کی جانب سے اس قسم کے رویہ کی توقع نہ تھی۔ اس لئے ہوئی کہ اصل مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے تو سخت اختلاف کیا اور تقریر ایسی کر ڈالی جو یہ سوال ایجنڈے پر آجانے کے بعد ہی کی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ نمائندے نے یہ طرزِ عمل بظاہر اس لئے اختیار کیا کہ کم از کم اسے واقعی سیر حاصل بحث ضروری محسوس ہوئی۔ جب واقعہ یہ ہے تو اس کا یہ کہنا ہمارے لئے یقیناً حیرت کا موجب ہے کہ وہ ایجنڈے کی منظوری کے خلاف رائے دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے خود تقریر کے لئے موقع کی تلاش تھی اسے موقع مل بھی گیا اور اس سے فائدہ بھی اٹھا لیا گیا۔ گویا ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ مگر وہ دوسروں کو اس موقع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ دوسرے جو لوگ اس میز کے گرد جمع ہیں انہیں اس موقع سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انہیں بحث میں حصہ لینے کا ٹھیک ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا فرانس کے نمائندے نے اپنے لئے حاصل کرنا مناسب جانا۔ لیکن یہ بات ایک حد تک ناواجب و غیر مناسب ہے کہ خود تو تقریر کر لی اور فرانس کا نقطۂ نگاہ پیش کر دیا ـــ میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی قابلیت سے پیش کیا ـــ گویا اس نمائندے کی حد تک ایجنڈا منظور ہو چکا تھا پھر ایجنڈے کی منظوری کی مخالفت کرکے دس دوسرے وفود کو اظہارِ رائے کا موقع دینے سے اختلاف کی کوشش ان کے حقوق پر چھاپہ مارنا ہے جو اس غرض سے حفاظتی کونسل کو تحریری درخواستیں بھیج چکے تھے۔

نمائندہ فرانس نے اپنی تقریر میں جس منطق کا سہارا لیا ہے اگر اس کی پیروی کی جائے تو نہ محض یہی ضروری نہیں کہ ایجنڈا منظور کر لیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان دس وفود سے کہا جائے کہ وہ فوراً حفاظتی کونسل میں اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ اور فرانس کے زاویۂ نگاہ کی مخالفت میں اپنا موقف پیش کریں ـــ واضح رہے کہ یہ وفود ان قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جو جمعیت اقوام متحدہ کی رکن ہیں اور اس معاملے کے متعلق حفاظتی کونسل سے

درخواست کرچکے ہیں۔

فرانس کا نمائندہ دو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا یعنی اس وفد نے حفاظتی کونسل کے نام اپنے مکاتیب کے ساتھ جو ضمیمے منسلک کئے تھے انھیں ملاحظہ کر کے مبارک ـــــ نمائندہ فرانس کے نزدیک ناخوشگوار ـــــ یہ تھے کہ ان میں سے وہ تمام عبارتیں پڑھ دیں جن کا ترجمہ ان کے خیال کے مطابق درست نہیں کیا گیا تھا۔ موصوف نے زور ان باتوں کا جواب دینے پر نہ دیا بلکہ صراحت صرف کیا کہ انہیں بہتان سے تعبیر کیا۔ مثلاً انہوں نے گیارہ ممالک پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے حکومت فرانس کے خلاف بہتان آمیز بیان دیا ہے۔ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس الزام تراشی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ دوسرے دس وفود بھی ـــــ اگر انہیں اظہار خیال کا موقع ملا تو ـــــ اسی طرح احتجاج ہی کریں گے۔ نہ ہمارا یہ منصب ہے، نہ ارادہ اور نہ خواہش کہ ان کے عظیم ملک کی یا اس کی حکومت کو غیر ذمہ دار طریقے سے بہتان طرازی کا نشانہ بنائیں۔

فرانس کے نمائندے نے اپنی تقریر میں متعدد واقعات شمار کئے ہیں اور مزید کہا ہے کہ تحمل سے کام لیا ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ہم دس یا گیارہ سادہ لوح قوموں نے "پیلیس ڈی شیلو" کی روش قوں میں سوچے سمجھے بغیر بعض غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں سن لیں۔ پھر ہم نے وہ قدم اٹھایا جو ہرگز اٹھانا نہیں چاہئے تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ موصوف نے ایسی بات کہہ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع دیا کہ ہم نے کس درجہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ ذمہ داری کے احساس کا کتنا اچھا ثبوت دیا اور کتنے تامل و تذبذب سے یہ معاملہ غور و خوض کی غرض سے حفاظتی کونسل کے سامنے لائے ہیں۔

اب ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ حکومت تونس کے دو وزیر ـــــ ایسے وزیر جنہیں اپنی وزارت کے زمانے میں حکومت فرانس کا اعتماد بھی حاصل تھا ـــــ پیرس پہنچے۔ حفاظتی کونسل کے صدر کو ایک مکتوب بھیجا جس میں کونسل کی توجہ تونس کے بعض افسوسناک اور الم انگیز حالات کی طرف منعطف کرائی۔ اس خط کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ مکتوب طویل عرصے تک اقوام متحدہ کے دفتر خانہ میں پڑا رہا۔ سورج کی کرنیں نہ اسے پیرس کے "پیلیس ڈی شیلو" میں پہنچ سکیں اور نہ نیویارک کے اس ایوان میں جس میں بے شمار کھڑکیاں موجود ہیں۔ اسے لوگوں کی نگاہوں تک پہنچنا اس دن نصیب ہوا جب میرے وفد نے درخواست کی کہ اس کی نقلیں تمام اراکان کے پاس بھیجی جائیں۔

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ مکتوب حفاظتی کونسل کے صدر کو پہنچایا گیا تھا اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اسی دور میں تونسیہ قتل عام، فسادات، گرفتاریوں اور تخریبی کارروائیوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ـــــ میں صرف تشدد کے واقعات کا ذکر کر رہا ہوں اور اس مرحلے پر بھی کسی کو ان کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرانا چاہتا ـــــ اس سارے علم کے باوجود ہم صرف اس امید پر بیٹھے صبر و تحمل سے انتظار کرتے رہے کہ حکومت فرانس خود دانش مندی سے کام لے گی، موقع کی نزاکت کا احساس کرے گی۔ ان لوگوں کے ساتھ خوشگوار سمجھوتے کا بندوبست کرے گی جن کا شمار روئے زمین کے شریف ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

ہمارا انتظار بہت دنوں تک جاری رہا۔ ہم نے آپس میں مشورے کئے۔ اس مسئلے پر بحث و تمحیص جاری رکھی۔ ہم نے مختلف ذرائع کو غیر رسمی طور پر اور دوستانہ انداز میں حکومت فرانس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہمیں اس امر کا احساس تھا کہ یہ مسئلہ انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ایسا نہیں کرنا چاہیے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے حکومت فرانس کو پریشانی میں مبتلا کر دیا جائے بشرطیکہ اس کے ارادے نیک ہوتے، اور ہمیں یہی امید تھی کہ اس کے ارادے نیک ہیں۔

عام احساس یہ تھا کہ اس معاملے کو جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے آخری ہفتوں میں یا اس سے بھی پہلے پیش کر دیا جائے۔ لیکن زیادہ دور اندیش اصحاب کی رائے کو فوقیت حاصل ہوئی۔ ہم سے کہا گیا کہ تحمل سے کام لینا چاہئے۔ پندرہ ملکوں کے نمائندے ایک وفد کی شکل میں جنرل اسمبلی

سے صدر مسٹر پیڈیلا نروو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استدعا کی کہ وفدِ فرانس سے یا جس کی وساطت سے حکومت فرانس سے کہا جائے کہ اہلِ تونیسیا کی آواز اس منزل پہ نہ پہنچایا جائے جس کے بعد انسان تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن جاتا ہے۔ امن عالم کا تقاضا یہی ہے۔ مقاصد حفاظت کا تقاضا بھی یہی ہے اور دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا تقاضا بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔

جنرل اسمبلی کے صدر نے ہمارا پیغام پہنچا دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور اسے پورا کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ پلیس ڈی شیلو کے برآمدوں میں سراسیمہ گشت لگانے والے لوگ تیونس کے وزیر نہ تھے بلکہ ہم تھے جو بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ہم اس پیغام کے جواب یا اس سلسلے میں کسی اشارے کا انتظار کرتے رہے افسوس کہ نہ کوئی جواب ملا اور نہ کوئی اشارہ ملا۔

مزید انتظار کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر جنرل اسمبلی کے صدر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ ہمارے جذبات حکومت فرانس تک ایسے ذرائع سے پہنچا دیئے جائیں جنہیں وہ بہتر خیال فرمائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے لئے قدرتی اور معمول کے عین مطابق طریق کار یہ تھا کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار جنرل اسمبلی کے اجلاس میں کرتے۔ لیکن اس اجلاس کے آخری ایام میں یہی اچھا معلوم نہ ہوا کہ اقوام متحدہ کے کام میں مشکلات اور پیچیدگی پیدا کر دیں۔ صدر نے ہم سے پھر یہ وعدہ کیا کہ یہ پیغام حکومت فرانس تک پہنچایا جائے گا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ بھی پورا کر دیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ آیا ہمیں یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کر دینا چاہئے۔ اس ضمن میں ہمیں ایک بڑی رکاوٹ پیش آگئی کیونکہ کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ انہی ممالک کو جن کے نام موجودہ شکایت نامے پر درج ہیں۔ انتہائی المناک، افسوسناک اور ناخوشگوار تجربے سے گزرنا پڑا۔ ہم میں سے متعدد نے مراکش کا مسئلہ جنرل اسمبلی میں پیش کرنا چاہا تھا۔ عارضی ایجنڈے کی اس شق کو جنرل کمیٹی کے روبرو زیر بحث آنا تھا۔ اس کمیٹی میں ان ممالک کو اکثریت حاصل نہ تھی جن کے نام اس دستاویز پر ثبت ہیں۔ جنرل کمیٹی نے اس مسئلے پر بحث کی اجازت نہ دی یقیناً اس نے کہا کہ اس سوال پر بحث فی الحال ملتوی کر دی جائے۔ اس وقت ہمیں خوب معلوم تھا کہ "فی الحال" کا مطلب ایک غیر معین عرصے کے لئے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دینے کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یہ معاملہ جنرل اسمبلی کے ابتدائی اجلاس میں زیر بحث آیا اور اس پر متعدد نمائندوں نے یکے بعد دیگرے اپنے شدید جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن ہم اس سوال کو ایجنڈے پر لانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم دل شکستہ ہو گئے پھر بھی مزید انتظار مناسب سمجھا۔ نیویارک پہنچے۔ آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہم برابر اخباروں میں تشویش انگیز خبریں پڑھتے رہے ہر روز اصلاح احوال کی نئی امیدیں باندھتے رہے۔ ہر روز یہی توقع تھی کہ فرانس اور اہل تونیسیا کے درمیان بہتر مفاہمت ہو جانے کی علامات ظاہر ہوں گی۔ ہم اہل تونیسیا اور جمہوریہ فرانس کی سلامتی کے لئے دعائیں کرتے رہے لیکن خبریں روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں۔

اب ہم نے سوچا کہ ہمیں اخبارات کی خبروں پر ہی کلیۃً انحصار نہ کر لینا چاہئے اور غالباً بہتر ہو گا کہ اہل تونیسیا میں سے چند اصحاب کو نیویارک بلایا جائے تاکہ ہم ان پر جرح کر سکیں اور معاملے کو حفاظتی کونسل میں لے جانے سے قبل ذمہ دار وفد کی حیثیت میں یہ جان لیں کہ صحیح صورت حال کیا ہے ہمیں معلوم ہوا کہ اہل تونیسیا کے نیویارک آنے کی راہ میں سخت اور ناقابل عبور مشکلات حائل ہیں۔ پتہ چلا کہ تونیسیا کے ذمہ دار عہدہ داروں سے ان کے سفارتی پروانۂ راہداری واپس لے لئے گئے ہیں۔ اگر فرانس کا نمائندہ اس بیان کی تردید کر سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ بہر کیف یہ امر واقعہ ہے کہ وزرا پروانۂ راہداری کی مشکلات کے باعث نیویارک نہیں آ سکتے تھے۔ عالم اضطراب میں ہم نے کچھ اور لوگوں کو بلوانے کی بے انتہا سعی کی۔ لیکن ان کے راستے میں بھی ہر طرح کی مشکلات حائل تھیں۔

اس کے بعد ان چند اقوام کے عظیم دوستوں نے جن کے نام یہاں دیئے گئے ہیں۔ ہمیں بتایا کہ حکومت فرانس کو پارلیمانی بحران سے سابقہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک یہ بحران دور نہیں ہو جاتا حکومت مذکورہ سے اس معاملے میں کسی واضح اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم کچھ زیادہ پُرامید

نہ تھے پھر بھی ہم نے سوچا وہ دانش مندی نہ سہی جوانمردی کا تقاضا یہی ہے کہ فرانس میں حکومت کا استحکام ہو جانے کا انتظار کیا جائے آخر یہ بھی ہو گیا اور حکومت کو استحکام مل گیا۔ ہمیں فرانس کی خاطر اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب ہم پر امید تھے کہ حکومت فرانس اگلا قدم اٹھائے گی۔

حکومت کے استحکام کے چند روز بعد ہم نے دیکھا کہ صرف یہی نہیں تیونس میں صورت حال اصلاح پذیر نہیں ہوئی بلکہ ہمارے سامنے مایوسی دہشت اور حیرت کا ایک طوفان اٹھ آیا۔ جب ہم نے سنا کہ جمہوریہ فرانس نے تیونس کی پوری کابینہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ پوری کابینہ سے میری مراد وزارت کے تمام وہ افراد ہیں جو حکومت فرانس کے قابو میں آ سکتے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حکومت فرانس کابینہ کے دو ممبروں کو پکڑ نہیں سکی۔ یہ وہ کابینہ تھی جسے ۱۹۵۰ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان مصالحت ہو جانے پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اور یہی کابینہ تھی جسے فرانس اور تیونس کے درمیان بہتر مفاہمت کے لئے اصلاحات کے معاملے پر حکومت فرانس کے ساتھ بات چیت کرنا تھی۔ وہ سب اب جیل میں پہنچ گئی۔ تیونس کے ممتاز افراد میں یہ آخری لوگ تھے جو قید ہوئے۔ تیونس کی سب سے بڑی اور مقبول عام پارٹی نیو حزب دستور کا کوئی حیثیت لیڈر رہا نہ تھا جو پہلے جیل میں نہ پہنچ چکا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہماری اطلاع کے مطابق ہزاروں تیونسی نظر بندی کے کیمپوں میں پہنچا دیئے گئے تھے۔ سیکڑوں ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ اگر اس اطلاع کی تردید کی جا سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ تیونس کے بعض علاقوں سے اطلاعات حاصل کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

ہم نے پھر بھی انتظار کیا۔ اور سوچا کہ بہرحال ہم پوپ سے بڑے کیتھولک ہونے کا دعوے نہیں کر سکتے۔ اگر خود اہل تیونس ایک اور حکومت کی تشکیل کریں اور وہ خوش اسلوبی سے کام کرنے لگے تو ہمارے لئے کوئی وجہ اضطراب نہ ہو گی۔

ہمیں اس انتظار میں بہت دن گذر گئے اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ باکوش نامی ایک صاحب کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اس کی سابقہ کیفیت معلوم کرنی چاہی اور ایسے لوگوں سے حالات دریافت کئے جو اس کے ماضی سے آگاہ تھے انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب کسی وقت سول کے سرکاری ملازم تھے اور دوران جنگ میں تھوڑی دیر کے لئے وزارت عظمیٰ کی گدی پر براجمان ہوئے تھے۔ تیونس میں ان کی قیادت تسلیم کرنے والے افراد زیادہ نہ ہوں گے اور یہ تنہا بزرگوار ہیں جنہوں نے ہماری دانست میں فرانس کے رابطہ وقت وزارت عظمیٰ کا عہدہ قبول کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے ہمیں بتایا گیا کہ وہ کابینہ وزارت تشکیل کریں گے۔ ہم نے انتظار کیا اور دن گذرتے گئے۔

یہ مسٹر باکوش وزیر اعظم ہیں۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کی ساری قوت اور مال ان کی پشتیبان ہے اور حکومت فرانس ان کی امداد و اعانت کے لئے کمربستہ ہے لیکن یہ حضرت اب تک کوئی کابینہ نہیں بنا سکے۔ "ہیرلڈ ٹریبیون" اور "نیویارک ٹائمز" میں یہ اطلاعات شائع ہوئی ہیں کہ تیونس کے اس وزیر اعظم کے خلاف عوام کی ناراضگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب وہ بے (حکمران تیونس) سے ملنے کے لئے محل میں تشریف لے جاتے ہیں۔ تو عقبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔

وزیر اعظم یا فرانسیسیوں نے دباؤ ڈال کر ایک اور ایسے شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ جو وزیر بننے کے لئے تیار ہو گیا۔ ان صاحب نے عوام کے جبر و قہر کا نشانہ بنتے ہوئے وزارت کے سنگھاسن پر بیٹھنے کی ہامی تو بھر لی۔ لیکن جب عملاً وزارت سنبھالنے کا وقت آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ عوام کی خفگی اور نفرت اس کے خلاف حد سے بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے وزارت کا یہ "تاج" سر پر رکھنے سے انکار کر دیا اس پر فرانسیسیوں نے اسے جیل میں ڈال دیا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیونس نے آج کل برائیوں اور خرابیوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں کا دستور یہ ہے کہ آپ وزیر بنئے اگر اس سے انکار ہے تو سیدھے جیل جائیے۔

اس کے بعد ہم نے سنا کہ فرانس کی جانب سے موسیو ہاٹکلوک نئی اصلاحات لے کر تونیسیہ پہنچے ہیں۔ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ اہل تونیسیہ کے لئے امیدوں کا جو پشتارہ لے کر گئے تھے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس اجلاس میں دوسرے ممالک کے جو نمائندے تشریف فرما ہیں ان کے سامنے میں فراہم کردہ اطلاعات میں سے چند فقرے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے تمام مندوبین کو پتہ چل جائے گا کہ موسیو ہاٹکلوک کے تونیسیہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی اور یہ اس لئے گئے تھے کہ تونیسیہ کو درست بنا دیں۔ اور فرانس کے وعدے کے مطابق اسے آزادی اور اصلاحات کی دولت سے مالا مال کر دینے والے تھے۔

موسیو ہاٹکلوک ۱۳ جنوری کو تونیسیہ پہنچے۔ ان کے استقبال کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کی سب سے بڑی تقریب بنایا گیا۔ جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ آپ نے ایک بحری جنگی جہاز سے اتر کر ساحل پر قدم رکھا۔ شہر پر فرانسیسی فوجوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ جدھر سے گزرے سڑکیں مسلح فوجیوں کی قطاروں سے اٹی پڑی تھیں۔ سارا شہر بکتر بند گاڑیوں، مسلح کاروں، اور ٹینکوں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا یہ عام استقبال نہ تھا بلکہ فرانسیسی نمائندے کی آمد کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کے لئے موزوں ترین موقع بنا لیا گیا تھا۔

ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے پہلی ہی ملاقات میں ان پر واضح کیا کہ وہ ان سے براہ راست رابطہ رکھنا پسند کریں گے۔ تاہم وزیر اعظم نے ریذیڈنٹ جنرل کو بے کی جانب سے مطلع کر دینا ضروری سمجھا کہ تمام سرکاری رابطے وزیر اعظم کی وساطت سے ہونے چاہئیں۔

جب حکومت تونیسیہ نے ۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنی شکایت اقوام متحدہ میں پیش کی تو اس وقت ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے علیحدگی اور تخلیہ میں گفتگو کرنے کا مطالبہ کیا۔ بے نے انکار کر دیا۔ اور انہیں وزیر اعظم سے بات کرنے کی ہدایت کی۔ ۱۵ جنوری کو ریذیڈنٹ جنرل نے لکھا کہ وہ بے سے وزیر اعظم کی موجودگی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے متعدد شرائط پیش کیں۔ ایک یہ کہ اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ دوسرے یہ کہ وزارت بدل دی جائے۔ تیسرے یہ کہ بے دو فرمانوں پر دستخط کریں۔ ایک کے ذریعے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کر دیں اور دوسرے کے ذریعے جنرل گاربے کو وزیر دفاع کا عہدہ سونپ دیں۔ یہ جنرل گاربے وہی ہیں کہ جن کے نامۂ اعمال میں مڈغاسکر میں سب سے بڑا فوجی اقدام شامل ہے۔ بے نے وزیر اعظم کو ہدایت کی کہ ریذیڈنٹ جنرل کو ان شرائط کا جواب دے دیا جائے۔ وزیر اعظم نے جو جواب دیا وہ ریکارڈ میں موجود ہے اس نے بتایا کہ وزیر اعظم کو بے نے تونیسیہ کے متعلق اقوام متحدہ میں شکایت پیش کرنے کا مجاز بنایا تھا۔ اس سے نمائندہ فرانس کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی ہے کہ اقوام متحدہ میں یہ شکایت بے کی ہدایت پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس کے لئے خود وزیر اعظم کے اختیارات ہی کافی تھے۔ لیکن اگر یہ موقف پیش کیا جائے کہ بے کو ہی اجازت یا ہدایت دینا چاہئے تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اجازت یا ہدایت بے سے حاصل کر لی گئی تھی۔

اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل اور جنرل گاربے کو پیرس طلب کر لیا گیا وہ ۲۲ مارچ کو تونیسیہ واپس پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے بھی انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ چنانچہ ۲۴ مارچ کو بات چیت کے لئے انہیں طلب کیا گیا۔ لیکن اس موقع پر تونیسیہ کے وہ تمام وزرا بھی موجود تھے جو اس وقت شہر میں تھے۔ ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے کہا۔ حکومت فرانس بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے لیکن اس شرط پر کہ کابینہ کو موقوف کر دیا جائے اور اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ بے نے یہ دونوں باتیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے ایک دستاویز بے کو دکھائی جس پر فرانسیسی وزیر خارجہ کے دستخط تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ ریذیڈنٹ جنرل امن و قانون بحال کرنے کے لئے ——— مجھے امید ہے کہ میں بعد میں کسی موقع پر یہ واضح کر سکوں گا کہ استعمار پیشہ حکومتوں کے نزدیک "امن و قانون" کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے ——— اور فرانس کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو کچھ بھی کارروائی کرنا مناسب سمجھیں اس کا انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ بے نے جواب میں اس مسئلے پر سوچنے کے لئے مہلت مانگی۔ اور اس سوال پر اپنی پوزیشن محفوظ رکھی۔ ریذیڈنٹ جنرل نے انہیں صرف تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا۔ یہ سلوک

فرانس کی حکومت تیونس کے حکمران سے کر رہی ہے جس کے بارے میں فرانسیسیوں کا دعویٰ ہے۔ ریذیڈنٹ جنرل جس طرح کی سیاسی کوشش کر رہے ہیں اس کو قوت کا مظاہرہ کر کے اس عمر رسیدہ اور قابل احترام بادشاہ کو ایسا جواب دینے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ اس طریقے سے جواب حاصل کرنے کے متعلق ہمارا یہی خیال ہے کہ اس سے کسی ضمیر کی تسکین نہیں ہو سکتی۔

جب بے کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تو انہوں نے جمہوریہ فرانس کے صدر کو بجری تار بھیجا جس میں بتایا کہ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل نے حکومت کے نام سے ان پر کس طرح دباؤ ڈالا ہے۔ ساتھ ہی ریذیڈنٹ جنرل کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ اسی رات ریذیڈنٹ جنرل نے تیونس کے وزیراعظم اور تین دوسرے وزراء کو گرفتار کر لیا۔ ایک اور وزیر موجود تھا لیکن بڑھاپے اور بیماری کے باعث سے گرفتار نہ کیا گیا۔ یہ جناب سعد اللہ تھے۔ اس بوڑھے اور بیمار وزیر نے ریذیڈنٹ جنرل کو لکھا "مجھے گرفتار کر لیجئے تاکہ میں قید خانے میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہ سکوں"۔ ان سب کو تیونس کے جنوبی علاقے میں بھیج دیا گیا۔ سینکڑوں سیاسی کارکنوں، صحافیوں، طالب علموں، وکیلوں اور دوسرے معززین کو جن کی ہمدردیاں نیشنلسٹوں کے ساتھ تھیں گرفتار کر لیا گیا۔ تمام نیشنلسٹ اخبارات کو بند کر دیا گیا۔ تمام مذہبی اسکولوں کے دروازوں پر قفل چڑھا دیئے گئے۔ اور مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے پاس ایسا ذریعہ نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ ملک بھر میں کس قدر گرفتاریاں ہوئیں۔ ان کی صحیح تعداد کیا تھی تاہم یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ نظر بندی کے جو بڑے بڑے کیمپ قائم کئے گئے تھے ان میں مقید نیشنلسٹوں کی تعداد ہزاروں سے کیا کم ہو گی؟

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ فرانسیسی فوجوں نے بے کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ ریذیڈنٹ جنرل ۵ ہی صبح کو بے سے ملنے کے لئے گیا مگر اس نزدیک میں کسی دوسرے کو موجود رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے اعلان کیا کہ بے نے ایک فرمان جاری کرنے کی منظوری دے دی ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس پر بے نے دستخط نہیں کئے تھے۔

ہماری اطلاع کے مطابق تیونس کے حکمران اور ریذیڈنٹ جنرل کی اس خفیہ ملاقات میں جو کچھ ہوا وہ بے کے لئے ہرگز خوشگوار نہ تھا۔ لیکن جب ریذیڈنٹ جنرل ملاقات کر کے باہر آیا۔ تو اس نے موجود لوگوں سے ہنستے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اندر تو بڑے پیار محبت کی باتیں ہوتی رہیں"۔ یہ ہولناک اور کرب انگیز تمسخر اس بوڑھے شخص سے کیا گیا جس کے تمام ساتھی اس سے چھین لئے گئے تھے۔ اور جو تیونس میں فرانسیسی حکام کے بھاری فوجی دباؤ کا مقابلہ بہتر مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

موجودہ صورتِ حال کا یہ نقشہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک آلۂ کار کو جس کا نام باکوش ہے نیا وزیراعظم بنا دیا۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ وہ کب تک وزیراعظم رہے گا۔ البتہ اگر مجھے پیش گوئی کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ اسے اپنے ضمیر کی ملامت یا جیل میں اپنے مقید نیشنلسٹ بھائیوں کی ملامت کے زیرِ اثر یہ عہدہ جلد از جلد ترک کرنا پڑے گا۔ حالت یہ ہے کہ وہ تا حال اپنی کابینہ میں ایک بھی وزیر نہیں لے سکا۔ اور ادھر ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ فرانس کے حکام اصلاحات کی خوب صورت سکیموں اور تیونس کو خود مختاری دینے کے منصوبوں کے ساتھ منتظر کھڑے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ ان سکیموں اور تجویزوں کے بارے میں گفتگو کس سے کریں گے؟ انہیں آخر بات چیت کس سے کرنا ہے؟ کیا خواہش یہ ہے کہ جس میز پر بیٹھ کر انہیں گفتگو کرنا ہے اس کے دونوں جانب صرف فرانسیسی ہی ہوں یا پھر ان کی کٹھ پتلیاں ہوں؟ اگر ان کا مقصد کچھ کام کرنا ہے اگر الفاظ بے معنی نہیں ہو گئے اور اگر وہ فی الواقع کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں تو نہ صرف انسانیت کے نام پر بلکہ عام عقل اور منطق کے نام بھی ضروری اور لازم ہے کہ وہ بات چیت ان لوگوں سے کریں جو فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ ان لوگوں سے بات چیت کرنے کا کیا فائدہ جو خود فرانسیسیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہے ہیں؟

اس وقت صورت حال یہ ہے لیکن فرانس کے نمائندے نے کہا ہے کہ چند ہفتے قبل تو حالات ایسے تھے جن پر حفاظتی کونسل یا جنرل اسمبلی میں بحث کے لیے شاید کوئی وجہ جواز ہوتی۔ آج یہ صورت ہرگز نہیں اور حالات کی ابتری ختم ہو چکی ہے اب تونیسیہ میں امن، خوش حالی، شادمانی اور دوستی کا دور دورہ ہے — لیکن حالات وہی ہیں جو اور پیش کیے گئے ہیں۔ ہزاروں تونیسی جیلوں میں بند ہیں۔ پوری کابینہ جیل میں ہے اور نیشنلسٹ تحریک کے تمام سربراہ جیل میں ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کی عزت و حرمت نہ صرف اپنے ملک میں ہے بلکہ باہر بھی ہر جگہ انہیں ویسی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کیا یہی وہ خوش حالی اور شادمانی کی صبح ہے جس کی نوید ہمیں فرانس کے نمائندے نے سنائی ہے، اور کہا ہے کہ ہمیں اس صورت حال پر بحث نہیں کرنی چاہیے؟

اس مسئلہ میں یہ میری پہلی مداخلت ہے۔ میں اسے مختصر رکھوں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے وقت کم ہے اور دوسرے مندوبین بھی کچھ کہنے کے خواہاں ہیں۔ میں اس مسئلے پر پھر اظہار خیال کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مختصراً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ساری اطلاعات کے مطابق شاید ہم اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے لیے سات مثبت ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ ہمارا یہ اندازہ غلط نکلے تو ہم سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ لیکن اب تک ہمارا خیال یہی ہے کہ اتنے ووٹ ہمیں نہیں مل سکیں گے۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہے کہ یہاں ووٹ نہ دینے کا مطلب بھی منفی ووٹ ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس مسئلے کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے قبل پیرس کے اجلاس میں مسئلہ مراکش کا ہوا تھا۔ لیکن کونسل میں یہ سوال گیارہ ملکوں نے پیش کیا ہے یہ تمام ملک اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ اور انہیں غیر ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو اقوام متحدہ کے راستوں میں یونہی گھومتے پھرتے ہوں۔ وہ اقوام متحدہ ہیں اقوام متحدہ کا ممتاز جزو ہیں۔ انہیں اعتماد و یقین ہے کہ یہی ایک ادارہ ہے جس میں وہ دکھ درد کا مداوا تلاش کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس اور کوئی راہ نجات نہ ہو۔

کیا فرانس کی حکومت اس بات پر خوش ہوگی کہ اہل تونیسیہ اپنی تکالیف کے ازالے کے لیے تحریکات چلاتے رہیں؟ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے سیاست سے غیر ذمہ دارانہ طریقے اختیار کرنے لگیں؟ کیا کوئی اور تنظیم ایسی موجود ہے جو اقوام متحدہ سے بہتر کام انجام دے سکتی ہے؟ فرانس والے انہیں کہاں بھگانا چاہتے ہیں؟ میں یہ سوال تمام ان فرانسیسیوں سے کر رہا ہوں جن تک میری تقریر کے الفاظ دیر بدیر پہنچیں گے اگر تونیسیہ جیسی صورت حال پر اقوام متحدہ میں بحث نہیں ہو سکتی تو اقوام متحدہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر مظلوم و مقہور اقوام غیر ذمہ دار ممالک کی وساطت سے ـــ نمائندہ فرانس اور دوسرے نمائندوں کو خوب علم ہے کہ یہ ممالک چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے ایشیا سے عبارت ہیں ـــ اپنی آواز یہاں نہیں پہنچا سکتیں تو پھر ہم لوگ یہاں کس غرض سے جمع ہیں؟ عملی طور پر سارا ایشیا اقوام متحدہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ نہیں کہہ رہا کہ فرانس کو سزا دیجیے۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ تونیسیہ کو آج ہی پروانۂ آزادی دے دیجیے۔ صرف یہ کہتا ہے کہ ازراہ کرم اس سوال پر بحث کیجیے لیکن اگر سلامتی کونسل کے سات ارکان اس مسئلے کو زیر بحث لانے کے لیے نہیں مل سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گیارہ قوموں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جہنم کی راہ لو۔ ہم تمہارے سوال پر بحث نہیں کریں گے تم اس مسئلے پر خواہ کتنے ہی شدید احساسات رکھتے ہو لیکن ہم اسے اپنے ایجنڈے پر بھی لانے کے لیے تیار نہیں۔ تاکہ سچائی بروئے کار آ جائے۔

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آگ لگی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ آگ ہم نے خود نہیں لگائی۔ ہم نے شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں اور ہم آگ بجھانے والے محکمے کے پاس یہ کہنے کے لیے آئے ہیں کہ ذرا اس آگ کو دیکھیے اور اسے بجھائیے۔ اب آگ بجھانے والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس طرف نگاہ بھی نہیں کریں گے یہ بڑی عجیب صورت حال ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سوال سے دلچسپی لیتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ان مظلوم افراد کا ہے جنہیں ہم اپنے بھائی سمجھتے ہیں۔ جن ممالک نے اس مکتوب پر دستخط کیے ہیں ان میں سے اکثر ماضی قریب تک خود اسی طرح محکوم و مجبور تھے۔ ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کہ وہ تمام معاملات کی ان مصیبتوں کو بھول گئے ہوں۔ جن کا تختۂ مشق وہ محکوم ہونے کے باعث بنے ہوئے تھے۔ بہرحال ہم اہل تونیسیہ کی حالت زار کو فراموش نہیں

کر سکتے ہیں ان سے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ حفاظتی کونسل اپنے صوابدید کے مطابق جو وہ کوئی فیصلہ صادر کرے جائے۔ اس کونسل کے میز پر بعض ایسے امور بھی رہ جائیں گے جن کا حل زمین پر ہو چکا ہو۔ بہرحال ہم کا ڈر ہے اس صورت کو آتے ہوئے دیکھنے کے روادار نہیں ہیں) ہم اپنے دل میں چراغ روشن رکھیں گے اور جو کچھ ہو سکے گا اس کے لئے ہم تعاون پیش کریں گے۔

اس مقام پر میرا وفد فی الحال رک جانا چاہتا ہے۔ نمائندہ فرانس نے تاریخ ماضی کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا وفد ان کے متعلق بھی جواب کا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت تیونس کی صورت حال سے مزید پردے چاک ہو جائیں گے۔ اور وہ استعماری کیفیتیں سامنے آ جائیں گی جو وہاں موجود ہیں، اور اس پہلو سے بھی اور اضطراب کی بنیاد وہ اساس ہیں۔ ان امور کو صرف تیونس کی بحث ہی سے علاقہ ہے۔ مجھے اجازت دی جانی چاہیے کہ میری تقریر میں مطلب کے بعض نکات بھی زیر غور آ گئے ہیں لیکن ان کا اس باعث نمائندہ فرانس کی تقریر تھی جس نے مطلب کے معاملات اپنی تقریر میں شامل کر لئے۔

یہاں میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

---

(۲)

اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں تیونس کا مسئلہ ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں پروفیسر احمد شاہ بخاری ـــ پطرس ـــ
کی دوسری تقریر جو انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کے اجلاس میں کی۔ بخاری اس وقت کونسل کے صدر بھی تھے۔

تقریریں کرنے والوں کی جو فہرست میرے پاس موجود ہے، اس میں اگلا نام پاکستان کے وفد کا ہے۔ اگر حفاظتی کونسل کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں کونسل سے خطاب کروں گا۔

اب تک حفاظتی کونسل کے تمام گیارہ ارکان اس مسئلہ کو ایجنڈے میں شامل کرنے کے بارے میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اب یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ چھ ملکوں کے وفد اسے ایجنڈے میں شامل کرنے کی حمایت نہیں کریں گے۔ ان میں مختلف ملکوں کے دو دوست اور رفیق بھی شامل ہیں جن کے لئے ہمارے دل میں انتہائی احترام ہے۔ ان میں سے تین ملک ایسے ہیں جو تمام لوگوں کے نزدیک زبردست استعماری مفاد کے نمائندے ہیں۔ چوتھے ملک کی عظمت و شان میں بھی کلام نہیں۔ اسے استعماری مفاد سے بھی کوئی علاقہ نہیں۔ تاہم اس نے مذکورہ بالا ملکوں ہی کا ساتھ دینا پسند کیا۔ اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اگر اس بارے میں ووٹوں کی نوبت آئی اور جب کبھی بھی آئی، ہم ہار جائیں گے۔

آج کا دن ـــ ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء ـــ اقوام متحدہ کی سرگزشت میں ایسا دن متصور ہوگا جب مختلف معاملات پر آزادانہ غور و بحث کو بار دینے کی بنیاد رکھی گئی۔ میرے دور اندیش رفیق چین کے نمائندے ڈاکٹر سیانگ نے اقوام متحدہ میں وسیع تجربے کی بنا پر ہمیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ اس انجمن کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا واقعہ ہوگا جب ایک معاملے کو محض ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں کونسل کے اندر اس درجہ شدت اختیار کی گئی کہ اسے ختم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں آج کا دن ایک اور لحاظ سے بھی یادگار رہے گا اس لئے کہ ایک پالیسی کو صد درجہ افسوسناک اور المناک طریق پر الٹ دیا گیا۔

پچھلی مرتبہ میرے وفد نے حفاظتی کونسل سے خطاب کیا تو اس کی ضرورت میرے معزز دوست نمائندہ فرانس کے خطاب کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ میرے لئے یہ امر صد درجہ غیر مناسب ہوگا کہ میں اس دوسرے موقع کو بھی ان کی تقریر پر نکتہ چینی کے لئے استعمال کروں۔ مجھے ایسے طرز عمل سے احتراز

رہنا چاہیئے۔ میری آرزو یہ ہے کہ اس موقع پر اپنے رفیق کے سامنے خود حکومتِ فرانس کی رائے میں سے چند اقتباسات پیش کردوں۔ یہ رائے اس مسئلے پر دی گئی تھی کہ کسی مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ اس وقت دی گئی تھی جب آئینی مسئلہ قطعاً زیرِ بحث نہ تھا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو حفاظتی کونسل یونان کے خلاف یوکرین کی شکایات پر بحث کر رہی تھی۔ اس وقت نمائندہ فرانس نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں کا ایک حصہ یہاں پڑھوں گا۔ نمائندۂ فرانس مسٹر پیروڈی (MR PARODI) نے اس موقعے پر کہا تھا۔

"ایک معاملے کو ایجنڈے پر لانے سے انکار کا طریقہ سخت نقصان رساں اور خطرناک ہے۔ مزید برآں یہ فیصلہ کرنے کے کون سے وجوہ ہوسکتے ہیں کہ فلاں شکایت کے لئے مناسب بنیاد موجود نہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کونسل عام سیاسی صورتِ حال کے متعلق قیاسی طور کی بنیاد پر فیصلہ صادر کردیگی ایسا کرنا ممکن ضرور ہے لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا اس قسم کی شہادت سے پیش قدمی کونسل کے لئے اس قسم کا طریقہ اختیار کرنا ایک حد تک خطرناک ہے اس لئے کہ جب تک کونسل پورے مسئلے پر کھلے دل سے غور و خوض نہ کرے گی اسے شہادت کے بارے میں صحیح اندازے کا موقع کیونکر مل سکے گا؟ اندیشہ ہے کہ ایسے معاملات میں کونسل عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو جائے گی۔ اور ان مقاصد یا انصاف کا پورا خیال نہ رکھ سکے گی۔ جو پیش کردہ مسئلے کے سلسلے میں ملحوظ رہنے چاہئیں"

فرانس بہت بڑا ملک ہے۔ وہ حفاظتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان میں سے ہے۔ یعنی ان پانچ ارکان میں سے ایک ہے جنہوں نے اقوام متحدہ کے پورے نظام کے نشوونما میں حصہ لیا تاکہ انصاف، مساوات اور آزادانہ غور و بحث سے مسائل کا تصفیہ ہوسکے لیکن آج اسی فرانس کا وفد (اسی ملک کے ایک سابق نمائندے کے الفاظ میں) عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہوگیا ہے اور اس نے انصاف کے وہ مقاصد پیشِ نظر نہیں رکھے جو اس خاص مسئلے میں پیشِ نظر رہنے چاہییں تھے۔

جس حد تک میرے معزز دوست نمائندۂ فرانس اور اس بحث میں اس کی حکومت کی ماضی کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہ کہنا چاہیئے۔

میں نے سلطنتِ متحدہ (برطانیہ) کے معزز نمائندے اور اپنے دوست سر گلیڈوِن جیب (SIR GLADWYN JEBB) کی تقریر سنی۔ اس سے بطور خاص مایوس ہوا۔ معزز سر گلیڈون جیب کی تقریر میں متعدد خوشگوار باتیں تھیں۔ جن میں میں بھی ان کا شریک ہوں۔ ان میں انگریزی زبان کے لئے محبت اور عزت بھی شامل ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ سلطنت متحدہ کے معزز نمائندے نے آج ہمارے اس مشترکہ محبوب کی بے حرمتی کردی ہے انہوں نے یہاں اس خط میں سے کچھ اقتباسات سنائے جس کے مطابق گیارہ ملکوں نے یہ معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور جب وہ اس فقرے پر پہنچے جس میں حکومتوں نے کونسل سے درخواست کی تھی کہ موجودہ حالت کو ختم کرنے کی غرض سے وہ تمام ضروری تدبیریں منشور کے مطابق اختیار کرنے کے لئے اجلاس منعقد کیا جائے تو نمائندے نے فرمایا کہ یہ جملہ مبہم ہے دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک اس جملے کے متعدد مفہوم تھے۔ جن کی وجہ سے انہیں پریشانی لاحق ہوئی۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس مفہوم کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی شاید یہ صورت ہوگی کہ یہ گیارہ قومیں حفاظتی کونسل سے معتدل اور متوازن طریق پر درخواست کرتیں اور کونسل کو پورا موقع دیتیں کہ وہ اس مفہوم کے مطابق کم یا زیادہ جیسا مناسب سمجھے انتظام کرے میں نمائندۂ برطانیہ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں تو کوئی ابہام نہیں الا یہ کہ ہم انگریزی زبان کی بے حرمتی پر کمر باندھ لیں۔

سر گلیڈون یہ بات کہہ کر اپنے تعلق سے آگے بڑھے۔ انہوں نے فرمایا کہ کم از کم برطانوی وفد کی رائے یہ نہیں کہ فرانس یا تیونیسیہ پر کوئی حل ٹھونسا جا سکتا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ زیر بحث جملے میں ایک بھی ایسا لفظ موجود ہے جس سے قوت یا جبر کا مفہوم پیدا کیا جا سکے یا سمجھا جا سکے کہ کوئی چیز ٹھونسنا مقصود ہے؟ اگر سلطنت متحدہ کے وفد کو صرف اس بات پر اعتراض تھا تو وہ ایسی تجویزیں یا سفارشیں پیش کر سکتا تھا جو فریقین پر کوئی حل ٹھونسنے سے بالکل پاک ہوتیں۔ سلطنت متحدہ کا وفد کہہ سکتا تھا کہ آئیے اس مسئلے پر بحث کریں۔ ہمیں تیونیسیہ یا فرانس پر کوئی حل ٹھونسنا نہ چاہیے۔ بس یہ سفارش کر دینی چاہیے کہ وہ اکٹھے بیٹھ کر جھگڑے کا تصفیہ کر لیں۔ کیا اسے ٹھونسنے سے تعبیر کیا جا سکتا تھا؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اپنا نقطۂ نگاہ جس انداز سے پیش کیا اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہم نے حفاظتی کونسل میں جو شکایت پیش کی وہ مبہم اور غلط تھی۔ ساتھ ساتھ تنگ دلی بھی موجود تھی۔ ہماری درخواست میں کوئی ایسی بات مذکور تھی جس کی بنا پر حفاظتی کونسل کے لیے لازم ہو جاتا کہ وہ اپنا حل تیونیسیہ یا فرانس پر خواہ مخواہ ٹھونس دے۔ یہ امر حقیقت سے منزلوں دور ہے۔

سلطنت متحدہ کے نمائندہ کا بیان ایک سلسلہ پالیسی کا بھی اہم اور ملال انگیز نقطہ ہے۔ قبل ازیں انجمن اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پیش تھا کہ اس قسم کے مسائل ایجنڈے میں شامل کئے جائیں یا نہ کئے جائیں۔ اس موقع پر سلطنت متحدہ کے وزیر خارجہ نے اپنے نظریات پیش کئے تھے۔ میں حفاظتی کونسل میں سرکاری دستاویزوں سے اقتباسات پیش کروں گا۔ جب روس کے خلاف ایران اور احوال یونان کے متعلق روس کی شکایتیں زیر غور تھیں ـــ مسٹر بیون (E. BEVIN) نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو فرمایا تھا ـــ

"میں دل سے چاہتا ہوں کہ حفاظتی کونسل ان تمام معاملات کے متعلق شکایت کرنے والوں کی باتیں سنے خواہ وہ کوئی ہوں۔ اگر کوئی حکومت محسوس کرتی ہے کہ کسی چھوٹی یا بڑی طاقت کے خلاف شکایت لے کر وہ اس کونسل میں نہیں آ سکتی اور اپنا نقطۂ نگاہ بیان نہیں کر سکتی تو میرے نزدیک یہ غلط ہے۔ جس حکومت کا میں نمائندہ ہوں، اسے بھی اس کٹہرے میں ڈالنے کا الزام لگا دیا گیا ہے۔ یونان کے معاملے میں جس حد تک میری یا کم از کم میری حکومت کی خاص ذمہ داری کا سوال ہے اس کی پوری تحقیقات کر لی جائے اور اس پر بحث بھی ضرور کی جائے۔ میری طرف سے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔۔ اگر حکومت ایران کو حکومت روس کے خلاف کوئی شکایت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ایران کو ضرور موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آئے اور اپنا معاملہ پیش کرے۔ اس وقت ہم یہ اندازہ کر سکیں گے کہ شکایت درست تھی یا نہ تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے کو ایجنڈے پر رکھا جائے اور اس پر برسرِ عام بحث کی جائے اس لئے کہ مجھے یقین ہے حقائق کو دنیا کے سامنے لانے ہی پر امن کا انحصار ہے۔ خواہ وہ حقائق صحیح ہوں یا غلط۔" (سرکاری ریکارڈ سال اوّل سلسلہ اوّل صفحہ ۱۷)

آج یہ گراں بہا الفاظ بھلا دئے گئے ہیں۔ آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کو بروئے کار لانے سے انجمن اقوام متحدہ کے اصول کو تقویت نہیں پہنچے گی۔ بلکہ ـــ مجھے افسوس ہے کہ یہ بیان سلطنت متحدہ کے نمائندے کی تقریر میں ہے ـــ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانا اور اس پر آزادانہ اور عام بحث کا موقع بہم پہنچانا انجمن اقوام متحدہ پر بہت برا اثر ڈالے گا۔

اس معاملے کے متعلق زیادہ بحث سے اقوامِ متحدہ پر بڑا اثر پڑتا ہے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آج کی دنیا میں اقوامِ متحدہ کا اور کونسا وظیفہ رہ جاتا ہے۔ سلطنتِ متحدہ کے نمائندے کے نزدیک اقوامِ متحدہ کو خطرات سے بچانے اور زیادہ قوموں پر جو بڑا اثر ڈالا جاتا ہے ان سے بچاؤ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام بحثیں ختم کر دی جائیں اور ہم سب امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ ساتھ ساتھ اس نئی عمارت کو تاکا کریں جس میں ہم بیٹھے ہیں۔

سلطنتِ متحدہ کے نمائندے نے اور میں سمجھتا ہوں کہ نیدرلینڈز کے نمائندے نے ایک بات جسے خاص اہمیت سے کہی، اور وہ یہ کہ اگر ہم نے اب کوئی قدم اٹھایا یا اس مسئلے پر حفاظتی کونسل میں بحث کی تو تونیسیہ میں جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ناکام ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ بات چیت کس سے ہو رہی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ایک فریق فرانس ہے دوسرا فریق کون ہے جو بات چیت کر سکتا ہے؟ تمام عوامی وزارت جیل میں ہیں۔ اور یہ آخری عوامی وزارت تھی جو تونیسیہ کو ملی۔ تمام قومی لیڈروں اور کارکنوں کو اور ہر پڑھے لکھے آدمی کو جس نے قومی مقاصد سے کم یا زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا یا تو پیٹا گیا یا حوالات کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ تونیسیہ میں اس وقت وسائل حمل و نقل پر شدید پابندیاں ہیں۔ کچھ فرانسیسی اس وقت کس کے ساتھ معاملات پر بحث و تمحیص کر رہے ہیں؟ کونسی گفت و شنید ہے جو حفاظتی کونسل میں بحث کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے گی؟ ریذیڈنٹ جنرل تونیسیہ میں کون سا ایسا نازک کام انجام دے رہا ہے جو یہاں ہماری بحث کی وجہ سے معرضِ خطر میں پڑ جائے گا؟ اگر اقوامِ متحدہ میں اس مسئلے پر بحث تونیسیہ کے اندر ریذیڈنٹ جنرل کے کام کو تباہ کر دے گی اور اگر اس بین الاقوامی عدالت میں آزادانہ بحث اس کے لئے رکاوٹ بن جائے گی تو ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کسی برے کام ہی کے درپے ہوگا۔ جس میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ کسی اچھے کام میں رکاوٹ کا امکان ہی نہیں۔ اور میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اقوامِ متحدہ میں کوئی بحث بہبودِ انسانی پر ایسا مہلک اثر ڈالے گی۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم نے یہاں اس مسئلے پر بحث کی تو اس سے تونیسیہ میں بے چینی کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ یہ بات شروع ہی سے کہی جا رہی ہے یہ پہلو سب سے پہلے نمائندہ فرانس نے پیش کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے نمائندوں نے بھی خلوص کے ساتھ خطرہ محسوس کیا کہ ہمارے الفاظ کسی نہ کسی طرح وہاں کے عوام کو مشتعل کر دیں گے۔

تونیسیہ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اول وہاں کے اصلی باشندے، دوسرے فرانسیسی۔ فرانسیسیوں نے ہزاروں فوجیں وہاں اتار دی ہیں ان کے ساتھ ٹینک ہیں توپیں ہیں۔ اور ہر قسم کے آلات و اسلحہ ہیں۔ جس حد تک مجھے علم ہے اہلِ تونیسیہ کے پاس نہ کوئی اسلحہ خانہ ہے اور نہ کوئی حربی کارگاہ۔ لہٰذا اگر ہمارے الفاظ کسی کو مشتعل کر سکتے ہیں تو وہ صرف فرانسیسی ہیں۔ وہی موثر طریق پر مشتعل ہوں گے۔ اہلِ تونیسیہ میں کیونکر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے؟ وہ بھی کبھار ایک آدھ بم پھینک سکتے ہیں وقتاً فوقتاً شور مچاتے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں کی پوری فوجی قوت فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ ہم انہیں اس وقت (ان) کارروائیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان افعال کے مرتکب نہ ہوں جنہیں "مظالم" سے تعبیر کیا جا رہا ہے ——— یہ ایسا لفظ ہے جو نمائندہ فرانس کے کانوں پر یقیناً گراں گزرے گا۔ تونیسیہ میں ابھی حالات اور کچھ نہیں ہوا۔ البتہ ریذیڈنٹ جنرل سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے تاکہ دنیا کو بتا سکے کہ بات چیت از سرِ نو شروع ہو گئی ہے۔

سلطنتِ متحدہ کے وفد کی طرف سے یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ اس لئے کہ سلطنتِ متحدہ کے سوا دنیا کا کوئی ملک نہیں جسے اس قسم کے حالات کا زیادہ سے زیادہ تجربہ ہو۔ اس وفد کو خوب معلوم ہے کہ پاک و ہند کی سرزمین میں برطانوی اقتدار کی دست کشی سے پیشتر قومی لیڈروں کو بار بار جیلوں میں ڈالا گیا تھا اور ان کی جگہ "مقامی معززین" نے حکومتیں سنبھال رکھی تھیں (یہ وہی اصطلاح ہے جو فرانس نے تونیسیہ میں اپنے پٹھوؤں کے لئے استعمال کی) زیادہ معتدل اور زیادہ معقول عناصر سے سمجھوتے ہوئے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی سمجھوتہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔ جب تک عوامی

خواہ تشدد سے احتراز حتیٰ جب یہ بھی معاملات کی کوئی قسط عقلیت و صلاحیت سے کامیاب نہ ہو سکی ، تمام ملک ایک فیصلہ کن عمل کی بنا پر جو میرے نزدیک تاریخ میں ہمیشہ شاندار اور برتر رہے گا سلطنت متحدہ نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں سے بات چیت کرے جنہیں ایک مرتبہ پر جیلوں میں ڈالا گیا تھا اس کے بعد ہی پاکستان، ہندوستان اور سلطنت متحدہ کے درمیان پائیدار امن و دوستی کی بنیاد پڑی ۔ اس دوستی پر ہمیں فخر ہے ۔

تاہم یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوا جب تک سلطنت متحدہ نے ایک جرأت مندانہ اور خیال انگیز قدم نہ اٹھایا ۔ معذرت کے بجائے وقت گزاری اور زمانہ سازی سے کام لینے اور دنیا کو اپنے ارادوں اور روش کے متعلق دھوکہ دینے کی کوشش کے بجائے سلطنت متحدہ جرأت مندانہ اقدام سے اصل کام پر متوجہ ہو گئی اور قوم نے حقیقی نمائندوں کے ساتھ بات چیت کی ۔ فرانس تو تیونس میں یہ طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہمیں امید تھی کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے حکومت فرانس کو یہی مشورہ دیں گے جو ماضی قریب کی تاریخ میں خود ان کے اپنے تجربہ پر مبنی تھا ۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ کوئی دو ہفتے پیشتر فرانس کے وزیر خارجہ اور برطانیہ کے وزیر خارجہ کے درمیان بات چیت ہوئی تھی ۔ اگر بعض کی گفتگو ترتیب تھا ۔ اگر مسٹر ایڈن کا بیان اسی مشورے پر مبنی ہے جو انہوں نے فرانس کی حکومت کو یہ معاملہ ایجنڈے میں شامل نہ کرنے کے لئے دیا گیا ہے تو مجھے افسوس ہے کہ ان دو معزز اصحاب کی یکجائی سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ مسٹر ایڈن جیسے انگریزی زبان پر قابل رشک دسترس کا مالک کہتے ہیں مجھے اپنے آپ کو گھوڑے اور مجھے خرگوش سے تشبیہ دی ہے ۔ اس طرح مجھے جلد بازی کا ملزم ٹھہرانا ۔ موصوف نے بتایا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں جس کے ساتھ وابستگی کی عزت انہیں ، مجھے اور ہمارے ملکوں کو حاصل ہے بجائے گھوڑوں کے سیاسی جانوروں کی گنجائش ہے یہ تو غالباً درست ہے لیکن اگر برطانوی دولت مشترکہ میں شتر مرغ بھی موجود ہیں تو وہ میرے ملک میں نہیں پائے جاتے ۔

اب میں اس معاملے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔ جو میرے نزدیک صحیح بنیادی دروازہ کھلا ہے یعنی اس مسئلے کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا موقف جس حد تک آزادانہ بحث و تمحیص کا تعلق ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی نیک نیتی زیادہ مضبوط ریکارڈ پیش کر سکتا ہے ۔ اس وقت تک امریکہ کی پالیسی ہر ابہام سے پاک رہی اور وہ ہمیشہ بلند آہنگ تھی ۔ گذشتہ برسوں میں اس معاملے کے متعلق آزادی تقریر کے بارے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جو کچھ کہا ان میں سے بعض حصوں کو دہراتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بہتر اصحاب کے قلوب میں حرارت پیدا ہو جائے گی ۔ ان میں سے بعض حصے بڑے روح افزا ہیں ۔ میں ان حصوں کو اس غرض سے یہاں پیش کروں گا تاکہ اندازہ ہو سکے آج اقوام متحدہ کے بڑے ارکان کی روش میں کتنا نمایاں تغیر آ چکا ہے ۔

کیا مجھے ۱۹۴۶ء کی طرف توجہ کی اجازت دی جائے گی جب مسٹر سٹےٹی نیس (Mr. Stettinius) نے روس کے خلاف ایران کی شکایت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا ۔

> "اگر ہم کونسل کے آئندہ اجلاس میں بحث کی غرض سے ایسے مسائل کو ایجنڈے میں لانے پر راضی ہو سکیں تو میں سمجھتا ہوں اس طرح صورت حال ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی ۔ میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو یقین ہے اگر اقوام متحدہ کے ارکان میں سے کوئی ملک شکایت لے کر آتا ہے تو یہاں اسے اپنی بات سنانے کا حق حاصل ہے ۔"

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسی نمائندے نے فروری ۱۹۴۶ء میں یونان کے اندر برطانوی افواج کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا ۔

> "جب مختلف ملکوں کے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو بہتر یہی ہے وہ اپنے معاملات

کو اس کونسل میں لے آئیں۔"

امریکہ کے ایک اور معزز نمائندے مسٹر جانسن (MR. JOHNSON) نے یونان کے خلاف جمہوریہ شوروی یوکرین کی شکایت پر ۱۹۴۶ء میں بحث کرتے ہوئے کہا:۔

"اس نظام (حفاظتی کونسل) کی تاسیس کے وقت سے میری حکومت ہر وقت یہ اصرار رہا ہے کہ اگر اقوامِ متحدہ کا کوئی رکن کہتا ہے ایسے حالات موجود ہیں جن سے بین الاقوامی امن و حفاظت کے لئے خطرہ درپیش ہے تو کونسل اسے اپنا معاملہ پیش کرنے کا موقع دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔ میری حکومت اس اصل کو بہت اہم سمجھتی ہے۔"

امریکہ کے اسی نمائندے یعنی مسٹر جانسن نے ۱۹۴۷ء میں کہا:۔

"یہ واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ دنیا کے اس خطے میں گولی چل رہی ہے، اور آدمی مارے جا رہے ہیں۔ لہٰذا حفاظتی کونسل کو اس پر غور کا حق حاصل ہے خواہ سیاست کا تصور کچھ ہی ہو اور انجام کار اس بارے میں کچھ ہی فیصلہ کیا جائے۔"

روس نے چیکوسلواکیہ کی آزادی میں مداخلت کی تھی اور اس پر چلی کی طرف سے شکایت پیش کی گئی تھی۔ مسٹر وارن آسٹن (MR. WARREN AUSTIN) نے اس سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"جو مسئلہ سامنے ہے اس کے متعلق فیصلہ اصل معاملے کا فیصلہ نہ ہوگا۔ اسے معاملے کے مالہ و ماعلیہ پر فیصلہ نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جب ایک مسئلہ پیش ہو۔ جیسا کہ یہاں ہوا یعنی یہ کہ کوئی معاملہ بحث کے لئے ایجنڈے پر رکھا جائے یا نہ رکھا جائے تو اس معاملے کی نوعیت پر مزید غور کر لینا چاہیے۔ تاکہ معلوم ہو سکے حفاظتی کونسل کی دسترس میں وہ آتا ہے یا نہیں آتا۔"

مسٹر آسٹن نے مزید کہا:۔

"کیا حفاظتی کونسل اس ذمہ داری سے اعراض یا اغماض کر سکتی ہے جو اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے کہ ان تمام الزامات کی سماعت کرے؟ ان وجوہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اس امر کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں ووٹ دے گی۔"

میں وہ تمام اقتباسات پیش نہیں کروں گا۔ جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ میں اپنے رفیقوں کو تھکا دینے کا خواہاں نہیں۔ امریکہ کی حکومت زمانہ ماضی میں اس مسئلے کی حمایت میں بڑی ہم آہنگ اور محکم رہی ہے۔ میں مسٹر جیسپ (MR JESSUP) کے بیانات میں سے بعض اقتباسات چھوڑتا ہوں اور اس اقتباس پر آتا ہوں جو میرے ذخیرے کا آخری اقتباس ہے۔ یہ مسٹر وارن آسٹن کے بیان سے ماخوذ ہے جو اس شکایت کے سلسلے میں دیا گیا تھا کہ حکومت ایران عالمی بین الاقوامی عدالت کی مؤقت تجاویز پر عمل کرنے میں ناکام رہی۔ موصوف نے فرمایا:۔

"اقوام متحدہ اصولاً کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی۔ تاہم دخل دینے سے انکار اس وقت پیش نظر آ سکتا ہے۔ جب ایجنڈا منظور کر لیا جائے اور اس پیش کردہ معاملے

پر فیصلہ ہونے دینے سے انکار بیشتر نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ انکار کے ساتھ کوئی وجہ موجود ہو۔

تاہم یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ بعض وفود نے اختیار کی بحث اس موقع پر ہمارے نقطہ نگاہ کو قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اختیار کے معاملے کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ان پر بحث نہیں کی گئی۔ بعض نمائندوں نے کہا کہ جب تک اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کی رضامندی نہ دی جائے گی وہ کونسل کے اختیار یا عدم اختیار کی بحث میں نہیں پڑیں گے۔

اس طرح امریکہ نے حالیہ سال تک واضح روش پر قائم رہنے کے بعد اپنی پالیسی بالکل بدل لی۔ مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ طرز عمل ہمارے لئے بہت بڑی مایوسی کا باعث تھا۔ اس تبدیلی کے ابتدائی آثار گذشتہ موسم خزاں میں جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے دوران نمایاں ہو چکے تھے۔ اس اجلاس میں مراکش کا مسئلہ پیش ہوا اور امریکہ نے جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کرنے سے اختلاف کا فیصلہ کیا۔ جب اس معاملے میں امریکہ کے انداز اور طرز عمل کی سرگذشت کا علم تھا ہم نے محسوس کیا کہ امریکہ کے اس ماننے سے ایک عجیب سا اعتراف ہے جو اس نے اپنے لئے تجویز کیا ہے۔ محض یہی نہیں ہم یہ سمجھتے رہے تھے ..... اور اس کے لئے ہم امریکہ کے وفد کو انتہائی تحسین کا مستحق سمجھنا چاہئے ـــــ کہ امریکہ نے کسی بھی معاملے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ اگرچہ اس میں خود امریکہ بھی گوشہ نیا الزامات کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی سرگذشت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ سمجھا کہ مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ کو ایک منفرد مثال سمجھنا چاہئے۔ غالباً بہت سی مصلحتیں پیش نظر تھیں جو مسئلہ مراکش کے متعلق امریکہ کے ووٹ پر اثر انداز ہوئیں لیکن پیش نظر مسئلے کو کسی مصلحت سے کوئی تعلق نہیں۔ شاید ایک مصلحت یہ تھی کہ جنرل اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا جو نمائندے یہاں تشریف فرما ہیں انہیں یاد ہوگا کہ فرانس کے وزیر خارجہ نے جو تقریر کی تھی ویسی عجیب و غریب تقریر اقوام متحدہ میں کبھی نہیں سنی گئی۔ اس نے مقام تقریر پر پہنچ کر اسمبلی سے درخواست کی کہ مسئلہ مراکش کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے متعلق ووٹ دینے سے احتراز کیا جائے اس لئے کہ دوسرے معاملات کے علاوہ اسمبلی اس وقت فرانس کی مہمان ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ جو وفود اس موقعے پر موجود تھے ان میں سے متعدد نے اس مروت اور خوش خلقی کو اپنے اوپر لازم کر لیا جس کے متعلق وزیر خارجہ فرانس نے یاد دہانی کی تھی۔ اس قسم کی مروت اور خوش خلقی پکار رہی دنیا میں آج بھی مزید حوصلہ افزائی کی موجب ہوتی۔ اگر لاکھوں مراکشیوں کی زندگی اور آزادی معرض خطر میں نہ ہوتی۔ جس طرح آج لاکھوں تیونسیوں کی زندگی معرض خطر میں ہے۔

آج ہم کسی کے مہمان نہیں کہ وہی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ جو پیرس میں اختیار کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ کا ووٹ سے احتراز پیرس میں ووٹ سے احتراز کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ ہے۔ ہم اس احتراز کا ماتم کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنے امریکی دوستوں اور امریکی وفد کے دوستوں کو یاد دلانا میرا کام نہیں۔ کہ ان کا فیصلہ دنیا بھر میں آزادی فکر و خیال کے حامی عناصر کی بہت بڑی تعداد کے لئے باعث رنج ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ حفاظتی کونسل کے گذشتہ اجلاس سے اب تک یہ مسئلہ بہت سے ملکوں کے باشندوں پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ ہر جگہ دلوں کو ٹٹولنے کے بعد اس پر گہرا غور و خوض ہوا۔ میں کسی ملک کے کسی آزاد خیال اخبار سے آگاہ نہیں۔ جس نے یہ موقف اختیار کیا ہو کہ اس مسئلے پر بحث کا دروازہ بند کر دینا کوئی اچھی پالیسی ہوگی۔ اور امریکہ بھی ان ملکوں میں شامل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ کی حکومت نے خطرات کا پوری طرح محاسبہ اور موازنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ اور یہ گیارہ ممبر جو اس شکایت کو حفاظتی کونسل میں لائے ـــــ محض یہی نہیں بلکہ آج کی تمام آزادی پسند قومیں ـــ کشیدگی اور تنازعے کے اس دور میں زیادہ سے زیادہ اور وسیع سے وسیع اتحاد پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ دنیا کو مصائب سے بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے میں امید کرتا ہوں کہ امریکہ کی خاطر، ہماری اپنی خاطر اور امن و آزادی سے محبت رکھنے والے تمام ملکوں اور جماعتوں کی خاطر اس امر کا پورا خیال رکھا جائے گا کہ امریکہ کا یہ فعل اصل مقصد کی تلاش میں کسی مزید رکاوٹ کا باعث ثابت نہ ہو۔

جس حد تک میں اندازہ کر سکتا ہوں مجوزہ تک ایک واضح طرز عمل اختیار کر لینے کے بعد اب ایک اس کے برعکس ہو۔ یہ بڑی عجیب سی معاملہ ہے جس
کی کوئی معقول توجیہ امریکہ کے بہترین دوست بھی دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکیں گے۔ یہ تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے جس یا اس میں سوا یہاں صرف ایک رخ پر چل رہی تھی
اور کسی اسی پر چلتے چلتے اچانک اپنے رخ کا مزاج فیصلہ کر لیا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا اس مجوزہ کے تعلق کیا ہوا۔ گو امریکی مندوب نے اس کو
جب جناب انہوں نے اپنے بیان میں بہت سے جملے استعمال کئے۔ انہوں نے قوت و طاقت سے استعمال کی مذمت کی اور مذمت تیونس کی محدود
سی بات اس میں فرانسیسی ملک کو شامل کر لیا گیا۔ امریکی وفد کے اصحاب خوب جانتے ہیں کہ قوت و طاقت کے لات تیونس کے پاس نہیں۔ ان حالات میں بحیثیت
مجموعی کا یہ زیادہ سے زیادہ بجا ہے کہ تیونسیوں کا۔ لہٰذا میں ان کے جملے کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے قوت استعمال کرنے کے متعلق فرانس کو
یہ بات کہی ہے۔ فرانس سے کہا گیا ہے کہ قوت استعمال نہ کی جائے۔ تیونسیوں کو وہ اس وقت سے روکنا چاہتے ہیں جب تک عالمی رائے کا مر
اس صورت حال کے خلاف بیدار نہ کیا جائے۔ فرانسیسی بس یا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوت استعمال نہیں کر رہے جب حالت یہ ہے کہ ایک بھی قابل ذکر شخص آزادانہ
اسلام میں چل پھر نہیں سکتا۔

لہٰذا میں خوشی سے ان الفاظ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ان کا خیر مقدم کریں گے۔ ان لوگوں سے بار بار کہا گیا ہے کہ
پیش نظر رکھا جائے۔ اہل تیونس نے جب پہلی مرتبہ امریکہ سے امداد کی اپیل کی تھی تو اس زمانے میں مسٹر ایسن صدر تھے۔ لوگ یہ حقیقت فراموش کر چکے ہیں کہ تیونس
میں کئی بار مرتبہ انقلاب برپا ہو چکے ہوتے۔ لوگ بھول رہے ہیں کہ مجوزہ قومی تحریک کا آغاز تو ۱۹۰۰ء میں ہوا تھا۔ یہ تحریک کل کی پیداوار نہیں
اس معاملے پر کل، آج اور گزشتہ سے بحث کی۔ اہل تیونس جب یہ الفاظ سنیں گے تو مجھے یقین ہے ان کی ہمتیں بڑھیں گی۔

پھر امریکی مندوب نے آخری جملے سے بھی اس حد تک تسکین حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جس حد تک ممکن ہو گا یعنی امریکہ مہرت اس مرتبہ
مشورہ دینے سے احتراز کر رہا ہے جب پیرس کے اجلاس میں اکثریت کا مشورہ دیا گیا تھا تو اس وقت بھی یہی جملہ استعمال کیا تھا اس وقت کہا گیا تھا کہ ہم فی الحال
مشورہ دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ آج امریکہ نے اس مرتبہ یہ جملہ استعمال کیا ہے

یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ بیشتر دانا ڈپلومیٹک بولی میں اس مرتبہ کے الفاظ محض لیپ پوت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس جملے کو کسی قدر
یہ ایسی جگہ رکھا جہاں زیادہ سے زیادہ زور کے ساتھ کہہ سکے کہ معنی مقصود ہوں یا اثر پیدا کرتا ہے۔ کہنے والے کے دل میں ابھی فاسد تخیلات باقی ہیں۔
ہم اس جملے کے استعمال کر کے بڑے معنی نہ پہنچا سکیں گے میں کہتا ہوں کہ اس جملے کی تعبیر کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ امریکی ضمیر کی ایک چھوٹی سی کرن
اقوام متحدہ کی ڈپلومیسی کے دھندلکے سے کچھ آزمائی کر رہی۔ اس حد سے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ وقت نہ آئے گا جب ریاست
ہائے متحدہ امریکہ کو پابندی قول و عہد نہ کرنے کا طعنہ دینا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ ہماری ناکامی اہل تیونس کی ناکامی نہ ہو گی۔
مجھے ایک چھوٹی سی بات اور کہنا ہے جس پر میری تقریر کا یہ حصہ ختم ہو جائے گا۔

ہم اس معاملے میں فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے نہ ہم ہمدردی کے ان زبردست روابط سے بے خبر ہیں جو جنگ کے دوسری جانب
بیٹھے ہوئے ممالک کے درمیان قائم ہیں۔ ہم فرانس کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے اس کی مثالی شجاعت کا ہمیشہ احترام کیا۔ مصائب و آلام کے دور میں ہمیں
اس کے ساتھ گہری ہمدردی رہی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمدردی ابھی تک ختم نہیں ہوئی اور ہم مستقبل میں اس کے امن اور خوشحالی کے آرزومند ہیں۔
تاہم ہم نے یہ مسئلہ اس لئے اٹھایا کہ ہم بصمیم قلب یقین رکھتے ہیں فرانس کے مفاد کا تقاضا اہل تیونس کے حقیقی نمائندوں سے پر امن مفاہمت
میں ہے اور ان پچھلوں کے سے نہ مفاہمت نہیں جنہیں خود فرانس نے کار لایا مسٹر ڈی ہوٹی کلاک (MR. DE HAUTECLOCQUE)

(ریذیڈنٹ جنرل) اس وقت انتہائی سرگرمی سے تاش کے پتے پھینٹنے میں مشغول ہیں اور انہیں امید ہے کہ دیر یا بدیر کسی وقت بھی ان کے اچھے پتے آ جائیں گے۔ لیکن افسوس کہ جن چند پتوں کی وہ امید لگائے بیٹھے ہیں انہیں مسٹر ڈی ہاؤٹ کلوک نے قید میں ڈال دیا ہے۔

فرانس کے ارباب بست وکشاد غالباً یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انہوں نے بڑے سلیقے سے ساتھ ــــ ان گیارہ قوموں کے ساتھ جو اس مسئلہ کو حفاظتی کونسل میں لائیں ــــ شطرنج کی بازی لگا رکھی ہے اور انہیں جلد سے جلد چال چل جانی چاہئے ورنہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہو جائے گا۔ یہاں سے شطرنج نہیں کھیل رہے اگر ایسا ہوتا تو ہم یہ شکایت بڑی مستعدی سے بہت پہلے پیش کر دیتے اور فرانس کے لئے یہ ضرورت پیش آنے کا موقع نہ رہتا کہ پہلا باب تیونس کے ساتھ بات چیت جاری کر رکھی ہے یہ معاملہ ابھی بالکل شکایت پیش کرنے کا نہیں۔ اگر مسٹر ڈی ہاؤٹ کلوک کی اپنی آستین سے کابینہ وزارت نکال کر پیش کر دیں تو وہ اپنے سوا دنیا کے کسی آدمی کو مطمئن نہیں کر سکیں گے۔ وہ یہی مات دینے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگر ایسا ہے تو انہیں اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ وہ ہم سے جنگ نہیں کر رہے۔ اور ہماری ان سے کوئی لڑائی نہیں۔ وہ تاریخ سے جنگ کر رہے ہیں اور اگر وہ واقعات کی رفتار سے سرکشی کرنا پسند کریں تو برابر ناکام رہیں گے۔

لہٰذا میں تیونس کے فرانسیسی ارباب بست وکشاد سے التجا کرتا ہوں کہ وہ جان لیں یہ ہمارے ساتھ شطرنج کھیلنے اور تیز تیز چالیں چل کر ہمیں مات دینے کی کوشش کا موقع نہیں۔ یہ نیا معاملہ نہیں کہ امریکہ کے جریدہ نیشن کے الفاظ میں: حشیانہ تیز رفتاری سے وزارتیں بنا دینے سے حل ہو جائے گا۔ یہ معاملہ گہری متانت کا متقاضی ہے۔ اس کا تجزیہ ٹھنڈے دل سے کرنا چاہئے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انجام کار یہ دوست نمائندہ امریکہ کے الفاظ میں عوام کا ارادہ اور عوام ہی سے کارگر ہوگا۔

ہم فرانس کے مفاد کی مخالفت نہیں کر رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود فرانس کے ارباب بست وکشاد اپنے وطن کے مفاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں۔ وہاں مٹھی بھر فرانسیسی آبادکاروں کے مفاد کی حفاظت میں مصروف ہیں۔ جنہوں نے تیونس میں صد ہا برس سے مراعات حاصل کر رکھی ہیں اور پیرس کے سیاسی حلقے ان کی حمایت میں صدق دل سے زور اور گرم جوشی ہیں۔ فرانس میں بھی آزاد خیال لوگوں کا ایک ایسا گروہ ہے جس نے تیونس کی موجودہ صورت حال کو ذلت قرار دیا۔ فرانس آزادی کی عظیم الشان روایات کا حامل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تیونس کے ڈیڑھ لاکھ فرانسیسی آبادکار ان روایات کی درخشانی کو مدھم کر سکیں گے وہ تھوڑی دیر کے لئے ان روایات کو پس پشت ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔

لہٰذا اگرچہ ہم پندرہ قومیں ــــ پانچ جو حفاظتی کونسل کی رکن ہیں اور جنہیں اس معاملے میں ووٹ دینے کا حق ہے اور دس ہم جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں اور ووٹ کی مجاز نہیں ــــ ہم اس کام میں ناکام ہو چکے ہیں جسے اپنا فرض سمجھ کر اٹھایا تھا۔ جو آج ہمیں شکست دے رہی ہیں۔ دنیا خود بخود ان واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرے گی۔

سوال یہ ہے کہ اس غم ناک صورت حال کے علاوہ کی موجودہ مرحلے پر کیا صورت ہے؟ کیا کوئی ایسی چیز باقی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم بحیثیت اقوام متحدہ اپنی عزت ایک حد تک بچا سکتے تھے؟ اگر حفاظتی کونسل اس مسئلے کو مسترد کر دینے پر تلی بیٹھی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ پیش نظر ضوابط کے مطابق کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔ صرف ایک چھوٹا سا کام شاید باقی ہے۔ جس پر حفاظتی کونسل مناسب سمجھے تو راضی ہو سکتی ہے۔

جن گیارہ قوموں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا انہوں نے دفعہ ۳۵ کے ماتحت درخواست کی تھی کہ حفاظتی کونسل اس معاملے کو پیش کرنے کی اجازت دے۔ وہ موقع جس کے بھروسے پر ابتدائی درخواست پیش کی گئی تھی اس وقت تک نہیں آ سکتا۔ جب تک یہ معاملہ ایجنڈے پر نہ آ جائے ہماری درخواست اس وقت رد ہو جائے گی جب ووٹ لئے جائیں گے۔

اندریں اثنا فوری چارہ کار کی بحث کے دوران میں ہماری ہتک کی گئی۔ دس قومیں، جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں، اور ایک قوم جو کونسل کی ممبر ہے ان گیارہ قوموں نے بین الاقوامی امن کی خاطر یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ ہم سب فرانسیسی رفیق نے بڑی شستگی سے۔ اس نے ہم پر الزام رکھا کہ جو بیانات کہنے سے ان کا مقصد پاکستان کا تھا میں جا تقاضا کرتا ہوں کہ ہم میں سے بعض پر دنیا اعتماد نہیں رکھتا جیسا وہ سرفد پر رکھتا ہے لیکن یہ زیادہ سے زیادہ دعا اتنا دہ ملک کا معاملہ سامنے لانا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تنفیذ کے دل میں پریذیڈنٹ کی کرسی فرض ہو سکتی تھی جب اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانے پر آمادہ ہوا جو نمائندہ فرانس نے حفاظتی کونسل پر مسلط کیا تھا جب طریق کار پر بحث ہو رہی تھی اور اس مسئلے کو ایجنڈے پر رکھنے کے بارے میں غور و خوض کیا جا رہا تھا لیکن ابھی فیصلہ کوئی نہ ہو سکا تھا۔ اس کے بعد دس قوموں اور ان کے نمائندوں نے درخواست پیش کی کہ اگلا اجلاس بلانے کے لیے منعقد ہو چکی ہے تو کم از کم ہمیں اتنا مروت تو برتی جائے کہ اخلاقی حق سے محروم نہ کیا جائے کہ ہم پر الزامات لگائے گئے ان کے جوابات کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم اقوام متحدہ کے ساحت کے دوران میں اعلان کے علاوہ جواب کا حق اس طرح تسلیم کر چکے ہیں جسے قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاید حفاظتی کونسل مسئلہ تونیسیہ پر بحث سے پہلے گیارہ قوموں کی درخواست کو مسترد کر کے کم از کم تلافی کا موقع مزید پیدا کر سکے اور دس قوموں کو کونسل کی میز پر بلائے تاکہ وہ داغ باقی نہ رہے۔ پر پاکستان سے اور ان ممالک کی جانب سے ان الزامات کا مفصل جواب دے سکیں جو فرانسیسی نمائندے نے گزشتہ جمعہ کے اجلاس میں ہم سے خلاف عائد کیے۔ اس وجہ سے یہ میری نیک تجویز ہے کہ زیر غور مسئلے کے بارے میں فیصلے سے پیشتر ہمیں حفاظتی کونسل کی حیثیت میں ان دس ملکوں کو دعوت دینی چاہیے جنہوں نے آج کونسل کی خدمت میں تحریر پیش کی ہے۔ اور جن کے خطوط میں بحث کے آغاز میں پڑھ کر سنا چکا ہوں۔ دعوت یہ ہو کہ وہ حفاظتی کونسل میں آئیں اور ان الزامات کے جواب کا اخلاقی حق استعمال کریں جو نمائندہ فرانس نے ان کے خلاف استعمال کیے۔

پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں میرا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔

---

(۳)

اس بیان کا متن جو پروفیسر احمد شاہ بخاری نے حفاظتی کونسل میں ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو دیا

مسئلہ تونیسیہ کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں، پاکستان نے جو ووٹ دیا ہے اس کے ضمن میں مزید تشریحات کی غرض سے میں مندرجہ ذیل بیان دینے کا خواہاں ہوں۔

سال رواں کے قریباً آغاز ہی سے تونیسیہ میں شدید بے چینی جاری ہے۔ قتل، تشدد، آتش باری، اور وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی خبریں دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ میری حکومت نیز اقوام متحدہ کے رکن ملکوں میں سے دس اور حکومتوں کے نزدیک یہ صورت حال بے حد تشویش ناک ہے۔ ہمارا قطعی یقین ہے کہ گزشتہ تین ماہ یا اس سے کسی قدر زیادہ مدت کے اندر تونیسیہ میں جو دردناک حالات پیش آئے انہیں محض مقامی ہنگامے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شہریوں میں کچھ فساد ہوا یا معمولی امن شکنی کے واقعات پیش آئے جسے روکنے کے لیے نظم و قانون کے محکمے کو عام اقدامات کرنے پڑے جن لوگوں کے ہاتھوں یہ واقعات رونما ہوئے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فریقین کے احمق یا بدکردار لوگ تھے۔ اس صورت حال کی جڑیں ماضی میں چلی گئی ہیں۔ فی الحال توازن بڑی ہی نازک حالت میں ہے اور مستقبل کے دامن میں ناخوشگوار واقعات ہی نظر آ رہے ہیں۔ اسی لیے ہمارے نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال بین الاقوامی امن و سلامتی کے لیے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے ذہن

اور مقتدر نگاہوں کی توضیح و جواز کے لئے اس کے متعلق مزید کچھ عرض کروں۔

فرانسیسی حکام اور اہل تونیسیہ کی حکومت کے درمیان جس کش مکش نے حال میں ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے یہ اس کش مکش کا مختصر ۔۔ ترین منظر ہے جو ستر سال سے جاری ہے۔

فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونیسیہ پر قبضہ جمایا تھا۔ جب کہ ایک فرانسیسی فوج (مورخوں کے بیان کے مطابق) الجزائر سے اس بہانے تونیسیہ میں داخل ہوئی تھی کہ ایک قبیلے کو سزا دینی منظور تھی۔ داخل ہوتے ہی اس فوج نے دارالسلطنت کی طرف تیزی سے آنا شروع کیا۔ عام حکومت کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، اور حاکم تونیسیہ کو فرانس کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال معاہدۂ باردو قرار پایا۔ یہ معاہدہ اپنی نوعی وضع میں ان معاہدوں کے عین مطابق تھا، جو استعمار کے دور عروج میں طاقت ور اور ناتوانوں کے درمیان ہوتے رہے۔ بہر حال اس کی تمہید میں مرقوم ہے کہ "فریقین دوستی اور خوش گوار ہمسائیگی کے روابط کو مستحکم بنانے کے آرزومند ہیں جو ان دو حکومتوں کے درمیان ہمیشہ سے چلے آتے ہیں۔" اس معاہدے کی دفعہ ۲ میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کا فوجی قبضہ اسی وقت ختم ہو جائے گا جب فرانس اور تونیسیہ کے حکمران اس امر پر متفق ہو جائیں گے کہ مقامی انتظامیہ قیام امن بحال رکھنے کا اہل ہے۔

یہ فوجی نصرت جس کا مدعا یہ تھا کہ نظم و قانون بحال ہو، بدستور اب تک قائم ہے اور اس کی کڑیاں میں ڈھیل کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ تونیسیہ پر فرانس کی گرفت بار بار سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔

فرانس کو تونیسیہ میں قدم جمائے دو سال ہو چکے تھے۔ جب ۱۸۸۳ء میں ایک کونشن پر دستخط ہوئے جو لامرسی (La Marsa) کی کونشن کہلاتی ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ تونیسیہ کے لئے "زیر حمایت علاقے" کا جملہ استعمال ہوا تاہم اس سے ابتدائی معاہدے کی بنیادی حیثیت میں کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ اسے بدلا گیا۔ جو "دو حکومتوں کے درمیان" ہوئی تھی۔ اس کا منشا یہی تھا کہ دو حکومتوں کے درمیان تعاون رہے گا۔ یہ نہ تھا کہ فرانس انتظامیہ کا براہ راست ذمہ دار ہوگا۔ تاہم عملاً یہ تونیسیہ کی محکومی کا آغاز تھا کیونکہ اس کے بعد سے جمہوریۂ فرانس نے یک طرفہ حکم جاری کر کے پہلے حکمران تونیسیہ سے اندرونی امور کے تمام اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے پھر بہت جلد یکے بعد دیگرے حکمناموں کے ذریعے تونیسیہ میں فرانسیسی نمائندے کے اختیارات اور بھی مستحکم کر دیے اور وہ نمائندہ بطور خود تونیسیہ میں فرانسیسی جمہوریت کے اختیارات کا تولیدار بن گیا۔

کسی علاقے کو زیر حمایت لے لینے کی وجہ جواز پیش کی جاتی ہے کہ پس ماندہ اقوام کو خود اختیاری حکومت کے راستے پر چلایا جائے لیکن تونیسیہ کے تعلق میں اس کے برعکس عمل ہوا یعنی اس آزاد ملک کو آہستہ آہستہ آزادی سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی سیادت اور برتری کھا کھا کر ختم کر دی گئی۔ اور جو خود مختاری اسے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے حاصل تھی وہ غیر ملکی اقتدار میں بدل دی گئی۔

پھر تونیسیہ میں فرانسیسیوں کو آباد کرنے کا مسلک اختیار کیا گیا۔ ان آباد کاروں کو زمینیں بھی دی گئیں۔ اور مالی امداد سے بھی نوازا گیا۔ تونیسیہ کے نظم و نسق میں فرانسیسی کارندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بہترین زمینیں ان آباد کاروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہیں جو براہ راست فرانس سے آئے تھے یا انہیں قریب میں انہیں تونیسیہ میں قومی حقوق مل گئے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کو خواہ مخواہ جنگلات قرار دے کر حکومت قابض ہو گئی۔ ایک اور قانون کے ذریعے ان تمام جنگلات کی حد بندی کر کے خاص آباد کاروں کے فائدے کے لئے از سر نو تقسیم کر دیا گیا۔ تونیسیہ کی آبادی چھتیس لاکھ کے قریب ہے ان کے مقابلے میں فرانسیسی صرف ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہیں۔ تیس ہزار چھوٹے بڑے افسر ملک کا نظم و نسق سنبھالے بیٹھے ہیں گویا ایک سو باشندوں کی ہر جماعت کے لئے ایک افسر مقرر ہے ان افسروں میں سے تین چوتھائی فرانسیسی ہیں۔ تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو مدرسوں میں جانے والے تونیسی طلبہ کا تناسب ۱۱ فیصد ہے اس کے مقابلے میں فرانسیسی

تونیسیہ کا مناسب مداخلہ

سب پرستم اپنے پیرس فرانس کی طرف سے جو ریذیڈنٹ تونیسیہ میں مقرر ہے اس نے حکمران کے تمام اختیارات غصب کر رکھے ہیں اور اس فریب کی حالت کا احساس قائم رکھنے کے لئے محض اس کی مہر استعمال کی جاتی ہے۔ تونیسیہ کے باشندوں کی کوئی قانون ساز مجلس یا پارلیمنٹ نہیں جس کے ممبر رائے عامہ سے منتخب ہوئے ہوں اور جسے کم از کم داخلی معاملات کے متعلق ہی قانون بنانے کا اختیار ہو۔ اگرچہ وہاں وزیر مقرر کر دیے گئے ہیں تاہم احکام نافذ کرنے کا پورا اختیار فرانسیسی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اہل تونیسیہ نے فرانسیسی استبداد کو کبھی بطیب خاطر قبول نہیں کیا۔

موجودہ صدی کے آغاز سے تونیسیہ کی قومی تحریک میں زیادہ سے زیادہ قوت و حرکت پیدا ہو گئی اور اس نے وہی شکل اختیار کر لی جو دنیا کے دوسرے حصوں کی محکوم اقوام نے دور حاضر کی سیاسی فضا میں اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی وہ بیدار ہوئے، آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور بعض حالتوں میں اب تک اجنبی اقتدار اور لوٹ مار کے خلاف سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

اہل تونیسیہ کو بھی ایسی مشکلات پیش آئیں جو دوسرے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں۔ یعنی جن اجنبیوں نے وسیع وسائل ملک پر قبضہ کر رکھا ہے ان کی طرف سے مخالفت اور استعماری طاقت کی طرف سے قوت کا کڑا اور اندھا دھند استعمال۔ قوم پرست لیڈر یکے بعد دیگرے یا تو جیلوں میں ٹھونس دیے گئے یا جلا وطنی پر مجبور ہو گئے۔ اور یہ تمام لوگ بصیرت اور دانش و ہمت کے مالک تھے۔ ان میں سے بعض جلاوطنی ہی میں وفات پا چکے ہیں تاہم عارضی پسپائیوں کے باوجود تحریک برابر ترقی کرتی گئی۔ پہلی جنگ عظیم اور پریذیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات کے بعد اہل تونیسیہ کے دل نئی امیدوں کی روشنی سے چمک اٹھے۔ جریدہ اکانومسٹ (Economist) کے بیان کے مطابق عین اسی وقت فرانسیسی حکومت نے اپنے شہروں اور چھوٹے چھوٹے آبادکاروں کی تعداد بڑھانے کا منظم سلسلہ شروع کر دیا اور فرانس کے سیاسی گروہ مختلف فریقوں کی حمایت میں لگ گئے۔ بعض سیاست دان بائیں بازو کی ترقی پسند جماعت "دستور" کے ساتھ ہو گئے، بعض نے آبادکاروں کی پشتی بانی اختیار کر لی۔

پیرس میں حکومتیں بدلتی رہیں۔ ہر حکومت کی ظاہری حیثیت کے ساتھ اہل تونیسیہ کی امیدوں اور آرزوؤں میں بھی نشیب و فراز کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک طرف دستور پارٹی اور حکومت کی امیدیں مایوسی میں بدل گئیں۔ دوسری طرف آبادکاروں کے حامی فرانسیسی حکام کر بیٹھ کر تیار ہو گئے۔ اس طرح دسیع پیمانے پر کشمکش کا ایک دور قائم ہو گیا۔ قریباً ایک ہزار قوم پرور جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ فرانسیسی حکام نے اعلان کر دیا کہ تونیسیہ میں محاصرے کی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہ صورت حال ابھی تک ختم نہیں ہوئی اگرچہ چودہ سال کے طویل دن گزر چکے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ تونیسیہ میں فرانس کا نظم و نسق نظر ثانی کا محتاج ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ نظم و نسق نہ تو دو حکومتوں کے درمیان معاہدوں کی بنا پر جائز تھا نہ اسے انصاف یا آزادی کے اصول کی بنا پر حق بجانب ثابت کیا جا سکتا تھا۔ میں یہاں پھر جریدہ اکانومسٹ سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جریدۂ مذکور رقمطراز ہے:

> "جس حکومت کو بدلنے پر وہ (تونیسی اور فرانسیسی) اصرار کر رہے تھے اس کے اجزائے ترکیبی اس وقت یہ تھے۔ بے (حکمران) ایک کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا جس میں سات فرانسیسی اور چھ تونیسی شامل تھے۔ لیکن اس کابینہ کے فیصلوں کو اوپر بھیجنے سے پیشتر ایک فرانسیسی کی توثیق لازم تھی۔ کابینہ کو معاشی اور مالی معاملات میں مشورے دینے کے لئے دو بڑی منتخب کونسلیں مقرر

کردی گئی تھیں۔ جن کے ارکان کی تعداد یکساں تھی۔ ایک تونسیوں پر مشتمل تھی اور دوسری فرانسیسیوں پر لیکن ان اسمبلیوں کی حیثیت محض مشیروں کی سی تھی۔ اس گورنمنٹ بار سے ہم تونسیوں کے ۱۲ سے کردی گئی تھی۔ عملاً پورا اقتدار فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے کہ ایک فرانسیسی افسر تمام اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا اور باے تونسیہ کے ہر حکم پر کسی فرانسیسی کے دستخط بھی ضروری تھے۔ سب سے آخر میں اس لئے کہ جن فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تمام کلی اختیارات تھے وہ جلدی اور دیہاتی اداروں کے بھی نگران مطلق تھے:

۱۹۵۰ء کے موسم گرما میں، ۱۹۴۹ء کے واقعات نے وہ نتیجے پیدا کئے۔ فرانسیسی آبادکاروں کے سخت لسانی شدید مخالفت کے باوجود نئے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو ہدایت کی گئی کہ تین بڑی اصلاحات جاری کردی جائیں اور اگر ممکن ہو تو اس بارے میں اہل تونسیہ کی حمایت حاصل کی جائے۔ اوّل فوراً وزارت از سر نو ترتیب دی جائے۔ دوم سول سروس میں داخلے کی شرطیں تبدیل کردی جائیں تاکہ اہل تونسیہ بھی معقول تعداد میں سے جا سکیں اور مقابلے کا امتحان ضروری نہ رہے جسے فرانسیسی آبادکار ترجیح دے رہے تھے۔ سوم دیہاتی خود مختاری جاری کردی جائے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ریذیڈنٹ جنرل نے حکمران کے مشورے کے بعد ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی کوئی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ اس نے نئی وزارت کی ترکیب کا اعلان کیا جس میں پہلی مرتبہ تونسیوں اور فرانسیسیوں کی تعداد مساوی رکھی گئی۔ اور اس کی صدارت تونسی وزیراعظم ایم شینک (M. CHENIK) کے حوالے کی گئی۔ سات تونسی ارکان مختلف پارٹیوں کے نمائندے تھے۔ صرف کمیونسٹوں اور قدیم دستور پارٹی میں سے کوئی نمائندہ نہ لیا گیا۔ اس لئے کہ آخر الذکر بھی مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہرحال نو دستور پارٹی اس کابینہ میں خدمت گزاری پر راضی ہو گئی۔

فروری ۱۹۵۱ء میں تونسیوں اور فرانسیسیوں نے باہمی رضامندی سے کئی تبدیلیاں کرلیں۔ ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ وزارت کا فیصلہ اگر انہیں حکمران تک پہنچانے سے پیشتر کسی فرانسیسی کی نظرت اشیاء تونیق ضروری نہ ہوگی۔ اب فرانسیسی آبادکاروں کے سامنے اس صورت حال پر غور سے پھر سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں خرابی کہاں پیدا ہوئی؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہے: ماضی قریب میں جو مشکلات پیدا ہوئیں۔ ان کی اصل اساس یہ ہے کہ نو دستور پارٹی نیز تونسیوں کی بہت بڑی تعداد ان اصلاحات کو جلد سے جلد کامل خود مختاری حاصل کرنے کی تمہید سمجھتی ہے اس کے برعکس فرانسیسی آبادکاروں کی رائے یہ ہے کہ ان حدود سے آگے پیرس کو ایک قدم بھی نہ بڑھانا چاہیئے۔

وزیراعظم تونسیہ نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے نام ایک خط بھیجا: "موجودہ وزارت اس وجہ سے بہت بے بس ہے کہ جو نیا قدم یہ اٹھانا چاہتی ہے اس میں مسلسل مخالفت ہوتی ہے..... مذاکراتی وزارت کا قیام اس قسم کے دباؤ کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اس لئے کہ مہینوں سے یہ وزارت تونسیہ اور پیرس دونوں مقامات پر فرانسیسیوں کی تحقیر آمیز اور معاندانہ سرگرمیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے تونسیہ اور پیرس میں فرانسیسی نمائندوں کی اکثریت نیز فرانسیسی حکام کی کوشش اور ان سب کی کوششیں کہ گفت و شنید ناکام ہو جائے ایک کھلے ہوئے راز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ تمام ذرائع استعمال کئے گئے جن کی بنا پر حکومت تونسیہ اور اسمبلی کے تعاون کو ناممکن بنا دینا منظور تھا۔ مثلاً اجتماعی طور پر استعفے دے دیئے گئے خاص سیاسی نقطۂ نگاہ سے قراردادیں پیش کی گئیں۔ وزیراعظم نے قرضوں کے سلسلے میں جو مطالبہ کیا تھا اسے نمائندوں کے سامنے پیش کردیا گیا۔"
۲۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو وزیراعظم نے پھر ایک چٹھی ریذیڈنٹ جنرل کے نام بھیجی جس میں ان تمام کارروائیوں کی تفصیل کھول دی گئی جو وزارت سے پہلے اور اس کے بعد اختیار کی گئیں۔ اس میں بڑی مجلس کے فرانسیسی حصے کے استعفے بھی شامل تھے جو فرانسیسی حکومت اور پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے وفدوں نے روبرو پیش کئے

گئے۔ دیلازگی کا رہ وائیول کا بھی ذکر تھا۔ شفو پیرس تار بھیجے گئے، مختلف انتظامی محکموں میں جو فرانسیسی کام کر رہے تھے ان کے ساتھ معاونہ مشیر بھی مقرر کر لیا تھا۔ میں ان نازیبا اشاعتوں کا ذکر نہ کروں گا جن کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہے یعنی ان فروگذاشتوں کا جو وہاں کی حکومت میں سراسر غیر مادی سمجھے جانے کے لئے تیار ہوں ــــــ البتہ میں آپ کی توجہ ان چند نمایاں واقعات کی طرف مزید مبذول کرانا چاہتا ہوں جن سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اہل تونیسیہ کی طرف بعض لوگوں کی غلط اندیشی عداوت اور تونیسیہ میں فرانسیسی مفاد کے عجیب و غریب تصورات کس حد تک وسعت اختیار کر سکتے ہیں، تاہم اب بھی ہر چیز کا مداوا ہو سکتا ہے۔ مجھ سے کئے امکانات موجود ہیں دیانت دارانہ اور خیر خواہانہ گفت و شنید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تیونس کے لوگ جن پر انحصار مشکل ہے مایوس ہیں، اور وہ مایوسیوں کے باوجود گفت و شنید جاری رکھنے کے لئے تیار ہیں اگرچہ بار بار اس میں مداخلت ہوتی رہی۔ اس مداخلت کے ذمہ دار وہ چند لوگ تھے جنہیں سیاسی و انتظامی تعطل ہی میں فائدہ نظر آتا ہے۔"

دوسرے لفظوں میں ۱۹۵۰ء کی روح ان فرانسیسیوں نے بالائے طاق رکھ دی جن کی دلچسپیاں تونیسیہ سے وابستہ تھیں۔ تونیسیہ کی وزارت جو اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ حکمران اور اہل تونیسیہ کی خود مختاری بحال کرنے کے لئے حکومت فرانس سے گفت و شنید کرے اسے غلط طریق پر محروم اختیارات کیا گیا۔ فرانسیسی آبادکاروں کی سازشوں اور جا و بے جا مداخلتوں نے وزارت کو بے عمل بنا دیا۔ تونیسی وزیروں کو مسلسل ذلت کا نشانہ بننا پڑا۔

یاس و ناامیدی کی یہ فضا تھی جس میں تونیسی وزیر ۱۹۵۱ء کے آخری ہفتے میں عازم پیرس ہوئے تاکہ حکومت فرانس کو از سر نو عہد و پیمان کی یاد دلائیں۔ فرانس کے وزیر خارجہ نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو جو جواب دیا اس نے امیدوں کا آئینہ ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اس جواب میں جدید اصلاحات کی ضرورت کے سوا اور کوئی چیز تسلیم نہ کی گئی۔ باقی جو کچھ تھا صرف یہ تھا کہ فرانس نے تونیسیہ میں تہذیب کے لئے جو کام کیا اس کی خوب قصیدہ خوانی کی گئی اور بتایا گیا۔ تونیسیہ میں فرانس نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس جواب نے اہل تونیسیہ کو حد درجہ مایوس کر دیا اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو لوگ بس رہے تھے ان کے دلوں میں بھی شدید خطرات پیدا ہو گئے۔

۱۹۵۱ء میں ایم رابرٹ شومان (M. ROBERT SCHUMAN) نے کہا کہ "فرانسیسی یونین کے تمام علاقوں کے لئے سب سے بڑا نصب العین آزادی ہے۔" اس سے اہل تونیسیہ کے دل مسرور ہو گئے۔ تاہم ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کے مکتوب میں یہ اعلان کر کے تاریخ کا رخ بدلنے کی کوشش کی گئی۔ "حکومت فرانس موجودہ اداروں (گرانڈ کونسل) میں ترمیم پر غور و خوض سے نفور نہیں لیکن اس کے نزدیک نمائندگی نسبت کی حکومت میں فرانسیسی نمائندگی کے اجزا کی حفاظت سراسر ناگزیر ہے۔"

اس بحث سے مشکل اور مایوسی سے اہل تونیسیہ کو جو صدمہ ہوا اسے اس خط سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا جو تونیسی وزیر اعظم نے حالات کی اس اچانک تبدیلی پر حیرت زدہ ہو کر صدر فرانس کو لکھا۔

> "تونیسیہ میں فرانس کے مفادات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت تونیسیہ نہ صرف ان مفادات کو تسلیم کرتی ہے بلکہ ان کی حفاظت کی ضمانت دینے کے لئے بھی تیار ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اہل تونیسیہ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کر رہی ہے۔ لیکن ان مفادات کو خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں سیاسی حقوق کی صورت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جن کے تحت اہل فرانس کو تونیسیہ کے انتظامی اور نمائندہ اداروں میں دخل دینے کا حق مل جائے ..... جہاں تک فرانس کی طرف سے مالی امداد کا تعلق ہے اس امر کی پوری پوری وضاحت

ہو رہا ہے زیادہ سے . کہ اس کی حیثیت قرضے کی ہے جس کا اصل اور سود دونوں واجب الادا ہیں ، اور
جس کے اخراجات سالانہ بجٹ میں بسلسلہ قرضہ زیر عنوان "قرضہ تونیسیہ" کئے جاتے ہیں ۔ اس میں
شک نہیں کہ اس قرضے سے ملک اور عوام کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے
کہ اس امداد سے جو مفادات سب سے زیادہ نفع حاصل کر رہے ہیں وہ قدرتی ذخائر ، نقل و حمل
کے وسائل ، مدد بجلی وغیرہ کی تیاری کے لئے مراعات ہیں ۔ ایسے مفادات میں تونیسیوں کا حصہ
عملی طور پر صفر کے برابر ہے ۔ جناب صدر ! مثالیں گنوانے سے یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اہل
تونیسیہ پر فرانس کے احسانات کا ڈھنڈورا انتہا پر چڑھا کیا جاتا ہے لیکن تونیسیہ نے آڑے وقت میں فرانس
کی جو مدد کی ، اسے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے ٹال دیا جاتا ہے . . . . . کیا یہ سب کچھ بھلا
دیا گیا ہے ؟ کیا تونیسیہ کو وقتی فرانس کا ہمیشہ کے لئے دست نگر تصور کر لیا گیا ہے ؟"

اس کے بعد جو کچھ ہوا ، اس کا کسے علم نہیں ؟ تونیسیہ کے ہر دل عزیز محب وطن رہنما حبیب بورقیبہ (MARIE BOURGUIBA)
اور دوسرے قومی لیڈر جنہیں تونیسیہ کے عوام عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ، ۱۸ جنوری کو گرفتار کر لئے گئے ۔ فسادات رونما ہوئے گولیاں برسائی
گئیں ۔ جان و مال کا نقصان ہوا ، ہزاروں تونیسیوں کو ، بالآخر تمام تونیسی وزیروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا ۔ یہ سب حال ہی کی باتیں ہیں ۔

ماضی کے حالات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے سے میری غرض محض یہ ہے کہ کشمکش کے گذشتہ تین مہینوں میں وہاں جو واقعات رونما
ہوئے ہیں ان پر روشنی ڈالی جا سکے ۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر فرانس کے اس دعوے کو کہ وہ امن و قانون بحال کرنا چاہتا ہے اس ، فسادی کردار کے شکنجے
میں جا پہنچے جس نے ایک مظلوم کا گلا مروڑا اس جرم کی پاداش میں شدت کے ساتھ . بایں لزوم گھٹنے کے باعث اس کی آنکھیں باہر نکل آتی تھیں ۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میری حکومت تونیسیہ کی صورت حال کو محض ایک معمولی مقامی یا داخلی مسئلہ نہیں سمجھتی ۔ حکومت فرانس کا یہ کہنا کہ وہ
اصلاحات کا نیا منصوبہ رائج کرنا چاہتی ہے ہمارے دلوں میں اطمینان یا اعتماد کس طرح پیدا کر سکتا ہے جب کہ اس نے تونیسیہ کے ان تمام قومی لیڈروں کو جیل
میں ڈال رکھا ہے جن سے اس قسم کے منصوبوں کے بارے میں بات چیت ہو سکتی ہے ؟

تونیسیہ سے حال ہی میں جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ بہت اضطراب انگیز ہیں ۔ نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون "تونیسیہ کی کابینہ" کے زیر عنوان
ایسوسی ایٹڈ پریس کی یہ اطلاع شائع کرتے ہوئے کہ ۱۲ اپریل کو تونیسیہ میں نئی کابینہ قائم ہوئی لکھتا ہے :-

"اس کابینہ کو کوئی قابل ذکر اقتدار حاصل نہیں ۔ فرانس کی طرف سے اعلان اصلاحات کی جو تقریب
قریب ہی قرطاجنہ میں منائی گئی اس میں شریک ہونے والوں نے بیان کیا کہ شمالی افریقہ کے زیر حمایت
علاقے تونیسیہ کے برائے نام حکمران بے کے چہرے پر اس وقت تبسم کے کوئی آثار موجود نہ تھے ۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجبور کر کے یہ کردار ادا کرایا جا رہا ہے ۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل جین ڈی
ہاٹی کلوک (JEAN DE HAUTECLOQUE) نے وزارت خارجہ کا عہدہ
سنبھال لیا ہے ۔ تونیسیوں کو اپنے ملک کے دفاع سے بھی سروکار نہ ہوگا ۔ بیس ہزار سے زیادہ فرانسیسی

> فوجِ فرانس حکومت کر رہی ہے۔ جن علاقوں میں فی الحقیقت عرب بستے ہیں وہاں اس وقت معمولی سی بات
> پر بھی ... جتنا سارا تیونس، مقامی حکام امین پاشا پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ مسٹر بکوش (M.
> Baccouche) کو بحیثیت وزیر اعظم قبول کریں۔ باوجودیکہ بالغ تیونسی ...
> تیس لاکھ تیونسیوں کی نمائندگی نہیں کرتے، وہ خود تیونس کے ... اس عہدے پر ... نامزد ہو گئے ہیں
> پیرس کے حلقۂ اخبارات نے بھی باوجود موجودہ حکومت کو تیونسیوں کا ... سینے میں ... نہیں
> کیا اور فرانس نے تیونس کی جدوجہد آزادی کو ... میں دبانے کی کوشش کی اس پر تنقید جاری
> کر رہے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت فرانس پھر ایک بار تیونس کی جدوجہد کو ناکام بنانے کی خواہاں ہے۔ اور پرانی استعماری صورت حال کو بحال رکھنا چاہتی ہے جس میں قوم کے جذبات خود مختاری کو دبا کر ایک جمہوری اور بدشعور عوام کو پھر سے پیدا کرنا چاہتی ہے تاکہ استعماری طاقت کی لوٹ کھسوٹ اور منافع کے لئے سازگار فضا بنے۔ استعماری طاقت کے لئے دولت مندی کا راستہ یہی ہے کہ اپنے نو آبادیوں میں سستے پیداوار سے محکوم قوم کے ان جذبات سے خود امید حاصل نہ ہو جن میں دوسرے مقامات پر شاندار اور جوان مردانہ جذبۂ وطن کا نمونہ بھی دیا ہے گا۔

ایک مشہور امریکی رسالے میں ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے "یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ افریقہ سے دست کشی کے سوال اور عموماً ان کے سامنے پیش ہو رہے ہیں جو نو آبادیاتی طاقتوں میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ اب جب کہ اپنی نصف سلطنت ختم کر چکا ہے" مقالہ نگار کے قول کے مطابق فرانس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت بنا ہوا ہے۔ اس لئے کہ کروڑوں افراد محکوم بنا رکھا ہے جو دنیا کے تین حصے ہو سکتے ہیں اور وہ ستاون ہزار مربع میل کے رقبے میں آباد ہیں جو ریاست ہائے متحدہ سے ڈیڑھ گنا ہے ..... فرانس کے لئے اب بھی وقت ہے کہ افریقہ میں دانشمندانہ پالیسی اختیار کرے۔ استعماری نظام کی جگہ تعاون کا نظام رائج کرے اور مقصد یہ ہو کہ بہر حال وہ افریقہ سے دست کش ہو جائے گا۔ اس طرح فرانس تمام نو آبادیاتی ممالک کے لئے ترقی کی حیثیت میں مثل پیدا ہوگا۔"

یہ دست کشی نہ تو موجب شرم ہے اور نہ اسے شکست قرار دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر اقوام متحدہ کے منشور کے کوئی معنی ہیں تو استعماری طاقتوں کے لئے انجام کار اس سے زیادہ تر روش اور کوئی نہ ہوگی کہ اپنی نو آبادیوں کو چھوڑ جائیں۔ تمام امن دوست قوموں کی دلی خواہش یہی ہے کہ یہ دست کشی امن و نظم کے ساتھ پوری ہوگی۔ اس میں کم سے کم اخلاقی یا جسمانی بربادی کا موقع آئے گا۔ اور بعد میں ایسی خوشگوار یادیں رہ جائیں گی جن سے دنیا میں امن کو تقویت پہنچے گی۔

اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں میرے وفد کے مقاصد یہ تھے:-

۱. حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر تیونسیوں کو بے عزتیوں اور پریشانیوں سے بچایا جائے ان کے اموال و نفوس کو تباہی سے محفوظ رکھا جائے ان کے شہری حقوق کو ضائع نہ ہونے دیا جائے اور یہ سب سختیاں ان پر اس قصور کی پاداش میں نازل کی جا رہی ہیں کہ انہیں اپنے ملک اور اپنی قومی آزادی سے محبت ہے۔ اس مقصد کو ہمارے نزدیک سب پر تقدم حاصل ہے۔

۲. حفاظتی کونسل کے اثر و رسوخ کو وسیلہ بنا کر اس تعطل کو ختم کیا جائے جو فرانسیسیوں اور تیونسیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو تیزی سے برباد کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ دوستانہ تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔

۳۔ الجزائر اور ایشیا میں عوام کے جذبات پر منفی ردعمل کو برانگیختہ ہونے سے پہلے ہی کہ ایک گروہ نے پیا ہو گا، اور شریف قوم اور ایک صدر جو آزادی یورپی طاقت کے درمیان جو خونریز جنگ جاری ہے وہ ایشیائی طاقت اور جہاز یا ہو آزادی ہے اور دوسری قوم کے لئے اہم پیچیدہ تعریف کے لئے؟ ایسا کوئی اقدام وہ جو جاذب پیش نہیں جا سکتی۔ باشندگان الجزائر و ایشیا کے جذبات کی بے چینی کو جنگ سے علیحدہ کرنا ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میری حکومت اور میرے ملک کو فرانس کے ساتھ انتہائی محبت ہے اور وہ فرانس کی عظیم الشان آزادی پسندانہ روایات کو منصفانہ احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے ایک ممتاز روزنامے "ڈان" نے لکھا ہے۔ "بعض سیاسی مسائل میں بھی فرانس کے ساتھ گو ہمیں اختلافات ہوں لیکن ہم فرانس کی انتہائی عزت کرتے ہیں اس لئے کہ وہیں سے حریت، اخوت اور مساوات کے بلند پایہ نعرے اٹھے تھے۔ ہم فرانس کو آزاد دنیا میں اپنا دوست دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ اور فرانس و پاکستان کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔"

اگر ان اعلیٰ اصول کا علم بلند رکھنے کی کوشش میں جس کا سہرا تاریخ نے فرانس کے سر باندھا ہے میں نے اپنے رفیقوں اور ممتاز نمائندوں کے صبر و تحمل پر زیادہ بوجھ ڈالا ہے تو میں بصمیم قلب معذرت خواہ ہوں۔

ماڈل جنرل اسمبلی

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ و سفیر احمد شاہ بخاری کی اس انداز کی تقریر کا متن دیا جاتا ہے جو
انھوں نے برنارڈ کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی کے جلسے میں ۷ اپریل ۵۵ء کو فرمائی۔

جناب صدر! سب سے پہلے میں آپ کی اجازت سے مس مدر سیاسیہ میک انتوش[1] پروفیسر پیرسن[2] مسٹر ولیم ہینڈرسن[3] اور مس روتھ شاختر[4] کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کے سبب مجھے آج شام یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے اقوام متحدہ کی اس ماڈل اسمبلی سے مقرر خصوصی کے طور پر خطاب کرنا ہے تو ایک لمحہ کے لئے مجھ پر صورت حال کے ابہام نے تحیر کی کیفیت طاری کر دی۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ اجتماع جس نے اپنے لئے ماڈل اسمبلی کا نام تجویز کیا ہے، یہ عام اقوام متحدہ کی اسمبلی کے نمونے پر تیار کرے گی۔ جو دنیا نے ایک پرمسرت پیش گوئی تھی یا اقوام متحدہ کی اسمبلی کے متعلق یہ توقع قائم کی گئی ہے کہ وہ بتدریج اپنے طرز عمل کو آپ کے نمونے کے مطابق بنا لے گی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے رفقائے کار جو اقوام متحدہ میں ہیں اور یقیناً وہ مقرر بھی جو آج شام آپ سے مخاطب ہے اپنے طرز عمل اور طریق کار کو آپ کے طرز عمل کے نمونے پر ڈھالنا پسند کرے گا۔ میں یقین کیا کرتا ہوں کہ ایسا کرنے سے وہ دنیا میں بھی اپنی زندگی سدھار لے گا اور آخرت میں بھی۔

میں یہ پیش گوئی تو نہیں کر سکتا کہ آپ لوگ اس اسمبلی میں جو مباحثے کریں گے ان کا انداز کیا ہوگا لیکن اگر انہیں اسی مثال پر قائم رہنا ہے جو اقوام متحدہ میں پیش ہوتی ہے تو پھر میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو آپس میں اختلافات رفع کرنے سے بھی سابقہ پڑے گا اور میں یہ پیش گوئی بھی کر سکتا ہوں کہ ان اختلافات کی بنا پر آپ کبھی کبھار اور شاید بسا اوقات اپنے آپ کو شکست سے دوچار ہوتا ہوا بھی پائیں گے پھر آپ کے سامنے بار بار سوال آئے گا کہ آیا یہ تنظیم چل سکتی ہے؟

اختلافات کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ لیکن میں ایک نقطے کے لئے فقط دو ہی صورتوں پر زیادہ توجہ کروں گا۔ ان میں سے پہلے خلاف کی توضیح بالکل سہل ہے اور مجھے اس پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑے گا۔ یہ خلاف بنیادی حیثیت کا ہے جس کی نمائش اقوام متحدہ کے ایوانوں میں بار بار ہوتی ہیں۔ اور جس کے نعرے اس مجلس میں بار بار بلند ہوتے ہیں۔ اسے مشرق و مغرب کی آویزش کہا جاتا ہے۔

---

1. MACINTOSH, 2. PEARSON 3. MR WILLIAM HENDERSON, 4. MISS RUTH SCHACTER

ہم سے [illegible] ان ... کی ماہیت و تفصیل سے تسلی کی فرصت نہیں ... کہ [illegible] کیا ہے، [illegible] کروڑوں انسان مرد و عورت [illegible] کشمکش کے [illegible] سے [illegible] نہیں اور [illegible] ... کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟

ان میں [illegible] اختلافات کی طرف منسوب ہوتا ہوں [illegible] ... جو یہ اختلاف زیادہ تر نہیں [illegible] کی حیثیت ... [illegible] ... کے سے [illegible] تمام [illegible] احکام کا موجب بنے گا۔

آپ سے ... [illegible] ... صاحب [illegible] ... بتائیے [illegible] ... سے [illegible] ... ہیں کہ [illegible] ... کی ... [illegible] ... کے مفہوم میں کوئی خاص ... نہیں ... کسی خاص قسم کا [illegible] ہے۔ ... مفادات کا ایک عالم ... جو مختلف قوموں میں ... کی تاریخ [illegible] روایات کے باعث مشترک ہیں۔ یہ تو ایک انسانی [illegible] ... شاید آپ کو ... کہ یہ اختلافات کیا ہیں؟ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ ... انہیں رفع کرنے کی [illegible] کیا ہے؟

یہ اختلافات [illegible] ہیں۔ ایک فرق تو وہ ہے جسے [illegible] ... سادگی بھی مشرقی اقوام میں ... [illegible] ... اس میں قدر مشترک کیا ہے ... آپ نے غور فرمایا ... میں نے لفظ [illegible] کیا ہے؟ ... آسان [illegible] ... علاوہ [illegible] کی [illegible] استعمال کر کے اسے [illegible] ... کا مفاہمت ... [illegible] ... استعمال کیا جا رہا ہے۔ مغربی یورپی قوموں نے ... گروہ میں جو [illegible] ... میں [illegible] اختلافات [illegible] کے ہیں ... میں غلط نہیں کہتا [illegible] کا لفظ تو ہرگز استعمال نہیں کرتا۔

ان میں پہلا اختلاف [illegible] مسائل [illegible] تعبیر کے متعلق تھا ... [illegible] ... اکثر و بیشتر اقوام ماضی میں شدید [illegible] کا شکار رہی ہیں ... [illegible] ... کو فراموش نہیں کر سکتی [illegible] ... کا عقیدہ رکھنے والوں سے ... [illegible] ... مستقل [illegible] ... انہیں [illegible] سمجھیں۔ [illegible] امتیاز کے [illegible] کی علامت ... [illegible] ... غلط نہ سمجھیں ... ان چھوٹے موٹے حادثات کو نہیں جو [illegible] ... میں ... ہیں ... انفرادی واقعات کی جانب [illegible] ... ابھی بہت دور ہے جب کوئی ملک [illegible] ... ہمارے [illegible] ... میں اس نسلی امتیاز کا ذکر ... جو وسیع بین الاقوامی پیمانے پر کیا جا سکتا ہے اور ... [illegible] ... کے لیے بھی خطرے کا باعث ہے۔ آپ نے اخباروں میں کئی ملکوں کی خبریں پڑھی ہوں گی جہاں نسلی امتیازات کے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے واقعات [illegible] ... میں بھی ... ہوتے ہیں اور چند دوسرے ملکوں میں بھی۔ مجھے مغربی یورپ یا [illegible] ممالک کا کوئی ایسا [illegible] ... خیالات [illegible] ... ہیں ... فرق ہے تو صرف صورت حال کے جذباتی ردعمل کا ہے۔

دوسرا مسئلہ جس پر اقوام ... اس گروہ کے ... [illegible] ... سے تعبیر کیا جا سکتا ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ [illegible] اقوام دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک وقت تھا جب مجھے یہ بات یاد دلانا پڑتی تھی ... اس سادہ سی حقیقت کو تسلیم ... [illegible] ... تک [illegible] ... کر لیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ آج دنیا

[illegible] فلسفیوں کو اس مادہ کی حقیقت کا اندازہ [illegible] حیثیت [illegible] نہیں تو کم از کم [illegible] حیثیت [illegible] وقت [illegible] تو آپ میں سے [illegible] کی کوآبادی [illegible] بعض مکرو [illegible] آئے [illegible] کی موت [illegible] انسانی ذہن [illegible] شعور [illegible] نہیں [illegible] ہماری شعوری [illegible] انکاری [illegible] سے لوگوں [illegible]

[illegible] بالکل [illegible] حقیقت [illegible]

[illegible] کے لئے [illegible] مقدم [illegible] کا باعث ہوئی [illegible] کا ثبوت نہیں [illegible] ناہمواریاں دور کی جائیں۔

ایک وقت تھا [illegible] اور تاریخ [illegible] جو کہہ سکتے تھے کہ مفلس اور بے روزگار لوگوں کی امداد کے لئے زیادہ [illegible] کی مخالفت اسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ غریبوں اور بے روزگاروں کو اپنے برابر [illegible] دینے کے مخالف تھے۔ اس دور میں اسی قسم کے مسائل حقیقی اور واقعی طور پر پیش تھے اور اصلاح کے علمبرداروں [illegible] اقتصادی انصاف کے اصول کا پرچار کر کے عوام کو ترغیب دی جاتی تھی۔

کی وہ اس وصول کر رہا ہیں۔ آج بھی اب نہیں کرنا پڑتا۔ اب کسی بھی متمدن ملک میں یہ تبلیغ کرنے کی ضرورت نہیں کہ امیروں سے غریبوں کی نسبت زیادہ ٹیکس وصول کرنا چاہئے؟ گویا یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے۔ ہر معاشرے کا ہر فرد یہ ذمہ داری محسوس کرتا ہے۔ تاہم یہ صورت کبھی بین الاقوامی معاشرے میں پیدا نہیں ہوتی۔ آج اقوام متحدہ کا کوئی رکن پسماندہ ہے، خوش حال ہے، بیماریوں کا مارا ہوا ہے، افلاس اور قحط میں مبتلا ہے اور مدد کے لئے پکارتا ہے تو کم و بیش یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ اسے یہ امداد خیرات کے طور پر دی جیسے یہ اپنی جزا ہے؟ اب سے ایک یا دو صدی پہلے ٹیکس دینے والے دولت مندوں میں کا خیال تھا وہ سمجھتے تھے کہ وہ قوم کے باقی افراد کو اپنی دولت کی زکوٰۃ دے رہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے۔ ہم اس امداد کو خیرات تصور نہیں کرتے۔ ہم سے بین الاقوامی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اس عام مسلمہ اصول کی تکمیل ہے کہ ہر شخص سے اس کے مقدور کے مطابق لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے؟ لیکن جب زیادہ ترقی یافتہ ممالک سے یہ امداد ان ملکوں کو حق اور احسان مندی کے ساتھ قبول کی جاتی ہے۔ تو کئی دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کی امداد سیاسی مصالح کی حامل تو نہیں؟ کیا اس کے ساتھ شرائط و قیود کی پابندیاں تو نہیں؟ آخر اس امداد کا مقصد کیا ہے؟

یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں نفس مضمون سے ذرا ہٹ کر اس حقیقت کی یاد تازہ کراؤں کہ ان میں سے اکثر ممالک جب استعماری اقتدار اور غیر ملکی سامراج کے محکوم تھے۔ تو طویل عرصے تک خام مال مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ رہے تھے۔ اب دو صدی سے یہ کیفیت چلی آتی ہے کہ تمام صنعتیں اور ہر قسم کی فوقیت دنیا کے ان ملکوں میں مرتکز ہو گئی ہیں جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے تجربے سے معلوم کر لیا ہے کہ جب تک کوئی ملک خام مال مہیا کرتا رہتا ہے، اس وقت تک وہ خود کفیل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر ہمارے ملک میں کوئی ایسی ترقیاتی سکیم پیش ہوتی ہے جس کا انحصار خام اشیا کی زیادہ سے زیادہ پیداوار پر ہو تو اس کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے خام مال سے فائدہ اٹھانے کے لئے خود اس ملک میں صنعت رائج کی جائے، دوسری طرف ہمیں جو امداد مل رہی ہے ـــــ مثال کے طور پر اقوام متحدہ ہی کو لیجئے ـــــ ملتی ہے اس سے ہمارے دلوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس امداد کو خام مال مہیا کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے بجائے اپنی صنعتی ترقی میں صرف کریں گے تو دنیا ہمیں احمق سمجھے گی۔

لہٰذا جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دنیا کی اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا بہترین حل کیا ہے؟ تو میں نہایت ادب سے یاد دلاؤں گا کہ سب سے پہلے بین الاقوامی معاشرے کو ان ممالک کی امداد ان وجوہ کی بنا پر کرنی چاہئے، جو میں واضح کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ان ممالک کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کرنا لازم ہے جو ملک صدیوں سے زرعی دور کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں اور ایسے ملکوں میں جو بھاپ کی دریافت کے بعد صنعتی ترقی کے میدان میں سبقت لے جا چکے ہیں، آج اتنا ہی وسیع اور بنیادی تفاوت ہے جتنا پتھر کے زمانے اور زراعت کاری کے زمانے میں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ یہ ممالک جس کیفیت سے گزر رہے ہیں اسی میں ان کو ترقی دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا نے صنعتی ترقی اور مشینی پیداوار کے لحاظ سے جو شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی طرف صحیح رہنمائی کی جائے۔

ان تین چار معاملوں کے بارے میں اختلافات ہمیشہ رہیں گے یہ اختلافات کبھی شدید اور کبھی کم تر ہوں گے، یہ ان ممالک میں بھی رہیں گے جن کے درمیان بنیادی اصول پر کامل اتفاق رائے موجود ہے۔

میں کسی ایسے آزادی فکر، حسن ظن پر مبنی کسی ایسے عقیدے اور آزادی کے لئے کسی ایسے تصور سے واقف نہیں جس کے لئے امریکہ کی بہت سی ممتاز اور قابل قدر ہستیوں نے جدوجہد نہ کی ہو یا اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں ختم نہ کر دی ہوں۔ ہم اپنی امیدوں کے محل اسی بنیاد

ہمارا ملک چھوٹا ہے، آپ کا ملک بڑا دیکھیے۔ آپ پسند کریں یا نہ کریں پھر بھی پاس سے متعلق آپ پر ذمہ داریاں عائد ہیں جو میں نے مختصر بیان کی ہیں
ہوں۔ مستقبل کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ اس ذمہ داری کو کس حد تک خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔

اب مجھے اپنی بات ختم کر دینی چاہیے کیونکہ مجھے معلوم ہے اس جلسے کی مدد وقت بہت زیادہ ہے۔ یہ چیزیں آپ کے لیے ناصح تلخ ہیں
جو میں نے کہا جیسا کہ میں نے کہا، میں آپ کا وقت لیتا رہا۔ آپ کی مرکز رہا۔ سمجھے کہ لوگ بات ہوں گی آپ میں صرف ایک وفد کے
سے بھی نصیحتیں کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں اور وہ پاکستان کا وفد ہے جو اس وفد کا ہمدرد ہے۔ وہ حقیقت چیت تو کچھ دو اپنے ہی اند
کا معاملہ ہے جسے آزادی کی دولت حاصل کیے ابھی صرف چار تین سال گزرے ہیں۔ بے شک ہم اسی طرح طاقت کا نشان نہیں سمجھا جانا چاہیے کیونکہ
ایسا نہیں ہے البتہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ عالمی مشکلات کے بہتر حل میں، جہاں تک ممکن ہو، اپنا کردار ادا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی
وقت بین الاقوامی معاشرے کے مفاد کو اپنے ملک کے مفاد محدود مفاد کے تابع کرنے کی ترغیب اس کے سامنے آجائے۔ ایسے موقع کے لیے یہ مشورہ
ہے کہ اس قسم کی ذہنی کشمکش بھی حیثیت رکھتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایسی کشمکش کے موقع پر ہم بین الاقوامی معاشرے کی بہبود کو عزیز
رکھیں گے۔

پاکستان کے وفد کے لیے میری ایک چھوٹی سی اور آخری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہو تو ضرور کہیں لیکن جب
کہنے کو کچھ نہ ہو تو براہ کرم خاموش رہیں۔

تقریروں کے اردو ترجمے کے لیے ادارہ
مولانا غلام رسول مہر کا شکرگزار ہے

پیغامات

خلیفہ عبدالحکیم

[illegible] اس جہان فانی سے اٹھ گئے [illegible]

[illegible]
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

حفیظ جالندھری

دوستا! بخاری کا انتقال ہو گیا ہے۔ بخاری سے میرا بھی یارانہ تھا۔ میں بائیس برس کا تھا جب ۱۹۱۹ء میں لاہور آیا تو میری شناسائی پطرس بخاری سے ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات "من تو شدم تو من شدی" بن گئی۔ عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، شیخ عبداللطیف تپش، سید امتیاز علی تاج تقریباً روز ہی تاج صاحب کی بیٹھک میں بیٹھتے۔ کبھی کبھی ایک ہوٹل میں بیٹھتے۔ کبھی سے شالامار بھی جاتے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں بھی شریک ہوتے۔ پھر بخاری کی ذات جاذبِ نظر سوالی ہو گئیں۔ بخاری ہی کی شخصیت کی بدولت بن گئی۔ اب تاثیر اور مجید ملک اور پنڈت ہری چند اختر بھی اس بزمِ احباب میں شامل ہو گئے۔ اور سب نیاز مندانِ لاہور کہلانے لگے۔ لیکن اس انجمن کی شمع پطرس بخاری ہی کی ذات تھی۔

شعر و سخن، ادب و فن اور نقد و نظر کے سبھی پہلو، نکات اور لطائف و ظرائف بخاری کی زبان سے ظہور میں آتے جو ہم سب کے لیے بصیرت بخشتے۔

پھر بخاری لاہور سے دہلی چلا گیا۔۔۔ کچھ مدت بعد میں بھی دہلی چلا گیا۔ ہری چند اختر، فیض اور حسرت بھی دلی ہی میں جمع ہو گئے۔۔۔ بخاری ہی کے ہاں کبھی کبھی میرے ہاں میلہ لگتا۔ سالک صاحب لاہور سے آ جاتے۔ جناب چغتائی اور صوفی تبسم بھی قدم رنجہ فرماتے اور محفل جمتی۔ پاکستان بننے کے بعد بخاری امریکہ کا رو پیارا دنیا کی سب سے بڑی انجمن میں شامل ہو گیا۔ دوستی کی محفل بے چراغ ہو گئی۔ امید تھی وہ آ جائے گا اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ آ جاؤں گا اور سب سے جو اس پر جمع ہو جائیں گے لیکن اب اس کی شادی سی ہے جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ؎

دوستی اب کے کام رہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

لیکن اس سے میرا رشتہ آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں۔ جہاں تپش، حسرت، تاثیر، ہری چند اختر اور بخاری وہاں پہنچ گئے ہیں ——— وہاں میں بھی جلد ان سے جا ملوں گا۔

خواجہ منظور حسین، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

پروفیسر احمد شاہ بخاری کی وفات پر ان کے پرانے کالج کے سوا کسی ادارے کو بھی، جس سے ان کا تعلق رہا، سوگوار ہونے کی اتنی وجہ نہیں کیونکہ ہمارے رفقائے کار میں سے کسی نے ان سے زیادہ نہ اس کالج سے کچھ حاصل کیا نہ زیادہ فراخ دلی کے ساتھ فائدہ پہنچایا۔ انہوں نے اس جگہ اور کیمبرج میں اپنی زندگی کے سب سے زیادہ مسرت بخش اور فیض رساں سال بسر کیے۔ یہی وہ درس گاہ ہے جہاں ان کی شخصیت نے پہلے پہل چکا چوند کر دینے والے اوصاف نمایاں کیے اور ان خصوصیات کو استعمال میں لانے پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ یہیں سے ان کی اثر آفرینیوں نے دور و نزدیک کرنیں پھیلیں اور تہذیب و شائستگی پھیلانے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ وہ ایک ممتاز اور متبحر عالم تھے جو مشرق و مغرب کی حیات پرور ادب کے نشوں سے سرشار تھے۔ ایک جوش آفریں استاد کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ ترشیدہ لطائف اور درخشاں فصاحت رکھنے والے ادیب اور مقرر تھے۔ بات بات میں نکتے پیدا کرنے اور تلوار کی طرح تیز کاٹ رکھنے والی ظرافت کے مالک تھے۔ انہوں نے جس چیز کو چھوا اس کی ہیئت بدل دی اور جس سے ملے اس کی رفتار تیز تر کر دی۔ تحقیق و تجسس کا شوق

انہیں کی تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گیا۔ تاہم تب وقت مستقل طور سے انہوں نے کئی دور بار ... کے انتقال ... سے ... کو پسند کیا۔ میانوالی میں ... یہاں تک کہ وہ کتابوں سے الگ ہو چلے۔ ... باقاعدہ ... ذوق والوں کی صحبت میں ... آخر ہو گئے۔ ان کے عصری ترقی پسندی، روشن خیالی، ذہنی استقامت سب پطرس کی قوت کے ساتھ ہماری یادوں میں محفوظ ہیں۔ (ترجمہ)

سید عابد علی عابد

پروفیسر احمد شاہ بخاری کے رخصت ہو جانے سے بہت سی چیزیں ان کے ساتھ رخصت ہو گئیں۔ ظرافت کا ایک اسلوب جس کی روایات و اقدار رخصت ہو گئیں جو مشرقی اور مغربی روایات کے نہایت بلیغ امتزاج سے پیدا ہوئی تھیں۔ وہ اسلوب تحریر رخصت ہو گیا جس میں مختلف زبانوں کی جوہری لطافتیں اس طرح جھلکتی تھیں جیسے شیشے میں رنگ۔ ان کے ساتھ ادیبانہ خطابت، خطیبانہ ادبیت، متین ظرافت اور ظریفانہ متانت بھی رخصت ہو گئیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے جیسے اب کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ادیبوں، انشاپردازوں اور سخن فہموں کی ایک مخصوص جماعت کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ ان کے جانے کے بعد اگرچہ اس جماعت کے گنتی کے کچھ افراد باقی ہیں۔ لیکن اس جماعت کی وہ نمائندہ شخصیت رخصت ہو گئی جس کی جرأت سے اس جماعت کے سارے افراد جیسے بڑے ٹھمک ٹھمک کرتے تھے۔

شائستگی اور بخاری ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح لازم و ملزوم ہو گئے تھے کہ میں تو جب شائستگی کے متعلق کچھ سوچتا تھا تو بخاری کو اس کا مظہر متعین بنا کر سوچتا تھا۔ انہیں فطرت نے گوناگوں صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا۔ سائنس میں بصیرت رکھتے تھے۔ کرکٹ کے بڑے باقاعدہ مطلع تھے۔ ادبیات کے رسیا تھے اور حسن انتظام کی ہنستی بولتی چلتی پھرتی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اللہ نے ان کی یہ تمام صلاحیتیں پاکستان کے کام آئیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مسئلے کے سلسلے میں ایسی گرہ پیدا ہو گئی جو کہ سلجھائے نہیں سلجھتی اور بخاری سے رجوع کیا گیا ہے تو انہوں نے پہلے مسئلے کو چٹکیوں میں سلجھایا ہے اور پھر اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے کام لے کر بات کو بھی چٹکیوں میں اڑا دیا ہے۔

اردو ادبیات کے سلسلے میں ان کی تخلیقات گنتی کے چند مضامین اور منظومات پر مشتمل ہیں۔ لیکن ہر تخلیق ایک کارنامہ ہے اور ہر مضمون پڑھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ بخاری اس سے بہتر مضمون نہ لکھ سکیں گے۔ ہر بار یہ گمان غلط ثابت ہوتا ہے ہر دوسرا مضمون پہلے سے بلند تر ثابت ہوتا ہے۔

بلی اور دو ماہ سے قطع نظر ان کے بانکپن کی یہ ادا کون فراموش کر سکتا ہے کہ روتے ہوئے ہنس دیتے ہیں اور ہنستے ہوئے رلا دیتے ہیں۔ شاید لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کو ان کی موت کے بعد معلوم ہوا ہو گا کہ ان کی بیماری کتنی خوفناک، شدید اور طویل تھی اور اپنے فرائض منصبی کا کتنا گہرا شعور رکھتے تھے کہ تا حیات مرحوم کی موت کا داغ تازہ ہوا۔

ہم زباں چپ ہو گئے ہم داستاں چپ ہو گئے
کیسے محفل آرا نکتہ داں چپ ہو گئے

قیمت ــــ ۱۹۴۸ ــــ پرچہ نمبر

ہفت روزہ ـ نصرت ـ لاہور

یکے از مطبوعات مکتبہ جدید

بہت سے لوگوں اور اداروں نے نصرت کو اپنی پسند کے موافق سمجھا ہے۔ امید ہے آپ بھی اس کا باقاعدہ مطالعہ کرنا اپنے لیے کئی لحاظ سے پسند کریں گے۔

ایک شاعر

نصرت واقعی پیارا ہے۔ نصرت نے جن امور کو پیش نظر رکھا ہے۔ آج کل ہمیشہ ان کی ضرورت تھی۔ انسانوں کے دلوں میں بہتر زندگی کے لئے آرزو پیدا کرنا اور اپنے ملک و قوم کے مسائل میں تعمیری جذبات کے ساتھ خود حصہ لینا اور دوسروں کو مائل کرنا نصرت کا مطمح نظر ہے۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

ایک مصور

روحانی نشو و نما اور صلاحیتوں کی تکمیل کے لیے مکتبہ جدید نے بے مثل خدمت کی ہے اور اب ہفت روزہ نصرت بھی ان خدمات کی ایک کڑی ہے جسے فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ نصرت نے اتنے تھوڑے عرصے میں جتنی ترقی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے ایک پیغام ہے اور اس میں بصیرت کی چمک ہے۔

مصور مشرق، عبد الرحمٰن چغتائی

ایک روزنامہ

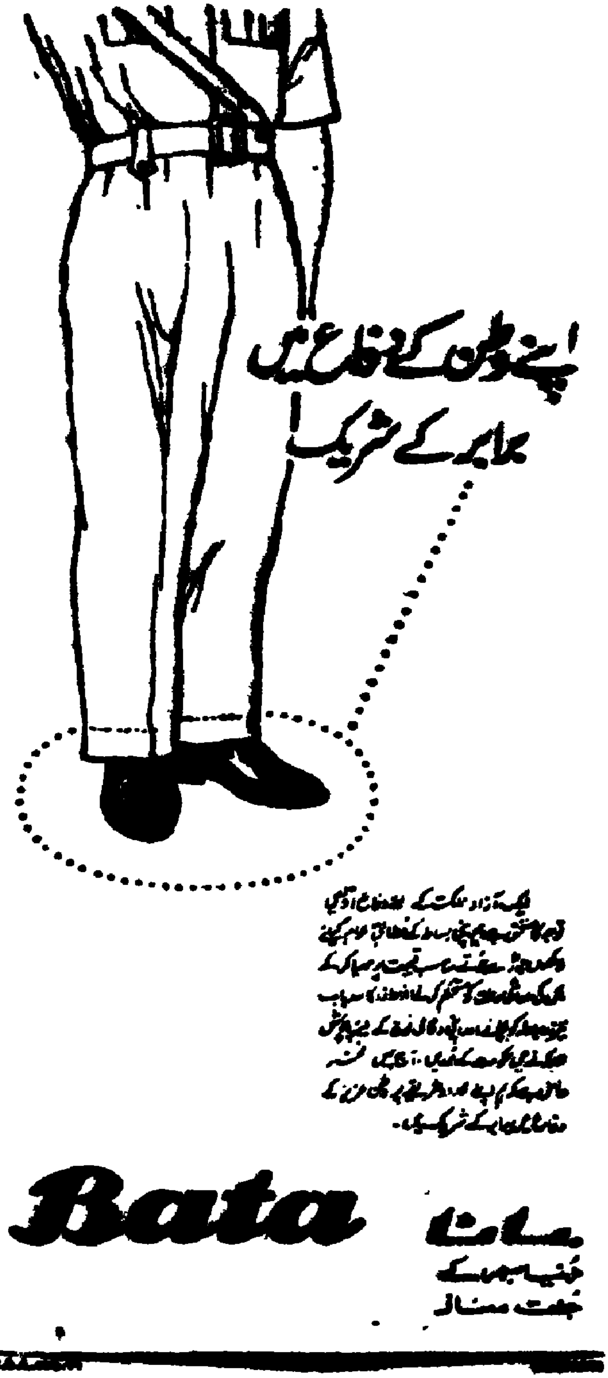
نصرت میں باقاعدہ یہ کوشش نظر آتی ہے کہ ہماری زندگی کے جو مختلف اور متنوع پہلو ہیں ان کو سامنے لایا جائے اور یوں لوگوں میں ارد گرد کی زندگی میں اور خود اپنی زندگی میں دلچسپی لینے کا مذاق پیدا کیا جائے ــــ اور یہی ایک ہفتہ وار کا صحیح تصور ہے۔

روزنامہ 'آفاق' لاہور

بدل اشتراک

فی شمارہ چھ آنے ــــ ایک سال کے لیے پندرہ روپے ــــ چھ ماہ کے لیے آٹھ روپے

ناظم: ہفت روزہ نصرت ــــ ۶ ــــ نسبت روڈ ــــ لاہور


اپنے وطن کے دفاع میں
ہمارے شریک
Bata
باٹا
دُنیا بھر کے
جُفت ساز

دو چار باتیں

۱۔ نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا۔ جو دیگر رسائل کے سالناموں سے زیادہ بہتر ہوگا۔ انشاء اللہ!

۲۔ عام نمبر کے بعد نقوش اپنے دس سالہ کارناموں کا انتخاب پیش کر یگا جو بلاشبہ ایک کارنامہ ہوگا۔

۳۔ نقوش کا غزل نمبر کئی اہم اضافوں کے ساتھ جلد ہی مارکیٹ میں آجائیگا شاید نومبر تک۔

۴۔ افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر (دوم) منٹو نمبر اور طنز و مزاح نمبر مل سکتے ہیں مگر صرف وی پی ہی سے منگوا کر

۵۔ نقوش کے پرانے نمبروں میں یہ شمارے بھی مل سکتے ہیں مثلاً نمبر ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴۔

۶۔ بعض دیگر نمبروں کے لئے ہماری ایجنسی طاہر نیوز ایجنسی نشتر روڈ کراچی کو لکھیں شاید چند ایک شمارے مل جائیں۔

۷۔ ادارہ نقوش ڈرامہ نمبر کے لئے بھی پر تول رہا ہے۔ کچھ مشورے دیجئے، کچھ مواد کی فراہمی میں مدد کیجئے۔

۸۔ نقوش کے سابقہ کارناموں پر رائے اور آئندہ کے لئے آپ کے مشورے ہماری رہنمائی کا موجب ہوں گے۔ کچھ لکھئے تو۔

(ادارہ)